

برگ گل

ایم سلطانہ قمر

آتے جاڑوں کی رُت تھی۔

ایسا موسم کہ کبھی ٹھنڈی محسوس ہونے لگتی اور کبھی گرمی۔
ایک کُنڈ شید خواہ گاہ کے دروازے کھڑکیاں گوبند تھیں مگر مغربی سمت کی کھڑکیوں کے پرے سے ہونے تھے اور شیشوں کی رکاوٹیں پار کرتی دھلتی ہوئی سہ پہر کی نیم جان اور سنہری دھوپ اپنے پر شکوہ دہل بید پر نہ مٹی، یکم زینت شعیب کے پیڑ میں لوٹ رہی تھی۔

یکم زینت شعیب فرہی مائل جسم۔

کھلتی ہوئی گندمی رنگت۔ فرہی کی دھڑ سے بھرے بھرے پر گوشت کالوں پر دیتی ہوئی مکھڑی مکھڑی سی ناک۔
پ اسٹک کے ٹکے سے شید سے رستے پتلے پتلے ہونٹوں، چھوٹے سے دہانے، غلائی پونٹوں اور غول جن یعنی دھڑی ٹھوڑی کے ساتھ۔ مجموعی طور پر دھلتی ہوئی عمر میں بھی قبول صورت نظر آ رہی تھیں۔

ان کے گھٹو گھڑیلے تراشیدہ اور پولی کلر سے رنگے سرخی مائل براؤن بال ٹیکے ہونے کی وجہ سے دونوں شانوں پر اور پیچھے کی طرف بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ باؤں کی ہلکے چمپی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ایک کھلا ہوا خطہ تھیں، وہ کسی گہری سورتج میں متفرق تھیں کہ دفعتاً خواہ گاہ کے منسلخانے کا دروازہ کھلا اور ان کے درواز قامت اور خوش شکل شوہر شعیب منصور مائل کلا تھ کے ہاتھ گاؤں میں ملبوس تو لیسے سے اپنے گیلے بال پونچھے ہوئے برآمد ہوئے۔ وہ چند گھنٹے قبل ہی اپنے کسی کاروباری دورے سے واپس لوٹے تھے جنسل خانے سے باہر آتے ہی انہوں نے جیوی پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

”کیا تم نے اس خط کو ابھی تک پڑھا نہیں؟“

توزینت اپنی عویت سے چونک کر قد سے اٹھے ہوئے انداز میں بولیں۔

”نہیں، پڑھ تو لیا ہے مگر بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کیوں کیا لاٹینی یا کوئی غیر مغربی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس خط میں جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔“ شعیب منصور نے بال پونچھے پونچھے ہاتھ روک کر پوچھا۔ پھر تو لیسے کو جھٹکتے ہوئے غسل خانے میں چلے گئے اور تو لیسے کو اسٹینڈ پر ڈال کر واپس

ملنے ہوئے انہوں نے کہا۔
 "جی صاف اور سیدھی بات ہے۔ فاخرہ بی بی نے سلوٹ کے معاملے کو مصیبتہ راز میں رکھنے کی تاکید کی ہے اور بس؟

تو شوہر کی بات پر زینت نے توری پر ہل ڈال کر کہا۔
 "مگر سہی راز و ازمیں رکھنے کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی مگر آؤ اس قدر اس نکلنے چھپانے سے فائدہ ہی کیا ہوگا۔ دیکھیں نا جب چاند چڑھتا ہے تو کل عالم اسے دیکھتا ہے پھر سلوٹ کا معاملہ تو۔"

اور جو تو اتنی بات کیوں میں جانے کی ضرورت ہے۔ جب فاخرہ بی بی ایسا ہی لکھا ہے تو اس کے پیچھے ہی ان کی کوئی مصلحت ہی پوشیدہ ہوگی۔ "شعیب منصور قدسے چوکھڑے کر لے۔"

واہ عجیب مصلحت ہے۔ "زینت نے گردن نیوڑا کر نکتہ چینی کی۔
 "عجیب ہو یا غریب اس سے مجھے یا تمہیں کیا غرض۔ انہوں نے تاکید نہیں ایک طرح کی درخواست کی ہے تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ان کی بات کا اعترا بہت پاس ضرور رکھیں اور اس سے ہمارا گھٹ بھی کیا عام ہے۔"

شعیب منصور نے ابھی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ملازم نے جانے لانے کی اطلاع دی تو شعیب منصور جلدی سے لباس تبدیل کرنے غفل خانے میں چلے گئے۔ اجازت ملنے پر ملازم جانے کی ٹرائی لیے اندر داخل ہوا اور زینت کے آگے رکھ کر لٹے پیروں واپس جانے لگا تو زینت نے ڈالی کا ایک جائزہ لے کر پوچھا۔
 "یہ جانے لائے سے پہلے تم نے اسے چیک بھی کر لیا تھا کہ غاسا ماں نے کیسی بنائی ہے۔"

"جی بیکر صاحب! ہم نے خود اپنے ہاتھ سے صاب کے لیے یہ جانے دم کیا ہے۔ بڑا مشرونگ قسم کا بنا لیا ہے۔ ملازم اپنی فوجیت جتانے کی غرض سے دانتوں کی لگی سی ناشق کرتا ہوا بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ غاسا ماں پر نظر رکھا کرو۔ نیا اور اچھی آدی ہے۔" انہوں نے کہا تو ملازم کو "جی بہتہ" کہتا ہوا اکڑے سے چلا گیا۔

پچھری دیر میں شعیب منصور آف و ہاٹ سلکن کرتے پا جاسے میں ملبوس غفلنے سے برا کمر ہوئے اور دل سے دیوار پر لگے خوبصورت ریک پر رکھا اپنا پاپ اٹھا کر پیر سے اس میں تبا کو بھرتے ہوئے بولے۔
 "کیا بڑے غاسا ماں کو نکال دیا ہے جو غاسا ماں کو رکھنے کی ضرورت پڑ گئی؟"

"میں نے تو نہیں نکالا مگر وہ خودی نکل گئے۔ روٹیاں جو لگتی تھیں نا نہیں۔ ایک تو ان کے داغ بہت ہو گئے تھے دوسرے چھینے بھر کر لاش آٹھ دن میں ختم۔ وہ تو مال اور دربان نے ہی ایک دن ان کی چوری پھولی۔ ایک تو کان پر سرج سے تھے جالی۔ اس بات پر میں نے انہیں چیک کیا تو سامان اٹھا کر بلا ٹوٹس ہی غائب ہو گئے۔ زینت نے غاسا ماں کے جانے کی تفصیل بتائی۔

"ہوں۔ اصل میں خاتون فائدہ کی بے توجہی اور غفلت سے یہ ملازمین بہت فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ۔"

"مکین میں ان خواتین میں سے نہیں ہوں۔ جنہیں ہر وقت اپنے بناؤ سنگھار اور دیر و تفریق کی ہی پڑی رہتی ہے۔ میں شوشل مزدوروں اور ہلکے موٹی میں حصہ لیتی ہوں۔ مگر گھریلو امور سے کبھی غافل نہیں رہتی۔ اور یہی تربیت میں نے اپنی بچیوں کو بھی بی ہے۔ اور آپ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔ زینت نے شوہر کی بات کو طنز پر محمول کرتے ہوئے اچھا خاصا ہیکر جھاڑ دیا۔

"ہاں ہاں جی، تمہاری اس خوبی کے تو ہم دل سے متعرف ہیں۔ اور تمہاری انہی خوبیوں سے مرعوب ہو کر تو تم سے شادی کی تھی۔" باپ کو لاٹش کا خند دکھانے کے بعد وہ دین لیسے لے لے کر شعیب منصور نے فائدہ کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یاد ہے کہ ہماری ایجنج میرج ہوئی تھی تو میرج نہیں۔ پھر جلا آپ میرے اندر چھپی خوبیوں سے کیونکر مرعوب ہو سکتے تھے۔" زینت نے شوہر کی بات کو استہزا پر محمول کیا۔

"اے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے نا بگیم اور دل کی آنکھیں ان ظاہری آنکھوں سے کہیں تیز ہوتی ہیں سو ہم نے انہی کے ذریعے تمہارے اندر بھی جو صلاحیتوں کا اندازہ لگایا تھا۔" شعیب منصور نے بیڈ پر ٹیکے سے ٹیک لگا کر مٹھتے ہوئے کہا تو زینت نے کچھ کہنے کے بجائے اٹھ کر ان کی طرف دیکھا۔ اور پھر کوزی بنا کر پیٹ سے پیانی میں جانے اندھینے لگیں۔

"پہلے جانے بی بیں پھر یہ کہیں کا زہر بھرا دھواں پھیلاؤں میں اتارے گا۔" زینت شوہر کی تبا کو ناشی کی عادت سے سخت ناالاف تھیں۔ انہوں نے جانے کی پیانی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے قدرے ناگواری سے کہا۔

"اسے سب چلتا ہے زینت بگیم! اب آپ کے دوسرے نوکٹر پر گریٹ کے بجائے ہم نے یہ پاپ پینا شروع کر دیا ہے۔ تو آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے۔" شعیب منصور نے ان کے ہاتھ چلانے کی پالی کے کلا پر وانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور مگر گھٹ بیایا پاپ بات ایک ہی ہوئی! مگر کیسی دیکھی صورت میں تبا کو کسٹے لگانا۔" زینت اپنی پیالی میں چینی گھولتی ہوئی ہنسونوں کو جھکا کر دسے کر بولیں۔ شعیب منصور خاموشی سے چلے بیٹے رہے۔

کمال ہے کئی عرصے کی شادی ہے اور ہمارا تو گویا پہلا کلب ہے۔ پھر کئی کئی چھوٹی سے خودانے کے بجائے اپنی نند کو بھیج دیا۔ وہ بھی اتنی تعینتوں اور نصیحتوں کے ساتھ۔ "زینت چلے جائے گا گھوٹ ملتی ہے اتار کر خود ہی بولیں۔

"لیکن اور باتوں کے ساتھ انہوں نے اپنی جھوٹی ہنسی پر زور دیا کہ قاتب انہیں اپنے ساتھ دلوٹو پر لے جائے ہیں۔ پھر جلا دیکھے ہماری بیٹی کی شادی میں شریک ہو سکتی ہیں۔" شعیب منصور نے بہن کی طرف سے صفائی پیش کی تو زینت نے طنز سے کہا۔

"جی ہاں، جب ہی تو انہوں نے سلوٹ کو اپنا ریسرژنٹ ٹیوٹر (ناندہ) بنا کر یہاں بھیج دیا ہے۔"

"چلو اگر سبھی دیکھ لے تو اس میں بھی ان کی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔ میرا مطلب ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کے جانے کے بعد سلوٹ تنہا وہاں رہی تو نہیں کھتی تھی۔"

"اور نہ۔ ہر بات میں مصلحت ہی مصلحت۔ کیا بات میں مصلحت برتنا فاخرہ کی کوئی حکمت عملی ہے۔" زینت جملے کے انداز میں بولیں۔

"مکن ہے کہ حکمت عملی ہی ہو لیکن تمہیں اس بات پر اس قدر متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل تو توں ہی تمہارے گھر مہانداری کا سلسلہ چل رہا ہے۔ سلوٹ کی دور ویاں پھر بھاری تو نہیں ہوں گی۔" شعیب منصور بیوی کے جملے کے انداز پر سنج کر بولے۔

بہن آپ کے خیال میں، میں کوئی گری پڑی ہوں جو سلوٹ کی دور ویاں بھاری سمجھوں گی۔ میرے تو سان وکان میں بھی ایسا ریکر خیال کبھی نہیں آیا۔ میں تو صرف اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ میرے نزدیک تو یہ کوئی عیوب بات نہیں جس کی فاخرہ اتنی پردہ پوشی کرنا چاہ رہی ہیں۔ "زینت جین جین کی کیفیت میں بولیں۔

"تمہارے خیال میں نہ تو لیکن فاخرہ کی کے خیال میں تو ہے۔ بلکہ بہت مکن ہے کہ خود سلوٹ ہی پسند نہ کرتی ہو۔ اور اس نے فاخرہ کی کو یہ سب لکھتے پڑھ کر کیا ہو۔" شعیب منصور بیوی کے سامنے جھوٹی بہن کو ہمیشہ فاخرہ ہی کہتے تھے اور زینت کو فاخرہ کے ساتھ زینت کی کج نیت حکمت عملی یوں بھی بند کی اتنی طرف داری کرنے پر اندر ہی اندر جڑ بڑھی ہوئی تھیں۔ کوہا سامنے بنا کر بولیں۔

"خیر جو کچھ بھی ہیں کیا پڑی ہے برائے پٹے میں پر اٹانے کی۔"

"ہاں، واقعی ہاں کیسی کئی باتوں سے کیا واسطہ۔ ویسے بائی واو سے تم نے لے لیا یا یا؟" شعیب منصور نے پیالی خالی کر کے اسے میز پر رکھ کر اپنا پاپ اٹھا لے کر پوچھا۔

"کھسے؟" زینت بولیں۔

"سلوٹ کو اور کسے۔"

"ابھی دو تین ہی روز تو ہوئے ہیں اسے یہاں آئے۔" وہ سلوٹ کا نام سن کر ہنسی سے بولیں۔

"مگر بوت کے پاؤں تو لٹنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔" شعیب منصور نے ان کی ہنسی پر مسکرا کر کہا۔

"بظاہر تو خاموش معقول ہے۔ یوں ہی شروع شروع ہی تو سب ہی اپنی باندگی دکھاتے ہیں۔" وہ میاں کے مسکرانے پر چڑ کر بولیں۔

"باندگی دکھانے کا محاورہ نہایت بے عمل ہے کیونکہ وہ تمہاری نند کی نند ہے، ملازم یا کام کرنے والی نہیں۔" شعیب منصور نے بیوی کو زوراً ہی ٹوکا۔

"افوہ! آپ تو میری وراسی بات کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ورنہ میں نے ان منوں میں تو یہ محاورہ استعمال نہیں کیا تھا میں نے تو ایک آدمی بات کہی تھی۔ مگر بہن کا معاملہ ہے نا اس لیے آپ کو اس میں بھی بڑائی نظر آتی۔" زینت بڑبڑا کر بولیں۔

"بہن کا نہیں بہن کی خند کا معاملہ ہے۔ یعنی سمجھانے کی بات ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ تمہارے کسی بیوے سے عاقبت کے احساسات کو قیاس پیسنے اور کوئی شکریہ پیدا ہو جس اس خیال سے تمہیں عطا ہونے کی تلقین کر رہا ہوں۔" شعیب منصور سنجیدہ ہو کر بولے۔

"کمال ہے تمہیں برس تو گزر گئے ہیں میں ایک ساتھ زندگی گزارتے اور آپ اب تک میری فطرت اور مزاج کو نہیں پہچانے اور ادھر ایک دنیا میری عادات اور اخلاق کی گویہ اور متعلق ہے۔" زینت نے شامی کی نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ جب کہ ان

33

کا لہجہ جھٹسا سکتا۔
 نہیں، گرویدہ اور مسترف تو ہم بھی بہت ہیں۔ لیکن وہ جو ایک روایتی شرم کی جلیسی ہوتی ہے نڈا اور بھادو کے درمیان اس کے بقیہ نظر کبہ ہے ہیں۔
 میں کیا کیا۔ جلیسی۔ میں میں آپ کی بہن سے جلیس ہوں۔ بیٹھیں و حسد رکھتی ہوں اس سے۔ واہ کیا خوب صلبہ دیا ہے آپ نے اپنے برس کی رباتوں اور توبائیوں کا۔ زینت شوہر کی طنز بہ باتوں پر ایک دم کھول دی انھیں۔
 "میں ہی تم کو کافی اداں با بہتان تو نہیں جو تم اس قدر کما مان رہی ہو۔ یہ تو ایک فطری سی بات ہے جس کا میں میں شاد ہوں میں نہ ایک دوسرے نہیں بارہا ناخوہی کے ساتھ تمہارے رویے اور توجروں کا مشاہدہ کیا ہے۔ خیر چھوڑو اس قسم کے کوباب کو گئے فٹے اظہر لغزواہ عواہ ہی تلخیاں پیدا کرنے سے حاصل ہی کیا ہوگا۔" شعیب منصور نے باپ کے تبا کو پریس سے دبا تے ہوئے کہا۔
 "ہو نہ ہو۔ تلخیاں تو آپ کھول ہی چکے ہیں۔ اور جب آپ نے بات ہی چھڑی ہے تو ہمیں بھی یہی کہوں گی کہ آپ کی چھٹی بہن نے کبھی میری حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ کبھی باکرہ کھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بارہ برس کی تھیں جب یہاں ہوا کہ آپ کے گھر میں آئی تھی۔ یہی سوچ کر کہ اکوئی خندہ بہن کی شکل، اس پر بے ماں کی جی ہے۔ اس لیے اسے سر پر چھڑا کر رکھوں گی۔ میں نے اس کا خیال رکھنے میں کوئی کسر اٹھا چھوڑی مگر وہ میری محبت و شفقت کے جواب میں ہر شے ہے میری اور بے کالکی سے ہی لڑا اڑا گیا۔ اب آپ بڑا نہیں یا بھلا۔ یہاں یہ عادت ہے کہ کوئی اگر تبا ہے یا کتر تبا ہے تو ہم بھی اس کی طرف ہلٹ کر دیکھنا پسند نہیں کرتے مگر چونکہ لاٹوئی نڈا کا معاملہ تھا اس لیے دل پر ہرج کر کے جھلکا پڑتا تھا۔ ان کے سامنے اصل میں آپ لوگوں کے بے جالا دیار نے ناخوہی کو کچھ زیادہ ہی ادا کو بغیر نڈس کر کے رکھ دیا تھا۔" زینت نے بڑے ڈھکے ڈھکے انداز میں نڈی نظرت اور مزاج پر چوٹ کی۔
 "اصل میں ناخوہی ایک ہی توبہ میں ہی تم تینوں بھائیوں کی۔ بھائی جان نے خیر نڈن جا کر اپنی دنیاوی الگ بسالی بھی لیکن میں اور سہیل جی رہ گئے تھے ان کے نازا اٹھانے کو۔ وہ صرف چار سال کی تھیں جب بی اماں کا انتقال ہوا تھا۔ اباماں نے ان کے انتقال کے تین ماہ بعد ہی عقد شادی کر لیا تھا۔ اور بوی کو سہ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہ کچھ لوگ اتنی سی کی تو کم دونوں بھائیوں نے ہی ماں اور باپ کی شفقت دی تھی بلکہ بھائی جان نے بھی کیونکہ اس زمانے میں تو وہی کم دونوں سے بڑے تھے۔ یہی کوئی سو لہتر سال کے مگر یہ حقیقت ہے کہ دوسرا خواہ کچھ کو کتنا ہی پیار ہے اس کے باوجود بھی والدین سے محرومی کا احساس بچے کو اندر ہی اندر کھل کھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔ سو ہی کچھ ناخوہی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس پر بھائی جان کی جدائی نے بھی انہیں گم گم سا کر کے رکھ دیا تھا۔ تمہارا شکوہ کچھ ہے جاہن کی کہ وہ سگی بھینجی کی شادی میں شریک نہیں ہو رہیں۔ مگر کیا کریں ان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے پروا اور روکھی پیکلی ہے۔ بس ہمارے لیے تو یہی بہت ہے کہ وہ اپنے گھر میں سکھ جائیں سے رہ رہی ہیں۔" شعیب منصور نے عقیدہ دبار بتائی ہوئی بات پھر دہرائی تو زینت بڑی دیر سے دل نہ کھٹکتی ایک بات کو زبان پر لے آئیں۔
 "ہاں دیکھیں ادھر آپ دونوں بہن پر جان پھرنے والے بھائی ہیں اور ادھر وہ آپ کے بہنوئی قاقب صاحب ہیں کراہی میرا تفریق کی خاطر ہے جاری اکوئی بہن کو یہاں بھیج دیا۔ وہ بھی سروس کرنے کی غرض سے۔ جب کہ ان کے پاس انڈا کا دیا سب کچھ ہے۔ اس پر ایک ہی بہن وہ بھی بے جاری غمزہ۔ اسے تو قاقب کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے تھا۔ یاد رکھو بھال کے کسی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا شیتے۔"
 "قاقب صاحب بھلا کوئی آدمی ہیں جو ان سے اس قسم کی توقع رکھی جائے۔ جتنا نہیں کسی بھر بھی مٹی سے اٹھایا گیا ہے ان کا فیر کر زلنے ہوا کھل کھل کر ان میں سا گیا ہے۔ اگر پوچھو کہ کوئی کیسے حال چاہاں تو جواب ملے کہ اس انڈا کا گم ہے۔ اور اگر پوچھا جائے کہ آج کل کیا مسئلے تو کہیں گے کہ کوئی خاص نہیں یا کام کیسا چل رہا ہے تو کہا جائے گا کہ میں دوسرا جیسا کہ ہمیشہ سے چلتا آ رہا ہے۔ وہ بھی کچھ اتنے گھرواؤ انداز میں کہ معلوم ہوگا جیسے مطلق میں کچھ تک ریت پھیل گئی جارہی ہے۔ وہ بندہ خدا تو محض مزدوری بات کرتا ہے اور اس کے ساتھ کہ وہ ہماری ناخوہی یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے کوئی ٹرپ کر رکھی ہو۔ وہ بھی مزدوری بات کر لیتی ہیں۔"
 گو شوہر کی باتوں سے زینت کبیدہ خاطر ہو رہی تھیں پھر بھی انہوں نے جس انداز میں اپنے بہنوئی کے نرمے بے بن کا نقشہ کھینچا تھا اس پر ہنسے نہ نہ رہ سکیں۔
 "پلیں یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ قاقب کو بوی بھی ہم مزاج ہی ملی درد کوئی شوخ و شنگ مل جاتی تو گڑا راشک ل سے ہی ہوتا کہ ازواجی زندگی میں تو آپس کی انڈا شنیدنگ کے ساتھ ساتھ خیالات اور مزاج کی ہم آہنگی بھی بہت ضروری ہوتی ہے جب

کہ دونوں اولاد دینی خدمت سے محروم بھی ہیں۔ پھر بھی کسی دیکھی طرح بھرہ ہی ہے۔ خیر ناخوہی کو خدا سدا نکلی رکھے۔"
 "آمین۔" شعیب منصور بولے۔
 "اوہاں ایک بیالی اور نڈا دل آپ کے لیے۔" زینت کو کچھ خیال آیا تو انہوں نے پوچھا۔
 "ہاں یاد دہرے چائے کے تو ہم مدامے ریا ہیں یا تمہارے اس نازک سے وجود کے۔" شعیب منصور نے چابوت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔
 "آپ بہانے بہانے میرے موافقے کو نشانہ کیوں بناتے ہیں۔ آخر میری عمر تو دیکھیں بڑھاپے کو چھڑنے لگی ہے اور اس عمر میں تو۔" زینت نے ان کی بات کو طنز پر غفل کر کے بڑا ماننے کے سے انداز میں کہا تو شعیب منصور نے کچھ سے کہہنا کر سیدھے ہوتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔
 "خدا کرے جو تم بوڑھی ہو۔ ذرا میری نظروں سے تو خود کو دیکھو جن میں تم ویسی ہی دھان پان، نازک بدن اور سیم سی نظر آتی ہو۔"
 "اے بس چھوڑیں جی یہ کچنی چھڑی باتیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ آپ کی نظروں میں میری کیا وقعت اور حیثیت ہے؟ زینت ان کی پیالی میں پین ڈالتے ہوئے بولیں۔
 "کیوں کیا میں نے قبلے حقوق کی ادا کی میں کسی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ تمہاری محبت میں کبھی خیانت سے کام لیا ہے جاہم؟ آج میرے لیے تمہارے احساسات اس قدر متنی ہو رہے ہیں۔"
 زینت نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چائے کی پیالی خاموشی سے ان کی طرف بڑھادی لیکن انہوں نے ایک ہاتھ سے پیالی کے نیچے ان کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے پیالی کے کپڑے پر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
 "سنو جان من! ہمیں میری صاف اور کھلی گفتگو سے تکلیف پہنچی ہے نا تو یہی تو سوچو کہ والدین، بہن بھائی اولاد سب کے لیے جذبہ ایکسی ہو رہے ہیں محبت، لیکن اس محبت میں بھی رشتوں کی مناسبت سے ایک تعویذ ضرور ہوتی ہے کہ والدین کے عطیے میں محبت کے ساتھ احترام، تابعداری اور آداب کو ملحوظ رکھنا پڑے اس طرح بھائی بہن اولاد لائے رشتوں کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہوئے محبت کی جاتی ہے اور اسی تعویذ کے ساتھ بیوی کی محبت کے انداز میں پھر زلے ہوتے ہیں۔ وہ رفیق سفر بھی ہوتی ہے اور دیکھ سکھ کی ساتھی بھی۔ اور آپ کچھ اپنے دلے در باؤنا شوہر کو کتنی عزیز ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ شاید تم کبھی نہ لگا ہی نہیں سکتیں۔ لیکن تم تعلیم یافتہ ہو جو ان جوان بچوں کی ماں ہو محبت، اس کی تقسیم پر ایک بار غصہ سے دل سے غور کرو۔ تو پھر ہمارے درمیان شکوے شکایت کی کوئی گنجائش ہی باقی رہے گی۔" شعیب منصور سمجھ گھٹتے تھے کہ وہ کس وجہ سے اتنی دل گرفتہ ہو رہی ہیں! انہوں نے ان کا ہاتھ تھامے تھامے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔
 "اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آپ میرا ہاتھ تو چھوڑیے۔" زینت ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں بولیں۔
 "نہیں پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی باتوں پر اپنا دل نہیں جلاؤ گی۔ سنو سنو کرا پھر۔" انہوں نے کچھ زیادہ ہی مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ دیا۔
 "واہ یہ ابھی زبردستی ہے چھوڑیے نا۔ اگر کوئی آگیا تو کیا سوچے گا بھلا۔" زینت جھینپے جھینپے انداز میں مسکرا کر بولیں۔
 "آہا آہا۔ آج اس عمر میں اتنے عرصے بعد بھی تمہیں کسی کے آجانے کا دھوکا لگا ہوا ہے۔ کمال ہے تم کے اس دور میں یہ خرم و اعتقاد شاید بقتار ہی حق ہے۔" شعیب منصور نے ان کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے ہلکا سا جھنجھٹا کر کہا۔
 "ہاں تو وہ ملی ہوئی عمر کے اس دور میں شرم دیکھا کوئی دھڑکتی ہوئی جاتی۔" زینت لڑائی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔
 "بچے آپ کچھ کہیں تو دوپہر کا کھانا بھی آپ نے نہیں کھایا۔" انہوں نے لڑائی شوہر کی طرف کھسکا کر کہا۔
 "نہیں دوپہر کا کھانا تو جہاز میں ہی کھایا تھا۔ پھر یہاں کس پیٹ میں پڑتا۔" شعیب منصور بولے۔
 "ہاں۔ خوب معلوم ہے کہ کتنا کھانا ہوگا۔ یوں بھی آپ گھر سے باہر کچھ کھانے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ دل بھی دوجا رہے ہی حلق سے اتار لیے ہوں گے۔" زینت دھار سے بولیں۔
 "نہیں۔ خیر گھر سے باہر کا نہیں شہر سے باہر کا معاملہ تھا۔ اس لیے اپنی اس عادت کو بحال مجبوری چند روز کے لیے ترک کرنا ہی پڑا۔"
 "اچھا پلیں اب تو کچھ کھالیں۔ کم از کم یہ چٹیر اور بکٹ ہی پکھلیں۔" زینت اصرار کرنے کے سے انداز میں بولیں۔ اور

چکن پٹری کی پلیٹ اور سکڑوں کی کوئی بچلے خانے سے اٹھا کر ٹالی کی بالائی ٹرے پر رکھ دی۔
 ”اوہ آپ کو کھلائیں اور ہم دیکھائیں۔ ہماری بھلائی بھال کھاں مگر یہ بسکٹ کے لیے چھٹنے کا حاورہ بھی خوب ہے۔“ شعیب منصور نے کوکی سے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے نہیں کر کہا۔

”اٹنی سیدی باتوں میں پھر جائے ٹھنڈی کر لی آپ نے۔“ زینت بولیں۔
 ”کوئی مضائقہ نہیں۔ تمہاری قربت میں ہیں ٹھنڈی چائے بھی ایک دم کوک لگتی ہے۔“ شعیب منصور نے سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ تو زینت نظریں کتر کر بولیں۔

”کچھ معلوم بھی ہے کل سے شادی کی رسمیں شروع ہونے والی ہیں اور ادھر بابا صاحب اب تک کاغان دی کی پیر سے ہی نہیں لوئے ادھر آپ بھی دور سے پرستے مجھے جتنی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میری دل جانتا ہے۔“
 ”کیوں سہیل اور زور دیا تو ایک ہفتے قبل ہی آگئے تھے کیا انہوں نے تمہاری کوئی مدد نہیں کی؟“ شعیب منصور نے ایک ہی گھونٹ میں پوری پیالی ختم کر کے اسے ٹالی میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ دو تھوہت کی دولاں نے ہی مگر زور دیا بھاگ دوڑ کے کام تو نہیں کر سکتی تھیں نا۔ سب کچھ ہے جاسے سہیل منصور پر ہری ہوگا۔ پھر بھی لوکی کی شادی میں تو وضعی تک تنو سو بھیڑے ہوتے ہیں۔ صاحبزائے کو کم زکام اتا تو احساس ہونا چاہیے تھا۔ کز زندگی میں یہ پہلا خوشی کا موقع ہے وہ بھی بہن کی شادی کا مگر باہر کی ہوا لگ کر تو ان کی نظریں رشتوں ناؤں کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔“ زینت کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لانا بانی بن سے بہت نالاں ہیں۔

”اچھو کچھ زیادہ ہی ناراض معلوم ہوتی ہو اپنے لادے سے لیکن یہ تو متنبی بھی معلوم ہے کہ وہ ادارہ گروی کی نیت سے نہیں گیا بلکہ اپنے فارزد و متوں کو پاکستان کے پرفضا مقامات کی سیر کرانے کی غرض سے گیا ہے۔“ وچھے اسے اب تک واپس تو آجنا چاہیے تھا۔ بہت ممکن ہے کہ شام کے پلین سے آجائے۔“

”ہوں۔ آجی جا میں گے تو کون سا تیر مارا میں گے۔ ہر محلے میں اپنی لاطمی کا اظہار کرتے ہیں۔“ زینت آہستہ سے سر کو جھٹک کر بولیں۔

”لو اس سرے اس سرے آخر تم اس سے جا ہتی کیا ہو۔ بے چارہ۔ چار سال تک تو تک سے باہر ہی رہا اور یہاں بھی رہتا تھا تو زیادہ تر اپنی نعمانی سرگرمیوں میں ہی مشغول رہتا تھا۔ اسے بھلا آئے دال کا بھاؤ کہاں معلوم ہوگا۔ ویسے بالی واوے۔ کیا کسی چیز کی کمی باقی رہ گئی ہے؟“ شعیب منصور نے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے بعد پوچھا۔

”بھئیے۔ کوئی ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ وہاں تو ابھی بے شمار چیزیں باقی رہ گئی ہیں
 ابھی تو نشان کے طور پر دو لہا کو خواہوں میں جو پورے چڑھا ہے جلتے ہیں۔ ان پر چھوکنے کے لیے کیلیں۔ بتائے مٹی کیلیں مٹی سفید شکر کے لالچی دانے بھی نہیں منگو اپنے پیڑیوں کے لیے میوہ اور کھانے بھی نہیں آئے۔ باغ کاؤن زری کا دوشالہ اور پلنگ سوٹ تک نہیں خریدے۔ ادھر آج بیوہ لے بھی لیا ہے۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ چھوٹی موٹی چیزوں اور دست لڑے کے علاوہ کم از کم چار سیٹ تو ہماری قسم کے فے دوں بیٹی کو۔“ زینت بولیں۔

”لیکن ہمارا چولہا تو بہت پرانا بلکہ خاندانی ہے تم نے اسے زبولات کے سیٹ میں منگو لیا پسند کر لے ہو تو۔ خود جمانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ شعیب منصور نے باپ کا دھواں بھیجے دیں سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

”وہ بے چارہ تو سر آنکھوں پر دوڑا دوڑا آجائے مگر دوکان پر جانے کی بات اور ہوتی ہے۔ وہاں اور بھی بہت سے موزائک نظر پڑتے ہیں جب کہ یہاں وہ بے چارہ پوری دکان اٹھا کر لائے سے تو رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس سیٹ ہی بے آئے۔“ زینت بولیں۔

”اچھا تو پھر اٹھو۔ ابھی تو صرف ساڑھے پانچ ہی بجے ہیں۔ یعنی دکان بند ہونے میں آدھ پون گھنٹہ باقی ہے۔ آج ہم اپنی بے خاص سے ایک عظیمہ سیٹ خرید کر آپ کی نذر کر گئے۔“ شعیب منصور اٹھنے کی غرض سے سیدھے ہو کر بیٹھے ہوئے لوے۔

”کیا سچ؟ زینت نے خوش ہو کر پوچھا۔ پھر اٹھتی ہوئی بولیں۔
 ”لیکن اگر جباری سوا تو اسے بھی میں اپنی بیٹی کے جہیز میں لگا دوں گی۔“

”نہیں وہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ایک گھنٹ ہوگا اور بیٹی کے لیے زیور کی کیا کمی ہے۔ چار نہیں تم جھوٹا سیٹ دے دینا۔ چلو اب دیر نہ کرو شعیب منصور نے جوتوں میں پیڑ ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا بس ایک منٹ میں دریا بہاں تبدیل کر لوں۔“ زینت غصہ لگاتے کا رخ کرتی ہوئی پولیس جس سے ملحق ان کا ڈرائیگ روم تھا۔

”مگر تمہاری لباس کو نسا بڑا ہے۔ کتنا سوٹ بھی کر رہا ہے تمہارے شعیب منصور نے ان کے لباس کا ایک سرسری جائزہ سا لے کر کہا۔
 ”ہاں روسک کی ساڑھی ہے جو میں نے منگا پھر سے خریدی تھی مگر گھر لو استعمال کی ہے بس ایک منٹ میں پہنچ کر کے آئی ہوں اسے۔“

زینت یہ کہتی ہوئی جلدی سے ٹوائلٹ میں گھس گئیں۔ پھر جب دو منٹ بعد باہر آئیں تو انہوں نے کچلے آسانی رنگ کی سیلف پرنٹ کی ایک بہت ہی خوبصورت قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جو ان پر بری طرح کھب رہی تھی۔ شعیب منصور نے انہیں دیکھ کر خوش سے انداز میں سیٹی بجائی۔ اور پھر گاڑی کی چابی ساڈ ٹیبل سے اٹھا کر ان کے ساتھ باہر آگئے۔

باہر پورچ میں شعیب منصور کی نئے ماڈل کی سیڈ پر کھڑی تھی جس میں بیٹھے سے پہلے زینت نے ملازم کرم کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور پھر شعیب منصور نے دروازہ کھول کر پیچھے انہیں سیٹ پر بٹھایا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی اور اپنے پرنشکو شگلے سے باہر نکل آئے۔

باہر ایک گہا گہا تھی۔ غروب آفتاب کے نزدیک بھی زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ شڑوں پر ٹریفک کا ایک سیل سا بہہ رہا تھا۔ زینت کا دل خوش تھا۔ روح گمن تھی اور دماغ آسودہ اس لیے انہیں چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری نظر آرہی تھیں۔

یون سائی پر قیص کرتی روشنیاں۔
 دکانوں میں جلتے تھے۔
 مکانوں میں جلنے روشنیاں۔

کاروں بیوں اور رکشاؤں کی ہیڈ لائٹیں۔
 اور شام کی سہری فضاؤں میں سرسراہٹیں۔ انہیں مسرت و شادمانی کا سندس دیتی لگ رہی تھیں۔ فزٹ سیٹ پر اپنے جہانے واسلے اور محبوب شوہر کے ساتھ بیٹھی وہ خود کو فضاؤں میں پرواز کرتا محسوس کر رہی تھیں۔

دولت، ثروت، حیثیت، اسٹیٹس، خوبصورت اور لائق خالق اولاد۔ شوہر کا اتفاقات اور سب سے بڑھ کر ملی طمانیت اور سکون۔

کونسی ایسی نعمت تھی جس سے وہ محروم تھیں۔
 کار میں ٹیپ ریکارڈر پر موزی کی بجلی سی دھن بج رہی تھی۔ جس سے اپنے طور پر شعیب منصور غفلت ہو رہے تھے۔ زینت اپنی کسی خوبصورت سوچ سے نکل کر ٹیپ بند کرتی ہوئی بولیں۔

”معلوم بھی ہے میں نے کیا سوچا ہے؟“
 ”ہاں کیا سوچا ہے؟“

”تازہ پوری شادی کے بعد بابا کو بھی ازدواجی بندھن میں ماندھ دوں گی۔ بہت چھٹے چھٹے جہیز ہیں ہر وقت۔ یوں بھی اب انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔“

”لیکن تعلیم اس لیے مکمل تو نہیں کی کہ اسے تہر کر کے شادی کر کے بیٹھ جائے۔ پیٹلے اسے اپنے فیڈلزم قدم تو جھانے دو“ شعیب منصور نے کہا۔

”قدم بھی نہیں گئے۔ نہیں رپے پیسے کی کوئی کمی تو نہیں۔ اتنی ساری جائداد میرے، دونوں ٹیکسٹریاں اور اتنا بینک بیلنس یہ کیا کم ہیں ان کی کیسی جان کے لیے۔“ زینت بولیں۔

”خیر کیلی جان تو نہ کہا ابھی اور میں تمہارے سامنے اور پھر یہ جو تم جائداد اور زمینوں وغیرہ کے حوالے سے بات کر رہی ہو تو پھر یہ نظر رکھو کہ یہ فارم بٹا ہے لیکن وہ بھی ہر گز نہیں جاکر لیکن خزانے میں چند ہی لینا ہے اور میری خواہش ہے کہ اسفند خود اپنے زور بازو سے کمائے اور معاشرے میں اپنا ایک مقام بنائے کیونکہ والدین کے پیسے یا اپنی وراثت پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے۔

والے لوگ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے اندر دوسروں کی حاجی اور بے حس کی قلت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کیریئر کے اخراجات بھی میں اسے ایک حد میں سبب قرار دیتے ہیں۔ تم میری تجویز پر عمل کرتے رہیں۔ اگر مجھے معلوم تھا کہ وہاں کا ماحول اور معاشرہ کیسا ہے اور پیسے کی طرف سے بے فکری تو اس کی دیر میں انسان کو بھٹکا دیتی ہے۔ اب دیکھ لو چار سال بعد آپس آیا ہے تو کسی میم ویم کی بیچ ساتھ لگا کر نہیں لایا۔ "شعیب منصور نے بوی کی بات پر اتنا لمبا لیکچر بھڑا تو وہ انکا کر بولیں۔ "ٹھیک ہے۔ میں خود اس معاملے پر اس سے بات کر دوں گی۔"

کس معاملے پر؟ "شعیب منصور نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ شادی کرنے کے موہم میں یا اپنی پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" زینت نے بیزاری سے کہا۔

"ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے لیے کوئی لڑائی تلاش کر لی ہے۔" شعیب منصور نے قیاس آرائی کرنے کے سے انذار میں کہا۔

"ہاں۔ لڑی کو دیکھ کر تو بیچ میری رال ٹپک رہی ہے۔" زینت نے لالچ لگاتے لگتی ہے۔ "شعیب منصور نے نہیں کر کہا۔

"اچھا تو کیا وہ اعلیٰ یا پھر کی غامضیت رکھتی ہے۔ کیونکہ عموماً کھلی چیزوں کو دیکھ کر ہی لالچ لگتی ہے۔" شعیب منصور نے نہیں کر کہا۔

"اب آپ تو ہر بات کو یا تو مذاق میں اڑاتے لگتے ہیں یا پھر سیریس ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑی آپ کے داماد احمد سرور کی خالہ زاد ہے۔ بڑے ہی دل آف لوگ ہیں اور زناش تو اتنی خوبصورت ہے جیسے عدسے اسے اپنے ہاتھ سے بنا یا ہو۔ اس پر تعلیم یافتہ اور اسٹائش بھی بہت ہے اور باعلاق اور شہر مکہ بھی ایسی کر لیں لگتا ہے جیسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلیاں سی چٹک رہی ہوں۔"

زینت نے لڑی کا نقشہ کھینچا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ گویا لڑی نہ ہونی کلیوں کا گلدستہ ہو گئی۔ مگر بیٹی کی سسرال سے بھولانے کی کبھی سوچنا بھی نہیں۔ کیونکہ اگر تھوڑے بیٹے کا مزاج اس سے ملا نہیں جس کے امکانات یقینی ہیں تو تمہاری اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تمہیں کی بھیبت چڑھ جائے گی۔"

"واہ آپ کو کیا ابھام ہوا ہے کہ اسفند کا مزاج اس سے نہیں ملے گا۔ ہونہر! یہ کہتے کہ آپ بیٹے کا سہرا دیکھنے کی آرزو ہی نہیں رکھتے۔" زینت بڑا سادہ بنا کر بولیں۔

"اب میری ذات کو اپنے طنز کا نشانہ نہ بناؤ۔ بھلا کون باپ ایسا ہو گا جسے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی آرزو نہ ہو۔ لیکن ہر کام موقع اور محل پر ہی اچھا لگتا ہے۔ ابھی اس کی دو بہنیں اور بیٹی ہیں۔ چلو اگر نیما چھوٹی بھی ہے تو کم از کم نیلوفر تو اس قابل ہے کہ ایک آدھ سال بعد اس کی شادی کر دی جائے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر تمہیں اپنے بیٹے کے خیالات ہی معلوم ہیں کہ وہ کسی لڑی چاہتا ہے۔ کم از کم زوناں جیسی لڑی کو تو بالکل پسند نہیں کرے گا کیونکہ وہ فطرتاً سا دگی پسند ہے۔" شعیب منصور کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ فی الوقت بیٹے کی شادی کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ زینت بھی سمجھ کر گئیں۔

"خیر یہ تو اس کا عندیہ لینے کے بعد ہی معلوم ہو گا کہ زوناں اس کے معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں اترتی۔ مگر یہ اسے کہاں بڑھ جا رہے ہیں۔ کیا بھول گئے جو ہری کی دوکان۔ وہ پچھلے گئی ہے مگر آپ کا رہیں روک دیجئے۔"

زینت نے ان کی بات کا جواب دیتے ہی انہیں جوہری کی دوکان کے بارے میں بتایا تو انہوں نے بیک دیوہر میں دیکھ کر کار کو وہیں روکنے کے بجائے پورے گریس ڈال کر اسے بیک کیا کہ انھان سے پچھلے کار پارکنگ کا حقہ خالی تھا۔ پھر دونوں میاں بوی کا رستہ انکر جوہری کی دوکان میں داخل ہو گئے۔

شعیب منصور کے والد منصور احمد اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ بن تین چار رہنے اور تھوڑی سی جائیدادیں ان کی ملکیت تھیں۔ ان کی بوی خدیجہ بیگم بیٹے میں ان کی بھوپورا دہی تھیں۔ خدیجہ بیگم کے بطن سے منصور احمد کی اولادیں تو کئی ہوئی تھیں مگر تین لڑکے اور ایک لڑکی ہی زندہ رہ سکی تھیں لیکن بیٹی کی پیدائش کے بعد کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ منصور احمد اچھے خالص آسودہ مال تھے۔ اس لیے انہوں نے بوی کا علاج معالجہ بھی خوب کرایا۔ مگر شاید وہ تیس برس کی عمر ہی تکھو کر لائی تھیں۔ جو مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوکان کے مصداق صحت یاب ہونے کے بجائے ان کی صحت گرتی ہی گئی۔ اور وہ فائزہ کو حیم فیض کے پورے چار سال بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

اس کے سب سے بڑے بیٹے شعیب منصور عمر کی سولہویں منہ میں قدم رکھ چکے تھے۔ شعیب ان سے چار سال چھوٹے تھے اور سہیل منصور آٹھ برس۔ اور بن ماں کی چار سالہ بیٹی فائزہ گھر کے گوشے گوشے میں ماں کو تلاش کرتی نظر آتی تھی۔ باپ کچھ فطرتاً رنگین مزاج کے واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے شروع سے ہی اولاد پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی برونہ دل بستی تھی۔ وہ بچوں کی تعلیم کی طرف سے بھی لاپرواہ تھے کیونکہ ایک تو خود انہوں نے زیادہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ دوسرے زمیندار تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان کے بیٹے جیسے بڑے ہو کر زمینوں کا کام نبھال لیں گے۔ مگر خدیجہ بیگم کے میکے میں تعلیم کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد بھی ایک مدرسے میں معلم رہ چکے تھے اور داوا بھی اپنے وقت کے قید عالم تھے۔ وہ خود بھی خاصی پڑھی لکھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے میاں کی مخالفت کے باوجود اپنے تینوں بیٹوں کو اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ شعیب کو خود بھی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور سولہ سال کی عمر میں انہوں نے میٹرک بھی پاس کر لیا تھا۔

گھر میں باپ کے علاوہ بڑی اولاد یا بڑے بھائی کی حیثیت بھی بیکارواں کی سی ہوتی ہے۔ اگر بڑا بھائی اچھی عادات و عمدہ عناصر، اخلاق اور کردار کا ہو تو اس سے چھوٹی اولادیں اس کی تقلید موزور کرتی ہیں۔ شعیب منصور کا لڑھان تعلیم کی طرف تھا۔ ہر وقت کھیل کود، دھینکا مشتی اور اوارہ گردی میں ہی مصروف نظر آتے۔ آٹھ سالہ سہیل منصور بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے مگر شعیب منصور دونوں کو ٹھونک بھا کر کسی کسی طرح راجہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ماں کی علامت بھی شدت اختیار کر گئی تھی۔ ماں کے بیٹوں بھائی دم و دیوار تھے۔ کچھ اس لیے بھی شعیب منصور نے بڑے بھائی کے احکامات پر خاموشی سے سر ہٹا

دیا تھا۔ سبیل تو یہی چھوٹے تھے اور باپ سے زیادہ بڑے جھانی سے ان کی جان بھٹکتی تھی۔ اس لیے ان پر غضب کو زیادہ غمت صرف کرتی نہیں پڑی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز خدیجہ بیگم جی جان چھوڑنے والی اور عزیز ترین ماں ان چاروں بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دین سے منہ موڑ گئیں۔ اور زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ان تینوں بھائیوں کے لیے سانحہ سے کم ثابت نہ ہوا۔

ماں کے انتقال کے بعد باپ جو تیسرے چوتھے دن گھر میں نظر آجاتے تھے۔ دسویں کی فاطمہ کی اپنے بچوں کا ساتھ دینا ہوا تھا۔ اس کے بعد دسویں بندھوڑی کی جان کی صورت دیکھنے کو ملتی تھی۔ تین چار روز کے قیام کی غرض سے گھر میں آئے بھی تو بچوں کی شامت آجاتی۔ سب سے زیادہ غضب سے نالاں تھے جو زمینوں کا کام سمجھانے کے بجائے تعلیم کی طرف راغب تھے۔ اپنی اہلا دیں اگر تھوڑا بہت لگاؤ تھا تو وہ معصوم سی چار سالہ فائزہ سے ہی تھا۔ اصل میں تو وہ اسی کے خیال سے آگئی جانتے تھے مگر معلوم کیوں فائزہ ان سے بہت گھبراتی تھی۔ بھلائے پران کی گود میں چلی تو جانی تھی مگر یا تو رونے لگتی یا چل کر فوراً ہی اتر جاتی۔

بہر حال بچی کے انتقال کے بعد یہ شروع شروع کے چوٹیلے تھے۔ باپ کے وہ ملی قدرت نے شاید داد کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھا ہی نہ تھا۔ جو منصور احمد نے رختہ رختہ آدہ و رفتہ بالکل ہی کم کر دی تھی۔ البتہ خروج بڑی باقاعدگی سے ہوا دیکھتے تھے۔

پھر ایک روز وہ آئے تو ان کے ساتھ ایک اجنبی مسرت غمزہ بھی تھیں۔ جن کا تعارف بچوں سے انہوں نے بتا ہی چھوٹی اتنی ہمدرد کر لیا۔ دو چار روز اسی غمزہ کے ساتھ گھر میں قیام فرما رہے۔ اس کے بعد جھگڑنے تو معلوم ہوا کہ چھوٹی موی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس وقت غضب بھی ساری اولادوں میں کچھ باشعور تھے۔ حالات کی گتائیوں نے اس کو نزعہری میں ہی ان پر فہم و ادراک کے دروازے کھول دیے تھے۔ انہوں نے باپ کی زندگی میں ہی باپ کی جانشینی اختیار کر کے بھائیوں اور بہن کو پر لکھا یا لکھا۔ وقت بہتہ دریا کی مانند آگے ہی بڑھتا رہا اور تشنہ علم، دریا نے علم سے یلبر ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ خود غضب نے ظلم۔ اسے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان امتیاز ہی بڑوں سے پاس کر لیا۔

غضب بھی اس دوران میں گریجویشن کر چکے تھے اور چونکہ سبیل بڑھائی میں ان سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے تھوڑا دیر میں آگئے تھے اور فائزہ نے میرٹھ پاس کر لیا تھا۔ غضب کو بیرون ملک جاکر بارہٹ لاک ڈگری لینے کا سودا سما۔ اور وہ بھائیوں کو بہن کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کی بھی تاکید کر کے انگلستان روانہ ہو گئے۔

غضب کا چرچا ان واقعہ بڑھائی کی طرف نہیں تھا پھر بھی بڑے بھائی کی تاکید پر مارا سے باندھے انہوں نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اس دوران میں ایک بڑا خوبصورت حادثہ رونما ہو گیا تھا۔ سوتیلی ماں خلاف توقع اس قدر سوتیلی ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ جیسی کہ روایتی سوتیلی مائیں ہوتی ہیں۔ وہ خود تو ان کے گھر نہیں آتی تھیں مگر جب بھی سوتیلی بیٹے باپ سے ملنے چھوٹی موی جانتے تھے وہ بڑی مہر و لگاؤ سے پیش آتی تھیں۔ ان دنوں غضب منصور نے ظلم۔ اسے پر یوں میں نانا داغلہ کیا تھا۔ نصاب کی کمی سے سن جن خریدنے کا مسئلہ درپیش تھا جس کا حل وہ خود نے وہ باپ کے پاس گئے تھے۔ وہیں ایک خالوں موجود تھیں۔ بڑی طرح دارا در با وقار سی۔ انہوں نے غضب منصور کو دیکھتے ہی اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا۔ وہ غضب منصور کی سوتیلی ماں کی سبیلی تھیں۔ غضب منصور کے جلنے کے بعد انہوں نے ان سے اپنی بیٹی کے شے کی بات کی تو سوتیلی ماں سلیم بیگم یہ رشتہ طے کرانے پر فوراً تیار ہو گئیں۔

پھر ایک دن انہوں نے کسی بھانے سے غضب منصور کو بل کر زینت کو بھی دکھا دیا۔ غضب منصور کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ سوتیلی ماں یہ کیا چکر چلا رہی ہیں۔ وہ تو بعد میں بات کہنے پر ہی علم ہوا کہ انہوں نے زینت کے بارے میں۔ ان کا عندیہ لیا تھا۔ اور چونکہ چھوٹی بچی کی خواہش تھی۔ اس لیے باپ بھی فوراً ہی اس رشتے کے لیے راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے غضب منصور کے ہزار غدر تراشے کے باوجود بالآخر انہیں راضی کر لی لیا تھا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لیے ایک دو ایک شیعہ نظری میں دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔

غضب کو اطلاع دی گئی تو جواب میں انہوں نے بڑی ٹانٹ ڈپٹ کا ایک خط لکھا جس میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے بے دلی سے یہی گزارش دی کہ بعد کی شیعہ منصور چھٹے ہی سے جتنی کما انہوں نے ایم۔ اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اور اس ساری کارکردگی کا ذکر گزاری میں تین سال کا عمر تک لگ گیا۔

فائزہ سرخسویں سال میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ان کی شادی بھی سلیم بیگم نے ہی کرانی تھی۔ سلیم بیگم واسطہ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں مگر بڑی کامی تھیں۔ انہوں نے گریجویشن کے علاوہ اردو و سبکدستی میں ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیاز ہی بڑوں سے پاس کر رکھے تھے۔ زیادہ خوب و نہیں تھیں مگر پرکشش مزور تھیں اور طبقے سے

تعلق رکھتی تھیں۔ جس کی چادر اتنی مختصر ہوتی تھی کہ ٹری شکل سے کچھ تھان کر انسان کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ جہاں اعلیٰ تو کیا مٹوئی بڑے کا جیڑ مینا کر نامی کاردار دی ہوتا ہے۔ اور سلیم بیگم کی تو تین تین جوان بنیں اور بھی تھیں۔ پینا مات زیادہ تراوسط طبقے کے کی گئے تھے۔ اس لیے گھر کی حیثیت دیکھ کر ایسے جالتے کر پھر بھی واپس نہیں لوٹتے تھے۔ اور پھر یوں زندگی کے کسی مضبوط سہارے کی آرزو میں بیٹے سلیم بیگم کے بال بچنے لگے۔ چہرے سے بھی جوانی کی ساری شاد والی رشعت ہو گئی۔ اور وہ ایک اسکول میں پڑھاتے پڑھاتے رہ جایا ہوا بچوں پر کر رہ گئی تھیں۔ ایک دن ایک شاطر قسم کی عورت نے جو شہر شہر پر قریہ گھیر کر آسمانوں پر ترم کیے رشتوں کو زمین پر ملانے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ سلیم بیگم سے منصور احمد کے بارے میں بات کی۔

منصور احمد کی عمر اس کے اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی جب کہ سلیم بیگم اس سے ایک آدھ سال اوپر چھلانگ بچی تھیں۔ گو وہ اس دھلتی ہوئی عمر میں شادی چاہنے کے لیے بالکل تیار نہ تھیں مگر اس شاطر کے بھانے بھانے پر انہوں نے بھی سوچا کہ اگر یہ معلوم کتنا عرصہ اور جتنا بڑے تو کیا ساری عمر بچوں کو تنہا و تنہا داخلہ دے کر اور پڑھا لکھا کر ڈاری جائے گی۔ عورت کے یہ مدعا کہ وجود تو ایک کمین گاہ کی طرح ہوتا ہے جس کے تلے بیٹھ کر وہ دنیا کی سرد و گرم ہی سے نہیں بڑائیوں اور خطرات سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ والدین کب تک بیٹی کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ان کے بعد لڑکیاں بھائیوں سے زیادہ بھادو کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے بھائی اچھے بھی ہوتے ہیں۔ تب بھی بھایاں بے سہارا نندوں کے جو کوہ برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔ اور ہر طرح سے بھائیوں کی پیلید ہوتی ہے۔

سلیم کا بھی ایک ہی بھائی تھا۔ جو نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ اس کے دو بیٹے بھی تھے۔ چونکہ سلیم کے والدین زندہ تھے اس لیے بھائی بھادو مع بچوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

مگر آئے دن کسی نہ کسی بات پر چرچہ چور ہوئی رہتی تھی۔ سلیم کا گھر پر خاصا رعب تھا۔ چونکہ وہ سب سے بڑی اولاد تھی پھر سلیم ہی لکھی اور بھادر تھی اور مستقبل کے آئینے میں آئے والے حالات کا عکس دیکھتے تھے۔ اس لیے بحالت جمہوری اس نے منصور احمد سے عقد کر لیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سوتیلی روایتی ماؤں سے بالکل مختلف تھی۔

زینت کی والدہ سے سلیم بیگم کی بڑائی شادمانی تھی وہ بھی کچھ یوں کہ زینت جب چھوٹی سی تھیں تو ابھی کے اسکول میں پڑھتی تھیں اور چونکہ حساب اور جراثیم کی گور تھیں۔ اس لیے کچھ عرصہ سلیم سے ٹوشش بھی نہ رہی تھیں۔ اب یہ بعض اتفاق ہی تھا کہ زینت کی والدہ سلیم سے ملنے ان کے گھر آتی ہوئی تھیں کہ شیعہ منصور آگئے۔ بہر حال سلیم کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا۔ عاقب کی چھوٹی خالہ سے بھی ان کی کاڑھی چھتی تھی کیونکہ ان کی بیٹی بھی سلیم کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ سلیم اس کی کلاس میں تھیں۔ گوسلیم کی حیثیت ان کے پاس اور ساڈی سے فوراً ہی تاملی جاتی تھی لیکن ان کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ اور بات کرنے کا انداز بھی کچھ ایسا پرکشش تھا کہ درمیان سے متاثر ہونے بغیر نہ رہتا تھا۔ چنانچہ عاقب کی خالہ بھی جو خاصی متول تھیں۔ ان سے حد تک لگ مل گئی تھیں۔ اور ان سے دوستی کا سلسلہ شادی کے بعد بھی چلتا رہا تھا کہ شادی کے بعد تو وہ سردار منصور احمد کی اہلیہ بن کر کامیاب

حیثیت ہو گئی تھیں۔ اس لیے تو کسی نظر وقارت بھی انہیں دیکھتے تھے وہ بھی ان سے ملنے کچھ کچھ چلے آتے تھے۔

پھر اس عرصے میں جب غضب منصور فائزہ انھیں ہو کر کسی ملازمت کی تلاش میں تھے۔ خدا نے انہیں ایک بہت خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ زینت کی مستقل اقامت تو اس گھر میں تھی جس میں ان کے شوہر، جلیطہ پورا اور بیٹا پڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ لیکن شادی کے بعد شیعہ منصور جو کچھ سوتیلی ماں کے اخلاق اور کردار سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ اسی لیے ان کی آمد و رفت باپ کے یہاں بھی رہتی تھی۔ وہ بڑی اور بچے کو بھی چھوٹی لے جاتے تھے۔ اور یہ بھی خدا کی شان ہی تھی کہ منصور احمد نے اولاد کے کبھی باوجود چھوٹے نہیں کیے تھے مگر وہ بڑے کے شیدا تھے کہ یوں بھی اصل سے سو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ پوتے کو ایک منٹ بھی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سلیم بیگم بھی جو کچھ دلا دھیں۔ اس لیے یہ بچہ ان کی آنکھوں کا نانا تھا۔ اس کی محبت میں دو دنوں میں بچی کو ایسے رنڈا رہوئے تھے کہ انہوں نے چھوٹی موی کی رہائش چھوڑ کر شہر میں اپنی پرانی وضع کو کھلی میں جس میں ان کے بچے رہائش پذیر تھے سکونت اختیار کر لی تھی۔

دادا سے بڑے کا نام سردار محمد اسفند رکھا تھا اور اپنی زندگی میں ہی اپنی آدمی جا دا داس کے نام منقول کر دی تھی غضب منصور کو بیٹے کی پیدائش کے فوراً ہی بعد منشی آف سیلٹہ میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ سبیل کو چونکہ یوں اور درختوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ باقی کے سبکدستی میں بی۔ ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ چھپن ہیں ہی سے جب کبھی انہیں زمینوں یا شکار پر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ ہمیشہ جڑی بوٹیاں اور معدنیات کی تلاش کرتے نظر آتے تھے اور شیعہ منصور کی سفارش پر ہی باپ نے ہزار غماغت

کے باوجود انہیں کینیڈا جانے کی اجازت دی گئی کیونکہ ساری اولاد میں کچھ بونے کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ باپ کی خوشی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شعیب منصور نے زمینوں اور جائیدادوں کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی۔ باپ کی نظروں میں ان کی قدم و منزلت کچھ سوا ہو گئی تھی۔

پھر چار برسوں پر محیط وقت تیزی سے آگے نکل گیا۔ اور شعیب کو قدرت نے ایک عہد یعنی بھی نواز دیا۔ بیٹے پر تو باپ نے اپنی ساری محبت اور شفقت چھڑا کر رکھے ایک طرح سے قبضہ کر لیا تھا اور شعیب منصور کو ہر شے سے بچی کا بہت ارمان تھا کیونکہ ان کے خاندان میں بیٹیوں کی بہت کمی تھی۔ اور اسی لیے بیٹیوں کی بہت قدر بھی کی جاتی تھی۔ کچھ اس لیے بھی شعیب منصور بیٹی کو بہت چاہتے تھے۔ داد بھی پوتی کی پیدائش پر بہت خوش تھے لیکن موت نے انہیں اپنی مہلت ہی نہیں دی کہ پوتی سے بھی ماں گون کرتے۔ وہ دس کے پرانے مزین تھے اور پرہیزی کھانا کھاتے تھے مگر ان ایک تو سردی کی شدت بھر پور تھی۔ اس پر ر جانے یا سو بھی یا یہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہوئے کا ایک بہانہ ہی تھا کہ بیوی کے لاکھ منگ کرنے کا وجود فرج میں کبھی ٹھنڈی کھیر کھالی۔ اس میں اتھوڑی سی کھیر نے ان کی جان برباد دی جسے کبھی ایسا شدید حملہ کیا کہ دو تین روز میں جٹ پٹ ہو کر رہ گئے۔ باپ کے انتقال کے بعد شعیب گورڈن میں چھوڑی جائیداد وغیرہ کا بھارا نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ایک تو دونوں بھائی پیرنی مالک میں رہ رہے تھے۔ دوسرے سب سے بڑا سلسلہ آدمی جائیداد کا تھا جو باپ نے اپنی زندگی میں ان کے بیٹے کے نام کر دی تھی۔ شعیب منصور اس معاملے میں ان کے بہت کام آئے۔

اصل میں باپ نے کدو سے وہ کچھ ایسے بدل ہوئے تھے کہ انہوں نے بھائیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ لہذا میں ہی شعیب ہو گئے تھے۔ کچھ روز پہلے ایک ترک خاؤں سے شادی کر لی تھی جس سے ان کی دو بیٹیاں بھی تھیں اور انہوں نے باپ کی درستی میں چھوٹا جائیداد سے دستبردار کی کے اعلان کے ساتھ ہی شعیب منصور کو مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بھائی، بہن اور توبلی ماں کے حصے ان تینوں کے حوالے کر کے اپنے حصے میں آئی ہوئی رقم سے کوئی معقول سا کاروبار کر لیں۔

شعیب منصور نے بھی بھائی کے مشورے کو بہت مناسب جانا کہ یوں بھی تین ہزار کا شاہراہ ان کے شاہان اخراجات کے لیے بہت ناکافی ہوتا تھا۔ اور سوسٹ ترقی کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ باپ کی زندگی میں انہوں نے شادی کے بعد کبھی ان سے ایک پانی بھی لیں گوارا نہیں کی تھی۔ لہذا سب کا حصہ فے کر اور بیٹے کا حصہ نکال کر بھی آنا بچا تھا کہ انہوں نے اس سے تمام چینی کے برتن بنائے اور گلاس درک کی دو ٹیکسٹریاں نکالیں۔

غیر بیٹے کی جائیداد سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ اسے تو وہ اس کے سیو گنگ کاؤنٹ میں جمع کر لیتے رہتے تھے۔ مگر ان کی زمینوں اور جائیداد سے جو کچھ بھی حاصل ہوتا تھا کینیڈا کی آمدنی کے ساتھ چند برسوں میں اتنا۔ ہو گیا کہ بڑے ساہوکاروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اور ان کا کاروبار دیگر بونے نکل کر لائونڈ کاروں اور دیگر کمیشنرزوں تک پہنچ گیا۔ مگر ان کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ خلعت اور کونوٹ بھی بہت اچھے تھے۔ غور نام کو نہیں تھا۔ تنہا بڑے سے مذہبی خیالات کے بھی حامل تھے۔ اور اپنے مذہب و حقیقت سے ڈرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں زینت قدرے زود مچ واقع ہوئی تھیں۔ ان کے مزاج میں تنہا سادگیاں تھیں۔ عقدا قوت فیصلہ کو مضبوط بھی گروہ ظاہر ایسا کرتی تھیں جیسے دوسروں سے مشورہ لیے بغیر کوئی عملی قدم ہی نہ اٹھا سکتی ہوں مگر روشن اور آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد فرض شناس اور میاں کے تصور دیکھ کر چلنے کی عادی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شوہر پر اپنی عادی تھیں۔ جتنی کہ عام طور پر چھٹی ہوتی ہی۔

بزرگیت آپس میں اندازاً ملے تنگ تھی اس لیے بڑی اچھی طرح نباہ رہا تھا۔ قدرت نے انہیں مزید وہ بیٹیوں سے نوازا تھا۔ اس لیے اسفند کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

سردار محمد اسفند اپنے نام کے آگے باپ کا نام لکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عجیب سی خلعت اور عادات کا مالک تھا وہ بی بی داد کو معز میں ماں باپ سے زیادہ واد کی خلعت اور مزاج اس کے اندر طول کر گئی تھیں۔ اس لیے سخت لا بالائی ہونے کے ساتھ ساتھ خوشک مزاج اور تند خو بھی تھا۔ کچھ بے جا اوصاف نہایتاؤں پر دیا رہے بھی اس کے مزاج میں طغیانیوں پرورد کو پیشہ رہی ارمان رکھا کہ اس کا اکلوتا بھائی کبھی بہنوں کے مقابلے میں خود کو کسی بزرگ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے خاص طور پر زبرد کو پیشہ رہی ارمان رکھا کہ اس کا اکلوتا بھائی کبھی تو نہیں کر اس سے بات کرے یا کم از کم اس کے ساتھ کرم، لود واداش جیسے گیز میں شریک رہے جو جائے۔ مگر کبھی وہ سیدھے منہ اس سے بات ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ اپنی بروائی کا رعب ہی بھاتا نظر آتا تھا۔ گھر میں صرف نیلا ہی تھی سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے کبھی وہ نہیں بول لیتا تھا۔ باپ سے زیادہ اس کی دوستی چاہتے تھے۔

باپ سے تو وہ صرف مزدور تاجری بات کرتا تھا۔ ماں سے بھی وہ اتنا فری نہ تھا جیسے کہ عموماً اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو بہتا تھا اور کسی سے فری تھا تو وہ اس کی وادی سلجی بیگم ہی تھیں۔ جن کے پاس میٹر کو وہ پھر دن بائیں کرتا رہتا تھا۔ اور انہیں سے اپنی شکایتیں اور دکھ سکھ کہتا تھا اور توبلی ساس ہونے کی وجہ سے زینت اس بات پر بہت خار کھاتی تھیں۔ یوں شعیب منصور کے دل میں بھی توبلی کی احساس مزر تھا۔ سلی بیگم کی محبت اور غلوں کے آگے وہ خود کو بے ساس محسوس کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے بیوی کے شکایتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے لڑا دیتے تھے۔

بہر حال یہ تو اس وقت تک کی باتیں تھیں جب اسفند روکپن کے دوسرے تھا۔ اس کے بعد تو کاروبار میں توسیع ہو جانے کے بعد شعیب منصور کراچی چلے آئے تھے۔ اور وہاں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ بلکہ مینگلوں ٹاؤن میں مین ڈرگ روڈ پر ایک عیالیشان بنگلو بھی تعمیر کر لیا تھا۔ جس میں اب ان کی اقامت تھی۔

بیٹیاں بھی اسکولوں کی سرمدیں پارکس کے کالوں میں پڑھتی تھیں اور میڈیکل سائنس کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹریت کرنے کی غرض سے بیرون ملک جانے کے لیے پرتول رہا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس کے مزاج میں تبدیلی اور بڑائی آئی تھی۔ انہم اور ان کے تعلیم کے کسی قدر دلچسپی تھے۔ اس لیے رشتوں کی بہانہ کا شعور بھی آ گیا تھا۔ مزاج میں وہ طنز اور براہِ خط بھی بڑی حد تک کم ہو گئی تھی۔ والدین کے مرتبہ کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ اور بہنوں کی حیثیت کا بھی۔ مگر ایک عادت سی ہی نہ گئی تھی۔ بے وقوفی رہتی تھی۔ اس لیے ایک گھر میں رہ کر بھی وہ سب سے الگ تھلک سا رہتا تھا۔ ایک ماں ہی تھیں جو ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں رہتی تھیں۔

پھر ایک دن وہ مازم سفر ہوا اور پورے چار برس تک دیارِ عری کی آزاد نفساؤں میں سانس لینا رہا۔ ایک تو باپ ہی اخراجات کے لیے ایک محدود رقم سمیٹتے تھے اس پر اس کی برزور رہنے کی عادت اور مزاج میں غلطیوں نے اور کچھ دلوں جا کر ایک انسٹی ٹیوٹ میں ٹیوشن لینے کی وجہ سے اسے اتنا وقت ہی نہ ملا کہ وہ وہاں کی آزاد اور اخلاقی فیرو سے باہر نکلی ہوئی رنگین نفساؤں میں بیٹک جاتا۔ اس پر شہزاد گھر اور اپنے لٹنے زیادہ چاہتے والوں اور پیاروں سے دور چلا گیا تھا۔ تو وہاں کی اجنبی نفساؤں میں اپنی کوتاہیوں کا خیال گھبراہٹ سے ایک پچھاواں کی اس پر وقتا رہتا تھا۔ کچھ اور ملک سے باہر جانے کے بعد انسان کو اپنے گھر والوں کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ احساس کبھی کبھی خون کے آشور لانا ہے۔ ہر چند کہ اسفند بہت لا بالائی اور بے پروا فطرت کا حامل تھا۔ لیکن یہ احساس ایک پچھتاواں کہ ان کے دونوں اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ گو وہاں کے ماحول میں انسان کو بہت چست اور چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے کہ ہر کام حتیٰ کہ مزدوریات زندگی سے متعلق امور بھی وقت کی پیمائش میں مدد و کر کے انجام دیے جاتے ہیں۔ اصل میں بیرونی مالک کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ وہاں وقت کی قدر کی جاتی ہے۔

ہر شے زندگی میں ہر بات اور ہر معاملے میں وقت کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ گویا انسان وقت کو نہیں بلکہ وقت انسان کو گزارتا ہے۔

اپنے تعلیمی شاعری، تعلیمی سرگرمیوں اور ٹیوشن پر جانے سے اسفند کو اتنی فرصت ملتی ہی نہ تھی کہ وہ خالی الذہن ہو کر کچھ سوچ سکے۔ شام تک وہ اتنا تنگ جاتا تھا کہ کہیں بیٹے ہی زندہ آجائی تھی۔ مگر بیٹے کے بدینہ آئے تاکہ قلیل عرصے میں کبھی بیٹوں کی یاد آجائی تو خیالات کے سائے دھارے گھر کی طرف ہی بہتے لگتے تھے۔

بہر حال پورے چار برس کے بعد ڈاکٹریت کی ڈگری لینے کا علم کے سمندر کی گہرائیاں تپنے کی وجہ سے وہ زینت کے بقول انسان بن کر یا تبدیل کر نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ اس کے احساسات کی بیداری تھی جس نے اسے ایک دم تبدیل سا کر رکھا دیا تھا۔ اور شعیب منصور کی بات یا خیال کچھ غلط تھا کہ باہر کے ماحول نے اس کے اندر کا خود کو توڑ دیا ہے۔ اب وہ باپ سے بھی گھل کر بات کرتا تھا۔ ماں کے کٹے بھی پچھتاؤں تھا اور بہنوں سے بھی تنہا بول لیتا تھا۔ سلی بیگم اب کافی ضیق ہو گئی تھیں۔ اس پر وہ ان کے بقول انگلستان بھار گیا تھا۔ اس لیے گھر انہیں کاشٹے کو ڈوڑا تھا اور وہ اپنے بھائی کے یہاں چلی گئی تھیں۔ مگر اس نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ انہیں ان کے بھائی کے گھر سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اسے دلوں واپس آئے صرف تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ ناز پرور کی نسبت تو اس کے آگے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی اس کے آگے سے فوراً بعد ہی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی تھی۔ اور جسے زور شور سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ چانک ہی اس کے چند خاں ز دوست پاکستان کی سیاحت کی غرض سے آگے گواں کا پروگرام تو تجارت اور خیال وغیرہ تک جانے کا تھا مگر چونکہ وہ کراچی آئے تھے اس لیے وہ انہیں وادی کا گانا اور سوات وغیرہ کی میر کرانے کی غرض سے لے گیا تھا۔ اور پورے پندرہ روز گئے مٹے مٹے مٹے گئے ہوئے۔

اگلے روز سے شادی کی رسومات شروع ہونے والی تھیں اور اس کا کوئی پتلا اور نشان نہیں تھا۔ اور اسی بات پر زینت سخت چٹائی ہو رہی تھیں کہ گھر کی بڑی اولاد تھا۔ بڑا بھائی جس کی موجودگی نہ صرف بہت ضروری تھی بلکہ اصل میں تو اسے ہی بڑھ چڑھ کر بہن کی شادی میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ مگر اسے کسی بات کی کچھ پروا ہی نہ تھی۔ جب کہ سہیل منصور جنہوں نے شادی کے بعد کینڈا میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ شادی سے ایک ماہ قبل ہی اہل و عیال کو لائی آگئے تھے۔ انہوں نے بھی کینڈا میں ہی اپنی ایک جماعت پاکستانی لڑکی سے شادی کی تھی جس سے ان کی ایک بیٹی تھی جو نیلما کی عمر تھی۔

رات گیارہ بجے کا عمل تھا۔ بزرگ پارٹی اپنے اپنے کمرے میں ٹھہر چکے تھے۔ لیکن ناز پر ور کے کمرے میں اس نے تیر و نشینیوں اور گہا گہا کی وجہ سے دن کا سا سماں ہو رہا تھا کہ آج دوپہر سے ہی مہمان آئے شروع ہو گئے تھے اور ناز پر ور کی دونوں بہنوں نیلوفر اور نیلما سمیت چچا زاد اور ماموں زاد۔ خالزاد اور شیبہ منصور کی فرسٹ کزن کی لڑکی بھی موجود تھی اور سوط بھی ایک کونے میں رکھے پت پر بیٹھی تھی۔ سامنے قالین پر دو اس کے قریب کپڑے میں بندھی دو حوٹ اور ہارنوم بھی رکھا ہوا تھا۔ لوکیاں آہ میں باتیں کر رہی تھیں۔ تمام گفتگو ناز پر ور کی شادی کے بارے میں ہو رہی تھی۔ بوریٹ کے آثار تقریباً سب کے ہی چہروں سے ہوتا تھے کہ نیلما نے کسی کے سوال کے جواب میں بڑی ہینراری سے کہا۔

”ہاں، بتا نہیں رہی تو کیا سوچھی جو مایوں کی رسم کل پر ملتوی کر دی۔ درنا س وقت ہم کتنا ابھائے کہتے ہوئے۔“

”لیکن مایوں کی رسم پر ہی کیا موقوف ہے۔ گائے تو آج سے بھی شروع کیے جاسکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو سنا ہے کہ مہینہ بھر پہلے ہی درنا سے پر نوریت رکھ دی جاتی تھی۔ اور شادی کے گیت شروع کر دیتے۔“ ناز پر ور کی ماموں زاد عیر نے کہا جو ناز پر ور کی ہی عمر تھی۔

”ہاں واقعی، یہ تو خوشی کا موقع ہے کوئی ضروری تو نہیں کہ مایوں والے دن سے ہی گانا بجانا شروع کیا جاتا۔ سچ تو اگر پہلے سے آجائے تو کتنے ہی شادی کے گیت شروع کر دیتے۔“ شیبہ منصور کی فرسٹ کزن کی لڑکی یعنی ناز پر ور کی چھوٹی زاد و نشان بولی۔

یہ بھی ناز پر ور کی عمر ہی تھی۔

”تو پھر بس اندر آپ ابھی سے شروع کر دیجئے تاکہ اس پوریت سے کچھ تو بچا لے۔“ اسما بولی۔ جو ناز پر ور کی خالزاد تھی۔

”جی نہیں میں اس وقت گیارہ بج چکے ہیں۔ تمہارے شور شرابے سے بزرگ لوگ دھڑبھڑا رہے گئے۔“ ناز پر ور نے کہا۔

”اب اس دوسرے کچن روز کے لیے تو ان لوگوں کو برواشت ہی کرنا پڑے گا۔ ویسے ہی تو آپ کا بیدروم الگ تھا کہ ہے؟“

نیلوفر نے کہا۔

”اصل میں ناز پر ور کا کھانے کی ریسرل کرنا چاہتی ہیں۔ سچی تو نہیں کسی طرح میاں سے ملنا چاہا رہی ہیں۔“ حیرانہ س کر بولی۔

”نہیں خیر اسی تو کوئی بات نہیں۔“ ناز پر ور بھانک کر بولی۔

”گوریا یا اس طرح مل بیٹھنے کے مواقع — بار بار تو نہیں آتے کہ تقریباً ساری کزنز اکٹھی ہوں۔ ایسے میں حضورا بہت انجوائے تو کرنا چاہیے نا۔“ نیلما سب سے زیادہ بوریٹ مسموم کر رہی تھی۔

”ہاں اور مشکل تو یہ ہے کہ بہنیں یندی میں آ رہی ہنذا اگلا نہیں تو کم از کم کوئی اور شغل ہی ہونا چاہیے۔“ حیرانہ نیلما کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے کہا۔

”ارے ہاں واقعی کوئی دن ڈور گزیر ہی گھٹیل لیتے ہیں۔“ حیرانہ س نے نیلما نے اپنے بھائی روک کر کہا۔

”ان ڈور گیم، مگر کونسا، کارڈز، کیم — کرکٹ، اسکرینل — جو بھی کھیلوں اس میں اتنے سارے باشر تو شریک نہیں ہو سکیں گے۔ جتنے یہاں موجود ہیں۔“ نیلوفر نے نکتہ چینی کرنے کے سے انداز میں کہا۔

”تو پھر ہم ہی بنا دو کہ کونسا کیم نوز دن رسے کا جم سب کے لیے۔“ حیرانہ س ہٹ سے بولی۔

”کوئی نا چال شاہی۔“ درنشاں نے جوشی سے کہا تو سب کو ہنسی لگتی۔

”یہ کوئی نا چال کے بجائے اگر کوئی نا چال شاہی ہوتا تو کچھ بات بھی بنتی مسمومی اعتبار سے یعنی جلال شاہی کا کورا۔“ اسما ہنسنے کے بعد بولی۔

”یعنی اصل میں یہ کھیل تاریخی نوعیت رکھتا ہے۔“ نیلوفر کچھ سوچ کر بولی۔

”اچھا کیا واقعی!۔“ فیصلہ نے توجہ سے پوچھا۔ جو نیلوفر کی خالزاد تھی۔

”ہاں جی۔ پڑانے میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جہاں شاہ۔ مگر فطرت اور مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے نام کی ضد تھا۔

— اس نے اپنے فریادیوں کا مزہ بند کرنے کے لیے ایک ایسی سزا تجویز کی کہ کسی دوسری کسی بھانے فریادیوں کو جمع کرنا تھا اور ایک دائرے کی صورت میں کھڑا کر کے اپنے ہاتھوں کے ہاتھ میں شاہی کوڑے سے تینا تھا اور وہ شاہی فریادیوں کے چاروں طرف گھومتے رہتے تھے اور آواز بلند پوچھتے تھے کہ کیا کوئی شکایت ہے۔ اور جو فریادی بھی پٹ کر اپنی شکایات پیش کرتا تھا اسے کوڑے مارا کر اڑھ ٹوک دیتے تھے۔“

نیلوفر نے جس طرح سوج سوج کر کہ ساری حکایت بیان کی تھی۔ درنشاں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ گپ ہانک رہی ہے۔ اس پر ناہر نے بھی جواب دینے پر پہلی ہی گھٹنوں میں منڈ سے لڑکھائی سکرا ہٹ چھپائی۔

”جلو جلوب اتنی بڑی گپ نہ ہانکو کہ ایک معمولی سے کھیل کو ہینوریکل مینر پر بھی پیش کر دیا۔“ درنشاں نے جتانے والے انداز میں ہنس کر کہا۔

”ہاں ہاں واقعہ اور یہ معمول گھٹنوں کوڑے سے کسی کو مارا نہیں جاتا بلکہ جس کے پیچھے کوڑا رکھا جاتا ہے۔ وہ اللہ کر رکھنے والے کو مارتا ہے۔“ عیر نے بھی عقیدہ مار کر کہا۔ تو سب لوکیاں ہنسنے لگیں۔

”نہیں خیر کھیل تو یہ تاریخی نوعیت کا ہے مگر نیلوفر نے اسے سوچ بکا کر پیش کیا ہے۔“ ناز پر ور مسکرا کر بولی۔

”آف تو یہ کیا معمول بحث کے کر بیٹھ گئے آپ لوگ۔ بور کرنے کی حد ہوئی ہے۔“ نیلما بڑی ہنراری سے بولی۔

”اصل میں نیلوفر کی کھیلوں کوئی نمونہ گیم نہیں آیا ہو گا نا۔ اس لیے یہ قطعے کہا نہیں سنا ہے گگ گھٹن۔“ حیرانہ س نے انداز میں بولی۔

”اگرچہ اسے پوچھتی ہو تو میں میری مشورہ دونوں کی راب ہانک کر اس سے سوچاؤ کیونکہ لوگوں بھی گیارہ بج چکے ہیں۔“ ناز پر ور نے کہا۔

”جی ہاں بڑا سوچاؤ۔ سب سے زیادہ تو آپ ہی پور کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ درنا سے تو ہم روز میں مگر جگہ کے مواقع بار بار تو نہیں آتے نا۔“ بہن کے مشورے پر نیلما چمک کر بولی۔

”تو پھر سوچو کہ کونسا شغل اختیار کیا جائے یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر میٹھا بھی تو اچھا نہیں لگ رہا۔“ سہیل منصور کی بیٹی کو شرجی جاتی دیر سے خاموشی بھی سب کی باتیں سن رہی تھی فزع ہو کر بولی۔

”سوچ لیا۔ سوچ لیا۔“ نیلما نے فریادیوں کو پھوڑا سا اچھٹے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

”آکھ پھولی۔“ نیلوفر نے بتایا۔

”ارے ہاں ایسا بڑا مزہ آئے گا۔ بڑا ایسا۔“ نیلما بہن کی تجویز پر خوش ہو کر ناز پر ور سے بولی۔

”واقعہ تو نہیں چل گیا تھا۔“ جہاں میں اس وقت۔ تمہارے ساتھ آکھ پھولی کھیلوں گی۔“ ناز پر ور اسے اکھیں دکھائی ہوئی بولی۔

”کیوں آج کیا خاص یا غیر معمولی بات ہو گئی اپنا؟ آپ تو اکثر و بیشتر ہمارے ساتھ آکھ پھولی کھیلتی ہی رہی ہیں۔“ نیلما نے کہا۔

”ہاں اور ابھی تو آپ ہاں بھی نہیں مٹھیں کہ کمرے سے نکلنے پر پابندی عائد ہو۔“

”ندور و رنگ ان کے آئے کا احتمال ہی ہو سکتا ہے۔“ درنشاں نے حیرانہ کی بات میں گویا حاشیہ لگایا تو ایک بار پھر سب لوکیاں ہنسنے لگیں۔

”ہائے مکھیں نا اپنا اس غضب کی سوا انگریز چاندنی ہے۔“ نیلوفر جو اس اشنایں کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی کھڑکی کا پردہ سمیت گہرا سر ہو چکی کثیف داماں چاندنی پر ایک نظر ڈال کر ناز پر ور سے کہا۔

”او۔“ ہاں آج تو فل مون ہے نا۔ اس پر مسمومی عاشقانہ سا ہور ہے۔ بس اب جلدی سے مٹھ جائیں اپنا!“ نیلما نے بھی میٹھے میٹھے ایک کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اعلیٰ ٹاپیر ناز پر ور اپنا بھل سے تو آپ ہاں بیٹھ کر گوشہ نشین ہی نہیں پردہ نشین بھی ہو جائیں گی۔“ حیرانہ بھی نیلما کے اشارے پر اصرار کر رہی تھی۔

”ہاں اور اس کے بعد تو شاید کبھی ایسا موقع نصیب ہو بلکہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شادی کے بعد تو لوکیاں بالکل ہی بدل کر رہ جاتی ہیں۔“ حیرانہ بہن عیر ہوئی۔

”کیوں کیا شادی کے بعد لوکیوں کے سینک وینک نکل آتے ہیں؟ ناز پر ور نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں سینک وینک تو نہیں نکل آتے البتہ ایک بیزر سینکوں والا میڈھا ہر دم خدائی فو خدا کی طرح قابض ہو رہتا ہے۔“ درنشاں نے کہا تو ایک تہقہ پڑا۔

نوجوان اور گھینے کے انداز میں انا کر دہ بشل اپنی چوچ کو دبا سکی۔ بچی واقعی کچلے دشتی اور جنگلی سے تارگی گئی تھی کہ مذرف اس کے بال بٹ گئے تھے اور کنپشیاں پھوڑا ہو رہی تھیں۔ بلکہ آنکھوں میں برہنیں ہی میرے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے آگے ترسے سے ناپج گئے تھے۔ اس لیے وہ اس جنگلی سے انسان کی شکل بھی نہ دیکھ سکی تھی۔ لیکن مارے غصے کے اس کا حال ہاں ہو گیا تھا۔ وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکی۔

”تم جو کوئی بھی ہوتا تھا یا غیر مذہب اور جنگلی قسم کے انسان ہو۔ ایک دم وحشی جانور۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ تھا بچی انا نے کا۔“ اور شاید اس کا مخاطب بھی شیت تھا اور تھکے مزاج کا حامل تھا جو فطرت کی یہ جوت برداشت نہ کر سکا اور ڈنڈ پڑ کر بولا۔ ”جانور میں نہیں تم جو ہوا اپنے گٹے سے پھڑھانے والی ہجڑ کی طرح اتنی رات گئے یہاں کھڑی شور مچا رہی تھیں۔ دوسروں کے آرام میں فتنہ ڈالنا بھی کوئی شرافت ہے۔ یو ڈیم ایڈیٹ گنوار ہوگی۔“

”آف۔“ اپنی بے ہودگی اور زیادتی پر شرمندہ ہونے کے بجائے وہ اٹا اسے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ ”ڈیم ایڈیٹ“ کہہ رہا تھا۔ اس کا بی تو جاکر اس کے منہ پر ایسا ہاتھ مارے کہ اس کا پورا چوکا حلق ہی گھس جائے۔ مگر باہر بیٹا بچاں ہونے کے بعد دیکھ لیا تھا کہ وہ اس کے منہ میں زیادہ مضبوط اور طاقت ور ہے اور اس پر مضبوط اور وحشی بھی۔ اس لیے اس نے بڑی مشکل سے خود کو اسے چبھانے سے باز رکھا۔ مگر زبان کا وار کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

”اے یو ڈیم ایڈیٹ اور گنوار ہو گئے تم اور تمہارا باپ زیادہ میرے منہ لگے تو ایک ایسا تھپتھر رسید کروں گی کہ یہ تمہارا طبق سا چشتیاں پک کر رہ جائے گا۔ گھمے۔“ اور جواب میں وہ توجہ رخ آگے بگولاسی ہو گیا۔ کچلے کے بجائے دانت کچل کر اور ہاتھ کو کرانے کی پوزیشن میں اٹھا کر اس کی طرف بڑھا تو وہ ڈر کر سر پر ہر کر کہہ کر جو بھاگ کر تاندر آ کر ہی دم لیا۔ اندر جہاں ساری بوکیاں پہلے سے ہی مسکین کی موتیں بنائے، اس کے انتظار میں تھیں۔ اس آواز سے کھرا لہو تھیں جو ابھی اچھا لنگ ہی اس جنگلی کی شکل میں اس پر ٹوٹ پڑی تھی مگر وہ اپنے طور پر پڑی تھی کہ کسی وجہ سے وہ سب اتنی خاموش بیٹھی ہیں۔ اس پر کچھ زیادہ یہ گہرا طاری ہو گئی اور وہ ان سب سے اپنے آنسو چھپاتی پٹنے۔ ہانسی کرے میں چلی آئی۔

اپنی اتنی ذلت و خوار پر مارے غصے اور کسب بٹ کے اس کی آنکھوں میں بدلیاں سی اٹھنے پر بڑی تھیں جو اپنے ہانسی کرے میں آتے ہی ہانسی کی تیز ہوجاؤ کی طرح ایک دم ہی رستے لگی تھیں۔ اصل میں غصہ تو اسے ان لوگوں پر تھا جو اس کے خیال میں جان کر سے تنہا ہر چھوڑ آئی تھیں یا دوسرے معنوں میں انہوں نے دانستہ اس جانور نما انسان کے ہاتھوں اسے ذلیل کر لیا تھا۔ مگر خود وہ کون تھا؟

یہی کوئی بڑا یا بڑا بڑا کافر کا حضرت تو ہرگز نہیں تھا۔

بلکہ بظاہر تو بہت ہی اچھی شکل کا تھا۔

قد و قامت اور تن و قوت کے لحاظ سے بھی بہت مقبول اور مکمل تھا۔

مگر فطرت بہت بد اخلاق اور اُجڑ سا۔ ایک دم مریختے تیل کی خاصیت کا لگ رہا تھا۔

تبھی تو میرے منہ توڑ جواب پر کیسے آنکھیں نکال کر اور دانت کچا کر کھڑے رہا تھا اور۔ ”آف۔ اگر میں سر پر رکھ کر نہ بھی گئی تو

زمعلوم وہ میرا کیا حشر کرتا۔

جب کہ اس کے جنگلی پن سے تھی اتانے پر میری پشانی اور سر دکھ رہا ہے۔

آنکھوں اور کنپٹیوں پر بھی جلن سی ہو رہی ہے۔

غیر میں نے اس کی اس بد اخلاق پر اسے ایسے بے نقطہ ستائی ہے کہ اس کے بھی دانت ہی کھٹے ہو گئے ہوں گے۔ اپنے ہانسی کرے میں آکر کھڑو

مک آنسو ہانے کے بعد وہ آنسو پونچھ پونچھ کر بھی سوچ رہی اور یہ سب سوچتے ہوئے نیند کی دلدلی میں قدم رکھنے تک اس کے دماغ میں یہی ایک سوال گردش کر رہا کہ آخر وہ کون تھا؟ جس انداز میں بات کر رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ گھر کی کا کوئی فرد ہے۔ مگر گھر کے افراد سے تو وہ بخوبی واقف تھی۔ دوسیاں ہوئی، قریبی میاں اور ایک بیٹا۔ مگر بیٹا تو اپنے دوستوں کے ساتھ دایک خان کی یہ کر گیا تھا ہوا تھا جسے تو بیاں کی رسم اٹھنے پر دھڑکتی کر دی تھی غمی۔ پھر یہ کون تھا؟ اتنا بد نظیر، منہ بیٹھ اور دوندہ صفت۔

اگلے روز بھی یہی سوال اس کے تجسس میں اضافہ کرتا رہا۔ جی چاہا کسی سے پوچھ جی لے مگر بھلا کیا بتا کر چھٹی۔ یوں بھی شیب منصور کی بیٹیوں بیت تقریباً سبھی لوگوں کی غیر اور اچھی تھیں اور اس لیے اس سے منافی نہ تھی۔ ایک ذرا بھلا کا روٹی یہ دوستانہ سا تھا۔

مگر وہ بھی سب ایک لٹ (حد) میں رہ کر بات کرتی تھی۔ مطلقہ خود بھی بہت خود دار اور بڑبڑا رہی اور جلد ہی کسی سے بے تکلف ہونے کی عادی نہ ہوتی اس لیے اس نے اس سوال کو ہی ذہن سے نکال پھینکا تھا۔ کریوں بھی گذشتہ روز ہی یہ ملے کر لیا گیا تھا کہ اسفند خواہ۔ آئے باز آئے ناز پر

کو اگلے روز بیاں بٹھا دیا جائے گا کیونکہ زینت بیٹے کی غیر حاضری سے نہیں بلکہ خود بیٹے سے بڑی چھٹا نظر آتی تھیں اور یہ فیصلہ مہوش ہی کیا تھا۔ اس روز زینت نے صبح ہی صبح ان مہمانوں کو ناز پر ور کو باؤں بٹھانے کی اطلاع دے دی تھی جو باؤں کی رسمیں مدعو کیے گئے تھے اور بیاں تو باؤں کے سلسلے میں تیار کی جانے والی تمام اشیاء پہلے سے ہی تیار کر لی تھیں یعنی کھٹوے، تازہ چوکی اور چپتر۔ تازہ پرور کے کپڑے۔ اور ہر جگہ جملہ لوازمات جو سب کے سب پہلے رنگ کے تھے۔ حتیٰ کہ چپتر۔ کھٹوے کے پائے اور باؤں پر لگی بیاں جن پر چپتر لگا با گیا تھا اور کھٹوے میں بھی سونے کی ایک پلے رنگ کی تھی۔ بیٹوں پر بڑی خوبصورتی سے لگا تھی کرن اور بٹھا بیٹھا گیا تھا۔ تازہ خواتین نے بھی پہلے رنگ کے بلبوسات زیب تن کیے تھے یعنی پہلے رنگ کی کاٹھارا ساڑھیوں کے ساتھ ہلکا ہلکا طلائی زیور اور ہاتھوں کا لون میں جنسیلے کے گورے پہنے تھے۔ حتیٰ کہ جوڑوں میں بھی چینیلے کے گورے لگائے تھے اور دیکھوں نے بھی ہلکے طلائی زیورات کے ساتھ پہلے رنگ کے کمرے دوپٹے پہنے تھے اور ان کے ساتھ پھولوں گئے جو عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ ماسوا اسلوٹ کے جس کے پاس پہلے رنگ کا کوئی لباس تھا نہ اس سے کہا ہی گیا تھا کہ وہ پہلے رنگ کا لباس پہنے ورنہ وہ رنگو ای ہی تھی۔

یوں بھی زینت کا دل اس سے بہت مغایر انداز پر ایسا بھلا تھا۔ تازہ پرور اور زیور فرماں مایا جیسی ذہنیت اور مزاج رکھتی تھیں اس لیے اس سے سیدھے منبات نہ کرتی تھیں۔ اور پھر اسے آئے دن ہی کہتے تھے۔ ”کل پانچ روز۔“ اور آئی بھی ایسے موقع پر تھی کہ سب شادی کی گہا گہمی میں مصروف تھے۔ کچھ اس لیے بھی اسے کسی کی طبیعت اور مزاج کا اتنا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ایک کے لیے دوسرے کی نگاہوں میں جو مدت اور اپنا پانچ سا ہوتا ہے اسے تو ایک ہی طرح محسوس کر لیتا ہے۔ اس نے آسانی رنگ کا لباس زیب تن کیا تھا جس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔ اور چیل پہل اور گہا گہمی کے ساتھ ساتھ مصروفیت بھی تو اتنی تھی کہ صبح سے کسی کو سر اٹھانے کی ہمت نہیں کی تھی۔

زینت نے ہما ہمارا بھی کچھ زیادہ ہی کر لی تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کا پہلا خوشی کا کار ہے اور دل کے سارے تونیں آدھے آدھے بدامان تکانا جاتی ہیں۔ سلوٹ کو کسی نے مجبور تونیں کیا تھا کہ وہ بھی گھر کے کاموں میں برابر کا حصہ لے۔ پھر بھی وہ اخلاق اور وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اور کچھ اس لیے بھی کہ دھیمیا نے کی بات تھی کہ کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

پھر وگرام کے مطابق پھر مغرب ناز پرور کو باؤں بٹھایا جانے والا تھا۔ اور اس سے شام پانچاں سے پہلے بھلائی دھیرے دھیرے نیچے اتر ہی تھی جس کے ساتھ ساتھ رتی رتی فتنوں، خانوہوں اور شوب لائٹس کے جل اٹھنے کی وجہ سے گھر کے گوشے گوشے میں روشنیوں کا ایک سیلاب سا ماحول آیا تھا۔ یوں تو ہر ہانسی کرے پہلے منزل میں ہی تھے کیونکہ بالائی منزل پر صرف دو کمرے ہی تعمیر کیے گئے تھے۔ جو عام دلوں میں زیادہ تر بند رہتے تھے اور اگر استعمال میں بھی لائے جاتے تھے تو خاص خاص وقتوں پر۔ اور اب بھی شادی کے موقع پر چونکہ نیچے مہمان ہی مہمان بھرے ہوئے تھے اس لیے فرشتہ گردوں کو جھار پونچھ کر ان میں سے ایک میں ناز پرور کے چہرہ کا کلیک کا سامان مٹنی فرج۔ ٹی وی۔ لے سی۔ واشنگ مشین۔ سونگ مشین۔ مسکر گرائینڈر، آٹا گوندھنے اور قہیر بنانے کی مشین۔ چمڑے۔ اسٹری بعد اسٹینڈر۔ الیکٹرک کیشل اور کوئنگ رینگ وغیرہ رکھوا دیے گئے تھے اور دھڑ میں یہ وہ جات اور کھانے کی بہت سی دیگر اشیاء کے ساتھ مہندی، تیل وغیرہ۔ نیچے تک میں اتنی گنجائش نہیں رہی تھی کہ کمروں سے بیٹھ کر کوئی کام کیا جاسکتا۔ اس لیے زینت کی بڑی مایوس زینت گھر کی پرانی ملازموں کو لے کر گلی اور اٹھنا گندھوا لے اور چلی آئی تھیں انہوں نے سات سات گھنٹوں کا ہاتھ لگا کر جو کر کے اپنے اپنے پڑھنوں کی قیمتی بویاں تھیں گھر کی دونوں پرانی شادی شدہ خادموں سے اٹھنا گندھوا لیا تھا جس میں چند خوشبودار سائوں اور کھلی کی آبریزش تھی اور جسے خاص پینیلی کے تیل سے گوندھا گیا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک ادھر ہی کام میں مصروف تھیں سلوٹ کے سپرد مہمانوں کی چائے پانی کا انتظام تھا اور وہ اس سے کہہ کر کوئی تھیں کہ مٹی پر سے لیے ایک بیانی چائے اور بھجوا دینا۔ سلوٹ کام میں اتنی مصروف تھی کہ اسے کچھ باڈی نہ رہا۔ بس شام کو ہی خیال آیا تو وہ جلدی جلدی ٹپے جا کر۔ ”پتی۔ زینت بڑی خوش خلق اور خوش مزاج تھیں اور سلوٹ سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں۔ انہوں نے اتنے اہتمام سے چائے لائے پر اسے بڑی اچھی اچھی دعاؤں سے نوازنے کے بعد کہا۔

”لینا بیٹی، ذرا یہ آٹھن کے طشت تم ہی نیچے لے جاؤ۔ یہ لوگ تو گائے اور فلفل باتوں میں رات ہی کر دیں گے اور ہاں۔ زینت سے کہنا کہ رسم شروع کر دیں۔ میں بھی لوگ مٹھل کر کے آئی ہوں۔“ اور وہ لے جانا تو نہیں چاہ رہی تھی لیکن اخلاق و مروت میں انکار نہ کر سکی۔ اور چپ چاپ دونوں نشیمن طشت اٹھانے لگی تو زینت نے پھر کہا۔

”یہ دونوں طشت آماں جان دھمکے لگے کہ دوسے دن تا زینت تو اس وقت مہمانوں میں مصروف ہوں گی۔ یوں بھی انہیں کہیں نہیں کہاں آتی ہیں؟“

”جی اچھا۔“ اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ زینت کو ریڈر کے آخری سرے پر تھا جو نیچے ہال سے طہی باہر داری نما کمرے میں مڑتا تھا کو ریڈر سے لے کر میز چھوٹے تک سرخ قابیل بٹھا تھا اور نیچے اس کمرے میں بیٹھ کر آف واپس قابیل کا فرش تھا۔ زینت پر پڑے دونوں

سب یہی سمجھ رہے تھے۔ وہی سب جو اس کی فطرت اور مزاج سے واقف تھے کہ چونکہ اپنی اس دوگت پر اس کا موڈ آف ہو چکا ہے اس لیے وہ مایوں کی رسم میں شرکت نہیں کرے گا۔ زینت کو ملال ہی تھی تھا کہ اس کا کرم کھرسلک کا نیا اور حقیقی شلوار سوٹ جو اس نے خاص طور پر مایوں کی رسم پر پہننے کی غرض سے سلوا یا تھا اُسے بنے بس تہ بہت ہو گیا تھا۔ وہ بچہ جو اب جانتی تھی کہ اب وہ باس تو ضرور تبدیل کرے گا لیکن تیار ہو کر یا تو کہیں گھومنے پھرنے نکل جائے گا یا پھر کمرے میں بند ہو کر بیٹھ رہے گا۔ اس لیے وہ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ بجاؤ جلدی سے لباس تبدیل کر کے آج اس کا مایوں کی رسم ادا کی جائے کیونکہ مایوں کی رسم میں باپ بھائی، چچا، ماسوں وغیرہ کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی کہ کچھ عین دین کا معاملہ بھی ہوتا تھا اس لیے انہوں نے اس سے سن آتا ہی کہا۔

”آف تمبارے سوٹ کا تو بالکل ہی ستیا ناس ہو گیا۔ جاؤ یا کم از کم انہیں تبدیل تو کر لو“
 ”میش فوراً ملے گی۔ ستیا ناس تو ہونا ہی تھا۔ آخر آٹنا کیلئے میں ہی تو داغ دھتے پڑی جاؤں گا۔ سب پہلے سے ہی پڑ گئے ہیں۔ خیر اب تو میں ذرا اوپر جا رہا ہوں تاکہ غلامی کا تھوڑا سا تھکاؤ ہٹا دوں۔ لیتے آؤں گا کہ رسم کی تیاری کیجیے۔“

یہ اسفندیا بکھر رہا تھا اتنی صلاحیت اور انسانیت سے۔
 شاید زندگی میں پہلی بار ان کی توقع کے خلاف اس نے اتنی حقولیت برتی تھی۔
 انہیں اپنی ساعت پر تعین نہیں آ رہا تھا۔
 کچھ دیر وہ نہ کھو لے تو عجب سے دیکھتی رہیں۔
 مگر کچھ اسے اوپر کارخ کرتے دیکھ کر ستر سے جموئے دل کے ساتھ عاشقانہ نگاہ اور عفت سمیت دوسری خواتین کے ساتھ ناز و نوروں کے کمرے میں چلی آئیں۔ لڑکیاں جو بڑی دیر سے ہنگام گیت گارہی تھیں ان کے آنے کی غرض سے دعا و غایت جان کر انہوں نے مایوں کا گیت شروع کر دیا۔

پہلا جوڑا پہن کے
 تیل اٹھن لگا کے

ریشم کی بیج سجھا کے
 سترے چتر تیلے

نادو مایوں بیٹھے گی
 بنو مایوں بیٹھے گی

چاند مکھڑا چٹھا کے
 بھینگا پلکین جھکا کے

بتے کے خواب سجھا کے
 خوب بچا شرم کا

نازو مایوں بیٹھے گی
 گوری مایوں بیٹھے گی

”ارے یہ کیا ناؤ! اچھوڑو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ معلوم بھی ہے بابا خواتین نے آکر اسے ہیں میں زینت نے بہت فخر یہ لڑکیوں کو بتایا۔“
 ”بائیں کیا دھمکی! اسفندیا بھائی! اپنا لے کر آئے ہیں بھو بھو جان؟“ سمیرا نے جو ڈھولک بجا رہی تھی ہاتھ روک کر نہایت بے تعلقی سے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں سہنی تو سہنی۔ بھلا میں غلط بیانی سے کام کیوں لینے گی؟“ زینت کی خوشی جیسے نہیں چھپ رہی تھی۔

”اوہ، دیٹ ازان کریں! دیہ قابل تعین ہے! نیلوفر نے حسب عادت انگلیں جھاڑی۔
 ”ہاں اگر بیج پوچھو تو اب سے کچھ دیر پہلے مجھے تعین نہیں آیا تھا۔ مگر آج تو بااثر نکال ہی کر دیا۔“ زینت بولیں۔
 ”اچھا! کیا کوئی خاص بات ہوئی تھی؟“ نیلوفر نے پوچھا۔

خاص بات کیا اصل میں ان کے کپڑوں پر ابٹنا کر گیا تھا۔ وہی نیا شلوار سوٹ جو سلوا یا تھا اس پر۔ اور میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب موز اتنا خوب ہو گا کہ وہ رسم میں شریک ہی نہ ہوں گے۔ مگر وہ تو خوشی خوشی اپنا لینے چل دیے اوپر اور مجھے تیار رہنے کا کہہ کر یہاں صبح دیا۔
 زینت نے مختصر انصاف بتائی۔

”میکان خاندانی تیاری تو ساری مکمل ہی ہے پھر آپ کس تیاری کی بات کر رہی ہیں؟“ درخشاں نے پوچھا۔
 ”جی۔ اس وقت تو صرف انتظار کا کام درخشاں سے ہے۔ وہ نہ تیار تو ہو چکا ہے۔“ فیصلہ نے ہنس کر کہا تو زینت بھی ہنس کر بولیں۔

”بس اب ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ غیر سے بابا کسی دم آتے ہی ہوں گے۔“

ہند پر دو گھر کا بہت بڑا تو نہیں مگر خاصا کشادہ تھا۔ داخلی دروازہ کمرے کی دیوار کے نیچے بیچ تھا اور دروازے کے مقابل کی دیوار میں کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن پر لگائی شیشے کے پھول پر دس پے پے ہوتے تھے۔ دائیں طرف دائیں ہی کونے میں کمرے سے ملنے والی چھوٹی عسائی تھا اور دائیں ہی طرف کھڑکیوں کے آگے اس کا بیڈ پڑا تھا۔ بیڈ کے پائنتی دروازے کے قریب ہی چھتر لگ کھڑے تھا جو کئی رکھی تھی اور ستر سے تھوڑے فاصلے پر کھڑکیوں کے آگے اور دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے پر صوفے رکھے تھے۔ بائیں سمت بیڈ کے عین مقابل میں اور کمرے کے دوسرے سرے پر ایک دیوان پڑا تھا اور بائیں طرف بھی دیوار کے ساتھ دروازے سے تک صوفے رکھے تھے۔ فرش پر کھینچے ہوئے گلابی رنگ کا قالین بچھا تھا۔ بڑی عسائی کی خواتین صوفوں اور دیوان پر بیٹھی تھیں جن میں گاؤں کیلئے سے ایک لگا لگا سلی کیلک بھی ایک لطافت سے ممکن تھیں اور نیچے قالین پر۔ تو شاید شہر لوگیاں اور عورتیں بھری ہوئی تھیں اور آدھے کمرے میں ناز پرورگی نہیں، کم از کم اور سیلیاں بیٹھی تھیں۔ گویا کمرے میں اس وقت کل دھڑلے کو جگہ تھی۔ جی کہ ناز پرور کے بیڈ پر بھی اس کے ساتھ بہت سی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور وہیں ایک طرف ایک تپائی پر پھولوں کے دولے رکھے تھے۔ زینت اپنی دروازہ صحتی سنبھالتی اور سب کے درمیان میں سے اپنی جگہ بناتی آگے بڑھیں تو ان کی نظر سب سے پہلے پھولوں کے دولوں پر ہی پڑی۔ انہوں نے جھک کر دولوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

”ارے یہ پھول کس مصرف کے لیے لگائے ہیں۔ کیوں چھو جانیوں کی رسم میں دھن کو پھول تو نہیں پٹاتے جاتے نا؟“

”نہیں۔ مایوں بھالے سے پہلے تو زیور تک اتار لیا جاتا ہے۔ مٹھر اور پھول تو دور کی بات اور اوپر تو ریشم کا استعمال ہونے لگے۔“
 وہ ہمارے زمانے میں تو پرانے سوئی پڑے رنگارنگ کر دھن کو پہناتے جاتے تھے۔ کیونکہ انہیں کارنگ دھوئے نہیں اترتا۔“ شیبہ منصوری بچی کشو جہاں نے کہا۔

”لے آج کل کا تو عین ہی کچھ اور ہو گیا ہے کہ لڑکیوں کو بس ایک دروازہ ہی مایوں بٹھایا جاتا ہے۔ وہ بھی بس رسم پوری کرنے کو۔ درنہ ہمارے زمانے میں تو لڑکی کو شادی سے ایک ماہ پہلے مایوں بٹھایا جاتا تھا۔ دو زار دن میں کئی کئی بار کھلی اٹھن کی ماش ہوتی تھی اور ایسے مرض کھانے کھلانے جاتے تھے کہ شادی کے دن لڑکی کے چہرے پر ایسا خوراک تھا کہ کمری پوڈر لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ایک اور عرہ زورہ بولیں جو کشو جہاں کی ہم عمر تھیں۔

”افوہ! اونٹنی۔ پھر تو بغیر میک اپ کے دلہن بے چاری بیمار ہی لگتی ہوگی۔“ ناز پرور کی سہیلی نے لڑکاؤ سامنے بنا کر آہستہ سے کہا۔

”بھئی! اگلے وقتوں کے میں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔“ درخشاں بولی۔ زینت ابھی تک پھولوں کی طرف ہی متوجہ تھیں۔

”مہی یہ پھول تو آپ کی یہ چاروں مہمنیں لائی ہیں۔ شاید یہ ان کے یہاں کوئی رسم ہوگی۔“ نیلوفر نے ان کی توجہ دہلایا کہ یہاں کی طرف دلائی جو بیڈ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

”اسے آپ کب نہیں۔“ مجھے تو خیر تک نہ ہوئی۔“ زینت ان کی طرف بڑھتی ہوئی بولیں۔

”بس آہی گئے چیک سے آتی۔ اور یہ پھول تو می نے آپ کو بھیجے ہیں۔“ ان چاروں لڑکیوں میں سے ایک نے جو دہلایا کہ یہاں کی رسم ہے بڑی تھی، انہیں سلام کرنے کے بعد کہا۔

”اوہ۔ بے حد شکر ہے۔ پھر تو میں یہ ضرور پہنوں گی۔ میری بہن نے اتنی محبت سے جو بھیجے ہیں۔“ زینت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں۔
 ”بھلا مایوں کی رسم میں لوگے والوں کا کیا کام۔ مایوں کی رسم تو بہت گھریلو قسم کی ہوتی ہے جس میں سب اپنے ہی اپنے شریک ہوتے ہیں۔ لے کہیں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس رسم میں پرانے گھر کے لوگ بھی شریک ہوں۔ لے زینت! ہم کے تو گھر کی بات ہی زانی ہے۔“ رشتے داروں میں سے کسی صاحب نے ناک بھون پڑھا کہ لڑکی تو زینت نے شرمندہ ہو کر جلدی سے بات بنائی۔

”بھئی یہ چاروں بچیاں کوئی خیر تو نہیں۔“ اپنی نیلوفر کی سہیلیاں اور ستر سے بڑھ کر ہمارے بیٹے اور موش کی بہنیں ہیں۔ یہ تو اگر بھی آئیں تو بڑی ہی نہیں ملو لیتے۔“ پھر انہوں نے لڑکیوں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔

”ایسی مٹھلوں میں ہر طرح کے گلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بچوں تم کچھ خیال نہ کرنا تو احمد موش کی وہی بہن تانید! ہنس کر بولی۔
 ”اوہ نہیں! تم تو آپ کو اپنا ہی سمجھ کر آئے ہیں۔ آخر یہ ہماری بھائی کا ہی تو گھر ہے۔ نا۔ پھر بھلا ہم کیوں مانڈ کرنے لگے! ایسی مٹھلوں باتوں کو۔“
 مگر باقی مٹھلوں لڑکیاں من بھلا سے ہی بیٹھی رہیں۔ اور زینت ان کے آگے بھی جارہی تھیں۔ ان کی خاطر تو مٹھلوں کے کارہی کی رسم تھیں کہ ابھی اسفندیا دروڑوں ہاتھوں پر بیٹھے طشت اٹھا لے اپنے تین چادر کزن کے ساتھ اندر آ گیا۔ لڑکیاں جو عید اور ارسا کی زبانی اس کی درگت کا قصہ سن چکی تھیں اس کے کپڑے اور صورت دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ اپنے اوپر لڑکیوں کو بہت سا دیکھ کر وہ کچھ خفیف سا ہو گیا تھا۔ اصر اور دیکھ کر بولا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے میں نے کسی ٹوٹو پیٹ یا منجھ کے رید کا آخر تو نہیں دیا جو آپ سب مسلسل دانوں کی نالاش کر رہی ہیں؟“ اور اس کی بات پر ہنسنے کے بجائے لوگ ان کے چہرے پر گہری گہری نظر آئی۔

”اچھی رہتے نہیں دیں۔ آخر آپ کیا دیں گے۔ آپ تو خود اس وقت ایٹلٹس پیٹ کی کسی لوگس کمپنی کا اشتہار لگ رہے ہیں۔ ناز پر وہی ایک اور پہلی بولی تو لوگوں نے شاید اپنی جھینپ ٹائے کو ایک تھقبہ لگایا۔ مگر وہ بھی ایک کا لیاں تھا۔ کان پر ہاتھ دھک کر بولا۔

”ذرا زور سے کہتے مجھے آپ کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔“

”ہونہر۔ اب بات نہیں بنی تو یہ کہہ دیا۔“ وہی لوگ ناک چڑھا کر بولی۔

”آپ کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اپنے کی ناز میں وہی لگا کر آئے ہوں۔ تاہم بھی منہ نہ کر بولی۔

”جی، آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔“ وہ جواب میں بولا تو زینت سمیت ساری خواتین جو ان کی آئیں کی جھیر جھارے محفوظ ہو رہی تھیں، ہنسنے لگیں۔ زینت بیٹھ کر اٹھتے تھے تو نہیں دیکھ کر کھلی پڑی تھیں۔ انہوں نے اس کا تعارف تانیہ وغیرہ سے کر لیا۔

”احمد روش کی بہن تانیہ ہیں اور میرا بھائی ہے۔“ وہی نے جواب دیا۔

”یہ ہماری فرسٹ کزنز زینت اور نکیت ہیں۔ تب اس نے گردن کا تھوڑا سا ان کی طرف موڑ کر سر کو ہلکے سے خم کیا اور دیکھ کر پھر لیا۔

ماں۔۔۔ دونوں بہنیں۔۔۔ خالہ۔۔۔ جی اور مانی وغیرہ نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا اور اس کی ایک ایک بات پر ان کی نظر تھی۔۔۔ اشتر۔۔۔ ندیم

زیر اور بعد میں اس کے دو سرے کزنز بھی اس کے قریب ہی کھڑے تھے مگر تقریباً ساری لوگ ان اور خواتین اسی کی طرف متوجہ تھیں یا دوسرے جنوں

میں اسے اس کی اہمیت کا احساس دلانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایک بہت بڑا وصف یہی تھا کہ نیکر یا گھنٹا اس میں نام کو

دکھاتا۔ نہ وہ اتنا تڑپا تھا۔ یوں بھی کسی ایسی بزم میں شریک ہونے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا اور اتنی ساری خواتین کے درمیان وہ تھوڑا

تھوڑا زور بھی ہو رہا تھا۔ بار بار جیسے پلٹ کر دو دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زینت بھی جھینپ کر وہ اتنی بھیر سے گھبرا رہا ہے۔ انہوں نے

زینت سے کہا۔

”چلو اب کسی طرح بسم اللہ بھی کر لیں۔ آخر انتظار کس بات کا ہے۔“

”جی، ظاہر ہے ہماری ہوگا۔ ہمارے آئے بغیر پہلا ہی بسم اللہ کب تکتی ہیں۔“ شعیب منصور نے جوابی وقت کمرے میں داخل ہوئے سالن کی

بات کا جواب دیا تو زینت خوش ہو کر بولی۔

”ارے ہاں ہاں، چشم ماروش دل ماشد۔ آئیے آئیے آپ کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا جانی صاحب۔“ وہ چھوٹے پہنوں کی کجانی

صاحب ہی کوئی تھیں۔

”پہلے کچھ بھی نہیں ہو سکتا کی وضاحت کر دیں آپا بھیر۔ آگے دھکیں گے۔“ شعیب منصور جہاں تک آئے تھے وہیں رک کر شوخ سی

معنی فیزی کے ساتھ بولے تو سب ہنسنے لگے اور زینت تو ہنسنے سے روکتی نہ رہی۔

”اے جانیں۔۔۔ بڑے بیوہ ہیں آپ۔ ذرا بھی تو شرم نہیں آتی یا زینت بری طرح جھینپ کر تدریس ننگی سے بولیں اور جواب میں شریعہ منصور

کوئی اور شوخ سا فقرہ اچھا لانا چاہ رہے تھے کہ زینت اشارے سے انہیں منع کرتی ہوئی بولیں۔

”آئیے، ادھر آجائے شعیب۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی تو شعیب منصور قالمیں پر بیٹھی ہوئی خواتین کے درمیان میں سے اپنا

راستہ بناتے ہوئے ان کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ زینت نے ان کے قریب آتے ہی سب سے پہلے اہمت سے انہیں بتایا کہ وہ لہا کی بہن بھی

آئی ہوئی ہیں۔ ذرا سوچ بھکر بات کریں۔

”مگر جوں کو ادا کرتی تھی۔ اس لیے لوگ ان پر ڈھولک سمیٹا کر رہ گئے۔“

”ذرا تھوڑے کیوں۔ پہلے سورہ اخلاص کی تلاوت ہو جائے پھر کا نام شروع کرنا۔“ سلمیٰ بیگم نے دیوان پر بیٹھی بیٹھے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

”اچھا تو پھر آئیے۔ آپ ہی سورہ اخلاص پڑھ دیجیے۔“ زینت سلمیٰ بیگم سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”بہنیں اب میں کیا پڑھوں گی۔ یہ اپنا بھائی پڑھ دے گا۔“ سلمیٰ بیگم نے کہا اور پھر اسفند سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”چلو بیٹے۔ تم میں مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر بہن کی پیشانی پر دم کر دو مگر پہلے تین مرتبہ درود شریف پڑھ لینا تو وہ جو ناز پر دم کے بیڑ پر

پاؤں کے ساتھ ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ اس نے چونک کر رادوی کی طرف دیکھا۔

”میں پڑھ رہی ہوں اماں جان۔“ اچھا ٹھیک ہے اور پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے جا کھڑا ہوا۔ تو زینت اس خیال

سے کہ کہیں وہ غلط سلطہ نہ پڑھ دے یا اس سے کوئی سوچ نہ پڑ جائے اور اس کا مذاق بنے گھر اسی اٹھیں۔ یوں بھی تقریباً سب ہی کے چہرہ پر

مسکراہٹ دوڑ گئی تھی بلکہ ان کی آنکھیں ہنس ہنس کر اس میں کھسک رہی تھیں۔ وادی کے کہنے پر وہ چونک کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اس

لیے وہ اسے زینت سے باز نہ رکھ سکتی تھیں۔ ان کا دل ابھی دھک دھک ہی کر رہا تھا کہ تبھی اس نے باقاعدہ قرأت کے ساتھ اعلان کیا اور

بسم اللہ کے بعد میں مرتبہ درود پڑھنے کے بعد تین بار ہی سورہ اخلاص کی تلاوت کی تو ساری محفل کو جیسے سانپ موگیا۔ گہرا غصہ سب ہی کی

آنکھوں میں جھرتا ہو کر آئی اور جوں ہی وہ تلاوت کے بعد بہن کی پیشانی پر جھونک مارا۔ دروازے کے بالوں کو چوم کر پیچھے ہٹ کر زینت پڑھ کر

چٹ چٹ اس کی پیشانی پر ہونے لگا۔

”ارے ماشا اللہ جیڑہ بد دور۔ ہزار ہی ہو تو ہماری تم تو جیسے رستم ہی بن گئے۔“ کسی خوبصورت آواز میں سورہ اخلاص پڑھی جاتے۔

”مگر اس کا سا انگریڈ آماں جان کو ہی جاتا ہے کیونکہ یہ سب ان کی اعلیٰ تربیت اور فیض صحبت کا ہی نتیجہ ہے۔“ شعیب منصور

نے ستائشی انداز میں کہا۔

”ہاں واقعی۔ آماں جان نے تو رادوی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہی ہوگی۔“ سہیل منصور کی بیوی نازش بولیں

جو سوتیلی ماں کو بہت غریب لگتی تھیں۔

”اے کیوں مجھے انہوں میں گھسنے ہو چکی۔ یہ تو میرا مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو سب سے پہلے دینی اور مذہبی تعلیم دے۔ بسو میں نے

سب سے پہلے اپنے کلمے کا کلمہ بھی پڑھا ہوا تھا اور یہ کوئی ایسی خاص یا انوکھی بات تو نہیں۔“ سلمیٰ بیگم انتہائی انکساری سے کام لے کر بولیں

زینت جو شرم اور درودانی کے مسائل کی تعریف کر رہے تھے۔ زینت کی بیوی اور ماں ہو کر اپنے فرض پورے نہ کر رہے تھے۔ انہوں نے

اعدا و طلب نظروں سے زینت کی طرف دیکھا تو زینت بات کا رخ موڑتی ہوئی بولیں۔

”بھئی، تم بھول رہے ہو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کا نام لے کر جو کام بھی شروع کیا جاتا ہے اس میں ضرور برکت ہی نہیں بڑی کامیابی بھی

ہوتی ہے۔ خیر اب تم کسی طرح بیٹھی کرو یا یوں تو بھٹاؤ زینت۔“

”ہاں ہاں، اتنی دیر سے یہ ہے چارے مگر دھکیں گے تو کھڑے ہیں۔ آئیے آماں جان، آپ کم از کم پوتی کو سند پڑھاؤ دیں۔ رسم بھی

آپ ہی ادا کر دیجیے گا۔“ زینت نے شوہر کے سامنے ساس کی اہمیت بتاتے ہوئے ان سے کہا۔

”اے فرج ہو۔۔۔ مجھ بیوہ کا اس وقت بھلا کیا کام۔“ پہلے سات مہمانوں کو کھڑا کر لو اور کٹھنوں کی چھوٹی ہوش آواز سے رسم کی

ابتداء کر دی۔ سرے سرے میں بیٹھے ماں کی بیٹی۔“

روضہ آرا بھی جو ساس کی بات پر اٹھنے لگی تھی سلمیٰ بیگم کی بات پر شرم سے پوچھنے لگی۔ کٹھنوں نے پھر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اے اب اٹھ بھی چلو۔“ وہاں تو ازل میں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ زینت شرمناک بن کر ساری روش آرا جو ایک بچکے کی ماں ہونے کے

باوجود بڑی نازک اور خوبصورت سی لگتی آگے کھڑی ہو گئی۔ اسفند نے اسے بڑی دلچسپی اور تعجب سے دیکھا کیونکہ چہرے ہرے اور تند و قامت

سورہ اسکل کی کوئی خاصیت ہی نہ تھی۔

پھر زینت سمیت سات مہمانوں نے ناز پر در کو مہار دے کر بیٹھ سے اٹھا اور اسی کھٹولے نما چوکی پر بیٹھا دیبا جس پر نگندوں کے کلام کی پہلے

رنگ کی موڑی بھی تھی اور پہلے رنگ کا گانگہ اور کبھی بھی لگتی تھی اور جس پر پہلے رنگ کا درکار بھی تھا۔

پھر سب سے پہلے ماں نے نوٹوں کی موٹی سی گڈی کا صندوق اٹھا کر اس کے آگے کھٹولے پر ہی ایک طرف ڈال دیا۔ اس کے بعد درویش آرائے

گو یا رسم کی ابتدائی۔ اس نے بھی سب سے پہلے ناز پر در پر سے نوٹوں کا صندوق اٹھا اور ان نوٹوں کو زینت کے آگے اٹھائے ہوئے نوٹوں کے پاس ال کر

اٹھنے کے دونوں پشتات اس کے آگے رکھ دیے۔ پھر اس کے دائیں بائیں کی پھیلی ہوئی پھولوں کا ایک ایک ساٹھ رکھ کر اسے منہ کی طرح جمایا۔ پھر اس کے

کی پیشانی پر رنگا یا پھر ساری کی پھولی ڈلی اس کے منہ میں ڈال کر ایک سو ایک ڈپٹاس کی پھیلی پر رکھ کر کچھ ہنسنے لگی۔ اس کے بعد زینت

سمیت چھ مہمانوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ زینت کا ہر سب سے آخر میں آیا تھا۔ انہوں نے اس کی بائیں پھیلی پر بھی اٹھانکھا یا اور پھر اس کے بعد خواتین

کا ہر بڑا صندوق اٹھانے کے بعد مایوں کی رسم کا رنگ باز پرورد کی پھیلی پر رکھی گئی۔ لیکن مردوں نے صرف رنگ کی پھیلی پر رکھا اور شعیب منصور

نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر مایہ نگرانیاں بھی کچے اور جب لوگوں کی بادی آئی تو سب سے پہلے نازی نے اٹھنا کیلئے کی ابتدا کی پھر وہ ہڑوٹی کی

بڑی عمر کی خاتون کھڑا کر کے نکل گئیں۔

نازی نے سب سے پہلے اسفند کو ہی تاکا تھا۔ اس لیے اسفند کی تو جیسے شامت ہی لگتی تھی۔ جتنی کہ شعیب منصور کو اور دروہا کی بہنوں

کو بھی نہیں بھٹاتا تھا۔ شعیب منصور تو خیر خودی کھسک لیے تھے مگر تانیہ وغیرہ اپنے اسے عمدہ کپڑوں کی بربادی پر بڑی جزیہ ہو رہی تھیں۔ اصل

میں بعض لوگوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں آتی تھی کہ وہ چاروں مایوں کی رسم میں شرکت کرنے کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب سارا سامنا تھا تو ہر گویا

اور اس کے بھی ٹھک ہا کر بیٹھ رہے تو لوگوں نے دھولک سمیٹا کر اٹھنا شروع کیا۔

نازد کا ماکھا
بو کو کون ہے
او جو بادا ہے؟
اونوں
بھیا ہے؟
نانا

چا چا ہے
نہیں نہیں
وہ تو احمد روش ہے۔ احمد روش ہے
احمد بانکا جیلا ہے؟ کیا جیل جیلا ہے؟

تو یہ نہیں نہیں
اس کا لونے جیلا قد ہے ہاتھی جیلا ڈول ہے
کوئے جیسی رنگت ہے بیل جیسی صورت ہے
چوہے جیسی آنکھیں ہیں گدھے جیسے کان ہیں
طوطے جیسی ناک ہے اونٹے جیسے ہونٹ ہیں
بابا — واہ یہ احمد روش ہے

یہ تو بڑی فروش ہے
آں ہاں میوہ فروش ہے
اوہوں دوا فروش ہے۔

واہ بھی دوا فروش ہے

یہ احمد روش بھی دوا فروش ہے

گو یہ گیت مانجھے کا نہیں تھا بلکہ ہندی کے دن کے لیے ان لوگوں نے بنا رکھا تھا اور اس کے ابتدائی بول کچھ اور ہی تھے۔ مگر بنگالی بول کی طرح ان لوگوں نے یہ گیت بڑی ترتیب اور سرلی آوازوں بلکہ خوبصورت دھیمی میں گایا تھا۔ کچھ لڑکیاں سوال کرتیں۔ کچھ جواب دیتیں اور آخری بندب باجم آواز میں ملا کر گانے لگتیں۔ تانایہ اور اس کی بہنیں تو پہلے ہی لباس خراب سوجانے پر چلی بیٹھیں۔ اب جو گانے میں فروش کا نقشہ کھینچا گیا اور سب سے بڑھ کر اسے دوا فروش کہا گیا کہ تانایہ کے والد نے اپنے کاروبار کی ابتدا ہی دواؤں کی ایک دکان کھول کر کی تھی اور اتفاق سے کہنی کا نام بھی اپنے کھلوتے بیٹے احمد روش کے نام پر ہی رکھا تھا۔ تانایہ کا یہ شاید یہ کوئی ٹیک پوائنٹ تھا اس لیے گانا ختم ہوتے ہی وہ اپنی بیٹیوں بہنوں سمیت اٹھ کر کھڑی ہوتی بولی۔

وہ بھی اگر جہاں بھائی دوا فروش ہے تو یہ تو آپ لوگوں کو بات پتی کرنے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔

”ہاں اور ہمارے جیلا تو لیتے تو خوبصورت ہیں کہ آپ کے خاندان میں شاید کوئی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔“ دانیہ براسمانڈا بکار بولی۔ اس کے پیچھے میں عقارت میں شامل تھی۔ فضیلہ دانیہ مزاج کی تھی اس عقارت تیز میرے کو برداشت نہ کر سکی اور چمک کر بولی۔

”ارے جانیں بہت دیکھے ہیں آپ کے جیسا جیسے خوبصورت۔ ارے ایسے خوبصورت لوگ تو ہمارے بھائیوں کے سامنے پانی بھرتے ہیں پانی۔“ سفدر نے جوڑائی کے آثار دیکھے تو جلدی سے سکر سے کھسک گیا۔

”آف فار گوڈسک فضیلہ! خاموش ہو جاؤ بھئی احمد بھائی جیسے بھی ہیں۔ میں تو ہمارے ہونے والے بہنوئی ہی۔ بالکل بھائیوں کی طرح۔“ نیلو خرنے ناز پرور کے اشارے پر گویا بیچ بھاڑ کر اٹھ پڑے۔

”ارے چھوڑو نیلو باجی۔ کیسا بھائی اور بہنوئی۔ ہم بھی خوب جانتے ہیں کہ بھیا کے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہیں۔“

”ہاں سچی۔ ابھی وقت ہے۔ خوب ابھی طرح سوچ سمجھ لو۔ بعد میں یہ نہ ہو کہ تمہاری بہن منہ سوتی نظر آئیں۔“ تانایہ نے کہا۔ شاید کسی نے ماہر جاکر دینت کو اللہ کے دے دی کہ اندر کچھ نکلا رہا ہو۔ باہر وہ خود ہی اندر کی غیر خیریت لیتے آئی تھیں۔ انہوں نے آتے آتے تانایہ کی بات سن لی تھی۔ مگر تو بہت لگا لگیں بیٹی کی ان تھیں۔ اور بیٹی بھی وہ مایوں بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر لوگوں سے بوجھا۔

”کیوں بھی بچپن کی کیا تھک گئیں تم جو گانا بند کر دیا۔ خیر چلو باہر کھانا لگ چکا ہے۔ کھانے کے بعد جب تک دل چاہے گا لینا۔“ ادھر پھر تانایہ

کے قریب آکر انہوں نے عیرو سے کہا جو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”ان چاروں بچوں کو میں نہیں اپنے اور ناز کے ساتھ کھانا کھلاؤں گی۔ ورنہ یہ باہر گئیں تو تکلف اور دشمنی آدھاپٹ بھی نہ کھا سکیں گی۔ عیرو

تو پہلے ہمارا کھانا یہاں بچھو دو۔“ عیرو نے کہا اور بار بار نکل گئی۔ تب انہوں نے تانایہ کو بہت ہی محنت اور پیار سے ٹھالتے ہوئے کہا۔

”اے کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ نا بیٹی۔ میں تو کام میں ایسی لگی کہ ڈھنگ سے تمہاری خاطر تو وضع بھی نہ کر سکی۔ مگر تانایہ سے زیادہ اس کی بہن اور

کونز کا منہ چھو لارہا۔

”نہیں آئی، اس وقت تو ہم جا رہے ہیں۔ دیر بھی بہت ہو گئی ہے۔ اسی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ تانایہ نے کہا۔ اس کے تورو بدلے ہوئے تھے۔

”ارے کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی۔ دیر ہو یا کچھ میں نہیں بڑھ کھانا کھلائے تو ہرگز جانے نہ دوں گی۔ چلو مجھ جلدی سے شاباش دینت نے بڑے

ڈولار سے کہا۔

”کھانے کا کیلے۔ کھانا تو گھر میں ہی پکا ہے آئی۔ ہم وہاں جا کر کھا لیں گے۔“

”ہاں اور کیا۔ ہم کھانا کھانے کو نہیں آئے تھے۔“ دانیہ بھی بہن کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔ پھر زینت نے بہت روکا مگر وہ رکی ہی نہیں اور

انہیں سلام کر کے چلی گئیں۔ ان کے چلے جانے سے رنگ میں کھنگ سی پڑ گئی تھی۔ ناز پرور بھی بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ اسی کی زبانی زینت کو حقیقت

حال کا علم ہوا تھا۔ کیسا کھانا اور کیسا کچھ۔ انہوں نے لوگوں کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ انہوں نے ایسا بہہ دہکا نا ان کے سامنے کیوں کیا تھا جسے انہوں

نے اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا۔ اب عین وقت کے وقت انکار ہو گیا تو ہم کسی کو نہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہیں گے۔ اب تو تمہاری بیوی کی وجہ سے مجھے

ہی ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پیر جوڑنے پڑیں گے۔ تم لوگوں نے اصل معنوں میں انہیں نہیں مجھے ذلیل و خوار کیا ہے۔

”آف تو یہ لڑکے والے تقریباً سارے کے سارے ہی ایسے ذلیل ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں جب لڑکی بیٹی ہوتی ہے تو کیسے گرو گڑا تے اور

خوشامدیں کرتے ہیں اور جب بات پتی ہو جاتی ہے اور رسمیں شروع ہونے لگتی ہیں تو اپنی ساری اوقات دکھا دیتے ہیں۔“ دوشاں جلے کے انداز میں بولی۔

”نہیں خیر یہ تو نہ کہو۔ یہ لڑکے والے خواہ کتنے ہی روشن خیال اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں ان معاملات میں وہی لکیر کے فقیر ہوتے ہی ہیں پس ذرا سی گولی، غلاف مرضی بات ہو جاتی شرط ہوتی ہے ان کے لیے پھر تو یہ ایسی آکھیں بھرتے ہیں کہ تو کون اور میں کون۔“ عائشہ بیگم نے کہا۔

”جی ہاں۔ اور مجھے تو خالہ بیگم یہ سب کے سب اپنا شائے (لوڈو لیتے) ہی لگتے ہیں۔ شاید آپ نے بھی لوٹ کیا ہو اس روز جب تاربخ مقرر ہونے کی خوشی میں انہوں نے نہیں جانے پر اپنے گھر کو کیا تھا تو یسی شوکت کر رہی تھیں وہ سب کی سب اپنے زیور اور کپڑوں کی جھل جھل سمجھنے کے سلسلے اپنی کاروں، برنس اور بینک سٹینس کا ذکر بھی کہیں کیا جاتا ہے۔ لگتا ہے سب کچھ زندگی میں پہل بار نصیب ہوا ہے تبھی تو اتنی چھجھوری حرکتیں کر رہے تھے۔ درخشاں شاید سب سے زیادہ جلی بیٹھی تھی اس لیے ایک طرح لڑکے والوں کے عیب کنوٹے۔“

”ارے بچی! اب ساتھ کھا کر ذات کیا پوچھتی۔ یہ سب تو اس وقت معلوم کرنا چاہیے تھا جب بات کچی ہو رہی تھی۔“ زینب نے کہا۔

”خیر اپنے طور پر تو ہم نے اچھی طرح پچھان بین کر لی تھی۔ گروہ جو کتنے ہیں، اکثریت میں اکثراری تھی ہوئی ہے تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ اب ایک اتنی سی بات پر مجھے ہی ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پر پڑنے پڑیں گے۔“

”ارے خدا کرے آپ کیوں ہوئیں ہاتھ پاؤں۔ یہی مائیں تو غضب بھالی کو بلا کر ساری بات بتا دیں وہ خود ہی منٹ لیں گے ان لوگوں سے۔“ عائشہ بیگم نے مشورہ دیا۔

”اے فوج رکھا سر بھٹولی کرنا چاہتی ہو مردوں ہی مردوں میں جو یہ سب لگا مشورہ دے رہی ہو عائشہ بیگم! ایسی باتوں کی تو ہوا سبک نہیں دی جاتی مردوں کو۔ ہاں البتہ اگر معاملہ بالکل ہی ختم کرانے کا ارادہ ہے تو اور بات ہے۔ کیونکہ مردوں کو بتانے کا مطلب تو یہی ہے کہ اتنی سی بات کا تین گنا کر دہی مشل ہوگی کہ سارا جھگڑا اٹلا ختم کرے تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر عین ہے“

زینب عائشہ بیگم کے مشورے پر ہچک کر لو لیں۔

”خدا کرے کیا اشیطان کے کان بہرے۔ ایسی بد فائیں منہ سے نہ نکالے۔“ عائشہ بانی نے اگر غلط مشورہ بھی دیا ہے تو ذہن تو سب ہی کے مافوق ہیں اس پریشانی میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کیا جائے۔ زینب نے اپنی بہن اور نند کے رشتے کی نزاکت کے پیش نظر بہن کی کھری بات کو اس طرح لیا۔

”اے چوڑیں بھائی بھائی جان رہ سارا کیا دھرا تو زینب آیا کا ہی ہے۔ میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھکا تھا جب اُٹھنے کے تھا لگے تھے۔ اب دیکھیں بڑ گئی، نارنگ میں بیٹنگ۔“ عائشہ بیگم بھی خاموش بیٹھنے والی نہ تھیں انہوں نے فوراً ہی بدلا تارا۔

”اے بھائیوں دو شلے میں لپیٹ کر کیوں مار رہی ہو بہن، صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ میں نے جان لوچو کہ اپنی بھائی کے حق میں کانٹے لے رہی ہیں۔“ زینب برامان کر لو لیں۔ اور تب زینب کا دل جاپا کھیں عائشہ آپا کچھ غلط تو نہیں کہہ رہیں آپا میں تو پہلے ہی کھٹک گئی تھی کہ اسی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ مگر کچھ کہہ کر بہن کی راضی مول لینا نہیں چاہتی تھیں اس لیے سخت عاجزی سے لو لیں۔

”تم نے آپا اس وقت میرے پوش ٹھکانے نہیں ہیں خدا راکھ ہی خاموش ہو جائیں۔“ زینب خود بھی بہت معاملہ ختم اور زیرک تھیں انہوں نے جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

”پریشانی اٹھانے سے فائدہ۔ ابھی تو لڑکیاں گھر بھی نہ پہنچی ہوں گی تم جلدی سے رونا دھونا۔“

”بہنیں تم ہی! میں آپ کو بڑ کر جانے نہیں دوں گی۔“ ناز پر جواب تک خاموش بیٹھی تھی ماں کا ہاتھ بڑک کر بولی۔

”واہ بھائیوں! نہیں جانے دو لڑکیاں تم چاہتی ہو کہ جمع ہو کر سب لوگوں کے سامنے میری ناک کٹ جائے۔“ زینب نے بیٹھی کھلے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

”ہاں ناز پر بیٹی! ان کا جاننا اس وقت بہت ضروری ہے کیونکہ اگر یہ نہ لیں اور بات مردوں تک پہنچ کر تو ادھیڑ بڑا ہوگا۔“

خانہ بیٹی ناز کو کھچا ہوا۔

”بہن! یہ تو تم ہی کی بہت تو بہن ہوگی وہاں جا کر ان لوگوں سے بیگ کرنا۔ آپ ٹھہریں مٹی میں خود دفن پر احمد سے بات کرتی ہوں۔“

ناز پرورد نے خالہ کی بات کا ٹوٹ لیے بغیر کہا۔

”ارے نہیں۔ ایسا تو غضب ہی نہ کرنا، زکو لڑکے سے خود بات کر دو لاکھ اس سے تباہی اندھا سٹینڈنگ ہی لیکن جب مرد

شوہر بن جائے تو عورت کی ایک معمولی سی کمزوری راہی کا پھارنا لیتا ہے اور کسی نہ کسی موقع پر اسے طعنہ مزدور سے دیتا ہے۔“

زینب نے گویا ایک طرح مرد کی فطرت اور خصلت سے بیٹی کو خبردار کیا۔

”آج سے زینب یہ تم میں کھڑی کیا کر رہی ہو باہر تباہی لٹنے والیاں تھیں پوچھ رہی ہیں۔ یہ کہاں کی معقولیت ہے جھلا کہ بیزبان تو غائب اور مہمان بے چارے اکیلے کھڑے۔“ لیکالک زینب نے کمرے میں داخل ہو کر کہا مگر وہ اپنی بات کہتے کہتے لیکالک خاموش ہو گئیں۔

”کیوں خیر تو سب یہ تم سب کے چروں پر ہوا بیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“ وہ باہر تھیں اسی لیے انہیں کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

”خیر یہ ہی تو نہیں ہے کیا؟“ تو سنے ہوئے سارے سامنے بولنے لگیں اور پھر انہیں دولہا کی بہنوں کے بڑا کر۔ چلے جانے کی انھیں تباہی ہو رہی تو بڑا ہوا۔ اب کیا کرو گی؟“ پوری بات سننے کے بعد زینب نے تڑو سے پوچھا۔

”کردن گی کیا کیا۔ ان لڑکیوں کی بے ہودگی کی وجہ سے اب مجھے خود جا کر سمجھنے کے سامنے ناک سے سات لکیریں کھینچنی پڑیں گی۔“ زینب بے حد سچے سچے انداز میں اپنی بھائیوں اور بھتیجیوں کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”اے ہاں جھلا دیکھو تو یہ بیٹھے بیٹھے اور سر پر پڑی۔ درنہ ایسے موقعوں پر تو اس سے کہیں زیادہ بے ہودہ مذاق ہوتے ہیں آج کل تو خیر دستور ہی ختم ہو گیا۔ درنہ تو پہلے ڈومنائیاں اور میڈائٹل گانے گانے میں ایسی بیچ بیری گایاں دیتی تھیں سمجھنے کو کہ سننے والا شرم سے پانی پانی ہوجاتا تھا۔ دولہا کی بہنیں بہت خردماغ معلوم ہوتی ہیں، انہیں تو اتنے سے مذاق کو بھی نہ سہا رہیں۔“ عائشہ بیگم نے کہا جو زینب کے پاس کھڑی تھیں۔

”ہاں یہ تین بے بی کچھ چکی ٹاپ۔ کالج میں بھی ذرا ذرا سی بات پر گڑ بٹھیتی ہے۔“ نیو فرنے کہا۔

”اے بی بی! مجھے تو وہ میڈوں ہی ایسی ہی لگیں خائستہ کوک قسم کی۔ اب نامعلوم گھر والے کیسے ہوں۔“ کوثر نے رائے زنی کرتے کرتے انداز میں کہا۔

”ارے بیٹی!۔ دین میں تو ایک چاول ہی دیکھا جاتا ہے جو اگر کچا تو جاناو سارے چاول ہی کچے ہوتے ہیں۔“ زینب نے طنز بھرے انداز میں ہنس کر کہا۔

”اے نہیں خالہ جان۔ احمد بھائی کی ساری فیملی بہت اچھو کیڈ اور ایڈوائس ہے میرے خیال میں تو وہ لوگ اس بات کو اتنا سیریس نہیں لیں گے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔“ میلو فر لولی۔

”ابن ابی بنی نہیں نگارہیں تو نہ کیسے یہاں تو بچی کو مایوں میں بھی بٹھا دیا مہمان داری بھی شروع ہو گئی۔ اب خدا نخواستہ کوئی ایسی کہیں بطور کو ایک سے ایک لڑتے مل سکتے ہیں۔“

مقابلہ نہیں کر سکتا۔" دانگیر بولی۔
 "ہاں مگر بعد میں تو اس نے بھی اپنی ساری اوقات دکھا دی تھی اُنہا کیلئے وقت۔ اس نے اپنے سارے کزنز کو بلایا تھا اور

سارے کے سارے ہی چڑے سمجھو رے اور لو فرسے لگ رہے تھے لڑکیوں کو پکڑ کر انہیں مل رہے تھے انہوں نے توہین بھی نہیں چھوڑا۔ مکہ کے چھوٹے بولنے کی انتہا کر دی۔

”ہائے یہ تو بڑے ذلیل نکلے سارے کے سارے۔ جالاکہ اوپر سے تو بڑے ڈیلٹنگ لگتے ہیں۔“ تانیہ کے ماموں زاد بھائی کی بوجی صدف نے کہا۔

”اوہستے تو نیسی ڈیلٹنگ لگتے ہیں لیکن اندر کا حال واسطہ پڑنے کے بعد ہی کھلتا ہے۔“ تانیہ کی تایا زاد ترین نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

”بیرسب کی سب زیادہ انگریزی ہی بولی رہی تھیں۔“
”دیکھو نوین تم نے بڑی تعریفیں کرتی تھیں تم ان لوگوں کی اور وہ کیسے ذلیل نکلے۔“ تانیہ کی امی انسرین نے سب کچھ سننے کے بعد اپنی چھوٹی بہن نوین کو مخاطب کر کے کہا۔

”جی ہاں۔ میں نے تو پہلے ہی ان لڑکیوں کو کتنا منع کیا تھا کہ وہاں مت جاؤ۔ اب جانے کا نتیجہ بھی جھلک لیا نا؟“ نوین نے ساری بات اپنے اچھڑاتے دیکھی تو لڑکیوں کو الزام دینے لگیں۔

”واہ خوب کہا کوپ نے کہ عجوبہ جھلک لیا۔ کوئی یہ کسی راہ چلنے کا معاملہ تو نہیں۔ سمجھانے کی بات ہے۔ کیا کہیں ایسا ہوا؟“
”جی کیا جاتا ہے لڑکے والوں سے؟“ نوین نے نوین کی بات پر جھنجھکیا۔

”ہاں۔ اور جھلک لڑکی والے بھی کہیں ایسے تھیں ہوتے ہیں۔ ایسا اندھیر تو کہیں بھی نہیں دیکھا۔ جب ابھی سے ان لوگوں کی دہشت کا یہ عالم ہے تو بعد میں تو جانتے کیا ہوگا۔“ صدف بھی چڑے غصے سے بولی۔

”اجی ہوجو کیا۔ ہم لڑکے والے ہیں دہشتاں لوگوں کو چاہیے کہ ان کی لڑکی ہمارے گھر آ رہی ہے بعد میں ہم اسے کیسا ٹریٹ کریں۔“ بھڑ میں ابھی ناز کی قسم سے نوین پر بات کرتی ہوں۔ ایسی کھری کھری سنائو گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے ان کے۔

شاداب نے کہا جو بہت تنک مزاج تھی۔
”ارے نہیں! شاداب اس طرح فون پر بات نہیں کرتے آخر تو سمجھانے کا معاملہ ہے۔“ تانیہ کی چڑی خالہ مرعین نے

شاداب کو سمجھا ناچا با تو تانیہ اپنے انسویکچر کو نہایت جذب کے عالم میں بولی۔
”اچھا کس کا سمجھانا دھبیانا۔ ہمیں نہیں کرنی اپنے جیتا کی شادی وہاں۔“

”بائیں بائیں تانیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اب بھلا ایک ایسی امی کی بات پر بھائی کا رشتہ بری طور پر ٹوٹ جائے گی۔“ مرعین نے اسے فوراً ہی لگا کر۔

”ہاں جی ایسا تو نہ کہو مکمل دور و زور تو نکاح میں رہ گئے ہیں۔ کل مہندی ہے پرسوں ریسٹ ڈے اور اتوار تو شادی۔ اور شادی کی ساری تیاریاں ہم مکمل ہو چکی ہیں اب بھلا بات کیسے توڑی جاسکتی ہے۔“ صدف نے دلی زبان سے کہا کہ وہ اس گھر کی ہوتی۔

”اچھا اگر نہیں توڑی جاسکتی تو توڑیں میں بھی قسم کھا سکتی ہوں کہ کسی رسم میں شریک ہوں گی نہ اس گھر میں جا کر کبھی تھو کوئی نا تانیہ بولی۔

”ارے نہیں بات توڑنے کا تو نہ کہو۔ عین وقت کے وقت باتیں نہ کہ اُٹھ جاتی ہیں ذرا سی مرضی کے خلات بات پر تانیہ کی والدہ انسرین نے کہا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تانیہ کی پشتی لے رہی تھیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا ایسی باتوں سے آپ؟“ مارے کوفت کے نوین نے چڑے سے بچنے پر ہی سے پوچھا۔

”مطلب کیا ہوگا یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے ان لوگوں کے ہاتھوں ہماری بچیوں کی بے عزتی ہے میں تو ابھی مردار صاحب کو بلا کر اس بات کا تصفیہ کر رہی ہوں۔ ہم لوگ کوئی گرسے بڑے تو نہیں ہیں لڑکے والے ہیں لڑکے والے۔ ہمارا پتہ تو بھاری رہنا چاہیے۔“

اور سنیں کی بات پر نوین کھول کر کھینک چاہ رہی تھیں کہ ملازم نے آکر گھر کے آگے کی اطلاع دی تو ان کے اچانک آجائے کی نوعیت جاننے میں کسی کو دیر نہ لگی۔ انسرین نے نوین کی طرف دیکھ کر کہا۔

”دیکھ اپنی غلطی تھی نا اس لیے صفائی پیش کرنے کے لیے انہیں بھی بھیجا گیا ہوگا۔“
پھر انہوں نے بڑے نخوت سے بھرے انداز میں ملازم سے کہا۔

”جاؤ یہاں کھڑے۔ کیا کر رہے ہو انہیں ڈرانگ روم میں لے جا کر جھانڈو ہم بھی اچھے آتے ہیں۔“
”پر یکدم صاحب! میں نے بھی یہی بولا تھا کہ ڈرانگ روم میں چل کر چھین پر وہ بولے کہ ہمارے پاس ٹیم نہیں ہے ہمیں ادھر ہی چلو۔ اور وہ ادھر آ رہی ہیں۔“ ملازم نے کہا تو جیسے کمرے میں ایک جھگڑا مچ گئی۔ دو تین عزیزائیں صدف سمیت اٹھ

کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئیں تانیہ اور ادیبہ بھی اپنی دونوں کنز سمیت کمرے سے۔ جاک گئیں۔ نوین اور شاداب جلدی جلدی کمرے میں بچھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں اور نوین انسرین بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور نوین سب کو اپنے ساتھ

کرتی ہوئی بولی۔
”اکیس بیٹو۔۔۔۔۔۔ قیمتی! فرنیچر اور ڈیکوریشن مگر معلوم ہو رہا ہے جیسے

اٹ تو بچھو پڑیں گی جی انتہا ہے۔ اکیس بیٹو۔۔۔۔۔۔ قیمتی! فرنیچر اور ڈیکوریشن مگر معلوم ہو رہا ہے جیسے گرنے کو ہے بولے ہوں یہاں۔ کسی سے اتنا جی نہیں ہوتا یہاں کہ ہاتھ پیروں کو تکلیف دے کر ٹیٹوری سی صفائی ہی کر دیا

کرے۔“
”ارے جی شادی کا گھر ہے اس پر مانتا اللہ امی مہمانداری بھلا کس کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ صفائی سٹھرائی کی طرف توجہ

دے۔“ مرعین بولیں۔
”لیکن صفائی تو روز ہی ہوتی ہے البتہ شام تک یہ حشر ہو جاتا ہے۔ رسوائے میرے اور تو کسی کو توفیق ہی نہیں ہوتی اس طرف

توجہ دینے کی۔ شاداب تھکے لگے ہوئے بولی۔
”معلوم بھی ہے پوری صفائی میں وہ۔“ ان کا گھر کیا پورا محل ہے محل ہے اور ٹوائلٹس اور کچن سے لے کر ایک ایک

کمرہ ایر کونڈیشنڈ ہے اور صفائی سٹھرائی ایسی کرنا کھ میں میل آجائے تو آجائے مگر کچن میں نظر نہیں آسکتا۔“ نوین نے بتایا۔
”جی غلطی تو ساری ان کی ہی ہے جو وہ سیدی ادھر آ رہی ہیں ورنہ کسی کے پرائیویٹ روم میں کھس آنا بھی جھلا کوئی اخلاف

ہے۔“ نوین محلہ لکھنؤ وغیرہ فریٹ سے لکھی ہوئی بولی۔
”جی وری سوری اصل میں اس وقت میں بہت بھلت میں ہوں اس لیے مجھے اس بااخلاق کا مرکب ہونا ہی پڑا ہے۔“

نگار نے جو اس آٹا میں اندر گئی تھیں نوین کی بات سن کر کہا تو اس سمیت سب ہی شرمندہ ہو کر رہ گئے۔
”ارے نہیں منہ زور نہ علی آپ کے لیے تو اس گھر کو دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اصل میں یہ لوگ اپنے جھوٹے پرنسز شرمندہ ہو کر

کمرہ رہے ہیں۔“ نگار نے کی حالت بھی تو دیکھیں ایک دم کہا تھا نہ ہی لگ رہا ہے۔“ انسرین نے یہ کہہ کر گریبا اپنی تعجب بٹائی۔
”لیجئے۔ آپ لو اس طرح کہہ رہی ہیں انسرین جیسے میں کسی ڈیڑھ ٹیٹریٹ یا جنگل میں رہتی ہوں جی کیا مجھے معلوم نہیں کہ شادی

بیاہ کے موقع پر خصوصاً مہمانداری میں ہر چیز ہی اپ سٹیٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔“ نگار ہنس کر بولیں۔
”خیر آپ اپنے بیٹے کو نکاح پر کہتے آج ہماری یاد کیسے آگئی؟“ نوین نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دیوان پر بٹھاتے ہوئے

پوچھا تو نگار دیوان پر ٹھکے سے انداز میں بیٹھتی ہوئی بولیں۔
”یاد تو خیر ہم ہمیشہ ہی رہتی ہو لیکن اس وقت تو تم نے خود ہی مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے اور چونکہ نوین ان کے آنے

کی غرض دعاغیت جان کی تھی اسی لیے اس نے ہنس کر صرف ”اچھا“ ہی کہنے پر اکتفا کیا۔
”بھلاں کسی نہ کسی بہانے ہی یہی اپنے یہاں تک آنے کی زحمت تو گوارا کی۔“ انسرین نے کہا تو مسکرا کر ہی تھا لیکن بوجہ

چھپتا سا تھا۔
”نہیں یہ نوین جب بھی یہاں بولی ہیں میں ان سے ملنے آتی رہتی ہوں۔“ نگار نے ان کے ہاتھ میں چھپے طنز کو نظر انداز

کر کے کہا۔
”اچھا تو انہیں سے تمام تر تعلق ہے آپ کا ہم سے کچھ بھی نہیں۔“ مرعین نے گلہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔ سہیہ نہیں۔“ مرعین نے سارے کو سوسے ہی ہے اور میں ان کی طرح آپ کو بھی لپی لپی بہن سمجھتی ہوں۔“ نگار نے نوین کو

کھات دیکھ کر کہا تو وہ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہنے لگی اور مرعین نے بھی ان کا ساتھ دیا۔
”نوین جانو انہیں سے کے لیے کوئی ڈونٹس وغیرہ تو لے آؤ۔ یا پھر آپ کا فی لیں گی۔“ انسرین کو ان کا خاطر تواضع کا خیال آیا تو انہوں

نے نوین سے کہنے کے ساتھ ساتھ ان سے بھی پوچھ لیا۔
”نہیں! شکر ہے! اتنی تکلیف کی ضرورت نہیں تھا۔“ نگار نے معذرت کی تو نوین اٹھنے اٹھتے پھر

بیٹھ گئی۔ نگار چاہ رہی تھیں کہ بات کی ابتدا ان لوگوں کی طرف سے ہو مگر وہ سب کی سب جیسے ایک کر کے بیٹھ گئی تھیں کہ کچھ کہیں گی نہیں۔
”آؤ نگار کو خود کوئی دیا پڑا۔“

دیوان بھی اس وقت میں کسی خوش وقتی میں نہیں آئی ہوں ڈیر فریڈز۔ فزی اپنے بزنس ٹرپ پر جاپان جا رہے تھے سارا دن ان کی تیاری میں مصروف رہی اور اب انہیں سی آن کر کے ایر پورٹ سے واپس لوٹ رہی تھی۔ کئیال آیا ذرا بیک ٹیٹ

سے بھی مٹی جلوں لے چاری تے ہاؤں کی رسم میں کتنے اصرار سے بلایا تھا۔ مگر فیزی کی وجہ سے جا ہی نہیں سکی تھی۔ "نگار کی بات پر بڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر کوئی نہیں۔"

"انسوس تو اس بات پر کہ کم لوگ خواہ کتنے ہی لکچر لکچر اور ایڈوانس کیوں نہ ہوں۔ خدا فرما سی باتوں کو اپنی پرستش (دور کا مسئلہ بنا کر خود اپنے لیے ہی لکچر لکچر (مشکلات) پیدا کرتے ہیں۔ وہاں پہنچی تو یوں محسوس ہوا جیسے سارے گھر پر ہی صحت پر مبنی ہو۔ لیونکو سارا، حول ہی شیز (د منتشر) سا لگ رہا تھا۔ پوچھتے پر پتہ چلا کہ تمہاری بھانجیاں وہاں کوئی سین کر رہی ہیں (فٹنگ جاگرا) کر کے آئی ہیں۔" نگار نے جس طرح اصل مسئلہ اٹھایا، سب ہی اپنی اپنی جگہ بل بھر کر رہ گئے۔

"دادا! آئی! ابھی ان ہی کی سائیڈ لے رہی ہیں۔ بڑی ویٹ ان فٹنگ فیز (لیکن یہ انصاف نہیں ہے) شاداب چمک کر رہی ہیں۔" ہاں واقعی۔ دن سا انداز سوزی سن کر یقین کر لینا کوئی انصاف تو نہیں ہے جبکہ آپ کی اور یوں آنٹی کی اتنی پرانی فریڈ شپ بھی ہے۔" نورین نے بھی شاداب کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے کہا۔

"ارے چھوٹو ندرین بہ! آنٹی ان کی سکھائی ہوئی آئی ہیں۔ ان سے کچھ کہنا بیکار ہی ہو گا۔"

شاداب طے کئے سے انداز میں بولی۔

"وکیو وکیو! میں تمہارے ٹروں سے بات کرنے آئی ہوں۔ تم سبھی چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش نہ کرو۔ بڑی کرپ کوائس (بہتر ہے کہ خاموش رہو) نگار نے دھڑکے سے انداز میں کہا تو مدھن بولیں۔

"ہاں مسز فرزندہ علی شکاک ہی کہہ رہی ہیں۔ تم خاموش بیٹھ کر سنو۔ زیادہ چڑچڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔" ایک نورین اور شاداب سے سرین کا سسرالی رشتہ تو تھا۔ دوسرے سرین خود بھی بھری بھیجی تھیں۔ بڑی بہن کا انداز شوہر کی بھیجی کو ڈانٹنا انہیں سخت ناگوار گزارا۔ انہوں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"باجی! آپ بلا مجھے کبھی سب کو ڈانٹنے لگتی ہیں۔ درزاں دوروں کی ایسی غلطی بھی نہیں ہے۔ نگار بہن واقعی صرف ایک طرف کی سن کر کہہ رہی ہیں۔ اور میں ہی قصور وار کروا رہی ہیں جب کہ انصاف کا آٹھنا یہ تھا کہ ہماری بھی کچھ منتیں ہم سے بھی کچھ جیتیں اس کے بعد کسی نتیجے پر پہنچیں تو کچھ بات بھی بولی۔

"مگر کسی نتیجے پر پہنچنا یا نہ پہنچنا تو آپ کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ کیونکہ میری حیثیت تو اس وقت ایک ثالث کی سی ہے جو کچھ انہوں نے کہا میں نے خاموشی سے سن لیا اور جو آپ کہیں گی وہ بھی اسی طرح سن لوں گی لیکن سننے سے پہلے یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ آپ کے ارادے کیا ہیں۔ یعنی آپ اس بات کو یقین سے لیں گی یا پھر سکھانے والوں کی ایک گروٹ کچھ نظر انداز کریں گی؟ نگار نے ایک بار سرین کے فٹنگ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"نہاں ہے۔ آپ کے کان کچھ زیادہ ہی بھر دیے ہیں ان لوگوں نے۔ خیر فوٹی ویری فرینک میں بھی کہوں گی کہ کم بہت غلط لوگوں میں جھنسن گئے۔ بھلا یہ انداز بھی کہیں دیکھا ہے کہ لوگ کی بہنوں کی اس قدر توہین کی جائے کہ ان کا بیٹھنا وہی ہو جائے۔ جب کہ وہ بھی لڑکی داسے ہو کر لڑکی داسے تو الٹی جوتیاں ہی سیدی کرتے نظر آتے ہیں۔ لوگ والوں کی۔" سرین بڑے بہم انداز میں بولیں۔

"ہاں یہی ایک کنزرویٹو ہی ہوتی ہے لڑکی والوں کی۔ آخر مٹی بھی تولیہ تے میں ناگرماف گوئی معاف سرین: یہ بڑی فرمودہ ہے۔ جیسے آپ کی بہر حال ایسی کیا نامعقول باتیں کی تھیں انہوں نے جو آپ کہہ سکیں تو یوں کا سبب نہیں۔"

نگار بھی کچھ کمال نہیں تھیں۔ انہوں نے آٹے میں لوج دینے کے بعد ہی یہ سوال اٹھا یا تھا۔ سرین خود بھی یہی چاہ رہی تھیں کہ جلد از جلد سب کو ان کے گوش گزار کریں لیکن نوں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ان کو غلط کر کے کہا۔

"آپا! ایسا یوں نہ کریں کہ ان چاروں کو یہیں بلوالیں۔ وہ خود انہیں سب کچھ بتا دیں گی کیونکہ جھگڑا کبھی وہی آتی ہیں۔ ہم تو وہاں موجود نہیں تھے نا۔"

چلو خیر ان کو بھی بلوا کر وکیو لو مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میرا مطلب ہے مسز فرزندہ علی ان کی باتوں پر یقین کر لیں تبھی نا۔" سرین نے پھر نگار پر طنز کیا۔

یعنی۔ کوئی ان لوگوں کی سب سے زیادہ نفرت بن کر تو نہیں آئی نہ ان کا وہی کھاتی ہوں۔ ہاں البتہ یہ مقصود ہے کہ میں نے آپ دونوں کے بیچ میں پورے رشتہ طے کر لیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ فضول باتوں سے گریز کریں اور اگر نا سب سمجھیں تو

لوگوں کو بلوالیں۔" کوئی دوا داری رہتی ضروری نہیں سمجھی اور روتھ سے انداز میں کہہ دیا سرین سے ان کی بات کا کوئی جواب نہ بن سکے۔ روتھ نے شاداب سے کہا کہ وہ چاروں لوگوں کو بلا لائے اور وہ فوراً ہی اٹھ کر ان چاروں کو بلا لائی۔

سکا تو بنوں نے شاداب سے کہا کہ وہ چاروں لوگوں کو بلا لائے اور وہ فوراً ہی اٹھ کر ان چاروں کو بلا لائی۔

سبب یہ نہیں بلکہ اس حد تک گھونٹی کا ب مقابلی ہی کیوں وقت کے وقت غلط لوگوں میں جھنسن جانے کا سبب ہو رہا ہے۔

ان سوال کرتے کا انداز بھی ایسا سکاٹ وار تھا کہ تانیہ سے جواب نہ بن سکا تو اس نے نہ بڑک کر کہا۔

ملا لیں جو۔ ہلے آئی تو کچھ غلط تو نہیں ہو رہا۔ وہ لوگ ہیں ہی ایسے لوگوں (پچھلے طبقے کے) رو رہیں۔

واہ۔ ماشارا نہ بڑی حاضر جواب ہے تمہاری بھانجی تو یوں کمر پہلے اپنے گریبان میں مڑوا ل کر دیکھتے ہیں پھر کسی کو برا بھلا کہتے ہیں۔" اور میری بات کا جواب تو نہ تھا جو تم نے دیا ہے۔" نگار نے نوں سے کہہ کر اسے مخاطب کیا تو تانیہ رماں سے

مخاطب ہو کر بڑی بدترقی سے بولی۔

"جس جو ہو گا سو ہو گا۔ اب میں کسی کے سامنے دکھنے نہیں روؤں گی۔ پہلے ہی میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ آپ کو صفائی پیش کرنے کی یہ خود ہی کریں۔" مگر ماں نے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ نظر اٹھوا لیں۔ نوں کی نظرت اور مزاج بہن سے بہت مختلف تھے۔ اس سے پہلے نگار کچھ بولیں۔ انہوں نے تانیہ کو گھوڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نی بیویو ریلیف (تیرے رہو) تانیہ: یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کوئی معمولی بات نہیں اور پھر کیا تم نے جھوٹ بولا تھا جو تلتے ہوئے کتے زبانی ہو۔"

"ہاں ہی بولیں۔" اس نے بہت سے کہا اور نوں اس کی گستاخی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

"چلیں یہ نہیں بتائیں تو میں بتائے دیتی ہوں۔" دانیہ نے کچھ ایسے سنوارے انداز میں نہیں کہہ کر کہا۔ جیسے اس فنڈ فائڈر بہت خوش ہو۔ نگار نوٹ تو سب کر رہی تھیں گریوں کچھ نہیں۔ پھر دانیہ نے شروع سے کر آخر تک بلکہ اپنی طرف سے جھوٹ

پہنچ جو کہ انہیں ساری بات بتا دی۔ نگار نہایت عموماً اور خاموشی سے سب سنتی رہیں پھر کچھ وقت کے بعد بولیں۔

"ہوں۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگا لیا ہے اس کا نئے سے جو ناز کی گزرنے کا یا تھا۔ تمہاری فیلنگس بہت (احساسات فزج) ہوتی ہیں ورنہ اٹنا کیلئے میں تو تفریباً تب جلدی ایسا ہوتا ہے کہ جو دور جھلنے کی کوشش کر رہے ہیں سب سے زیادہ

نشانز بنا جاتا ہے اور اس میں ہی عمر دریاں بالیاں ہی کھلتی ہیں۔ اٹنا جس میں بھائی اور نرنگی شریک ہوتے ہیں اور کیا اٹنا میں

کبھی ایسی کسی رسم میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"نہیں ہو کیوں نہیں۔ دیووں بار ہو بے مگر ہمارے منہ کرنے پر انہوں نے نہیں پچھو کہ یہ بھی کہا تھا کہ اگر کچھ خراب ہو جائے

کامی خیال تھا تو پھر ماؤں کی رسم میں شرکت کرنے کیوں آگئیں آپ۔ جھلکا میں ایسے بھی کہتے ہیں لوگ والوں کو آنٹی! دانیہ بولی۔

"ہاں کہتے ہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اٹنا کیلئے کی رسم ہی ہنس مذاق پر مبنی ہے۔ ہوتی ہے اور میرے

خیال میں تو یہ اتنی معمولی سی بات اس قدر قابل گرفت تو نہیں تھی کرتے اسے لے دیا کہ مسئلہ بنایا۔ اس قدر نازک مراسلت

لکھی ہو تو میں یوں کی رسم میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ یہ رسم تو اٹنا کیلئے کے لیے ہی ہوتی ہے۔" نگار نے سمجھنے کا انداز

مخبر و بنا دیا جو کہ وہ اپنی صاف گو فطرت سے نام لے کر اساتھ کے ساتھ ان کی اچھی طرح کھینچی ہوئی گئی جارہی تھیں۔

ہاں اور کیا میں نے خود بھی ان لوگوں کو کتنا تنگ کیا تھا کہ ماؤں کی رسم میں جانا ٹھیک نہیں ہے مگر یہ سستی ہی کسی کی ہیں؟

نورین بھی نگار کی باتوں پر قائل ہی ہو کر بولیں۔

"لیکن آنٹی اگر تم غلطی گئے تھو تو انہیں اسی طرح ہی ہو تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کی شاید کوئی رشتہ داری تھیں جنہوں

نے ہمارے مزہ پر یہی ہونا چاہا تھا کہ وہاں کی بہنوں کا بھلا ماؤں کی رسم میں کیا کام۔ یہ تو ہماری ایک ہی رسم

ہے۔ انہیں رشتہ نہ گننے سے کہہ سکتے ہیں کیوں دیا اور اگر کبھی گئی تھیں تو ہم سے پہلے ہی چلا کر دیا ہوتا۔" دانیہ سے کوئی جواب نہ

بن سکا تو نہت سے ایک اور شکایت پیش کی۔

جی ہاں اور مزے کی بات یہ کہ نہایت آنٹی نے انہیں ڈانٹنے کے بجائے اللہ ہم سے کہا کہ ہم ان کی باتوں کا برا نہ مانیں۔

کیونکہ ایسے وقتوں پر بعض لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" مکہبت نے گویا تقریر دیا۔

”ہاں تو کہنے والے کی زبان تو نہیں بکری جاسکتی نا، البتہ تو کا نرورہ جاسکتا ہے، وہ بھی اگر خود اپنے کانوں سے سن لیا نہ لے
 نکارنے اس بات کو بھی غلام نہ کر کے ہوئے کہا۔
 ”جی ہاں تجھی تو اپنے کانوں سے سن کر انہیں نوکے کے بجائے زینت آئی نے لٹا نہیں لوگ دیا تھا۔“ دائرے ان کی بات
 کا مذاق اڑاتے ہوئے نہیں کر کہا تو دوسری لوگیاں بھی ہنسنے لگیں، نکار کو غصہ تو بہت آیا مگر انہوں نے بڑے عمل سے کام
 لیتے ہوئے کہا۔ ”خیر یہ تو لکنا تو نہیں سمجھنا ہوا۔“
 ”میں یہ سب نہیں جانتے، آئی ان کے دلوں میں ہماری طرف سے کھوٹ تھا، اس لیے انہوں نے ہمارے لئے یہاں سے
 کو بھی نہیں بخشا اور نہ عرف ان کی صورت کا مذاق اڑایا بلکہ میوہ فروش اور دافروش تک کہہ دیا۔ یہ ساری ان کی جالہ میں
 ہیں دلیل کرنے کی، تانہ جو جاتی دیر سے مرد بیٹلائے اور بگڑے ہوئے ہوئے بچے بچے تھی۔ اس نے نگار کی مسالماہ گفتگو پر
 جل کر کہا۔

”لیکن میوہ فروش اور دافروش کہنے سے کوئی میوہ اور دافروش بن تو نہیں جاتا اور یہ نہیں اس بات کو اپنا ویکٹ
 تو نہیں بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو چور کی ڈاوی میں تھکا والی ہائی ہو گئی کہ جو نہیں جلتے وہ بھی تھکا ہے اس طرح بھڑک اٹھنے سے جان جائیں
 اب میرے شوہر بکری دیکھ لو جن کے پاس آج اتنی دولت ہے کہ بڑے بڑے سیٹھ سا جو کاروں کو خرید کر چھینک دیں، انہوں نے
 بھی اپنا کار دیا بار نکال میں ہوں دے کر اس کیب کا ایک چھوٹا سا ٹوٹ (۱۵۳) خرید کر لیا تھا، تجارت میں اتنا مارا اور چھوٹا ہوئے
 ہی رہتے ہیں، اصل میں تو ساری بات قسمت اور مہارت پر منحصر ہے، کوئی ایکدم ہی ترقی کر کے بادشاہ بن جاتا ہے اور کوئی
 غنیمت کر کے آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، تمہارے دادا میوے کی تجارت کرتے تھے، ان کا وہ بڑا بڑا ٹھکانہ ہونے لگا تو انہوں
 نے کرلے کی دکان کھولی لی، اور جب اس میں بھی کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو تمہارے والد نے اسے ڈرگ اسٹور میں تبدیل کر لیا،
 جس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی، قسمت نے یاد دہائی کی، کاروبار روکھایا اور آج اعلیٰ پائے پر بڑھ کر رہتے ہیں، پھر ہلاکار
 انہوں نے مذاق میں تمہارے بھائی کو دافروش بھی کہہ دیا تو اس میں اس قدر مانڈ کر کے کی کیا بات تھی کہ آپس میں دل
 بڑے ہو گئے، نگار نے ایک تسلسل بات تو سمجھائی کہ غرض سے کہی تھی مگر دھڑلے میں بیٹھ کر کہی تھی یا پھر سادھے ساتھ
 ان لوگوں کی اصلیت ان پر جتا دی تھی، تانہ یہ تک کہ بولی۔

”جو ہنر بڑا مذاق میں کہہ دیا، آپ سے کہیں وہ ایسا مذاق اور آپ برا نہ مانیں تب میں دیکھتی، تانہ کا جو بہت گستاخ
 تھا، نگار کو بچہ بیچ ناؤا گیا، انہوں نے نوین کو غنا طلب کر کے کہا۔
 ”نوین! یہ تمہاری بھانجی تو بڑی گستاخ اور مزہ زور ہے، کیا تم لوگوں نے اسے بڑوں سے بات کرنے کی تیز نہیں سکھائی؟“
 ”نہیں، تیز تو ایسی سکھائی ہے کہ وہ سو روپوں کو بھی سکھا دے، لیکن چونکہ یہ غلط بات برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے،
 اس لیے ایک دم ہی ریش اندر کر اٹھتا ہوا جاتی ہے،“ نوین کے جیسے سرین بیٹی کی حمایت میں بولیں جو نگار کی باتوں پر پہلے
 ہی بیچ و تاب کھاری تھیں۔

”مگر یہ تو بڑی تباہ کن عادت ہے، سرین یہ ذرا ذرا سی بات پر ایک دم ہی ریش ہو جاتا، اور مجھے تو تعجب اس بات پر
 ہے کہ آپ اسے باز رکھنے کے بجائے الٹی شرف سے رہی ہیں، گویا دوسرے معنوں میں خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کے حق میں کانٹے
 پوتا ہوا رہے تو۔ یہ بیٹی ذات ہے اور اسے پرانے گھر کی جان ہے، اگر اس کی بدزبانی اور خردملاخ کا بھی عالم نہ تو اس کا ہانا
 کسی سے بھی نہیں ہو سکتا گا، اور اچھی تک تو میں بھی سمجھتی رہی تھی کہ ان لوگوں نے ضرور کوئی بے ہودگی کی ہوگی جو کنگڑی
 فوٹ آگئی، مگر آپ کی بیٹی کی چرب زبانی سے اس بیٹے پر پڑی ہوں کہ اس نے دانستہ آپ کے اداوان لوگوں کے درمیان تعلقات
 گھونٹنے کی کوشش کی ہے،“ نکار نے بھی انہیں اچھی طرح بتا دیا۔

”خیر، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میری بیٹی جیسی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، لیکن ان لوگوں نے واقعی بڑی
 کینگی کی نظر بڑھایا ہے، اور اپنے بیچ لوگوں سے کوئی رشتہ جوڑنا مجھے بالکل گوارا نہیں،“ سرین اپنی چہیتی بیٹی کے بارے
 میں نگار کی تائید کر لیں اور سچی لپٹی رکھے بغیر بولیں۔

”ہاں، آخر کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟“ نکار بھی غضب ناک ہو کر بولیں۔
 ”مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دیکھی کبھی کم از کم ہم تو نہیں کھانستے، یہ بھی بہت خلیعت ہے کہ ان کی اوقات ہم پہلے
 سے ہی۔ کھل گئی، اور اب ہم اپنے بیٹے کی شادی وہاں نہیں کریں گے،“ سرین اپنے روکے کی ماں ہونے کے زعم میں بڑی

غزوت سے بولیں۔
 ”نکار نے ہاتھ تو صاف ہو گئی۔“ نکار نے جذباتیں اگرائے ہوئے کہا، اور نوں سے بولیں۔
 ”تم اپنے جھوٹی میاں اور دوسرے کو بلاؤ، میں ابھی اور اسی وقت ان سے دو لوگ کھنکھو کر جاتا ہوں۔“

اور سرین جو روکے کی ماں ہونے کے زعم میں یہ سمجھ رہی تھیں کہ چونکہ وہ لوگ کے ماں ہیں اس لیے نکار ان کی باتوں سے
 معذوب ہو جائیں گی، نکار کے پورے دیکھ کر اور سب سے بڑھ کر اپنے شوہر جھوٹی اور اپنے کوان کے بلوانے کے خیال سے ہی ان کے
 چلے چوتھے گئے کہ ان کے دو لوگ تو کبھی تک کسی بات کا ملو رہی نہیں ہوا تھا اور نکار انہیں بلو کر ان سے اپنا کام یہ کہیں
 کہ تمہاری بیوی، سالی اور ماں نے رشتہ توڑ دیا ہے تو جھوٹی تو جڑنے کی مناسبت سے حیران ہی رہ جاتے گرمیاں اور میاں اس
 بات کو کبھی برداشت نہیں کرتے اور یوں بھی ان کے میاں مزاج کے بڑے تیز تھے اور غصے میں موقع عمل کا خیال نہیں رکھتے تھے۔
 نوں بھی اس خیال سے سخت ہراساں ہو رہی تھی، اس کی نگاہ میں نہیں آ رہا تھا کہ نکار سے کہے تو کیا کہے، اور جہین جنہیں جہین
 کی حاکمیت پر سخت غصہ آ رہا تھا اور وہ منہ پر نہیں بڑا ہلا کہہ رہی تھیں، آخر نکار سے بولیں۔

”نہیں، نہیں نکار! بہن! یہ سرین تو فحش غصے میں کہہ گئیں، آپ جی سوچو، بیٹیاں اپنے بھائی کی سسرال سے روتی پڑتی
 نہیں تو کون سی ماں ایسی ہوگی جسے غصہ نہیں آئے گا، آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے، جھلا ایسی معمولی معمولی باتوں پر بھی خدا نہ
 کرے کہیں رشتہ توڑا جا سکتا ہے۔ وہ بھی عین شادی کے وقت۔“

”نہیں، میں جیسا کہ آپا، برائی بیٹی کا معاملہ ہے دلوں میں پہلے ہی کھنڈت ہو گئی ہے، کل کلان کو لے آپ لوگوں سے کوئی تکلیف
 پہنچی تو وہ مجھے ہی کہے گی، اور پھر میرے گھر بھی بیٹیاں ہیں، میں کسی غلطی کی آہ نہیں لینا چاہتی، بہتر یہی ہے کہ کبھی اچھی دلوں
 کے سامنے معاملہ صاف ہو جائے، نکار اپنے اسی بیٹے میں بولیں۔

”دیکھا آپا اور سرین جیسا کہ اس تانہ کی بیوی کو، یہ تو اچھی معلوم کسی کا گھر تباہ کر دے گی اپنی ان حرکتوں سے، لہذا ابھی جھانسی
 کا گھر بھی نہیں کہ اس نے بڑا واکر رکھ دیا۔“ نوں نے نکار کی بات کو چپکے سے ہن کا فنیوہ کیا، تو سرین گہرا کر بولیں۔

”نہیں، نہیں، خدا نہ کرے جو میرے بیٹے کا گھر بڑے، تم کبھی کسی شوخ زبان بول رہی ہو؟“
 ”ہاں، میں تو شوخ زبان بول رہی ہوں اور تم جو چپکی کڑی سبک دیکھ کر کہنے پر لگی ہوئی ہو تو بڑے بات ہی نہیں، اب کہو نا ان
 سے کچھ نہ بھائی جان اور احمد اندر آئے تو ایک حشر بچا کر رکھ دیں گے،“ نوں نے ہن کا فنیوہ کیا، تو سرین کی اور کچھ
 کچھ میں نہ آیا تو گہرا کر دے لگیں۔

”اب رو کر کیا پڑا رکھ رہا وہ بیٹا، ناشا ہوا لوگ ان کے سامنے،“ جہین نے دانت ہیں کہ آہستہ سے کہا، دونوں بہنوں کے درمیان
 وہ واقعی سینڈ وچ بن گئی تھیں، جسے نکار سلام ٹرپ کر کے کوتاہی کھڑی تھیں، آخر عدلی سے آسنو پوچھ کر انہوں نے نکار سے کہا۔
 ”آئی ام ویری ساری مسز فرزند ملی! میں نے تو بس غصے میں کہہ دیا تھا کہ چاروں طرف سے کور ہو گئی تھی، در نہ شریفوں میں بھی
 خدا نہ کرے رشتے تو لگا کر رہے ہیں۔“

”نہیں نہیں، سرین! آپ اپنی بات پر شیعہ قازنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ کوئی نمسی کھیل نہیں بڑا ہی سیرس معاملہ ہے، اپنا
 فیصلہ بدلنے کے لیے کوئی آپ کو مجھ سے نہیں کرے گا کیوں کہ ناز کو رشوت کی کوئی کمی نہیں ہے، یہ آپ کے یہاں بات طے ہو گئی تھی۔
 در وین تو نر کی کہنے کے لیے اسے لپٹا چاہا ہے، خیر یہ تو ہمیں دیکھا جائے گا، مگر اس وقت تو آپ در وین کو بلاوے۔“
 ”نکار کسی شرف ناہوں ہی نہیں آ رہی تھیں، سرین نے ان کی بات سن کر ہی نہیں کی تھی بلکہ بیٹی کو بھی ان کے منگوایا تھا اور وہ ان
 لوگوں کی ساری اگر شکوہ نکال دینا چاہتی تھیں، در وین میں تو بہت خوش ہو رہی تھیں کہ سرے رشتہ توڑا نہیں، در وین وقت
 کے وقت نکار ناز و مہی متول کھانے کی لڑکی کا مستقبل اگر تارک کہ نہیں کرتا تو بہت سی انہوں اور مشکلات مزور پیدا کر دیتا ہے،
 کراؤنی اوپر اہم کر لے گی ہو یا غریب کھانے کی، اس معاملے میں میل کیا ہو مال ہی نہ کرہ جاتی ہے کہ جسے قسمت کی بیوی کوئی کل توڑ
 سکتی ہے، نکار کا جواب سن کر سرین کی کچھ کچھ میں نہ آیا کہ یہ کیا کہیں تو انہوں نے نوں سے کہا۔

”تم ہی انہیں کھاؤ نوں! آخر یہ تمہاری اتنی برائی دوست ہیں۔“
 ”میں کچھ کھاؤں، نہیں، تم نے تو اپنے بیٹے کے گھنڈ میں آکر کوئی گنہ گار ہی نہیں چھوڑی، اس مانگہ دار کی چھوڑی کو بھی ان
 کے سر جو دھوایا، یہ معلوم ہوتے ہوئے ہی کہ وہ دانتے ہیں، اور میری دوستی کے بل پر تیری پورے دودھ معافی کرنے آئی تھیں۔
 تم نے لڑکی دوستی کو بھی ختم کر دیا، نوں جیسے انہیں کاٹ کھانے کو دوڑیں، تب میں نے نکار کا ہاتھ پکڑ کر عاجزانہ سے کہنے

”احمد بہت خود مختار ہے وہاں کی باتوں کو گردانا بھی نہیں اور پھر ناز و اس کی پسند ہے۔ سرزن اور تانیہ سے جو بدتمیزی کی ہے اس کی میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ سرزن کو ایک موقع ادا کرنے کے بعد کسی کو بھی اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی اور تب نگار نے قدرے نرم پڑے ہوئے کہا۔

”نکال ہے مرعوب آپ! آپ مجھے کیوں شرمندہ کرنے پر تکی ہوئی ہیں۔ آپ سے تو مجھے کوئی شکوہ ہی نہیں۔ سرزن سے ہی کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ میں توجیح والی ہوں۔ سرزن نے رشتہ توڑنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ ابھی کے ابھی فیصلہ ہو گیا۔ تاکہ ان لوگوں کو بھی انتظار کی سولی پر لٹکا نہ پڑے اور بس۔“ نگار سے بھلا کوئی جیت سکتا تھا۔ مرعوب کا دل سی ہو کر بولیں۔

”ہاں۔ یہ تو آپ سولہ آئے درست ہی کہہ رہی ہیں۔ لیکن سرزن نے آپ سے معذرت تو کر لی ہے۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ بچوں کا شکلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یہ سرزن میری بہن تو ہے لیکن مجھ سے اور نوین سے بہت مختلف فطرت پائی ہے۔ یہ عقل سے کم کام لیتی ہے اور لوگوں کے مشوروں سے زیادہ اس کی خند و مٹیوں نے بھر دیا تو بلا سوچے مجھے اتنی بڑی بات کہہ گئی مگر اب چھٹا رہی ہے۔ بے چاری۔“

”یہ جلیں چھڑیں۔ لیکن ان سے یہ ضرور کہہ دیجئے گا کہ آئندہ عقل سے ہی کام لیں۔ کیونکہ پرانی بیٹی کو بیاہ کر لانا بڑی ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔“

”نگار نے یہ بات کہہ کر گو یا بات رفت گزشت کی۔ سرزن بھی خاموش اور نام لکڑی یہ سب سن رہی تھیں اور وہ غلطاً اپنی بری بھی نہیں تھیں۔ اصل میں میں ان کی بدتراجی کی وجہ سے ان کی قوت فیصلہ کو درہنگی تھی۔ اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ایک شہنشاہ بن کر لڑتا تھا۔ اس لیے آپ انکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہاتے ہوئے انہوں نے نگار سے کہا۔

”اب اس مسئلے میں کچھ کہوں گی تو آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ دروازہ تو دو بجے دل و جان سے عزیز ہے۔ وہ تو شیطان نے معلوم مکان میں کیسی شر پھونکی تھی جو میں ان بیویوں کی باتوں میں آگئی۔“

”خیر شیطان نے تو کیا اس تانیہ نے بھی بھونکی ہوگی۔“ نوین ہل کر بولیں۔

”یہ تانیہ تو بے ہی سدا کی شری۔ باپ کی فہمیت آئی ہے ساری اس میں۔“ مرعوب شاداب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر بولیں تو ہر طرف سے ہنسنے لگے تو نگار سے رستہ دیکھ کر تانیہ نے رونا شروع کر دیا۔

”پلو زارہ شمسو سے مہلاؤ۔ یہ سارا فتنہ تمہارا ہی ملکا ہوا ہے۔ اٹھ کر اپنی کوسری کہو۔ بڑی زبان ہو گئی ہے تمہاری مجھے اب اس کا بھی علاج کرنا پڑے گا۔ بیٹھو کسی طرح اور اپنی کوسری کہو۔“ سرزن نے آخری فقرہ بہت غصے میں کہا۔ تو قدرے تامل کے بعد تانیہ بخیر نگار کے قریب آگئی اور چہرہ تھکا کھینچنے لگی۔

”آئی ویری سوری۔ میری سوری آگئی۔“ تو نگار نے بھی محض روتا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اٹھ اٹھ رات تانیہ! چلو کوئی بات نہیں۔“ اور نگار کا اٹنا کہنا تھا کہ تانیہ ان سے لپٹ گئی۔

”نہیں! آئی! پہن میں بہت روڈو گستاخ ہو گئی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا جو میں نے آپ۔ آپ۔“

باقی فقرہ اس کی سکینوں میں گھل گیا۔ ”اٹ، تو گھر کے ماحول میں تفتاد کے باعث اس گھر کے کچھ بھی وہابی انشا کا شکار بنی۔ درختانی بیانیہ ذات سے اتنی بڑی نہیں ہے۔ امیر جو با غریب با پھر بیچ کا طبقہ۔ یہ المیہ تو تقریباً ہر گھر سے گھر کا نصیب ہے۔“ نگار نے تانیہ کی باتوں سے متاثر ہو کر دیکھ کر سوچا۔ اور پھر نہیں بولیں۔

”بھئی! سوری تو مجھے نہیں زینت کو کہو۔ کیونکہ تم ان کے لیے خاصے شے بستے گھر کو دے رہے ہو۔“

نگار کا دل چاہا ساتھ کے ساتھ یہ بھی شاداب کی زبان سے تو اس پریشانی میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ مگر مصلحتاً بات دو گئیں۔

”نہیں بھلا! یہ کس مزے ان سے کچھ کہی گئی۔ خود ان سے معذرت کروں گی۔“ سرزن بولیں۔

”نہیں۔ آپ کو معذرت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ نگار نے کہا۔ ”وہ ان کے مزید کچھ کہتے ہیں۔“

”کیوں۔ کیا میں اس قابل ہی نہیں کہ۔“ تو نگار نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بلکہ یہ مقصد یہ تھا کہ انہیں کچھ علم ہی نہیں کہ یہاں کیا باتیں ہوتیں۔ میں نے کیا پوچھا اور آپ نے کیا بتایا تو پھر معذرت و غیرہ کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔“

”ہاں، یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔“ مرعوب بولیں تو نگار نے کچھ سوچ کر کہا۔

”آپ ایسا بڑی نرمی سے کہہ فون پر ان کا شکریہ ادا کر دیں۔ وہ اصل میں اس پریشانی میں مجھے تو خیال ہی نہ رہا۔ آپ کی باتیں چونکہ خبر کو کھاتے ہیں اس لیے زینت نے میرے ساتھ ان کا کھانا۔ بھیجا تھا جو میں نے کئے ہی آپ کے ملازم سے کہہ کر کہیں میں کھوا دیا تھا۔ بس آپ اسی بات پر ان کا شکریہ ادا کر دیں۔“

”اوہ دندل۔“ یہ تو آپ نے بڑی اچھی ترکیب بتائی۔“ ان کے مشورے پر نوین نے خوش ہو کر کہا۔ ”تو بے سانس ہی کہنے میں رکھے فون کی طرف کہیں اور جلد جلد زینت کا ممبر فونل کر کے ریسور کان سے لگایا۔ اور سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہیلو! کہتے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“

”اچھا! اچھا! خدا شیک ہی رکھے۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس قدر تکلیف کیوں کی یہ کھانا بھیج کر۔“

”وہ تو طبیعت ہے لیکن یہاں بھی جو وال دیا ہوا تھا وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ پھر یہ تکلف برتنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ اصل میں چونکہ آج کل ماشاء اللہ ہمارا گھر بھی مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اس لیے تقریباً سارا دن ہی سخت محروم گزرتا ہے۔ تانیہ کے سر میں بھی درد ہو گیا تھا۔ وہ تینوں بھی دن بھر کی ٹھکی ہوئی تھیں آئے ہی پھر جو نوین کو اب میرے خیال میں تو صبح سے پہلے نہیں اٹھیں گی۔“

”جی نہیں، مجھے تو انہوں نے بات ہی نہیں کی۔ اصل میں تانیہ کو اکثر درد کی شکایت رہتی ہے اور جب درد ہوتا ہے۔ تو وہ کھانا پی پی بھی نہیں۔ کمرے میں جا کر سو جاتی ہے۔“ پھر سرزن نے ماؤ تھ پیس پر ہاتھ رکھ کر نگار سے پوچھا۔

”آپ کو پوچھ رہی ہیں۔“

”کہہ دیں کہ آئی تو قیاس کی ضرورت ہی چلی گئی ہیں۔“ نگار نے کہا تو سرزن ماؤ تھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر بولیں۔

”وہ تو کب کی جا چکیں۔ بہت جلدی میں نہیں شاید۔ میں نے بہت روکا مگر کی نہیں اور کھانا دے کر چلی گئیں۔“ صبح آپ نے تو شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔“

”اچھا۔ اچھا بے حد کمر۔“ بڑی لوازش۔ آپ نے یہیں یاد تو رکھا۔

”نہیں نہیں شرمندہ کرتی ہیں آپ۔ اچھا خدا حافظ۔“

”آج تو سرزن نے کچھ زیادہ ہی عقل سے کام لے والا۔“ درز آپ نے کچھ اور ہی بتایا تھا۔ نگار نے اس کے مرعوب سے کہا تو وہ زور سے ہنسنے لگیں۔ پھر نگار کا جرات سے کہہ لیں تو سب انہیں باہر تک چھوڑے آئے۔ تو پچھتے کہیں سے انہیں مرعوب کی آواز سنائی دی۔

”ارے میں کین میں جا کر دیکھتی ہوں کہیں وہ کم خست مارا اچھا نہ جانے کڑی بڑی بوئیاں نہ نکل گیا ہو۔“ تو انہوں نے گھر کا رخ کرتے دل میں سوچا۔ ایسی ذہنیت کا اظہار تقریباً ہر گھر میں ہی پایا جاتا ہے۔ حالانکہ پیٹ میں ہانے کے بعد سب کا کھانا پیا کھا دیں جاتا ہے۔ اور پھر اپنی اس سوچ پر آپ ہی آپ ان کے چہرے پر سکراہٹ دوڑ گئی۔

”اب آپ کل تو بالکل ہی محروم نہیں ہوں گی کیونکہ سینٹھ صاحب جاپان شریف سے جا چکے ہیں۔ اس لیے میں ابھی سے کہنے رہی ہوں کہ آپ کے لئے بغیر میں دہن والوں کے یہاں مہندی لے کر نہیں جاؤں گی۔“ سرزن نے ان کے کارب پیچھے سے پہلے بڑی اچانکیت سے کہا۔

”اوہ۔“ تو نوین انہیں گراہی میٹھ ہوا لیکن اس تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ کے انٹیمیشن کا رد تو پہلے ہی مل چکے ہیں۔

”میں خود ہی آجاتی۔“ نگار نے کہہ دیا تو دینے کے انداز پر نہیں بولیں۔

”تکلف نہیں انٹیمیت ہی ہے نگار۔ اور صرف آپ کا ہی نہیں مہندی، بارات اور دیکھ سب ہی کا بلا واسطہ آپ کو کل شام کے سات بجے تک یہاں موجود ہونا چاہیے۔“ نوین نے کہا۔ تو نگار نے بولیں۔

”ماہو۔ ہو۔“ یہ تو سرزن سے بھی بڑی قہرٹ ہو گئی۔ پھر تو آدھ گھنٹہ قبل ہی مجھے یہاں حاضر ہونا پڑے گا۔ اچھا بخیر منور آؤں گی۔ تم لوگوں کے محبت میرے انٹیمیشن کا شکریہ۔ او۔ کے خدا حافظ۔“ پھر وہ دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھی ہوئی بولیں اور کار اسٹارٹ کر کے انہوں نے زینت کے گھر کا رخ کیا۔

”مگر بہاؤ میں کہہ رہی تھیں کہ یہاں کیا باتیں ہوتیں۔ میں نے کیا پوچھا اور آپ نے کیا بتایا تو پھر معذرت و غیرہ کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔“

رات کے آٹھ بجے پھر مرعوب کے بنگلے کا نام تھا۔

اس سے چراناں کا ساگن ہو رہا تھا۔
 گنگا شتر تین روز سے پوری غارتی کی گاہیں کی طرح ہوتی غلوں سے بھی تھک کر رہی تھی مگر آج اس گنگا کاہٹ میں کچھ زیادہ
 ہی اضافہ ہو گیا تھا، کہ درخت اور پودے حتیٰ کہ باؤنڈری وال تک تلخے سے رنگ برنگے برقی تھکے ستاروں کی طرح چمک
 رہے تھے۔

آج صبح کی کیرم بھی اور دوما دے کچھ درقیل ہی مہندی لاسے تھے۔
 گوہر، سہم خالصتا خاں کی ہی موتی ہے مگر دوسرے لڑکیوں کے ساتھ دو دھاکے کچھ کڑی بھی آئے تھے اور دوسرے بھی دھن کے
 بھائی اور کزن وغیرہ اس رسم میں موجود تھے اور اس کے اس قدر شور مچا رہا تھا کہ گاؤں کے پٹے پٹے ہوئے غلوں پر رہے
 تھے۔ کہو کہ دو دنوں طرف سے یہ گاؤں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

تانیہ وغیرہ پوری تیاری سے آئی تھیں، اور ایک سے ایک گلنے والی لڑکیاں ساتھ لائی تھیں اور ادھر بھی لڑکیاں ہی
 تو ہی تھیں مگر ان میں ناز پرور، نیکو اور لیلیٰ کی چند سہیلیوں کا اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔ برسا اور دھم مال میں ہو رہا تھا۔
 گویا مقابلہ کا جتن بٹھا اور کوئی بھی پارٹی ہار مانتے ہوئے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور اس کا گمان کہ مورہا تھا اور دھم مال
 تالیوں اور چٹوں جی کے تلیوں کی آواز میں زیادہ نمایاں تھیں۔ اس پر تھپتھپ اور غور غور اور چٹوں کی پیچ و پکار، کم از کم سندر
 کے لیے یہ سب ناقابلِ رواست تھا۔

وہ لڑکی بھی ماں کے اصرار پر مہندی کی رسم دیکھنے چلا آیا تھا۔ ورزاسے ایسی ہنگامہ خیز عقل میں شریک ہونے کا ذرا بھی
 شوق نہ تھا۔ اور نہ ہی اس کے کسی مقصد سے یہ لڑکی تھیں نہ ہی ایک تو تانیہ وغیرہ کے ساتھ روزنامہ بھی آتی تھی۔ دوسرے دوما
 والوں کے ساتھ اور بھی نئی صورتوں کی لڑکیاں آئی تھیں جو روزنامہ سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت، طرح دار اور متول تھیں۔
 اور چونکہ ریت کی خواہش تھی کہ اسی کی نظر انتخاب کسی ایک پر پڑ جائے۔ اس صلیت کے پیش نظر وہ باقاعدہ طور پر بستے کو
 آہستہ آہستہ کے باسے میں بناتی بھی رہی تھیں کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ مگر اس قدر جب عادت میں ایک ہی نظر ڈال کر
 دوسری طرف منوج ہو جاتا، اور وہ شروع شروع جب آپس کے مقابلے میں کچھ ناامنی اور ناگہانی تھی۔ بڑے شوق اور جیسی
 سے سب کچھ دیکھتا اور سن رہا تھا۔ مگر جب اوپر سے اپنے نگاہوں سے آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے، کچھ لڑکیوں نے لڑکے
 بھونڈے بن سے اپنا بھی شروع کر دیا تو اسے وحشت سے بھونڈے لگی جب تک ماں قریب کھڑی رہیں وہ دل پر جرح کے ٹوکوں
 کھارہ مار غرور جی اس کے پاس سے نہیں وہ لڑکیوں اور غور غور کے اثر و مل میں سے اپنی جگہ بنانا مال سے باہر نکل آیا۔
 اور اس خیال سے کہ اسے چپکے سے کھسکا دیکھ کر کہیں کوئی پھر اسے زبردستی اندر نہ لے جائے۔ وہ لاؤنچ بابا کی طرف
 سے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کچن سے طعنہ پڑی میں آ گیا کہ ایک تو بیاں بھی لگ رہی تھی۔ دوسرے بیٹری سے بھی
 ایک راستہ باہر کی طرف۔ جانا تھا جس کا دروازہ ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ مگر اسے کھولا تو جاسکتا تھا۔ لیکن بیڑی میں قدم نہ
 ہی جیسے اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم کیلکھتے کسی نے جکڑے لیے۔ اور وہ جہاں تک آیا تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔

کیونکہ اس نے ہی سلوٹ کھڑی تھی۔
 بزرگای، رنگ کے پکے پکے کام کے تنگ پا جامہ سوٹ میں ملہوں۔ گاؤں میں بزرگیوں کے جڑاؤ اور بے پنے کچھ چیل
 میک اب میں وہ کچھ ایسی قیامت لگ رہی تھی کہ اپنی جگہ پر ٹھٹکا۔ وہ کچھ دیر تک ہلکی چھپک چھپک کر اسے دیکھتا رہ گیا اور
 وہ جفرج کھولنے کھولنے اس پر نظر پڑتے ہی کسی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر کہیں کسی شہنائی کے لے رہی یا نہ یہ سمجھا
 کہ وہ فرج کو کس طرف سے کھول رہی تھی۔ پھر کچھ دیر تک اسی کم صم کی کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد اس کی موجودگی کو نظر آنا
 لگا وہ اندر جانے لگی تو اس نے بڑھ کر پوچھا۔
 "وہ چھپکوں نہیں آئیں؟ اور وہ جاسے جاتے رک تو گئی مگر بولی کچھ نہیں۔"

"سب خیریت تو ہے نا؟" اور جواب بھڑنار دی تھا۔
 "تھ۔ تم۔ آپ یہاں کیسے نظر آ رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو بھی سب کے ساتھ اندر ہو جانا چاہیے تھا آج تو
 مہندی کی رسم ہے۔" اپنے دو دنوں سوالوں کا جواب دینے کے باوجود وہی اس نے پھر پوچھا۔ مگر وہ غوٹوں پر غاموٹی کی ہر
 لگائے ٹری سے نیازی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
 "اے سہو۔ میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں یعنی کہ مراد احمد اسفند۔ سمجھیں آپ۔" وہ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے

ہوئے بولا۔ انداز بھی برہم سا تھا۔ تب اس نے ایک نیکی سی نظر اس پر ڈال کر مڑی تانے سے کہا۔
 "اودہ بڑی فائز ہے آپ کی کہ آپ مجھ سے خطاب ہیں لیکن میں اس بات کی پابند تو نہیں کہ آپ کی بات کا جواب دینا

ضروری سمجھوں۔"
 خیر آپ ضروری سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ صرف ناخبی کی بنا پر میں نے آپ سے اتنا
 غلط رویہ اختیار کیا تھا جس پر مجھے بہت افسوس ہے۔ اس کے اس قدر کہ اسے کیلے جواب کے باوجود وہ معذرتی سے پیچھے ہٹ گیا بولا۔
 "لیکن مجھے تو کسی کے غلط یا صحیح رویے کی بالکل پروا نہیں۔ آئی کیر فور پور روز۔ اس نے غوت سے کہا اور پھر اس
 کے قریب سے راستہ بنا کر بیڑی سے باہر نکل گئی اور اس کے جواب پر وہ اپنا سامنے بے وجہ تاب کھانا رہ گیا کہ اس کے جواب
 دینے پر پہلے ہی تاؤ کھا رہا تھا۔ پھر ہی گئی اور اگلی ہی چھوٹی کے تعلق خاطر سے وہ اخلاقی رت گیا تھا۔ ویسے بھی یہی سمجھ
 رہا تھا کہ وہ اس کے اس قدر جارحانہ رویے پر اس سے اپنی بدظن ہو گئی ہے کہ جواب نہیں دے رہی۔ تبھی تو اس نے اپنی غرت
 اور عادت کے خلاف اس سے اپنی نہایت برقی تھی کہ معذرت بھی کر بیٹھا تھا۔ مگر اس کے غوت بھرے جواب نے تو اس کے
 سارے بدن میں جیسے چنگار یا سی بھڑکی۔

اس ستائیس اٹھائیس سالہ زندگی میں اس کا واسطہ بہت سی لڑکیوں سے توڑا تھا مگر شناسائی کی حد تک ہی۔ کیونکہ
 وطن کے تعلیمی دور اور کچھ میں رہائش کے دوران بہت سی لڑکیاں جو اس کی ہم جماعت تھیں ان سے وہ ہنس بول بھی لیتا تھا۔
 اور ان کے ساتھ بھی کبھی محو مچھ رہی لیا کرتا تھا۔ مگر اس نے کسی کو ضرور غنا نہیں سمجھا تھا جتنا کہ اس لڑکی کو سمجھا اور اب اس
 کے گلے سے جواب پر اسے شخص اس پر نہیں بلکہ اپنے اوپر کرتا تھا کہ اس نے کیوں اس لڑکی کو اتنا مزہ لگایا۔ کہ اس کے جواب نہ
 دینے پر بھی سوال پر سوال کرتا رہا جب اس نے پہلے ہی سوال کا جواب نہیں دیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی تو اسے وہیں چھوڑ
 کر اپنا راستہ لیتا۔ مگر ایک تو اپنے نانا داسلوک پر معذرت کرتا اور پھر اس کا راستہ بھی روکتا۔ یہ اس کی حماقت نہیں تھی تو اور کیا تھی
 وہ چٹری سے نکل کر اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی دیر تک کھڑا ہوا موٹو لیے ہی سب سوچتا رہا۔

گاؤں کا مقابلہ تمام ہو کر برابری رہا تھا۔ تو مہندی کی رسم ادا کی جانے کی اونا زبردور کوال میں لاکر مسند پر بٹھایا گیا اور
 انہیں پیچھے کپڑوں پر زرد رز کی کام کا بھاری دوپٹا اوڑھ لیا گیا۔ پھر اس کی ہونے والی نندوں اور دواہ کے رشتے کی بہنوں
 اور بھانجروں نے اس کی پٹیلیوں پر مہندی چھائی۔ بھجوں کا گھنٹا اور جوڑت بڑی میں ساتھ لے گئے تھے۔ ان ہی میں سے
 دو بھاری بیٹھ پر مہندی لگے۔ پھر اس نے بھجوں کا گھنٹا بھی پہنایا۔ چاندی کا ورق کی ہوئی بھری کھلائی اور انہیں نے بھی
 چاندی کا ورق لگا لگا لگا پان کا بیڑہ کھلایا۔ اس کے ساتھ ساتھ گود بھرائی کی رسم بھی ادا کی گئی۔ گود کا میوہ جو سوچنے کے ساتھ لایا
 تھا چوکھ بہت زیادہ تھا اس لیے اس کا ایک چوتھائی ایک زر کا کٹنے، میں بھر کر دھن کی گود میں رکھا گیا۔ اس کے بعد
 نظر لڑکا صدقہ نامہ کر جان کا صدقہ آتا رہا۔ تب نگاہوں سے سب سے پہلے دھن کی دودھ پلائی کی رسم کے طور پر سو سو کے کٹی
 ٹوٹ اس کی گود میں رکھ دیے۔ ان کے بعد نسرتین، مچھیں اور قرین نے اور ان کے بعد دوسری مٹر خواتین نے یہ رسم ادا کی۔
 اس کے بعد دواہ کی ساری نہیں، بھانجروں اور بھانجیاں بھتیجیاں ناز پر دو گھیرے بیٹھی تھیں اور تانیہ جھک جھک کر
 ناز کو دیکھے جارہی تھی اور اپنی خوش اور شاش بشاش نظر کر رہی تھی کہ گنگا شتر روز کی ساری کدورت ناز پر در کی ساری
 بہنوں اور بزرگے دل سے جھٹ گئی تھی۔

"ہائے دیکھیں دھرمی! ہماری بھانجیاں بغیر میک اب کے بھی کتنی حسین لگ رہی ہیں جیسے بڑی چٹوں میں گلاب
 کی کوئی تو خیر گل۔" سچ تمہی جیٹا تو انہیں دیکھ دیکھ کر بالکل ہی ہو جائیں گے؟
 "ماں تو یہ ہے ہی ماشا اللہ تانتی خوبصورت اور پیاری پیاری ہی سمجھ تو مہنے اسے اپنی بیٹی بنایا ہے۔" نسرتین ناز کی طرف ہلکے
 بڑے دلدار سے بولیں۔

"مجھ میں ان کی ایک جھک دکھانے کیا بھیا کو ضروری دیکھے لیے یہاں بلاؤں؟" تانیہ نے ماں سے پوچھا۔
 "شش۔ کیا دیوانی ہوئی ہو۔ وہ بھلا اس وقت یہاں کیسے آسکتا ہے۔ وہ تو بس کل آکھا ہی اس کا عروسی جلوہ
 دیکھے گا۔" نسرتین نے پیار بھرے انداز میں اسے گھر کتے ہوئے کہا۔
 "اودہ فوجی! یہ تو سخت زیادتی ہوئی جیٹا کے ساتھ۔" یہ بھی ہے وہ ان کو دیکھنے کے لیے کتنے بے تاب ہو رہے تھے۔
 بھلا کل تک انہیں چہن کیسے پڑے گا بلا انہیں دیکھے۔" تانیہ بولی۔

”یہ بیٹھے بٹھائے نئی کیا مانی ہے تمہارے دماغ میں تائید بہتر ہے کہ خاموش رہو“ فرین اسے ٹرانس کے انداز میں بولیں اور وہ چڑکچڑکے کہنے ہی والی تھی کہ ابھی اس کی نظر سامنے ٹھہری سلوٹ پر پڑی۔ تو سب کچھ بھولی بھال کر اس نے پاس بیٹھی زینت کا شانہ ہلا کر اہستہ سے کہا۔

”ملنے ذرا دیکھنا یہ س یونیورس دسینہ عالم، یہاں کیسے ٹپک پڑی؟“ تو زینت نے بھی سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی سلوٹ کی طرف دیکھا اور بولی۔

”ماں واقعی۔ مگر یہ بے کون؟ تو اسے جواب دینے کے بجائے تائید نے نیلو فر سے پوچھا۔

”اے سونیو فر یہ سامنے جو ایک آفتی ہے کھڑی ہے یہ کون ہے؟“

”یہ ہے سلوٹ ہیں“ نیلو فر نے گول مول سے انداز میں بتایا۔

”کون سلوٹ؟ کیا تمہاری کوئی کزن ہیں؟“ تائید نے سوال کیا۔ تو نیلو فر قدر سے ہٹا کر بولی

”نہیں۔ کزن تو نہیں ہیں۔ بس ان سے ہمارا کچھ ایسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسے تمہارا شاہین رضا سے“ اصل میں شاہین تائید کی بڑی چھوٹی بھی کی شہر تھی۔

”او۔ اچھا اچھا۔ یعنی سمدھیانے کا رشتہ ہوتا ہے تمہارا ان سے مگر اب تک تم نے انہیں کہاں چھپا رکھا تھا؟“ تائید مسلسل سلوٹ کی طرف دیکھ کر جاری تھی نیلو فر کو تائید کا سلوٹ میں دھسے لینا کچھ اچھا نہ لگا۔

”بھئی میں کیوں چھپاتی انہیں۔ یہ خود ہی کچھ آدم ہیں اسی شے ہیں کسی کے سامنے آتی ہی نہیں ہیں۔“

”اصل میں ان کے ساتھ کچھ ٹوٹ چکی ہوئی ہے اس لیے یہ سب سے الگ تھلک ہی رہتی ہیں“ نیلا بولی۔

”ہائے دیری سید۔ مگر ابھی کیا ہو چکی ہوئی ہے؟“ تائید نے انہیں کہتے ہوئے بہت جھجھک سے پوچھا۔

”اچھی طرح تو معلوم نہیں لیکن شاید ان کے ٹیکٹر نے کچھ بے وفائی کی ہے۔ یا پھر وہ بھلا گیا ہے۔ بس اسی کے نام میں دنیا تیاگ بیٹھیں ہیں“ نیلا کے بجائے نیلو فر نے بتایا۔

”اف ہائے دیکھو تو ذرا گلاب کا نو شگفتہ بھول گئی رہی ہیں یہ تمہاری چھوٹی بھی کی ان لازم سے جو میں نے تائید سے ان لازم سے جو میں کچھ اس طرح کہا کہ اگر وہ بیٹھی لڑکیوں کو ہنسی آگئی۔

”پتھ مجھے تو انہیں اس بات پر کہ میں نے انہیں بہت دیر میں دیکھا۔ پہلے دیکھ لیتی تو اپنے بھیا کے لیے انہیں ہی سلیکٹ کرتی“ تائید نے زینت کے کان کے قریب سرگوشی کی تو زینت اسے ٹھوکر کر بولی۔

”چلو فضول باتیں نہ کر دوسری نے سن لیا تو خواہ مخواہ ہی“

”سن لیا تو سن لے لیکن میں نے ایسی اور کچھ بیوی نہیں دیکھی۔ سچ لگتا ہے اللہ میاں نے اسے اپنے ہاتھ سے گھڑا ہے“ تائید جب عادت اوکھی آواز میں بولی اور اوتار جھٹی ہوئی کہنے پر تو زینت بہت لوٹ لوٹ گئی ”نیچے ابھی ناز کی تعریف میں مینہ خشک ہو رہا تھا اور اب سلوٹ کے آگے انہیں سب پتھ نظر آ رہے ہیں“ دختشاں نے سکڑا کر کہا۔

”ہاں اور ذرا لشجیات ملاحظہ ہوں“ عمیرہ ہنس کر بولی۔

”تشجیات کیسی۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی۔ میری بھائی تو بالکل ایسی کلی لگ رہی ہیں جو کسی دم بھی کھٹنے والی ہو جس میں تو خیر بھی ہو اور بات بگڑتی بھی۔ اور یہ آپ کی سلوٹ یہ واقعی کسی نو شگفتہ بھول کی طرح ہیں۔ جس میں نزاکت مہک اور درخشاں ہوئی ہے جیسے کچھ دیر پہلے ہی کھلا ہو۔ بلکہ پورا ہی کھل گیا ہو“

اور تائید کی بے مکی تشبیہ دینے پر سب بری طرح ہنسنے لگے۔

”اے یہ اپنی ناز کی نند تو بڑی پٹا خن ہے کیسی کتنی کی طرح زبان چل رہی ہے اس کی“ تھوڑے فاصلے پر بیٹھی شعیب کے رشتے کی ایک چھوٹی سی سردار جہاں بیگم نے کٹر جہاں سے کہا۔

”اے ماں آپا سردار جہاں بیگم آج کل کی لڑکیوں کی زبانوں کے تو مانتو ہے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں“ کشور جہاں بولیں۔

”اے ٹوٹے کیا بلکہ جانا ہے نہیں گئے مانتو ہے۔ بے مانتووں کے پید ہو رہے ہیں آج کل“ ایک اور عزیزہ کلثوم نے گردن کو شانوں میں دباتے ہوئے دہانے کو بھلا کر کہا تو فرنگ خواتین ہنسنے لگیں۔

”اے پیچھے بیگم کو رڈوں اربوں سالوں سے بھی زیادہ عرصے سے آسمان پر جو روحیں جمع ہیں وہ اب بوڑھی ہو کر تو زمین پر اتر رہی ہیں نا۔ آج کل تو چھٹی کے اندر اندر ہی ٹوٹو لوٹنے انہیں ملتے ہی مسکرانے لگتے ہیں جبکہ تمہارے

زمانے میں پانچویں چھٹے مہینے کہیں جا کر پتھر صوڑیں پہنچا رہا تھا“ ایک اور خاتون بولیں۔

”اے ماں بہن۔ اصل میں قرب قیامت ہے۔ ہمارے بڑے کہتے تھے کہ قرب قیامت میں گائے تو میں گے پتھر تری گے جھل میں منگل ہو گا۔ ملک میں منگ نہ رہے گا۔ مٹھاس میں مٹھاس نہ رہے گی۔ گائے کو کھائے گی اور کواڑی برائے گی۔ یہ سات نشانی ہیں قرب قیامت کی اور جب کواڑی برائے گئے گی ہے تو وہ بھیا کی ہی تو کھائے گی۔ اور دیکھ تو آج کل کی

لوکیاں کیسی بے حجابی کی باتیں کرتی ہیں۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ اور نہ موقع محل کا خیال۔ زبان کے آگے کنواں لڑکائی کیسی بے حجابی کی باتیں کرتی ہیں۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ اور نہ موقع محل کا خیال۔ زبان کے آگے کنواں

آگے یا کھائی کیس بولے ہی جلی جالیں گی“ کشور جہاں نکتہ چینی کرنے کے انداز میں بولیں۔

”اے ماں آج کل کا تو واقعی یاد آؤم ہی نرالا ہو گیا ہے۔ لڑکوں کی تو خیر بات ہی دوسری ہے مگر لڑکیوں کی آنکھوں کا تو بانی ہی چل گیا ہے۔ اے ذلیلا نہ تو دیکھو۔ کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکیاں بالیاں لڑکوں کے ساتھ مل کر کاتی اور ناچتی ہیں اور لڑکیاں ہر دنگا جاتی ہیں کہ شیطاں بھی چلو بھرا پانی میں ڈوب مارتا ہوگا۔ اے ہمارے زمانے میں اگر لڑکیوں کے یہی

طور چلن ہوتے تو آٹاں یاد آتیں زمین کھود کر گار دیتے“ سردار جہاں بیگم نے کہا۔

”اے پیچھے بیگم، جیسا زمانے کا چلن ہوتا ہے اس کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ اب یہ زمانہ ہماری تیسویں نسل کا ہے۔ اور پہلے سے بہت زیادہ نرمی بھی کر گیا ہے۔ اب اس زمانے کی بچیاں آپ کے زمانے کے رواج اور دستور پر کچھ

جائیں تو موجودہ زمانے کے بھٹوں کو ہی کن کر رہ جائیں گی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جہلم اور کوہا ہو جھڑکی تو کچھ غلط تو نہیں کہتے۔ انسان کو زمانے کے ساتھ چلنا ہی پڑتا ہے“ عائشہ بیگم ان لوگوں کے اعتراضات سے انکار کر بولیں۔ اور ابھی رینب اور ناز نے آکر سب کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہاں والوں سمیت سب ہی نے کھانا کھانے کی عرض سے لازمی

تھے شامیوں کا رخ کیا۔

باہر شامیوں کے نیچے کس حساب کتاب نہ تھا۔ یعنی خواتین کے ساتھ کھڑے مرد اور مردھیانے سے آگے بڑھ کر بھی کھانے میں شریک تھے۔ کہ پیکاز زینت کو بیٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے پہلے سارے مہمانوں میں

اسے ادھر ادھر تلاتا کیا بھی عائشہ بیگم نے ٹوکے اسد سے پوچھا۔

”یہ بابا نظر نہیں آ رہے اسد بیٹے کیا تم نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے تو اندر مل میں ہی تھے مانی جان۔ کہیں اپنے کمرے میں نہ چلے گئے ہوں یا پھر اندر ہی کہیں رہ گئے ہوں“ اسد بولا۔

”اے تو ذرا دیکھو تو جا کر آخر چلے کہاں گئے۔ یہاں تو کھانا بھی شروع ہو گیا اور مجھے مصروفیت میں خیال ہی نہ رہا“ اسد پلٹ کر دھسے لیے کھانا کھا رہا تھا۔ نوالہ منڈیں رکھ کر بولا۔

”جی اچھا مانی جان، بس ابھی جا کر دیکھتا ہوں“

”نہیں! اطمینان سے کھانا کھاؤ میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں“ زینت نے اسد کو کھانا چھوڑا کر بھیجنا مانا سب نہیں سمجھا اور خود بیٹے کو دیکھنے اندر چل دیں۔

ان کا خیال درست ہی نکلا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی موجود تھا اور اپنے بیڈ پر تکیے سے لگا ناگین پھیلائے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ماں کو آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اسے اطمینان سے کتاب پڑھتا دیکھ کر زینت تیز بڑی ہو گئیں۔

”یہ بھی بھلا کرے میں بند ہو کر کتاب پڑھنے کا موقع ہے سنی۔ تم بھی حد کر دیتے ہو بد اخلاقی کی۔ دیاں سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں“

”لیکن میں کوئی چیف گیسٹ (مہمان خصوصی) تو نہیں ہوں مٹی جو میرے جائے بغیر کوئی نوالہ نہیں توڑے گا“ وہ ناگواری سے بولا۔

”چیف گیسٹ تو نہیں ہو لیکن ٹوکے کے بڑے اور اکھوتے بھائی تو ہو۔ اسی لیے ٹوکے والے بھی نہیں پوچھ رہے ہیں“ زینت کو مجبوراً غلط بیانی سے کام لینا پڑا۔

”کچھ پوچھ رہے ہیں تو آپ بھی ان سے کہہ دیجیے مٹی کہ لڑکی کے بڑے اور اکھوتے بھائی کا اس وقت کمرے سے باہر جانے کا بالکل موڈ نہیں ہے بلکہ کھانا کھا لیں“ وہ قہر سے بد مزیزی سے بولا۔

”واہ اب سمجھانے والوں سے جا کر بھلا میں یہ کہوں گی کہ لڑکی کے بھائی کا کمرے سے نکلنے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ یہ تم کیسی غلط باتیں کرتے ہو بیٹے۔ کیا یہ چاہتے ہو کہ بہن کو اس کی سسرال والوں کی نظروں میں بالکل ہی گرا دو۔ سب کو جس جس پیدائش لڑکی کا بھائی گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ لڑکی کا معاملہ کشا نازک ہوتا ہے۔ اور لڑکے والے ایک ذرا سی بات کی بھی کسی طرح گرفت کرتے ہیں۔“

”اگر یہ لوگ ایسے ہی نرود یا شیڈ کو تھانہ نظر، ہیں تو بھرناز کا رشتہ ان کے ہاں کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”ارے یہی لوگ کیا ساری دنیا کے لڑکے والے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں؟“

”اچھا تو کیا جب آپ بھی لڑکے والی بننے کی یوزنیشن میں ہوں گی تو ایسی ہی ثابت ہوں گی جیسے ساری دنیا کے لڑکے والے ہوتے ہیں؟“ وہ بیٹہ ماں کی باتوں کی گرفت کچھ اسی طرح کرتا تھا۔ زینت کو اس کی بات پر دکھ تو بہت ہوا مگر وہ جواب گول کر کے لولیں۔

”وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ مگر کسی طرح اٹھو تو سی۔ دیاں تو کھانا بھی کب کا شروع ہو چکا۔“

”کھانا شروع ہو چکا تو آج کل تو لڑکے کچھ اتنی تیز رفتاری سے کھانا کھاتے ہیں کہ کب کا ختم بھی ہو چکا ہوگا۔ پھر میرے باہر جانے کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی، فکڑ کٹا ہٹلا دو مٹ دم تھا۔ زینت اس کی باتوں پر زنج سی ہو کر لولیں۔

”اچھا جب تم نے سوتے ہی ایسے کمر جاؤ گے ہی نہیں تو پھر میں نے یہاں اگر محض جھک ہی ماما۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اناں جان کو تھارے پاس بھیج دیتی۔ ان کی بات ماننا تو تم اپنا ایمان سمجھتے ہونا۔ پھر بھلا میری کیا حیثیت کیا اوقات؟ زینت کو سچ سچ ہی غصہ آ گیا تھا اور شاید پہلی بار آتا تھا۔ وہ مڑ کر جانے لگیں تو اس نے انہیں پکارا۔

”ممتی؟“

”ماں کہو کیا بات ہے؟“ انہوں نے وہیں رک کر پوچھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ ماں کا رتبہ کیا ہے؟ اس کے منہ سے انہوں نے پہلی بار ایک انوکھی سی بات سنی تھی۔ انہیں سخت اچھا ہوا۔

”اچھا معلوم ہے پھر بھی دوسروں کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو؟“ وہ اس کے نزدیک آتی ہوئی لولیں۔

”نہیں یہ بات ایسی فنی۔ ماں کے مرتبے کے لحاظ سے اماں جان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے محمد اللہ باقاعدہ ترجیح کے ساتھ قرآن شریف پڑھا ہے۔ اور اس نے ہی مجھے ماں کی عظمت اور مرتبے سے روشناس کرایا ہے۔ لیکن اماں جان کے مجھ پر بہت سے وہ احسانات ہیں جو آپ کو مجھ پر کرنے چاہیے تھے اور وہ فرائض بھی جو آپ کو ادا کرنے چاہیے تھے انہوں نے ادا کیے ہیں۔ یوں بھی ممتی اگر وہ تو یہی بھی ہیں تو لڑکی کا چچا اور چچو کے لیے ہی ہوں گی۔ آپ کو تو انہیں کوئی مسئلہ نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ انہوں نے ہی بڑے خوشی و ملن سے آپ کی شادی ڈیڈی سے کرائی تھی۔ اف زینت تو سمجھ رہی تھیں کہ ان کے خفا ہو جانے پر اگر وہ ان کو منانے کا نہیں تو اپنی معذرت ضرور پیش کرے گا۔ مگر وہ تو اپنی دادی کے نصیحت پر پھر رہا تھا۔ وہ مل کر لولیں۔

”اچھا تو تم نے کیا ہی سب کچھ کہنے کے لیے مجھے روکا تھا؟“

”نہیں ممتی بلکہ آپ کو آپ کے رتبے سے آگاہ کرنے کے لیے روکا تھا۔ جو میرے دل میں آپ کے لیے ہے؟“ وہ پہلی بار مسکرایا اور کھسک کر پیر نیچے فرش پر ٹھکا لیے۔

”ہو نہ ہو جی تو میری ہر بات زد کر دیتے ہو۔ بات بات میں دل توڑ دیتے ہو؟“ وہ شاک سے لمبے میں آزدی سے لولیں۔

”ادو فنی۔ میں نے آپ کی بات رد نہیں کی۔ بلکہ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں زیادہ شور مچاؤں اور لوگوں کے عجم میں رہنے کا عادی کیس ہوں۔ پلینر فنی۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“ وہ

کتنی لجا جیت سے کہہ رہا تھا جبکہ اس سے پہلے تو کبھی ایسے لب و لہجے میں ان سے بات ہی نہیں کی تھی۔ ہزار اس سے شاک ہی لیکن آخر تو وہ ماں تھیں اور وہ ان کا کھانا اور لڑائی لڑائی تھا۔ ان کو بھی معلوم تھا کہ ان کا بیٹا شور مچا کر بالکل عادی نہیں۔ ان کی ممتا نے ایک دم ہی جوش مارا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر لولیں۔

”بیٹے تمہارے سر میں درد تھا تو تم نے مجھ سے آتے ہی یوں نہ کہہ دیا۔ چلو آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں ابھی فون کر کے

کر لیتی ہوں کہ دوا کھلاؤ۔“ وہی آکر تھارے لیے کوئی دوا جو خرید کر دیں گے۔“

”نہیں نہیں ممتی اب ایسا بھی سر میں کیس نہیں ہے۔ میرا کہ ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا جائے؟“ وہ ڈاکٹر کے نام سے بک کر بولا۔

”نہیں خدا کرے۔ چلو سر درد کی کوئی کھاؤ۔ میں ابھی گولیاں اور چائے لے کر آتی ہوں۔ پھر تمہارا سر بھی دبا دوں گی۔“

”ادو فنی۔ میں دو کھانے کا قائل ہی نہیں۔ جی تو آج تک اپنی زندگی میں کبھی بیمار نہیں پڑا یہ دیکھیں کیسا ہٹا کتا ہوں

ایک دم باڈی بلڈرز کا دلچ۔“

”اے ماشا اللہ جتنم بد درد خدا تمہیں صحت سلامت رکھے۔ اس طرح منہ بھر کر تو درد کو۔ ٹوک لگ جاتی ہے؟“

”واہ کی خوب لالچ ہے؟“ وہ ہنس کر بولا۔

”اچھا پھر اس کا کچھ ہی کو پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے بھی سر میں درد ہو جاتا ہے۔ یہاں کراچی میں تو ایسا ہی

بڑے کی شکایت عام ہے؟ زینت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح بیٹے کے سر سے درد ہٹا کر دیں۔

”جھیک ہے آپ کہہ رہی ہیں تو کھانا ضرور کھاؤں گا۔“ اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ ممتی نیلا اچھا تھی ہوئی اندر آگئی۔

اس کا سانس پھول رہا تھا پھر بھی بھائی کو دیکھ کر معذرتی لے لے لولیں۔

”ممتی بھائی جان میں بغیر اجازت کے اندر آگئی لیکن میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے؟“

”کیوں خیریت تو ہے؟“ زینت نے پھر پوچھا۔

”ممتی آپ کو۔ خود بخود صوفیہ کر سارا گھر بھان مارا۔ وہ سلوٹو آپا بیری طرح حل گئی میں نا؟ نیلا ممتی قدر سے مانگتے

ہوئے بتایا۔“

”ہائیں توں؟“ وہ حوالہ کے کہنے پر لپٹ گیا تھا اس نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”سلوٹو آپا۔ وہی جنہوں نے آپ کو آٹھنے میں ہٹلایا تھا؟ نیلا ممتی بتایا۔

”ادو فنی کے اس سے اس طرح سلوٹو کا تعارف کرانے پر زینت چڑ کر لولیں۔

”مگر حل کیسے گئی وہ؟“

”وہ خانساں اسٹو سے کیتلی اتار رہا تھا۔ ہینڈل بہت گرم تھا اس پر گر پڑا کہ سر کا کیتلی اس کے ہاتھ سے چوٹ

کر سلوٹو آپا کے ہر دوں پڑا پڑی جو قریب ہی کھڑی بیالیاں سٹ کر رہی تھیں۔ سچ پڑلیوں تک آئے پڑ گئے ہیں ممتی بھی سخت متاثر ہوئے ہیں۔ نیلا نے اس کے گلنے کی وجہ بیان کی تو زینت نہایت ناگواری سے لولیں۔

”اف تو یہ لڑکی جب سے آئی ہے ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرتی ہے؟“

”ممتی یہ تو ایک اتفاقی حادثہ ہی ہے۔ کوئی جان بوجھ کر تو نہیں جلاتے انہوں نے اپنے پیروں

”اے ایسا ہی اتفاقی حادثہ کل بھی تو ہوا تھا اس کے ساتھ معلوم بھی ہے حالات کس حد تک خراب ہو گئے تھے وہ تو لگا کر نڈا خوش

رکے وہ صلہ صفائی نہ کریں جا کر تو اس وقت اس گھر میں آوی بول رہا ہوتا۔“

”پھر ممتی می میں کروچہ تو لیں انہیں۔ نیلا ماں کی بے بسی پر جڑ بڑی ہو کر لولی۔

”ماں پل دی ہوں پھر کھانے کا کیا رہا۔ میں تو کھانا سرو ہوئے ہی یہاں آگئی ممتی۔ یہ بابا کے سر میں درد ہو رہا تھا نا۔ اب بتانا نہیں

بابا کا شکر کیا ہوا ہوگا؟“ زینت لولیں۔

”ممتی تو یہ نہیں ہوا سب اطمینان سے کھانا کھا رہے ہیں۔ بکواب تو ختم کرنے والے ہیں۔ اچھا خبر اگر بھائی جان کے سر میں درد ہو

رہا ہے تو آپ نہیں ان کے پاس رہیں میں جلی جاتی ہوں سلوٹو آپا کے پاس بیٹھ لولی۔

”ارے نہیں تم ہاں اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ میں بھی بس ابھی آئی ہوں۔ زینت نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں میں کچھ کھا چکی ہوں کھانا۔ ڈیڈی نے مجھے آپ کو بلانے بھیجا تھا وہ سلوٹو آپا کے کمرے میں بیٹھ کر لٹی کے آئے گا انتظار کر

سہہ زب بک آپ جلدی سے آجائیں۔ نیلا نے بابا کو آج کرتے ہوئے کہا۔ اور شوہر کا نام سن کر زینت بگم بگم لائی انہیں اودھا ہوا کہ لڑکے

کتنے کوئی خیال آتا تو بیٹے لولیں۔

”دیکھا بعض گھڑی لپٹی ہوتی ہے کہ جو منہ سے نکل جاتے وہ کسی نہ کسی طرح پورا ہو کر رہتا ہے۔ اب میں تو نہیں کھانے کی غرض سے

کر لٹی ممتی کو بلوانا چاہ رہی تھی مگر کھانے ڈیڈی نے سلوٹو کے لیے بوا بابا بگم شے ہے تم سے تو ملائی۔“ اور پھر وہ شوہر کی خطی کے بچال سے

فلوڈی اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اور وہ سلوٹ کے معاملے میں ماں کے تاثرات، رویے، ہنراری اور گھٹو گھٹو پر غور کرتا رہ گیا۔

کیونکہ گزشتہ روز بھی اس کے پاسے میں اُن کے خیالات اور گھٹو گھٹو خود اپنے کانوں سے سن چکا تھا اور ملک تو اس کی بڑی بچا تھا کہ وہ اس کے آگے بہت خوش نہیں ہیں جبکہ اسے سلوٹ کی آمد کی غرض و غایت کا بھی قطعاً علم تھا اور وہی کچھ دیا تھا کہ دوسرے عزیزوں یا عزیزوں کی طرف سے بھی اس کی شادی میں شرکت کرنے آئی ہے۔ جتنی کہ اسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ اس کی بیوی کسی وجہ سے نہیں آسکی ہیں اور غرض کہ نہایت انھوں نے سلوٹ کو اپنا غماغمندہ بنا کر بھیجا ہے۔

وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ مہمانوں سے ایسا ناروا سلوک تو رہا نہیں رکھا جاتا۔ وہ بھی کچھ بھیجی کی اگلی تہ بندے گزشتہ روز ہی تو دوسرے انکشافات کے ساتھ ساتھ اس پر یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ سلوٹ اس کی بیوی کی اگلی تہ بندے۔

اور اس کی محنتی سلوٹ کی حقیقت اور اہمیت کو جاننے کے باوجود بھی اس سے اس قدر متغیر اور دیرینہ کیوں نظر آتی تھیں۔ کچھ بڑی خوشی کے باوجود اس سے لگتی ہی نہیں جا رہی تھی جبکہ اس کے اندر سب تو اس کا مادہ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس پر ماں کے رقبے پر اسے توجہ بھی ہو رہا تھا اور توجہ کو فٹ بھی... اس پر وہ کسی بھی مسئلے پر زیادہ توجہ نہ دیتا تھا۔

ابھی ٹھوڑی دیر قبل سلوٹ کے اہانت، ہنراریہ پر ہی سخت غصہ کیا ہونے کے باوجود اپنے کمرے میں آکر وہ کچھ دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر ایک کتاب کھولی اور اس کے مطالعے میں لگ گیا۔ پھر اس وقت توجہ سے زیادہ تجسس اس پر اس وجہ غالب تھا کہ اس نے بھی بہتر دیکھتے بیٹھے ہی نہیں کر سکا کہ ماں سے ان کی اس لڑائی کا سبب تو کچھ کر سکا تھا۔ انسانیات کا تھکا تھکا تو یہی تھا کہ کم از کم ایک نظر سے دیکھ ہی آئے لیکن اس کے اور سلوٹ کے درمیان کوئی ایسا تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ جس کے بل بوتے پر وہ اسے دیکھ ہی چلا جاتا۔ پول بھی کسی کی تکلیف وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس رات بھی سلوٹ کی آنکھوں پر بندھی تھی کہ اس بری طرح اُٹھتا ہے ہراس کی تکلیف کا تصور کر کے وہ کافی دیر تک بے چین سا رہتا تھا۔

اگلے دن اس قدر صوف کر رہا تھا کہ کسی اور کو تو کیا خود اسے گھٹو گھٹو بھی سر اُٹھانے کی ہمت نہیں ملتی تھی۔ ایک تو مہمان اور دوسری ان کی ہمت سے آئے تھے کہ اتنے بڑے گھر میں بیکار رہ کر صرف سے دونوں جانب اولاد نہ گزری تھیں۔ ملک کا روں کا ایک باجم کھڑا تھا۔ دھنہ کو جھگڑا رہی تھی۔ جہاں کی تعداد کوئی ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی اور اس تعداد کے بیش نصف تہ بندے نے شوہر کے بہت کچھ کے باوجود کسی شرمے ہوئی میں کوئی بڑا گھٹو گھٹو نہیں کر لیا تھا کہ اگر اتنے سارے مہمان کی ہوس میں کیسے سمائے تھے۔

کچھ ماں نے اور باپ نے وادی کے گزشتہ روز اسے اس کی اہمیت اور انصاف کا احساس دلایا تھا اس لیے غلاب تو اس نے بہن کی شادی میں بڑھ کر کچھ کر دیا تھا۔ پول بھی آخر کار بڑا دلدار کی ماں جانی تھی۔ اس کا خون تھی۔ جبے اب تک وہ ایک چاہنے والے بھائی کا پیرائیں دے سکا تھا کہ وہ اسے عزیز و بہت توجہ تھی لیکن اپنی بڑائی کے زعم میں اور کچھ اپنی لاابالی فطرت کی وجہ سے وہ اپنی محبت کو اس پر کھانا نہیں کر سکا تھا۔ اور اب وہ بڑائی کو گھر سے رخصت ہونے کی تو لڑائی کو تو بچوں کا خیال سے بڑی طرح تجربا رہا تھا۔

پول بھی لڑکی ابھری ہو باغریب کی۔ اسے رخصت کرنے کا خیال ہر خاص و عام کے دلوں پر ایک گرائی سی پیدا کر رہا تھا۔ جو لڑکیوں کو نمونوں میں تول کر دوسروں میں پہنا کر دیتے ہیں وہ بھی اور جو خون پسینہ ایک کے چمک چمکاتی رہی رقم یا اپنا بیٹ کاٹ کر جمع کی ہوئی یا پھر قرض مانگ کر لی ہوئی رقم سے چند چوروں اور جو بچے پتے دو انھوں میں رخصت کرتے ہیں وہ بھی انھوں کی جھلکا اور دوسروں سے نکلتی ہوئی دعاؤں کے ساتھ ہی اپنی کو رخصت کرتے ہیں کہ لڑکی کا نصیب بھی لڑکی کی طرح ہوتا ہے۔

جو نکل آئے تو بوری اور ہی باوری۔

اور نہ نکلے تو دلدار ہی دلدار۔

خیر غریب اور اسو سلطانی لڑکیاں تو دنیا کے سرور گم سے بلکہ زیادہ تر گم ہی گم سے نرو ذما ہونے کے لیے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ریشیوں کی لڑکیاں پیسے ہی سے تو دنیا کی ہر خوشیاں نہیں خرید سکتیں۔ پول بھی روپے پیسے سے اور سب تو خرید سکتا ہے مگر خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں۔ مستوراوی لی جاسکتی ہیں۔ ہاں البتہ جھوٹی خوشیاں ضرور خریدی جا سکتی ہیں جو کرائے کی ہوتی ہیں۔

اور پیسے کی عوض خود کو بہلا دینے کے لیے۔

اپنا غم بھلائے اور دھیان بٹانے کے لیے انسان یہ بھی تفریح ہوتا ہے کہ دوسرے تھوڑے میں کرائے کی خوشیاں ہی تو خرید لیتا ہے۔ وادی ماں اور دوسری بزرگ خواتین کی دغا بازی سن کر تو یہ سارے احساسات بھی بہن کی شخصیت کے وقت ہی مل گئے تھے۔ اور اس کا دل اندازے اندازے سے ٹوٹ رہا تھا۔ ان کو رخصت کرنے سے اس کی آنکھوں میں بھی آنسو چلے دیکھتے تھے اور ماں اور وادی کو

سب سے زیادہ توجہ ہوا تھا۔

کو دیکھ کر رخصتی کے بعد دیر چوتھی چالوں اور دعوؤں کا سلسلہ خامے سے نکلتا رہا ہے۔ مگر جب وہ رخصت ہو جاتی ہے تو بہت سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود گھٹو گھٹا ہے جیسے راجہ زوں کی ٹولی نے کسی کا لہجہ کو لوٹ لیا ہو۔ اور صرف دلوں کو، کی کر دینے والا تا آٹھاری ہو۔ اپنا مال و منافع جانے کے بعد اہل کارواں دھواں دھواں ہوئی صورت میں بیٹھے ہوں۔

بہن جی کئی تو ماں باپ انھوں اور اتنے سارے عزیزوں کی موجودگی کے باوجود گھر کے کاتے کو دھڑا لگ رہا تھا۔ سہا تو یہی تھا کہ ٹھوڑی دیر کے لیے کہیں باہر گھر بھرتے گا مگر باہر جانے کا بھی کوئی نہیں ہوسا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منہ پرانی کے چند چھپکے مارے اور باس تبدیل کر کے سید پر لبت گیا۔

پھر اس کے علاوہ خیال نے ایک نئی اثران لی۔

ایسا کہوں ہوتا ہے کہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ لڑکیاں اپنی زندگی کے ابتدائی بیس بائیس سال گزار کر اور والدین کی اتنے سال کی محنت اور رشتہ پر اپنی بھرتہ کر ایک بڑے گھر میں جلی جاتی ہیں اور انھوں کو کیسا دکھی دیکھی سا کہے رکھ دیتی ہیں۔

کیا لڑکیاں اپنے والدین کے سارے عافیت میں رہ کر زندگی نہیں گزار سکتیں۔ والدین تو ان کے لیے دنیا کا ہر کچھ فراہم کرتے ہیں۔

لڑکی جان چوگھوں میں ڈال کر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

اپنا بیٹ کاٹ کر ان کا بیٹ بھرتے اور تن دھکتے ہیں۔

ان کی ذرا کی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔

اولیٰ تمام تربیت اور شفقت ان پر کھانا کر دیتے ہیں۔

حتیٰ کہ پڑھانے لگاتے ہیں۔ اور دوسرے تمام کاموں میں بھی حاکم کر دیتے ہیں۔

کہا یہ ساری محنت اور شفقت اس لیے کیسے ہیں کہ ایک دن وہ انھیں چھوڑ کر غیب کا گھر لے آئیں آخر اس کی وجہ

ہراس بات کی وجہ جاننا بھی اس کی عادت تھی۔ جو اس کی کچھ سے بالاتر ہوئی۔ پھر اس کے تجسس کا باعث بنتی تھی۔ وہ دیر تک اس سے شہنائی کی درمیان میں کہیں کو شال اس کا زندگی میں پہلی باج و ایک کچھ سا دوسرے وارم کی طرح سوچ رہا تھا۔ اور وہ کوئی آسانانہ کچھ اور خاندانہ نہ تھا کہ اس کی کچھ میں ہی نہ آتی۔ کہ لڑکیاں اگر ساری زندگی والدین کے درمیان بیٹھی رہیں تو لڑکی ہو کر کچھ جائیں۔ اور پھر اتنے دنوں کے فیض سے اس انسانی کا جو ایک سلسلہ بچے بعد دیر سے چلا رہا ہے۔ وہ بالکل ختم ہی ہو کر رہ جاتا۔ تو پھر دنیا میں کچھ سحر اور جومات ہی باقی رہ جائیں۔

اسے خود ہی اپنے خیالات پر بڑے زور کی ہنسی آتی۔

وہ تو جو نہیں کہ جانے کے بعد وہ دل اور ذہن پر ایک اچھوٹا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے اُنے عید کے خیالات کے تلنے تلنے میں اُچھک رہا تھا۔ اچانک آجائے والی ہنسی نے جس کی گڑبگڑ دی تھیں۔ یا پھر مزید پر جھپٹنے کا تھا اس لیے خیالات کے تلنے تلنے ایک وہم ہی ٹوٹ گئے۔ باہر لان میں بھی گھاس اور پھودوں کی وجہ سے پورے گھوٹاں پہرے کرنے کے باوجود وہ جھپٹ کر دھن میں ضرور دناستے جھپٹنے کاٹنے کی وجہ سے پھر پھر خفا سا ڈھانچا رہا تھا۔ جسے بھلنے ہمت اس کی نظر اس دوسرے بڑی تو جی ہی تھی۔ اور کچھ دیر بعد دوسرے کے بھلنے اسے اپنے پر پر ایک ابل سا نظر آئے لگا۔ اور پھر کچھ کے اوپر تک جہاں تک پر کھلا ہوا تھا آجائے ہی آجائے۔ جن کے ساتھ ہی ساتھ ذہن کی بڑی گھٹی۔

وہ گھٹنے خڑبہ بھلنے کے رعب کہاں اُٹھائے۔ یہی تھی... فرما دکتی... بڑی بڑی ہیروں کی کنوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اور پھر... اپنے مرقہ پر بے طرح کچھ سز رنگ کے لباس میں چہرہ بھلنے اور بڑے ہنگامہ خیز انداز میں پچھلے ہونٹ کو مٹھوٹا سا دناؤں میں دھالنے کی قائل ادا۔ اور وہ دل کی ہر آہنگ کو مٹا دینے والا سا متکبر سا رویہ۔ آپ ہی آپ چمکتی ہوئی غم کی دہلیز کی طرح آنکھوں کے سامنے آتا رہا۔ تو وہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت سا اس دلفریب نظارے میں گم رہا۔

پھر وہ دفعتاً کانوں میں ایک گھنجنی بٹ کے ساتھ ساتھ... ماں کی باتوں کی بازگشت کوئی تو ٹیکٹو وہ ناشی ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی سلوٹ کی ادا میں... یاد آ کر بندھا تھا اور جس کے ساتھ ہی دل میں اس کی احوال پر کی کرنے کی خواہش مائل تھی۔ لیکن اب وہ تاثر لگتا تھا تو وہ سمجھ رہا تھا۔

بھلا یہ اس کے کیا واسطہ کیا سروکار جو اس کی احوال پر ہی کو کہاؤں۔ وہ جی اس وقت رات کو۔

پہلے بات کو تول مڑو رہا کہ سلوٹ نے تو مجھے دھما بھی ملائی ہے اور جیسے ہی کیونکہ غاسماں تو سب کے جلسے کے بعد معلوم کہاں، وہاں ہو گیا تھا اور تو مجھ پر ہر گز ہر گز نہیں ہوں گے۔ اصل میں تو سلوٹ کی ہی وجہ سے میں نے کسی کو نہیں روکا، درد اور نرا کی وجہ سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی، یہ سلی بیگ آہستہ آہستہ بولے ہی جاری ہیں۔ تب اس نے سلوٹ کی طرف دیکھا جو محض اس کی وجہ سے رن سوڑے اور ہانے کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی فطری شغوفی عکس کرتی۔

”خیر یہ تو شاید ان کی عادت ہی ہے۔ یہ بھاگ بھاگ کر سب کی خدمت بجالانا۔ سچ کہتا ہوں اماں جان پہلی مرتبہ انہیں دیکھ کر میں بھی کچھ تھا کہ کام کر جانے کی وجہ سے جی نے کوئی نئی ملازمہ رکھی ہے یہ گواہ کا بوجھ بھی شوق سا تھا مگر اس کا شوق سا فخر و غرور کے دل میں تیر کی طرح بھڑک رہا تھا۔ اس نے تیزی سے گردن موڑ کر شعلہ باز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ تلخ سا جواب دہنایا چاہ رہی تھی کہ سلی بیگ نے اس سے کہا۔

”اے سلوٹ بیٹی تم اس لمحے کی کسی بات کا برا نہ ماننا۔ اس کی تو ہنسی میں ہمدرد ہے نہ روتے ہیں۔ یہ محض چھوٹنے کی غرض سے ہی کہہ رہا ہے۔ تا کہ نہ چمک کر کوئی تھکا سا جواب دے۔ چپکلی جی تو بیجی ہونا اس قدر تو وہ دادی کی بات بروہ ہنس کر بولا۔

پھر پھلنے نہیں خاموشی کے ہر سے سیل پیکڈ تو نہیں کر کے بھی ان کا منہ۔ وہ خود بھی بروقت ہنر میں گنگناہٹیں بھرے غمزدہ ہیں۔ اسے بس اب بندھی کر دے پھر چھوڑ دے۔ یہ بیکاری اگر میری وجہ سے خاموش بیٹھی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس پر جرح دوڑو، دادی نے دھکے دھکے انداز میں اسے تنبیہ کی۔ ”نہیں اماں جان۔ ان پر جرح کر کیا پھینسا ہے مجھے۔ دیکھ نہیں رہیں ان کا سر کٹنا پکنا اور پھسلوان ہے۔ اس نے کچھ اس طرح ہنسنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ہمارا سلی بیگ کو اتنی بیماری میں بھی ایسی آگئی جو اس نے بھی رن پھر کر پٹی مسکراہٹ چھپائی۔

”اماں جان وہ۔ خیر آپ کی تو طبیعت ہی نا سار ہے۔ پھر پھوٹیں جلسے دیں۔ وہ ایک دم ہی تنیدہ ہو کر سرا دنگی پر کچھ اس طرح ہاتھ پھیرتا ہوا بولا جیسے کوئی بہت ہی خاص اداہم بات ہو چکے ہو۔ وہ اچکا رہا ہو۔

”نہیں نہیں کیا بات ہے بناؤ تو۔“ سلی بیگ نے سرکا دھ بھول کر انتہائی ”جسٹس“ انداز میں پوچھا۔

”وہ کچھ زیادہ کھا بیابا ہے نا اس لیے اور سا ہو رہا ہوں۔ وہ کافی پیسے سے معدہ میں رطوبت پیدا نہیں ہوتی نا مگر خیر چھوڑیں۔ اس وقت تو غاسماں بھی غائب ہے۔ پھر کون بنے گا میرے لیے کافی۔“

”ارے اگر مجھ میں ذرا سی بھی بہت ہوئی تو میں خود آٹھ کر بنا دیتی۔ تم اب سا کر دے فرج سے کوک یا آئس کریم سوڈا نکال کپا تو دو دو چار ڈاکر اس اگر طبیعت صاف ہو جائے گی بھاری۔“ دادی کو فوراً اس کی بات پر یقین بھی آگیا۔

”اچھا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو کدو وغیرہ سے تو سخت الہک ہوں میں دیکھ کر ہی سوڈا اور طربت پیدا ہوتا ہے، وہ دادی کے مشورے پر بیک سا ہوا تھا۔ کچھ دیر اس اتنی ادب میں رہا کہ شاید سلوٹ خود ہی اس کے لیے کافی بنائے ہر امداد ہو جائے۔ مگر وہ خاموش ہی بیٹھی رہی تو اس نے دادی کی سی مخاطب کر کے کہا۔

”انھوں نے آپ کے لیے چائے بنا دیا تھا تو کیا برسر کے بل کچن تک گئی عین اب اتنی دیر سے کافی کے لیے تڑپ رہا ہوں تو ان کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ آٹھ کر میرے لیے کافی ہی بنالیتیں۔“ بوجھ بھی بھاڑ ہلانے کا سا تھا۔

”اے دیوانے تو نہیں ہو گئے تم۔ اتنی مشکل سے تو بے چاری کچن تک گئی تھی۔ اب خواہ خواہ ہی اس کے سر پر ہے ہو۔ بیٹے تو کبھی کافی نہیں پیتے تھے پھر اب آج کیا کئی سوچی۔ اگر یہ بھارے یہاں چند روز رہنے کے لیے آئی ہے تو اب یہی کہا قیامت آگئی جو تم سب کے سب خواہ کر کے رہتے ہو۔ سلی بیگ کو بھی اس کی باتوں پر غصہ آگیا۔ انھوں نے اسے فوری طرح چھٹکارا تو وہ ایک دم ہی تنیدہ ہو گیا۔

”ارے نہیں۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں اماں جان میں تو انہیں اتنا خاموش دیکھ کر محض مذاق کہہ رہا تھا۔“ اور پھر اس نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آئی ایم مری سوری۔ سلی میل و۔“ اور پھر بار بار جانے لگا تو سلوٹ نے اسے پکارا۔

”سیئیے۔“ اس نے دھناڑم بھائی ترک کر اس کی طرف دیکھا۔

”فرمائیے۔“

”وہ۔ میں ابھی آپ کے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔ بس دو منٹ ہیں۔“ وہ آٹے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ اس کا دل تو چاہا کہ انکار کر دے لیکن اس کے توب دیکھ چکا تھا جو جینے سے محفوظ گئے تھے اس پر وہ اچھے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ پھر فریض پر کھنے کی وجہ سے جسم کا سارا نور پیروں پر ہی پڑ رہا تھا اور اس کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اس کے قریب آکر بولا۔

”نہیں تھینکس اے لٹ۔“ بوجھ شہرہ (مجھے کافی پینے کی بالکل خواہش نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں اور یہیں بیٹھی رہیں۔“ اور اس اچانک تبدیلی پر اس نے قہقہے اسفند کی طرف دیکھا، نگاہیں پھر چارہ بوش تو چند لمحے ایک دوسرے میں اُلٹی رہیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

”اس دل میں بلا احترام ہے آپ کا بھیس،“ بوجھ بھی جاری سا ہو گیا تھا۔ پھر وہ سیدھا ہو کر دیکھنے لگا اور اسے بول ہی جبران دہر لیا۔

”ساجھو، مجھ پر چپ چاپ کر کے سے نکل گیا۔“

یوں تو نازش کو تراویح میں سہلی بیگم کا بہت خیال رکھتی تھیں اور نظر ہر داری کا کھانے کے طور پر ہی یہی زینت اور نیکو فریبی ان کی پوری پوری خبر گیری رکھتی تھیں۔ لیکن ان کے پاس زیادہ در تک تھا کوئی ہی نہ تھا۔ نازش اولہ کے ترنگہ کی نازش کے ساتھ ساتھ گھر کی نازش کے لیے نئی چیزیں بیٹا کھانے اور کھانے داروں اور واقف کاروں کے سامنے جاننے کے سلسلے میں زیادہ تر گھر سے باہری ملاقاتی تھیں۔ اور فیوڈل اور شہنشاہ کا بیٹا بھی جاتی تھیں۔ سہیل منصور بھی بھائی کے ساتھ ان کے آفس اور کبھی اپنے کسی کام کے سلسلے میں سارا سارا دن گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ زینت کی بھی ایسی مصروفیات تھیں۔ صبح سے دن کے کھانے کے وقت تک گھر بیٹو اور انجام دینے میں۔ دوپہر سے سہ پہر تک آرام کرنے اور سہ پہر سے رات تک کا وقت بہرونی مصروفیات میں۔ فیصلہ منصور لاور زینت کراچی کے قریب ہی نہیں کراچی دوری اور لاہور تک کے گھر زینت کے لیے ضروری تھے اور وہ فوجی میاں بیوی بنتے میں ایک باہر نماز ضرور جلتے اور خاص خاص موقعوں یا تقریبات پر بیٹوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ شعیب منصور کو کہتے تھے کہ زینت اور لاہور والے شہر کے انسان تھے۔ لیکن چونکہ اعتدال پسند تھے اس لیے انھوں نے ان ساری چربی تقریبات یا ایجنسیوں کے لیے کچھ اصول وضع کر رکھے تھے اور سہ پہر سے بڑھ کر وہ ایک کاروباری آدمی تھے اس لیے وہ ہر بات پر لڑائی کاروباری مصروفیات کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

یہی جس کلب میں جی جلتے تھے اپنی کاروباری مصلحتوں کو ہی مدنظر رکھ کر جلتے تھے اس لیے خصوصاً بیٹیوں کو کم ہی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ یوں ہی انھوں نے بیٹیوں کو ایک مدر تک ہی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے تب تک کہیں نہیں بھیجتے۔ البتہ بیٹیوں کے یہاں تقریبات میں شریک ہونے کی اجازت دے رکھی تھی باقی تو تمام معاملات اور تربیت کی ذمہ داری انھوں نے زینت کو ہی سونپ رکھی تھی کہ ان کے خیال میں ماں ہونے کی حیثیت سے بیٹیوں کی تربیت وہی صحیح طریقہ کر سکتی تھیں۔ اس پر زینت کو ہمیشہ سے ان سے یہی شکوہ رہا تھا کہ انھوں نے ان کے ہونے کے پہلوؤں کے بیٹے کو دادا اور دادی کی کجوبل میں دھکے مارنے صرف انھیں کا ٹھوٹ دیا تھا بلکہ بیٹے کے سامنے ان کی اہمیت ہی ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی وہ زینت کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ کچھ زیادہ ہی روشن خیال تھیں اور مزید وہ کئی گنا بڑھ کر جیسے گھر میں بری ملاوٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ اور جو مال کی دست راست تھی اس نے ماں ہی کے خیالوں کو نہایت بلکہ عادات و مزاج بیٹے و بچے کے لیے ہی سمجھ کر لایا اور قبول کیا تھا۔ اور فیوڈل جو تیار دوسرے دور میں بیٹیوں کی بڑی بہن کے لکھنؤ قدم پر چلنے کی کوشش کرتی تھی۔۔۔ اور ماں کے اشاروں پر بیٹیوں کی ناک گھراؤوں کی نظروں میں بڑی بہن کی طرح اپنی حیثیت منوا سکے۔ اور ایسا شخص جو دوسرے کی دین سے کتنا ہو یا دوسرے کے زیر اثر رہتا ہو اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ نیوٹن کے مزاج میں گو طنطنہ بھی تھا اور ترنگ بھی، لیکن شخصیت میں جو ہلکا پن تھا وہ اس کی عادات اور شخصیت کو غائب کر دیتا تھا۔

ماں اور بہن نے کسی کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا بس وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتی تھی۔ اور نچا دیکھنے کی عادی تھی اس لیے اپنے اور بچی کی حیثیت کے لوگوں سے مرعوب ہو جاتی تھی۔ بلکہ خود بھی بہت اور نچا اڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ دوسرے نمونوں میں خود پسند بھی تھی، یہی وہ تھی کہ لینن کی بھی بہت ولادہ تھی اور بہت مودوں بھی۔ مہسوسات ہی لیے بہت ہی بڑی تھی جو لینن ڈورانی کے ہونے سے اس کا حلقہ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ اور سہیل بھی وہ بچہ داکھ کر لینن کی نکل اور باجیٹ جلتے کی ریکوئٹوں کو ہی مانتی تھی۔ اور کالج کے بعد اس کا اکثر و بیشتر وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی گزارنا تھا۔ گو بوش جلتے کے بعد اس نے خود کو ایک پرتیش اور اسوہ حال ماحول میں سانس لیتے دیکھا تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں اولاد کے دو مہمان کوئی تو نہیں رہیں کبھی کبھی سب کے لاڈ و پیرا ایک ہی ہوتے ہیں تو لی کر کے جلتے تھے۔ لیکن کسی اولاد کے لیے یہ تاثر نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ دوسری اولادوں سے بہت منفرد و خوبصورت، ایک بہت اور سعادت مند ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ سب کو اپنی اولادیت کا احساس دلانے میں کوشاں رہتی تھی۔ جبکہ تیلہ سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے وجہ سے خاص طور پر باپ کی بہت لاڈلی تھی دوسری بہنوں کے مقابلے میں خود اسخند بھی اس بہت عزیز رکھتا تھا۔ زینت تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح اس سے بیش آتی تھیں اسے چونکہ ہر طرف سے لاڈ و پیرا دیا جاتا تھا اس لیے مدد و رجا لایا ہی ہونے کے باوجود خود اعتمادی اس میں کوئی کمی نہ رہی تھی۔ اس کے طبیعت بھی بہت سچی ہوتی باقی تھی اور دل بھی نرم و داوی سے بھی اسے دلی آنیت تھی۔ اسے آنکھ کھول کر ہر طرف سے

دعوت و دہم کے بعد تقریباً دو مہینوں تک جہاں اور دو خواتین کا سلسلہ چلتا رہا تھا پھر نا زید اور اپنے شوہر احمد سروش کے ساتھ ہی مومن منانے سو مشنر لینڈ چلی گئی تو اس کے جانے کے بعد گویا حالات پر متحول ہو گئے تھے۔ جہاں تو شادی کے چند روز بعد ہی اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے تھے۔

گل بہار میں صرف سہیل منصور ان کی بیوی نازش اور بیٹی کوثر ہی رہ گئے تھے لیکن سہیل منصور کا قیام بھی عادی ہی تھا اصل میں وہ کراچی میں سہیل ہونے کی غرض سے پورے ستر برس بعد وطن واپس لوٹے تھے۔ اور اپنے لیے کراچی کے کسی معزز علاقے میں مکان خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بلکہ کوشاں تھے۔ جبکہ شعیب منصور کی خواہش تھی کہ وہ اپنی گھر کا قیام اختیار کریں لیکن سہیل منصور بھائی اور بھانجے پر اپنی رہائش کا بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ سہیل کیف۔ ابھی تو وہ بھائی کے یہاں ہی قیام پذیر تھے۔ ان کے علاوہ سہیل بھی تھے جو بھائی کے پاس واپس جلتے کا ارادہ تو رکھتی تھیں لیکن کچھ اس وجہ سے کہ غذا میں بد پریشی کی وجہ سے چونکہ ان کے جوڑوں کے دونوں اضافہ ہو گیا تھا اور اس عرصے میں وہ کافی غلغلہ رہی تھیں اور کچھ اس لیے کہ اسخندان کے بھائی کے یہاں واپس جانے کے حق میں نہ تھا۔ بلکہ کسی طور پر انھیں جانے ہی نہیں دیتا تھا اور اس کی خاطر سہلی بیگم کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اس لیے انھیں نہ چاہتے جو بھی اس کی خوشی کی خاطر کرنا ہی پڑتا تھا۔

اب ان کے بعد لے دے کے سلووا ہی رہ جاتی تھی۔ جیسے گل بہار میں اس طرح دھڑا دے کر بیٹھے گا کوئی حتی تھا نہ خود اس کی طبیعت ہی گوارا کرتی تھی۔ لیکن اس کی مجبوری ہی کچھ تھی کہ سارے احساسات رکھنے کا وجود اسے نہ چاہتے ہونے بھی وہیں رہنا پڑ رہا تھا۔

لیکن مجبوری صرف اس لیے نہیں تھی کہ اس کے بھائی اور بھانجے کے لاڈ و پیرے ہونے سے یا ان کے ولید و پیرے جانے کی وجہ سے چونکہ وہ گھر سے زیادہ جاتی اس لیے اسے کراچی میں ہی رہنا پڑا تھا اور ان کے واپس لوٹنے ہی وہ بھی واپس چلی جاتی۔ بلکہ وہ تو کراچی میں مستقل اقامت کی غرض سے آئی تھی۔ اور یہی موجب کراچی تھی کہ کوئی معقول ملازمت ملے۔ یہی اپنی رہائش کا بھی بندوبست کر کے لیکن سروس ملنا تو کیا اسے تو ابھی تک ملازمت تلاش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ جس کی وجہ ایک تو اس کے پیروں کے نرم اور دوسری سہلی بیگم کی ملازمت تھی۔

کیونکہ اپنے دیکھنے ہوئے نگار پیروں کے ساتھ پوری زندگی سے سہلی بیگم کی تیار داری بھی کی تھی۔

اس روز بھی سب کھلنے کی مہر کے گرد بیٹھے ٹھکانا کھا رہے تھے۔
 شعیب ادب سہل منصو را پس میں اپنے کاروان کے متعلق کوئی خوشخبر کر رہے تھے جس سے ادب کی زندگی سے شوہرے کما۔
 "یوں تو مائنا اللہ رکھ میں سب ہی موجود ہیں لیکن میری نازک کے جانے کے کئی دن ہو چکی ہیں کبھی بھئی کوئی خبر آئے۔
 شعیب "بہت ہی اہم برس خاک دانت" انھوں نے قطع کی تھی۔ اس پر شعیب منصو را دے بڑھاری سے جس میں لاپرواہی کی تھی تھا
 تھی لوے۔

”اصل میں چھوٹے اکا۔ محنتی اپنے میسرے کے پہاڑے میں میری پسند کو توڑنا چاہتی ہیں، ناز کو دعوت و لہیر میں جو بھی خلو بصورت کو کمزور

رہی نظر آتی تھی اس کی طرف میری توجہ مبذول کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مدعو بہ بھی کچھ حسیں مریضوں کے صحنوں میں کچھ کھینچ کر گئیں جبکہ لائق بنانے حرم کھینچے کا بھی میں نے نہ تھا تاہم اسے اور سب جو نہایت خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے آخری فقرے پر انھیں بے ساختہ ہنسی آگئی تھی۔ "کوششیں مضمون ہی جو اپنے سامنے اس کے اس قدر بے باکی سے بات کرنے پر حیرت زدہ کر دیتے تھے مگر انہیں رہ سکے۔"

"بہنو! میں ابھی طرح جانتی ہوں یہ تمہارے سارے اندر بہانے ہیں۔ زینت تو رازی بنجیدہ ہی شکل بنا کر لو لیں۔"

"چلیے اگر آپ کو معلوم بھی ہے تو میری یہ کسی بیچ پر پینچنے کی کوشش کیجئے تھی یعنی دوت کی ریل پیل میں مہینتی حسین تعمیر ہونے کے کسی ایک انتخاب کیجئے کیونکہ ساری صفات کسی ایک ہی میں تو جمع ہونہیں سکتیں۔ اور ہوں بھی تو پھر اس کے مدام اوپر دیکھ کر یہ یا اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے پس ماندہ ہوگی۔ یوں تو جی دیری فریٹک تھی مجھے نہایتی چیز نہیں چاہیے۔ بلکہ اور عملی بیوی مانگنا ہوا۔ اندر دوماں ایو پو نیز سرد اور مدد کے ساتھ خواب میں آپ سے یہ ہوں گا کہ ان لوگوں کے مجبور کر دیئے پر ہی میں آپ کے سامنے آتا ہوں گی۔ اس نے آخر میں باپ سے اپنی بے باک و گفتگو پر مدد کی۔"

تو شیب منصور بولے "لیکن مجھے تمہاری صاف گوئی سے زیادہ تمہارے خیالات کی کنخوشی تھی ہے۔"

"شکر و فیکٹی" وہ سحر کر بولا۔

"لیکن تمہاری جان کے خیالات سن کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خود اپنے لائف پارٹنر دجیون ساتھی سیلکٹ و تھیکر کر رہا ہو۔"

نیو فو رولی۔

"خیر لائف پارٹنر تو انسان کو خود ہی سیلکٹ کرنا چاہیے کیونکہ یہ پوری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے یا نہ ہونا بلکہ یہ بیٹیوں نے اس معاملے میں دخل دینا شروع کر دیا تھا اس لیے شیب منصور نے موضوع پیش کی غرض سے سلو طے پوچھا۔

"کہو اب تمہارے غم کا کیا حال ہے سلو طہ کرمل جی کے علاج سے کچھ آفاقا تو بھی ہوا۔"

تو وہ چلنے ہی کسی خیال میں کہ چپ چاپ کھانا کھا رہی تھی چونکہ کرولی۔

"جی۔ جی ہاں۔ آفاقہ تو بہت بولے ہیں مگر میرے پیر میں تو سارا زخم رہ گیا ہے۔"

"سچی تم کچھ تو آہستہ بہت تکلف سے کام لیتی ہو، نازش نے اسے کھانا کھاتے نہیں بلکہ چھتے دیکھ کر اس کی طرف مڑتا دکھاتا۔

بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے شکر یہ کہ یہ مضمون سارا بلاؤ لڑی پلیٹ میں ڈال دیا۔

"تکلف نہیں کرتی بلکہ شرماتی ہیں یہ سلو طہ آج اب میں اندر جا کر کھانا لگ جانے کی اطلاع دو تو ہر شرم کا ایسا سا ہر گز نہ۔

جیسے انھیں کھانے کے لیے نہیں بلکہ کسی کو کھانے کی غرض سے بلایا جا رہا ہو۔" نیو فو رولی تو ایک فہم پر اور شرم کی سرخی نے اس کے رخساروں پر لگا سا چھڑک دیا۔

"یعنی خیرات لگتی ہیں نہیں سیدہ سارے ماحول کی پردہ پوشی ہے لیکن تم بھی تمہارے لیے خیر نہیں تمہاری بھاری بھالی کے ہوا ہی ہیں۔ تم کسی قسم کا بھی کوئی تکلف نہ کرنا کرو، شیب منصور نے اسے جھینپنا اور شرمنا دیکھ کر گواہ حوصلہ دیا۔

"اصل میں یہ تکلف سے نہیں غریب سے کام لیتی ہیں، حالانکہ مجھے سارا ہی رہنے کے ارادے سے آئی ہیں۔ انھیں تو اس ایک ماہ کے عرصے میں سب سے محفل مل مانا جا رہا ہے بخیر توجہ تو دیکھو کسی سے بات ہی نہیں کرتیں۔ زینت کا ہر گز ادب و عزت و احترام۔

میں جو کہ وطن پرست تھا ہوا تھا اسے تو بڑا سبب ہی نے محسوس کیا۔ اور شیب منصور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ سلو طہ خود لول تھی۔

"بہنیں خیر غریب تو بالکل نہیں برتی بھائی جان! اور جہاں تک یہاں رہنے کا سوال ہے تو میں آپ کے یہاں مستقل رہنا کی غرض سے تو نہیں آئی۔"

"اچھا۔ مگر میں نے تو سنا تھا کہ تم یہاں کر لپی میں سروس کرنے کے ارادے سے آئی ہو۔ نازش نے پوچھا۔ تو محسوس پلیٹ میں لٹنے ڈالتے ہاتھ روک کر شیب منصور نے پوچھا۔

"یہ آپ نے کس سے سنا چھوٹی دہن! تو نازش کچھ پتہ نہ لگتی تھی۔ اور گلاس سے ایک دو گھونٹ پانی پینے کے بعد انھوں نے کہا۔

"وہ شاید اہل جان اس روز کچھ ذکر کر رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ بات بنائی گئی ہے۔ شیب منصور نے بہت کچھ طرف دیکھا خاموش ہو گئے۔

"لیکن آپ نے کچھ غلط تو نہیں سنا بھائی دلن؟" آخر وہ اپنے رشتہ داروں کو جن ناموں سے پکارتی تھیں سلو طہ کی وی ہوتی تھی جن میں سروس کرنے کی غرض سے جی کر لپی آئی ہوں۔ رہائش کا مسئلہ درپیش تھا اس لیے بھائی جان نے مجھے یہاں بھیج دیا لیکن وہ

نہ تھی۔

گلاس روز کے بعد سے متعدد بار اس سے سامنا ہوا تھا اور وہ اس کی موجودگی میں اس کے لیے بھی آیا تھا۔

ملنے ہی میں اپنی رہائش کا نہیں اور بند و بست کر لوں گی، سلو طے نے یہ کہہ کر گویا زینت کو اپنی رہائش کے بارے میں اطمینان دلایا۔

"آج گھر آجائیں علیحدہ رہنے کا ارادہ ہے تمہارا مگر جانتی ہی ہو کہ مجھ سے رہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یا کسی بڑی بھائی کوئی ہے چاروں طرف سے اچھے اچھے اپنی جانوں اور عزتوں کی حفاظت کرنے سے کام لے رہے ہیں اور تم تو ایک کمزوری لڑکی ہو۔ شیب منصور نے یہیں نہ تڑپتی تھی اور نصیحت کی۔

"میں تمہارا رہنے کا تو فیہم تصور نہیں کر سکتی تھی اکا البتہ کسی ہوشیار یا بو ذہن میں توجہ کو مل ہی جائے گی۔ وہاں تو نہائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ شیب منصور کے اوپر بے پناہ کھانے کے باوجود اس نے کہا۔

"تم چونکہ یہاں رہ رہی ہو تو ایک طرح سے میری ذمہ داری بن گئی ہو نہاد جب تک عاقب دلدور سے نہیں لوٹے تم اپنے سروس کے ارادے کو ترک ہی کرو، شیب منصور اس کے جواب پر بڑا رمان کر لے۔

"لیکن مجھے اکا۔ بھائی جان کی اجازت کے بغیر تو میں گھر سے بھی قدم نہیں نکال سکتی تھی۔ ان سے سروس کرنے کی اجازت لے کر ہی آئی ہوں شیب کے سامنے بالخصوص اس شخص کے سامنے وہ اپنے ذاتی معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے شیب ساری تھی مگر میری اسے کہنا ہی پڑا تھا۔

"خیر۔ سروس بھی کر لینا ایسی جلدی کیا ہے۔ یوں بھی سروس ملنی انہی آسان نہیں جتنی تم سمجھ رہی ہو۔ شیب منصور نے حائل کا سامنا کرنا بنایا۔

"لیکن کس قسم کی سروس چاہتی ہیں آپ۔ آئی میں۔ آپ کے پاس کسی کام کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے یا کوئی تجربہ بھی رکھتی ہیں آپ؟"

نیو فو رولی پوچھا۔

"نہیں۔ تجربہ تو نہیں رکھتی کیونکہ میرے کسی کام کرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ البتہ سرٹیفکیٹ مفروضہ ہے میرے پاس ٹائٹلنگ اور شارٹ ہینڈ میں مہارت رکھنے کا، سلو طے نے نہایت سادگی سے بتایا تو نیو فو رولی جو چہرہ جھجکا کر لگنے لگی۔ کوڑا اور ہلکے چہرے پر بھی مسکرا ہوا تھا۔

"کیوں تم نے ہر تعلیم حاصل نہیں کی؟ نہایت نے کیسے سے لیے ہیں پوچھا۔

"نہیں۔ لیس انٹر ماس ایس کیلئے میں تعلیم نہیں سمجھتی، سلو طے نے بتایا۔

"لیکن آگے کیوں نہیں پڑھنا تھو؟" سبیل منصور نے پوچھا تو اس نے ایک نظر زینت پر ڈال کر اہستہ سے کہا۔

"بھائی جان نے مزید کچھ پڑھنے کی اجازت ہی نہیں دی اور کلاس سے اُٹھوایا۔

"اور یہ تو جی زیادتی کی تم بہا محسوس نے۔ سبیل منصور بولے۔

"مگر کسی ڈینٹ جاب کا تو خیال ہی چھوڑ دیجئے۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ اسٹیو گرافک جاب مل سکتی ہے لیکن یہ اسٹیو اور ڈائمنٹ کی جاب تو بڑی چپ و چمٹا، ہوتی ہیں۔ نیو فو رولی نے قہر سے کہا۔

"خیر خیر جاب و اب کے معاملے میں ابھی سے کرپٹیا کرنے کی کیا ضرورت ہے جب اس کا موقع آئے گا تو جی دیکھا جائے گا۔ سبیل منصور نے کہا۔

کھانا تو بڑا سبب کھا رہی تھی مجھے تھے محسوس کا دو پر عمل رہا تھا۔ بلکہ محسوس بھی کھائی گئی تھی لیکن چونکہ بڑے ابھی تک مجھے ہی تھے اس لیے لڑکیاں بھی۔ اسی جیٹ نہا رہی تھیں کہ ادب و آداب اور اخلاق کی رو سے جب تک کہ کھانا کھا کر نہیں اٹھتے کھانا کھا چکے تھے کہ باوجود چوبیسوں پران کا ساتھ دینا لازم ہوتا ہے البتہ کوئی جلدی میں ہو یا میرے اُٹھنا چاہ رہا ہو تو مدد کے آگے جا رہا ہے۔ جیٹا سفند سے بھی کہی کہہ۔ وہ آجیکو پوزی کہہ کر کھڑا ہوا اور کھانے کے کوسے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے تقریباً دو بجے شیب منصور بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اُٹھنے ہی اور سب کی اُٹھنے۔

سلو طہ اپنے رہائشی کمرے میں آئی تو سلی بیگم سوچتی تھیں۔ وہ اب روایت تو ہو گئی تھیں لیکن کمزوری باقی تھی اس لیے جلدی سوچتی تھیں جیسا کہ رشتہ داروں کو تو بھی بت چکے تھے۔

آئے ہی وہ ان کی در سے دیے پاؤں ملتی ہاتھ دھونے کی غرض سے غسلی میں بیٹھ گئی تھی۔ واپس ملتی تو اس کی نظر اسٹنڈ پر پڑی جو کئی بیگم پر کھانا کھا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر روزانے کی بیگم پر ہنس کر لگتی تھی۔

گلاس روز کے بعد سے متعدد بار اس سے سامنا ہوا تھا اور وہ اس کی موجودگی میں اس کے لیے بھی آیا تھا۔

65

مگر اس وقت جب گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کمرے میں موجود ہوتا۔ وہ بھی دن کے وقت۔ اول تو وہ داوی کے پاس زیادہ ہوتا، ہی نہ تھا۔ اور چار گھنٹہ دیر کے لیے تک ہی جانا تو سوا دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھ جاتا تھا۔ جس سے وہ کمرے میں داخل ہوتا اور کمرے میں اندر ہی اندر اس سے خوفزدہ ہی رہتی تھی۔

جبکہ وہ اسے یہ بھی یاد رکھا تھا کہ اس کے دل میں اس کا بہت احترام ہے۔

پھر بھی وہ اس کے سوتائی۔ اجتناب برتنی تھی حالانکہ وہ خود بھی سامنا ہو جانے پر اس کی طرف رخ نہ دیتا بلکہ دوسرے معنوں میں اس کی موجودگی کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ کہوں بھی سلوٹے اس کا کوئی ایسا اثر نہ تھا۔ نہ تعلق جس کی بنا پر وہ اس کے کوئی اثر نہ سمجھتا۔ اور اسی خیال کے تحت وہ اس کی بے رحمی اور اعلیٰ کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اور آج وہ نہایت خاموشی سے اندر گیا تھا۔ جبکہ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اس کی داوی کے کمرے میں ہی رہتی ہے۔ اسے کہہ کر نہ بتا کر دیتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر سے پہلے ہی ناخوشگوار خیال سلوٹے کے ذہن میں سرسرا اٹھتا۔ اور دیکھنے کی بیزاری کو درپیش کر لیتا تھا۔ وہ تو تھی اس کی کہ درجہ ہے وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہا۔ لہٰذا وہ اس کے غم میں وہاں جانے کے لیے غصے ہی تھی جو کچھ اس نے کہا۔

”جینے کی کوشش کے سوا کوئی کیوں میں نے آپ کو بچھڑا ہے۔ یہ تو وہ وہیں مسکاتی ہو کر رہ گئی۔“

”اصل میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اندر موجود ہیں ورنہ کم از کم کھٹکھٹا کر ہی اپنی آمد سے آپ کو باخبر کر دیتا۔“ وہ سیدھا ہونٹا ہوا بولا۔ مگر سلوٹے جواب میں خاموش رہی۔ البتہ ناخوشگوار کیا کہ قدم بڑھا کر اپنے بیٹے کے قریب جا کھڑی ہوئی جو کمرے کی دوسری انت میں پڑا تھا۔

”ویسے بائی دوسرے کہا بچھا کا دلوا رہا تو نہیں نکل گیا جو اپنا نقصان پورا کرنے کے لیے انھیں آپ سے سروں کرانے کی فریاد بڑھ گئی۔“ اس نے قدم بڑھا کر اس سے غصے پر کمر کر دیا۔ البتہ کینا ہی نہیں بہت اہانت آمیز سا بھی تھا اس نے غصے پر کسی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔

”نہیں، خدا کرے بھائی جان کا دلوا رہا کیوں نکلے گا۔ وہ تو میں خود اپنے شوق اور مرضی سے سروں کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا میں یہ سوچ سکتا ہوں؟ آخر آپ پر راجہ کیا؟“ خدا بڑھ گئی ہے جو آپ ایک خیر سے جا کر ناچا جاتی ہیں اس کے جواب پر وہ غصے سے بولنا۔ تو اس نے توری چڑھا کر انتہائی پیچھے انداز میں پوچھا۔

”اور کیا میں یہی سوچ سکتی ہوں کہ انہی بارش لینگو تیرے زبانی بولنے کا حق آپ کو کس نے دیا؟“

”اسی احترام سے جو آپ کے لیے میرے دل میں ہے۔ وہ یوں بولا جیسے پہلے سے ہی اس کے سوال کا جواب تیار کر رکھا ہو۔ اس جواب پر سلوٹے نے متعجب کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ہر کیوں کے ساتھ ساتھ ہر تھوڑا سا جھجکا کر بولی۔

”اگر آپ کا کوئی مذاق بھی ہے تو میں خود کو اس کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔“

”ہاں میں کہا مطلب ہے تمہارا؟“ یہی آپ کا کیسا مذاق؟ اس نے انھیں پتہ چاکر متعجب سے انداز میں پوچھا۔

”مطلب یہی کہ جہاں تک مجھے باوجود ہے میں نے آپ کو کوئی تکلیف پہنچائی ہے نہ کوئی مذاق ہی کیا ہے۔ وہ تو نقص افغانی

ہی تھا۔ میں اپنی دھن میں بیٹھ کر آدمی تھی کہ ایک بیک بڑبڑ رہا تھا اور۔ اور۔“

”مگر یہ چاہنا کہ بڑبڑ جانے کا حادثہ کیسے وقوع پذیر ہوا تھا؟ اس نے اس کی بات کاٹ کر عزت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اب وہ صاف صاف یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ انھیں دیکھ کر ہر تھوڑے سے ڈر کر۔ جواب سوہنے کر بولی۔

”یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم مگر ہوا کچھ ایسا ہی تھا۔“

”جتنی بات کہتے ہوئے ڈرتی ہیں نا؟ آپ کچھ سے خوفزدہ ہو گئی تھیں۔“ وہ کھٹکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔“ خوفزدہ کیوں ہونے لگی تھی آپ سے۔“ وہ ہنستا کر بولی۔

”اچھا تو پھر مجھے دیکھ کر وہی انگلیاں کاٹنے کا محاورہ صادق لگنا ہوگا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ اس کے اچانک لہجہ بدل لینے پر اس نے گھر کر اس کی طرف دیکھا۔ کہنا چاہ رہی تھی۔ ”نہیں۔ لیکن نظر میں چاہے ہوش تو بڑی طرح دکھلا رہی تھی۔“

”اب تو کہہ دیجئے کہ ہاں۔“ وہ اس کی کھلا ہوتی ہوئی بولی۔ مگر جواب میں وہ ہنست ہنست کھڑی رہی۔

”وہ جو کہتے ہیں شاعروں کے خاموشی خود ایک جواب ہوتی ہے تو کیا میں ان کی کج بولیوں۔“ وہ غصے سے اس کے نزدیک ہو کر بولا۔

تو قوت کے بعد اس نے کہا۔

”اگر تمہیں تو فرقی ہی کیا ہے گا؟“

”فرق ورق کی بات۔ آپ کی نہیں میرے سوچنے کی ہے۔ اور یہ بات میں پورے وقوف سے کر سکتا ہوں کہ آپ اس وقت ہی مجھے خوفزدہ نظر آ رہی ہیں۔“ تو اس کا دل چاہا کہ کہیں مجھے سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے کیوں نہیں دیکھ کر گھر پر ایک گھر است ہی ملتی ہو جاتی ہے۔ اور کچھ تو وہ یہ بات کہہ رہی تھی لیکن کہنے کے بعد اس کے طرح طرح کے سوالوں کا جواب دینا اس کے لیے مشکل ہی ہو جاتا۔ اسے یہ تمہیں بات پر ہاتھ دھو کر دیکھتے تھے۔ ہوا سے جاری تھی کہ۔ ”سلی۔“ بیکر جو شاید اس کی آواز سے مل گئی تھیں اور کڑوٹ

کے بل کی تھیں۔ انھوں نے سیدھا ہونے کی کوشش میں سر اٹھا کر دھڑکھڑکھتے ہوئے پوچھا۔

”افوہ ستوری دیر دیر سے نہیں۔“ عین کلا عکس پر اس کی آپ کی کچھ ٹھنکی رہ گئی تھی۔ وہ وقت کے عالم میں منہ میں جڑ جاتا ہوا ان کے بیٹے کی طرف بڑھتا تو انتہائی بوجھ ہوئے کے باوجود سلوٹے کو ہنسی آ گئی جسے اس نے فوراً ہی ضبط کر لیا۔

”ہاں میں کہا کہ ہے ہونے؟“ سلی۔ ”مجھے اس کے جڑنے پر پوچھا۔“

”کچھ نہیں اماں جان۔ میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ہوتے ڈیڈی نے آپ کا علاج دوسرے ڈاکٹر سے کر لیا ہے۔ وہ۔“

”مگر اس کی مال برابر ہوتی ہے نا شاید ای ہے۔“ وہ سلی بیٹے کے قریب جا کر بولی۔

”اسے نہیں۔ تم چار برس دلاؤ۔ اب اس کا کٹ کر تو نہیں آئے وہ تو مجھ کو سوات گئے ہوئے تھے اور تمہارے پیچھے میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس لیے شیب نے کرل حتی کو بلا کر دکھا دیا تھا۔ اس لیے نا اسی کا علاج ہوتا رہا۔“ سلی بیٹے کو بھینس کر وہ ان کے غصے سے کہہ رہا ہے۔

”لیکن میں ان کا علاج تو کر سکتا تھا نا اور شرط یہ کہنا ہوں کہ ان کے پیر کا زخم کب کا بھر چکا ہوتا۔ اور ہر کرل حتی سے علاج کر کے ایک عکس پڑا نہیں۔“

”اے تو اس بے چاری کی اس میں کیا خطا کرل حتی کو تو تمہارے والد نے بلا کر دکھا دیا تھا۔“ سلی بیٹے کو جھنجھتی ہوئی بولیں۔

”یہ لفظ بے چاری ان کی کینت ہے یا عفت یا بھر ولدت اماں جان۔“ اس نے ان کے سلوٹے کو بے چاری کہنے پر کچھ بڑبڑ پوچھا۔

”اے نہیں ایسی کیا بے چاری ہے اس غریب بیٹی سے جو تمہارے دھوکے اس کے پیچھے چمکتے ہو۔“ سلی بیٹے کو بڑبڑ پوچھا۔

”اچھا تو بڑبڑ بھی ہیں جیسے ایک صفت اور معلوم ہو گئی ان کی بے چاری اور غریب شاید ای ہے تو ذرا کے دولت مند بننا چاہتی ہیں مگر پھر بھی ان کو کھینچ رہی ہیں کہ کیوں نہ لڑیں گے جو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جب خراب ہوئے تو اب لڑی کا جتن ہوا کینت نہیں۔“ وہ جو کہ اپنے بیٹے کے پاس کھڑی تھی۔ اس سے اسے تھلے تو اس نے قد سے اونچی اٹھ کر بولی۔

”تو سلی بیٹے اے انھیں دکھائی ہو گئی ہیں۔“

”اے واہ جس کا معاملہ ہے وہ خود جانے تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟“

”ایک خیر خواہ۔“ وہ واہ کی کھنکی کو نظر انداز کر کے منات سے بولا۔

”ہو نہ ہو۔“ اس نے نکل کے خیر خواہ۔ وہی مثل ہوتی کہ ان کے بڑبڑ جان بڑی خال سلام۔“ سلی بیٹے کو بولی۔

”بڑی خال نہیں جہوں پیچھو کی دیکھتے آتے میری پیچھو کی ندی تو میں نا۔“ اس نے کچھ اتنی بڑھتی ہے کہ اس کے سلی بیٹے کو بھی ہنسی آ گئی۔

”اچھا بھلے آدمیوں کی طرح بیڑ گریات کر۔“ یہ کھڑے کھڑے ہنچھوئے کیوں آ جاتے ہو۔ اور آج کہا خاص بات ہو گئی جو اس وقت رات کو کل کے تھے ہو۔“ سلی بیٹے نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ آپ کی خبر تیرے پچھنے رات کو آپ کو پوچھا جا رہا ہے کہ کہا خاص بات ہے۔ یوں ہی تمہارا اتنا کہنے کے بجائے شاید آپ نے بے دھیلی میں منہ بھولنے کا محاورہ استعمال کیا ہے۔“ وہ بھی ایک چالاک تھا۔ ان کی اصل بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے بات ہی گھمادی۔

”اے چل زیادہ باتیں نہ بنا۔ میں خوب جانتی ہوں مجھے بے ساری مجھے بے وقوف بنانے کی باتیں ہیں۔ ورنہ دل ہی کب چاہتا ہوگا۔“ بڑبڑ جان نے اس کے گھر کی دھڑکھڑکی سے کھنکی کو اس کی داوی ہی نہیں اس کے رگ ویلے سے واقف انھوں نے کھنکے کے انداز میں کہا۔

”نہیں خبر تو نہیں تیرے کہہ جانا ہے میرا۔ لیکن آجکل مصروفیت ہی کچھ ایسی ہے کہ سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔“ وہ واہی کے پاس بیٹھا ہوا کسی ہی صورت بنا کر بولا۔

”کیوں ایسے کہا بل جو سننے پر نہ ہیں نہیں آجکل۔ اور اگر ایسی ہی مصروفیت تھی تو کیا میرا چارڈ اٹنے کے لیے نہ

”یہ مجھے مہلّا کہیں کسی انسان کا بھی، چار پڑے سنا ہے آج تک۔ شاید اتنا بڑا تو مرزا بھی کسی نے ایجاد نہیں کیا ہوگا اور لا۔ وہ ان کی بات سنہی میں اڑاتا ہوا لولا۔“

”بیروں سے تو تجربہ انسان خود ہی جتا ہے لیکن آپ کو آخر تکلیف کس ہے جبکہ میں نے اپنے طور پر آپ کو ہر طرح کا آرام فراہم کر رکھا ہے۔ ذہنی کمی جی آپ کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں مگر آخر آپ جیسے ہمارے نام کے یہاں جلنے پر رضیہ کیوں ہیں؟“

”لیکن یہ سوطھی تو آپ کے کمرے میں ہی نہ رہیں! اماں جان پھر تنہا ہی کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟“ وہ انہیں کسی کی طرف قائل کرنے پر تلا دوڑا تھا۔

”لو اب بات نہیں بن سکتی تو تیرا۔ دکھانے لگے۔ جہاں بھی تھاری یا خوشی غماز کو ملحوظ رکھتے ہوئے تو یہاں آئی تھی اور اب تمھارے ہی ارادہ پر یہاں رک گئی تھی ہوں تو اس کا یہ مطلب تو یہ نہیں کہ تم بے گناہ مال بکھڑے ہو اس کی جاؤ جبکہ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی بھی یہاں ایسے بڑے خوش نہیں۔“ سلی بیگم اصل بات آخر کار پرے آئی تھیں۔

”کیا سنا نہیں آپ نے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”ہائیں ہائیں! یہ کیا عتقوت ہے۔ اگر اس نے سن بھی پایا ہے تو حجاب و دنیا کو ضروری تو نہیں پہنچی لیکن فوراً ٹوکا۔“

”واہ یہ بھی خوب ہے سوال ان سے کرو اور جواب آپ دینی ہیں کیا ان کی زبان کچی ہوئی ہے جو خود بول نہیں سکتیں؟“

”مجھیں بہت اوجھار میں مزید آپ کی۔ تو نہایت بے باکی سے اس نے اس کی غٹھے سے تپتی آنکھوں میں دیکھ کر اس کے بات کاٹ دی۔“

”نہیں! یہی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر آپ نے سروں کی نسبت کچھ ہو جائے گا۔“
 ”ہاں! وہاں تو لوگوں نے کہا کہ اگر آپ آج آکر اس کا سامنا کریں۔“

وہ سخت برائی کے عالم میں اس سے لگا میں ملنے ہوئے ہوئی۔

ساتھ ساتھ ہی میں نے اس شخص کو بھیجا کہ وہ اس کے کھانے کو لے کر اس کے کمرے میں آجائے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کے کمرے میں آجائے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کے کمرے میں آجائے۔

68 "میں کہیں ہوں نکل کر دوں۔"

یہاں پر وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ یہ تو میرے دوست ہیں، ان کو جاننا چاہتا تھا۔

”ان فوجیہ امال جان کی قوت سلسلہ کوچہ غیر معمولی حد تک بڑا تھا۔ وہ میں تو ہمیشہ کچھ بڑا تھا کہ میری گفتگو کا ایک نقطہ یہ ان کے لئے نہایت بڑا رہا۔ وہ ایک سو سو گال دی جا کر کے انہی آدھنی آواز میں بولنے پر جو برابر والے کمرے میں بیٹھ کر کسی آپ کی گفتگو کو

”اچھے بگے کی باجری بیسونا تو اس کے بھائی کی دوسرہ داری ہے تمھاری تو نہیں۔ جو تم خواہ مخواہ بھسودی کیسے بڑبے کر رہے ہو یہ وادی نے تمھیں کھانڈے اٹھا دیں سمجھا اور شے داری کی نزاکت کا احساس دلایا۔ تو حجاب میں اس نے ایک بھائی نے کر کہا۔“

وہ اپنے کسے میں آیا تو اسے اسی اس نے حسب معمول لباس تبدیل کیا بلکہ ہر ملے لگے عیوب کا مین دیا یا اور جب تک عیوب سے ایک سوئی کی کتاب اٹھا کر تیرہ سو سال کی طرف عیوب کی روشنی میں کتاب محمول کر رہا تھا۔

مگر ذہن الجھا ہوا تھا۔
 کالوں میں واہی کے لیے الفاظ کو گم نما ہوا تھا۔ خواہ ہر سو ہی کہے کہوں مے بن رہے ہو۔ ابھی تک گونج رہے تھے۔ اور ایک

اے لے کر اب میں درج عبارت پڑھ کر تو رہا تھا لیکن مفہوم سمجھنے سے قاصر سا لگ رہا تھا۔

کو عبادت کے ہر حرف پر کھمبھی بٹھان اور ہری ہری آنکھ ڈال کر ہر دم کی خوبصورت آنکھیں۔

اور وہ بھولا بھولا شخص کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ؟

آج سے پہلے تو کبھی اک ملازم میرے احساسات اتنے شدید نہیں ہوئے۔

ہرگز کیا بات ہے؟ کہا وجہ ہے؟
 وہ کس وجہ سے میرے خیالات پر حاوی ہو رہی ہے۔؟

اب تک اپنی پسند اور معیار کا کوئی متعین ہی کر سکا ہوں۔

نفاذ وہ کوئی جاننا ہیجز ہو یا جو کچھ لڑیں، کسے کہہ نہ سکتے، کہ اگر ایسا کہنا کہہ کر نہ گئے، وہ لڑنے لکھنا آئے یا جو کچھ

60

یہ بھی کئی کہ بہل منور نے اپنے اولاد کے دریاں مائل طویل تر فاصلوں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ لندن میں تو وہ سے ہر دوسرے تیسرے دن نوٹر ہال سے فون پر رابطہ قائم کرتے تھے اور وہیں بار خود بھی اس سے اکریمل گئے تھے۔ اصل میں تو اس کی کہ وجہ یہ بھی تھی کہ شہب منور بھی اولاد و زینہ سے عروم ہی کے ان کے صرف دو لڑکیاں ہی تھیں، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد وہ شہب منور کے لئے اور وہاں ایک مقامی بیوہ سے شادی کر لی تھی اور فخرہ کو لا دلہہ ہی تھیں۔ گویا منور نے امدان کا واحد سلسلہ بدھار بھی سمجھ دیا تھا۔ اس لیے بہل منور سے بیوہ کی طرح ہی چاہتے تھے۔

بہر کیف، باپ اور بچے کے شوق سے بنی الوقت اس نے اپنا پڑا بیوہ کیلینک ٹیبلٹ کر کے اولاد نہ کر سکا تھا اور اگرچہ اس کے ایک بیوہ سے ہسپتال میں طازمت حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہ وقتاً بہت اچانک اور غیر متوقع طور پر بلوٹ کے غشی نے اس کے دل و دماغ پر ہلکا بول دیا۔

وہ سوکرا تھا تو وہ صبح اسے بہت اچھوٹی بہت مسرور کن سی لگی کہ اگر کم ان ساری صبحوں سے کہیں نہ زیادہ حسین اور لطیف ہو اب تک وہ گڑھا چکا تھا۔ ذہن بھی بہت تازگی محسوس کر رہا تھا۔

اور دل انسا طاقی لہروں پر بہت سرشاری سے خود غم تھا اور وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا ہو کر دھنکی ہوئی روٹی کی طرح ہلکا ہونے والوں کے نمونوں کی مانند نیلے گھن کی دھنوں میں پرواز کرتا محسوس کر رہا تھا۔

اس حقیقت سے بے خبر کہ وہ عشق پر غلبہ سے تھیں، لذت نامک اور مایوس کن مقامات بھی آتے ہیں کہ ایک عاشق ناظر اپنی جان سے گزرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

یاد آتا ہے کہ وہ بھی نہیں چھوٹا۔

مگر جہز چونکہ بالکل نیا اور تازہ تازہ تھا۔ اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جس کے ہاتھ اچانک فضاؤں میں بلند ہونے والا کوئی رنگین غبار اچلے اور اس کی خوشی کا کوئی ٹکڑا نہ رہے۔

وادی کے کمرے میں جانے کی خواہش کو سختی سے ٹھکرا کر اس نے نائنٹہ کو کسی نہ کسی طرح دل پر جبر کر کے حلق سے اتار لیا تھا۔ نائنٹہ کے بعد۔ لاکھ دہانے اور سختی کرنے کے باوجود دل جب بری طرح چلنے لگا تو اس نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح اتنے سویرے وادی کے کمرے میں چلنے کا جواز منو نہ لیا۔ اور پھر ہی دیر بعد وہ وادی کے کمرے میں جا پہنچا اور انہیں سنا

کرنے کے بعد اس نے کمرے میں اور ادھر دیکھتے ہوئے بچھا۔

”اماں جان۔ بے چاری غریب اور جانور شمال نے زبان نہ بولی کہاں میں ہوا تھا لاکھ وہ اسے بیڈ کے سر پرانے کو نہ میں کھرا دیکھ چکا تھا۔

”ماںیں ماںیں، یہ کیا بے ہودگی ہے ننھے، باز تم کیا بک رہے ہو؟“ سلی بیگم نے۔ بچی بچی آواز میں اسے جھڑکتے ہوئے انکھ کے اشارے سے سلوٹ کی موجودگی کا احساس دلایا۔

”خیر، بک تو بالکل نہیں رہا، البتہ انہیں حاج سویرے سویرے ایک بہت ہی بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ایک تہہ شدہ کاغذ کو وادی کے سامنے لہرا رہا ہوا ہوا۔ اور وہ جو اس کے بے چاری غریب وغیرہ کہنے پر بھڑک سی اٹھی تھی اور اپنے بستر کی تھار جھانڈنے کی غرض سے بیڈ کے سر پرانے کو مڑی تھی رچی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے منہ سے خوش حرف کا لفظ اس کا غصہ اور تہما ایک جھٹس میں بدل گیا۔

”اچھا جب ہی تو میں کہوں کہ آج اتنے سویرے تمہارا زول کیسے ہو گیا بگالیسی کی خوشخبری لائے ہو کچھ بناؤ میں تو“ سلی بیگم نے محض اس تنازع کو بدلنے کی غرض سے جو اس کے بے چاری اور غریب کہنے پر بندھ گیا تھا تھوڑا سا ہنس کر پوچھا۔

”خوش خبری یہ ہے کہ سچو سچو اور سچو چھانچا خیر و عافیت پنے ٹورے واپس آگئے ہیں، اس نے تیار۔

”میں کیا بچہ؟ بہت بے اختیارانہ اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر تھوڑی سی آگے بڑھ آئی۔

”تو کیا آپ کے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ وہ تنک کر بولا۔

”میرے خیال میں تو یہ ان دونوں کی آمد کی اطلاع ہوگی جو انہوں نے اس تار کے ذریعے دی ہوگی، سلی بیگم کا اشارہ اس کاغذ کی طرف تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔

”جی نہیں، یہ تار ان کی طرف سے ضرور آیا ہے لیکن ان کی آمد کا نہیں بلکہ نازو کی شادی کی مبارک باد کا ہے۔“ وہ طنز پر انداز میں ہنس کر بولا۔

”ہیں نازو کی شادی کی مبارک باد! دو ماہ بعد دی ہے انہوں نے کیا اتنے عرصے سے سو رہے تھے دونوں؟“ سلی بیگم تجویز پر دل ڈال کر بولی۔

”دیکھیے بھلا اتنی باسی تباسی مبارکباد دینے کی ضرورت ہی کیا تھی انہیں؟“ وہ بڑا سائنہ بنا کر بولا۔

”دیکھی پ تو کہہ رہے تھے کہ بھلائی اور بھائی جان اپنے ٹورے واپس آگئے ہیں تو پھر بھلا انہیں یہ تار بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟“

سلوٹ کا شاید اس بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

”اب یہ تو وہی باتیں کہ کیا ضرورت تھی البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں واپس آگئے ہیں اور رڈ مار پر دلہنشی کے ساتھ آئے ہیں۔ بالکل دی، فی پیر کی طرح۔ جیسی تو اخبارات میں ان کی تصویر بھی شائع ہوئی ہے۔“ اس نے کہا اور جیب سے کسی اخبار کا پتلا مٹھو نکالنے لگا۔

”اچھا تصویر بھی چھپی ہے ان کی۔“ سلی بیگم تعجب سے بولی۔

”جی ہاں، یہ دیکھیے۔“ ان دونوں کی ہی تصویر ہے؟ وہ اخبار ان کے سامنے کر کے ایک تصویر پر انگلی رکھ کر بتانے لگا۔

”لیکن ان دونوں نے تو اپنے جیسے ڈھانپ رکھے ہیں،“ سلی بیگم بیانی کی کڑوری کی وجہ سے انکھیں چندھیا کر تصویر کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”ہاں تو تو زیادہ تاخر سے مبارکباد کا تار بھیجا ہے، شمار رہے ہوں گے وہ دونوں بھی تو جیسے ڈھانپ رکھے ہیں؟“ وہ اخبار کو رول کر کے جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

”اسے حل مجھے بنانے چاہیے، معلوم کس کی تصویر اٹھا لیا۔“ ورنہ پھر اسی طرح ہی اپنے کٹوت دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے منہ چھپاتے ہیں،“ سلی بیگم بولی۔

”ہاں تو کیا اتنی تاخیر سے تار دے کر انہوں نے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا؟ یہ تو انہیں اپنے منہ چھپانے پڑے۔“

”اے بس رہیں، میں دو دن سے شرم تو نہیں آتی ایسی بے ہودہ باتیں کرتے۔ جبکہ وہ دونوں بھی تمہارے پچو پچو چاہیں۔ بزرگ ہیں کیا انہی کے ساتھ یہ ادنیٰ بولنی باتیں کرنی رہ گئی ہیں تمہیں؟“ سلی بیگم نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے انکھوں انکھوں میں دھماکا کیا۔

”لیجیے بھلا میں نے ایسی کیا بات کہہ دی جواب انکھوں ہی انکھوں میں مجھے کھانے کے لیے تیار ہیں،“ وہ تھوڑا سا ہنس کر بولا۔

”لیکن بھائی اور بھائی اسے کہاں ہیں؟“ سلوٹ کو صرف بھائی بھادج کی واپسی کی ہی پڑی تھی۔

”زمین پر؟“ اس نے برہنگی سے کہا۔

”خیر زمین پر تو سب ہی اترتے ہیں، میرا مطلب تھا کہ کیا وہ یہی کراچی میں اترے ہیں؟“ سلوٹ جی سی ہو کر بولی۔

”نہیں، کراچی میں اترے ضرور تھے مگر بالا ہی بالا۔“ دو منٹنگ فلاٹ سے ملتان چلے گئے ہیں۔

”میں یعنی واپسی پر کھڑے کھڑے مبارکباد دینے تک نہ آئے؟“ سلی بیگم جھک کر بولی۔

”جی نہیں، کیسی بچی، کسی کی بھتیجی آج کل تو سارے ہی رشتے بودے اور ناقص ثابت ہو رہے ہیں؟“

”میں ذلیل تار دیکھ سکتی ہوں،“ سلوٹ نے جو بڑی مضطرب سی نظروں میں تھی کچھ سوچ کر پوچھا۔

”جی ہاں ضرور یہ دیکھیے،“ وہ کاغذ والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے بولے۔

”افوہ نہیں، میرا مطلب تھا کہ میں تار پر درج عبارت پڑھتا جا رہی ہوں سلوٹ نے تار کی عبارت پڑھنے کی غرض و غایت بیان کی۔

”اچھا تو کیا میرا ہر طرح دنیا کا کافی نہیں؟“

”افوہ دے دونا سے تار۔ اتنی محبت کیوں کرتے ہو؟“ سلی بیگم بھی عاجز آگئیں۔

تب وہ قدم بڑھا کر اس کے نزدیک ہی کھڑا ہو گیا اور نہایت خاموشی سے تار اس کے ہاتھ میں بٹھا دیا۔

”کیا کھائے سلوٹ بیٹی؟“ سلی بیگم نے سلوٹ کو تار پڑھتا دیکھ کر پوچھا۔

”کھا لیا ہے بیٹے آف تک، گڑو گڑو اور پارٹی ٹریننگ وغیرہ یعنی بہت رسی سے جملے،“ اس کے جواب دینے کے بجائے خود بولا۔

”لیکن اس تاریخ میں تاریخ تو کہیں بھی درج نہیں کی گئی، بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے شادی گئی ہے،“ سلوٹ تار کو غور

”ہاں واقعی، یہ تم عطیک ہی کہہ رہی ہو۔ مگر۔۔۔ اس مجھے کو تم سے ہی ایسا مذاق کرنے کی آخ کیا سوچی؟ جب بھی آتا ہے کوئی نیا چنگل چھوڑ کر جاتا ہے اب کل رات تمہارے پیچھے پڑ رہا تھا کہ تم سرورس کرنے کا خیال ترک کر دو۔ بھلا یہ بھی کوئی معقولہ ہے اور اسے کیا حق پہنچتا ہے کسی کی ذاتیات میں دخل دینے کا؟ اور جواب میں وہ بھلا کیا کہتی۔ اور انہیں کیسے بتائی کہ وہ کس برے پراپن حق جتنا ناچا رہا ہے۔

یاس کے کانوں میں ایک ایسی فتنہ خیز بات چھونک کر گلی ہے کہ اس کے دل کی دنیا اٹھل پھٹل ہو کر رہ گئی ہے۔ ”خیر اگر یہ اس کا مذاق بھی ہے تو بیٹھی! تم اس کی باتوں کا بڑا اندازہ مانتا؟ سطلے بیگم بھی اسے خاموش دیکھ کر اس کے سوا کچھ اور کہہ بھی نہیں سکیں۔

”منہیں برا ماننے کی بات نہیں اماں جان البتہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی میری ذاتیات میں دخل دے۔“ وہ قدرے ناگوار محسوس کر رہی تھی۔

”اے تمہیں ہی کیا یہ بات تو کسی کو بھی پسند نہیں ہوتی کیونکہ سب اپنی اپنی مرضی کے مختار ہوتے ہیں مجھے تو اس بات پر یقین ہے کہ تم سے ایسے مذاق کیوں کرتا ہے جبکہ سب کو تمہیں نہیں لگا تاہم سطلے بیگم کسی خیال کے تحت لڑیں ان کے پیچھے میں طنز یا معنی خیزی نہیں سمجھتی اس کے باوجود بھی سطلے بیگم چٹائی گئی۔

”مو۔۔۔ مجھے خود نہیں معلوم اماں جان۔ لیکن جہاں تک یہ خیال ہے اس کی وجہ۔۔۔ شاید یہی ہے کہ اس روز اپنے کالمشٹ اپنا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ان پر گر پڑا تھا ان کا خیال سٹراب ہو گیا تھا؟ وہ سوچ سوچ کر بولی۔

”مگر وہ تو معنی اتفاق تھا کہ سنا ہے تمہارا پیر پرٹ گیا تھا سرور بھی سے۔ کوئی تم نے جان بوجھ کر تو اس کے کپڑوں کو اٹھنے میں نہیں لیتا ہے۔ اسے ہاں جتنے منہ اتنی باتیں لگے اصل بات تو ان کے خدو کا کیا تھا؟ سطلے بیگم بڑی چالاکی سے کام لے کر بولیں ”وہ تنہا نکل کر بولی۔

”وہ۔۔۔ وہ دراصل یہ تیزی سے زینہ چڑھتے ایک دم ہی سلفے آگئے تھے۔ اور میں دونوں ہاتھوں میں ہلشت تھامے بیٹھے آؤ رہی تھی۔ انہیں راستہ دینے کے لیے جلدی سے ایک طرف ہٹی تو بے دھیانی میں میرا پیر پرٹ گیا اور میں لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر آگری۔“ اس نے گول مول سے انداز میں بتایا۔

”ہاں یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ وہ تو معنی ایک اتفاق تھا کوئی تمہ نے جان بوجھ کر تو اس پر اٹھنا نہیں گرایا تھا۔ جو یہ ختم سے چن چن کر بدلے لے رہا ہے اور وہ ایسی خصلت کا ہے بھی نہیں۔ میرے خیال میں تو ازراہ ہمدردی اور مروت تم سے ہنس بول لیتا ہے کہ ایک تو تم جہاں ہو دوسرے تم سے بہت نزدیکی مند صیاد بھی تو ہوتا ہے نا؟ سطلے بیگم نے اظہار خیال کے طور پر کہا تو جواب میں خاموش ہی رہی۔

”ہاں یقیناً یہی بات ہوگی ورنہ اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے اور یہ خفا ابھی ابھی آہستہ آہستہ۔۔۔ جو تم سے کچھ کہہ رہا تھا اس کا بھی کچھ خیال نہ کرنا۔ میں موقع دیکھ کر خود اسے سمجھا دوں گی کہ تم سے مذاق نہیں کیا کرے۔ دلے جہاں تک میرا خیال ہے اس نے تم سے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی ہوگی جو تمہاری دل آزاری کا سبب بنی ہو کیوں میرا خیال کچھ غلط تو نہیں؟“ سطلے بیگم دیر سے دل میں کشمکش کی بات کو آخر زبان پر لے ہی آئیں لہجہ جتنا نے والا نہ ہی مگر سمجھنا تو معنی خیز ضرور تھا جو ان آخری دو فقروں میں سمٹ آیا تھا۔

ان جیسے اقبال پر دم کمرانے کے لیے کسی سخت ترین کراس ایجنٹ اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہوگئی۔

اسے بول لگا جیسے انہوں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

جبکہ دُور درنگ اس کی کوئی خطا تھی نہ غلطی۔

بجائے کہ وہ کچھ اتنی سراسیمہ ہوگئی کہ سرورس کے موسم میں بھی اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔ حتیٰ کہ سرورس ہاتھوں میں بھی کی کا احساس ہونے لگا۔

اب جواب میں ان سے کیا کہے۔؟

کیا اصل بات انہیں بتا دے؟

یا پھر آئینہ فی صفائی سے جھوٹ بول کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دے۔ لیکن زندگی میں معنی مقام ایسے ہی آتے ہیں جھوٹ جو بڑی آسانی سے بولا جاسکتا ہے یا پھر انسان بولنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ بھی بولا نہیں جاسکتا۔ جبکہ سچ جو کہ ایک

عظیم وصف ہوتا ہے۔ آسانی سے بولا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ اس کے بولنے میں بہت اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔
مصلحتوں کو پس پشت ڈالنا اور مردت اور روماداری کو بالائے طاق رکھ دینا لازمی ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر سچ بولا جاسکتا ہے۔

گو اس پر کسی کا زور تھا۔

نہ دھونس۔ نہ خوف ہی غالب تھا۔

اور نہ کوئی مصلحت ہی درپیش تھی۔

رواداری اور مردت کا بھی کوئی پاس نہ تھا۔

البتہ بہت اور حوصلے کا فقدان ضرور تھا اس لیے وہ سچ بھی نہیں بولی سکتی تھی سوال کرنے کے بعد جواب دینے کا درمیانی وقفہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور مزید تاخیر اس کے حق میں کوئی اچھی بات نہ تھی لہذا اسے بحالت مجبور ہی جھوٹ کا سہارا لی لیتا پڑا۔

اماں جان۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ بالکل بے ٹکئی سی بات تھی جس پر دھونس کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں بڑے غصے تو وقت کے بعد اس نے انصر دے کر کہا تو سنے بیگم نے عورتوں کا چپک کر پوچھا۔

”ا۔ چھا ایسا کیا تھا اس نے؟ وہ حد درجے جھٹس دکھائی دے رہی تھیں۔

”یہی کہ اب تمہارے بھائی جان آگے ہیں تو تم ان کی دھونس میں آکر کہیں مروس نہ کر دیتے۔ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ اس نے غصی چھپی آواز میں بتایا۔

”اسے واہ کیا دیوانہ ہو گیا ہے وہ یا تمہارا والی وارث ہے جو بولوں دھونس جمار ہے۔ پھر وہ اب کے آئینے وہ اسے پھر دکھا میں اس کی کسی خبر لیتی ہوں۔ سنے بیگم کے دل سے اس کے جواب پر ایک بوجھ سا پاشا تو وہ اسفند کو بڑا بھلا کہتی ہوئی بولی۔

”جہیں اماں جان! خدا ان سے کچھ نہ کہے۔ ورنہ وہ مجھے چغلی اور معلوم کن کن القابات سے گوازیں گے۔ دیکھیں ناہیں یہاں ساری زندگی گزارنے کی غرض سے تو نہیں آئی۔ صرف ایک دعوہ کی بات اور ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ میں یہاں بالکل ہی بے وقعت ہو کر رہ جاؤں۔ اس کے لیے میں کرب بھی تھا اور التجا بھی۔ سنے بیگم بھی کسی حد تک اس کے دکھ سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے بھی دھکی پھر کر کہا۔

”اتھا اچھا بیٹی تم اطمینان رکھو میں اس سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میرا تو پہلے ہی یہ تمہاری بیماری پر صورت دیکھ کر دل کٹتا ہے یہ قدرت کے کھیل بھی کیسے نیکارے ہوتے ہیں کسی کو صورت سیرت اور تمام تر خوبیوں سے نوازی ہی ہے تو بہت سی نعمتوں سے خروم کر کے رکھ دیتی ہے۔ کاش اس نے تمہاری قسمت اچھی بنائی ہوئی تو آج تم شہزادیوں کی طرح راج کر رہی ہوتیں۔ اور جواب میں اس نے ایک سرد آہ بھری۔

جانے کیوں انھوں میں مریضی سی لگ رہی تھی۔

اور دل بھرا چلا آ رہا تھا۔

”مجھے ہونے کو کہ ایسا ظاہر کرتی ہیں جیسے میں ان کی ماس نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہوں وہ بھی ظالم اور جلا وطن کی جبکہ طرز ہے کہ میں نے ہی ان کی شادی شعیب سے کرائی تھی۔ کیونکہ ان کی ماں میرے بڑے اچھے واقف کاروں میں سے تھیں اور خدا گواہ ہے کہ آج تک میں نے خوراک نہ کھوئی سوتیلی ماں نہیں کھیا غیر میرے تھے کو خدا بھاری عرصے تک کسی سے کوئی لگا نہیں۔ اب مجھے ہونے تو ناخوہ کے منتقل تھے کہ تو جتنا مناسب نہیں لگا کیا ناخوہ واقعی میاں کے ساتھ ورنہ تو پر گئی ہوں یا نازوں کی شادی میں شریک نہ کرنے کا کوئی عذر تراشا گیا ہے۔ کیونکہ ملازمت چھوڑنے کا عاقب کو عرصہ ہوا۔ اور کاروبار بھی سنا ہے کہ بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا ان کا۔ پھر کیا کاروں کا خزانہ ہاتھ لگا گیا تھا تو نہیں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ دنیا کا دورہ کرنے کے لیے چل دیے سنے بیگم نے بڑی خوشحورتی اور ترکیب سے فاخرہ اور عاقب کے معاملات کو کر دیا تو وہ راستہ سے بولی۔

”آپ نے جو سنا تھا ٹھیک ہی سنا تھا۔ مگر آج کل تاروں کا خزانہ نہیں کاجاؤ کاروبار کا بازار گرم سماں جان اور ا۔ اور ا۔ بھائی جان بے چارے ایک معاملے میں بری طرح چھٹس گئے تھے اسے اتنا درد نہ تھا کہ مجبور ہی انہیں ترک وطن کر کے بھائی جان کے ساتھ کسی بیرون ملک میں پناہ لیتی پڑی اور میری عزت و جان خود خطے میں بھی اس لیے بھٹی جانے لگی تھی یہاں بھیج دیا۔ آپ ہی بتائیے میں ان لوگوں پر جو بھرت کر تو نہیں رہ سکتی۔ ظاہر ہے مروس ہی کروں گی۔ بھائی جان نے بھی مجھے مروس کرنے کی اجازت دے دی

تھی۔ مگر مروس کیے بغیر میرا گزارہ کیسے کہیں ہو سکے گا۔ مروس مل گئی تو پھر میں کسی بورڈنگ یا ہوٹل میں مل جاؤں گی۔ لیکن یہاں نہ کسی قیمت پر گزارا کروں گی۔ کیونکہ ان لوگوں کا رویہ بہت مغایر ہے۔ زینت جہاں بھی شروع دن سے ہی خوش تھی یہاں اور نفرتی نگاہوں میں میرے لیے حقارت ہوتی ہے۔ اماں جان آپ ہی بتائیے میں یہاں سے نہ جاؤں تو پھر کیا کروں۔؟

اور پھر وہ سنے بیگم کی گود میں سر رکھ کر جھوٹ جھوٹ کر رونے لگی۔ سنے بیگم کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے ان کے دل میں ایک حسرت بھری خواہش ابھری۔ اسے کاش میرا پنا کوئی ٹھکانہ ہوتا تو میں اس اتنی بیماری۔ دھکی ہمدرد اور درد مند لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔ مگر شوہر کے انتقال کے بعد تو وہ خود بھی بے ٹھکانے ہو گئی تھیں۔ ایک آسرا تھا تو خدا کا یا پھر اسفند کا۔ اسفند کا سہارا بھی بہت بودا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چپ چاپ آنسو بہاتی اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھرتی رہیں۔ پھر اسے دلا سادہ بھٹی بولیں۔

”مجھے تو تمہارے خیالات سن کر مڑی خوشی ہوئی ہے۔ جی۔ کہ تم بہت غیر راہ خود دار ہو۔ کسی کی دست نگرین کر رہنا پسند نہیں کرتی۔ تمہارا یہ جذبہ قابل ستائش ہے مگر سب سے پہلے خود کو کس کا محتاج بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ خدا خوش ہو کر اسے خود ہی سرفراز کر دیتا ہے۔ کیا کروں بڑی مجبور ہوں ورنہ میرا پنا کوئی مشایخ کا نا ہوتا تو تم کو بھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیتی۔ چلو اٹھا پنا دل بھالو۔ اور جا کر عورتوں کا پانی پی لو۔ طبیعت بھی سبیل جانے گی اور دل بھی ٹھہر جائے گا۔ مگر اس نے ان کی گور سے سراٹھایا تو آنسو پونچھنے کے باوجود آنکھوں کے مسافر چھلکتے ہی رہے۔

”دیکھو بیٹی! یہ دو آدمی بنا زولوں اور کمر دروں کا کلام ہوتا ہے جب کہ تم خاصی دلیری سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہو۔ اگر کسی طرح حالات کے سامنے ڈٹی رہیں تو انشاء اللہ اس پانی کا ہر قطرہ چھول بن جائے گا جو تمہاری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ یاد رکھنا میری بات اگر میں زندہ رہی تو خود تم سے پوچھ لوں گی اور اگر گئی تو تمہاری یادداشت کے کسی کوئے میں تو پڑی ہی رہے گی پھر تم اسے کونج کر لگال لینا کہ حالات کے سامنے سینہ سپر ہو کر ڈٹے رہنے والے ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یہ ہریشانیان اور مصیبتیں تو ہر انسان کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔ جنہیں خوشیوں کی طرح وہ ان کو بھی اپنے آپ سے گنا رہتا ہے۔ اری بیٹی! یہ زندگی تو دوسرے چھاؤں کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا تاریک پہلو سنے بیگم نے گایا تو اندھیرا ہی اندھیرا اور روشنی پہلو سنے بیگم نے گایا تو اجالا ہی اجالا۔ کبھی ایک ہی کیفیت تو نہیں رہتی اس کی۔ خدا نے اس میں بھی اپنے بندوں کے لیے ایک حکمت لکھی ہے۔ چلو غائب ہوا۔ اب روک لو۔ آنسو اور آنسو کر مرنے دعو آؤ۔“

انہوں نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پکارے ہوئے اسے سمجھا تو وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر غسل خانے کا رخ کرنے لگی تو موٹی اور گلو گیارہ واڑ میں اس نے سنے بیگم سے کہا۔

”اماں جان۔ ماں سمجھتے ہوئے میں نے آپ کو بھائی جان کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ خدا آپ اس بات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیکھئے گا۔“

اور سنے بیگم جن کا دل اس سے اور بھی بہت کچھ پوچھنے کے لیے چل رہا تھا۔ انہوں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں میرا سینہ تو ایک گہرے کنوئیں کے مانند ہے جس میں جھانک کر دیکھنے پر بھی کسی کو یہ نظر نہیں آسکتا ہے کہ بہت گہرائی میں چھپتے پانی کی سطح پر کچھ تر بھی رہا ہے۔ تم میری طرف سے تو بالکل اطمینان ہی رکھو۔“

اور تب وہ اپنے آنسو پونچھتی غسل خانے میں ٹھس گئی۔

دل کے چارے کھانے کا عمل تھا۔

دوسرے کی آب و تاب ابھی ماندا نہیں پڑی تھی۔

”گاہ بگاہ سناؤں کی زد میں تنہا کسب اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے نیلیا بندھواڑے کو نور سے بھائی ہوئی اندھا گئی۔“

”جی۔ جی۔“ بھانگ کر آفس کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ زینت جو تھیں بند کی اپنے بند پر لیٹی تھیں اس کے عجی عجی بخت پر ہرگز گزرتے نہیں۔

”کہوں تو کہ جیسے کہا ہوا؟“ انھوں نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

”جی! وہ ایسا اولاد بھائی آئے ہیں۔ نیلیا نے مروس سے انداز میں بتایا۔

”ہیں میری ناز و آؤی ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“ انھوں نے آگے سرک کر جوتی میں پیروٹ لٹے ہوئے بے یقینی کے ساتھ انداز

میں بوجھا۔ اور پھر بولیں۔
 "ابھی کل شام کو ہی تو میں نے سرن سے فون برسات کی تھی۔ انھوں نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ پھر یہ دونوں کیسے آگئے؟
 آٹھ گھنٹہ کا ریزک کر رہی تھی۔
 "اب یہ تو بتانا نہیں مگر وہ دونوں آگئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں کارے آگئے دیکھے ہیں۔ تو آپ کو فزوا
 اطلاع دینے چاہیے؟ یہ بتانا باہر جانے کی جگہ ہے۔
 "تجربہ ہے۔ زینت آئیے کے سامنے کھڑی ہو کر بیٹھے۔ اپنے بال سنوارتی ہوئی بولیں۔ ان کے لیے اب بھی بے لگنی سی
 عیاں تھی۔ لیکن نیلا انھیں وہیں چھوڑ کر جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ زینت بھی جلدی سے کچھ ڈرائنگ گیلری پر ڈال کر باہر نکلے۔
 ان کے باہر آنے ہی ناز پر دروازہ اپنے منہ کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی۔ ان پر نظر پڑے ہی جھجک کر ان سے بہت لڑکچڑ
 اس کا شو بھرے کچھ ہی رہ گیا تھا۔
 ماں نے بیٹی کو خوب بھیجی سیخ کنگے سے لنگے کے بعد عمدہ ہو کر پھر پڑنے والوں سے بچی کا جائزہ لیا۔
 وہ شاندار لنگ بنگ لکی بنگ لکی کے کام کی سازشی اور نفیس سے جڑاؤ سیٹ ہیں۔ یہی قابل رشک صحت کے ساتھ بڑی بھری بھری
 لگ رہی تھی۔
 "ماشاء اللہ جیٹم بھلا۔ انھوں نے انھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلا میں لے کر کہا۔ اور پھر واما کی طرف منہ کر گئیں۔ جوں
 آشنا میں ان کے نزدیک آگیا تھا۔
 اس نے جھجک کر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اس کی پیشانی پر جوڑ کر اسے بہترین دعاؤں سے نوازا اور پھر بیٹی سے مخاطب ہو کر بولیں۔
 "برا بھائی! کیسے آگئیں جیکل شام تک تو کھانے آئے کا وہ دور تک گمان نہ تھا۔
 "اصل میں ہم کل رات کی فلاٹ سے یہاں پہنچے تھے۔" ناز نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
 "اچھا کل رات کی تو ہوئی ہو اور مجھے بتانا تاکہ نہیں۔ زینت کے پیچھے میں پیچھے سے زیادہ گھر سناٹا مل تھا۔
 "وہ اصل میں بی بی آپ کو سہو پڑنے پر چاہ رہی تھیں۔ ورنہ میں نے تو آپ کو فون کرنا چاہا مگر انھوں نے
 منہ کر دیا۔ ناز کے بھائی احمد روٹوں نے وضاحت کی۔ مگر زینت کو یہ سہو پڑنے والی بات بھی نہ لگی۔ کہنا تو یہی چاہ رہی تھیں
 کہ کل رات کو نہ ہی صبح کو ہی مجھے مطلع کر دیا ہوتا۔ صبح کو ہی آج میں مگر واما کی موجودگی کے پیش نظر انھوں نے موضوع چھپتے ہوئے
 بیٹی سے پوچھا۔
 "اچھا بیٹی! بتاؤ گھر کا رٹ پ کیسا رہا؟ انھوں نے خوب کیا ہوگا تم دونوں نے؟ تو ناز شوہر پر ایک شوخ سی نظر ڈال کر بولی۔
 "او۔ جی ایسا دلیرا۔ اتنا زبردست کہ تین ماہ کا عمرہ بول کر گریا جیسے گل ہی کی بات ہو۔" ناز پر ایک سرشاری کا عالم طاری
 تھا۔ خوشی سے وہ کھلی پڑ رہی تھی۔
 "جی ہاں جی ہمارا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا وہاں آئے کو مگر احمد روٹوں نے مسکراتے ہوئے بات اور حوری چھوڑ دی۔
 "ہاں بیٹی! یہ وقت باوجود زندگی کی تمام زمرقوں اور لطافتوں سے ہنگامہ ہونے کا ہی ہوتا ہے۔ خدامت دونوں کو پیشتر ہی طرح
 خوش و خرم اور شاد دوا دیا۔ ماشاء اللہ کھاری صحت کی قابل رشک حوری ہے۔ آؤ جیٹو لوگ روم میں چل کر بیٹھیں۔ زینت
 نے واما کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر بیٹی اور واما کے ساتھ لوگ روم میں چل کر بیٹھیں۔
 "اصل میں ہم مشرقی لوگوں کے یہاں ہی مون وغیرہ بنانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ تو خیر ایک ایک رات ہے جسے ہم نے اپنے
 (اپنا) کر لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ رات بھی اتنا خوب تھا۔ آج نہیں جگہ اس میں فائدہ کی فائدہ ہے۔ یعنی زواہی زندگی کے لذتی
 دور کی خوشیاں لوٹنے کے ساتھ ساتھ صرف نے شادی شدہ جوڑے کا تمام وقت سیاحت اور تفریح ہی میں نہیں گزرتا۔ بلکہ اپنے
 خاندان والوں یا اپنے گروہ میں رہنے والوں سے علیحدہ ہو کر انھیں اس غریبے میں ایک دوسرے کی عادات و مزاج کی کفایت اور
 پسند ناپسند یا پھر ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اور اس عمر میں وہ ایک طرح آپس کی ناموافقیت سے کھجوتہ
 بھی کر سکتے ہیں۔ کہ بیوی کے اندر لڑکائی خانی یا کزوری ہے یا پھر خلاف مزاج کوئی عادت ہو تو شوہر اس سے مطابقت رکھنے کا بہتہ
 کر لیتا ہے۔ اور شوہر میں کوئی خانی یا خرابی ہو تو بیوی اپنے خیالات اور مزاج کو اس کے مطابق ڈھال کر اس سے نباہ کر سکتی ہے۔
 یعنی ہے۔ انھوں نے بیٹی اور واما کے ساتھ لوگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ نے باقاعدہ بی بی مون کے فارمولے پر عمل کر چکا ہے بہت ہی ڈیڑھ سبب معلومات رکھتی ہیں۔ احمد روٹوں
 نے ناز کے کان کے قریب ہنر کر کے آہستہ سے کہا۔
 "ہاں تو جی کا تجربہ ہی نہیں مشاہدہ بھی بہت کر لیا ہے۔" ناز پر دروازہ میں قدم سے فخرے بولی۔
 لوگ روم۔ گیلری میں ایک بیٹھک ہوئی ہے۔ باوجود سرے منوں میں افراد غازی نشست گاہ۔ اور یہ لوگ روم بہت آرام
 تھا۔ پورے فرش پر ڈیڑھ اونٹن کا قیلین سے ڈھکا ہوا تھا۔
 واما بائیں مقابل کی دیواروں کے آگے چھوڑے چھکے دیوان رکھتے تھے جن پر کچھ خوشنما خانچوں پر لگا دیئے گئے تھے اور مانے کی
 دیوار کے آگے صوفے رکھے تھے۔ قایلین اور فرخچر کی مناسبت سے دروازے اور کمرے کے پردے پر بڑے بڑے ہتھکڑے تھے۔ انھیں دو دن
 میں اندر بی بی جی جونی پینوں لوگ روم میں آکر بیٹھے وہ بھی اگر ناز سے بہت کڑی تھی۔
 زینت نے نشست گاہ میں بیٹھنے کی ملازم کو بلا کر جانے کے متعلق ہدایات دیں۔
 "ہاں ایسا اور سائے کہاں کہاں گئیں اور کہاں کہاں دیکھا؟ یہ بتانے پر منظور ہیں سے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔
 "ارے بس کیا بتاؤں۔ بس یہ کہو کہ آدھا لوپ کھوے جس جی کر لندن جی ہوائے۔ مگر باوجود خیم سوئر لینڈ میں ہی رہا لیکن
 سے سوئر لینڈ میں بہت کچھ کا ایک شہر ہی معلوم ہوتا ہے۔ حقیقی قدرت کی ہی انھیں بلکہ آسانی یا انھوں نے سنواری ہوئی ایک ایسی
 وافر جگہ جس کی لطیفی رو سے پورے بی بی میں نہیں مل سکتی۔ پھر وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔
 "بس جی اچھے تو لڑکی آئے کے خیال سے وحشت ہونے لگی تھی۔ بجلیا یہ بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے ایک دم بوس اور
 پوری کوئی تاحہ نہ ڈھنکے نہ وہ آسانیاں اور رغات جو پورے والوں کو میسر ہیں۔ میں نے تو امداد سے کہہ دیا ہے اگر گھر بواؤں کی
 تو سوئر لینڈ میں وہ دیکھ کر یہاں اس پھر اور پس ماندہ سے ملک میں تو ہیں کبھی نہیں رہیں گی۔
 "ہاں یوں تو میں خود بھی پاکستان میں رہنے کا شروع سے ہی قائل نہیں ہوں۔ لیکن جی گھر گھولے اور نرلس تو سارا نہیں
 ہے۔ گھر ہاری کپڑی کی ایک پرانے لندن اور ایک جاپان میں بھی قائم ہے لیکن کوئی درجہ سے لندن انھیں پسند نہیں آیا اور لندن
 باکرہ کچھ مشکل نہ ہوتا۔ احمد روٹوں نے ساس سے مخاطب ہو کر کہا۔
 "اؤہ لندن کہا سوئر لینڈ کے مقابلے میں تو مجھے پھر بس پسند نہیں آیا کہ بونکو دونوں ہی شہر بہت گنجان اور نیک مزاج ہیں۔
 جگر لڑی سا دلالت اور چیرل ہوئی پر تو بی بی جان جانی ہے اگر ہاؤس کی تو سوئر لینڈ میں جی ہاؤس کی جگہ اصحاب آنا نہ ہو رہے
 ناز سے بولی۔
 "ایسا کیوں نہ کریں دوہلا بھائی کو سوئر لینڈ میں بھی ابھی کپڑی کی ایک پرانے مھول میں اور پھر انکل سے کہہ کر ہاں کا چارج
 لے لیں۔ یہ بتانے پر اپنی دانست میں نہایت مناسب مشورہ دیا۔
 "ہوں مشورہ تو بہت نیک ہے جو بیباکیم آپ کا۔ لیکن بی بی آپ مجھے دوہلا بھائی نہ کہا کریں۔ مجھے یہ دوہلا بھائی کا لفظ بہت
 اور سنا ہے۔
 لیکن یہ مانے اس کی پوری بات نہ سنی اور گڑھ کر بولی۔
 "وہ میں آپ کو جیسا کہہ رہے لگ رہی ہوں آئی تو امرانگ اور بھلی دھت مند ہوں۔
 "ہوئی لیکن مجھے تو غم بالکل ایک جیو بی سی جو بیباک لفظ ہی ہوا۔ امداد نے مسکرا کر کہا۔
 "پھر تو آپ کی آنکھوں میں لیفتا کوئی خرابی ہوگی بہت سی ہے کہ فوراً اپنی بیباک ٹیک کر لیں۔" امداد مسکراتے ہوئے کچھ
 زیادہ ہی بڑھ کر بولی۔
 "ابیں بائیں بیباک یا سید بدترینی ہے۔ یہ تم کیا باک رہی ہو؟ زینت نے واما کے نازک رشتے کے خیال سے فوراً ہی اسے
 جھڑک دیا۔
 "ارے نہیں جی! یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے آپ انھیں نہ ڈانتے۔ احمد میں کر لوانا نہ ہو رہا ہوش میں مگرانی رہی۔
 "ہاں تو لڑکا مشورہ دے رہی تھیں جو بیباکیم آپ۔ امداد نے بیباک کو مخاطب کر کے پوچھا۔ جو ماں کے گھر کے بہن بھائی کے ساتھ تھی۔
 "وہیں پھر روم جی جو بیباک لفظ تو آپ نے ڈانت دیا لیکن ان کو نہیں ڈانت سکتیں آپ جی؟ یہ بیباک لفظ ہی۔
 "ارے تو تم اپنی آؤت کیوں ہوں ہی ہو۔ یہ تو تم سے ملانی کر رہے ہیں۔ آخر بڑے بھائی ہیں تمہارے۔ زینت نے ہنسنے ہوئے

اُسے بھی کیا۔

”جی ہاں ہرے۔ اگر ہنسوتی بھی ہیں تو انسٹ ہی کرے ہیں میری کیونکہ میں شکل سے بھی جو بہا نہیں لگتی۔“

”او۔ نو انسٹ کیسی ہیں تو نہیں رہتا نا جا رہا ہوں کہ جب تک تم مجھے دولہا نہیں کہہ کر دیکھا روٹی میں نہیں چوسا ہوں کہ کیونکہ دولہا بھائی کہنے سے مجھے سخت چڑھے۔“ احمد نے دیکھا کہ سالی اس کے مذاق پر بخیرہ ہو گئی ہے تو فوراً ہی اس نے بات تبدیل کی۔

”اچھا تو پھر کیا کہہ کر دیکھا روٹی آپ کو یہ پہلے کئے سے انداز میں بولی۔

”بھئی۔ سیدھی طرح احمد بھائی ہی کہہ رہا کرو۔“ احمد بولا۔

”اچھا چلوں احمد بھائی ہی کہی۔“ نیلمہ نے زچ ہونے کے انداز میں کہا۔

”ہاں بھتیگ ہے بے بی نیلمہ بس تم مجھے احمد بھائی ہی کہہ کر دو۔“ احمد نے مسکرا کر کہا۔ انداز میں چہرہ کا ساٹھا نیلمہ اس کے بے بی کچھ پر جھڑپ کرنا کہ طرف دیکھا تو وہ اپنی مسکراہٹ و ہار کو بولیں۔

”چیز بے بی ہی کہی، لیکن ملنے بڑی مناسب دی ہے انھوں نے نہیں۔“

”جی ہاں جی ہاں اس بات کا اعتراف تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔“ احمد خوش دلی سے بولا۔

”اچھا صرف اعتراف ہی کیجئے ہیں باطل کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں یہ نازو نے پوچھا۔

”ہاں مل۔ عمل تو بعد کی چیز ہے۔ پہلے تو اس مسئلے پر کچھ غور کرنا پڑے گا۔ پھر کچھ عرصہ ارادہ کرنے میں گزارے گا اس کے بعد میں جا کر عمل درآمد کرنے کا مرحلہ آئے گا۔“ احمد نے کیونکر بات کو مذاق میں اُٹا نا چاہا۔

”پھر تو آپا پوچھنا کہ میں مکان بنوا کر دے گا خیال ہی نہ کر رہی ہیں۔ نیلمہ ہنسوتی کی بات سن کر بولی۔

”واہ کیسے ترک کر دوں۔“ نہیں معلوم ہی ہے کہ میں ایک برجس بات کا قصد کر رہی ہوں اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔ نازو چہک کر بولی تو احمد موش کے چہرے کا تاثر غوراً سادل گیا تاہی دیکھ کر زہنت نے صحت کوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھتیگ ہے اس کا قصد بھی تم بعد میں کر لینا۔ اچھی تو نہیں یہاں آئے ایک دن ہی ہوا ہے۔ اور ایک دن میں ہر سارا مرحلہ طے نہیں ہو سکتے نا۔“

”نہیں می۔ سوال ایک دن یا ایک سال کا نہیں ہے۔ اصل سبب تو میری مجبوری ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور دوسرے معنوں میں ہر اک دست راست ہوں میرے سوا ان کا ہاتھ نہ ملنے والا ہی تو کوئی نہیں ہے۔“ نازو کا انتقال تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ ایک چھوٹے چچا ہی نے بچے کو سو دھندلن کا آفس سنبھالے بیٹھے ہیں۔ وہ بھی شخص کرشماتی ہے کہ دس گیارہ سال سے وہ بیٹھ رہے۔ وہیں انھوں نے شادی بھی کر لی تھی۔ اب یہاں سے ان پر بہت زور ڈالا تو انھوں نے ہر پرانہ احسا کرتے ہوئے آفس کا چارج سنبھال لیا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں میرا نہیں اور جا کر رہنا ممکن ہے۔“ احمد موش نے اپنی مجبوری بیان کی تو زہنت قائل سی ہو کر بولیں۔

”ہاں بیٹے آپ تم بھتیگ کہہ رہے ہو ہر ایک کی اپنی کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہوتی ہے۔ اور میرا خواہ دل چاہے یا نہ چاہے جہاں سے روزی ملتی ہے وہیں انسان کو رہنا ہی پڑتا ہے۔ تم تو ابسار کر رہیں کر رہی ہیں ہی کوئی تنگ نہ کر دو۔“

”بیٹے بھلا یہاں کر رہی ہیں تنگ نہ کرنے کی کوئی ٹھک ہے می۔ اور میری تو اس علاقے میں تو بغیر میں تو تمام دنیا پریش دئے دو لیٹے رہتے ہیں۔ اور کھٹن ایرہا میں ہی تقریباً ایسے لوگوں کی آبادی ہے۔ اب اے دے کے کس ڈی اے ایرہا ہی رہ جاتا ہے تو وہ تو اس قدر خستہ و دغمان ہے۔ ہو کر رہ گیا ہے کہ وہاں کوئی تنگ نہ کر رہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ شہر کے کچھ کئے سے پہلے نازو بہت بڑا کر بولی۔

”لیکن میرے خیال میں تو میرے سے کہیں تنگ نہ کر رہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نا چاہے کیونکہ ہمارے کھٹن دے کے تنگ ہی کوئی ایسی برائی بھی نہیں ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہے می کہ کتنا دیر ہے۔ ایک تو ڈھائی ہزار گز پرنا ہوا ہے دوسرے پہاڑے آدھا حصہ ہمارے پہاڑے کے ہے۔ یہاں پر لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے شک ہے۔ اور میرے خیال میں ہمارے بے تو فی الحال ہی بہت کافی ہے۔“ احمد موش باتوں ہی باتوں میں دل کی بات کر گیا۔

”اصل میں می۔ احمد جو اسٹ فنی سسٹم کے حامی ہیں یا پھر انسانی استطاعت انہیں رکھے ہوں گے کہ بیوی کے لیے دوسرا بنگلہ بن کر اس میں رہ سکیں۔“

شہر کے حالات سن کر نازو نے توری بڑھاکر اس پر طنز کیا۔ تو زہنت اس کے طنز کو بیٹے کی کوشش میں جلدی سے بولیں۔

”نہیں خیر اگر استطاعت بھی ہے جس تو تنگ نہ رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے ہر مل کر رہنے کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کا قرینہ بھی تو سیکھنا ہے اور پھر ایک دم ہی تو اپنے گھر والوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتے نا۔“

”جی۔ جی۔ بس یہ بات تو ان کی کچھ نہیں آتی تھی۔ یوں ہی تو بھول آپ کے ہم مل ہی تو بہا لے بیٹھے ہیں۔ اتنے عرصہ کیسے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔“ ساس کی بات پر احمد موش خوش ہو کر بولا۔ نازو کو ماں کا اس کی حمایت میں ہونا ناگوار تو بہت گزرا لیکن اس نے غور کر بات کی تردید نہیں کی بلکہ یہ موضوع ہی ہٹ دیا۔

”ڈیڈی تو خیر سارے بارے تک ہی آتے ہیں باقی سب کہاں ہیں می؟“ اس نے ماں سے پوچھا۔

”نیلمہ فریڈی کے یہاں تھی ہوں جی آج اس کی سائگر ہے نا۔“

”واہ آج ہی جانا بھی رہ گیا تھا نیلمہ فریڈی۔“ نازو نے کہا۔

”تو انھیں یہ معلوم تھا کہ آج ہی آپ بھی آ جاؤ گی۔“ نیلمہ نے جواب میں جس برستگی سے کہا۔ احمد موش ہنسنے لگا۔

”اچھا۔ وہاں سے بھائی جان کہاں ہیں۔“ نازو نے ایک نیکی سی نظر پھر ڈال کر ماں سے پوچھا۔

”وہ اب جھل پاکستان کے دور افتادہ بلکہ پس ماندہ علاقوں کے دورے پر ہیں۔“ زہنت کے بچانے نیلمہ نے بتایا۔

”کیوں تو میرے بھلا وہاں کی ٹھکانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی انھیں۔“ نازو نے بچے کے انداز میں پوچھا۔

”تم تو معلوم ہی ہے کہ وہ بالکل الگ دماغ کے کریدہ ہوئے ہیں اس لیے کراچی میں اپنا ذاتی کلینک کھول کر پھر نہیں شروع کرنے کے بجائے ایسے علاقے میں ڈسپنری کھولنا چاہتے ہیں جہاں مٹی ہو نہیں سکتی۔ اب بھلا نا تو خفقان نہیں توادر کہا ہے۔“ پچھلی جی یہاں کے سب سے سرکاری اسپتال سے بیماری آ کر آئی تھی لیکن بابائے اپنے خدمت مکن کے جذبے میں اسے ہی تھکوا دیا۔ زہنت یوں بولیں جیسے بیٹی کی جنوی ترکوں سے سخت نالاں ہوں۔

”لیکن می۔ اسفند بھائی کا یہ جذبہ تو بہت قابل ستائش ہے۔ ورنہ آجکل تو ڈاکٹر ز اور جرنل کا یہ عالم ہے کہ پہلے تو اپنی تعلیم پورے صرف ہونے والی رقم کو حاصل کرنے کی غرض سے مریضوں کو دواؤں یا ہتھوں سے کوٹتے ہیں پھر اس کے بعد جب پوری رقم حاصل ہو جاتی ہے تو پھر نیکر لڑائی زندگی بنانے کے لیے مریضوں کی جبین خالی کرتے رہتے ہیں۔ میں آپ سے شرط لگتا ہوں می کہ آج کے دور میں کوئی ایک ڈاکٹر بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبے سے نہ ہو کر کام کر رہا ہو۔“

”ہاں بیٹے اصل میں یہ بے ثباتی اور غرضی کا دور ہے ورنہ ڈاکٹر ز مریضوں سے جو بیماری بیماری لیس نہیں جھپٹاتے ہیں انھیں کم از کم اتنی کرشماتی توڑتی جیے کہ مریضوں کو مال اور غریب لوگوں کا مفت علاج کر دیا کریں۔ یوں ہی بیٹا انسان کی خدمت میں جس قدر لکھ دو جاتا ہے وہ اتنا ہی کماسکتا ہے۔ اس کے کم یا زیادہ نہیں۔“ زہنت بولیں۔

”اگر آپ کے یہی خیالات ہیں می تو پھر تو آپ کو اسفند بھائی کے بدلے کی قدر کرنی چاہیے بلکہ سراسر نا چاہیے۔“ احمد مسکرا کر بولا۔ تو زہنت کچھ گڑبڑ سی گئیں۔

”بھئی آپ بھائی جان کو اسفند بھائی کیوں کہتے ہیں احمد۔ جبکہ وہ میرے بھائی ہیں۔“ نازو ہر دسے ماں کو بغلیں جھانکنے دیکھا تو فوراً ہی بات بدلی۔

”بیٹھو وہ آپ سے ضرور بڑے ہیں مگر مجھ سے تو عمر میں پوسے دو برس چھوٹے ہیں۔“ احمد موش بدستور مسکراتا رہا اور نازو جواب میں کچھ کہنے کی دلی تھی کہ زہنت بولیں۔

”چلو اگر یہ بابا کو اسفند بھائی کہتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے خود بابا بھی تو انھیں احمد بھائی کہہ کر دیکھ رہے ہیں۔ اور اب جی زہنت نے بات ختم ہی کی تھی کہ کریم نے اندر کر ان سے پوچھا۔

”بچہ صاب آجئے اور نا شہتہ تیار ہو کر اسے کھانے کی میز پر لگاؤں یا نہیں لے آؤں۔“ تو زہنت نے بیٹی اور امال سے لچھا۔

”کیوں بچوں تم جتنے نہیں بیٹھے کھانے کی میز پر بیٹھ کر۔“

”نہیں کوئی ہر زمانہ تو نہیں ہیں۔ بس یہیں منگایا بیٹھے می۔“ نازو بولی۔ کریم گھر کا پڑا نا ملازم تھا اور نازو کو دیکھ کر کوئی اس کی کچھ بکلی جا رہی تھیں۔

”بھتیگ تو ہو کر تم۔“ نازو کو بالآخر اس کا دل رکھنا ہی پڑا۔

”جی۔ جی ہرانی فی بی۔ میں تو خوب بھلا چکا ہوں۔“ وہ بے طرح خوش ہو کر بولا۔

85

پروا نہ کی۔ خود احمد بھی ماں بہنوں کے سامنے مجھے بھلا بیٹھے ہیں۔

”اصل میں تو دونوں اتنے دن بعد آئے تھے۔ اس لیے ماں بہنوں نے سامنے دونوں کی سرپوری کر دی ہوگی۔ آخر تو اکٹھا ہوا ہے ان کا۔“ دل میں اس بات پریشانیاں ہی ہونے کے باوجود کہ غلط لوگوں میں بیٹھیں گئی ہیں۔ زینت نے نظارہ مار خیال کے طور پر کہا۔

”اگر یہ بات سنی تو پھر ہمیں اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی دوسرے بندہ کے ہاتھوں میں سجا کر دینی انھوں کے سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ نازہ چمک کر بولی۔

”تجربہ ہے۔ میں ان لوگوں کو اس قدر گراؤ تو نہیں سمجھتی تھی۔“ زینت دل ہی دل میں افسوس ہو کر بولیں۔

”گرسے ہونے تو ہوں گے، اب اسٹارٹس دو دیتے، جو ہیں بائیں ہی کہا کرتیں بھی سخت اوجھی ہوتی ہیں ان کی جبکہ خود کو ظاہر تو نہیں کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی دولت مند ہی نہیں زمانے میں لیکن دوسروں کی دولت اور عزت دیکھ کر ہر سے شقی ہو جاتے ہیں ان کے۔“ فلاں کے پاس اتنی ساری کاٹاں ہیں۔ آنا زیادہ زبرد سے۔ فلاں نے آنا زبرد سے ڈر دیا تھا۔ ہزاروں جہان ہلانے سے وہ بھی شرمیں ہیں۔ اتنی واٹھیر نہیں۔ انھیں کھانا کھانے کی کٹھالی کی کے یہاں ہوں گی۔ فلاں لڑکی کو آنا بھاری چیز طلبہ اسے سے کر دی تھی اسرار و بھنگ لائی ہے اپنے سامنے۔ واما کو کچی مالامال کر دیا ہے لڑکی والوں نے۔ اس پر ہر بات میں ہم ہی ہم۔ گھر کا ماحول بھی کچھ عجیب ہی سا ہے۔ ایک تو بڑوں کا وہ بچہ بچوں کا لحاظ۔ اس پر ہوں گے جیسے سب ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔ خاص طور پر وہ احمد کی پھوپھی کی شادی پوری فاسٹر لوک (لڑاکا) ہے کہ ابوں میں ان کی ولایت اور پوری بہن اور بھائی یعنی سالی اور سامنے لڑکائی تک بیٹھے بول بھلا کر رہتی ہیں اور وہ ہمارے کمر صاحب تو بچے جیسے عرصے تک جلاوے کے عہدے پر فرائض رہے ہوں کہ ان کے آئے ہی سب لوگوں کو فلوں بھروں میں دیک جاتے ہیں جیسے سڑک سے خدا کی سنی غصے سے نکلے تو مار لیتے پھلے آ رہے ہوں۔ اور صدقہ ہے کہ ان کی بیوی بھی انھیں دیکھ کر کچھ ایسا میر نہیں دیتی ہیں جیسے قربانی کی بکری فصل کو دیکھ کر۔ اب تک بات ہو تو بڑا ڈنڈی ہے۔ نازہ کے کہنے کا جملہ اس انداز میں کہا ایسا تھا کہ زینت کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”ہنسنے کی بات نہیں می برہ مجھے تو اپنی قسمت پر رونا ہی آتا ہے۔ یوں بچتا ہے کہ جیسے خدا کو گنہگاروں میں۔“ پھنسی ہوں۔

ان بچڑوں میں بول کر کہا بناؤں۔ کھانے کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں ہر وقت چرنے ہی نظر آتے ہیں۔ اس پر ایک تو کھانا باچہ چڑھ کر کھانے میں بیٹھے وہ انہیں دیکھ کر جھگڑا۔ میں پہنچنے کی جلدی ہو اور سر پر خطرے کا سائرننگ دیا ہو۔ کھانے پر بڑوں کا انتظار کرنے کی زحمت بھی تو ارا نہیں کی جاتی بس کھانا سامنے آتا ہو۔ اتنی تو بین بھی نہیں ہوتی کہ کھانا ختم کر کے بڑوں کا انتظار ہی کر لیں۔ یا پھر میرے انھیں تو معذرت کر کے انھیں۔ اور خاص طور پر وہ ہمارے کمر صاحب کھانے کے بعد دو چھوڑ کر گھروں کی طرف کچھ اتنے زبردست طریقے سے ڈکا رہے ہیں کہ بے دھاری میں باس بیٹھا انسان دلی کر پھیل ہی پڑے۔ اس پر موصوف ایک روز اتنے بے لطف ہوئے کہ تہمند اور دیناں ہی میں سے سامنے چلے آئے وہ تو احمد جلدی سے انھیں ہارے تھے اور نہ ہیٹھ کے لیے فری ہو جاتے۔ بھلا آپ ہی بتائیے گی۔ ڈی ڈی۔ بھائی جان یا بھلے دادا اور بھائیوں کے کبھی تہمند باندا ہے یا اتنی فک شکاف ڈکا رہی ہے۔ اب اور آپس میں تو تھکا کر کے کبھی بات کہے۔ ان لوگوں نے تو بڑھ چیتے کے اند اندہ اپنی ساری اوقات دکھا دی ائمہ تو بتانا نہیں اور کیا دکھائیں گے۔ بات کے اختتام پر نازہ بڑوں کے رخسار پر ہنسی ہو کر بولی۔

”ہاں بیٹی۔ یہ لڑکی کی شادی کا معاملہ بھی واقعی ایک عجیبی ہوتا ہے۔ کہ با نسبت پرچہ توجہ، ہی حجت اور پرچہ چکر تو مات ہی مات۔ تیرم تو صرف اپنے شوہر سے واسطہ رکھو۔ سسرال والوں کو زیادہ مہر نہ دلاؤ۔ حالانکہ اصولاً تو مہر مال کو بھی نصیب کرتی ہے کہ وہ سسرال والوں سے واسطہ رکھو۔ سسرال والے کیسے ہیں۔ لیکن جب تمھاری سسرال والے تمھارے اسٹینڈ کے ہی نہیں ہیں تو میں اس کے سوا انھیں اور کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔“ زینت نے دل ہی دل میں آرزو ہو کر کہا۔

”اس سے بھی کچھ فرقی نہیں پڑے گا۔ سسرال والے کیسے ہو۔ ایک جگہ ایک ہی جھٹ کے نیچے رہ کر لڑکی اس سے کوئی واسطہ نہ بھی رکھوں گی تو بھی ان کا واسطہ تو مجھ سے چرنا ہی رہے گا۔ اکیلیے تو ہیں جاہلی ہوں کہ ان لوگوں سے الگ ہی ہو جاؤں۔“ نازہ بولی۔

”لیکن اتنے جلدی کیسے ممکن ہو سکتا ہے بیٹی۔“ آرزوہ اکی ماں کی گوہر ہواں چڑھا ہے اسی باب کے سامنے میں بدوش پاتا رہا ہے جس سے تمھاری طبیعت مل نہیں کھاتی۔ وہ ایک دم تو اپنے سے چاہے والوں کو چھوڑ کر عیدہ تو نہیں ہو سکتا۔ بس تم تو احمد کو اپنی گرفت میں رکھو۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگا دیا ہے وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ سو ساسی مود کی ہے اس لیے اچھی کنیس (علم مجلس) کے بھی واقع ہے۔“ زینت کھانے کے سے انداز میں بولیں۔

”جی ہاں می۔ واقعی ان سب میں احمد ہی اچھے ہیں۔ بلکہ بہت ہی اچھے ہیں۔ شکر ہے باپ پر نہیں گئے۔ بلکہ باپ کی صدی واقع ہوئے ہیں۔“ مگر پمیل (سادہ) بہت ہیں اور کچھ خاص ہاں میں ہیں ان میں۔ ایک تو چوکو کھانے کے معاملے میں۔ تو بہت ہی بے تکلف ہیں۔ بس ذرا سا اشارہ بھی کہ وہ تو فری کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ بس ہی عادت احمد کی ہے۔ آپ نے تو نہیں کیا احمد کی بے تکلفی کو کیسے مرنے سے اوجھ چڑیں چٹ کر گئے۔

”چیز چڑیں کھانے کے لیے ہی ہوتی ہیں اور وہ واقعی بہت سیدھا اور سادہ لوح ہے۔ اس نے جس اپنا نیت اور بے تکلفی کا

کا مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔“ زینت بولیں۔

”اب آپ تو واماد کی حیثیت سے انھیں کھانا خوش ہو رہی ہیں مگر ہر ایک کے ساتھ تو بے تکلفی تحیک نہیں نا۔ میریں ان کو جلدی سب کچھ سکھا دوں گی۔ پتا ہے جی جب ہماری شادی ہوئی تو ان کو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ یہ جواب اتنے پریشان نظر آئے ہیں تو میری ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ اکیلیے تو مجھے بہت امیر لیس ہیں۔ ویسے بھی میرا بھلا لگاؤ (احترام) کرتے ہیں اور میری برخواست کو پورا کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ شوہر کے ذکر کے ساتھ ہی ناہرہ تو اس کی محنت غائب ہوئے تھی مگر اس کے تصور میں وہ تو اپنی کبر رہی تھی۔

”بس بس تو پھر فکر اس بات کی شوہر اپنا ہو تو پھر کسی کمال جو تیرھی نگاہ سے تمھاری طرف دیکھ جائے۔“ زینت کے دل

سے ایک وجہ سا اٹھ اٹھ چمک کر بولیں۔

”جی ہاں می۔ اصل میں اس بین ماہ کے عرصے میں ہماری ائمہ اسٹینڈنگ بھی تو بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اور ہمارے دریاں یہ بے پایاں ہے کہ ہم اپنی اپنی آئیں کی پابند رہا ہیں باقاعدہیں ترک کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی پابند رہا۔ عاتقوں کو وارث (درواشت) کرنے کی کوشش بھی کر رہے۔ ایک دوسرے کو اخلاقیات کا احترام بھی کر رہے۔ اور کسی اختلاف کو اپنے درمیان حاصل نہیں ہونے دے گے۔“ نازہ پرورش دیا اپنے ہنسی منوں کی زمین دیاں کھوئی ہوئی تھی۔ جو بہت سوہ سوہ کر بول رہی تھی۔

”ہاں یہ آپس کا اتفاق اور اتفاق ہی تو نہا کی کردوں کو مضبوطی سے جکڑتا ہے۔“ زینت خوش ہو کر بولیں۔

”اس کے باوجود می جی میں وہاں اسٹینڈ نہیں کر سکتی۔ وہ لوگ ہی نہیں بلکہ وہاں کا ماحول بھی مجھے تو نہیں کرنا لیں

بھی کر رہی مجھے بالکل پسند نہیں۔“ نازہ پرورش کر رہی تھی۔

”تو بھلا ایک کراچی ہی تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ عروس املا بھی کھانا ہے اور

پھر یہاں کی رہائش چھوڑ کر آخر یہ ہوگی کہاں۔“ زینت بیٹی کی باتوں پر چمک کر بولیں۔

”خدا ہی زمین بہت وسیع ہے می کسی فردن کشری میں اپنا آشیانہ بنالیں گے۔ پتہ مجھے تو یہاں اپنا دم کھٹنا محسوس ہوتا ہے۔“

نازہ تو دقت نہ تو تھی۔

”کمال ہے بیٹی تم نے کہاں کہاں کے سامنے بھی ایسی ہی باتیں کر رہی ہیں مگر میں نے اس کے سامنے تجھیں تو کتنا مناسب نہیں سمجھا۔“ لولا پر دیا یہاں ہو میں اسی سرزمین کا آب و ہوا نہ کھا کر پروان چڑھیں۔ نہیں اپنے سگوں کی ہجرت میں تم نے جیسے کا قریب سیکھا اور اب صرف بین ماہ یا ہرگز کرنا ہی ہو تو تمھارے دماغ ہی نہیں مل رہے۔ بیٹی یہ تو اچھے اور بے خبر لوگوں کی باتیں ہیں تو تم کد ہی ہو اور نہ یاد رکھو جس طرح جو باب کی نسبت سے چھپا نا جانا ہے اسی طرح ایک انسان کی شناخت اس کے ملک اور قومیت سے ہی ہوتی ہے۔ اب یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ تم اگر سو مشنر لیتا باندن میں رہا لائن اختیار کر لو تو بڑا سوسائٹی بھلائے ہو۔ جہاں بھی رہو گی پاکستانی ہو تو کھانا لگا اور زبان کس کو عزت نہیں ہوتی۔“

”افوہ می آپ سے پرس نے کہہ دیا کہ مجھے ہر ایک عزیز نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ترقی میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اور میں اپنی اپنی زندگی کو کسی ایسی جگہ گزارنا چاہتی ہوں جہاں مجھے زندگی کی تمام آسانیاں اور خوشیاں مل سکیں۔“

”زندگی کی بہت سی آسانیاں اور خوشیاں انھیں یہاں رہ کر بھی نصیب ہو سکتی ہیں۔ یہیں اپنا ایک پلن بناؤ۔ کچھ اصول منع کرو۔ شوہر کی محنت اور اخلاقیات انھیں میری ہے۔ یوں بھی بیٹی اور وہی زندگی بند کتاب کی مانند ہوتی ہے جسے کھولنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہوا ہے۔ تمھیں آئے والی عبارت درج ہے۔ باور گزرا جائے والی۔ یاد رکھو شوہر کا دیکھنے کے لیے عورت کو اپنی مشنر خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ تمھارے لیے بھی بہتر ہے کہ تم اپنی اعمال انہی لوگوں کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرو۔“

زینت کے ہاتھ انداز میں تنہا ہی شامل تھی۔ نازہ رو کر جواب ہی دینے والی تھی کہ تجھی آذان مغرب کی جات بخش آواز سہوڑ سے مٹاؤ گی۔ زینت نے جل شانہ میں جلا لہکتے ہوئے سازھی کا پوسرہ ڈال دیا۔ بیٹی نے بھی ماں کی تقلید کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اگلے صلابوں۔ ماں نے جو بصیرت کی تھی اس کے جواب میں مزید کچھ کہنے کی نازہ نے محنت نہیں دیکھی تو آذان ختم ہونے ہی لاؤنگ میں رہ کر گئی۔ وی کاٹن دبانے کے بعد ماں کے پاس کچھ بیٹھے ہوئے ٹی وی سکرین پر چلتے ہوئے اشتہارات پر نظر پڑا جو ماکرو پوجا۔ اس نے بے دھیانی میں ٹی وی کی آواز اور بھی نہیں کی تھی۔

”کمال ہے مغرب کی آذان بھی ہوگئی اور ابھی تک ڈیڈی نہیں اٹے۔ کیا بھل کر برے آتے ہیں؟“
 ”نہیں روز تو بھلا نہیں البتہ کبھی بھی ابھیں ضرور ہو جاتی ہے اور میں نے تو اچھا کہہ دیا ہے آذان کے کھڑکی کے دو پہرے فون پر ابھیں تھامے آئے کی اطلاع کرادی تھی۔ شاید بھنگ چل چکے ہوں گی۔ جو ابھی تک نہیں آئے۔ زینت نے بتایا۔
 ”مگر یہ ٹیڈلر لڑکا کیا بچہ ہے می جبکہ ڈیڈی کسی کے ساتھ بائزر شپ بھی نہیں ہے۔ نازہ نے پوچھا۔
 ”ہاں بائزر شپ تو نہیں ہے لیکن بزنس کو دوست دینے کی غرض سے باسٹھ لاکھ روپے کا ایک ٹینڈر جاری ہوئے ہے ایک پارٹی کے ساتھ کبھی شہر خرچہ ہے۔“

”اوکاڈ۔“ نازہ نے صرف اتنا ہی کہا۔ اُسے واقعی گھر پر طاری سنانے سے وحشت سی ہو رہی تھی۔
 ”یہ کیا کہاں غائب ہوگئی۔ احمد کو لڑکا تنگ چھوڑنے لگی تھی بائزر شپ کو تفت کے بعد اس نے اس پورٹ زدہ ماحول سے انکار کر دیا تھا۔
 ”ہاں چھوڑنے کو تھی مگر اس پر ابھل طرح طرح کی ڈھنگ سوار ہے۔ باقاعدہ ایک کوکنگ مشینیں ڈال دیا ہے۔
 اور اب کھارے لیے کافی بائزر شپ تیار کرنے میں مصروف ہے۔“
 ”اوکاڈ سویت۔“ بیٹھا شروع ہی سے بڑی بیٹھیشہ سی تھی۔ نازہ خوش ہو کر بولی مگر اس کا بھرپور غصہ تھا۔
 ”ہاں لیکن بڑھائی میں بہت کمزور ہے۔ جہاں تک بس سے اُتر رہا ہے اسے یہ کہہ لیا ہے کہ تمہیں سے اتنا شغف نہیں جتنا گھر پر لگا ہوا ہے۔“

”ہے۔ زینت بولیں۔“
 ”تو گھر پر لگا ہوا بھی تو زندگی میں سب سے اہم ہوتے ہیں۔ آپ دو گونے اُسے فرسک پڑھو کر واقعی اس پر بہت زیادتی کی ہے۔ اس کے بچان کے پیش نظر آپ کو اُسے ہم کن محسن کا لے ہیں ایڈمیشن ڈواؤر دینا چاہیے تھا۔“ نازہ بولی۔
 ”ہاں غلطی ہوگئی اب کیا ہی کیا جاسکتا ہے۔ زینت نے یوں کہا جیسے اس موضوع کو اتنا اچھا نہ رہا ہو۔
 ”یہ نیو فری واپسی آخر تک ہوگی مگر پونے سات لاکھ روپے ہیں کیا رات کا کھانا کھا کر لوٹے گی۔“ نازہ نے پوچھا۔
 ”نہیں رات کا کھانا کھا کر لوٹنے لگی۔ برعکس وہ ہارٹی ہیں مگر یہ۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات بجے تک واپس آجائے گی۔“

زینت نے کہا۔
 ”ہوں لکھائے نیو فری ایک چوتھہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں۔“ نازہ جھپٹے سے لہجے میں بولی۔
 ”نہیں۔“ ایک چوتھہ تو نہیں بڑھیں۔ البتہ تھامے جانے کے بعد جو کچھ رو لیتی ہوگئی ہے اس لیے وہ یہاں کی پورٹ سے گھرا کر نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ کھاری کار کھائے ڈیڈی نے اُسے لے دی ہے۔ زینت نے کہا۔ تو نازہ یوں بھلی جیسے کرٹ لگ گیا ہو۔

”ہیں۔ میری کار ڈیڈی نے نیو فری کو بخش دی ہے۔ لیکن میں مرنے نہیں گئی تھی جو میرے جلتے ہی میری چیزوں کا بخار ہو گیا تھا۔
 گیا۔ اور نیو فری کو اتنا ہی کیسے دے دی ڈیڈی نے کہ وہ تنہا شام تک آواز نہ گری کرتی رہتی ہے۔“
 ”اے اے تم ٹھیک تھا کہ تو ہو بیٹی۔“ آج کیسی خوش قسم کی گفتگو کر رہی ہو۔ اگر تھامے خیال میں نیو فری دار لگ بھی کرتی ہے تو تنہا نہیں کرتی تنہا ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ تو آج بھی نیلا کو ساتھ لے جانے کے لیے مہر تھی۔ بڑا نیلا کی طرح تیار ہی نہیں ہوتی۔
 زینت نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

”خیر کچھ بھی ہی لیکن ڈیڈی کو میری کار نیو فری کو نہیں بخشی چاہیے تھی۔ جبکہ میں نے تو پودوپ سے واپسی پر سوچا تھا کہ اپنی کار آپ سے لوں گی۔“ نازہ جڑے جڑے سے انداز میں بولی۔

”کیوں کیا کاروں کا بار بار ناکاروا لگی گئے ہیں۔ خیر سے تھامے یہاں کے باک تو جا جا کر گاڑیاں ہیں۔ زینت نے متعجب سے انداز میں پوچھا۔

”اُن کے پاس ہیں میرے پاس تو نہیں۔ بس اکی لیے جانا چاہتی ہوں۔“ نازہ ترسے ہوئے لہجے میں بولی۔ تو زینت چپ سی ہو گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

”اچھا ٹھیک ہے میں تھامے ڈیڈی سے بات کروں گی۔ اگر رضوں نے تو نازہ ان کی بات قطع کر کے قہر سے بڑبڑے میں بولی۔
 ”یہ آپ ڈیڈی کی انگلی پر کڑکے تنگ ملیں گی مگر آخر آپ کی یہ اختیار کچھ مرضی ہوگی۔ پھر آپ ہر معاملے میں ڈیڈی کی مرضی کو قبول

مقدم کرتی ہیں۔ زینت کو بیٹی کا لب و لہجہ ناگوار گزرا۔ وہ بھی قہر سے بڑبڑے میں بولیں۔
 ”اگر تم میرے اختیار اور مرضی ہی کی بات کرو تو پھر میں یہ کہوں گی کہ میں وہ کام نہیں کروں گی جو میں نے کرنا نہیں دیا۔“

”مگر کیوں؟ آخر جس وجہ سے مری۔“ نازہ نے جزبہ زری ہو کر پوچھا۔
 ”کیونکہ اب وہ کار نیو فری کو دے دی گئی ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ اُس سے جیپن کر اس کی دل آزاری کا سبب بنوں۔“

زینت نے وجہ بیان کی۔
 ”تو پھر توں کیسے کر اپنی بیٹا میرے حوالے کر دینے۔ آپ تو یوں بھی کم ہی اُسے استعمال کرتی ہیں۔ گیران میں چپے پڑے یقیناً اس میں رنگ لگ جانے کا۔“ نازہ بولنے لگا تو ایک بار پھر زینت چپ سی ہو گئیں۔

”کیوں مری۔“ اب اب چند ہزار کی کار بھی مجھ سے عزیز ہوگئی آپ کو کیا شادی کے بعد بیٹیاں اس قدر غور ہو جاتی ہیں۔“ نازہ پرور نے فحاشی کے انداز میں دوسرا سوال کیا۔

”نہیں۔ یہ تو کھاری کچھ کا بھروسہ ہے تو اب اس کا یہی ہو اور نہ کہیں ایسی ہے جان چیزیں بھی ایک ماں کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہو سکتی ہیں۔ زینت نے کہا۔ انداز میں نازہ نے اس کا ساتھ دیا۔

”اچھا تو پھر آپ کو اپنی بیٹا۔“ نازہ نے کھنا چاہا تو زینت اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولیں۔
 ”پھر میری بیٹا۔“ اسی طرح اس میں بھی بیٹا۔ اپنی بیٹا۔ ہرگز نہیں دوں گی۔ کیونکہ کار کے سوا کچھ مجھے دینا نہیں اپنی

برسات سے ڈھک کر دے چکی ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تھامے لیے جو کچھ کہے اب احمادی کرے۔ کیونکہ اب تم ہماری نہیں اس کی ضرورت ہو آج جسکے سے کار کے کار ہواؤں کو لگ نہیں میں کسی چیز کی ضرورت پڑی تو وہ یہ کہے گا کہ اپنے ماں باپ سے ملنے آؤ نہیں معلوم نہیں بیٹی واما دوں کی قوم بڑی ہڈوات اور جڑیں ہوتی ہے۔ اُسے ایک مرتبہ بوی کے میکے سے چیزیں اٹھنے کا چسکا پڑ جانا ہے تو پھر ساری عمر غریبی کے میکے والوں کو ہی ٹوٹو کھسوٹتی رہتی ہے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوتا تو بوی کی ذمہ داروں سے پتھر پوٹنی لگتی رہتی ہے۔ ورنہ ایک بیٹا تو کیا میں تیرے گھر کی چاروں گاڑیاں تیار نہ کر دیتی۔ زینت نے بات کا آغاز تو بڑے غصے میں کیا تھا۔ مگر آخر میں وہ نرم پڑ گئیں۔

”کمال ہے مری۔ آپ نے معلوم واما دوں کی قوم کو کیا کیوں بنا رکھا ہے۔ ورنہ کم از کم احمد تو ورنہ ایک ایسے نہیں ہیں بلکہ ان بے چارے کے کو فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کریں اپنی کالے جلے کارا وہ کھتی ہوں۔ یہ تو کچھ میری خواہش تھی اور کچھ ان کی ماں کی ہونے کی باتیں سن کر میں نے ایسا سوچا تھا۔ تاکہ بعد میں وہ منہ و منہ بہ منہ کہیں کہ تم تو ایک معمولی سی کامی نہیں لائیں اور پھر میکے سے ملتی ہوئی چیزیں سسرال میں لڑکی کی قدر و منزلت ہی بڑھاتی ہے۔“

نازہ پرور ماں کے سمجھانے پر قہر سے جھنجھڑی پڑ کر بولی۔
 ”یوں بھی مگر یہ کہ نظر انداز کر دینے پر اس سے اس پر سخت جھنجھلاہٹ کی طاری ہو گئی۔ اس وجہ سے بھی ماں نے اُسے پھر پھر مٹی۔ ماں بھی کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں کہ اس کا مودا اس قدر کڑا کیوں ہو رہا ہے اس کی بات پر نہیں کر بولیں۔

”ہاں بیٹی کی شادی کرنے کے بعد وہی مثل ہو جاتی ہے کہ بوٹی لے کر بھڑو بنا پڑتا ہے۔ مگر مگر اطمینان رکھو۔ میں نے نہیں اور تھامے جیال کو کچھ نہ کہہ دینے کا پہلے ہی سے انتظام کر رکھا ہے۔ تھامی ہاتھ تو جانے نہیں دوں گی تھامے کو تو بڑا لینڈ جانے سے پہلے ہی جب بھی تم تھامے آتی رہیں میں نے بھی نہیں اور اُسے خالی ہاتھ بھیجا۔ بیٹی جانے اس کے کہ شادی کے بعد میکے والے لڑکے کو بوجھ لائیں کہ ذمہ داریاں اور پڑھ جاتی ہیں۔ جسے نازک معاملات ہوتے ہیں بچے تو افسوس اس کی بات پر ہوتا ہے کہ اچھے خاتون تھامے یا تھامے لوگ بھی اس قدر رواجی اور بہت ذہین ہوتے ہیں خیر میں نے تو تھامے کو کہہ دیا ہے کہ اپنے بچے کے معاملے میں بالکل اکی دو مری ثابت ہوں گی۔ ماں کی گفتگو سن کر نازہ دھما دھما کر رہی تھی۔ کچھ دیر سے اُس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

زینت خود بھی اس موضوع سے گتزا ناچا رہی تھیں۔ کچھ دیر سے آذان کی وی پر نظر پڑ کر اُس نے کہا۔
 ”اے اس کی کار تو کوئی کہ شادی ہوگئی تو نہ ہو رہا ہے۔“ نازہ نے اٹھ کھڑا ناچا دیکھ کر اُس کے کہنے کے بلاتے ہی وہی بند کر دیا۔

”نہی! کچھ ہی پیچھے کوئی نہیں چاہ رہا یہاں کی لورڈت سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ اس نے پلٹ کر مال کے پاس کھڑے ہوئے کہا تو زینت بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”اسے اپنے کمرے کو کیا بھول نہیں جیتی جو اب تک اس کا خیال ہی نہیں آیا اور ادھر بیٹے ہوں کہ روزی اس کی تھانہ کر داتی ہوں۔“ زینت موضوع بدل کر بولی۔
”چھوڑ دو مٹی اب اس کمرے سے میرا واسطہ ہی کہا رہا۔ رہنا تو مجھے دوسرے گھر میں ہی ہو گا نا۔“ نانہہ رو دیے دل سے بولی۔
”ہاں ہاں۔“ خدام دونوں کی جوڑی سلامت لگے، اصل گھر تو اب وہی ہے بھلا۔ لیکن میں نے تو اس خیال سے کبھی اپنے اوٹو نہیں اور رضا سے میاں کو کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہوا تھا کہ وہ خوب سمجھا سوتا رہا ہے او چل کر ڈرا دیکھ تو پورا زینت یہی کہہ پڑی دل میں ملول ہی ہو کر بولی۔
”اچھا دیکھ لوں گی مگر یہ آپ نے میرے کمرے پر اتنی محنت کیوں کی کیونکہ کبھی اے اتفاق بھی ہوا تو ایک دو روز کے لیے یہی گئی۔ کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں۔ میرا مطلب ہے اتنا اہتمام کرنے سے فائدہ ہی کیا ہو گا آپ کو؟
”اے نہیں یہ کیا ہو گیا ہے بیٹی۔ خدا دیکرے جو تم ہمیشہ کے لیے یہاں آؤ۔ میں بلا رولٹ کمرے ہی ہوں کہ تم عدسے زیادہ جلدی نہ کرنا کہ ہو گئی ہو۔ اسے اگر وہ چپ چاپ یہیں یہاں چھوڑ کر مل گیا تو یہی اس کے مزاج کی سادگی ہے۔ اس نے بھلا سے یہاں قریب خواہش کا احترام ہی تو کیا ہے۔ ورنہ کوئی آڑے نہ توجھے، دماغ کا ہوتا تو ہم پر اپنی اہمیت خٹکنے کی غرض سے ساتھ لے جاتے۔
”ہو جاتا تے یا مار لیا ہوتا۔ نا اور لڑائی پر پھجوا کر لڑائی میں یہاں چھوڑتا۔ دیکھو بیٹی ازدواجی زندگی میں جلدی نہ کرنا اور صلاحیت سے ہی کام لینا چاہئے۔ یہی جاکر ایک کامیاب زندگی گزارا جاسکتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی گرفت نہیں کرنا۔
”بھلا تو ابھی نہ کیا جاعا ہے اس پر سامنے نندوں کا ساتھ بھی ہے اگر اچھے سے ہوشیار ہی اور بھلائی سے کام لے لوں تو بھلا ہمارا بھلائی صحیح میں آجائے گا۔ برو کی جگہ اگر شیطانی نہیں تو بد ضرور ہوتی ہے اور شروع شروع میں تو لغز بٹا سارے رو دیں گے اور بیویوں پر صدمے فاری جائے ہیں اور ان کے سامنے اپنی محنت کے بڑے بڑے دعوے کرنے ہیں مگر بعد میں۔
”او اچھا اچھا میں خوب سمجھتی ہوں۔ بلکہ آپ کی باتیں گہ میں باندھ لی ہیں مگر یہی میری اب مزید کچھ نہیں۔ میں نے واقعی ایک خوشی کو کر کر کر دیا ہے۔ یہی محنت سے۔“ نانہہ ہر دو ماں کی تقریر نا صیحت سے اس کا رد بولی۔ تو زینت اس کے کہنے کے انداز پر مڑ کر بولی۔
”اس سے سات دن پیچھے۔“ نانہہ نے جلدی سے ٹاپک بدلنے ہونے ماں سے کہا۔
”اپنے کمرے میں تو بعد میں پہلی جاؤں گی کہنے والا جا کر ٹپکا کو دیکھوں کہ کہیں میں کہا کا گزارا کر رہی ہے۔ مانی سہت لڑا (دیر کی باری ہو چکی ہیں)۔
”اچھا جاؤ پہلی جاؤ۔ میں بھی ذرا تمہارے ڈیڈی کو فون کر کے ابھی آئی ہوں۔ آخر کچھ معلوم ہو کر اتنی دیر کیوں لگا دی زینت نے کہا اور پلٹ کر صدمے لگیں تو نانہہ ہر دو کو مل کر خیال آیا اس نے ماں سے پوچھا۔
”کہا ماں جان ابھی یہیں نہیں آئی۔“
”ہاں۔“ آپس میں۔“ زینت نے ٹپک کر ہاٹ سے پیچھے میں بتایا۔
”او ویری اسٹریج۔“ (توجہ کی بات ہے)۔
”جھپک جھپک تو میں نا زبانی طور پر توجہ کا انہار کر کے بعد اس نے پوچھا۔
”ہاں بالکل جھپک ہیں۔“
”کیوں ہے فالوں کی یاد نہیں آئی ابھی؟“ نانہہ نے ایک طنز کی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔
”نہیں آئی تو بہت سچی معذوہ ہمارے بابا صاحب کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اب ہر مریاں ہیں جو ان کے کہنے سننے کے باوجود کسی طرح انہیں جانے نہیں دیا۔“ زینت کے چہرے سے ہی نہیں ٹھٹھکی کے بھی ایک ایک لفظ سے ناگوار کی کا اظہار ہو رہا تھا۔
”کمال ہے اتنی دیر سے آئی ہوئی ہوں معذوہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلیں۔ آخر باکری کی دہائی میں پڑے پڑے۔“ نانہہ نے مال کی ٹوکھوس کر کہتے ہوئے پوچھا۔
”زیادہ تر لڑکی ہی روتی ہیں۔ یا پھر لڑکھڑکھاتی ہیں۔ اصل میں سب جیلے بھلے ہیں ان کے ہر جوڑوں کے درمیان شکل نہ ور نہ باکے ساتھ تو دیر تک لان میں چلتی رہتی ہیں۔ اب جیسے وہ گئے ہیں تو پھر ستر ستر بھال رہا ہے۔ اس پر سلوٹے ان کی نہیں کرکے نہیں بالکل ہی معذوہ کر دیا ہے۔“

[illegible]

نواز کے لئے نئی دامان کا خدشہ نہ لگا۔ پھر وہ ان سے علیحدہ ہوئی تو کچھ دیر تک وہ اس سے اس کے پورے تریب کے بارے میں باتیں کر رہی اور باتوں کے بارے میں بہت کچھ پوچھا۔ ناز و اطمینان سے ان کے پاس جتنی برسات کا جواب دیتی سی۔ اس نے سولو کو پھر نظر انداز کر دیا تھا۔ دادی سے اجازت لے کر اسی تو انھوں نے ہی اسے اس کی موجودگی کا احساس دلایا۔

”اوہ آئی امی وبری سوری سولو۔“ ایک اماں جان کی پیاری بیواری بالوں نے مجھے بخاری احوال دہری کہنے کی ہمت دی۔ اس نے اُن دادی کو ذرا رہنمائی کی۔ وہ ہنسنے لگی۔

”کوئی بات نہیں۔ بس سچے باکل مانڈ نہیں کیا۔ سولو مسکرا کر بولی۔ تو ناز پر دوسرے انگ سے لگا ہوا۔

”یعنی دادی جان نیکیت سب کے لیے کوئی نیکوئی سوغات لائی ہوں نکھلے لیے ہی اس میں سے کچھ نکال لوں گی۔ اگر زینت ہی تو پہننی ہوں۔ جس سے دو پہر تک سسرالوں کا ایک تانسا سدا جھار ہا تھا اس لیے اپنا سوٹ کبیں کھولنے کا کچھ موقع ہی نہیں ملا۔ ہاں ہاں کبہری سچی وہ بھی سولو سے۔ سلی سلی کے تپ کی انتہا نہ رہی۔

”نہیں بس تم نے مجھ سے بات کر لی میرے لیے یہی بہت ہے۔ یہی سب سے قیمتی سوغات،“ سولو جواب میں بولی۔ تو ناز پر خوش ہو کر ہنسنے لگی۔

پھر دادی اور سولو سے رخصت ہو کر جوہنی باہر نکلی شعیب منصور سامنے سے آئے نظر آئے۔ شاید وہ اس سے ملنے سلی بیگ کے لیے ہی آ رہے تھے۔ ناز و جھگڑا کران سے ہٹ گئی۔ وہ بری و برنگ آئے بیٹے سے لگے کھڑے وہ پھر زینت کے کہنے پر آئے اس کے کمر کے لیے اس کے۔ زینت نے واقعی اس کے کمر کے زعفرین رنگ بدل دی تھی بلکہ فانی لین برڈ سے اور پھر جی ہاں اور ہنسنے لگی ڈالنا اور اپنی خوبصورتی سے بچا ہوا کمرہ ہر سے بول رہا تھا۔ انھوں نے کہے ہیں داخل ہوتے ہی اسے بھی ان کے ہاتھ مڑنا ڈوبا کچھ کچھ کرب کچھ بھول گئی تھی۔ گواس نے سائنسی نظروں سے کمر کو دیکھا تو مزید تعجب کیا کہ زیادہ تعریف نہیں کی تھی۔ بس ماں کا دل لکھنے کو واہ کا لہو لگا کر لائے ہی کہا تھا کہ امی آپ نے تو میرے کمر کو کچھ سے کچھ نواہا ہے۔

بہر حال باپ سے باتیں کرنے میں اسے دقت کا خیال بھی نہ رہا جتنی کھانے کا بھی نہیں کہ اس دوران میں نیلو فری آگئی تھی اور اس سے بھی سچی باپ کے ساتھ ساتھ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھی اور تب تک نہ ملنے دوسری بار اکٹھا نہ تھا اور جانے کا خدشہ تھا کہ پھر تو یہ سب کے سب کھانے کے لیے چلے آئے لیکن ابھی ناختم کر کے میرے آگئی تھی کہ احمد روشن آئے بیٹے لگا شعیب منصور اس سے بھی بہت شفقت اور محبت سے ملے اور پیش آئے اور اسے زبردستی اس کی بیوی بھائی پھر چرب دونوں واپس کے کمر سے آگئے تو ڈور اسٹیک روہم میں آئے ہی زینت نے کمر کو آواز دی۔ کچھ ہی دیر بعد کمر لہدی پھندی شالی و حکیمنا اندر داخل ہوا اور شالی زینت کے آگے رکھ دی۔ زینت نے پہلے بیٹی داماد کو پاس بلا کر انھیں بار بھولی پہنائے پھر جھک کر شالی میں رکھی ہوئی تیریا نکال نکال کر بیٹی اور داماد کے سامنے رکھتی گئیں۔

”پیوٹ کا پیرا“ شریش نامیاں اور کھٹ نکس نکھارے لیے جب اور یہ کٹان کی سڑھی اور سرت لڑا میری ناز کا ہے۔ انھوں نے داماد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر کمر سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”کمر تم تمھاری اور بھولوں کے ٹوہرے بیباکی کا رکی ڈکی ہیں رکھو اور جا کر۔“

”میری ہاتھ نکھات رہنے کی کیا ضرورت تھی کہ تو میرا آپ کے ہی بیچے ہیں۔ ہم تو ہر دوسرے تیرے روز قدم پوچی کے لیے آ رہے ہیں گے تو کیا آپ ہمیشہ ہی تو زینت جو کچھ خوشی سے بھولی آئیں ساری ہی ہیں اس کی بات کاٹ کر بڑے دلارے بولیں۔

”ہاں ہمیشہ ہی تو میں گے بیٹے۔ نکھار تو حق بنتا ہے ہم پر وہاں ہم دوسرے تیرے کیا روز ہی آؤ۔“

”پھر تو زبان سے جسے فائدے ہیں وہیں گے آپ احمد بھائی،“ نکھار ہنس کر بولی۔

”ہاں واقعی اس طرح کم از کم آپ دونوں کے کچھ لے کر ہمارے تھے کہ بڑا ملو تو سولو ملن، ہم ہی ہو جائے گا۔“ نیلو فری نے لہو ہاتھ ناز و احمد زور زور سے ہنسنے لگے اور شعیب منصور نے بھی ہنسی میں ان کا ساتھ دیا۔

”اچھا اگر یہی بات ہے تو پھر ہم سیریل ورت پر ہی آکر بیٹے یعنی سال میں دو مرتبہ ایک بار گریہوں میں اور دوسری بار پوچھیں کیوں ناز و ہر دم کا ایک ایک جوڑا کا فیوکانا ہمارے لیے۔“ احمد نے ہنس لینے کے بعد ناز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں پھر تو آپ جلدی سے پولیس لائے جان کریں کیونکہ پولیس والوں کو سال میں کل دو دوریاں ہی ملتی ہیں وہ بھی موسم گرما کے بعد۔ سو ہرک ہاں میں ہاں ملے ہوئے ناز پر دوسرے کچھ اتنی رجحانی سے یہ بات کہ ایک ہفتہ پڑا پھر دونوں ہاتھ ہنسنے لگے سب سے رخصت ہو کر اپنے گھر روانہ ہوئے تو زینت نے ہاتھ اٹھا کر ان کے سد اپاہی خوش و خرم رہنے کی دعا کی۔

بٹی اور داماد کے جانے کے بعد نہادھو کر اور تازہ دم ہو کر جب شعیب منصور اپنا پائپ سٹاک کر میڈ پر بیٹھے تو زینت بھی رات کا لباس تبدیل کر کے آچکی تھیں وہ اس سے بڑی مہن تھیں۔

بیٹی کا سر دوخو بصورت اور جھکتا ہوا چہرہ بار بار ان کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اور وہ خود کو خوشیوں کے جھولے میں جھولتا محسوس کر رہی تھیں۔

عجب کچھ کامیابیوں سان پر طاری تھا جو بیٹی کی ساس نندوں کا خیال آتے ہی اچانک ٹوٹ ٹوٹ جاتا کیونکہ بیٹی کی گفتگو کے پیش نظر وہ بہت شرمی اور فساد پر معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن پھر فوراً۔ داماد کی نیک۔ سادہ فطرت خوش مزاجی اور بیٹی سے اس کی محبت کا خیال آتا تو وہ پھر خوش کن خیالات میں مگن ہو جاتیں۔ اور کھلی آنکھوں سے بیٹی کی مسرور اور شاندار زندگی کے خواب دیکھنے لگتیں۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ آخر شعیب منصور نے انہیں اس قدر گم سم سا دیکھ کر لپوچھا۔

”ہائیں کچھ بھی نہیں“ وہ اپنی محبت سے بری طرح چونک کر بولیں۔

”نہیں خیر کچھ تو سوچ رہی ہو؟“ شعیب منصور نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ اپنی ناز کے بارے میں ہی سوچ رہی ہوں۔ اللہ اسے نظر دے بجائے شادی کے بعد کسی نکھر آئی ہے خیمہ پھرتا سا پانی بھی پھر گیا۔ اور صحت تو ماشاء اللہ اپنی اچھی ہو رہی ہے کہ نظر لگ جانے کے بدلے کے ڈر سے میں نے نگاہ پھر کر اسے دیکھا

نیک نہیں؟“

”کمال ہے تم نے تو اسے جنم دیا ہے اس کی ماں ہو پھر بھلا اسے تمہاری نظر لگ سکتی تھی؟“ شعیب منصور ہنسنے ہوئے لیے

میں بولے۔

”نہیں یہ تو نہ کہتے نظر سب سے پہلے اپنوں کی ہی لگتی ہے۔ اور میری بیٹی تو ہے ہی ماشاء اللہ حسین؟“

”ہاں۔ خدا اسے ہمیشہ خوش ہی رکھے۔“ شعیب منصور نے جواب دے کر کہا۔

”آپ نے بھی تو آج حدی کر دی اتنی دیر سے آنے کی بجائے انتظار کرتے کرتے تھک گئی؟“

”ہاں کچھ مصروفیت ہی اتنی رہی آج کہ پورا دن ہی گزر گیا۔ وہ تو میں ناز کو وجہ سے جلدی اٹھ آیا ورنہ نامعلوم

کب گھر آئے کی مہلت ملتی۔“ شعیب منصور نے مزید ایک لمبی جھانی لے کر اپنی گفتگو کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

”راجہ! بلا لیں کیا مصروفیت تھی آج کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔ زینت نے پوچھا۔ انداز جھنسا سا تھا۔ شعیب منصور کو برا

نو گامرہ واقعی بہت تھک گئے تھے اور انہیں جہانمیں آ کر ہی تھیں ورنہ اس انداز میں اس کے سوال کے جواب

میں چڑھ رہی کہتے کہ میں ناز کا سننے تو نہیں کیا تھا۔ یا سارا دن عیاشی تو نہیں کرتا رہا تھا مگر انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”بس وہ کچھ کاروباری معاملات طے کرتے تھے۔ سہ پہر کو اسی سلسلے میں میٹنگ بھی تھی اسی میں اچھا رہا۔“ زینت جواب

میں کچھ نہیں بولیں تکبیر درست کر کے لیٹ گئیں۔ شعیب منصور نے بھی لیٹنے کے ارادے سے کمر کے نیچے سے نکلیے نکالا بھی

کوئی خیال آیا تو لیٹنے لیٹنے رک کر انہوں نے کہا۔

”عجب اتفاق ہے آج میں اماں جان کی احوال پر ہی کرنا بھی بھول گیا۔ لیکن بیٹی داماد آئے تھے تو تم نے کم از کم انہیں

کھانے پر تو بلوایا ہوتا آپ کو وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گئی ہیں۔

”ہاں قابل تو ہو گئی ہیں مگر انہیں بلیک بریڈ کرکھا نا کھانے کا رابطہ سا پڑ گیا ہے اور پھر وہ تو سر شام ہی اپنا

ہڈ پڑی کھانا کھا لیتی ہیں۔“ زینت نے بڑی ہیزاری سے کہا۔

”اچھا تو کیا تم نے بیٹی داماد کو ان سے ملوایا بھی نہیں؟“ شعیب منصور نے ان کی ہیزاری کا ٹوٹس لیے بغیر پوچھا۔

”نہیں۔ ناز و خود جاکر انہیں سلام کر آئی تھی البتہ احمد نہیں جا سکا ان کے پاس۔“ زینت کھردرے سے بیٹھے

میں بولیں۔

”کیوں؟“

”اسے موقع ہی کہاں ملا۔ بیوی کو چھوڑنے آیا تھا تو میٹنگ میں جانے کی عجلت سوار تھی۔ تو چل میں آیا کہ انداز میں

اس نے جانے کے ساتھ سٹیکس کھائے تھے اور ناز کو لینے آیا تھا تو آپ کے سامنے ہی آیا تھا۔“ زینت شرم کے ایک ہی

”میرے سامنے بھی آیا تھا تو کم پر یہ لازم تھا کہ تم اسے اماں جان کے پاس لے جاتیں“ شعیب منصور نے کہا۔
 ”ہاں، لازم! تو ہٹا مگر کسی کی خاطر تو اسے صبح کچھ خیال ہی نہیں رہا، نیت ناس موضوع سے جان چھڑانے کو قصور کرنے کے سے انداز میں کہا۔

”لیکن یہ تو کوئی بات ہی نہیں جو فی جنہیں کم از کم امان جان کے رشتے کی نزاکت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا: غیر معصوم سچ ایک ہی موضوع کے پیچھے بڑے تھے۔“

”اگر ایسی ہی بات مٹھی تو آپ ہی خیال رکھ لیتے۔ ساری باتوں کا ذمہ دار تھے ہی کیوں ٹھہرتے ہیں! خرابی کی بجائے کبھی تو کچھ ذمہ داریاں ہیں؟“ زینت جھل کر بولیں۔

”جہیں ہماری ذمہ داری تو صرف یہی ہے کہ ہم آپ کو کما کر دیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ہمارے یہی مقصد کو کوئی تکلیف نہ ہوئے ورنہ باقی جملہ خاص طور پر مجھ پر معاملات کی ذمہ داری تو آپ ہی ہیں۔ اصل میں تو کوئی کام کا معاملہ سے نا اس لیے آپ اس قدر تیار و کھارہ ہیں ورنہ سکی سراس کا معاملہ ہوتا تو آپ جتنی اس لب و لہجے سے بات کرنے کی جرات نہ کرتیں“ شعیب منقصور درشت سے لیجے ہوئے۔

”شکر ہے آج اصل حقیقت آپ کی زبان پر آ رہی گئی۔ یوں سب لاکھ انسان چھپائے حقیقت کسی نہ کسی طرح اجاگر ہو کر رہی رہتی ہے۔“ زیت طنز بھرے انداز میں ہنس کر بولیں۔

”کیسی حقیقت؟“ شعب منہ مڑنے کیلئے تکیہ لپکے میں پوچھا۔

”ابھی گئے اور سوتیلے کے فرق کی۔“ زیت نے ایک زہر خند سے کہا۔

۱۰۔ احوالِ دلا کی کسی کڑی بھڑائی بات کرتے ہوئے سوتیلی تُو وہ تمہارے لیے ہیں ورنہ میں تو انہیں اپنی سگی ماں ہی سمجھتا ہوں۔
شعیب منصور گڑھے گاڑے انداز میں بولے۔

۱۱۔ ہاں ضرور تبھی تو مگس اور سوتیلی کا لفظ آپ کی زبان پر آ گیا لیکن پلے باز اس ذکر کو ختم کر دیں۔ میں آج اپنی بیٹی کا
قدر شادان اور فحاش دیکھ رہی ہوں۔ آپ خواہ مخواہ یہ میری خوشی میں کھنڈت ڈالنے کی کوشش نہ کیجیے۔ زینت

”خوش تو می بھی ہوں کہ وہ میرے جگ کا ٹکڑا بھی ہے۔ مگر خوش ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاؤں۔ اماں جان تو نہیں تو کم از کم تم سے سلو و کو کسی کھانے پر ملو الیا ہوتا آخر وہ جہاں کی حیثیت ہے سی کو یہاں ہونا ہے۔“ شعب منصور نے عرض کی کہ۔

”او دوہو تو یہ کہیے کہ یہ سارا قلعہ آپ نے سلوٹو کی وجہ سے کھڑا کیا ہے۔ ورنہ بھلا میں کبھی تو کہوں کہ یہ آج آپ کے احسانات امان جان کے لیے اتنے قیمتی کیوں ہو رہے ہیں؟“ زینت نے طنز نہ بھرے لہجے میں قدرے سختی سے جواب دیا۔

بھی ہے کوئی ایسا مرد جس کی حیثیت رسمی ہے اور جسے سولہ گناہہ کی تہا بیوی و زوجہ (سوں) اس کے پاس ہے۔
 ہے مگر تم صرف اس بات پر اس سے خار کھانی ہو کہ وہ خافہہ کی بی بی کی خند ہے۔
 تشعب منصور تہوہ پر بل وال کے لیے نریت تملاک بھیجی ہوئی ہو۔
 ”کمال ہے آپ کو اس وقت میں یہ عین برسہ سارے مندوں کے انداز میں بات کر رہے ہیں۔ وہ بر باد ہیں۔
 کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہ سب کچھ اس کے لیے جاری ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے لیے اس کے لیے اس کے لیے۔“

”مکھی ملتی نہیں کو اس کا سبب خود تھا ارغیا بلکہ وہ بھی توجہ دے سکتا ہے تم اس سے خلوص و اپنائیت سے پیش رو ہو نہ کہ جیسے ساری دنیا میں صرف میں ایک ہی فاتورہ کی کچن ہاؤس کے غیور پر غلوں پر اپنائیت کے خزانے تلاش کرتے ہو۔“

لیے جبکہ آپ کی نظر میں خود میری حیثیت ہے کہ مجھے معتبر سمجھتے ہیں یہ کسی قابل ہی نہیں کوسر بہت ہی بلند مرتبہ ہے۔ میں لیکن بہن کی زندگی میں باقی میری مجھ سے چھپتا ہے جس سے آپ کی کوئی رشتہ داری ہے نہ تعلق۔ لیکن آپ لاکھ چھاپیں، لپس۔ میں بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ سمجھے آپ نہ زینت ان کی بات کاٹ کر نہایت تیز و تندہ میں لے لیں۔

94

[illegible]

میں بھی ہوئی ہیں جن میں سے ایک دوسروں کی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی باتوں اور دوسروں کے پروگراموں سے رنجیدہ ہیں۔ لیکن تم نے جو معلومات حاصل کی قدرت کی ایک معلول پر مشیرہ ہے وہاں خود انسان کے لیے بھی ایک ایک مشیرہ ایک بھلائی ہے۔ لیکن تم نے جو معلومات حاصل کی ہیں ظاہر ہے دوسروں سے یہ کی ہیں اور دوسرے جو بھی کہتے ہیں اور دوسرے جو بھی کہتے ہیں جس کی باتوں اور دوسروں کے پروگراموں سے رنجیدہ ہیں۔ اسی خیال سے میں مسوکر کا نام یاد تھا کہ تم نے یہ کیا کیا ہے اور مجھے معلوم کرنے کی ایسی جستجو بھی کرنا ہے۔

شعبہ معنوی دے بہت کم اور اس شعبے کے کام کرنے والے بھی بہت کم ہیں۔ ان کی حالت اور سرگرمی سے جوئی کافی متنبہ رہ کر وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتے بلکہ درحک تو ایک گونگوں کی کیفیت میں رہیں کہ کہیں یا نہ کہیں پھر کچھ ویرگی سوچنے کے بعد بھول نہ گیا۔

"خیر خیر تو اس لیے نہیں ہے کہ آپ سب کو جانتے ہیں مگر میری کج فہمی یہ نہیں آتا کہ جب خدا اس نے سلطو کو دیکھے دے کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ انا اس کا ذکر کرتا ہوں کہ کسی کو اس کی بات"

نکال دیا تھا لوگوں کے احوال کے لیے کوسوں کی پٹریاں۔
 ”ہمیں بکس نے دیکھ کر گھر سے نکال دیا تھا اور کس نے انہیں مارنے کی کوشش کی؟ یہ تم کیا ادنیٰ لوگ بن چکے ہو؟“
 شعبہ مشغور ہوئی کی بات پر انھیں سے پڑے۔
 ”اب اتنے بھولے بھی نہیں بنے آپ۔ سب سمجھ جاتے ہیں مگر ظاہر ایسا کر رہے ہیں جیسے“
 ”ہاں جی ہاں نکال کر تھوڑے عرصے میں اسے زخافات سے مکمل ماری آقا کی ہوا ہے۔“ شعبہ مشغور نہ رہا۔

”میں جانتا تھا کہ تم میرے لئے ایسی کرامات سے کبھی باری تعالیٰ کو مجبور ہائے، یہ عجیب معلوم ہے کہ میں امداد میں یقین دہانی کرانی زینت کجی کی ان فطرت کے بموجب یقین کرنا ہی بڑا۔“

”تمہارا احمق آپ کو کچھ نہیں معلوم، تو پھر کسی بدخواہ نے تو یہی بھڑا کرانی ہو گی؟“ وہ بھی اسی خیال سے کہ ایک غلط بات پر غور ان کے لئے کرنے نے یہ بیڑہ جالیں بات کو قیامت ہی ہو لیں۔

”اگر یہ صحیح ہو تو اگر آپ کو اچانک اس قدر افسوس نہ ہو کہ کہنے والا، شیعہ، منصف، کچھ نہ کر سکتا، نہ اتنے بگڑے ہوئے۔“

اور جلدی آرائی ہے کوسے کے آرائی کو ان تھا ایسی کھو بائیں سے والے بلا سیب محصور ہے چہرے کے کمزرات یک عت
بول سے کئے۔ انہوں نے قدرے سخت پیچے میں چھپا۔
پہلے اپنے ہتھ سے منہ آرائی بائیں خواہ غلط ہو یا صحیح کس کہنے والے بلا سچے سمجھے کہتہ دیتے ہیں کہنے والے کی زبان تو کوئی
نہیں چھپاتا۔ دلوں پر رکھے یا شاہ کو کسی بھی راجھلائے ہیں
نہایت با کمال کہ نہ کہ کسی قدر کمال کے۔ مگر کمال آتا تو نہ محملہ بات نہ سہنی آتا نہ مگر محملہ سہ سہ

[illegible]

ایک غلط فہمی اس قدر پھیل چکی تھی کہ وہ لوگ جو اس کی بات کو سنا کرتے تھے، ان کے لیے یہ سمجھ جاتا تھا کہ وہ ایک عوامی شخصیت ہیں۔ اس لیے ان کی بات کو سنا کر ان کے لیے یہ سمجھ جاتا تھا کہ وہ ایک عوامی شخصیت ہیں۔ اس لیے ان کی بات کو سنا کر ان کے لیے یہ سمجھ جاتا تھا کہ وہ ایک عوامی شخصیت ہیں۔

کے خیال سے ایمان سے آپ جیسا غور نہ کیا ہو، بیوی کو زندہ کی کیفیت اور زنا دان ہوئی ہے۔ گھر آپ نے مجھے بہوی سمجھا ہی کہ بشر ان کو مجھے ہی معلوم ہے کہ کوئی مقدمہ چل رہا تھا جو وہ ہار گئے تھے۔ او نے پونے کوٹھی بھیجی اور بہوی کو لے کر وولڈ کو کہنے تک سے کہیں باہر چلے گئے اور بے چاری ابھی تک کوہاں بھیج دیا۔ وہ جھلا میں بھی کہوں کہ عاقب اودا نتا دل کریں گے کہ بیوی کو دھڑوہر پر نہ لیں جبکہ آج تک بے چارے پاکستان کے نور پر تو جا نہیں سکے۔“

زینت آرزوہ اور کچھ مٹنے سے انداز میں بولیں۔ تو شعیب منصور نے بہت چونک کر میوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”خیر یہ تو تم نے ٹھیک ہی غنا کہ وہ ورلڈ فور کا بہانہ کر کے گئے ہیں لیکن وہ مقدمہ نہیں ہارس بلکہ خیر پھر وہ
 قطعے کو انسان جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ اور پھر یہ ہمارا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے سائنڈ میبل پر چڑی کا لڑکھٹا
 میں اپنا پاپ رکھ کر تکیہ درست کر کے اپنی طرف کا لیب بٹھا یا اور لیٹے ہوئے کہا۔
 ”اچھا اب تم اطمینان سے صبح تک اپنی بیٹی کی خوشی کا جشن مناؤ مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے اس لیے شب بخیر اور زینت
 جوان کی باتوں سے دل گرفتہ سی ہو گئی تھیں۔ بڑ بڑانے کے سے انداز میں بولیں۔
 ”دہونہ۔ کیا خاک کا جشن مناؤ۔ ساری خوشی تو ابیرے غیروں کی خاطر ملیا میٹ کر کے رکھ دی۔ پتا نہیں کیسے پاپ بٹھا
 اور پھر شعیب آن کر کے خود بھی لیٹ گئیں۔
 ”ارے ارے باپ کیسا شوہر کہو ورنہ نکاح فسخ ہو جائے گا تیس سالہ شعیب منصور نے سوتے سوتے بھی ہنس کر کہا
 مگر زینت نے کوئی جواب نہیں دیا اور کروٹ بدل کر تکمیلی بند کر لیں۔

تیسرا بارن بجا تو کریم سے مٹھائی کا ٹوکرا اور بچوں کا دونا اٹھواتی ہوئی زینت بولا کر بولیں۔
 ”افو۔ یہ بالے تو میرے ہاتھ پہر بھلا دیے چلو کریم جلدی سے جا کر یہ ٹوکرا اور بھول ڈکی ہیں رکھ آؤ اور بابا سے کہنا کہ میں بس
 دوشن میں آئی ہوں یہ زینت واقعی بہت عجلت میں تھیں۔
 بہن منصور نے اپنے نئے رنگے میں چلنے کی خوشی میں دعوت کا انہماک کیا تھا۔ بولوں تو نیلے میں چلنے سے پہلے ہی انہوں نے قرآن خوانی
 بھی کر لی تھی اور چار بجے بھی اللہ کے نام پر فزع کواٹے تھے اور غزنیوں میں تلبیس کر دیے تھے مگر اس روز لجنہ نماز ظہر انہوں نے نفل آباد
 رسول مقبول متفقہ گئی تھی اور اس کے سارے پارچے سج رہے تھے۔ گویا مہلا دوسرا کہ شریف کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی زینت کو لیبیں
 تھا کہ کہو نہ ہمارے یہاں وقت کی پابندی کوئی نہیں کرتا اس لیے ہمان خوابین اور خود مہلا ڈپڑنے والی خالون قصر کے وقت ہی نفل
 کرائی بول گی۔ جبکہ یہ احساس بھی انہیں تھا تو انہوں نے پریشان کر رہا تھا کہ وہ کافی لیٹ ہو چکی ہیں۔
 کریم کے باہر جانے ہی وہ پیٹری سے نکل کر لاؤنج میں آگئیں اور اپنی خواب گاہ کا رخ کرنے کے بجائے مخالف سمت میں ہند قدم
 بڑھ کر انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے بیٹو فر کو بکرا۔

”مختار۔ یہی کب ختم ہوگی؟“ ایسے کونے سولہ گھنٹہ میں مصروف ہو۔ بھلا سارے پارچے سج گئے چلو جلدی سے جا کر گاڑی میں
 بیٹھو۔ یہی ابھی اپنا کرو لاک کر کے آئی ہوں۔“

”کئی۔ بس تو کب کی تیار ہوں۔ دیر تو خود آپ نے کی ہے اور یہ بھائی جان کے ساتھ جانے کی کیا ناکستی بھلا۔ میری گاڑی ہی چلی
 جائے گی۔ ان کے بکرا نے بیٹو فر جلدی سے اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی ہوئی بولی۔

”بھیس۔ یہی گاڑی نشان ہی اور بولی ہے۔ وہ بھی ہونڈا اکوٹکی۔ یہ زینت عجلت میں اپنے کمرے کے رخ مڑتی ہوئی بولیں۔
 ”پھر اپنا ٹوکرا اپنی بیٹراؤ سے دی گئی تو کئی گاڑی تو آپ ہی خرید سکتی تھیں۔“ بیٹو فر بولی۔

”اچھا اچھا۔ نہ بلوہ باہیں نہ نہ اور جا کر کہیں بیٹھو۔ ورنہ باہر بیچ میں بیٹھ کر جل دیں گے۔“ ہنری سے اپنے کمرے کا رخ کرتی
 زینت نے بیٹی سے کہا۔ ”تو وہ ہنری بیٹی کچھ برائی بائیں لگ گئی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر زینت نے الماری کا پتہ کھول کر اپنا پرک
 اٹھا۔ اور الماری مغل کر کے ڈریسنگ میل کے آئینے میں اپنا ہاتھ دیکھتے ہوئے برتن اٹھا کر ہنڈے سے بالوں پر بھیرا اور ہر سے کر کے

وہیں رکھا چاہوں گا کچھ اٹھا کر باہر آئیں۔ اس اثناء میں وہاں اور بجائے جا چکے تھے۔ انھوں نے گھٹے سے خواب گاہ کی جانب بڑھ کر کے اسے مغفل کہا اور باہر نکل آئیں۔

باہر پورے گھسے جیسے بیکڑت دیا ہر جانے کا راستہ، بڑے پورے سے کچھ دھلے پکھڑی اسفند کی بالکل نئی بوٹا کوڑھڑ بات کا کھلا اظہار تھی کہ اس سے وہ بہت غمت میں ہے۔ ٹیلو فرمشی ماں کے انتظار میں کچھ نشست کا دروازہ کھلے کھڑی کئی کچھ ڈرا بونگ سب پر ہی بیٹھا تھا۔

”اؤ فو ایسی کہا بھگت سوار تھی تم پر جو ہاں بجا کر میرے اوسان خطا کر دیے، بھگت کا کافی صلہ نہایت مرحمت سے کر کے انھوں نے کار میں بیٹھتے ہوئے سخت حوصلے سے ہونے انداز میں بیٹھے تھے۔

”مجھ سے نہیں یہ آپ ان سے پوچھ لیتی، ہاں، بجائے کا حکم یہی صادر کرتے رہتے۔“

اسفند نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شعیب منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو زینت، تجھیں کار میں بیٹھنے سے انھیں دیکھ کر سخت قیوب ہوا تھا کہ ایک تو وہ اپنی کار کے بجائے بیٹے کی کار میں بیٹھے نظر آ رہے تھے دوسرے یہ ان کی ایک بہت ہی اہم بونگ کھڑی تھا جس کی وجہ سے انھوں نے میری زینت سے کہہ دیا تھا کہ شام تک فارغ ہو سکیں گے لہذا وہ بیٹے کے ساتھ جلی جائیں۔ انھوں نے شوہر سے خطاب ہو کر پوچھا۔

”اوپر آج کیا غیر معمولی بات ہو گئی جو آپ بابا کی کار میں بیٹھے نظر آ رہے ہیں، بیٹے کے سامنے صاف پوچھ کے بجائے انھوں نے جس انداز میں پوچھا تھا اسے سمجھتے ہوئے شعیب منصور نے مسکراہٹ دیا کہ کیا۔

”بس آج ذرا اپنے بیٹے کی ڈرا بونگ کا لطف اٹھانے کو بی جا رہا تھا اس لیے ان کی کار میں بیٹھ گئے۔“ زینت بھی سمجھ گیا کہ اصل جواب گول کر دیا گیا ہے۔

”مغرب کی ٹو شاداس وقت کوئی اہم ٹینگ تھی، ان سے نہ رہا گا تو انھوں نے بتا دی۔

”تمی! تو بڑی وہ ٹینگ اٹینڈ کرنے کے بعد ہی آئے ہیں، اسفند نے ماں کے تپس کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

”اچھا اچھا، زینت کا تپس بھی بھری بھرا رہا، بونگو ان کے خیال میں اول تو یہ بات ہی غلط تھی کہ وہ ٹینگ اٹینڈ کر کے آئے ہیں۔ دوسری وہ اپنی کار کے بجائے بیٹے کی کار میں کیے آ گئے تھے۔ اور اپنی کار کہاں چھوڑ آئے تھے جبکہ اپنی کار کے سوا وہ کسی دوسری کار میں بیٹھنے کے عادی ہی نہ تھے۔ زینت اپنی خیالات میں الجھی ہوئی تھیں اور ادھر اسفند نے انھیں تو بہت پہلے سے سناؤ کر رکھ کر سنائی تاکہ ان کے نہیں بڑھانی تھی جبکہ ٹیلو فرمشی کب کی پیچھے جاتی تھی اور اتنی غمت بھی سوار تھی۔

”اب چلیے کیوں نہیں بیٹے یا تو اتنی غمت دکھا رہے تھے یا زینت نے کہا۔ تو اس نے پوچھا۔

”کیا سب کچھ بائس اور کو بھی چلنا ہے؟“

”نہیں۔ اور کون بائی رہ گیا ہے بیٹا تو صبح سے وہیں ہیں۔ اب میں کریم کو تو لے جانے سے رہی، زینت نے آخری فواد مزاح کے طور پر ہنس کر کہا۔

”لیکن وہ ایک پیچھے تسم کی چیز بھی تو موجود ہیں گھر میں کیا انھیں گھر میں مغفل کر کے جائیں گی؟ اسفند بولا۔

”ہاں یا تو بھی تسم کی چیز سلو کو کہہ رہے ہونا، شعیب منصور نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

”سلو کو تو نازش اماں جان کے ساتھ کل شام ہی سے گئی تھیں؟“ زینت نے تیار یا تو اسفند نے خاموشی سے کار کا گے بڑھائی۔

”بہلا دشریف تو بک کا شروع ہو چکا ہوگا بلکہ ختم بھی ہو گیا ہوگا اور آپ اب شریف نے ہماری ہیں، شعیب منصور نے بے پرواہی سے ایک نظر ڈال کر کہا۔

”دیر ضرور ہو گئی ہے لیکن میں آپ سے شرط کرتی ہوں کہ بہلا دشریف چار بجے کے بعد ہی جا کر شروع ہوا ہوگا بونگو عام طور پر خواتین گھر کے وقت بلاؤ عصر کے وقت ہی نکل راتی ہیں، زینت نے کہا۔

”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے جب میں اپنی کار سہیل کو دینے گیا تھا تو سورت خاصہ اندامیں آچھی تھیں، اور پھر چھوٹی دہن بڑی پیچونگی میں ان معاملات میں، انھوں نے زیادہ کسی کا انتظار نہیں کیا ہوگا۔ اور بہلا دشریف کو کراہا ہوگا یا شعیب منصور نے۔

”چرا کہ وہ بھی ہو گئی ہے تو نہیں اور نازش کوئی بڑا نہیں ہیں جو ہر ماں مان جائیں گے، شوہر کی بات پر زینت بڑھ کر بولیں۔

”مشکل تو یہی ہے کہ وہ غیر نہیں ہیں اپنے ہیں۔ اور بڑی عمارت ہونے کے لحاظ سے آپ کو صبح سے ہی وہیں ہونا چاہیے تھا۔

شعیب منصور نے کہا تو زینت بڑھ کر بولیں۔

”میں مجھے کھسکے بھی بہت سے کام انجام دینے تھے۔ ادھر ٹیلو فرمشی درو تھا اس لیے یہ سوری تھیں اور باہر بھی گھر پر کیلے۔“

”میں بھی کھسکے ہوئی، زینت نے غصہ پیش کیا۔

”میں میرے جانے سے پہلے ہی کھسکے ہوئی، آپ نے پھر کو کوئی گئی ہوئی؟ اسفند ہنس کر بولا۔

”میں نے میری کماؤت ہی لپی سے ہی کب تک سب کی طرف سے اطمینان ہو جائے میں نہیں آجاتی، زینت کو بیٹے۔“

”بات بھی یہی تھی تو انھوں نے گڑبڑ سے کہے ہیں کہا۔

”چلو چلو میں تو صرف نازش کا ہاتھ تلنے کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ بے چاری کیسی ہی سب کچھ کر رہی ہیں، شعیب منصور نے بیوی کا موڈ اٹھانے کے لیے بات کو منحصر کرتے ہوئے کہا۔

”میں نازش کا ہاتھ تلنے والوں کی کمی تو نہیں ہے۔ میں دسوں پر پچھ چھ ملازم ہیں، اس پر سلو کو بھی کل شام سے وہیں ہیں۔“

”میں نازش کا ہاتھ تلنے کی غرض سے ہی گئی تھیں، زینت شوہر کی بات پر جھمک کر بولیں۔

”اچھا تو کیا آپ کی طرح جی جان میں انھیں ملازم کی حیثیت دیتی ہیں؟ اسفند نے سوال کیا کہ اس کا جواب نہ تھا لیکن پھر بھی زینت سلو کو کے معاملے میں اس کے بدلے کی متونفہ نہیں اور پھر اس نے سوال بھی کیا کہ کیا وہ بھی شعیب منصور کے سامنے انھوں نے ایک نظر تیلو فرمشی اور زینت کی ہو کر بولیں۔

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”الزام کی بات نہیں تھی۔ اصل میں اس روز بہت اتفاقاً ان کے ہاتھ سے کوئی بیکوڈ سی چیز لے کر گئی تو آپ کی باتوں سے میں نے کچھ بھی نہیں سمجھا، اسفند بولا۔

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے تیرے میری کس بات سے یہ اخذ کیا ہے کہ میں سلو کو ملازم کی حیثیت دیتی ہوں یہ تو مجھ پر الزام ہی ہوا بیٹے۔“

”اے لیس۔ آپ تو نے گھر میں آکر بہت ہی جمل لکے ہیں سہیل بھائی۔ بھلا یہ کچھ کیا سبب رہے ہوں گے۔“ اور ان کے ہاتھ پر دووں بھائیوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگا دیا تو زینت نے جھینپ کر ہنسنے لگا۔

”اے تم یہاں کیوں کھڑی ہوئی ہو جاؤ اندر چلی جاؤ۔ اور یہ انھوں نے سہیل سے پوچھا۔

”یہ نازش کہاں ہیں؟“

”اندرونی ہوں گی۔“ سہیل نے بتایا۔

”اچھا اچھا بیلا دشریف ہو رہا ہو گا نا۔“

”نہیں بیلا تو ابھی آپ کے آنے سے بخیر ہی رہی تھی۔ اس وقت تو مٹھانی باجی جا رہی ہو گی۔ سہیل نے کہا۔

”میں مٹھانی باجی جا رہی ہو گی۔ زینت نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”وہ اصل میں جو کچھ رات کو ڈر رہے اس لیے ہم نے مہلا کے بعد جانے ناشتے کا جھنڈ نہیں رکھا صرف مٹھانی بانسے پر کھانا کھا رہے۔“

”ہاں یہ تو بہت اچھا کھا رہے ہیں۔ زینت بولیں۔

”میں بیٹے ذرا ڈی کھول دیں تو شکور سے چیزیں نکالوں۔“ انھوں نے اسخند سے غیاب ہو کر کہا تو اسخند نے بڑھ کر نور کو ڈی کا قفل کھولا۔

”کبھی چیزیں نکالو اسی میں ہیں بھائی جان؟“ سہیل منصور نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس بخیر ہی سی مٹھانی اور پھل وغیرہ ہیں۔ زینت نے کہا۔

”مٹھانی مٹھانی تو آپ پہلے بھی لاجی ہیں سہیل بولے۔

”وہ تو بہت ہی مزہ بن گھڑیں آئی تھی اس لیے شکون کے طہر ہلائی تھی۔ اس اثنا میں شکو پھیل اور مٹھانی کے نور سے پھولوں کے

برسے سے دوڑنے کے ساتھ نکال کر فریٹ پر رکھ چکا تھا۔

”اف تمہاری بنا یہ بخیر ہی مٹھانی ہے۔ پوری نہیں تو آدمی حوائی کی دوکان۔ اور کیا کسی ڈوٹ والے کا پھیلوٹ کر لے؟

مہاں صا جلد سے جاس طرح کے پھیل ہی تو میرے میں نظر رہے ہیں۔“

”پھیل جان انسانا تکلف نہ کر تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سہیل منصور نے بھادو سے کہنے کہتے جھینپے کو بھی رگید رہا تھا۔

خاموش کھڑا مٹھانا ہی با۔ البتہ زینت بڑے خشک سے بولیں۔

”اب بڑھتی کی باتیں تو نہ کیجئے اور صاحب۔ میں نے کوئی تکلف کیا ہے۔ تکلف لیس آپ کی خوشی میں اپنی بخیر ہی سی خوشی خالی کی کو سرکش کی ہے اور یہ ساری چیزیں کچھ اتنی زیادہ ہی نہیں جو آپ بھگے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”یہی کہ شرمندہ کر رہا ہوں کمال ہے۔ یہ کیسے کہ اس شرمندہ ہو رہا ہوں بلکہ دوسروں کی شرمندگی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔ پھر بھائی

خطاب ہو کر بولے۔

”ایک تو میری یہ سمجھ میں نہیں آتا بھائی جان کہ ہم ایسی بے جا رسموں میں بڑھ کر کیسے کا نہ پاں کیوں کر فریٹ جکر منہکانی کا ہی نہیں۔

ترقی کا دور ہے۔ شاید ایسی رسموں اور رواجوں کی وجہ سے ہم دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔“

”اے چھوڑو سہیل۔ جیسا دل پس ویسا بھی پس، ہمارا منہ انک ہے روح مختلف ہیں نظریات اور خیالات بھی جدا جدا ہیں۔ مذہب بھی منفرد۔ اب آباؤ اجداد سے جو رواج چلے آ رہے ہیں انھیں ہم چھوڑ دینا چاہیے۔ اور بھران باتوں سے بھلا ترقی کا کیا تعلق؟ زینت

”بہت برا تعلق ہے بلکہ وہ بڑے نام کی ہی ہے بھائی جان کیونکہ ان رسموں اور رواج کے پابند ہو کر ہم بیکر کے پیوے رہ گئے۔“

ترقی کا خاک کر سکیں گے اور ایسی رسموں کی سب سے بڑی خانی ہو رہی ہے کہ جو شے وراثتی اسطفاط نہیں رکھتے کو اتنی شہادت پہنچے

سکیں وہ شرمندہ بھی ہوتے ہیں کیسکے بھی سہیل منصور نے کہا۔

”اے چھوڑو بھائی۔ آپ کے تمام رشتے داروں میں اس وقت ہی سب سے قوی رشتہ دار ہوں۔ یعنی بھادو ہوں بڑی اور بڑی

مٹھانی ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ نے تو اتنا کچھ کہہ کر میری خوشی بھی ملباست کر کے رکھی۔ زینت کھسکی سی ہو کر بولیں۔

”اے نہیں بھائی جان میں تو ایسی رسموں کو ختم کر دینے کی غرض سے کہہ رہا تھا جس سے تکلف ہی نہیں بلکہ نقصان ہی پہنچتا ہے۔“

”کی چیز کے خلاف کوئی آواز نہ بلند کیا جائے تو وہ سب سے پہلے اپنے گھر سے ہی کہا جاتا ہے۔ سہیل منصور نے بھادو کے بڑھان چنے پرانی مٹھانی

پیش کی۔

”مگر یہ آواز نہ بلند کرنے کا کیا ہوتا ہے بھلا تم اگر رسموں اور رواجوں کے خلاف آواز ہی بلند کرنا چاہتے ہو تو ایسا کہہ کر بان عہ ایک منظر

جماعت بناؤ۔ جیسے کہ جوس نکالو مٹھانی بھادو کی دل آزاری تو نہ کرو۔ مثلاً منصور نے بیوی کی حمایت میں کہا۔ تو سہیل ہنس کر بولے۔

”اوکے چیف۔“ آپ کے گراں بہا مشورے پر یہ عاجز جلد ہی عمل درآمد کرے گا۔ اصل میں سہیل کو کبھی یہ احساس ہو چکا تھا کہ انھوں نے ذات کو مل

دے کر کتنی ہی بھادو کو آزدہ کر دیا ہے۔

”پلو جی شورو۔ اور ہر گز نہ کو کرے تھاؤ اور اندسے ملو۔“ شعیب منصور نے ملازم شکور سے کہا۔ جو ان لوگوں کے پاس سے ہٹ کر کچھ ناسے

پر جا کر اٹھا تھا۔

”شوہر کا بیوی کی حمایت میں ہوتا دیکھ کر زینت کا بچہ ہوا موڈ قدرے بھال ہو گیا تھا اور یہ موقع بھی کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار

نہیں کر کے بغیر شکو ایک دوسرے ملازم کے ساتھ آ کر کھائے لگا۔ تو پھلوں کے کوپر رکھا ہوا پھول کا دونا ڈالنا، کھانے کی غرض سے جو ہی

وہ آگے بڑھیں۔ اسخند نے جھک کر ان سے ہاتھ کی دہ دونا اٹھا لیا۔

”اے نہیں سہیل سہیل تم اسے لے کر چھوٹے ہوئے کیا اچھے لگوئے۔ لاؤ یہ کچھ دے دو۔ زینت بولیں۔

”نہیں مہی۔ آپ کچھ شایان شان نہیں ہوگا کہ دونا اٹھیں لے کر چھوٹے۔ اسے تو لیس میرے ہی پاس رہنے دیکھئے۔ بیش کی اس بات پر تو

ماں کے دل میں ہراساں ہوا غبار بھی صرت اور غر کے حساس میں نہیں مل کر کھجک سے اڑ گیا۔

”بھائی جان! بھان سے اگر آپ کبھی خفی کا یہی عالم رہا تو یہ ساری بدشتیاں ابھی ابھی بھادو ان کا۔“ سہیل منصور نے بھادو ج

کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا۔

”اے نہیں کیسی بزدلی کی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا تم سے خفا کیوں ہونے لگی۔ زینت حسب عادت ان کے بازو پر ہلکے سے ہاتھ مار

کر لہذا اصل میں تو سہیل بوجھنا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ بھول کس لیے میں لائے گئے ہیں۔ مگر بھادو ج کے بڑھان ملنے کے خیال سے محض راہ

ہموار کرنے کے انھوں نے یہ بات کہہ دی تھی۔ لیکن ان کا جواب سن کر بھی وہ بھولوں کے بارے میں استفسار نہ کر سکے۔ جیسا کہ سہیل کہ وہ

دونوں ملازم تو میرے اٹھا کر آئے تھے زینت جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ تاکہ نازش کے سامنے وہ تو میرے پیش کر سکیں۔ یوں بھی انھیں یہ

بات بہت ناگوار لگی تھی کہ نازش ان کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھیں۔ لیکن چونکہ وہ خود ہرے آئی تھیں اس لیے انھوں نے زیادہ اٹھال

نہیں بھادو ج بھی وہ اور ان کے لیے شعیب منصور اسخند کو بخیر فرمائیں۔ سہیل نے اندھی جی کی بھی اور سہیل منصور۔ بالائی

بڑھتی۔ اندر سے نازش کی موت میں بیلا دشریف میں شرکت کرنے والی خواہشیں ایک غولی کی صورت میں داخلی دوا سے پر ہوندا رہتی

جھانی کو دیکھتے ہی نازش انھیں سلام کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور ان سے ملنے لگیں۔ اور ان کی وجہ سے دوسری تمام خواہشیں کو

بھی گھٹ کر پڑا۔ زینت کسی لیے ہی موقع کی خواہاں تھیں۔ انھوں نے کسی اور کی طرف توجہ ہونے کے بجائے مڑ کر اسخند کے ہاتھ سے بھولوں

کا دونا لیا۔ اور اسے جلد بھول کر سہیل کو قریب بلائے ہوئے دونوں ہاتھوں سے مٹھنا اور گلاب میں گھسے ہاتھ لگا کر سہیل کی فوراً ہی

قریب آگئے تھے۔ زینت نے پہلے سہیل کو باور پہنایا اور پھر نازش کو۔ نازش ہلکا ہلکا ایک ایک کے اور ہاتھ کے انھیں کام کی آف دیا

سازھی۔ پہلی تو بون کی چار دی کی مالا اور کھانوں میں ڈھنگ اور مٹھوں کے جڑاؤ میں سہیل بھادو کے ہاتھ کے ساتھ اتنی خوبصورت لگتی ہی

تھیں کہ ماشاء اللہ کہہ کر زینت نے ان کا رخسار چوم لیا۔

”بھئی کیا قصور کیا ہے بھائی جان۔“ سہیل منصور ان کے آگے جھک کر بولے تو زینت مڑی طرح جھینپ کر ان کے سر پر ایک چپ

لگا دی ہوئی بولیں۔

”اے طہر نہ تو نہیں آئی۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

”بھئی میں شرم دلانے کی کیا بات ہے۔ آخر یہ بھائی کی طرح تو ہیں۔“ شعیب منصور بولے۔

”اچی ماں اور میرے بڑے بھائی ہیں۔ سہیل نے سیدھا ہو کر کہنے ہوئے کہا تو ان کے مذاق پر ایک بار پھر زینت کٹ کر رہ گئیں۔

”اے چھوٹو تو میں آپ کے مہاں کو لکھتا ہوں کہ کہہ دے ہو گئے۔“ انھوں نے نازش سے کہا تو وہ ہنسنے لگیں۔

”واہ بھائی جان! کہہ دے کہ کہہ دے ہوئے کا کہا خوب قابیہ ملا ہے آپ نے۔“ انھوں نے بھلاؤ زینت سہیل کر بولیں۔

”واہ نکالو۔“ جو کچھ نکالو یاد رکھا۔ تو اب یہ بھی میاں کا ہی ساتھ دے رہی ہیں۔ نازش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس

ہنسنی ہی رہیں۔ زینت خواہشیں کے اس غول میں سے اپنی شناساؤں سے سلام دعا کرتے تھیں۔ باقی جو چیزیں سنا تھیں ان سے نازش نے

ان کا ٹھکانہ کر لیا۔ دووں ملازم تو گھر کا بوجھ نشانوں پر اٹھاتے ہی کھڑے تھے۔ ملنے ملائے میں شاید زینت ان کو بھول گئی تھیں شعیب

منصور نے یاد دلایا تو انھوں نے نازش کو منسلک کی غرض سے باؤ واپس بلانے سے کہا۔

”بھئی بر بھائی اور بھولوں کے گوکے غم اندر کیوں نہیں ہے جاتے تو یہاں کھڑے ان کی نمائش کر دے ہو مگر غنازش ان تو بڑے جو عرف محفل بھلاہ میں شرکت کرنے آئی تھیں اور وہاں کسی کے لیے بر نزل دی نہیں شکر یہ اور کرنے میں لگ گئی تھیں بلکہ شخصت کرنے کی ہیں اس لیے بھائی کی بات سننے کے باوجود انھوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بہر حال زینت کا مقصد مل ہو گیا تھا اس لیے وہ دوبارہ کیوں چھوڑ کر نہ رہا اور بیٹے کے ساتھ اندر چلی آئیں۔ اندر وہ طویل سے کورہ پر کے آخری سرے پر ایک کشادہ سا کمرہ تھا جس میں تین بچے بیٹھے تھے اور ایک طرف بیٹھنے کی بڑی دیوار جس سے بچے کے پہلو کا بیرونی منظر صاف نظر آتا تھا۔ اور جس کے آگے ماربل آئینوں کے ستونوں والا لالچہ سا سناٹا ہوا تھا اور جسے لالچہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لالچہ میں بہت سی قیمتی اور خوشنما والے نوالے تھے اور ایک دروازہ کا ذخیرہ بنا تھا۔ اور کچھ خزانوں وہاں بھی صوفوں اور کچھ چرمی جوتی تھیں۔ زینت یہاں اور بیٹے کے ساتھ اس لالچہ کی آگے آئی اور ایک طرف کے دروازے سے جو کہ ایک سوچ کا تھا۔ ناز و نیما کے ساتھ آتی نظر آئی۔ اور ماں کو دیکھتے ہی بھاگ کر ان سے مل گئی۔

”ارے غم آئیں نازو“ ماں نے اس کی پیشانی پر موم کر پوچھا۔
 ”ہیں تو دوبارہ کر رہی تھی مٹی مٹی مٹی پہلا کا بلاوا تھا نا یہ نازو نے بتایا۔“

”کمال ہے مجھے تو بتا دیا ہو نا کہ مجھے بھلا وہ میں شرکت کرنے آ رہی ہو، زینت نے کہا۔ انداز نگاہ مبر ساتھ۔
 ”مٹی میں سے سوچا کہ آپ یہاں موجود ہی ہوں گی پھر آپ کو نہ کرا کر کرا دیں گی“ اور بھئی نے جواب دیا۔ ”ماں نے دل میں سوچا کہ مجھ پر آج کل کی لڑکیاں شادی کے بعد اس قدر فکریں بدل جاتی ہیں۔ نازو نے بچے تجاہل تک نہیں کریں بھی چچی کے یہاں جاری ہوں جا یہ عالم تھا کہ وہ کوئی بات ہو مجھے بنائے بغیر اسے چھین ہی نہ رہتا تھا۔“

”اچھا کیا احمد بھی آئے ہیں؟“ انھوں نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ احمد کا زینت نے بھلا وہ میں بھلا کیا کام تھا مٹی۔ وہ تو مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے تھے۔ اب سات کو آئی آئیں گے۔ نازو نے کہا۔ زینت کا دل تو چاہا تو یہیں کہ تم خود کیوں نہیں آؤ گے؟ اور اس وقت وہاں ڈراپ کر کے گئے ہیں مٹی سے انکار کرنے کے باوجود جو کہ انھیں دل نہیں مانا تھا اس لیے بیٹی کو اپنی شہر دوسے دی بھی مگر اب بہت نہیں پڑ رہی تھی اس سے کچھ پوچھنے کی۔

”بائے بھائی جان۔ آپ نے لڑکیاں کی صورت کو نہ سہا دیا۔ پورے ڈھیر ماہ سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ دو تین مرتبہ میں آپ کی وجہ سے گھر بھی گئی مگر آپ نے ہی نہیں رکھ دیا اس لیے آپ“ ماں سے الگ ہو کر نازو بھائی کے بازو پر بھول کر نزل کی۔ زینت آہستہ آہستہ اور لطیف سا خیال کر وہ ماں بننے والی ہے۔ بھائی کے دل میں بہن کی محبت کو وہ چند کر رہا تھا۔ اس کے شانے بہرہ مند پہلا کر رہا۔
 ”بس تمھارے ساتھ ساتھ ساتھ آیا ہوں لہجہ نہ زینت شب“

”اوہ۔ اچھا اچھا۔ پھر کب سہا رہا یہ آپ کا رُپ۔“ نازو نے بھائی کے رنگت بھرے رقبے سے حوصلہ پا کر ایک بچی سا سوال کیا۔
 ”بس ٹھیک ہی رہا۔ احمد کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے تم خوش تو ہو نا؟“ اسفند نے سر سے اسے انداز میں اس کی بات کا جواب دے کر پوچھا۔

”بہت خوش ہوں بھائی جان۔ احمد اپنی ذات سے تو بہت اچھے ہیں۔ نازو نے مسرور ہوجو میں بتایا۔
 ”بس یہی ہونا چاہیے۔ اسفند بولا تو اس خیال سے کہ کہیں کو نازو اپنی سسرال والوں کے متعلق بھائی سے کچھ کہہ دے۔ زینت نے جن کے کان اس گفتگو پر سے متھے۔ نعل اندازی کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری سسرال میں سے کوئی نہیں آیا کیا؟“
 ”نہیں۔ بس احمد کی اتنی ہی آئی ہیں اور دراز رنگ روم میں بیٹھی ہیں۔“ نازو نے بتایا۔
 ”اچھا اچھا تو آؤ چلو میرے ساتھ میں دوران سے بھی مل لوں۔“ زینت بولیں۔
 ”آپ خود چلی جائیں نا یا پھر نیلما کی کوثر کو لے جائیں۔ میں ذرا ایسے بھائی جان سے تھوڑی سی باتیں تو کر لوں۔ پورے پانچ بیسے بند ملاقات ہوئی ہے ان سے“ نازو نے جواب میں کہا۔ تو زینت اکیلے ہی اس کی ساس سے ملنے چل دیں۔

”باب کو بھول گئی ہو کیا جو صرف بھائی سے ہی باتیں کئے جاؤ گی؟“ شعیب منصور نے جو بھی کسی سے بات کرنے کے لیے رک گئے تھے۔ پیچھے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا وہ پلٹ کر ان سے لپٹ گئی اور ان کا حال احوال پوچھنے لگی۔ من میں وہ احمد کی چچا زاد بہن کی شادی میں پورے ایک ماہ لاجور رہ کر گزشتہ شب آئی تھی اور اب سے بھی نہیں مل سکی تھی جب کہ ماں سے تو آتے ہی فون پر۔ بات ہو گئی تھی۔ وہ شعیب منصور سے باتیں کرنے لگی تو اسفند نے نیلما سے پوچھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔
 ”یہ تو کہاں غائب ہے گڑیا؟“ وہ بہت لالچہ میں لگا کر گڑیا سی کہتا تھا۔

ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔

”معلوم ہے باتوں ہی باتوں میں ساڑھے سات بج گئے ہیں اماں جان۔ کیا آپ باہر نہیں چلیں گی۔“ اُس نے دیر وار پر آدیں لگ کر مڑی دیکھ کر کہا۔

”نہیں۔“ ایکس پارٹی سے۔ میں باہر جا کر کیا کروں گی۔ میں تو اب وضو کر کے عشا کی نماز پڑھوں گی۔ وقت بونہی ہے البتہ تم ضرور چلے جاؤ ورنہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہاری دھندل یا بج جائے گی۔“ سلمیٰ بیگم نے کہا تو اس نے ”اچھا“ بھرا بعد کہا۔

”میرے خیال میں تو نماز پڑھنے سے پہلے آپ کھانا کھا لیں۔ یوں بھی آپ برشام ہی کھانے کی عادی ہیں۔“ نہیں تھپے۔ سہ پہر کو جانے کے ساتھ منہ جھٹال لیا تھا۔ اس پر سوپ لی لیا۔ ابھی تک سینے پر رکھا ہوا ہے ہر کچھ۔ سلمیٰ بیگم آگے سر کر جوتی میں پیر ڈالتے ہوئے بولیں تو پھر دو چپ چاپ اُن کے کمرے سے نکل آیا۔

لیکن ابھی خواب گاہ کے آخری بیڑھی پر آیا تھا کہ اپنا ڈبل پاٹ کا کادمانی کی بھڑا پڑا آسمانی رنگ کا دروازہ کھٹک کھٹک لگتا تھا۔ اس کی دھندل سے کئی گھنٹوں کی طرف بڑھی تو اس پر نظر پڑنے لگی ”وہ“ اُن کی آواز کے ساتھ تین چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ جو اس کی تلاش میں سلمیٰ بیگم کے کمرے میں آیا تھا اور اسے نہ پا کر بھٹکا بھٹکا سادل لیے باہر نکلا تھا اسے اچانک بڑی خوشی سے بے قابو ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ قدرے تھیکے لہجے میں بولا۔

”اب اس قدر بھی ہیبت ناک اور دشتناک نہیں ہوں کہ آپ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوئے مجھے ”مگر وہ“ بڑی طرح ڈر گئی اور خوف سے اچھلنے دل کو تھوڑی دیر میں کوشش تھی۔ اس سے جواب میں کچھ کہا بھی نہ جا سکا بلکہ ہانپے ہوئے ہنگامہ خیز انداز میں آوازوں میں بھیجے ہیں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ بھی سر سے پیر تک کچھ دیر اس پر نظر پڑتا رہا۔ کر دیکھتا رہا۔ آسمانی رنگ کے تنگ جامد سوٹر سفید رنگیوں کا ہلکا سا آرٹیفیشل سیٹ پہنے۔ ہلکا ہلکا میک اپ کی پانے پورے وجود کے ساتھ آنکھوں کی راہ وہ آئینے میں دل میں اترتی لگی۔

”بہت ترپا پیا ہے آپ نے مجھے بوسے تو ڈیڑھ ماہ۔ ایک تو اپنا تصور میرے ساتھ کر دیا اور خود مزے سے یہاں بوجھ کر رہیں۔ بتائیے کیا سزاؤں میں اس کی آپ کو۔“ وہ وہیں کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں میں ایک وارفتہ سی چمک لیے بولا۔

وہ خود بھی تو اس کے جانے سے کسی ”اُس“ اور ”اُس“ سے بے گنج تھی۔

کتنی ہی بار اس کے دل نے چل چل کر کٹنا کی تھی کراٹھ وہ دایں لوٹ آئے تاکہ ایک بار چپکے سے ہی آئے دیکھ لے کہ وہ بھی آئے کتنا اچھا اور پناہ ایسا سا لگنے لگا تھا۔ شاید اسی ذلے اس قدر غریب ہو گیا تھا جس روز آنکھوں سے پٹی مٹا کر اس نے نہانے غیض کے عالم میں پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

اور آج وہ اس کے اتنے قریب کھڑا اس سے کیا پوچھ رہا تھا؟

اس کی آنکھوں میں یہ کسی ہوشیار چمک تھی؟

مگر وہ نے سلو جیسی ٹھوس طبیعت کی لڑکی کو میری طرح ایڑی گرفت میں لے لیا۔

بس ابھی کمرہ لکھن میں سے کوئی ایک لمحہ اُسے دکھائی دینے والا تھا کہ غلغلے میں سے آخ آج کی آواز آئی دشاہ سلمیٰ بیگم کھٹک کر گل صاف کر رہی تھیں۔

تو وہ بول چہ جیسے بند لکھن سے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے کسی شور شرابے یا دھمک سے یکدم انسان کی آواز کھل جاتی ہے اور آنکھ کھلتی ہے وہ ہمدردانہ فحش براب کی طرح خیالات کی سرکش لہروں میں کہیں رن مل جاتا ہے۔

آنکھ کھل گئی تھی تو نزاکت کا احساس یک دم ہی جاگ اٹھا تھا۔

”مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں اسفند صاحب۔ پلے آپ یہاں سے پلے جائیں۔ اگر اماں جان نے دیکھ لیا تو یہ آپ کے لیے نہ ہی لیکن میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ زبان سے تنگ باری اور چہرے سے جذبات کی پہلی پھوار۔

اور ابھی ابھی اس کی آنکھوں میں بھی تو وہ ہمدردانہ فحش براب کی تصویر تھی کہ نہ والے سارے عکس دیکھ چکا تھا۔ پھر اس زبان پر کیے یقین کر لیتا جو نرا کون اور احتیاط کی زنجیر ولس جلدی ہوتی تھی۔ اور پھر چپکے کھ کراٹھ کرتے ہوئے کار ہی اس کی انگشتان

پڑا کہ وہ اس سے چپکے کے بال گئی ہوئی ہے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسپید کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر کسی طرح اس تک پہنچ جائے۔ اسی وجہ سے تو وہ اس قدر کم حکم سا نظر آ رہا تھا۔

پانچ ماہ کے مابین جو باتیں ہوئی تھیں اسی انبساط اور اشتیاق میں وہ بھی ڈھنگ سے نہ من سکا تھا۔ اس پر مستزاد ماں کے ہاں سر جی کا کافی دیر تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا۔ اس پر وہ کہہ رہی تھی کہ چلے جاؤ۔

چپکے کے ہاں سر جی کا کافی دیر تک انتظار کی سولی پر لٹکا رہا۔ اس پر وہ کہہ رہی تھی کہ چلے جاؤ۔

مگر کبھی اس کا دل سے جاتا وہ؟

جب کبھی تو جا رہا تھا کہ اسے کھینچ کر کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں کسی کے آنے کا احتمال ہو نہ دیکھ لیے جانے کا دھڑکا۔

دل میں یہ لگن تھی اور لٹکا ہوں میں وہی وارفتہ سی چمک۔

جوتی کے نرا کٹوں اور اندیشوں بلکہ رسوائی کے احساس سے متغیر ہوتے چہرے پر جی تھیں۔ وہ خود بھی تو اپنے جذبے کی تشبیہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اماں جان جیسی نوں رفیق سہمزد اور ہر از سہمی کے سامنے بھی نہیں۔

”جیک ہے چلا تو جاتا ہوں مگر صرف ایک شرط پر“ اس کی آنکھوں کی وارفتہ سی چمک کچھ ہوا ہو گئی۔ سگڑاس کی نگاہیں تو غلغلے کے دروازے پر لگی تھیں۔

”تک۔ کبھی شرط؟“ اس نے بدستور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بشرطیکہ ایمان داری سے کام لیں گی۔“ اس نے یہ کہہ کر گریا اس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ کیا۔

”اچھا اچھا آپ بتائیے تو سہی۔ میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔“ اندر غلغلے میں پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے مدبھی بھنی آواز میں کہا۔

”اچھا صرف اتنا بتائیے کہ میں آپ کو کیا لگتا ہوں لیکن پوری صداقت کے ساتھ۔“

اس سوال پر اتنی سرامیکی کے عالم میں بھی اس کے ہنسنے کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گر رہا۔

”بہت اچھے۔ بے حد ڈینٹ۔“ اس نے بہت سی آواز میں کہا۔ یوں بھی سلمیٰ بیگم کے غلغلے سے براہِ مدد ہونے کا کسی لمحے بھی امکان تھا۔ اسی نڈھ سے پیش نظر بلا سوچے سمجھے وہ اس کی ہر شرط ماننے پر تیار ہو گئی تھی۔

”بھی یہ بہت اچھے۔ بے حد ڈینٹ سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ اچھے اور ڈینٹ تو ڈیڑی اور چھوٹے اکا بھی ہوں گے آپ کی نظر میں۔ اب اپنے سوال کی وفات کرنے بیٹھوں کا تو پھر ترقیقینا اماں جان باہر آ جائیں گی؟ اس نے جڑ کر اسے

اماں جان کا ڈراؤ اور درج کی نظر پر بار غلغلے کے ہمبند لڑی ہوئی تھیں۔ اس نے اندر کا لاک کھٹکے کی آواز بھی سن لی تھی۔ انتہائی غمگین۔ گھر بٹھ اور بے چارگی کی ملی کیفیت میں بولی۔

”وہ۔ وہ۔ فور کوڈمیک۔ اسفند صاحب آپ پلے چلے جائیں۔ میں اس وقت کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”نہیں۔ میں اپنے سوال کا جواب لیے بغیر تو جاؤں گا نہیں۔ خواہ اماں جان کے علاوہ بھی کوئی یہاں آ جائے۔“ وہ اس کی بجا پکی سے فائدہ اٹھا کر بٹھیلے سے لیے میں بولا۔ مگر آواز اس کی دھیمی ہی تھی۔

”اچھا۔ اچھا۔ یو آر ویری ڈیر لوی۔“ اسی تو سُر اب آں کوڈ۔ (میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ مجھے بہت ہی ہمارے ہیں) یہ ان کے ہرگز نہ یہ وہ عزیز؟ اس نے اعتراف بھی کیا تو جیسے گن بوائٹ پر کھڑے ہو کر اس کے دل کے بھی پورے یقین کے ساتھ یہ تم نہیں کیا۔ نہ مکرے کے داخل دروازے کی طرف کھسک کر بولا۔

”وہ“ کھینچ کر فورڈ اپلینٹ لیکن اس قدر عزیز ہوں تو آج ڈرنے کے بعد موقع فراہم کر کے مجھ سے علیحدگی میں ضرور ملیں گی آپ سمجھیں۔“ اف غلغلے کے دروازے کا مینڈل کھٹک لگا تھا۔ اس کی جان جیسے سولی پر لٹک کر رہ گئی۔

”باب دل سمجھو۔“ بلکہ وہ نہ کرتی ہوں بعد اب تو چلے جائیے۔ وہ رونے کے سے انداز میں بولی تب کہیں جا کر وہ ملتا اور بھی غلغلے کا۔ دروازہ کھول کر سلمیٰ بیگم نے کبے میں قدم رکھا۔

وہ اس کے جاتے ہی جلدی سے دروازے کے پاس کھٹ کر جس غمگین میں اُن کے بستر تک آئی تھی۔

حواس باختہ سی۔ بیٹے سے ترقیقینا کی اور پریشان سی رنگ آڑی صورت لیے لو کھڑے انداز اور ڈرنگ کے قدموں کے ساتھ سلمیٰ بیگم کی جہان نیدہ نظر سے اس کی یہ آنکھ پھیل سی کیفیت چھپی نہ رہ سکی کچھ دیر تک غلغلے کے دروازے کے آگے ساکت سی رہنے کے انہوں نے پوچھا۔

”کیوں خیر تو بے سلاطہ!“ ان کے لمحے میں توشیح نہیں ٹھنک سکی تھی جسے وہ اپنی حالت کے پیش نظر محسوس نہ کر سکی۔
 ”وہ اس آماں جان۔ نہ معلوم کیوں ایک دم ہی تھکن کا احساس ہونے لگا۔ اس لیے یہاں آگئی۔ آج کل میں بھی ہرگز
 پڑ رہی ہے۔ وہ ان کے بستر پر یک کران کی نظروں سے اپنی تنہا سی کیفیت چھپانے کی غرض سے چہرہ دا بچا کر کے دوپٹے کے
 آچل سے اپنی گردن کو ہوا دینے لگی۔ حالانکہ جیت کا پکھلافل اسپینڈ سے چل رہا تھا۔ سلمیٰ میگم دوسرے کو نے میں لگی نہ
 کی چونکہ اس طرف بڑھنے کے بجائے اس کے قریب آگئیں۔

”مگر تم کس سے باتیں کر رہی تھیں؟ اب اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے لاکھ چھپانے اور احتیاط کرنے کے باوجود
 وہ اسفند کی ایک جھلک دیکھ چکی تھیں۔ اس نے اپنی دانست میں ان کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”کب کسی سے بھی نہیں آماں جان۔ وہ تو میں خود جل کر گرمی کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ سلمیٰ میگم چند ثانیے ہی پہلے
 اور گردن کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ کیونکہ آچل سے گردن اور چہرے کو ہوا دیتے ہاتھ ان کے اس سوال پر
 خود بخود درگ گئے تھے اور چہرہ بھی ان کی طرف مڑ گیا تھا۔ مگر ان کے دیکھنے کے انداز پر اس نے پھر چہرہ اونچا کر کے گویا پھینک
 ہوا سے لطف اٹھانا شروع کر دیا۔ سلمیٰ میگم غلطی سے گھوم کر ناز کی چونکی کی طرف بڑھ گئیں۔
 ”چھوٹی دہن نے تمہیں کتنا بھیجے کیا تھا کہ تم مائیں ہی نہیں۔ بھلا آنا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی جو تھک کر چہرہ
 خیر حضور ہی دیر کے لیے میرے بستر پر لیٹ کر سستا لو۔ تھکن خود بخود دور ہو جائے گی۔ سلمیٰ میگم نے چونکی پر بھی جانا پڑا
 ہوئے کہا۔ مگر ان کا جوابی خالی سا تھا۔

”جی اچھا آماں جان،“ سلاطہ نہایت تابعداری سے بولی اور میڈ کی پائنتی کی طرف آڑی ہر کر لیٹ گئی۔

اسفند نے کیا کیا تھا اور اس نے کیا جواب دیا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کو سامن خطا ہو گئے تھے۔

اب تک اپنے منتشر سے حواسوں کو یکجا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

مگر تھوڑی دیر۔ آکھیں بند کرنے سے تھوڑا سا ذہنی سکون نصیب ہوا تو ہر بات یاد آگئی۔

”اف کس قدر تھم و حرم اور غیر محتاط سا انسان ہے یہ اسفند بھی کہ دوسرے کی عزت کا کبھی خیال نہیں یوں گی

خواہ خواہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ گویا زبردستی کا سودا ہوا ہے۔ تو۔ ورنہ میں تو۔ میں تو۔

”میں نہیں نہیں، میں غلط بانی سے کبھی کام نہیں لوں گی اسفند۔ میں واقعی تمہیں دل سے پسند کرتی ہوں۔ مگر میری اپنی منہ
 اپنی خوشی کی بات ہے۔ بلکہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم بہت عام سی بات بھی ہے کیونکہ عام طور پر لوگ ایک دوسرے کو پسند کرنا
 ہی ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یعنی ماں، باپ، چچا، بہن بھائی، بہن بیٹا اور خالہ وغیرہ۔ یہ
 رشتے رشتے داری ہوتے ہوئے بھی آپس کی پسندیدگی کے بل بوتے پر ہی استوار ہوتے ہیں اور کس قدر پاکیزہ اور قدس بن
 جاتے ہیں۔ مگر اپنی اور تمہاری پسندیدگی کو کیا نام دوں اسفند۔ تم نے مجھ سے اعتراف بھی کرایا تو بھلا کس طرح کہ میری منہ
 نہیں مجبوری کو ڈھال بنا کر۔ اب تم اس انتظار میں آئیں گی کہ میں اسی مجبوری کی حالت میں کیا اپنا وعدہ بھال
 گی۔ تم نے ڈنر کے بعد کسی عیانیہ گوشے میں ملوں گی۔

تو میرے نادان پرستار میں مگر کبھی ایسا نہیں کروں گی۔

کیونکہ تمہاری آنکھیں تو تمہارے جنونی جذبے نے پٹ کر رکھی ہیں اور عقل ناکارہ۔ لیکن میری عقل کی آنکھیں یہ نہ

بینا سے بھی تیز ہیں۔

اور پھر حقیقی زندگی کا ایک لہو لہان کر دینے والا اتحاد زار ہے۔

کوئی غمی یا افسانوی پوچھن نہیں کہ ہر دو ایک شہر میں ہے اور بیرون کسی دوسرے شہر میں۔ رات کا پہر ہے۔ سلاطہ

موج خواب ہے۔

ادھر سے ہر دو صاحب کوئی فراقی گیت شروع کرتے ہیں تو دوسرے شہر سے کوسوں دور بیٹھی بیرون جوانی کا ردائی
 مصروف ہو جاتی ہیں۔ پس منظر میں کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا میز پر کبھی بٹنا ہے۔ پھر بھی محفلے والوں کی بات تو دوسرے
 گھر والوں کے کانوں پر چونک نہیں رہی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے طبعی نہیں سب ابدی نیند سو رہے ہوں۔ اور ہاں۔ وہ۔

کی تارکیوں میں عاشق و معشوق کا چھپ چھپ کر ملنا۔
 اور بارکوں اور سڑکوں پر لہک لہک کر بلکہ گلا جھڑک کر ہونے کا نا، ناچنا اور تھکنا۔
 تو کبھی کبھی ایسی ہی غیر حقیقی اور غیر معقول باتوں کے مجھ سے متوقع ہوں۔ ہر دو وار محمد اسفند۔
 اس قہقہے میں اس نے کہا کہ میں درد کے جیسے صبر کو بھوکے کرتے خود بھی صبر کا ایک حصہ ایک جڑ بن چکی ہوں۔

آہستہ آہستہ مجسم بدلے ہوں۔
 میں کسی کیسی آذیتوں سے گزر کر تلخ حقیقتوں کے پل صراط کو کس قدر جی جان سے کمر باندھ کر اپنے فکاہیہ پیروں سے عبور کرنا چاہ

رہی ہوں۔
 میرے پائے ثبات میں جنبش آگئی تو دو ٹکڑوں میں بٹ کر اتنی گہرائیوں میں جا کر ان کی کھیل کھیل ہر کرہ جاؤں گی پھر

کچھ باقی نہیں بچے گا میری وصول بھی نہیں۔

نہیں نہیں اسفند۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

مجھ سے ایسی آئینیں اور توقعات وابستہ نہ کرو مجھے کہیں کا نہ رکھیں۔ میں بہت ہی دکھی ہوں۔ بے حذر غرہ اور فگار ہوں۔

تم خدا مجھ سے اپنی محبت واپس لے لو۔

خیالات کی رويں جالے کہاں بہنکی تھی وہ۔

بند آئینوں کے باوجود اشکوں کا ریل پیلوں کی رکاوٹیں تو ڈر کر بہن نکلا تھا مگر اسے روکنا تو گجا پونچھے کا خیال بھی نہ آیا۔

بس یوں ہی میڈ کی پائنتی آڑی میڈ بے دریغ یہ حزن و دلاں کے موتی لٹا رہی۔

جانے کب تک اور کتنی دیر۔

سلمیٰ میگم نے زامی نماز اور دعا سے فارغ ہوئیں تو آٹھ کر اس کے جاگ جانے کے خیال سے بہت آڑگی اور احتیاط سے بیڈ

پر بیٹھیں تو بیڈ میں لمبی سی لرزش پیدا ہونے کی وجہ سے اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور

سلمیٰ میگم کو بیٹھا دیکھ کر جلدی سے خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اوہو میں تو تمہارے خیال سے کہ تمہاری نیند ٹوٹ نہ جائے احتیاط سے بیٹھی تھی مگر پھر بھی تم؟“

”نہیں۔ میں سوئی تو نہیں تھی، آماں جان۔ بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔“ وہ ان کی بات کا ٹکڑ کر دی۔

”عام طور پر تو شام کی نمازیں گیارہ گھنٹیں ہی پڑھی جاتی ہیں مگر میں بند رہتی ہوں۔ اور دو گھنٹیں تجھ پر وضو ان کے علاوہ
 پھر دیکھ اور اس کے بعد دعا پڑھنا، دیکھنے اور دعا کا دورانیہ کم و بیش سو گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اور اس دوران میں بھی تم نہیں سو سکتیں۔
 معلوم بھی ہے اس وقت فوج رہے ہیں۔ تو سلمیٰ میگم نے خفت سی مسکراہٹ کے ساتھ عجیب سے انداز میں اسے وقت کا
 احساس دلایا تو اس نے چونک کر دیوار پر آویزاں نام و احوال کی طرف دیکھا۔ واقعی فوج رہے تھے۔

”افو! واقعی کافی ناگم کر گیا آماں جان۔“ اس نے تھیرے انداز میں کہا۔

”ہاں اور اب تو تمہاری تھکن بھی دور ہو گئی ہوگی۔ جاؤ اب باہر چلی جاؤ۔ ورنہ چھوٹی دہن کیا سوچیں گی بھلا کہ تم وقت

کے وقت کہاں غائب ہو گئیں۔“ سلمیٰ میگم نے کہا تو وہ بے دلی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

”نہیں آماں جان۔ اب جانے سے کیا فائدہ۔ ڈنر کو کب کا ختم ہو چکا ہوگا۔ ویسے بھی میری بہت نہیں ہو رہی کہیں جانے کی؟
 تو اس نے بہت کا لفظ کسی خاص وجہ سے نہیں بلکہ سلمیٰ کے اظہار کے طور پر استعمال کیا تھا کہ سلمیٰ میگم نے اس کا کچھ اور ہی

مطلب لیا۔

”ارے بیٹی، بہت تو کبھی ہار لی ہی نہیں چاہیے۔ خواہ انسان پر کیسے سے کسب کا وقت ہی کیوں نہ پڑ جائے کیونکہ وقت
 تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی گرم اور کبھی نرم۔ ایک سا تو کبھی رہتا ہی نہیں۔ گویا یہ بھی زندگی کا ایک دائرہ کار ہے
 یہ وقت کا اچھا اور برا ہونا سلمیٰ میگم نے بہت بندھانے کے انداز میں کہا۔

”لیکن آماں جان۔ میری توشیح پیدائش ہی میری ساعیوں میں ہوئی ہے۔ یوں بھی میرا ستارہ زحل سے اور زحل تو عام
 طور پر غم کی خیال کیا جاتا ہے۔ وہ چہرہ مگر مگر ڈوبنے کے آچل میں اپنی آنکھوں کی نمی کو جذب کرتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں۔ میں بڑھے کھٹے جالوں کی باتیں نہیں بیٹی، ورنہ تو شام کی بھی کسی قسمت میں رخصت ہونے کا باعث نہیں
 بن سکتا۔ سلمیٰ میگم نے گویا اس کے خیال کی تردید کی۔

”میرے آج کے کام سے تم کو کیا ملے گا۔“

[illegible]

”مگر کیوں؟“

یہ وہ ہے جس نے اپنے لیے ایک ایسا راستہ بنایا ہے جو اس کے لیے سب سے بہتر ہے۔

”میریوں! کیا ان لوگوں کو جہ ہے؟“ گورجی نے سائید کو ٹھیک اپنی کامیابی میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ابن پسر این سری نوچه در طریمیا مریوں۔

[illegible]

"وہاں تو ایسے بہت سے لوگ تھے جو کہ ان کے پاس نہ کوئی شے تھی نہ کچھ دیکھنے کے لیے۔"

”اے میرے بھائی! تم نے خدا کی قسم کھائی ہے کہ تم نے اس شخص کو قتل نہیں کیا۔“

”کسب و کار سے روٹی کھانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ انسان کو خدا کی رضا حاصل کرنے کی سہولت ملے۔“

”آف تو کہا کوثر نے کسی تار لہا سے ماہر خود اسفند نے اُسے تہا سے۔“ اُس نے دل کر دل میں سو جا اور نظارہ لاڑائی

”مگر کوئی ایسی بری بات تو نہیں۔ اگر تمہارے منہ سے غلطی سے بھائی جان نکل گیا تو۔“

کوٹڑبھی ایک چالاک بھی اسی نے فوراً ہی اس کی چوری پکڑ لی۔

بہو کیا: اس کے گھول تھکے ہوئے تھا۔

اگر کسی بی بی کی شکایتیں کو دس میں جلد نہ دو کوڑے ہو اس بات سے ہی دہائی میں سے م سے پہلے دی۔ اس کا دس

”میں نے اپنے دل سے اس کا نام نہ لیا تھا۔“

”اگر مانتہ نہ کریں تو ایک سات بوجھ اور سب سے زیادہ“

س نے لایروائی کا اظہار کیا۔

1888

”کوئی بات یہ ہے کہ کچھ اور ہی سمجھتے ہیں: کہ اس کا جواب منگھڑ سا تھا اور اس کے بلے نہ پڑا تھا۔“

آپ کو جو کچھ بھی سمجھتے ہیں آئی کیمن فیلڈ بٹ کانٹ ایکسپلین ایٹ دو دیں جسوس نوکر سکتی ہوں مگر

"اچھا کمال ہے۔" اس نے پست سی آواز میں کہا۔

”محنت کرتے ہیں تو یہ آپ یقیناً برا مان جائیں۔“ کوثر اس کے بننے پر صاف کوئی پراثر آئی تو اس کی دھڑکنیں اٹھل پھل

کی زبان افشا ہو رہی تھی پریشان ہوا تھا کچھ عجیب لوزہ تھا۔

”ہائے کیوں؟ کیا جیج آپ نے مانند کیا ہے؟ توڑے پوپھا

یہ بات بوم کے بدن بی بدن میں اسی اس کی سے چھوڑی ہے اب بے قرار ہیں ہمارے

کہ کہیں کوئی گھر اسے نہ ملے۔ اس کے نتیجے میں محمد سہیل نے کہا کہ تو اپنے مری حوصلے کی اور سہارا اگر نہیں دے گا تو میں

ما تم اے قبول کر لو گی؟

سہ تھا کہ ایک اتنی سی بات کے اتنے سنگین نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ تو سچ ہے یہ خوشخبری سیلو فور اور نیل کو بھی سنانے

ان کو سلوٹ لے جس قدر سیریں لیا تھا وہ کچھ کبیر اسی اٹھی تھی۔ پھر بھی نازش جیسی ذمہ دار اور فرض شناس ماں کی —

کے اندر رہ کر پروان چڑھایا تھا۔ باپ بھی ————— مریضوں کو سہولت دے گا

"اوپر محمد بنی ممانہ تھے کہ تنہا جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب ان کے اہل خانہ کو دے دیں۔"

پ کے سامنے بھی نہیں

یہ کہانی جس کو فیکٹس سے وعدہ کرتا ہے تو وعدہ کرنے والے کا ہاتھ اس وقت خدا کے ہاتھ میں رہتا ہے، بعد

ہوتا تو کٹر قد سے جذباتی انداز میں بولی تو سلوط نے خوش ہو کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔
 ”تم واقعی بہت ہی اچھی ہو۔ بڑی ہی پیاری۔ آخر ہونا بھابی دہن کی بیٹی“
 تو کو کٹر خوش ہو کر بولی۔

”اور آپ بھی تو کتنی اچھی اور پیاری ہیں سلوط آیا۔ سچ آئی لوگو۔ آئی اڈور یو وری مج۔“
 ”ایڈمی ٹو“ سلوط نے منہ سے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر کو کٹر کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ نیچے چلی آئی۔

دن کے دیگر لمحے کا عمل تھا۔

شعیب منصور غلات دستور آج گھر میں ہی نظر آ رہے تھے۔
 دن کا کھانا بھی انہوں نے گھر میں ہی کھایا تھا۔ اور اس وقت اپنی خواہگاہ میں بیدار بیٹھے بریف کیس کو ملے اس میں رکھے چند کام کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ زینت بھی خواب گاہ میں موجود تھیں اور ایک چوکور اپنی میز پر کئے سوٹ کیس میں اپنی الماری کے ہینگر پر پتی ہوئی رازھیوں کا انتخاب کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے شہرت اور انبساط اور حضورا حضورا جذباتی پن سا بھلاک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی شاید اسی کیفیت کے زیر اثر تھے جو وہ بسے جاؤںے سوٹ کیس میں اپنی ساڑھیاں جمادی تھیں۔
 وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر آئی تھیں۔ شوہر نے ہی کاغذات کا مطالعہ کرنے میں غرق ہو گئے تھے۔ اور وہ اپنے بچوں کی پکیگ میں۔ وہ حضورا دیر تو نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتی رہیں پھر جب انبساط کی کیفیت موم سے نکال کر نکلتی تھی تو وہ خود کلامی کے سے انداز میں قد سے اوجھل آواز میں بولیں۔

”واہ میرے مولا! صدقے جانوں تیرے کہتے ہیں بڑی سادت کا تو مجھے شرف بخش رہے۔ ورنہ میں کس قابل تھی اور مجھے تو افسوس ان کی نصیحوں پر ہوتا ہے جو ذرا سی بات پر بھاگے بھاگے امر بکھر چلے جاتے ہیں۔ یورپ کی سیر کرتے ہیں اور لاکھوں روپے فضول باؤل منہ صلیغ کر دیتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کی زیارت ہی کر آئے۔ جب کہ یہاں تو ہمیشہ سے بھی خواہش رہی کہ کہیں جاؤں یا نہ جاؤں مگر طبع کی خاکہ ضرور چاٹ آؤں۔ تو دیکھو میرے مولا کا کم کر اس نے میری یہ خواہش ہی پوری کر دی۔“

اپنی بات کو کراہ کر کرتے کرتے زینت نے شوہر پر ایک نظر ڈالی۔ مگر وہ کاغذات کے مطالعے میں کبیراں درجہ متفرق تھے کہ انہوں نے کوئی کی بات سنی ہی نہیں۔ آخر کچھ دیر مزید انتظار کر کے زینت نے سوٹ کیس کا ڈھکنا بند کر کے ہوتے براہ راست انہیں مناسط کید۔
 ”آپ نے کیا سامان جبکہ بھی کر لیا ہے؟ ورنہ بعد میں یہ کہیں کہ تم نے فلاں چیز تو کبھی ہی نہیں۔“
 ”اکیں۔ ہاں ہاں۔ جبکہ بھی کروں گا۔ آخر خاشی جلدی کیلے۔“ شعیب منصور نے کاغذات پر نظر میں مرکوز کیے کہا۔
 ”جیسے جلدی کیوں نہیں۔ رات کی فلائیٹ سے تو جارتے ہیں ہم۔“ زینت بولیں۔

”ہیں یہوں ہوں۔ رات کی فلائٹ سے بس دوران کاغذات پر نظر پڑا ہی کروں ہر ایک ہی کروں گا۔“
 ”اؤہ، ایجنسی بیک نہیں چیک۔ سلمان تو کب کا چیک کر چکی ہوں میں۔“ زینت غور کی غیر حاضر دماغی پرچہ کر رہی تھی۔
 ”اوہو، جیسی سب کچھ نہیں دیکھا جائے گا۔ یہ بہت ضروری فلک آفیشل قسم کے کاغذات تو چیک کروں۔“ شعیب نے ہنسی سے ہنس کر بار بار محل ہونے پر قہقہے ہنسنے شروع کیے۔ تو زینت نے زبردستی ہنسنے کو روک دیا اور اپنا سوسٹیکس کھول کر ہنسنے لگی۔
 مبادا ضرورت کی کوئی چیز رکھنا بھول گئی ہوں۔

اصل میں مات کی فلائٹ سے شعیب منصور اپنے کسی بزنس فورمیل ایسٹ کے دورے پر جا رہے تھے۔
 ان کا پروگرام بندھے آگے جانے کا بھی تھا، اور وہ دو تین روزہ رائل میں ہی قیام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور چونکہ زندگی میں پہلی بار انہیں مشرق وسطیٰ جانے کا اتفاق ہوا تھا اور چونکہ تہہ اور ماضی جانے کا بھی پروگرام تھا، اس لیے شعیب منصور بہت اشد تشریف کی زیارت کرنے کے ساتھ ساتھ عمو اور اکرے کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ اور ان کے اسی ارادے سے باخبر ہو کر زینت بھی ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ شعیب منصور بھی کی طرف سے یہی کوہنیں نہیں لے گئے تھے۔ مگر تین سال قبل ہائیک کا کالج اور ہائیک کے نوڈر کے گئے تو یہی کوہنیں ساتھ لے گیا تھا۔ ورنہ خود تو بار بار جان اور یورپ کے دورے پر جا چکے تھے۔ پھر اس لیے بھی اور کچھ بڑی عمر کے اکرے کے اہتمامی شوق کے پیش نظر وہ۔۔۔ یہی کوہنیں ساتھ لے جا رہے تھے۔ مال عمو اور اکرے جاری تھیں تو نیو نوڈر کی شوقی ہوا اور وہ بھی ان کے ساتھ جانے کی ضرورت تھی تو ہوا زینت کو اسے بھی لینے ساتھ لے جاتا تھا۔
 ضرورت کی استعمالی اشیا، سوٹ گیس میں رکھنے کے بعد اسے زینت نے الماری کچن بند کی اور چابیاں الماری میں ہی لٹکی چھوڑ کر بریڈر پر بائیس کی طرف آ گئیں۔
 شعیب منصور بدستور کاغذات کے مطالعے میں مصروف تھے۔

اصل میں جگہ کی ہی ایک شپنگ کمپنی میں باجی اشراک پر مال بردار جہازوں پر دونوں طرف سے مال لدوانے کی یہ کوئی بہت اعلیٰ پائے کی اسکیم تھی جس کے سلسلے میں معاملات طے کرنے وہ خود جا رہے تھے۔ یعنی زینت کو بھی معلوم تھا کہ ان کے اس قدر نامہا کی کو ذہنیت اور سمیت کیا ہے۔ اس لیے انہوں نے مزید کوئی بات کر کے انہیں دوطرف کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اسی بات پر غور کر رہی تھی کہ کون کوئی چیز اس ساتھ لے جاتی ہیں۔ یوں تو انہوں نے کئی سو سمیت ضرورت کی بہت سی چیزیں رکھ لی تھیں۔ یہ شاید تشریف نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ یہی سوچ رہی تھیں بلکہ اکرے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ کوئی چیز نہ لے کر کوئی بات نہیں رہے گی۔ شعیب منصور نے کاغذات کو بڑھ کر نہیں دیکھا تھا۔
 ”ہاں، تو اب بتائیے کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ وہ زیادہ تر جگہ غائب غور پر جب اچھے موڈ میں ہوتے تو انہیں آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

”اسے کہہ کر یہی جتنی ملکہ پوچھ رہی تھی کہ آپ نے اپنا سامان بھی چیک کیا، کیونکہ میں نے ضرورت کی ساری چیزیں ہی بیک کر دی ہیں۔ پھر یہی اگر ایک آدھ چیز نہ لے گئی ہو تو۔۔۔ شعیب منصور نے ان کی بات قطع کر کے کہا۔
 ”خیر، ایک آدھ چیز نہ لے گئی ہو تو ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں مگر یہ آپ نے ایک مٹی کو ساتھ لے کر دوسری کے ساتھ اس قدر نا انصافی کیوں کی ہے؟“
 ”نہیں نا انصافی کیسی۔ ایک مٹی ساتھ جاسکتی تھی تو میں نے سوچا نیو نوڈر کو ہی کیوں نہ لے جاؤں۔ نیلما ویسے بھی بڑھائی میں کڑوا ہے اور پھر اس نے نیو نوڈر کی طرح میرے ساتھ جانے کا اشتیاق بھی ظاہر نہیں کیا۔ یوں بھی اگر نیلما کو ساتھ لے جاتی تو پھر گھر پر باہر کو کبھی مینے کے لیے نہ جاتا ہی ہوتا۔“ زینت نے کہا۔

”خیر بابا کو کبھی دینے کا تو نہ کہیں۔ وہ گھر میں بکتے ہی کب ہیں۔ ان کے لیے تو یہ گھر کسی ریلوے خانے سے کم نہیں۔ رات گئے آنے ہیں۔ آتے ہی کھانا پیا سو گئے اور صبح ناخوش کر کے بالائی بالائیں دیے۔“ شعیب منصور نے لڑنے کیلئے سے ہنسنے لگا۔
 ”وہ جو کہتے ہیں ماکار انسان کسی حالت میں بھی خوش نہیں رہتا تو بوجہ ہی کہتے ہیں۔ اب بابا دان بروکٹی آوارہ گردی کرتے تو نہیں پھرستے۔ نہ فضول خندان میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ یا بنا بقدر جواب دیتے۔ صبح کو بے سہ و دہر کے دھماکے بے تک وہاں کی ذہنی نشانی ہیں۔ اور اس کے بعد اپنے بلاٹ پر چلے جاتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی بات تو نہیں کہ وہ اپنی بھلائی میں اپنا کھانا لے کر اپنے گھر آ رہے ہیں۔ زینت نے کی تائیت میں بولیں۔

”خبر بات اس قدر کی نہیں ہو رہی بلکہ نیو نوڈر کو ساتھ لے جانے کی ہو رہی ہے۔ اصل میں آپ کے کواسی کو ساتھ لے جانا ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر آپ اسے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تو مجھے خاموش ہونا پڑا۔“ شعیب منصور بڑا رگڑے سے لہجے میں بولے۔
 ”اسے ضرورت کی بھی باغیر اسے شوقی میں اس نے کی بھی۔ میں نے ہی آج کل کی رفتار رماڑ کو دیکھتے ہوئے ہی سوچا کہ جلد وہ بھی اس سادات سے مشرف ہو جائے گی۔ ورنہ آج کل تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کی پوڈ منڈر سب سے گنتی دور ہوتی جا رہی ہے۔ زینت تو ہر ایک بات پر چیک کر رہی ہیں۔“
 ”بصورت نہیں دن“ ۹۵۔ سندید تکاٹ لے

”لیکن اس دور کی ذہنی داری ہی ہو۔ ورنہ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں پھر جو دفتر داریاں عاید ہوتی تھیں ان کو تو میں شروع سے ہی پرکھتا تھا۔ زینت کو شوگر کی بات کھلی تو بہت لیکن وہ اس وقت کوئی غلطی پیدا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ہلکے سے پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں۔
 ”افوہ میں آپ کو باخود کو دفتر دارین ٹھہرا رہی ہیں تو اب کلام کی بات کہہ رہی ہوں۔ یعنی نئی پوڈ کا جو غلط رجحان پہلے سے دیکھ کر اور خدا کے فضل و کرم سے یہاں کی مٹی کے دل میں اتنا ایمان تو سب کو عمو اور اکرے کے لیے مل ہی اٹھی۔“
 ”ہاں یہی اس کا بڑا کرم ہے۔ لیکن ہر کلام وقت پر ہی کرنا مناسب ہوتا ہے۔ یوں بھی نیو نوڈر پر فخر تو نہیں عمو اور اکرے اور میں اسے ساتھ لے جانے کے حق میں اس لیے نہیں ہوں کہ بہت ممکن ہے کہ وہاں سے میرا سارا تھکنا ہٹ جائے گا۔“
 ”ہاں وہاں قیام طویل ہو جائے۔“

”اوہ۔ تو اس میں ایسی فحش کیا بات ہے۔ جو نیو نوڈر کو دلائیں یہاں بھیج دیں گے۔ اور اگر آپ مجھے پہلے ہی یہ بات بتا دیتے تو میں نیو نوڈر کو ساتھ ہی نہیں لے جاتی۔“ مگر اب تو اسے پھر زور کرنا پڑا۔ ”یہاں ساری تیاری کر رہی ہے حتیٰ کہ اب سیٹ بھی تیار ہو چکی ہے۔“ زینت نے یہ کہہ کر دل ہی دل میں کھل اٹھی تھیں کہ ان کے کیاں کا ارادہ یورپ کے بعض ممالک۔۔۔ جانے کا بھی ہے۔ انہوں نے بڑے مصالحتی سے لہجے میں کہا۔
 ”ہاں تو میں خود کب اسے پھر زور کر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں میں تو محض نیلما کے تنہا رہ جانے کے خیال سے کہہ رہا تھا۔“ شعیب منصور بولے۔
 ”لیکن نیلما تنہا کیوں رہتے تھے۔ سب سے بڑھ کر تو بابا نہیں موجود ہوں گے۔ دوسرے اماں جان اور سلوٹھی ہوں گی اور میں بابا کو مزید تکیہ کر جاؤں گی کہ بہن کا خیال رکھیں اور اسے تنہا ہی نکالیں۔“ زینت نے بولے۔
 ”آپ نے اماں جان اور سلوٹھا کو بلوانے کے بجائے نیلما کو بھی ہیل کے میاں ہی بھیج دیا ہوتا۔ وہ کہتا کہ یہی رہتے ہے۔“ شعیب منصور اس کے ارادے سے ہرے پھرتے دکھاتے ہوئے بولے۔
 ”ارے واہ تو کیا گھر کو روکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بالکل صفائی کی کرادی۔ اور پھر بابا کا مسئلہ کیسے حل ہوتا وہ کہیں اور رہنے کے عادی بھی نہیں ہیں۔ ویسے میں نے ناؤ سے بھی کہہ دیا ہے کہ دوسرے تیسرے آکر بہن کی چیزیں لے لیا کرنا۔“ زینت نے کہا اور پھر میاں کو افکار دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

”اب ماکا ہاں رہے ہیں، پھر تو انشاء اللہ جگہ پہنچ کر ہی آرام کرنے کی مہلت ملے گی۔“
 ”نہیں۔ میں اب تو سفر سوار ہو گیا ہے۔ پھر آپ اور فون میں منگواؤں جینڈر زوری کا ذکر کرتی ہیں اور ہاں زیادہ سامان لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ہی سوٹ کھیں کافی ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ روز میں جا رہی نہیں تو اس کی واپسی تو ہوتی جائے گی۔“
 ”ارے واہ، ایک سوٹ کھیں ہی تم دونوں کا سامان کو پھر سکا سکتا ہے اور پھر ایک سوٹ کھیں سے کام چلے گا۔ وہاں خاناگ بھی کوئی ہوگی۔ بلکہ میں تو حق یہی ہوں کہ وہاں سے دو تین سوٹ کھیں خرید لوں گی۔ سب سے بہت طویل ہو گئی ہے نہ انٹوں کی۔“ تو شعیب منصور اپنے اپنے ایک ڈی بیٹھ کر بولے۔

”کیسی فرمائشیں؟“
 ”سچی دوست! احباب کی فرمائشیں کسی نے موعود کی لڑیاں منگوائی ہیں کسی نے بروکڈ اور اطلس وغیرہ اور کسی نے کچر۔“ زینت نے مسکراتا ہوا کہا۔
 ”لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کے حلقہ احباب میں ہائی جنز (اعلیٰ طبقے) کے ایسے لوگ بھی خواہن شامل ہیں۔ جن کے لیے اور نیز (مندر پار) کا ہر ایسا ہوتا ہے جسے ہر کے ایک بازار سے دوسرے ملک مانا۔“ زینت نے ہنسنے لگا۔

ما فہ: آپ کو ایک ذرا سی بات کو اتنا بڑھا دیتے ہیں۔ درمید می سی بات ہے کہ ضرورت کی ناز چریں میرے سوتے ہوئے بھی انسان کو کسی کی ضرورت تو فری بی رہتی ہے اور وہاں خاص طور پر حرم شریف میں بعض ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو کہیں بھی نہیں ملیں۔ زینت نے تشریح کی گفتگو سے نچ ہو کر کہا۔

”ملیں یا رملیں اس سے کوئی غرض نہیں لیکن میں ابھی سے تم سے کہہ دیتا ہوں کہ حرم شریف سے تمہیں شاپنگ نہیں کرنی۔ ورنہ میں یہی کہوں گا کہ تم عمر کے نہیں بلکہ شاپنگ کے شوقیہ میں وہاں جا رہی ہو اور کچھ سے بھی ہی بات۔“ شعیبہ نے غصے سے اٹھ کر اپنے خاصے موڈ میں ایک دم متوجہ سا پیدا ہو گیا۔ اور ادھر زینت بھی ان کی الوام کو کسی پرکھول ہی اٹھیں کہ ان کا جذبہ مانتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے بڑے تحمل سے کام لے کر کہا۔

”خیر دلوں کا حال تو وہی اچھی طرح جانتا ہے جن کی محبت میں انہیں وہاں کبھی کبھی جلی جا رہی ہوں۔ تو پھر آپ کے سامنے صفائی پیش کرنی ہی ہے سو وہ۔ البتہ شاپنگ کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی کہ کوئی کسی دوسرے ملک میں جاتا ہے تو وہاں کی بھی کوئی چیزیں اور لوازمات وغیرہ ضرور خریدتا ہے اور یہ کوئی بڑی گناہ کی بات نہیں ہے۔ یہ رواج تو زمانہ قدیم سے ہی چلا آ رہا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ تو باقاعدہ تجارتی قافلوں کی صورت میں جا کر خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ ہاں البتہ ناجائز اور مضر تر رساں چیزیں نہیں خریدنی چاہئیں۔“

”خیر نیز اگر جائز بھی ہوں تب بھی میں اس بات کی تمہیں اجازت نہیں دوں گا کہ تم وہاں سے کچھ خریدو بوجھلا۔ یہاں تو یہ عالم کہ ہمیشہ ان لوگوں کو برا بھلا کہتا رہا ہوں جو حج جیسے تبرک اور فخر فریضے کی ادائیگی کے لیے جاتے ہیں اور ابھی میں اتنی بڑھا چریں خرید کر لاتے ہیں۔ جیسے حج پر نہیں تجارت کا مال و اسباب خریدنے گئے ہوں اور طرفہ یہ کہ یہاں لاکھوں گنی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے یہ حج پر جانے کی سادت تو نہیں ہوتی۔ بلکہ میرے کہنے کا لاگ بڑھا ہے۔ اس طرح تو حج کا ثواب اور ملو کم ہی حرم ہو کر رہ جاتی ہے۔ کم از کم میں تو یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ خود میری ٹیلی وہاں سے خریداری کرے۔“ شعیبہ نے تصور نہائی جاگڑا کرے ہوئے۔

”چلیں اگر آپ کو پسند نہیں تو پھر ہم حقہ اور ریاض وغیرہ سے شاپنگ کر لیں گے۔ اور کوئی سارا بازار دھونے کا ارادہ نہیں ہی سما کی چند چیزیں ہی خریدیں گے۔ یوں بھی خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ زینت نے شوہر کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے پھر مصلحتی دیکھ کر اختیار کیا۔

شعیبہ نے غصہ کو ایک دم ہی فون یا دوا گیا۔

”بھئی، ابھی تک آپ نے فون نہیں منکوا یا کرتا کہ یہاں کہ ایک سیٹ یہاں کسے میں رہنے دیا کریں۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر بے لاری سے کہا۔

”یہاں رکھتی ہوں تو سونا مشکل ہو جائے گا۔ خیر ابھی آجاتا ہے فون بھی۔“ زینت بھی بڑا کرک لے کر اپنے میں بولیں اور اٹھ کر سامنے دیوار کی سائڈ پر لگے انڈر کا پردہ لٹا کر فون کسے میں پہنچانے کے لیے کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فون بھی آ گیا تو شعیبہ نے غصہ میں لگن ہو گئے۔

رات کو گیارہ بجے جہاز کی روانگی تھی۔

شام ہی سے دوست احباب نے جیلے والے اور شہر دار کا کافی تعداد میں گھر پر جمع ہو گئے تھے۔ اور جو کچھ عہدہ دار کرتے جا رہے تھے اس لیے چوہوں اور شہر داروں کا ایک دھڑ سا لگ گیا تھا۔ سہیل منصور کی ٹیلی سمیت کچھ قریبی دوست معراج اور سرور شاہ انہیں پر پورٹ برسی آ کر کرنے جا رہے تھے۔ نیلا اور کوٹھنے تو سلوٹھ سے بھی اصرار کیا تھا۔ کہ وہ ان کے ساتھ اپنا پورٹ چلے لیکن اس نے سہیل کے کچھ کہنا تھا کہ اسے گند مٹی کے کے پورٹ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

اصل میں تو وہ اسفند کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی جو اس سے سخت ناراض تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ موقع ملنے کے باوجود اس رات وہ اس سے نہیں ملتی اور کچھ اس لیے کہ بہت اصرار کرنے کے باوجود سہیل بگمنا کر انش اور سہیل کی دل آزاری کے خیال سے اس کے ساتھ کھڑا نہیں آئی تھی جب کہ اصل میں تو وہ بھی چاہ رہا تھا کہ اگر امان جان نہیں تو سلوٹھ ہی اس کی ٹیلی کے ساتھ کھڑی چلے۔ مگر بھلا وہ سہیل بگم کر چھوڑ کیسے اس کے ساتھ جاتی جب کہ تنہا جانے کے خیال سے ہی وہ خوف زدہ تھی۔

وہ خفا ہو گیا تھا۔ اس لیے پورٹ کر نہیں آیا تھا۔

تو اس کے رویہ جانے کا احساس سہیل بگم کو بھی تھا۔ لیکن وہ اس کی خصلت اور مزاج سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے زیادہ پریشان نہیں کی تھی۔ یوں سہیل بگم ہی نہیں خود سلوٹھ کو بھی سہیل منصور کے یہاں رہ کر بہت سکون و آرام ملا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کی قدر بہت کی جاتی تھی۔ اس کی ایک ایک بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ گو کچھ نظر آتا ہی بہت لالہ ملی طبیعت کی واضح ہوتی تھی۔ پھر بھی اپنے مہلات اور مصروفیات میں سے وقت نکال کر کچھ وقت اس کے ساتھ ضرور گزارتی تھی۔ کوڑو کو سونگ، رائڈنگ ڈرائیونگ وغیرہ کو ٹیوٹی آتی تھی۔ اور اس نے ایک سونگ کلب میں داخلہ بھی لے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ جو جو ادارے کا فن بھی سکھ رہی تھی۔ اور ڈیوٹیوں کو کر بھی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہوم آگنٹس کالج میں بھی داخلہ لے رکھا تھا۔ یعنی وہ کمال میں چھائی حد تک ہی باصوف غیر فضا میں سرگرمیوں میں گزارتا تھا۔ البتہ شام کو وہ فرصت سے ہوتی تھی اور سلوٹھ اس کے یہاں صرف صرف ایک ہفتہ ہی تو رہ چکی تھی۔

اجاب کی شعیبہ منصور اور زینت کا مشرق وسطیٰ کے دوسرے پر جانے کا پروگرام بن گیا اور زینت نے زبردستی سہیل بگم کو اپنے ساتھ لے آئیں تو وہ بھی ان کے دم چھلنے کی طرح ان کے ساتھ لے گئی زینت کے گھر آگئی اور اس روز صبح کو ہی کوآئی تھی وہ۔ اور اس نے ایک دوبار سامنے بھی ہوا تو بالکل کانٹے پر دسکی طرح۔

کچھ ہی دن اسے دیکھ کر کرا گئی۔

اور کچھ اسفند نے اس پر نظر پڑتے ہی رنج ہو لیا۔

یابان سائیں گیا۔ اور اپنا پورٹ بھانے کا مطلب یہ تھا کہ باقاعدہ اس سے آنا سامنا ہوتا۔ یوں بھی بھلا اس کا پورٹ بھانے کا موقع بھی کیا تھا۔

زینت اپنے بیویوں اور جاننے والوں کے حلقوں میں جاری تھیں۔ اس کو تو گھاس بھی نہیں ڈالتیں۔

پھر بھلا وہ نہار کی اپر پورٹ بھا کر۔

سوئے ان لوگوں کی بے رخی سے، اپنے احساسات کو مزید چھلنے کرنے کے لیے حاصل ہی کیا ہوتا۔

گو گھر کے کچھ میں انڈر گئے تھے پھر بھی گھر پر کچھ ایسا نہا تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ اور اس نے تو اپنے حالات کی سخت خود کو ہر ماحول میں رہنے کا عادی بنا لیا تھا۔ مگر نیلا کو تو اس تنہائی اور سرائے سے کچھ ایسی وحشت ہوتی تھی کہ اس کا زیادہ وقت چپکے یہاں ہی گزارتا تھا۔ البتہ رات کو وہ ضرور گھر آ جاتی تھی۔

اور ادھر اسفند تھا کہ ناں کی اس تاکید کے باوجود کہ بھئی بہن کا خیال رکھنا اور اسے تنہائی کا احساس نہ ہونے دینا۔ حسب دستور تمام دن گھر سے غائب ہی رہتا تھا۔ پھر روز ہوتے تھے شعیبہ اور زینت وغیرہ کو گئے لیکن اس دوران میں وہ ایک بار بھی سہیل بگم سے ملے نہیں آیا تھا۔ جن کے ہاتھ میں ان دنوں گھر کا پورا کنٹرول تھا اور وہ اس کی رو بھی ہوتی ادا کوئی کے طفلانہ پن پر غور کر کے ہمیشہ ہی کہتی تھیں۔

نوراد جھو، ابھی تک غصے کا کھینچا نہیں گیا۔ اسے اگر میں وہاں بھی رک گئی تو اس میں اس قدر خفا ہونے کی ایسی کون سی بات تھی۔ بے وقوف وہاں بھی آ کر کچھ سے مل سکتا تھا۔ ویسے یہاں بھی وہ کونسا بڑا وقت گھر میں رہتا ہے۔ دنوں تو اگر صورت نہیں دیکھا جائے۔ اس پر غلط یہ کہ میں وہاں کیوں رہ رہی ہوں ہے نا بالکل طفلانہ سی حرکت۔ اب جو بھی صورت اترے گا تو خود ہی اگر میرے ہاتھ پاؤں دبانے میں جھج جائے گا۔ ابھی کہیں کا۔“

سہیل بگم اس کے بارے میں جو بھلاہ اور تاثرات پیش کرتیں کبھی کبھی تو وہ حیرت سے ان کا منہ ہی۔ دیکھتی رہ جاتی۔ بھلا ایک بڑا اور بالکل شخص جو محنت سے ڈاکٹر کی بی بی کر کے آیا ہے۔ اسے یہ امان جان ابھی تک جینی برداری سمجھتی ہیں۔ یوں جیسے کوئی مسکونہ اور دھوکے بولنے سے نکلے پھر رہا ہو۔ ہاں اب ان کا بھی کیا تصور۔ ان کی نظر کے عدسے شام کی عینک میں اتنی تھکی سے نہ ملے کہ وہ انہیں چھوڑا ہی نظر آتا ہے اور یہ انہیں کیا معلوم کہ وہ ان سے نہیں بلکہ جیسے خفا ہے۔

پھر ریف۔ وہ فراق یا دوری کا روگ بھانے تو کراچی نہیں آتی تھی۔

بلکہ محنت سمجھری کے عالم میں گویا جبراً بھیجی گئی تھی۔

سب کچھ وہیں چھوڑ کر آئی تھی جو پہنچنے سے اس کا مسکن رہا تھا۔ ماسوا چند چورے کچھوں اور دو چار ستمناں چیزوں کے۔

بھائی نے بوقت رخصت کل پانچ سو کی رقم پیش کر رکھی تھی۔
 یا پھر اس کی اپنی پس انداز کی بونٹی تھی جو رقم اور گنتی کے زورات ہی اس کی کل پونجی تھے۔ گو اس گھر میں رہ کر اس کی یہ پونجی محفوظ طورہ نہ سکتی تھی کہ تمام اور قیام کا دار کا نام نہیں پڑتا تھا۔
 لیکن اس کی غیرت کو یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ وہ مستقل اس گھر پر باہر نہ کرے۔
 مہلوں کی گھنٹیوں کا رواج اس کے ساتھ مندرجہ ذیل نہیں بلکہ شہادتِ اخیر بھی تھا۔ اور اگر نیلما اپنی خلیقِ فطرت کی وجہ سے اس سے روت بھی برت لیتی تھی تو بھی وہ اس مال کی بیٹی ہی تو تھی جو پیشہ اس سے بے رخی اور بے اعتنائی سے پیش آتی تھیں۔ وہ تو اپنی ساس کو نہیں گناہی تھیں تو پھر ہمیں بیک کے سامنے اس کی کیا حیثیت اور کیا اوقات تھی۔
 رہ گئے شعیب منصور تو اول تو وہ گھریلو معاملات میں دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ دوسرے اپنی کاروباری مصروفیات سے اپنی مہلت ہی کہاں ملتی تھی جو وہ کسی اور طرف دیکھ سکتے ہیں اس لیے اپنے گھر میں پناہ دے کر بھیجے وہ اس کے ہر معاملے سے بری الذمہ ہی رہ گئے تھے۔ یا پھر اسے بھول گئے تھے۔ اور اسفند اسے تو وہ ایک جذباتی سالاد دھیار میں بچھا ہوا انسان سمجھتی تھی۔
 جو اس کے خیال میں بے حد لامالی لا پرواہ ہی نہیں بلکہ حدودِ حریموں کی بھی تھا۔
 تبھی تو اپنے نمونے اس کی تو کیا تھے بیک کی نیز خیر پوچھنے آجھا تھا۔
 وہ تو اس کی فطرت اور مزاج سے بھی واقف نہیں تھی۔ اس لیے اس کی شکایت دینے والی باتوں سے کوئی متوجہ نہ ہونے لگا۔
 کہ وہ واقعی عشق کے معاملے میں سیرک ہی ہے یا پھر نفسی طبع کی خاطر ایسا ظاہر کر رہا ہے کہ ایک سوڈہ شروع ہی سے عدم اعتمادی کا شکار رہی تھی۔
 دوسرے بھی درست تھا کہ وہ اسفند کے دیوانگی کی حد تک ایک دم ہی اُٹھ اُٹھنے والے جذبے کا کینوڑا تھا۔
 یعنی ایسے انسان کی جذباتی سی باتوں اور اداؤں کا کیسے اعتبار کر سکتی تھی۔ جو ایک ایک ہی وار ہوتا تو اس طرح جیسے کوئی کرشمہ سی انھیں اتفاقاً اسے اس تک بھارے آتی ہو۔
 ماں باپ اور بہن کے جانے کے بعد اسے اسی طرح معلوم تھا کہ سلمیٰ بیک کے ساتھ وہ بھی اسی گھر میں رہ رہی ہے۔ مگر خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی چکا تھا پھر بھی چاروں کو کراہنے کے باوجود اس کے کمرے میں نہیں آکھا اور کمرے ہی کہا موقوف کہ وہ کہہ بند ہو کر تو نہیں بیٹھ رہی تھی۔ بلکہ وہ تو سلمیٰ بیک کی بدایات کے مطابق خاشاں میں آتی تھی تو اس میں کھانا پکوانی تھی۔
 اور ایک آدھ دوش خود بھی تیار کر دیتی تھی کہ اسفند کا ناشہ بھی گرم ہے اس کے کمرے میں خود بھی گھومنا تھی۔ جو بخیران چاروں میں دن اور رات کا کھانا اس نے گھر میں کھا یا ہی نہیں تھا۔ گھر سے نکلتا تو وہ ناشہ کے بعد ہی تھا مگر کھانے کے علاوہ کسی اور کچھ بھی اس سے مل سکتا تھا۔
 بہر حال وہ جاہتا تو کمرے کے علاوہ کسی اور کچھ بھی اس سے مل سکتا تھا۔
 مگر اس نے ایسی بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔
 صاف ظاہر تھا وہ سب کچھ اپنے نمونے ہی کرتا تھا۔
 یا پھر اس نے جو کچھ بھی کیا تھا غرض وہی تاثر سے زیر ہو کر ہی کیا تھا۔
 ورنہ اس کے لیے اس کے دل میں کوئی طوفانی اور طوفانی جذبہ موجزن نہیں تھا۔
 گو سلو تو خود ہی ایسی باتوں سے دور بھاگتی تھی۔
 بلکہ اسفند کے خیال کے ساتھ ہی ایک عجب سا ہراس پر طاری ہونے لگا تھا اور وہ خود کو اس کی نظروں سے اچھل ہی رہا تھا۔
 چاہتی تھی اس کے باوجود وہ واقعی اس کے من کو بھانپ گیا تھا۔
 وہ اسے اس قدر اچھا لگا تھا کہ پسندیدگی کا سا لہجہ اس پر ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ جب کہ چاہت کا یہ جذبہ اسفند نے ہیال کے ذیل میں جکایا تھا۔
 محبت کی یہ چٹکاری ایسی سے فزوان کی تھی۔ ورنہ یہ پسندیدگی محض سلوٹ کی ذات تک ہی محدود رہتی۔
 یعنی پسندیدگی کی حدت آگے نہیں بڑھتی۔
 مگر اب تو ایک کسک سی شامل حالات ہو گئی تھی۔

جب کہ اس کی یہ کیفیت تھی جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مڑ میں کپڑا ٹھونس رکھا ہو کہ وہ دیکھ اور سن تو سکتی ہو مگر نہ سنے اور نہ کلام سکتی ہو۔ جنبش ہی کر سکتی ہو۔
 بالکل سی پے ہیں اور سبے بال بزرگ طرح اس نے خود کو حالات کے تعجبوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا تھا۔
 خود کو اس درجہ جسے اسے اور بے غرض بنایا تھا جیسے پھر کہے جان توئی ہو کہ اسفند کی ذالی ہوئی اس نئی افتادہ اس کا رہا سہا چین و قرار بھی لوٹ لیا۔ گویا ہر وہ بہت تر سکون اور بے پروائی نظر آتی تھی۔
 لیکن اندر ہی اندر دل کے پامال میں کچھ ایسا تامل سل رہا تھا جیسے طیش اور کسک کا نام ہی دیا جاسکتا تھا۔
 کیونکہ اگر وہ اس معاملے میں سیرک ہی اور پنجابی ہو تو اس کی خوصلہ فزانی کرنا تو بڑی بات وہ اس پر ایک نگاہِ انتہا تک ڈالنے سے بھی گریز کرتی۔
 پھر بھی اسے اس بات پر سخت ملال تھا کہ مذاقِ باولی لگی کے طور پر ہی سہی۔
 اسفند نے اس کے دل میں یہ آگ سی کیوں بھڑکائی اور پس وردان دونوں وہ کسی معقول ملازمت کی فکر میں نہ تھا اور یہاں رہتی تھی کہ ایک موقع بہت اچھا کہ شعیب منصور اور زینت ملک سے باہر گئے ہوتے تھے۔ دوسرے شعیب منصور کے سختی سے منع کرنے کے باوجود ملازمت کے سوا اسے اپنے حالات درست کرنے کا اور کوئی پارہ کاری نظر نہیں آ رہا تھا۔
 لیکن ملازمتیں یا انٹرنٹ لیز کوئی نیکو اور فٹ باتوں پر ہی سہل اند تو نہیں بناتے۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے تو بڑی جنگ و جوار اور جنگ و دوکرنی پڑتی ہے۔ جب کہ عالم یہ تھا کہ کوئی معاون قضاہ مددگار اور ادھر اس کے مطلب کی ملازمت ڈھونڈنے میں مل رہی تھی۔ اس جھوٹ میں ہر روز صبح کا اخبار لائونٹ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آتی تھی اور اشتہارات کے کالم کا پتہ دیا کرتی۔ اسی امید میں کہ کبھی تو اسے کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے گا۔
 اس روز بھی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اخبار لینے لائونٹ میں گئی تھی کہ وہیں شعیب پر اخبار کے پاس ہی "مگ" کا تازہ اشتہور نظر آیا تو وہ اسے کھول کر اس کی تصویر دیکھنے لگی کہ وہ فضا غیب سے اس کی حیات بخشی آواز پڑی۔
 "وہ تو آج ہمارا عزم آفرینے کے ہاتھوں چڑھ چکا۔" وہ اس کی لائونٹ میں اچانک پھینکے آکر بولا تھا۔ در کچھل پڑنا قدرتی بات تھی۔ دل میں بھی جیسے کچھ لگ گئے تھے۔ اور بدن میں ایک ناخوشگوار سی جھنجھٹ۔
 "معلوم بھی ہے میں وعدہ خلافی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ وہ اپنا مزا اس کے کان کے قریب لاکر بولا تو وہ چڑچڑات منتظر ہونے والی دمزدنوں کی پورٹ میں ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔ متوجہ سا بیچے سر کہ اس کی طرف گھومی۔ کبھی خود غرض انسان تھا۔ اپنا دل چاہتا تو اس سے بات کرنے چلا آتا تھا۔ اننا اسے تصور دار گردانا ہوا۔ ورنہ اسے دنوں سے پلٹ کر پوچھا تھا کہ نہیں۔
 بڑی ہی کائناتی نظروں سے اس کی دف دیکھ کر کوئی نیچا سا جواب ہی دینے والی تھی مگر سفید فیس اور غیور پتلون میں تازہ نمازہ ٹیوٹ کے چہرے کے ساتھ صبح کی سہائی اور اجلی اجلی ساعتوں میں کچھ اتنا دلکش لگا کہ کوئی سختی بات کہنے کے لیے وہ بے بس ساکت رہ گئے۔ اور وہ اسے ایک تک و جمیتی ہی رہ گئی۔
 شخص دیکھنے سے ہی کام نہیں چلے گا بلکہ آپ کو میری بات کا جواب بھی دینا ہوگا۔" وہ اپنی وارفتہ سی نظروں کو بڑی۔
 بے باکی سے اس کی کینائی نظروں میں اتار کر بولا۔
 کب بات کا۔ اس نے اس کی نظروں کی پیش سے کپڑا کر لیا کہ کمرے کے تیکے سے لیجے میں پوچھا۔
 "میں نے اسے کہا تھا کہ۔" وہ اس کے آنکھیں کڑا جانے پر بڑی دلی سکھلاہٹ کے ساتھ بولا۔
 لیکن میں نے تو کوئی وعدہ نہ کیا یا عہد نہ کیا کہ کوئی میں وعدہ دیکھنے کے سر سے نازل ہی نہیں تو پھر عہد کی کیا بوال۔" وہ ذہنیت لیجے میں بولی۔
 ہوں تو بڑی ہی سیدھی نے خفا میں آپ گریہ انہی لٹکاس سلسلے میں بھائی جاری ہے یہ خفا تو اصل میں مجھے ہونا چاہیے تھا۔ وہ متوجہ سا نہیں کر بولا۔ وہ ناخوش سی رہی۔ یوں ہی اس کے پاس کی باتوں کا جواب ہی کہاں تھا۔ کیونکہ اسی تک وہ اسے کچھ ہی دیکھتی تھی۔
 "معلوم ہی ہے اس روز سے اب تک میں کتنی شدید کونٹ میں مبتلا رہا ہوں اور میں نے آپ کو اس روز کسی غلط خیال سے تو

انتہائی خوبصورت ایک سرکش سے جذبے کی ابھرنے سے پہلے ہی موت واقع ہو جاتی۔ یادو ابھرتے ہی مسل اور کبل جاتا۔

ان ساری باتوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس تکلیف وہ خیال نے اسے سر تا پا لرزا کر رکھ دیا۔
اندرونی اقل تھیل سے اس کا چہرہ بھی دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ وہ اب مزید اس کے سامنے دُئی رہنے کی پوری
میں نہیں رہی تھی۔
مبادا کہ اس کے جسم سے ہویا تاثرات اس کے کھوٹ یا غلط بیانی کا بیانیہ اجڑیں۔ اس نے دل میں ہوتی ناخوش
سی دھڑکنوں کے شور سے ابھرا دھرا دھڑا جیسے ہونے کہا۔

”اے اس وقت تک تو سب جیل کر لیٹنا راتھ سو چکا ہو گا۔“

”اے بال اور ادھر میرے کوئی گھر آؤں نہ (میرے ساتھ کام کرنے والے اور ماحولیات) بھی اب تک میرے انتظار میں سو کو کر کاٹا ہو گیا ہوں گے۔“

”اوکے دین سولہ لاکھ۔“ اس نے بھی مندری کے سے اعلا میں کہا۔ ورہ عالم طور پر وہ اس وقت اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا اور اس کے سولہ لاکھ کہنے پر سہل تو بھی جان میں جان آئی۔ وہ علیہ سے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ جانتے جانتے بوند کے خدا حافظوں خالی ہوئی تو نہیں کہہ کر تے۔ اپنی بات کہہ کر وہ اپنی کسی سے ساختگی کا مظاہرہ کر کے والا ہی شاہ کس نے گہرا

کر کہا۔ ”ہر بات انسان آہستہ آہستہ ہی سیکھتا ہے جلد بازی سے کام لے کر نہیں“ اور اس کے نتیجے سے جواب پر چھینپ کر دے نہ سکتا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

وہ بوجھ بند بول اور خوشی میں سرسرا رہا تھا۔
مگر وہ کسی کا کہی بھی نہیں رہی تھی۔
وہ پورا دن اس نے اپنی حماقت پر ماتم کھا رہا تھا اور طرح طرح کے اندیشوں سے اپنا خون سکھانے میں گزارا تھا۔
مہر نے آزاد احوال سے بول بول دیا تھا۔

کیوں اس کی آنکھوں پر ہلکا دے اور فریب کی جی باندھ دی۔
وہ تو اپنے جذبوں کی تمام تر سداقتوں کے ساتھ خود بھی بچا ہے۔
میں اب اگر سچ نبی ہوں گی تو وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔
بلکہ اس کے جذبوں میں مزید شدت آئے گی۔
جس سے مجبور ہو کر وہ میرے حصول کی مناکارے گا۔

بات کھیلے گی تو پتہ چر کیا ہوگا؟
سوائے دوسروں کی نظروں میں میری ذلت و فواری کے۔
اور اس کی نظروں میں میری تباہی کے مجھے حاصل ہی کیا ہوگا۔

تو پھر میں کون سی بنائے بناہ تلاش کروں گی؟
کس کا آسلو ٹھونڈوں گی؟
پھر تو در بدر کی ٹھونڈوں گی ہی میرا مقدر بھول گی۔

ایک طرف اس کی نظر وال میں ہی کو خواہر ہوئی اور اس طرح کم از کم میسے ملتے پر ر سوائی کا داغ تو نہیں لگتا۔

ہوں۔ ہا جان کی بخشی ہوئی جائیداد کا رہن منت نہیں۔ اسی وقت سے میں نے بھی تہیہ کر لیا اماں جان کو خود کچھ بٹا کر رکھوں گا۔

”ہاں اب دیکھو باب نے عورتوں کی تنہی سے ہی کوئی بات نہ کہیں گے۔ اب میرے تم کو اکثر کہیں گے جو انشاء اللہ تمہارے قدم چمکے گی۔ اور اپنے اپنے سے تم جلدی آسمان کا تار پھینک دوں گے۔ سہلی بیچ دعا یہ انداز میں بولیں۔“

”اے آپ کی دعا میں جی نہیں اماں جان! وہ سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا بولا۔
”وہ آپ کی ایڈی کا رنگ نظر نہیں آ رہی ہیں۔ کہیں آپ اپنے رہنما کو منت تو نہیں دے دی؟“ اس نے دہرایا دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اور سہلی بیچ کا اچھا بیلا ہو کر غور سے اس کا رخ دیکھا۔

”دیکھو میرے نام پر اپنی محنت پر اب ڈاکٹر بن گئے ہو تو اپنے اندر بردباری پیدا کرو۔ ورنہ رضیوں سے اسی اور پانچ باتیں کہیں تو پھر چلی جی تمہاری ڈاکٹری۔“ انہوں نے قدرے چمک کر کہا۔

”واہ یہ کیا بات ہوئی اماں جان! بھلا اس بات سے میرے پیشے کا کیا تعلق؟ میں نے تو سیدھے سادے انداز میں ایک بات پوچھی تھی آپ سے۔“ اس نے چند بار کہا۔

”لیکن وہ میری آبدی کا رنگ کیوں ہونے لگی۔ تمہاری ماں بہنوں نے بے جا چاری کو دو دھوپ پڑی کبھی کی طرح کہا۔ ایک طرف چھینک رکھا ہے۔ اس لیے وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ کوئی کسی کی نونہی یا باندی تو نہیں ہے وہ۔ میں نے تو فوراً چھوڑ دیا کی جس سے اس سے کوئی کام لینا ہی چھوڑ دیا ہے۔ البتہ تمہارے گھسے کا وہ ضرور کر رہی ہے آج کل۔ وہ بھی اس کی مفت کی دوائی تو فرنی اسے ابھی نہیں لگتی۔ ملازمت کے لیے کوشاں ہے مل جائے گی تو شک کا زہی الگ کرے گی۔ مگر جیسے یہاں ہے کہ اس کی غیو نو کرنا کر دے۔ سہلی بیچ نے تارا تو وہ معلوم کس موڈ میں تھا۔ ایک دم ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”وہ خانا شاماں سے رات کا کھانا تیار کرنے کے ساتھ ساتھ پیڑی میں کھڑی — سلا دینا رہی تھی۔ وہ بندوں کے کھانے کی طرح کوئی بنا سیدھا وہاں پہنچ گیا۔

”یہ ملازم کس مرض کی دوا ہیں جو آپ کو کون کی طرح یہ سارے کا کرتی ہیں۔ چلیے پھینک لے اور اپنے کمرے میں جا کر آکھینے آئندہ میں نے آپ کو کھانا کرتے دیکھا تو ٹھیک نہ ہوگا۔ اپنی بات کہتے کہتے نہایت مذہب کے عالم میں اس نے سلا دے دوش اٹھائی اور فرش پر پھینک دی۔ اور جس انداز میں آنکھیں اور طوفان بنایا تھا۔ اسی انداز میں باہر نکل گیا۔ اور وہ شہرہ کھسائی سی کبھی دروازے کی طرف جس سے وہ ہو کر آیا تھا اور کبھی فرش پر کچھ بڑی کو دیکھتی رہی اس کی اوچی آواز کے ساتھ ساتھ گھنے کی آواز آئی۔ تو چن میں کام کرتا ہوا خانا شاماں گہرا کمر پیڑی میں آگیا۔

”کیا ہوا بی بی صاب؟ کیا کر گیا؟“

”کچھ نہیں بس یہ سلا کی پلیٹ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔“ خانا شاماں کا متفسار پر وہ دامت بھرے لہجے میں بول رہی۔ خانا شاماں نے ایک نو اسفند کو گرج اور کونک سے تھی۔ دوسرے پلیٹ اس کے قریب نہیں بلکہ فرش پر غامسے غامسے پڑا ہوا تھی۔ وہ عورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں جھک کر فرش پر پھری کئی ہوئی بڑی پٹنے لگا۔

”گلاس کے دل و دماغ میں تو جیسے تڑپنے سے ہوسے گئے۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عتاب کی وجہ کیا ہے؟

”کانوں میں بھی تمک اس کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

”اگر میں نے آپ کو کھانا کرتے دیکھا تو ٹھیک نہ ہوگا۔“ زبانی دھمکی دینے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے بھی قہر کہہ رہی تھی۔

”کی پلیٹ ہی پھینک دی۔
”یہ کہنے کا تو اس وقت موقع قاذواں کی گرفتار نہ تھا کہ وہ جیسے دکھایا تھا۔
”آؤ کھانا غلط سرزد ہو گئی تھی اس سے۔
”بلکہ اس کی اس غیر اخلاقی اور بے ہودہ حرکت پر اس کا دل بڑی طرح ہلکا ہوا تھا۔ اس کے ذہن اس کی کھلی فحاشی اس لیے وہ سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر سہلی بیچ کے پاس آگئی۔ اور سہلی بیچ کی موجودگی کی وجہ سے اس کی غصہ خانی میں گھس گئی۔ اور پھر دیر تک اس کے باہت آمیز رویے پر آنسو بہاتی رہی۔ اور جب دل پر ڈھٹا ہوا جھوٹا

نکاح بھی باہر نکلی۔
”بچ میری طبیعت کچھ جاری بھائی سی ہو رہی ہے اس لیے صرف سوپ ہی پیوں گی۔ اصل میں دوپہر کو اشتہا سے زیادہ کھا

باتھا اس لیے شاید بھڑک رہی ہو۔“
”بات اور اس کی کیفیت سے لاعلم سہلی بیچ غفل خانے سے اس کے باہر آئے جی بولیں جی تو جا کر صاف صاف کہہ دے کہ میں تم سے کھانا کھانے کا کوئی نہیں لگاؤں گی۔ بڑائی کسی بات کا سے جواب وہ ضرور دے گا۔ باتیں بھی کرنا سہلی بیچ کے کسی کھانے کے لیے وہ آج نہیں رکھتی تھی۔ اور اس وقت تو وہ خود بھی یہی بات کہہ رہی تھی کہ وہ سہلی بیچ کو کوئی مشکل نہ دے گا۔ اس لیے بلا جواب دیے جلدی سے باہر نکل آئی۔ پھر خانا شاماں سے کہہ کر کمرے کے باہر اس نے سہلی بیچ کو سوپ بھجوا دیا۔ اور قوی دیر بار پھر کمرے میں آگئی۔ اس روز اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اور چونکہ سہلی بیچ نے صرف سوپ ہی

پیا تھا۔ اس لیے ان کے علم میں یہ بات نہیں آ سکی کہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ ورنہ وہ پوچھتیں ضرور۔ پس بھی اس روز وہ کچھ چپ سی تھیں اور عشا کی نماز پڑھ کر جلدی ہو گئی تھیں۔ مگر بستر میں سوئے گھس جاتے کے باوجود وہ رات کے تک کمر میں بٹتی رہی تھی۔ ان کے آخر سے ایک دم ہی کیا ہو گیا تھا؟

”وہ کیوں اس قدر بٹنے میں پھر پیڑی میں جلا آیا تھا؟
اور سلا کی پلیٹ کیوں پھینک دی تھی؟
اس پر دھاتے کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ خانا شاماں نے یقیناً اس کی آواز سن لی تھی۔ تبھی تو وہ اس قدر متبہس نظر آ رہا تھا۔

”گو یا یہاں رہ کر اب تو کون کی نظروں میں بھی میری وقعت و کوکڑی کی بھی نہیں ہے گی۔ آج خانا شاماں کے سامنے ڈانٹنے تو کل سب کے سامنے بھی بے عزت کر سکتا ہے۔

”گلاس نے ایسا کیوں کیا؟
سب طرف سے ہو کر بات بھراس نقطہ پر آٹھری۔
”اگر ہمدی کے طور پر بھی کھانا تو بھلا بھی کوئی انداز یا طریقہ تھا ہمدی جتنے کا نہیں نہیں بات کچھ اور ہی تھی۔

”شاید یا اس کی صبیح کی گفتگو کا رد عمل ہوگا۔
”سکون سے سوچتے سمجھتے کام تو قیلا ہو گا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ میں واقعی کسی لحاظ سے بھی اس کے قابل نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے اس نے ایسا رویا اختیار کیا۔

”خیر اگر میرا اندازہ درست بھی ہے تو پھر تو یہ بہت اچھی بات ہے۔
”میں تو خود یہ تہیہ کر چکی تھی کہ اپنے بارے میں اسے سہراں بنا کر کسی نہ کسی طرح اس سے اپنا بیچا چھڑا لوں گی۔
”تو اس نے ایسا اہانت آمیز رد اختیار کر کے خودی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ واقعی یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ اس طرح

”کہ ان کے من کو کون کی نظروں میں مزید گرائے سے بچ گئی۔
”وہ کمر میں بدل کر بڑی منظر بازی کیفیت میں بڑی دیر تک یہ سوچتی رہی۔
”مالا لک۔ بہت پہلے ہی وہ یہ تہیہ کر چکی تھی کہ اسے سب کچھ بنا کر اس سے کسی نہ کسی طرح بچھا چھڑا لے گی۔ اس کے

”باوجود وہی وہ محنت ہے مگر کاشمیر کی جی جی۔ اصل میں وہ بھی تو اس کے دل کو بھلا گیا تھا۔
”شاید اس پہلے شخص کی حیثیت رکھتا تھا جو پہلی ہی عورت کے دل پر پیاری دیکھ دیتا ہے۔
”جب کہ اس نے تو دھاتوں کی کھانسی کر دی تھی کہ بلا دستک دیے ہی بہت دراز اندر گھس آیا تھا۔

”گو یا اس کی میں سلوک کی لگن بھی شامل تھی۔
”اور سلا جو شروع سے ہی مجبور یوں کا سر پہنے بیٹے جو بھی بٹہ مجبوری دلائی ہو گئی تھی۔
”اگر کوئی بھلائی اور جذبات سے بے دخل کرنے کی کوشش میں خود بھی لہو لہاں ہوئی جا رہی تھی۔
”مگر وہ مجبوریاً قوت آراوی کی مالک تھی۔
”اس نے تو اور بھی بہت سے کاری دار دل پر پہنے تھے۔

اور اس سب سے شدید درد کو بھی سینے کا دوتا رکھتی تھی۔
والدین اور بہن کے جلنے کے بعد دنیا گھر میں کبھی نہ گئی تھی۔
وہ صبح کا بج جاتی تھی تو کبھی کبھی سیدھی گھر آ جاتی یا پھر سہل منصور کے یہاں چلی جاتی اور وہاں سے شام کو اس کا
والہی ہوتی تھی کبھی کھانا کھا کر آتی اور بھی بفر کھا لے۔ اور وہ بھی اس روز ہی آتی تھی جس روز ناز کے لئے کامیاب ہوئی
تھا کہ ناز و میسرے جو تھے ہی آ جاتی تھی۔ وہ بھی تنہا اور بخوری دیر بہن کے ساتھ کب شپ کے چلی جاتی تھی۔ بہت جلد
کھڑے کھڑے دای سے ملنے آگئی ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بیٹھتی تھی۔ تقریباً دو دنوں ہی بہن بھائی کی گھر سے ان کے
لا تعلق پر سخت شکایتیں کر رہی تھیں کہ وہ تو صبح کا گیارہ گھنٹے کو جی لوٹتا تھا۔ اور جیسا کہ ماں اسے تاکید کر چکی تھی کہ ان کے جانے کے بعد
چھوٹی بہن کا خیال رکھنے کو خیال رکھنا تو کیا اس نے کبھی پلٹ کر بھی جھوٹی بہن کو نہیں پوچھا تھا۔ چچا کے یہاں بھی وہ ایک دو دن
ہی گیا تھا۔ وہ بھی کمرے کے مگر اس شام خلاف دستور وہ گھر میں ہی نظر آ رہا تھا۔
شاید عام تعطیل کا دن تھا اس لیے۔

ناز و بھی کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی۔ دنیا بھی گھر پر ہی موجود تھی اور کوڑا آج اس کے یہاں دسے اسپینڈ (دون گزارنے) کی مینز
سے آئی ہوئی تھی اور وہ بھی خلاف دستور اور اصول۔ ان میوز کے ساتھ بیٹیا نہیں بول رہا تھا اور بہت ہی اچھے نوڈ میں نظر
رہا تھا۔
اور اس کے اتنے اچھے نوڈ کے پیش نظر ہی بہنوں نے اس کی لا تعلق اور لا پرواہی پر شدید شکوہ کیا تھا۔
سہلی بچ اب مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھیں۔

ناز و جب بھی آتی اتنی غصہ میں آتی کہ وادی کے سلام یا مزاج پر سی کرنے کا بھی اسے موقع نہ ملتا تھا۔ اس لیے سہلی بچ
خود ہی اٹھ کر اس سے ملنے پہنچی آتیں۔ اس روز بھی وہ اپنے بستر سے اٹھ کر اس کمرے میں آگئی تھیں جن میں یہ سب بیٹھے تھے
اور شاید اسفند کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں بیٹھا تھا۔ سہلی بچ کے آنے کے بعد کچھ دیر تو وہیں بیٹھا رہا پھر سرٹ وای میں خن
و کچھ کھن کر کے کا بہانہ کر کے اٹھا اور سیدھا اس کے رہائشی کمرے میں چلا آیا۔
وہ کچھ دیر قبل ہی مغرب کی نماز ادا کر کے باہر جانے کا قصد کر رہی تھی کہ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر جلدی سے
گھومی اور اپنے بڑی کی طرف پلٹ گئی۔

”ہو سویت ہارٹ!“ وہ اس کے کتر اچانک سے باوجود سیدھا اس کی طرف ہی بڑھتا چلا آیا۔
”کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ اس نے اس کے نزدیک آکر کہا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے کل شام کے
روئے کو اس پر جتنا ناچہا رہا ہو۔ اپنی تحقیر کے احساس سے اس کے پورے جسم میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ جی تو چاہا کہ اسے
ایسی بے نقط سنائے کہ وہ بھی تمام عمر یاد ہی رکھے۔ لیکن برواشت اور ضبط کے تحریک گوندی گئی تھی۔ اس لیے بھوں پر خاموشی اور
منبط کی ہر نکلنے اس نے تیزی سے پلٹ کر دروازے کا رخ کیا۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کے کل کے روئے پر اس سے سخت
ناراض ہے۔

اسے احساس تھا کہ اس سے زیادتی ہو گئی ہے۔ بلکہ وہ خود بھی حیران تھا کہ ایک دم ہی اسے کیا ہو گیا تھا۔
دعا مان جانے تو ایسی کوئی شائبہ لگنے والا بات نہیں کہی تھی۔ جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور فوراً ہی جا کر اس بے چاری پر ہلکا پلٹا۔
اور انہی اس فعلی یا زیادتی کی وجہ سے ہی اس روز وہ گھر میں نظر آ رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بھی نمازات بے چین سا رہا تھا۔
اور اب اسے منانے بلکہ اپنے فیز مناسب روئے پر اس سے معذرت کرنے ہی آیا تھا۔
مگر وہ تو اس کی کوئی بات نہ سنے کی روادار ہی نہ تھی۔
اور بہت تیرہا دکھاتی باہر کا رخ کر رہی تھی۔
اس نے تیزی سے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔
”آئی ام پری سوری سرٹ ہارٹ۔ میں اپنے اس روئے پر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔“ ان پھر وہی سرٹ ہارٹ۔ وہ اس کے بل
پر سرٹ ہارٹ کہنے پر مکمل ہی اٹھی۔

”آپ ایک سینٹ انسان ہیں۔ بلکہ مجھے ایسے غیظ القابات سے نوازا کہ اپنی شرافت کو داغدار نہ کیجیے۔ مگر اس نے اس کی اتنی سخت
سخت بات کا ذرا سا بھی نوٹ نہیں لیا اور بڑے مصالحتانہ سے انداز میں بولا۔
”چھاپری کا بل مداح تمام دوست۔ مجھے اپنی معافی میں کچھ تو کہنے کا موقع دے دیجئے۔“
”میں کچھ سننے کی عزت سمجھتی ہوں وہ صفا مستحق آئی کی بلکہ میں تو آپ کے کل کے روئے سے پہلے ہی پتہ چل چکا کہ باور رکھی ہوں کہ میں آپ کے
قابل نہیں ہوں۔“ چیر آپ سر سے راستے سے ہٹ جاتے ہیں کچھ بھی کہنا یا سننا نہیں چاہتی۔ وہ اس کی بات پر کچھ زیادہ بھڑک کر بولی۔
”اوٹو۔ یہ کیسی اور پریچر من نہیں۔ جب تک میں اپنے کل کے روئے کی وضاحت نہیں کر لوں گا۔ آپ کے راستے سے نہیں ہٹوں گا۔“
”اب بھئیے، اگر اس مسئلے میں تمہارے کوئی گستاخی ضرور ہو گئی تو پھر مجھے میری شرافت کا قطعہ نہ دیجئے گا۔“ اس نے اس کے شانے پر کچھ اس قدر
جھڑکے کہ وہ بھی اس خیال سے سراسر ہوا چلی کہ کہیں وہ سچ بچ ہی کبھی کسی بے ساختگی بلکہ بالکل کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے۔
”تھیک ہے میرے بھائی۔ مجھے اور کچھ کہنا ہوتا ہے میں جلدی سے کمر ڈالوں۔“ وہ اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے بٹاتی سمٹوٹا اس چلے پر ہلکا کر
ڈس فیروادار دے دیے ہیں بولی۔ تو اس نے بھی خود کو سمٹوٹا سا تالو میں کر کے کہا۔

اور ادھر برہمے کسی کے نہیں تو سلی بیگم کے آجائے گا دھر کا گہ ہوا تھا۔ انے لیے جس کی انتہا تھی۔
 ”اچھا اچھا۔ آئیندہ آپ کے حکم کی بجا آؤں گی کو میں اپنا ایمان بھجوں گی اس نے کبھی نہ تو کھاس نہ سہیت میں جیسے سخت چتا اور اجڑ چکا۔

سے بہت جلد اسے اپنے امن کی ایک بات بتا دوں گی۔ بڑی دیر تک ایسی نراکتوں پر غور کرنے کے بعد اس نے سب کچھ کہہ ڈالنے کے لیے خود کو پوری طرح تیار کر لیا۔

اگلے روز صبح ہی صبح صبح لو کہ اس سے کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ کیونکہ ایک تودہ آٹھ بجے سکر اٹھا تھا۔ بچہ اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ تیار میں بیٹھ گیا تھا۔ اور ایسی اعلیٰ سیجی حالت میں ہوتا تھا کہ سوط کو اس کے کمرے میں جاتا نہ سمجھتا تھا۔ نو سو اڑھائی کے قریب تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلتا اور ناشتہ کر کے اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔ ماں باپ کی موجودگی میں تو اس کا کچھ بھی معمول تھا۔ لیکن جب وہ دو دن مرہا دا کرنے لگے تو خود ناشتہ اپنے کمرے ہی میں منگوانے لگا تھا۔ اس صدمت میں بھلا وہ اس سے بات کرنے کا میں کیونکر قلم کر سکتا تھا؟ اب تو اس کی دلچسپی پر ہی بات ہو سکتی تھی۔

لیکن اور کچھ ایسا اتفاق ہو کر چند روز پیشتر اس نے ایک اخبار میں کسی اخباری مضمون کا اشتہار دیکھا تھا جس میں فرم کو ایک ٹائپسٹ کی ضرورت تھی جو فرم کے کاروبار کی غلطی اور ڈیکویشنل (دستاویز) کو ٹائپ کر کے ٹائپسٹ کا گریجویٹ ہو کر انگریزی زبان پر عبور رکھنا لگا دیا گیا تھا۔ اور وہ گریجویٹ تھی نہ انگریزی زبان پر عبور ہی کتنی تھی۔ پھر بھی ایک امید موزوم کے سہارے۔ اٹھنا کہ اس نے اپنے کوائف سمیت اپنی درخواست اس فرم کو زبردستی پیش کر دی۔ اور اس روز اس فرم سے اس کا انٹرویو لیا گیا تھا۔ وہ بھی اتنی حد تک۔ یعنی وہ اپنے بیٹے کے ادراک مینے کے اندر اندر۔ جسے دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ ہی نہ رہا۔ گویا انٹرویو اگلے روز دن کے دن بجے تھا۔ مگر اس کی خوشی وہ بات بھول گئی تھی جتنی کہ اس نے کچھ نہ سنا بھی۔ بس وہ وقت قریبی تصور میں اسی فرم میں بیٹھ بیٹھ جاتی تھی جسے اس نے دیکھا تھا۔ مگر اس کی لوکیشن محل وقوع ہی معلوم تھی۔ تصور میں کبھی خود کو انٹرویو دیتے ہوئے دیکھنے لگتی۔

کبھی انٹرویو کے سلسلے میں جو سوالات کیے جانے والے تھے ان کے بارے میں سوچنے لگتی۔ کبھی انٹرویو پر جانے کے لیے اپنے ماں باپ کا انتخاب کرنے لگتی کہ کیا بہن کر جانا چاہیے۔ کوئی ان باس موندل رہے گا۔ بس سارا دن اس نے کچھ ہی سوچ سوچ کر گزارا۔

رات کو ہی انٹرویو کے موقع پر پہنچنے کے لیے کپڑے نکال کر اسٹیج بھی کسے رکھ لیے تھے اور لوکیشن کے بارے میں کریم سے معلومات حاصل بھی کر لی تھیں۔ کفر میں جگہ اور علاقے میں واقع ہے وہ کہاں ہے اور وہ فرم صدر کے علاقے میں دکھائی دے رہی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ اشتہار کے ذریعے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا۔ مگر کریم سے یہی معلوم ہو سکا تھا کہ دکھائی دے رہی تھی صدر کے علاقے میں واقع ہے اور کمرہ کچھ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس وجہ سے دکھائی دے رہی تھی۔ بیکر اس نے صدر دار بوری باردار کا نام زینت اور نازش سے بار بار سن رکھا تھا اس لیے اگلے روز وہ جلد ملنے تیار ہو کر اسے آٹھ بجے کی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور اس نے سلمیٰ جی کو رازدار بننے کی تاکید کر کے عین وقت کے وقت بتایا تھا کہ ٹائپسٹ کی آسانی کے لیے انٹرویو دینے جا رہی ہے۔ سلمیٰ جی خود بھی اس کے ملازمت کرنے کئی میں تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

میں ڈوگر روڈ یا شمار فیصل مشورہ کراچی کی سب سے زیادہ مصروف ترین سڑک تھی جس پر چوبیس گھنٹے ٹریفک رواں دواں رہتی تھی مگر اس سڑک پر سواری کا حصول بڑا دشوار گزارشات ہوتا ہے۔ وہ بھی صبح کے وقت کیونکہ ایک تو رات وہ ترپرا ٹیوٹ گاڑیاں اور بسیں ہی آتی اور باقی نظر آتی۔ دوسرے اگر ٹیکسیاں بار کشت بھی گزرتے ہیں تو سب ہی۔ سافروں سے بھرے ہوئے۔ یہی حال ملک بھر اور وینز کال بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہے وہی نہ ہو کہ کوئی کشت پکڑ کر جلد سے جلد اپنی جائے مقصود پر پہنچ جائے کہ کوئی رات وہ پچ کر اسے فرم کو بھی لگا دیا تھا۔ اور ان دنوں کرنے میں بھی خاصا وقت دیکر روکتا تھا۔ مگر وہاں کشت نہ تو کوئی بھی خالی نظر نہیں آتی تھی۔ آخر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ٹیکس سے پہلے جانے اور صدر میں آنکر کوئی دوسری سواری پکڑنے کی کوشش کرے۔ مگر اس نے فرم کے آفس تک تو لے جانے سے ہی ہمتی۔ وہ شغیب منصور کی کوٹھی سے نکل کر سواری پکڑنے کے لیے کچھ خاصے پر پٹر کی سمت آکھڑی ہوئی تھی اور بس اسٹینڈ وہاں سے کوئی پلہ فریالنگ کے خاصے پر پٹر کی سمت تھا۔ اور اسی وہاں اسٹینڈ ٹنک جانے کے لیے پٹر کی رسی بھی کہ اسٹینڈ کاں کیٹ سے لگا اور میں روڈ پر لگئی۔ اس لیے سافروں نے رہے تھے اور اسٹینڈ کو ایک اہم ٹینک کے سلسلے میں جلد ہی ڈیوٹی پر پہنچا تھا۔ اصل میں ڈاکٹر بورڈ کی ٹینک تھی۔ میں وہاں پر آکر وہ ٹینک کے ہی بارے میں سوچتا ہوا پہلے تو اپنی وجہ میں آگے نکل گیا۔ مگر میرا سے ایک عجیب سے آدمی نے اپنی عیبت سے بڑی طرح چونکا دیا۔ اس نے ہلکی اسپید مل کر کے ایک ٹینک کو پیچھے پکڑ کر دیکھا اور دیکھ کر دیکھ کر اسے سڑک سے کنارے پر کرنا ہوا میں اس کے قریب آکر رکا اور وہ وقت کو اتنی تیزی سے آگے نکلتا ہوا دیکھ کر سخت پر اس باور ہوئی تھی۔ ادراک پریشانی میں اس کی کاروا اپنے آگے سے گزرتا دیکھ کر میں بھی کئی تھی۔ ایک کار کو آگے مانے کے بجائے پیچھے کے رخ ملتے ہوئے دیکھ کر میں اپنے آگے رکتے ہوئے تیری طرح چونک کر پیچھے ہٹی اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر کار میں بیٹھے ہوئے اسٹینڈ پر پڑی تو اس کا ادراک سالوں اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

اور تیری تو بڑی چیز، اسے اپنے انٹرویو کی بھی جیٹی ہوئی نظر آئی۔ اُن یہ اکیدم ہی کیے ٹیک بڑا کیا کچھ بعد یہاں سے نہیں گزرتا تھا۔ وہ سخت کھیا ہٹ کے عالم میں ہی سوچ رہی تھی کہ اس نے اس کی طرف کی کھڑکی پر جھٹک کر کیا۔

”کیے بیٹے۔ جہاں جانا چاہا رہی ہیں وہیں آپ کو ڈار کرا دوں گا۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس کے لیے ڈرنٹ سیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا۔ ایک لمبے کو اس کا دل پا کر کجا کجا گھر دہلیں جلی بنے کیوں بھی انٹرویو کے لیے جانا اب بے سود ہی تھا کیونکہ ایک تو۔۔۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ دوسرے گھر اسٹ اور پریشانی میں اسے کوئی مشعل نہ تھی تو نہیں سوچ رہا تھا۔ اپنے اسٹینڈ پر تمام سے تیار ہو کر لب بزرگ کھڑے ہونے کا۔ وہ سال اور سنہ زب سی لونی لکھی کھڑی رہ گئی۔

”بہن اب یہاں لب بزرگ کیا کوئی تعلیمی پیشین کر ایٹ (پیدا) کرنا چاہ رہی ہیں آپ کہ میں آپ کو زبردستی اندر کھینچوں اور آپ جھین پڑیں اب کی طرح پیچھے پیچھے۔“ اس کی خاموشی پر وہ قدرے چڑک رہا۔ گویا اس وقت بھی وہ بڑی آسانی سے کبہ کتنی تھی کہ نہیں نکھرے۔ جیسے وہاں جانا ہے میں خود ہی جلی جاتی ہوں۔ پھر اس نے جانے کا ارادہ مقرر کر دیا ہے۔ مگر اس سے تو اس کی حالت کچھ ایسی تھی جیسے سنگے یا پتھوں کی طرح کی ہو کر نہ جانے ابلن نہ پائے تھیں تو لنگ۔ منہ سے ایک لفظ نہ لے کر بھی ہمت نہیں ہوری تھی۔ چنانچہ وہ بڑی چپکاپٹ کا اظہار کرتی۔ چپ چاپ اس کے قریب بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اس نے بھی بڑی خاموشی سے کار آگے بڑھائی۔ اور پھر کچھ آگے جا کر اس پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

”ہاں تو تیار ہیں آپ نے کہ آپ کو کہاں ٹیوٹ کرنا چاہتا ہے؟“ اس نے اپنی گھر اسٹ پر کسی قدر قابو پا کر ہاتھ سے بتایا۔

”دکھو یہ روڈ۔“ لیکن دکھو یہ روڈ تو بہت بڑی ہے۔ مگر مطلب ہے جس جگہ جانا چاہا رہی ہیں اس کا کچھ بتا۔ نشان بھی معلوم ہے آپ کو؟ گو سوال بہت بڑھا تھا لیکن اس نے سوچا جب کوئی روڈ کا نام لے ہی دے تو بتا دیتے ہیں مسافر بھی کیا ہوگا۔

”ہوئی جی میں قریب ہی ہیں۔ ٹرانسٹریٹنگ کا پوریشن ہے میں وہاں اتروں گی۔ آخر اس نے بتا ہی دیا۔ کچھ دوسرے معزوں میں چونکہ اس وقت کو کھیا ہٹ مل رہی تھی اس لیے وہ کہہ گئی۔

”ٹرانسٹریٹنگ کا پوریشن؟ مگر وہاں کس سلسلے میں زبمت کر رہی ہیں آپ۔“ اس نے پچھتے سے پیچھے میں پوچھا۔ اور وہ جو سخت بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پکڑ کر راشت نہ کر سکی تو مات گئی سے کام لے کر لی۔

”وہاں جس جگہ انٹرویو کے ٹائپسٹ کی آسانی کے لیے۔“ اس نے پوچھا تو کیا اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی انٹرویو نہیں آیا ہوگا؟ اُس نے ہلا کوئی ناثر دینے پوچھا۔

”ملا ہے۔ لیکن انٹرویو پر میرے لیے انٹرویو دینے کیے جاسکتی تھی۔“ اچھا کیا بھلا یہ لڑکھا کتنی ہیں آپ۔ اس نے کہا تو سوط نے چپ چاپ اپنے پرس سے انٹرویو لیکر نکال کر اس کے ہاتھ میں تنھایا۔

”اچھا کیا دل میں اس نے اس بات پر شکرا ادا کیا کہ وہ بھی اس کی سروس کے معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اور ادراس نے ایک ہاتھ میں اسٹینڈ رکھنا اور دوسرے ہاتھ سے انٹرویو لیکر لٹا کر اپنے آگے اسٹینڈ پر رکھ کر لٹانے کے کونے پر درج کپنی کے پتے پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر بونہ کر کہ دروازہ اسٹینڈ سے ملایا اور لٹانے کوئی ٹیکسوں میں جا کر کسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

”ہاں میں آؤ یہ کیا غضب کیا آپ نے؟ اس کی اس خزانہ حرکت پر تھلا کر وہ اپنی جگہ پھینک کر ملی۔ رنج و تاسف کے ماسے اس کی آنکھوں میں نہ بھر آیا۔

”وہی جو بھٹکا رہا ہے تھا۔ اور میں نے تو صرف انٹرویو لیکر ہی بھاڑا ہے۔ ورنہ آپ کی جگہ میری کوئی بہن ہوتی تو اس حرکت پر اس کے کان پیچھے سے بھی مدینہ نہ کرتا۔“ وہ بھی نہایت خشکی کے عالم میں بولا۔ تو اسے بھی غصہ آگیا۔ واہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک تو سوچی اس پر سے سینہ نکلے۔ وہ بھی بڑا مضبوط ہے۔

”اگر آپ کی بہن ہوتی تو کھائی جانے کے نالے آپ کو جیتی ہذا کہ آپ اس کے کان پیچھے سے اسے مارنے سے بھی مدینہ نہ کرتے لیکن میرے کان معاملے میں آپ کو دل دینے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔“ دل بھرا جھگڑا تھا۔ آواز بھی رندھ گئی تھی اس لیے جانے کے باوجود وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

”آپ کے خیال میں مجھے کوئی حق نہ پہنچتا ہوگا مگر میرے اپنے خیال میں تو سارا حق مجھے ہی پہنچتا ہے۔ اور میں نے تو آپ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ آپ کو نہیں کرنی کی۔ پھر آپ کو یہ جرات کیسے ہوئی کہ آپ نے بلا لایا اور درخواست بھی دے دی اور انٹرویو دینے بھی چکے سے گھر سے نکل

کھڑی ہوئی۔ معدوم بھی ہے پیرا بھی ہے اور یہاں آپ جیسی حسین لوگیاں منٹوں میں غائب کر دی جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں بھی کی بات تو یہ کوہنچا دی جاتی ہیں کہ پھر وہ کھڑوں کا رخ کرنے کے بجائے کوٹھوں کا رخ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اور آپ کو تو یہاں کے راستوں کا علم ملاؤں گا۔ پھر بھی آپ نہ ہائی گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ کمال ہے میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اتنی خود سر اور فطری ہو سکیں۔ اس قدر کوئی اس کی خودی پر فخر آ رہا تھا اس نے اسے بے مبالغہ کر رکھ دیا۔ مگر اسے تو اس سے صرف اور صرف اپنے فخر پر فخر سے نکل جانے کا علم تھا۔ جا رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ تو اسے اس کی انٹرویو لیٹر پھاڑ دینے کی حرکت پر فخر آ رہا تھا۔ وہ واقعی وقت کیساتی بی بی بنی تھی یعنی۔

”ہوٹھ ابھی اس جھوٹا نہ حرکت پر اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا تو اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اسے زبانی کے نشیب و فراز کھائے جا رہے تھے۔ کراچی کے گھناؤنے اور خطرات سے پُر ماحول کا ڈر ادا کیا جا رہا ہے۔ یوں جیسے میں بالکل ہی بالکل جاں اور جڈ ہوں اور زمانے کی آواز کو دفعت ہی نہیں، اور اگر کراچی میں لوگوں کے ساتھ ایسا اندھیرا چا ہوتا تو میرے غور و خوض کے سروں کے لئے کوئی فتنوری باقی نہیں رہتا۔ کراچی میں تو ایسی نین تو ایسی مہرے غریب سروں کی کرتی ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہوں۔ اور پھر اسے کیا حق پہنچا ہے کہ اسے آپ سروں نہیں کریں گی۔ جبکہ میرے پاس جتنے ذاتی زیادہ ہندوؤں اور باندیوں کے باوجود کھیلوں کے مجھے سروں کرنے کی اجازت رہی ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر خانہ کے سینکے والوں کے ساتھ تھرا گوارہ نہ ہو سکے تو کسی پوسٹل وغیرہ میں داخل ہونے پر تیار رہنا۔ پھر یہ تو میرے لیے بالکل ہی غیر ہے۔ چند روز کی جان بچاؤ والا۔ یہی سب سوچ کر اس نے بیٹھے ہوئے مجھے میں کہا۔ ”کیونکہ میں اتنی ہی دفعوں نہیں نہ جا رہا اور کراچی کی حفاظت بھی نہ کر سکوں اور پھر میرا تو صرف انٹرویو تھا کوئی چارچ تو نہیں جا رہی تھی تو کر کے۔ یوں بھی مجھے کسی پیرلبر پر گرد ہنا بالکل گوارا نہیں، خیر یہ عازمت نہ تھی میں کسی دوسری ملازمت کے لیے کوئی تلاش کرتی۔“

اس کی گفتگو کے ایک ایک لفظ سے اس کے ارادے کی پنچھی کا اظہار ہوتا تھا جسے اسفند نے اس کی سرکشی پر بھول لیا۔ اس نے تو بہت آبا سگر بڑے سختی سے کام لے کر لولا۔

”ہوں تو گوارا آپ تہہ پر کچی ہیں کہ آپ سروں کر کے دیں گی۔“

”جی بالکل۔“ اس نے بڑی تعلیت کے ساتھ کہا۔ ”تو وہ چپ سا ہو گیا۔“

”آپ ہی سوچیں میرا اسی طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے پیٹنا بھی کوئی مناسب بات ہے۔“ وہ اس کی خاموشی کو اس کے نام نہ ہونے پر معمول کر کے بولی۔

”نہیں نہیں، بالکل مناسب نہیں۔“ اس نے اس کی بات کو تاہم نہیں، مگر عجیب سے انداز میں کہا اور خاموش ہو کر کچھ مچھنے لگا۔

خیال سے ایک دم ہی اس کے چہرے پر شگفتگی سی نمودار آئی۔ جس پر سنجیدگی کا خول چڑھتا ہوئے اس نے کہا۔

”اچھا اگر آپ سروں کرنے کا نتیجہ کرسی چکی ہیں تو پھر میرے پاس آپ کے لیے ایک بہت ہی ڈسینٹ اور عمدہ کام موجود ہے جس میں رہائش سے لے کر کچھ لٹاؤ لٹاؤ کا پینا بلکہ دیگر ضروریات بھی فری ہیں۔“

اور وہ اس کے منہ سے اتنے ڈسینٹ اور اتنی زیادہ مراعات کے ساتھ کسی کام کا سن کر اندر ہی اندر کھل اٹھی۔

”اچھا! مگر وہ کس نوعیت کا کام ہے؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”اب کام تو کام ہی ہوتا ہے۔ اور انسان جب کام کرنے کی ضمان ہی لیتا ہے تو کام خواہ کس نوعیت کا بھی ہر دفعی کٹھن اور خدمت ہو یا آسان اسے کر کے ہی چھوڑتا ہے۔“ اس نے قدر سے چمک کر کہا۔

”لیکن پھر یہی۔ انسان کے لیے پیلے پیلے معلوم کرنا بھی تو ضروری ہوتا ہے کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔“

”اسی لیے معلوم کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ جس کام کا ذکر کر رہے ہیں وہ کس قسم کا ہے۔“ وہ اس کے پسیدیاں بھولانے کے انداز پر چڑھ کر بولی۔

”میرے ساتھ کس زندگی کی کاٹری کھینچنے کا۔“

اس نے کہا بھی تو کیا کہ تسلیم اٹھانے کے باوجود ہنسنے لگا۔ ”جیکو وہ تو سچ رہی تھی کہ جس ہسپتال میں وہ کام کرتی تھی وہیں کوئی ایسا کام ہو گا جو میرے لیے مناسب سمجھ رہا ہے۔ مگر اس نے اس کی نوعیت بھی بتائی تو کیسی۔ کہ وہ اپنا سامنے کر رہی تھی۔“

”کیوں نہ کام کچھ اتنا کٹھن تو نہ ہوگا۔ آپ کے مزید اطمینان کے لیے بھی بتا دوں کہ بیک اور اکیں پے کا بھی کوئی صحبت نہ ہوگا بلکہ وہ پلے پیسے کی مالک آپ ہی ہوں گی۔“

اس نے اسے خاموش سا دیکھ کر۔ مزید بتایا۔ ”اُف مذاق بھی حد ہوتی ہے اور پھر یہ بھلا یہ مذاق کا کونسا موقع ہے یہاں دل ہلانا دے۔ اور بے کس جیسے میرے زخموں پر ٹپک رہا ہے۔ اس نے سخت جُڑ جُڑ ہو کر میری جتنی سنگتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔“

”مگر وہ چہرے پر کبھی کبھار کیلے سامنے ٹریفک کو ہی دیکھنا نظر آتا۔“

”ایسے معاملات جن پر دو انسانوں کی زندگی کا انحصار ہو۔“ سنجیدگی کے مذاق کی جھینٹ نہیں چڑھائے تھے۔ بلکہ سنجیدگی اور بھی اتنی رائے سے ملے ہوئے ہیں۔ اور اس کی سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی اتنی رائے سے ملے ہوئے ہیں۔“ وہ تو گویا بھلے پر پوچھ کر کیا جا رہا ہے۔ اس نے اس کی سنجیدگی سے خائف ہو کر دل میں سوچا مگر وہ ذاتی حدود سے سبک دے کر لولا۔ ”اپنی لاپرواہی میں ہی کہہ رہا ہے۔ جب اس کے سامنے حقیقت کا پردہ چاک ہوگا تو پھر یوں اچھی بات نہ رہیں۔“ یہ تو کچھ بھی کہہ رہا ہے۔

”یہ کبھی نہ سوں گی۔“

”تجسس اس ایک تو میری ہوتا رہا ہے کہ میں آپ کی زبان سے جو کہہ گا کہ آپ جبراً یا شراحتی میں کہتی رہیں لیکن یہ معاملہ میں آپ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔“ سنجیدگی کے ساتھ اس نے اس کے ساتھ اس کی اتنی جلدی بات بھی آپ سے نہیں پوچھوں گا بس بغیر کسی دباؤ اور کچھ بٹ کے صرف اتنا بتا دیکھے کہ آپ زندگی کی رفاقت میں میرا ساتھ دینا پسند کریں گی؟“

اس کی خاموشی اسفند کے لیے طری صراحت تھی۔ اس لیے وہ اس سے صاف صاف جواب مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ ”وہ تو آخر اس نے تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“ جبکہ اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔ ”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

”جیکو تم اس معاملہ کو اس وقت تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس نے جواب دیا۔“

”اے ابھی سب کچھ بتا دو۔ سولو تمہیں یہ پوچھ کر ڈالا۔“

” لیکن تو میرا اس وقت کچھ تلسے کا موڑ رہا ہے اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے۔ معلوم ہے ٹھیک دی بجے اپنے لہو کی طرح اٹینڈ کر رہے ہیں اور صرف دس منٹ رہ گئے ہیں بینک شروع ہونے میں۔ دس گھنٹہ اس وقت بینک نہ ہوتی تو میرے پورا دن آپ کے ساتھ ہی گزارنے میں لگا دیتا۔ لیکن ان کے لئے کھانا بھجوا دیا۔ وہ اس سے باہر کھانے کے لئے صدمہ کھو کر اس کے گھر گیا تھا۔ مگر جو بھی اس کو دیکھتا ہے اسے بینک کے اوقات کا احساس ہوا۔ اس نے فدا ہی ہو کر کوئی ٹھکانہ دیا رکھا، اور بہت تیز رفتاری میں گھر کو لوٹ گیا۔ مگر اس کے دل کو تو ایک دھچک بھڑکی سی تھی۔ کچھ دیر نہیں آ رہا تھا کہ وہ دس گھنٹہ کی بجے پہنچا۔ یہ بھی تو ممکن ہے اسے اصل باتوں کا علم نہ ہو۔ اور وہ محض جانی جان کے حالات کے پیش نظر اسے دعوے سے کہہ رہا ہو کہ مجھے تمام حالات کا علم ہے لیکن یہ تو بہت جلدت میں تھا۔ دوسرے گروہ اس سے اس معاملے میں مزید کوئی سوال کرتی تو جیج بھول کر ہی اٹھتا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اصل اور خالص بات ہے۔ وہ اسے صاف صاف کہوں نہ بتا سکے کہ تبھی وہ بولا۔

” حالات بڑے دہے ہوئے ہیں یا جیسے میرے نزدیک انہیں دہرائی کی حالت ہی ہوتا ہے۔ اور میرے دل آپ کو صرف پسند ہی نہیں کیا بلکہ پوری صداقت سے چاہا بھی ہے۔ تو میرے اپنے ہاں سے آپ کا کچھ کہنا ہے سو رہی ہوگا۔“

” لیکن ایک دھچک سے شاید آپ اب بھی ناظم ہیں اور میں۔“

” اوروہ۔ آپ نے تو آج میرا سلام و طاعت ہی کر کے رکھ دیا۔ بڑی بے رحم ہیں آپ۔ یا میرے آپ کو کچھ سے۔ اوروہ۔ ہاں سب سے بات تو میں پوچھنا ہی چاہتا تھا۔ کیا آپ کبھی مجھے کسی قسم کا لگاؤ دیا الیت ہے یا پھر میں یہ میرا ایک طرز جذبہ ہی ہے۔ اب میرے خیال میں تو ان کی بات بتانے میں تو آپ کو تھکا نہ چھوڑا کیوں؟ اس نے اپنی بات کو ایک سوال کی صورت دے ڈالی۔ سوال بھی ایسا مشکل کر ڈیو بھی تھی ثابت ہوا۔ اس نے اچھا موقع ملا تھا۔ یہی کہنے کے لئے وہ صاف صاف کہہ رہی تھی کہ ہاں آپ کا جذبہ محفوظ ہی ہے۔ یا پھر اس سے نجات حاصل کرنے کو کوئی ایسی بات کہہ سکتی تھی مگر نہ برا ہوا ہی نہ بھروسہ کرنے والی کوئی دل چاہنے کی بات نہ کہنے کی اجازت ہی نہیں دی۔

” وہ جو کہنے میں نہ کہ خاموشی بھی رضامندی کا ایک اظہار ہوتی ہے کہ کیا میں آپ کی خاموشی سے ہی مطلب انداز کر لوں۔ اس نے اپنے سوال کو اب طلب کرنے کی غرض سے آخری تیز رفتاری سے کر چلائے۔ چلنے سے اس کی طرف توڑا اس جگہ کہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی تو اس نے دیر لگائیں ایک ہی منٹ نہ ہوا جسے سب کو بھول کر اس نے گہرائے ہوتے لیے میں کہا۔

” دیکھیں دیکھیں کہیں ایک ہی منٹ نہ ہو جائے۔“

” خدا کے برے ہی جیسے وہ بھی میرا سگڑا آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد ہی ہوا۔ تاکہ کسی طرح اس غلش سے توجہ نہ ملے جو آپ کی بے اعتنائیوں کے نتیجے میں بھگت رہا ہوں۔“ وہ اس کے جواب کو لے کر جانے پر چل کر بولا۔ اور وہ اس کی بات پر ہنسی اٹھی۔

” اُن تو یہ بھی باتیں کہتے ہیں آپ۔ خدا کے برے جو آپ کا ایک ہی منٹ ہو۔ آپ تو سنبھل آقا کے نسل بردار میں میری تو یہ دہا ہے کہ میری عمر بھی آپ کی ملگ جیسے، اور جہاں میں اس نے ایک تہہ پہنچ کر کھڑے ہوئے گا۔

” ہا ہا ہا۔ اب اس بچے کوئی غم نہیں۔ مجھے یہ بات کا جواب مل گیا ہے۔ تو وہ خود اپنی ہی بات پر بری طرح ہنسنے لگا۔

” دیکھئے کج بین انسان تو جس کی شاید یہ بھی ہوا ہوں گا۔ اس نے کہا تو سب نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں؟ کیونکہ اس کے اس فقرے کا مطلب کچھ کہہ رہی تھی۔

” معلوم ہے کہ کیوں؟ اس نے خود ہی پوچھا۔

” مجھے کیا معلوم؟ اس نے کہا۔

” کیونکہ میری زندگی میرے ساتھ ہے۔ اب اسے چھوڑ کر وہاں جاؤں گا تو ہمیشہ کی طرح خود کو تنہا تنہا ہوں گا کیونکہ اپنی زندگی کا تعلق اس کے دل میں ہے۔ ساتھ ساتھ میرے گھر وہ بڑی خوشحالی کے عالم میں بولا۔ اب ایسی بات کا جواب یا سوال ہی اس کے پاس کہاں تھا۔ خود کچھ دیکھا یا پھر بھی۔ کیوں کہ ملنے لگے خاموش ہی بیٹھی رہی۔

” ایک بات پوچھوں؟ اس نے کسی خیال کے تحت اس پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

” پوچھیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

” کیا بھی میرا قصور بھی آپ کے ساتھ رہا ہے؟“

اب بھلا وہ کیسے کہہ دیتی کہ ہاں تصور ہی کیا تم کو میرے خوابوں میں بھی میرے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہو تم کو کسی تصور ہی نہیں کر سکتے جتنا میں نہیں جانتی ہوں۔ مگر۔ مگر یہ جاہت صرف میرے دل اور ذات تک ہی محدود ہے جسے تم سے اسے سوالات کر کے مجھے بھٹکانے کی کوشش نہ کر دو۔ میں تو تم سے دور بھاگنا چاہتی ہوں۔ بہت دور۔ اور تم ہو کہ میرے لیے کوئی

” کوئی آزمائش ہی محو ہی کر دیتے ہو۔ لیکن یہ سب وہ اس سے کہنے کی ہمت نہ کر سکی کہ یہی تو اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور اس نے کہنے چاہئے یہ سوال کیا تھا۔ آخر بہت سوچ کچھ کر بولی۔

” میں نے آج تک اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔ اصل میں سرورس کرنے کی دھن کچھ ایسی سوار ہے کہ ہر وقت بس اسی دھن ہی بجتی رہتی ہوں۔“ اور وہ بھانسنے کیوں بیٹھنے لگا۔

” ہا ہا ہا۔ اتنے کہتا ہے انداز بھی بہت خوب ہے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے ناکہ صورت سائل خود سوال ہوتی ہے، تو آپ کے چہرے کے تاثرات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے یہی ہی کسر آپ کی انھیں پوری کر دیتی ہیں؟

” اپنی بات کہنے کے بعد بھی وہ ہنسنے لگا۔ اور وہ جو رسی بنی خاموش بیٹھی رہی۔ چونکہ گھر نزدیک آ گیا تھا اس لیے بھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ اور جب اس نے گھر میں داخل ہو کر کار کو پورچ میں روکا تو اس کا شکریہ ادا کر کے اترتی ہوئی بولی۔

” دیر تو آپ کو ہو ہی جائے گی لیکن ذرا احتیاط سے گاڑی چلائیں گے۔ یہاں کراچی میں تیز رفتاری بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔“

” اچھا اچھا آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“ اور پھر وہ اسے خدا حافظ کر کے کار کو ایک زبردست اسکیچ دے کر رن سے ہوا ہو گیا اور وہ اس کے خیریت سے اسپتال پہنچ جانے کی دعا میں باقی انداز لگتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت باہر مالی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور مالی بھی لان کے کونے میں ڈور بیٹھا کیا رہا تو گوروہ کا تھا۔ کریم شاید باہر گیا ہو تھا اور ٹیلا کا بچہ۔ ورنہ اسے اس کی کار سے اترتا دیکھ کر تجسس ہونے لگتا۔

” وہ اپنے رہائشی کرے میں آئی تو اس کی اس قدر حیلہ واپسی پر سلی بھی متعجب ہوئے بغیر نہ رہیں۔

” دیکھو کسار با تہرا انٹر ویو؟ انہوں نے چھوٹی سی پوچھا اور وہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ اندک کرے میں ایک ہفتی بھی موجود ہے جو اس کے اس قدر حیلہ واپس آئے پر استفسار ضرور کرے گی۔ اس سے صورت بھی نہ بولا جاسکا۔

” میں انٹر ویو دینے جا رہی ہوں کہاں سکی ماں جان۔ مجھے تو اُدھے راستے سے ہی لوٹنا دیا گیا۔“

” ہاں کیا مطلب۔ بتائیں اُدھے راستے سے کیوں لوٹا دیا گیا؟ اور تب اسے اپنے اتنے زیادہ سچ بولنے کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے بولی۔

” میرا مطلب ہے کھڑے کھڑے ٹانگیں مل گئیں مگر کوئی سواری ہی نصیب نہیں ہوئی تو پھر انٹر ویو دینے کیسے جا سکتی تھی؟ آخر تنگ بارگاہی تھم رہی تھی۔“

” اے تو کھڑی کر دیتی تھی تو توئی کی جھلا کریم سے سواری کیوں نہ منگوائی۔ وہ تو جھلاوے کی طرح جاتا اور لپک چھپکے میں سواری لے آتا۔“ سنی سنی بولیں۔

” جی ہاں میں سواری میں اگر کریم سے سواری منگوائی تو وہ آپ کے منظور نظر پہلے ہی سے کرنیوٹا نہ کر دیتے میرے باہر جانے پر۔ اس نے مل کر دل میں سوچا۔ اور بولی۔

” جی ہاں بس کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ اصل میں جو چیز نصیب میں نہیں ہوتی وہ کبھی ملتی ہی نہیں؟“ وہ ایک شکست خوردہ لہجے کے عالم میں اپنے تہہ پہنچتی ہوئی آزدہ سے بچھے میں بولی۔

” ہاں ہاں ہاں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ناکہ ایک در بند تو ستر گھلے تو بس تم اپنی کوشش جاری رکھو۔ اگر نصیب میں نہیں آتی تو خود کوئی نہ کوئی تو ہو ہی جائے گی۔“ سنی سنی بولیں۔

” لیکن ماں جان میں نے تو انٹر ویو کے لیے جانے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اگر میں اس انٹر ویو میں کامیاب نہ ہوتی تو تنگ کر کے تنگ کا پیشہ اختیار کر لوں گی۔ سنا ہے کہ بڑے اسپتالوں میں کام کرنے والی نرسوں کو رہائشی ہو کر بھی دی جاتی ہیں۔ ورنہ آپ ہی سوچیے۔ انٹر سٹیشن بھی جھلا کوئی تعلیم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی میں نے اپنے شوٹنگ سے حاصل کی ہے ورنہ ہمارے بھائی جان تو میرے سے پڑھانے لکھانے کے نال ہی نہ تھے۔ وہ بڑی بے دلی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

”اماں جان! ناز و دلچسپی لپکا کے سکراتی نظروں سے نیلہ کی طرف دیکھا لیکن نیلہ نے کوا سے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسفندیہ نے دیکھ لیا۔ اسے اس کی اس دوغلی پن کی حرکت پر غصہ تو بہت آیا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ ماں کے زیر اثر ہے۔ اس لیے اس نے ہنس پر غلامی نہیں کیا کہ وہ اسے مسکراتا ہوا دیکھ چکا ہے۔ بلکہ بہت ہی سنجیدہ لہجے میں گویا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”اماں جان کے پاس کوئی بیٹہ جلے تو اوریت کاسا لوں ہی بیٹا نہیں ہو سکتا۔ ان کی شخصیت باغ و دھارا پر مبنی تھی۔ وہ داستان میراں ضرورتاً ثابت ہوئی ہیں۔ اور اس کے اس فقرے پر نازو نے اتنی دیر سے منبسط کی کہ بولنے سے کسی کو اک قہقہے کی صورت میں چھوٹا۔ مگر گیلپا تو اس کی بات کو کبھی نہیں سمجھی یا کسی اور خیال میں مگن تھی۔ وہ خاموش رہی یا بیٹھی رہی اسفند نے ناز کو تدریس فہمائی اماں میں دیکھا تو وہ اپنی ہنسی روک کر لولی۔

”مجھے تو عجب اس بات پر ہے کہ اتنے غریب انگلینڈ میں رہ کر بھی آپ اتنی اچھی ملکہ با مجاہدہ اردو بولتے ہیں شہزاد
ظاہر تھا اس نے یہ بات سنا کر گرا زائل کرنے کے لیے یہی سعی جو اس کی بیٹی سے کئے ذہن میں بندھ گیا تھا۔ اس قدر
جی تھرپا تھا وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

”کیوں کیا اعلیٰ زمین رہ کر میرے سیٹنگ نکل آئے تھے جو میں اپنی مادری زبان ہی بھول چکا تھا۔ بلکہ مجھے تو وہ لوگ بہت ہی چھپورے اور کم ظرف لگتے ہیں جو لوگ اسے اور اسٹینس سے آکر یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے پیداؤشی انگریز یا امریکی ہیں جو کھانے پینے میں لباس کے معاملے اور بات چیت کرنے میں تعصّب اور دکھاوے سے کام لیتے ہیں۔ اسے سنی پھان کی مٹی سے تیار کیا خیر رکھا جس سرزمین پر تم پیدا ہوئے اور جس گود میں پروان چڑھے اسے بھول کر تم دوسروں کی رہیں میں لگ گئے۔ دراصل یہ سارا قصور غلامانہ ذہنیت کا ہی ہوتا ہے۔“

”او ہوا و بھائی جان یو آرویری گریٹ۔ (آپ بیت عظیم ہیں)“
 نیلما بھائی کے خیالات میں خوشی میں تالی پیٹ کر بولی۔
 ”خیر، ٹوکیا البتہ چھوڑا نہیں ہوں، وہ انکسار سے کام لے کر بولا۔

ادھر نہ کرے آپ سمجھو پھر کہوں ہونے لگے۔ میں تو آپ کے خیالات میں کہ ایک فرما محسوس کر رہی ہوں کہ اصل میں ناز و جود کا مختلف نظریات ترحمتی سنی منہلہ کے تعریف کر کے پرمعن بھائی کو خوش کرنے کی غرض سے بولی۔ وہ بھی جانتا تھا وہ طبیعت مزاج حتیٰ کہ نظریات کے اعتبار سے اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بے

میں لولا۔

در کسی کی بڑائی یا اچھائی پر صرف فخر کرنے سے کام نہیں چلتا۔ بات کو جب سمجھتی ہے جب انسان خود بھی ایسی ہی مانند اپنے اندر پیدا کرے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میری تمام اچھائیوں کا کرڈٹ اماں جان کو جاتا ہے تو میں یہ کہنے میں کیا لیے حق بنایا ہو گا کہ میں نے ان کی تعلیمات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے۔ اور تم نے بھی جو میری اس بات کا فخر کیا کہ اماں جان اپنی ذات میں دستان میں رہیں تو یہ تو خبر میں نے خود بتائی ہے کہہ رہا تھا۔ لیکن حقیقتا اماں جان اپنی ذات میں بہت زیادہ ہیں۔ ایک مکتب ہیں ایک تو انہوں نے اس زمانے میں جو گجراتیشن کیا تھا جب عام لوگ میرے سے تعلیم نہواں کا تھا۔ ان کے ساتھ ڈیولونڈنگوں اور سائنیکوں پر پڑھنے کا زمانہ تھا۔ اور وہ ان کا کھروس سے باہر قدم نہ سنانا دیتے تھے ہوتا تھا۔ اور ایسی ہی بندشوں میں بندھے دور میں انہوں نے بی ایڈ بھی کر لیا تھا۔ ادا اس کے بعد تقریباً بیس سال بعد کاران علم کو مسلسل درس دیتی رہیں لاکھوں مذہبی لیکن ہزاروں طلباء اور طالبات کی انہوں نے پڑھایا ہے۔ یہ بھاری جامعہ میں ان کی شاگردی رہی ہیں۔ اور کوئی نہیں تو کم از کم تم ہی کیلئے تصور دیر کے لیسان کے پاس بیٹھ جاکر تو سب سیکھ لو گئی۔ اس نے نمل کو مخاطب کہتے ہوئے انی بات ختم کی تو نمل جلد ہی سے بولی۔

”جی ہاں بھائی جان! جب کبھی بیٹے کا موقع ملتا ہے تو قتلواری دربار تو کہاں میں تو کہاں جان کے پاس کسی کی حضورؐ
رہتی ہوں میں تو ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ نیلی کی بات پر خوش ہونے یا سراسر بے کے بھانے اس نے کہا۔
”ہاں کر ہی بھی چاہیے کیونکہ انہوں نے بھی ہماری محبت میں اپنی زندگی تباہ دی ہے۔ یہ ان کی محبت ہی تو ہے جو
اپنا حق بیٹے کے باوجود اپنا حق تک نہیں لیا اور ہمارے اتنے مفایا نہ روئے گئے باوجود ہم پر اس قدر جان چڑا دی ہے۔“

بڑی کھلاورداری جو بھی ہے لیکن تم کو میری سب سے زیادہ باصلاحیت اور با شعور بہن ہو اور اہل اب تو ایک ذمہ دار بھی بننا لو اسی پر جو بھی ہے وہی سے شروع ہی سے واقف ہو لیکن اب تو تمہیں ہر قسم کے لوگوں سے ڈال کر ناجی اچھی بھی بننی ہو انٹیکس وغیرہ سے تم شروع ہی سے نہیں کر سکتا کہ تم اماں جان یا سلوط سے غیرت برت کر ان کی ہوس کا یہ مطلب ہے میں تم سے کم از کم ایسی ایک توقع ہے، وہ بھائی جو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہ کر سکتا تھا سنی ہو تو یہی کہ اخلاق ہی ایک ایسا جوہر ہے جو انسانیت کی حرا ج کہلاتا ہے۔ وہ بھائی جو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہ کر سکتا تھا کیا تو آج اس قدر محل ملے پائیں کہ بد استا اس پر اس سے نازو کے اخلاق اور اوصاف کی تعریف بھی کر دانی تھی جس سے آن کی زن میں ناز کے دل میں سبکی لگیم اور سلوط کی طرف سے بھی اسارا کٹر چھٹ گیا۔ لیو بھی انسان خواہ بد و بارز با شعور جہاں نیدہ اور تجربہ کار ہو۔ اپنی تعریف بھی اس کی ایک کمزوری ہو تی ہے۔ جس سے لاکھ بیچھا چھڑانا چاہیے۔

اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جائے اس کے باوجود یہی کمزوری اس کے اندھ بھی کسی تہہ میں چھپی رہتی ہے۔

اور ناز تو ایک فوٹو گفٹ بھولی کی طرح تھی۔
 کم از کم تعریف کے معاملے میں تو ایک عام سی لڑکی ہی ثابت ہوئی تھی۔ بھائی کی ناصحانہ گفتگو نے اس کو اتنا اثر
 نہیں کیا جتنا کہ تعریف نے۔ یوں بھی نیک اور اچھی باتوں کا اثر لینے کی صلاحیت تو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے
 یہ بات ہے کہ وہ اس صلاحیت سے کام لینے کی کوشش نہ کرے۔

نوسو بھائی کی پرستاش باتوں کی روشنی میں اس نے بھی سوچا کہ واقعی بھائی جان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ غلطی ہماری ہی ہے کہ ہم نے خود ہی امان جان اور سلوٹو کو غلط انداز کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ تو ہمارے گھر بھائی کی شخصیت سے رہ رہی ہیں یہ فرض تو ہمارا ہے کہ ان سے اچھا سلوک رہا رکھیں اور چونکہ بھائی نے اس کو ایک ذمہ دار اور باصلاحیت ہستی کے طور پر دیکھا ہے اور مضبوط محسوس کر کے کوئی۔

”نہیں بھائی جان! آپ مجھ سے تو کبھی ایسپیکٹ (توقع) کیسے کیا گا ہی نہیں کہ میں کسی کے ساتھ بد اخلاقی اور بد عملی کرے جاؤں گی۔ وہ اصل میں چوکنکہ میں اماں جان کا بہت زیادہ ڈیگنڈو (احترام) کرتی ہوں اس لیے ان کے سامنے زیادہ بات نہیں کرتی۔ اور یہ تو شخص اتفاقاً تھا جو اس جہاں میں سب سے گناہی وہ نہ ہمیشہ گنہگار نہ ہونگے کے لیے ہی آتی ہوں۔ لیکن اماں جان سب سے بغیر تو نہیں بھائی! اثر (ظلم و مہم)ی وادی ہی تو ہیں۔ اپنی سگی وادی کو ہم نے دیکھا ہے نہ جانتے ہی ہیں!“

تجربہ سے کہتے کہ مقصد تو یہ تھا کہ اور کوئی نہیں کہ اگر کم تو اپنے اندر ایسی صفات پیدا کر جن پر میں فخر کر سکوں۔ گو
ابھی کاپانی بولے ہو۔ لیکن اس مگر کی بڑی بیٹی اور ایک ذمہ دار ہستی تو ہوتی حسن اخلاق بر توئی تو تنہا ہی دیکھا دیکھی یہ دونوں
بھی بہت ہی سچے گھر جاتیں گی۔ یہ ایک لمبی سی جہاں کے لڑکے کا قیام کو تھما کر رہا ہوا ہوا۔

ہر ایک کی جان بچانے کے لیے وہ اس موقع کو غلط کرنے کی عوض سے اس کی طرف متوجہ ہو کر چلا۔

پھر بھی ہمارے ہی گروا کا قاتل سخت لوریت کا شکار معلوم ہوتی ہے، _____ کیوں نہ آج اسے لڑے گا اور جھگڑے میں جلاجلے کیوں ناز و جدو؟

”بائیں بھائی جان تیسری آپ کی مرضی، مگر میں تو ششام کو گھر واپس چلی جاؤں گی؟“ ناز و بلوئی۔
 ”نہیں! تمہارے میاں تو نکاح گئے ہوئے ہیں، پھر تمہیں اتنی جھلٹ کیا ہے گھر جانے کی؟“ اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر
 پوچھا۔

وہ اصل میں گیارہ بجے رات کو احمد کی کال آئی ہے۔ اور میری ساس بھی آج کل پنجاب گئی ہوئی ہیں۔ وہ رات کو میری دونوں نندوں کو گھر پر نہ تھا جوڑنا پسند نہیں کرتیں۔ نا زانوے بتایا تو وہ کچھ سوچ کر نکلیا سے مخاطب ہوا۔

اس کے ساتھ ہی کہہ کر وہ اٹھ کر گئی۔ ہاں اس نے سینڈز پرٹ کلفٹن بیچ یا پھر کیمیاڑی سے بوٹنگ پر مگوئیاں کا کہیں جاتے

کا موڈ نہیں ہو رہا تھا مگر زندگی میں پہلی بار کتنے دلار سے بڑا بھائی پوچھ رہا تھا اس لیے بونگ کا سن کروہ گھر کر گیا۔
 ”نہیں نہیں بھائی بونگ کا تو سوچے یہی نہیں پہلے ہی گھر سے بادل چلائے ہوئے ہیں۔ یہی آپ جہاں ملے گئے میں وہیں چلی چلوں گی؟“
 ”بھئی کوڑھ کو بھی تو ساتھ لے جانا وہ بھی تو شام کو پہن آ رہی ہیں وہ نازو لے گیا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ کوڑھ کو ساتھ لے جانا تو ضروری ہوگا۔ میرے خیال میں تو سلوٹا کو بھی ساتھ لے چلو کیونکہ یہ نازو نہیں رہیں صرف تیری آدمی بلک کر کرتے کیا اچھے لگیں گے؟“ وہ اپنی دیر سے جس بات کے لیے کوشاں تھا اور زندگی میں بارہنوں کے سامنے اتنا بولا تھا آخر وہ بات زبان پر سے ہی آیا۔

”لیکن سلوٹا تو بھائی کی ہی نہیں اور یہ بات میں شرط یہ کہہ سکتی ہوں۔“ نازو سلوٹا کا نام سنی کر جلدی سے بولی۔
 ”کیوں بھئی یہ تم نے اس قدر شرط و طور پر سلوٹا کے نہ جانے کے بارے میں پیش گوئی کیوں کر دی؟“ اس نے جان کا بڑا سوال کو مزاح کا رنگ دے ڈالا۔

”کیونکہ وہ اماں جان کو تنہا چھوڑ کر جانا کبھی پسند ہی نہیں کریں گی۔ بلکہ جائیں گی ہی نہیں۔ یہاں شاید اسی خیال کے ہیں۔“ نازو کے بجائے نیلما نے بہن کی بات سے کچھ ہی مطلب اخذ کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں بالکل، اسی خیال سے کہہ رہی ہوں یوں بھی واقعی اماں جان بالکل تنہا رہ جائیں گی۔“ نازو نے بہن کی بات کے برا فوراً ہی اپنی بات سنبھالی۔

”خیر خیر، اماں جان کی فکر نہ کرو۔ ان کی تنہائی کا بھی انتظام ہو جائے گا، وہ اماں جان کے تنہا رہ جانے کے لئے طرف سے لاپرواہی کا اظہار کرتا ہوا بولا تو نازو نے تعجب سے پوچھا۔

”وہ کیسے بھائی جان؟“
 ”ارے بھئی، مسز راق کو ان کی چوکی پر مامور کر کے جائیں گے ہم۔“ وہ دہی دہی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
 ”مسز راق، کون مسز راق بھائی جان؟“ نازو نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔ تو نیلما جو خود بھی اس کے مزاح کہنے پر لچر جی گئی تھی، ہنسنی ہوئی بولی۔

”یہ مانی کی بوی کو کہہ رہے ہیں اپنا!“
 نازو ہنسنے ہنسنے ٹہری ہوئی۔ ”واہ بھئی یہ مسز راق بھی خوب کہا آپ نے؟“ اس نے کہا۔

”اوہو معلوم بھی ہے ساڑھے چار بج رہے ہیں یعنی کہ باتوں میں وقت گزر چلنے کا تیار ہی نہیں چلا۔ اچھا اب تو اس سے چائے لگواؤ۔ اتنے میں بھی ذرا فرش ہو کر آتا ہوں۔“ وہ اپنی رست و راج میں وقت دیکھ کر اٹھتا ہوا بولا۔ فرش کے اس کا مطلب نہادھو کر لباس تبدیل کرنے سے تھا۔

”بھائی جان! یہی پر شام تک ہی چلیں گے نا آپ؟“ نیلما نے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں۔ تھارے کوڑھی تو شام کو ہی آ رہی ہیں نا۔“ بھئی نے سلوٹا کو بھی تیار کر لیا۔ اس نے کہا اور پھر یہ بات

کمرے میں چلا آیا۔
 اس کا مقصد جو سلوٹا کو اپنی فیملی میں ملوانے لگھوانے اور اس کی جھجک اور شرم دور کرانے کے سلسلے میں تھا

حد تک پورا ہو گیا تھا۔ کیونکہ نیلما کے بارے میں تو اسے معلوم تھا کہ وہ بہت سیدھی اور صاف دل لڑی ہے۔ مگر نازو کی تربیت یافتہ اور زیر اثر بھئی اس کا برین داغ کرنا ضروری تھا۔ اور یہ آؤنگ پر جانے کا پروگرام جو اس نے جیسے جیسے کیا تھا۔ وہ چھوٹی بہن کی بوریٹ دور کرنے یا اسے خوش کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ سلوٹا پر چھانے ہوئے جو ڈر تھا اس حصار سے جو اس نے اپنی مجبور یوں اور حالات سے بد دل ہو کر اپنے گرد باندھ رکھا تھا نکالنے کی غرض سے ہی کیا تھا تاکہ اس کے اچھے ہونے ذہن اور پریشان خیالات کو سکون اور آسٹھی نصیب ہو سکے۔

وہ واقعی اسے پوری صداقت اور دل کی تمام تر گہرائیوں سے جانتا تھا۔ گو اس نے بھی ایک دنیا کی بھئی تھی جس کے درمیان رہ کر ایک غصہ گرا کر تھا اور اپنے وطن میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر مہم جیتوں کو دیکھتا تھا جن کے پاس وہ اور تعلیم کے تھے اور بڑا خیال بھی تھیں اور ان میں سے کچھ اسے بھائی بھی لگتی تھیں۔ مگر سلوٹا کے سامنے دل باریک بینی سے

نہیں دیکھتا تھا کہ دل ہی تو بے خواہی پر آئے یا گدی پر۔ کیونکہ سلوٹا اگر لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ایک تھی اور ان دنوں میں ایک ہونے کا بخاوردہ تو اس کی خسی صورت پر بالکل ٹھیک ٹھیک صادق آتا تھا مگر وہ جس سیرت میں بھی بیٹھا تھی۔

باوقار
 پروڈار اور خلق
 باسیا اور خودار

اس پر وہ دوسروں کی ہمدردی بھی تھی اور مخلص بھی
 نوزی میں ہی حالات کا شکا ہو گئی تھی۔ اس لیے بہت دبی دبی، ڈری ڈری اور افسردہ سی نظر آتی تھی اور بس اس کی یہی بات
 امداد سے منہ نہ کھنتی تھی کیونکہ ایک تو اس گھر سے اس کا رشتہ ہی ایسا تھا کہ اس گھر میں اسے بڑے شتے سے رہنا چاہیے تھا۔
 دوسرے گھر سے نہیں بھی رہ سکتی تھی تو گھر والوں کی نظروں میں کچھ تو اپنی حیثیت بنانی چاہیے تھی۔ یہ کیا کہ ہر جا اور بے جا بات
 پر دہن کھنکھانیاں اور سر تسلیم خم جب کروہ تو اسے اپنے لہول (رابر) پر لانا چاہتا تھا کیونکہ وہ اسی ہی لڑکی کا خواہاں تھا
 جیسی وہ بھی ہر لحاظ اور اعتبار سے اس کی مرضی کے مطابق یعنی ٹوہ پوری بنجید کی اور سچائی سے اسے اپنانے کا تمہید کر چکا تھا۔

وہ بہنوں کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا تو بہت خوش اور گن ساتھ اس بات کی طرف سے تو اطمینان تھا کہ جب
 اس نے سلوٹا کو بھی آؤنگ پر جانے کے پروگرام میں شامل کر لیا ہے تو بڑی نہ بھی چھوٹی بہن سلوٹا کو اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور کر کے ہے گی۔ بلکہ یہ بے خبر جانے کی ہی نہیں یہی وجہ تھی کہ اس نے بہنوں کے ساتھ جانے میں شرکت بھی نہیں کی تھی بلکہ جانے
 اپنے کمرے میں ہی تنگوائی تھی اور اس وقت اپنے کمرے سے نکلا تھا جب کوڑھ کے آ جانے کی اطلاع ملی تھی۔

اس سے شام پوری کا نانات پر اپنی سولہا نہیں بچھ چکی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر لان میں پہنچا تھا نازو اپنے کمرے جانے
 کے لیے پر تول رہی تھی اور کوڑھ شاید اس ایکایک بن جانے والے پروگرام کے بارے میں نیلما سے تبادلہ خیال کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے
 ہی ملک ملک کے بعد بولی۔

”آپ نے اپنے پروگرام میں سلوٹا پاؤں شامل کر کے بہت ہی اچھا کیا بھائی جان ورنہ وہ بے چاری تو ہر وقت بوریٹ کا شکار
 ہی رہتی ہیں۔“

”نہیں خیر، میں نے تو صرف پر ڈوگول (میز بانی کے آداب) نبھایا ہے اور یہ پروگرام میرا نہیں تم لوگوں کا ہے؟“ وہ نازو کو
 دکھانے کے لیے یوں بولا جیسے سلوٹا کو پروگرام میں شامل کرنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

”ہائے تو کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے بھائی جان؟“ نیلما نے اس کے آخری فقرے کا مطلب کچھ ہی لیا۔
 ”ہاں بھئی اب یہ ساری نازو نہیں جارہیں تو تم کیا جائیں۔ تم دونوں خود ہی چلی جانا تو وجہ اب میں روکھا سامنے بنا کر بولا تو
 کوڑھ ہنسنے لگی۔

”ہائے یہ نیلما آیا تو واقعی بہت اونسٹ (بھولی) ہیں۔“ اس نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”ہائے تو سہ سدا کی بدھو۔“ بھئی تو اتنا بھی نہیں سوچا کہ بھائی جان کے بغیر تو ایک دوسری دنیا کیوں کر کیسے جاسکتی ہیں؟

نازو نے بڑے دلار سے انداز میں نیلما کی بے وقوفی کو جتایا تو افسردہ ہنسنے لگا۔
 ”تم تم پر جانے کی اس قدر محبت کیوں سوار ہے نازو۔ ابھی تو صرف سات ہی بجے ہیں۔ اور ویسے بھی ہم وہاں سے زیادہ سے

زیادہ دو دو گھنٹے تک لوٹ آئیں گے۔ یعنی صرف گیارہ تک۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلی چلو۔“ وہ نازو سے مخاطب ہو کر بولا۔
 ”اگ۔“ نہیں نہیں۔ مجھے تو ماف ہی کر دیجیے۔ یوں بھی احمد کے بغیر بخوئے ڈر سکوں گی۔“ نازو یوں بدک کر بولی جیسے اس نے کوئی

بہت ہی بڑی بات کہہ دی ہو۔
 ”اوہو تم تو واقعی شوہر بہت ہو گئی ہو۔“ وہ منہ کر بولا۔

”صرف شوہر بہت ہی نہیں بلکہ فرض شناس بھی۔“ وہ بھی منہ کر بولی۔ اور سب سے رخصت ہو کر جانے لگی تو کار میں
 بیٹھتے ہی کچھ یاد کر کے اس نے کہا۔

”اوہ میں تو بھول ہی گئی وہ کل رات تھی کہ کال آئی تھی ڈیلی کی بہت ہی ہنر و دی کام کی وجہ سے اب تک بھٹکتے تھے۔ آج وہ وہاں سے مکمل غلط روز ہو گئے ہوں گے۔“

وہ بہت جلد یاد آیا آپ کو یقین اس کا مطلب ہے کہ ابھی ایک ماہ کا عرصہ اور گئے گا نیلویا جی کی واپسی میں؟

”نہیں خیر۔ ایک ماہ تو نہیں مگر نصف ماہ ضرور گئے گا۔ مگر کم کیوں پریشان ہوتی ہو جیسے عشرے تک تو میں مریض رہا کرتا تھا۔“

”ہاں تو صحتی ساری تیاری تو مکمل کر لی ہو گی تو دونوں نے اس کے جانے کے بعد اسفند نے کوڑا اور نیلا کو مخاطب کر کے کہا۔“

”ہائیں کیا کچھ بتا رہی تھی مگر میں نے تو خاصا مال سے کچھ بھی نہیں بویا۔ نیلا ستر و دی ہو کر بولی۔“

”یعنی آج جانے کی خوشی میں تم نے کچھ بکایا بھی نہیں گھر میں؟“ اسفند نے پوچھا۔

”نہیں خیر کھانا تو بیک رہا ہے مگر ساتھ لے جانے کے لیے تو کچھ بھی نہیں بویا میں نے“ نیلا بولی۔

”اوہ تو اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے، جی، تم کسی ریسٹورنٹ یا سٹیکس بار سے کھانے پینے کے لیے جا چلیے جلیں گے۔ کوڑا نے رائے پیش کی۔

”ہاں بس یہی ٹھیک ہو گا“ اسفند بولا۔

”تو کھیر تیار ہو جاؤ۔ یوں بھی رات ہونے میں کرکریا باقی رہ گئی ہے۔ شام تو ڈاکٹر زلفٹ دینے والے مہمان کی طرح ہی آئی۔“

”یہی ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ پریشانی ہوتی ہے۔“ اسفند نے کہا۔

”میں تو بالکل تیار ہوں۔ بس آپ کا انتظار تھا پھر کوڑا نے کچھ کہتے کہتے حسب عادت زبان دانوں میں وہاں کی وہ کوڑا کہا۔

وہ کیا کیا چاہ رہی ہے مگر اس نے کوئی استفسار نہیں کیا۔

”پھر وہاں کار میں جا کر بیٹھو۔ اتنے میں ہی دریا جیکٹ تبدیل کر کے آتا ہوں اور اسی بات کہتے کہتے وہ مڑ کر اندر چلا گیا اور حب واپس آیا تو پچھلی سیٹ پر نظر پڑے یہ کیا دیکھ اس کا دل اس پر یہی طرح دھڑکا کہ ایک لمحے کو تو وہ اپنی جگہ پر ٹھک کر رہ گیا۔ مگر پھر بھونے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کار میں آ بیٹھا۔ اس کی موجودگی کے احساس سے اس کے سینے میں انبساط اور مضبوطی لبرسی آئی تھی۔ وہ میں اس کے پیچھے ہی بیٹھی تھی اور سب دیر میں مرکب پر روان ٹریفک کی روشنیوں میں اس کا حسین سا مکملہ اوصاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لہو باز تو نہیں تھا لیکن جذبہ بے اختیار بار بار اسے دیر پر ایک نظر ڈالنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس لمحے وہ بالکل خاموش اور کھپکھپاتی سا تھا جیسے کوڑا اور نیلا آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ نیلا اس کے پاس فون پر پر مٹی تھی اور کوڑا پچھلی سیٹ پر سلوٹ کے پاس اور معلوم سلوٹ کے کان میں کیسے چپکے چپکے چھڑ رہی تھی کہ وہ بھی تھکی سے اس کا دل دھکتی اور بھی مسکرانے لگتی۔ اسے کچھ کچھ احساس ہو گیا تھا کہ کوڑا ان دونوں کے حلق کو توتاؤں گی ہے۔

بہر حال راستے میں اس نے ایک بڑے ریسٹورنٹ سے کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ یہی بیڈ اور کوک کی آدمی کریم کی ڈی کھوائی اور کئی قسم کے چمک بھی اور پھر تھوڑا سا فاسر ہا سائنڈز پرٹ جاپیٹھا۔

چاندنی رات تھی مگر چودھویں کی شب نہ تھی مگر چاند کی گیارہ۔ وہ تاریخ ضرورت تھی اور مسند شمس کی چاندنی کے پیرا پر مڑنے کی کوشش میں آپے سے باہر ہو جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آؤ کرے جلنے والی جھیلی جھیلی مگر ٹھنڈی ہوائیں ہلکتی تھیں۔ تاہم نظر۔ کھلا اور روشن روشن سا آسمان اور پیروں کے نیچے گیل گیل ریت۔ ساحل مسند تک دور دور پہیلی سیر میوں کی ڈوب اور عقب میں دور تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہی ہشش کا سلسلہ۔ سب بڑا کیف آگیاں سا لگ رہا تھا۔

مسند پر کھڑے (حفاظت) تھا اس لیے اسفند نے کوڑا اور نیلا کو پانی میں آگے تک جانے کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ چاروں ان حدود میں کھڑے ہو گئے تھے۔ یہاں پر ان کے پیروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر جاری تھیں۔ ان کے منہوں کو کچھ کر گزر رہی تھیں اور وہ اس بات پر خوش تھا کہ سلوٹ کی آج وہ بھی کچھ ہی کیفیت نہیں تھی۔ ایک سرے پر وہ کھڑا تھا۔ دوسرے سرے پر سلوٹ اور نیچے میں کوڑا اور نیلا اور وہ دھیمی دھیمی آواز میں مسلسل کوڑا سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ اس کے حسین جہرے پر مسکراہٹیں رکھنا تھیں۔

وہ کوڑا سے مخاطب ہونے کے ہانے کا ہے اسے ضرور دیکھ لیتا تھا۔

پھر اسی ترتیب میں جس میں وہ چاروں کھڑے تھے وہ بڑی دیر نہ رہے ہی کنارے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چمک تھکی کر لے رہے نیلا بھائی کی وجہ سے کم ہی بات کر رہی تھی مگر کوڑا مسلسل ٹپ کی طرح بچے چلی جا رہی تھی۔ وہ نیلا کے

شوں کے ساحلوں اور وہاں ہونے والی رونق اور گہما گہمی کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے آٹھ یا نو سال کی عمر میں پیرا کی ایک مقامی علاقے میں میزبل جیتا تھا۔ اس کے بارے میں بتا رہی تھی اور نیلا اپنے پیرا کی کے انتہائی شوق کا جواب ایک حسرت میں تبدیل ہو کر تیار بار کوڑا کر رہی تھی اور وہ دونوں کی باتیں سن کر صرف مسکراتے ہی رہتا تھا۔ جب کہ اسفند زبانی جواب دے رہا تھا وہاں سے غیر حاضری تھا۔ اس کے سینے میں اس کے بچے جذبات کی شوریدہ ہری اس جیسے مسند سے بھی کہیں زیادہ غور اس لمحے تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلوٹ کا ہاتھ پکڑ کر کسی تہا کوٹھنے میں لے جائے اور پھر نیلا سید چاک کے سونے کھار ہی تھی۔ اس کی صداقت کا یقین دلانے کیونکہ اس روز کار میں سلوٹ نے اس کی باتوں کے جواب میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ اس کے اپنے جذبے کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔

قدیم تھا کہ اس کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔

یہاں کا جذبہ تشہ ہی رہ گیا تھا اور جب وہ ٹھیلے ٹھیلے عاجز آ گیا تو اس نے رک کر کہا۔

”صحتی، اب کچھ کھاؤ تو کچھ بھی بہت بھوک محسوس کر رہی تھیں مگر شرم و محاذ میں اس نے نہیں کہہ سکی تھیں فوراً اپنی کار اور پٹ دونوں روکیاں جو خود بھی بہت بھوک محسوس کر رہی تھیں مگر شرم و محاذ میں اس نے نہیں کہہ سکی تھیں فوراً اپنی کار کی طرف بڑھ گئیں جو جس کے عقب میں کچھ ہی صے پر کھڑی تھی۔ اس میں ان لوگوں نے اب تک کھانے پینے کی اشیاء ڈکی سے نہیں نکالی تھیں۔

”میرے خیال میں تو میں کرٹ اٹھا لیتا ہوں اور تم دونوں یہ چلن اور سٹیکس اٹھا لو۔ پھر آرام سے بیچ پر بیٹھ کر کھاؤ گے؟“

”اوہ سپر! کوڑا نے اس کے شورے کو سراہا اور پھر وہ ساری چیزیں لے کر مسند کے کنارے سے کچھ فاصلے پر ریت پر بیٹھے۔

بھانے کے لیے بھی کوئی چیز لانا بھول گئے تھے۔ اس لیے تھیلیاں اور پیکٹس گود میں رکھ کر کھانے پینے لگے۔ کافی اسٹیکس، اچل اور پٹیکس لگتی تھیں۔ اب انہیں پھینکا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ جب کہ کوڑا کا کہنا تھا کہ یہ باقی ماندہ چیزیں بھی ہم دھو دھو سے چٹ کر جائیں گے۔

وہ کھانے کے بعد اٹھ کر چمک لگ کر رہا ہوا دور نکل گیا۔ تو توڑی دیر بعد دونوں لوگوں کو بھی ادھر ادھر بھر کر تفریق کرنے کا شوق چرایا۔ مگر جو کچھ ساری چیزیں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور انہیں چھوڑ کر وہ تینوں کہیں گھوم پھر رہی تھیں۔

کئی تھیں۔ کیونکہ کرٹ اور پٹیکس کرائے پر تھی تھیں۔ اگر کوئی لے کر چلتا پھرتا تو اسفند کے شفا ہونے کا خدشہ زیادہ تھا۔ اسی صورت حال کے پیش نظر توڑنے جب مشورہ دیا کہ یہ ساری چیزیں چل کر ڈی میں رکھ آئیں تو سلوٹ بولی۔

”نہیں اب یہ ساری چیزیں لاؤ کہ کار تک جانے کی ٹھیکر کیوں کرتی ہو۔ ایسا کر تو تم دونوں گھوم پھر آؤ۔ میں تو دیے بھی زیادہ گھومنے پھرنے کی عادی نہیں ہوں۔ اور آج تو تمہارے ساتھ واک کرتے کرتے بالکل تھک گئی ہوں۔“ تو دونوں ہی تھوڑے سے تکلف کا مظاہرہ کرتے کے بعد اٹھ کر کھوٹے پھرنے چل دیں۔

”دیکھو یہی زیادہ دور مت جانا۔ آج کل۔“ اس نے ان دونوں کے تنہا ہونے کی وجہ سے تاکید کرنی چاہی تو نیلا بولی۔

”نہیں تم جو خود سخت ڈر ہو کہ میں۔ بس وہ سائنٹک جا رہے ہیں آپ اطمینان رکھیے۔“ اور پھر وہ دونوں چلی گئیں۔

تو وہ اپنی ٹپ لاگوں کو آرام پہنچانے کی خاطر ریت پر ناگین پھیل کر بیٹھ گئی۔ خود اس پر بھی اس سے ایک سرشاری کا عالم جاری تھا۔ وہ اس کی خاطر میں کیسا بچا جا رہا تھا۔

کس طرح اعلان کر کے اسے چیزیں کھلوایا جا رہا تھا۔

کس قدر اچھا لگتا تھا۔ اہمیت، اسے رہا تھا کہ نیلا بھی اس کی خوشامد کرتی لگ رہی تھی۔ اور کوڑا شوق اور معنی خیز مسکراہٹیں۔

الکھڑے چمک رہی تھی۔

اور پھر وہ ایسی شان اور بھونے بھانے تو نہیں تھی۔ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ محض اس کو تفریح کرانے کی مرض سے اس نے یہ پیرا لگے بنائے۔ اس نے چھوڑ کر کھلے گئے کی زرد نیم آستین کی ٹی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ جس میں وہ اپنی اچھی رنگت اور کمر کی اور پٹیکس سے جم کے ساتھ سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں گھسا چلا کر رہا تھا۔

اس کے دل میں اترنے کو چل رہا تھا۔

”وہاں سے سینے سے تھوڑی سی سربازا سرباز سی بیٹھی تھی۔ کہ دفعتاً کان کے قریب ہی اس کی حیات بخش آواز گونجی۔

”نیلو۔ کیا ہو رہا ہے۔“ تو وہ اپنی اتنی حسین سی خوبیت سے اس پر یہی طرح چوٹی لگی تو کھلا ہٹ میں اس کے منہ سے نکلا۔

”کو کچھ بھی نہیں۔“

”نہیں خیر کچھ تو۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب ہی گیلی گیلی ریت پر لیٹ گیا۔ اور کبھی ریت پر جا کر اپنی کمر بٹھیر کر بڑا کرا کر روتے ہوئے بولا۔

”جہاں تک میرا اندازہ ہے کسی سوچ میں تم قیام نہیں۔ تو اس کا دل چاہا کہ تمہارے علاوہ اور کسی کی سوچ میں کم ہونے لگوں۔ غم اس کی قسمت سے پریشان ہو کر اس نے تھوڑا کچھ بریک کر پیرسٹ لے لیا اور پست سی آواز میں بولی۔

”نہیں تو۔“ مگر سمندر کی شوریدہ سہلوں اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہواؤں کے شور میں شاید اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ اندر سے متبادر ہو کر یا موقع پا کر اس وقت اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس خیال سے تھا کہ لوگیاں جیسے بیٹھے ہوئے رہی ہوں گی۔ انہیں بھی گھونٹے پیرسٹ کا موقع دینا چاہیے۔ اب یہ اس کے خیال میں اس کی خوش قسمتی بھی تھی کہ وہ تھکا ہوا مل گئی تھی۔ یعنی جس بات کی وہ اتنی دیر سے شدید خواہش یا تمنا کر رہا تھا وہ پوری ہو گئی تھی۔

”یہ دو دلوں کہاں ہیں۔؟“ اس نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”وہاں سامنے کھڑی ہیں زیادہ دور نہیں گئیں۔“

”اگر نہ جی جاتیں تو کیا ذوق پڑ جاتا۔“ وہ اس کی بات کے کچھ اندر ہی نہی لے کر بولا۔ اور وہ جواب دینے کے بجائے اس پر ایک نغز ڈال کر رہ گئی۔

وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں کچھ ایسی پیش تھی کہ وہ اتنے ٹھنڈے ماحول میں بھی پسینے پسینے ہوئی جا رہی تھی۔

دھننیں الگ بے طرح منتشر ہو گئی تھیں۔

اور وہ تھا کہ بالکل خاموش اور گنگ سا۔ شاید اس پر سے نظروں ہی مٹا، اھول گیا تھا۔ اور گھٹنے اوپٹے کیے۔ دو دلوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد پیچے بت بنی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کا گانا کر کے میں کوشاں تھی۔

وہ اس قدر قریب تھا۔ اس لیے آتشہ جذبول کی کوروش نے اسے ایک عجیب سی بے کلمی میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور اوپر وہ بھی۔ اپنے جلتے جلتے وجود کو ریت کی لم آلود ٹھنڈک سے آسودگی پہنچانے میں کوشاں تھا۔

دو دلوں کے بے بس ہوئے تھے۔

مگر دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔

اور انھیں۔ جذبول کی ترخان بنی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دوسرے سے اُلجھ اُلجھ سی جاتیں۔

کہ۔ محبت میں کچھ مقام ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں خاموشی زبان بن جاتی ہے اور آنکھیں جذبول کی تریجان۔

لیکن وہ اس کی طرح جذبول کی یورش سے پاگل نہیں ہوئی تھی۔

بلکہ نہ انہوں کا محو بہت احساس ضرور تھا۔ پھر بھی وقتی تاثر اور موقع کی رنگینی کی وجہ سے وہ اس کی نگاہوں سے چلتے جذبول کی پیلیٹ میں بے طرح آچکی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جو بنی ارادی اور غیر ارادی طور پر نظر اس کی طرف اٹھتی وہ یا تو فوراً پلکوں کی چلن گراہتی یا پھر نگاہیں سرسرا کر کسی اور طرف دیکھنے لگتی۔

اور اوپر وہ تھا کہ۔

نگاہوں کی نگاہوں میں اسے اس کے پورے وجود سمیت اپنے اندر اُٹانے کو بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ اور جواب میں وہ نگاہوں کی زبان میں بات کرنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔ اور نگاہیں جھکا کر ریت پر اپنی سفید سفید غمخیز انگلیاں پیچھے جاری تھیں۔

”میں آپ کے اس گریز کو کیا معنی دوں۔ کیا مجھوں سلوط۔ سب کچھ تو آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اب کیا میرے اچانق سے اپنا سینہ چاک کر کے اپنا دل بھی دکھا دوں۔ جس میں خون کے بجائے آپ کی محبت دوڑ رہی ہے۔“

ان اس کے ہمسے سے ایک کرب سا نمایاں تھا۔ مگر وہ جواب میں کیا کہتی۔ مجبور کی کے ٹھکنے میں یہی طرح بکھری ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے دل کی جو حالت ہو رہی تھی وہ تو وہی بخوبی جانتی تھی۔ یوں یہ خاموشی کی مہر بن گئے ریت پر انگلیاں پھینکتی رہی۔ اگر کرب کھوتی تو محبت کا سارا فسون ہی ٹوٹ کر بکھڑاتا۔ البتہ نگاہوں میں ہزاروں ٹھکے چلتے۔ کچھ کچھ بکھڑاتے ہوئے بھی اس کی خاموشی اور گریز کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔ تب اس نے ایک دم ہی ریت میں لے کر وہ سب کچھ اپنے آپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انگلیاں پھینکتے آپ کے بقول آپ اس معاملے کو مذاق پر محمول کرتی آتی ہیں تو یہ ہرگز ہرگز کوئی مذاق نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ جی اور نفوس۔ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ سوینٹ ہارٹ! میں آپ کو پوری سنجیدگی اور عقل و جوش کے ساتھ اپنانے کا تہہ نہ چکا ہوں۔ اور میں ایک بار جس بات کا تہہ نہ کر سکتا ہوں۔ ”تب دل میں اٹھتی در کی شدید ہر کوہ باکر اس کے منہ پر کھینچنے سے پہلے وہ قدرے تھکے اور شامی سے انداز میں بولی۔

”مفتوح ہے آپ میری مجبور یوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس پر بھی آپ اُنٹا مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔“ اپنی بات سمجھتے ہی اس نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ بھی چھڑا لیا تھا۔

”افوہ۔“ مجبور یوں کا رونا آخر آپ تک رسائی میں نہیں گی۔ دیکھیں انسان جتنا مجبور یوں کو اپنے اوپر حاوی کرتا رہتا ہے وہ اس قدر اسے جکڑے چلی جاتی ہیں۔ ساری بات بہت اور حوصلے پر منحصر ہوتی ہے۔ آپ بھلا رہیں تو مجبور یوں کے ٹھکنے سے خود بھی آزاد ہو جائیں گی۔“ آف تو کیا واقعی اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ اس کی باتوں کی روشنی میں اس نے اُمید ہی اُمید ہراساں ہو کر سوچا۔ اور سوچ ہی رہی تھی کہ جواب میں کیا کہے کہ اس نے کچھ لکھا۔

”مگر آخر وہ ایسی کیا مجبور یوں یا مجبوریاں ہیں۔ بس یہی بات تو ہے نا کہ کچھ پچھانانے کوئی ناجائز کار و دیگاہا ہے اس کے لئے گوارا نہیں کیا اور یوں ان کے شریک نگاران کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے انتقام کا نشانہ آپ کو بنایا اور آپ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ لکھا ہی اس کی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ مگر پچھانانے نے اپنی جان پر کھیل کر آپ کو وقت کے وقت ہی ان کے جھپٹنے سے آزاد کر لیا۔ یہی بات تھی۔ جسے میں محض آپ کی دل آزاری کے خیال سے آپ کے رد پر بیان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر آپ نے آج مجھے کچھ مجبور یوں یا مجبوریاں بتا کر دیا۔؟“

آف تو اسے واقعی کچھ بھی نہیں معلوم۔ معلوم بھی ہے تو وہ محض جھوٹ ہے۔

کیونکہ پروردگار خداوند کوئی کی بنائی ہوئی ایک من گھڑت داستان ہے۔

”خیر بات بکھر (صاف) ہو چکی ہے۔ اب میں آپ کی خاموشی کی پروا کروں گا۔ نہ شرم یا شرمندگی کی۔ بس جی کے آتے ہی ان سے آپ کو گناہوں کا۔“ انھیں آپ۔“

اف یہ کہہ کر گونجے اس نے اس کے سر پر ایک بھلا سا دے مارا تھا۔ اگر اس نے واقعی اپنی ماں سے یہ کہہ دیا کہ میں سلوط سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ یا شادی کر رہا ہوں تو بیچ ایک قیامت ہی آجائے گی۔ جس سے اور کسی کا نوکچہ نہیں بچوے گا۔ مگر اس تباہ و برباد ہو جانے کی۔ ایسی ذلیل و خوار موتوں کی کسی کو مزہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ اور اس کھسے تو لگا ہی مل جائے گا۔ تو پھر میرا کھانا کھلے ہوگا۔ کہاں جا سکوں گی میں۔

کیا اسفند کے بقول کو سمجھے پر۔

اف نہیں نہیں۔ ایسی کوئی نوبت آنے سے تو بہتر یہی ہے کہ اپنی۔ اس قدر شدت سے چاہنے والی محبوب بہتی کی۔ نظروں میں ذلیل و خوار موحاؤں۔ اس طرح اتنا تو مڑوگا کہ میں رسوائی سے بچ جاؤں گی اور کسی کی نظروں میں ذلیل و خوار نہیں ہوں گی۔ اتنا ہی تو ہو گا نا کہ یہ مجھ سے بدظن اور متفرق ہو جائے گا۔ اور ہمیشہ کے لیے میری محبت سے دستبردار بھی۔ افسانہ اپنی محبت کو۔

اپنی جان سے زیادہ عزیز شے کو کوئی اپنے ہاتھوں تو قتل نہیں کرتا۔

مگر انسان کی زندگی بھری ہوئی سلوط اس سفائی کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی۔ سچی بات کہنا اور حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا اس کی انسان کام نہیں ہوتا۔

بلکہ سلوط کیے جاتے عمل کی طرح ہی سخت و شوار گزار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ بڑی پر اُمید اور اشتیاق بھری

نظروں سے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں سے شروع کرے۔

کن الفاظ میں کہے۔

اور کس زبان سے کہے۔

کرتھی کو شکر لے کھار کر اپنی اور نیلہ کی آمد سے انہیں مطلع کیا۔

اور ایک بار پھر سنسناتی ہوئی کوئی کان کے قریب سے گزر جانے پر وہ اپنی سمت کو کوستی رہ گئی۔

مگر اس نے بھی نہ ہر کر لیا تھا کہ خواہ اس پار یا اس بار وہ ساری حقیقت اس پر عیاں کر کے رہے گی۔

اس طرح اس کے اتنے شدید جذبے اور ظرف کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ اسی خیال اور تپتے کے تحت گھر آ رہی

وہ اسے سنانے کے لیے اپنے حالات اور واقعات کے اگلے اور پھرے سرے جوڑتی رہی۔

دن کے پانچ بجے کا عمل ہے۔

پرائی طریقہ تعمیر پر بنے ہوئے ایک حویلی نما مکان کے عقبی صحن میں چھڑکاؤ کیے جانے کی وجہ سے جگہ جگہ پانی چمک رہا ہے۔ صحن بہت وسیع اور کشادہ ہے اور گرد و پیش بارہ فٹ اونچی دیوار جس کی منڈیر پر ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور کاغذ کے ٹکڑے لگی ہوئی دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ صحن کی عقبی سمت ایک بڑا سا لکڑی کا پھانگ ہے جو عام طور پر بندھی رہتا ہے۔ پھانگ کے بائیں رخ دیوار کے ساتھ ساتھ دو رنگ کیاریاں لگی ہوئی ہیں جن میں پھل دار درختوں کے ساتھ پھول دار پودے اور ترکاریاں بھی آئی ہوئی ہیں۔ اور دائیں سمت چار فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر بالترتیب بیت الخلاء، غسل خانہ اور باورچی خانہ ممبر امور لادم بنا ہوا ہے۔ دروازے کے بالکل مقابل میں تین سیڑھیاں عبور کر کے چار ستونوں والا ایک طویل برآمدہ ہے۔ ستون کے تنوں دروازے پر لٹکے کی چھتیں پڑی ہیں جو گری کی وجہ سے لپیٹ دی گئی ہیں۔ ستونوں کے آگے نکلی سیڑھی تک پھولدار پودوں کے گھلے رکھے ہیں۔ اس برآمدے میں سامنے کی دیوار میں تین دروازے بنے ہوئے ہیں جو غائب لکڑی کے ہیں۔

اور وہیں برآمدے کے انتہائی بائیں سمت تختوں کا بڑا سا چوکا پڑا ہے جس پر صاف ستھری چاندنی بھی ہے اور بونچ ساٹن کی خوشنما مسند پر گاؤں کے سے لگی مرحوم تعلقہ دامقصور الحسن کی بیوہ شوکت جہاں اپنا تلبے کا ٹھکانا بواڑا سا پاندان کھولے پان پر کھٹا لگا رہی ہیں۔ انہوں نے انڈیا ہوسکی کے کرتے ڈی ون (D. ONE) کے لمبے کاجڑی دار جامد اور پھینیس کی لمل کا ڈبل باٹ کا دو ٹیڑھیں کے کناروں پر چیشم آہو کی سنہری پیمک لگی ہے۔ دھیمیں کی لمل بہت ملائم اور باریک ہوتی تھی، زیب تن کر رکھا ہے۔ کرتے کے گریبان میں پرانی وضع کے طلائی بھاری پٹن، کانٹوں میں تپتے ہالیاں اور ہاتھوں میں موٹے موٹے طلائی کڑے ہیں۔ ان کی دایں طرف تھوڑے فاصلے پر ایک کونے میں ایک بہت ہی پرانا ٹیبل فرین ہے جو شاید اپنے موہک سب سے پہلے ایجاد تھا۔ کھوکھ اور کھوکھ کی ناخوشگوار سی آواز کے ساتھ پوری مستعدی سے چل رہا ہے۔

تخت کے پاس ہی ایک پڑوسی پر شوکت جہاں کی ملازمہ مائی رشیدن کسی فکر میں غطال اور چپیاں سی بیٹھی ہے۔ موسم کی

طرح شوکت جہاں کا مزاج بھی بگڑ کر ماسا ہے۔ انہوں نے بان کا بڑا منہ میں رکھ کر تمباکو کھینچا کرتے ہوئے کہا۔
 "سعدی کا ماسا سوئی گئی کوہ روئیں روئیں سے عورتی بچہ وادیا اس نے تو۔ اتنا پھر کا ذکر کرنے کے بعد بھی نہیں رہ
 جسکے اٹھ رہے ہیں اور یہ گلوڑ مار پٹھان اس کی پھونک سی نکل گئی ہے۔ موچلتا بھی ہے تو ریت کی طرح چرچ چرچ کر رہا ہے۔
 لے یہ نام اور سوچو کہاں مار گیا رشیدان۔ ذرا جا کر لو دیکھو سوہی اس کم ذات مارے جو کو۔ اس نے کچھ میں کوک تو اسے ہی نہ ہوتی تھی نہ
 انہوں نے پاندان کا دھککا نور سے بند کر دیا ہے۔ تو اپنا نام سننے سے زیادہ دھکے کی آواز پر رشیدان برکتی رہ
 چونکہ رگڑا ہی اٹھ لگای ہوئی اور قریب ہی بنے ہوئے دروازے سے اندر گھس گئی۔

شوکت جہاں نے تخت کے سرے تک سرک کر نیچے فرش پر رکھے اکالہ دان میں پک تھوکی اور اپنی جگہ سے ہلکے ہلکے
 سے ٹیک لگائی۔ اس لمحے وہ کچھ مضطرب سی نظر آ رہی تھیں۔ اور یہ اضطراب گہری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یوں محسوس ہوا
 تھا جیسے انہیں بھی کوئی فکر دان گہر ہو۔ وہ بھی پاندان کے کندھے پر ہاتھ پھیرنے لگیں اور بھی اپنا دوش پیٹتے ٹھیک کرتی رہیں۔
 دفعتاً آرامدہ کے دائیں پہلو سے جدھر دوار کے ساتھ ساتھ کھاریاں بنی ہوئی ہیں ایک چوتھیں پینتیس سالہ دنگل
 کے چاہاے اور کرتے پر کرم کلر کی اچٹن پہنے بیڑھیان عبور کرتا چاٹک ٹوٹا رہتا ہے۔ وہ عام سے نقشہ اور اچھے قد کا آدمی
 گہری رنگت اور چہرے پر شرافت اور نجابت کی گہری چھاپ کے ساتھ اضمحلال سا نمایاں ہے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے
 تخت کے قریب آیا اور ہاتھ کے اشارے سے شوکت جہاں کو سلام کر کے تخت کے سرے پر ہی ایک طرف ٹپک گیا۔
 "کھو گیا خیر لائے؟ اگر اچھی خبر سناؤ شوکت جہاں نے جی جی سے پہلو بدل کر تجسس اور اشتیاق کی طبعی کیفیت پر
 پوچھا۔ اور جواب میں قدرے توقف کے بعد اس نے سننے ہوئے افسردہ سے انداز میں کہا۔

"اماں۔ جب ابھی خبر میرے نصیب میں ہی نہیں تو پھر کیسے سناؤں؟"
 "ہاں ہاں۔ تو کیا پھر؟ شوکت جہاں نے کچھ ایسی آواز میں پوچھا جیسے ان کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو۔
 "ہاں اماں لڑکی ہی ہوئی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں، میں تو پہلے ہی سمجھ رہی تھی کہ وہ تمہاری چھٹی بیٹا تو بن ہی نہیں سکتی۔" شوکت جہاں نے جو پوتے کی آس
 لگائے بیٹھی تھیں ہوتی کی بدنامی کی خبر سن کر کھلے پیچھلے توڑے۔
 "مگر اماں یہ تو خدا کی مرضی اور اختیار کی بات ہے میرے آپ کے اور اس بے چاری کے تو نہیں؟ وہ ماں کو تالاکرن
 کی غرض سے بولا۔

"خیر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کس کے اختیار کی بات ہے۔ مجھے تو تمہارا وارث چاہیے تھا اور اس بول بھی۔
 لڑکیوں کا کیا میں باربنا کر لے میں ڈالوں گی۔ چار بیٹیاں، آٹھ لڑکیاں اور اب یہ۔۔۔ لوجھلا پال پوس کر لڑ کر لڑو ساری
 محنت کے ساتھ ساتھ دولت بھی میرے گریے جانی میں پرانے کھڑوں میں۔ اور پھر پھینوں کی بات تو دوسری ہی ہے۔ میرے
 تو اندر رکھے تمہارے باپ دادا کی مثل چلے گی۔ شوکت جہاں کی باتوں سے غلام سر ہر ہاتھ کا وہ بیٹے کی کوئی تاویل سننے پر تیار نہ
 "اچھا اماں۔ بس چلائے والا ابھی کچھ نہ کچھ ہی ہو جائے گا۔ کوئی اس لڑکی پر تو تمہیں ہوا اولاد کا سلسلہ وہ نہ ہو گا
 مگر پہلو کی کی زینہ اولاد کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ دلی ہمدردی جہاں سے اس کا اور میں دلی ہمدردی چاہیے۔ شوکت جہاں
 سخت سمجھے ہوئے نہیں۔

"افوہ اماں! آخر آپ چاہتی کیا ہیں۔ اب میں اس لڑکی کی جنس تو بدلنے سے رہا۔" اس نے ماں کی باتوں سے تنگ آکر ان
 کا سناٹا بھی نہ کیا۔

"دوسری شادی؟ وہ اس کی اتنی گھلی گھلی بات پر تو جردیہ غیر متانت سے بولیں۔
 "ہیں! وہ اچھل سا بڑا۔
 "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"وہ جو ہمارے ہاں کا پرانا دستور ہے کہ اگر پہلی بیوی کے بطن سے پہلو کی کی اولاد نہ ہو تو اسے عقد ثانی
 یہ بالکل جا ملانہ دستور ہے اماں۔ اور کونساں کوئی وائی تخت ماروڑوں کی جائیداد کا مالک ہوں۔ میں چند گاؤں پر شل یک
 چھوٹا سا علاقہ ہے تو جس کا ڈیڑھ حلقہ میری ملکیت رہ گیا ہے۔" اس نے ماں کی بات قطع کر کے بہم انداز میں کہا۔

"رہ گیا ہے تو کیا ہو۔ وی مثل ہے کہ ابھی بھی سوالات کا کھکا ہوتا ہے بیٹے۔ کروڑوں نہ بھی تو لاکھوں کے ہوا مالک ہو اور میرے
 کون سے دس دس بیٹے ہیں۔ اللہ آئیں کے ایک بیٹے کی تو ہو۔ یہ بھی میرے بڑے کولا کرم ہی تھا ورنہ بعد میں تو دواؤں، دناؤں کے باوجود
 رہنے کے نام پر کیا بچہ پیک نہیں ہوا ماسوا ان چاروں لڑکیوں کے اور اب پھر لڑکی۔ پوتی ہی بھی گھر میں تو لڑکی ہی نہ شوکت جہاں
 اتنا بچہ کو قتل کرتی ہوئی رہیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے اماں آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا مگر زندگی ذات سے مجھے یقین ہے کہ بعد میں وہ مجھے بیٹا بھی دے دے گا۔
 اس نے ہلے یقین سے کہا۔
 "اے بعد میں دے دیکھا ہے یہاں تو کل کی بھی خبر نہیں۔ شوکت جہاں بولیں۔

"اب یہ باتیں اپنے لیے بھی کہہ سکتا ہوں اماں جان۔
 "اے خدا ان کے دشمن وہ دیار لڑکے تو کیا کہہ رہا ہے۔ خدا میری عمر بھی تجھے لگا دے۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تیری ان
 باتوں میں اکثر یہ شادی کا خیال چھوڑ دوں گی تو یہ تیرا بچپنا ہی ہے۔"

شوکت جہاں نے بھی دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے۔ وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھیں کہ ان کا کلاہا اور لاڈلا بیٹا یہ کہہ کر ان
 کی ایک کمزوری پر زبانیے کی کوشش کر رہا ہے۔
 "افوہ۔ اماں! آپ نے اس بات کو کیا مسئلہ کیوں بنایا۔ اتنی خوبصورت پوتی سے نوازا ہے خدا نے آپ کو بالکل مالد پر
 گئی ہے اور پھر میری پہلی اولاد ہے۔ آپ کو تو۔"

شوکت جہاں اس کی بات قطع کر کے بولیں۔ "ہاں بے شک وہ تمہاری پہلی اولاد ہے اور ماں پر گئی ہے مگر بہو کا انتخاب بھی
 میں نے کیا تھا۔ تم خود اسے آکھو لڑکا یا بھگا کر نہیں لائے تھے۔"

"استغفر اللہ۔ اماں ابھی کسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں بھلا ان خرافات میں کیوں پڑنے لگا تھا۔ میں نے تو اس کی ایک
 جملہ بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو آپ ہی کی پسند تھی۔ وہ بھلا شایداں کو اس کے منہ سے ہو کی حریف ناگوار گزری ہے۔
 "ہاں میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ اگر بہو خوبصورت بھی ہے تو ساری خوبصورتی اسی پر تو تم نہیں ہو گئی۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر
 عین لڑکیاں میں میری نظر میں خاص طور پر بھی مکرہم جہاں کی بیٹی۔ بدالسنار۔

میرا خیر، خواہر بھی مکرہم جہاں کی بیٹی ہو یا مکمل جہاں کی لڑکی۔ یہی سب قیمت پر بھی عقد ثانی نہیں کروں گا؟ وہ گھوڑا کھڑا ہوا۔
 "واہ کیسے نہیں کرے گا میں تو تیری گدی پر کوزہ پرستی تیرا نکاح پر زحموں کی بدالسنار سے نام کی ہی نہیں وہ تو ہے ہی کچھ چوہر
 کا پاند۔ ایک تھوڑے سے ٹپک بھینکا نا ہی بھول جائے۔"

"خیر میں نظر باز ہوں مشوقین مزاج۔ اور یہ بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہے میری نظر میں تو زمرہ ہی دنیا کی حسین ترین عورت
 ہے اور پھر اس نے گناہ اور معصوم کو اس بات کی اتنی بڑی مزا دی۔ کیا صرف اس بات کی کہ اس کے بطن سے پہلو کی کی اولاد لڑکی پیدا
 ہوئی ہے؟ نہیں اماں۔ اگر آپ کے دل سے خوف خدا جاتا رہا ہے تو میرے دل میں تو ہے۔ میں مکر بھی اس پر ایسا ظلم نہیں توڑ سکتا۔ وہ
 ماں کے اس قدر ہمدردی سے مات کر رہے پھول ہی اٹھا۔

"اے مجھے کیسا علم اور کس کا خوف خدا۔ لے کیا تو مجھتا ہے کہ میں جو قبر میں پر لگائے بیٹھی ہوں خدا سے نہیں ڈرتی۔ اے نادان
 خدا کا خوف نہ کر تو ہے کہ مکر کو اس نے چار شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اور میں تو صرف فریاد اولاد کی خاطر تیری دھری
 شادی کر رہی ہوں۔ شوکت جہاں سے اور وہ بھلا جیت سکتا تھا۔

"بول تو گویا آپ بہت پہلے سے ارمان دل میں رہا ہے مجھی تھیں۔ آپ نے پہلے سے ہی یہ سارے انتظامات۔"
 "اے کیا پہلے مجھے لگتا رہی ہے۔ اگر اماں کی پوتہ تو مجھے بدالسنار شروع ہی سے پسند تھی۔ مگر وہ اس کا باپ خدا اس کی رواج نہ
 نہ کہ اسے لڑکا ہونے کی خوشنودی تھی۔ کتنا تھا کتنا خدا سے باپ بیٹی نہیں جانتے گی۔ یہی بیٹی کو تو اپنی اسی بیٹی میں بوڑھا کر کے رکھ
 نہ دیا۔ اب دیکھ لو اس کی آنکھ بند ہوتے ہی بیٹوں نے منجھلی مٹی کو پتھوں میں دے دیا اور یہ جیوتی۔"

"بھلا۔ اگر وہ میری بیوی بھی پہلو کی کی زینہ اولاد نہ پیدائے تو پھر دستور کے مطابق میری اور اس کے بعد چوتھی اور پانچویں۔ آپ
 تو بڑا بھول کا بھول لگے سے بھی دینے نہ کریں گی اور اگر میری قسمت میں فریاد اولاد ہی نہیں کبھی ہوگی تب؟" ماں کی باتوں سے اکتا کر
 لے لے پوچھا۔

یہ کیسی محبت تھی۔ کیسی اطاعت تھی اور کیسا عشق جب کہ عشق میں تو فدایت کا غلبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور عشق کی قربانیت ذاتِ اقدس سے جس کی محبت پر اولاد، بہن بھائیوں اور بیوی سب کی عینیتیں قربان ہوتی ہیں۔ شوکت جہاں خود کو بہت اندوہ والی اور عبادت گزار سمجھتی تھیں۔ جسے سر کر کے ان کی پیشانی پر ہاتھ پڑ گئے تھے۔ خدا ترن اور سنی مانی جاتی تھیں مگر کیا فائدہ تھا اس ساری عبادت اور ریاضت کا۔

جب کہ دماغ تو بہر وقت دوسروں کے دلوں میں غفاق ڈالنے اور دوسروں کو نینید دکھانے کی تدبیروں میں مصروف رہتا۔ نیت ٹھیک تھی نہ ارادے تک۔ وہ اپنی ہی صنف کی ایک کمزوری لڑکی کا جو قسمت سے ان کی پہونچتی گھر پر بلور کا پتیلہ بنا دیا۔ وہ بھی صرف اس جرم کی یاد میں کہ اس نے ایک عدد لڑکی کو جنم دیا تھا۔ جب کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ پاک کے نزدیک جس عورت کی پہونچتی کی اولاد لڑکی ہو اس کا مقام بلند ہوگا۔ اس مسئلے پر ایسی بیسیوں کے ہاں نرمی اور کیاں ہی لڑکیاں پیدا ہونے پر بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ انہوں نے بیسیوں کی ہر دواؤں کو قائل بھی کیا تھا۔ بلکہ قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر سب کے منہ بھی بند کر دیے تھے۔ گو وہ بھی کبھی نہیں تھیں مگر قرآن اور تجربہ دھن کے وجہ سے مخموری شدہ دوسرے کھتی تھیں۔

اصل میں ان کے والد حافظ قرآن بھی تھے اور دنیاویات کے ایک در سے میں سیکم بھی رہ چکے تھے۔ بس ان کی زبانی مسئلے مسائل انہوں نے ہی سمجھ رکھے تھے۔ ذہانت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھیں۔ ان پر نفرت بھی بہت شاطرانہ تھی۔ اصل میں ان کی رنگت دیتی ہوئی سانولی تھی اور ان کا نقش بھی معمولی سے۔ جب کہ ان کے شوہر شکل و صورت رنگت اور کھانے کے لحاظ سے ان سے کہیں بہتر تھے مگر پانے زمانے میں ایک تو اپنے ہی خاندان کی لڑکی اور لڑکے کو ترجیح دی جاتی تھی اور صورت مشکل کو نہیں شرافت کو دیکھا جاتا تھا۔ اور شوکت جہاں کی اپنے شوہر سے دوسرے کی رشتہ داری بھی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے سمندر کو دیا تھا اور شوکت جہاں کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ انہوں نے اپنے شوہر کے ولی عہد کو جنم دیا تھا۔ جب کہ ان کی خواہش تھی کہ ایک دوا کے اور دوسروں۔ اصل میں تو وہ خشن پرست بھی تھے اور شوقین مزاج بھی۔ ایک خاصے بڑے غلط فہم تھے۔ دولت اور جاہ و شہم میں کچھ تو سیر تھا۔

اس لیے انہوں نے ایک متوسط گھرانے کی خوبصورت لڑکی سے شادی کر کے گویا شوکت جہاں جیسی بے تصور اولاد کو یہ معلوم کس جرم کی سزا دی تھی اور یہ خیال کہ مر دیک و وہیں دس شادیاں کرنے کا مجاز ہوتا ہے اور بلا تصور اور دوسرے کے دم پر سوت بٹھا سکتا ہے کچھ آخری مضبوطی سے ان کے تحت الشعور میں جم کر رہ گیا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی کیا بھی بڑھ چڑھ کر جتن لیا تھا۔ اور اپنے شوہر کے اور بھی جیسے اور بھائیوں کی دوسری شادیاں کر چکی تھیں۔

اب بکے معلوم تھا کہ یہ ان کا انتقامی جذبہ تھا یا اپنا کوئی نظریہ۔ بہر حال لباس تو ان کا معقول ہی تھا۔ بس رشیدان سے لوہے کی بیٹی سے سلک چادر نکھو کر انہوں نے اپنے شانوں پر پھیلائی تھی۔ پانوں کی ویب بھی رشیدان جیسا جہاں بانگر جاپوں کے بھاری گچھے اور چھلر زرد سے بڑے سمیت ان کے زرد کارکنے میں ڈال دی تھی۔ شام پیری سے سر پر کڑی تھی۔ اور راستہ میں دور کا تھا وہ بھی ڈولی کے ذریعے۔ مگر ان کے خیال میں لوہا اتنا کم ہونا آسانی سے سوزا جاسکے۔ اس لیے ڈولی میں سوار ہو کر انہوں نے بین صاحب کی جوی کا رخ کیا۔

زہرہ کی زندگی قریبی شہر کے واحد میڈیٹل ہوم میں ہوئی تھی جو ایک پراسی لیڈی ڈاکٹر نے کھولا تھا کیونکہ اس زمانے کے لیے علیحدہ ہسپتال بنانے کا رواج نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عموماً عورت کی زندگی گھر پر ہی ہوتی تھی اور انہوں نے ہاتھوں ہی ہوتی تھی۔ البتہ بعض صاحب ثروت لوگ لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی یہ تعلیمی مرحلہ انجام دلاوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تقریباً سارے ہی کیس یا زچیاں نارمل ہی ہو کر تھیں کیسایورین ٹیسٹ اور کیسایورین ٹیسٹ اور امرو پور شہر میں ہی ایکشن وغیرہ۔ تاہم بکری اثرات اور ملاوٹ سے پاک زمانہ تھا اس لیے بچی کے کیس میں شاذ ہی کوئی کمی ہوتی تھی۔ البتہ احتیاط سخت کی جاتی تھی۔

اور بچہ کی ولادت ہوتی اور ادھر کھانے پینے کی ہر چیز نیا ماسوائے چائے یا دودھ کے یا پھر صبح و شام شربت زردی والا جو لوگ پھر سے کہیں زیادہ پر تیار ہوتا ہے۔ پھر تیسرے روز صبح نہار نہ کر دودھ کے ساتھ کیکسٹر آئل یا لیکو لیٹ پر افین کا کلاب دے کر ہلکا چھلکا ناشتہ اور دوسرے

بہرہ یعنی۔ چھٹی کا نہان ہلانے کے بعد البتہ نورتن (نورتن کاریاں) کھلایا جاتا تھا اور کچھ ٹھاس اور پھل بھی کماں کا دوسرا پھر ان ساری چیزوں کا عادی ہو جائے۔ پیٹ اور کولہوں پر سوا مینے تک کس کر پتی باندھی جاتی تھی تاکہ پیٹ بڑھنے نہ پائے والا بچہ اور اس احتیاطی اور اس احتیاطی احتیاط۔

خاندانی اور کھیتی باڑی کے وہی اور انار کا رس تو زچہ کے لیے سوا مینے تک زہر قاتل ہی ثابت ہوتا ہے۔ پھر زچہ بلنگ سے یوں غلطی تھی جیسے موت کی وادی کو پھلانگ کر نہیں بلکہ آب حیات کا غسل کے آگے کی بود بگر نہرہ جو کہ شوہر کے مقابلے میں خاصی کم عمر تھی اور کچھ شروع ہی سے کمزور تھی اس لیے اس کے کس میں کچھ عید کی پیدا ہو گئی تھی۔ شوہر اس کا دوا تھا۔ اس لیے اسے دایوں اور بری پورھیوں کی دواؤں اور ٹونکوں پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ شہر کے جاگر باقاعدہ لیڈی ڈاکٹر سے اس کا علاج کروا رہا تھا۔

اور اب فورسب سے بچی کی پیدائش ہوئی تھی۔ دفعہ محل کے بعد بھی ڈاکٹر اس کی طرف سے مطمئن نہ تھی۔ اس نے مسعود الحسن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ زچہ کی جان خطہ میں ہے۔ اس لیے مسعود الحسن خورہ کو دل و جان سے چاہتے تھے اس وقت سخت پریشان تھے۔ اور محض ماں کی پریشانی کے خیال سے کہ کشتہ دوپہر کو انہوں نے زہرہ کو میزین می ہوم میں داخل کر لیا تھا اور بچی اگلی دوپہر کو تولد ہوئی تھی آخری پریشانی میں بھی وقت نکال کر سہرہ کو ماں کو اطلاع دینے چلے آئے تھے اور کچھ اس خیال سے بھی آئے تھے کہ اگر ذرا آتے تو ماں یہی سمجھیں کہ وہ لڑکی پیدا ہوئی ہے اس لیے شرمندگی کی وجہ سے بیٹے نے منہ چھایا ہے۔ اور اسی جذبے کے تحت وہ خود کو پیٹے سے ہی اسے بات کرنے کے لیے تیار کر کے آئے تھے۔ کہ انہوں نے عقد شادی کا خوشا چھوڑ کر ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ کیونکہ وہ اپنا مال کی فطرت اور رگ و ریشے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانتے تھے کہ وہ جس بات کی فیکر کر بیٹھتی ہیں اسے پورا کر کے ہی دم میں ہیں اور اگر بات صرف عقد شادی کے ذکر تک ہی ہوتی تو وہ کچھ عرصے تک اس ذکر کو تائے بھی رہتے۔ جتنی کہ ان کا دوا و نمونہ بچا تھا۔ مگر انہوں نے تو بد رائی انداز کی صورت میں اپنے ارادے کی پختگی بلکہ اپنے ارادے پر جلد از جلد عمل درآمد کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ دودھ نہ پینے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔

مسعود الحسن جیسی ریسوں کی اولاد تھے۔ بہت زیادہ بڑھے کھتے تو نہ تھے مگر شر و ادب سے شغف مزور نہ تھے۔ گو اپنے آباؤ اجداد کی سی آن بان ان میں نہیں تھی مگر بہت دہار، خاموش طبع اور سادگی پسند تھے۔

بالکل ایسے مردوں کی طرح جو زیادہ سات پانچ کرنے کے عادی نہیں ہوتے لیکن دوسروں کی سات پانچ کے پچھ میں جلد ہی آجاتے ہیں۔ اصل میں ایسے مردوں کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ ایسے ہی ان کی طبیعت میں ضعف ہوتا ہے اور بیٹے کی اس کمزوری سے شوکت جہاں بخوبی واقف تھیں۔ زہرہ شوکت جہاں کی ہی پسند تھی۔ صورت و سیرت بلکہ ہر لحاظ سے لاجواب بیٹی ہیں قبل وہ بڑے چاچے سے بہادر لڑکی تھیں اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس بیٹے کی وہ ایک عدد لوہا تان کی گود میں ڈال دیتی مگر بچوں کی کسی اندر و خالی کی وجہ سے پورے ڈھائی برس تک توتیرہ ہی نہ ہوتی۔ اور وہ بہو کی طرف سے ناامید بیویوں میں ایک روز بڑے غیر متوقع طور پر یہ مردہ ہانفرا سننے میں آیا کہ خبر سے بہو کا پھر بھاری ہو گیا ہے۔ ساس کے امانوں کی دیکھ کر بچی کی کھال گئی۔ اب جوں جوں دن گزرتے جاتے۔ وہ بچی دیکھتی رہیں کہ بہو کون سا پر پہلے آتھا تھا ہے۔

کون سی چیز کو طبیعت قبول نہیں کرتی۔

کون کی چیز غبت سے کھاتی ہے اور مزید بھی کسی بیٹا ہونے کی علامتیں۔

اور زہرہ کی ہر علامت ہی صدی کی حد بیٹے کی نوید دے رہی تھی۔

مکروٹ آئے گھر و میٹل ہو گئی کہ کھودا ہارڈ اور نکلا جوا۔

شوکت جہاں کے تو سارے اندازوں اور حساب پر پانی پھر گیا تھا۔

اس پر زہرہ کی کہ زہرہ کو اگرچہ خود بہا کر لائی تھیں۔ مگر ان کا یہ مقصد مگر نہیں تھا کہ ان کا کھانا اور لاڈ لائیٹ اس کے نام کے لیے لے لے اور اس کا غلام بن کر رہ جائے۔ جب کہ زہرہ کو جو بنانے میں بھی ان کی ایک مصلحت کارفرما تھی اور وہ یہ تھی کہ زہرہ کے لیے والے کو بہت شریف اور خاندانی لوگ تھے لیکن اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اوسط طبقہ ہی وہ جس کے منہ پر آسودگی

تجاربہ سوچ سوانیر سے آگیا ہو۔ میں اسی اختلاف میں کہ پیش کم ہو تو جالوں شام ہو گئی۔

تجاربہ شام ہو گئی تو کیا مفاد ہے۔ یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہی ہے۔ مگر مگر جہاں کے بڑے بیٹے نے کہا۔

جی ہاں آپ کو رات کا کھانا کھلانے بیٹے جاتے ہی نہیں دیں گے۔ بڑی بیٹی بولی۔

میں نے رات کا کھانا کھانا کیا۔ انہیں تو بے گناہ دوسرے بیٹے جاتے ہیں دوں گی۔ مگر جہاں بڑی بیٹی چٹائی ہوئی ہو۔

میں بیٹی بیٹی جان۔ یہ کاجی مانہ ہے۔ کیا تباہ زخمی ہو جائے اس کے کہاں۔ یوں بھی خیر سے بوسے دوں گے۔ میں بھوس

توڑی دے دیتی تھی جاؤں گی۔ آپ کو گولے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا اس لیے اسی وقت ہی آگئی۔ شوکت جہاں نے گویا انگلی سے

کام لے رہے تھے۔ درندہ رات کو تو میں قیام کرنے کے ارادے سے آئی تھیں

آج بھی خیر سے ہو جائے گی اب جانی جان کوئی اس انتظار میں تو نہیں بیٹھی ہوں گی کہ ادھر آپ گھر سے باہر قدم نکالیں اور ادھر وہ۔

جنگل ہونے سے خفیہ سرکارت کے ساتھ فقہرہ اور حور چھوڑا تو سب بٹنے لگے۔

مگر اللہ کے کہی کس کو خبر۔ دیے بھی ہو جو کیا ماندہ تھا۔ میں نے اسے۔ ڈاکٹر کی دکان سے ٹھہر چکا ہے۔ شوکت جہاں بولیں۔

میں تو یہ بات طے ہے کہ آج کی شب آپ ہمارے ساتھ ہی گزاریں گی۔ بدر النساء بولی۔

جس کی وہ ہمیشہ گلیاں بٹیاں ہی لیتی رہتی تھیں۔

ابچا چلو اگر ہماری بیٹی کی کسی خوشی ہے تو پہنچی ہی۔ شوکت جہاں نے گویا اپنے پھرنے کا ٹھنڈا، بدر النساء پر رکھتے ہوئے بڑی۔

لکھتے تھے کہ اب اور پھر اسے گلے سے لگا کر بولیں۔

اُسے نہیں تو فرشتوں نے غلطی سے چھو چکی جان کی جھولی میں ڈال دیا وہ تیرا تو میرے کہاں ہو رہی تھیں۔ اور اس بات پر ایک تہقید

پڑا۔ سب کے دل ان کے بدر النساء سے اس قدر التفات برتنے پر شاد ہو گئے تھے۔ کیونکہ سب ہی سمجھتے تھے کہ ان کی یہ محبت بے لوث

ہے۔ اب کی کو کیا معلوم تھا ان کی محبت کے اندر کون سی غرض چھپی ہوئی تھی کہ نظر باہر تو ان کا اظہار مٹا بھی لے گا ہر بار والا تھا۔

اُسے اگر میری جھولی میں ہی ڈال دیا تو فرق کون سا پڑ گیا۔ یہ تو یہ تمہاری ہی ہے۔ مگر جہاں اتنی زیادہ لگا لگت سے متاثر

ہو کر بولیں۔

”اچھا اگر اسے یہی کچھ ہری میں تو اب اپنی بات سے پلٹے گا نہیں پھر وہی جان۔“ انہوں نے دلی یل میں اپنی کامیابی پر خوش ہو کر۔

مگر جہاں کے ایک جذباتی سے فقرے کو مابینہ میں بدلتے ہوئے کہا۔

”اے۔۔۔ میں بھلا کیوں پلٹے گی۔ وہی تمہی جی جان چورنے والی ہیں۔“ اے ہاں مٹے میں تو تم بدر النساء کی ماموں زاد بہن

ہو۔ مگر جہاں صدقہ دلی سے بولیں۔

”میں کون سے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہوں۔ اور آپ کو بہن۔ یوں ہی آپ مگر میں مجھ سے صرف تین چار سال ہی تو بڑی ہیں۔“

شوکت جہاں دل ہی دل میں ان کی سادہ لوحی پر ہنس کر بولیں۔

”کیسے اہل جان نے تو رتے ہی بدل کر رکھ دیے۔“ مگر جہاں کا بھلا بیٹا منس کر بولا۔ اور جواب میں سب کے ساتھ شوکت جہاں بھی

بٹنے لگیں۔

پھر نومیں بدلا تو ادھر ادھر کھنے برادری کی باتیں ہونے لگیں۔ اور پھر باتوں کی کند ٹوٹی تو زہرہ پر جا کر۔ جس کی تعریف میں

مگر جہاں اچھی خاصی رعب انسان نظر آ رہی تھیں۔ دوڑوں ہوئیں اور بڑی بیٹی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ اور پھر

یہ اتنی ہی برداشت سے بابر تھی۔ مگر بہت موقع شناس اور معاملہ فہم تھیں۔ ہر ملا تو کچھ نہ کچھ سکیں البتہ۔ پولا سا منہ بنا کر بولیں۔

”اگر صرف خوبصورتی اور ظاہر داری ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ انسان کی اصل خوبی تو اس کی سیرت اور اخلاق ہوتا ہے۔ اور

ہر کچھ کو اس کے لئے تعلق رکھتی ہیں اس لیے اب اور آپ سے تو بالکل واقف ہی نہیں اور اخلاق بھی ہمارا ہے۔ یہی برقی ہیں۔

کی تھوڑی بہت چکنا چٹ ہوتی ہے اور اپنے سے کم حیثیت خاندان کی لڑکی کو ہونا نے سے ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ ہونا

کے سامنے احساس کمتری کا شکار اور ان سے ذلی رہے گی کیونکہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اگر کسی رئیس گھرانے کی لڑکی ہونا

اپنی بڑائی کے زعم میں ان سے ان کا بیٹا چھین لیتی۔ اور زہرہ نے اگر ان کا بیٹا ان سے چھینا نہیں تھا تو بیٹے پر تافہیں ہونا

اور یہ بات پھانسی کی طرح ان کے سینے میں گھس گئی تھی اور مسودا محسن نے جو یہ کہا تھا کہ وہ ایسے ہی کسی موقع کے لیے تیار ہو رہی

کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ شوکت جہاں نے تو اس وقت سے ہی جیسے ہو گا پیر بھاری ہوا تھا۔ طے کر لیا تھا کہ اگر ہر کے ہاں لڑکی ہوئی تو ادھر

عقد شادی کیے بغیر نہیں گی۔ اور یہ بھی سچ ہی تھا کہ انہوں نے بدر النساء کو بیٹے کے لیے بہت پہلے سے تیار رکھا تھا۔ اصل میں

اس اجمال کا کچھ یوں تھا کہ پھر بھی مگر جہاں سے ان کی دور کی ہیں بہت دور ہے کی رشتے داری ہوئی تھی اور میل جول بھی بہت

میں خوشی اور مٹھی کے موقع پر کیا ہونے کی حد تک ہی محدود تھا۔ مگر جہاں کے شوہر سید احمد عرف پٹن صاحب سادات سے تعلق رکھتے تھے اور خود کو درجہ نجیب

اور اپنے شجرہ نسب پر انہیں کچھ اتنا فخر تھا کہ اپنے خاندان میں روکا نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے بڑی بیٹی کو گھر بٹھائے تھا۔

بوڑھا کر دیا تھا۔ جب کہ مگر جہاں کی ماں مثل تھیں اور خواجہ زادوں کی نسل سے تھیں۔ اور باپ اصل نسل سید۔ پڑا لے رواج کے مطابق خوشی اور مٹھی کے موقع پر بھی ان کی بیٹیوں کو ایسے اجتماعات میں شریک ہونے کی اجازت نہ

”تعب ہے یہ تھاری ہو تو بڑی چھٹی رستم نکلیں۔ ورنہ بظاہر تو بڑی ہی بے زبان اور بے ضرر سی معلوم ہوتی ہیں۔“
 ”اے بس رشتہ بھی دن چھو بھی جان، میرے منہ سے کچھ نہ بکھولیں۔ وہ بے زبان اور بے ضرر نہیں۔ بڑی کھلی اور بے
 ایسا میرے بے کوٹھی میں لیا ہے وہ اس کے سامنے مجھے بھی نہیں گروانا۔ اس پر ازل و بے کی پھر بڑھتی ہے۔ کیا مجال ہے کہ
 ہاتھ لگائے یا پٹ کر گھر کو ہی دیکھ لے۔ وہ تو گھر میں اس وقت گدھے ہی ہوتے دکھائی دیتے اگر میں اپنی جان نہ دکھائی۔ شوکت
 کو واقعی بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ یہ بھی بڑی ہوشیاری کی طرف متغیر نظر سے دیکھ کر کہا۔ یہ تو مگر ان کی ساس کو بڑا
 ساسوں کی طرح انہیں کہو۔ کے پیل بنا کر رکھتی تھیں۔“

”مگر آپ کی یہاں تو ایک چھوٹی سی کمی ملازم ہیں۔ یہ آپ کیوں خواہ مخواہ کام کرنے کی زحمت اٹھاتی ہیں۔“
 ”اے لو۔ ملازموں سے بھی کوئی کھر چلا کرتے ہیں۔ جب تک گھر والی خود پٹ کر نہ دیکھے اور ملازموں کی تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔
 مال مفت دل بے رحم۔ کینٹ بے دودی سے الگ خرچ کرتے ہیں اور ہاتھ کی محفاتی الگ دکھاتے ہیں۔ شوکت جہاں وہ ہیں
 ”ہاں بی۔ یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ گھر کے کام جب تک عورت خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی گھر گھوڑی نہیں
 مگر تھار تو سب پر بہت رعب و دبدبہ ہے۔ پھر تم ہو کو تو کوئی کیوں نہیں۔“ ”مگر جہاں نے اپنی بہوؤں کے چہروں پر جلی جی کر مگر
 دیکھ کر کہا۔“

”اے لوگوں بھی بھلا کیسے۔ وہاں تو ادھر بہو کے لیے منہ سے کوئی بات نکلی اور دھڑلے سے جیاتی کی طرح جیسے بڑا کر تو سہرا
 دی۔ شوکت جہاں نے کہا تو ان کے مثال دینے پر ہوں اور بیٹیاں سننے لگیں۔“
 ”تعب ہے۔ بہو کو میاں کی محبت سے اس قدر ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھانا چاہیے۔ اور وہ بھی شوہر کا گھر ہی لڑکی کا اپنا گھر
 ہے۔ کیونکہ گھر کی حیثیت تو وہاں خانے کی ہی ہوتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں جس عورت کو اپنا سب کچھ اٹھانا ہے۔ اے شوہر کا گھر
 رشتے دار بھی پیار سے ہوتے ہیں۔ مگر جہاں نے بہت پیٹ پیٹ کے اپنی بہوؤں کو مٹانے کی عرض سے کہا۔
 ”ہاں کتنے افسوس کی بات ہے ورنہ جیسا جان تو اتنی خوبصورت ہی کر بی چاہتا ہے بس دیکھتے ہی رہو ان کو۔“ ”بدلتا ہوا
 اس گفتگو میں حصہ لیا۔“

”مگر تم سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہے۔ بہو تم پر تو میری جب بھی نظر پڑتی ہے میں دل میں ہی دعا کرتی ہوں کہ کدانیہ
 میری نظر بدست جائے۔ شوکت جہاں کچھ جگہ پر گھر میں۔ تو ان کے خدا تھیں میری نظر بدگھنے پر ایک بار پھر سب ہنسنے لے۔ تو انہوں نے
 کرم جہاں کی بڑی بیٹی اور دونوں بہوؤں کا دل دیکھ کر کہا۔“

”یوں تو پھر بھی جان آپ کی دونوں بہوئیں بہت پیاری پیاری صورتوں کی ہیں اور یہ خیر النساء مہرا بھی مگر اپنی بدلتا
 کی مثال تو ستاروں کے بھر میں جس چوڑھویں کا چاند ہے۔ اور کرم جہاں انہیں چھوٹی بیٹی پر اس قدر صدفے داری ہوا دیکھ کر
 ہی ٹھیکیں۔“

”بیٹی بنا کر تو اے اللہ نے بھیجا نہیں۔ لیکن اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اپنی بہو بنا کر ضرور میتی۔“ انہوں نے آہ
 سے کہا۔ خیر النساء نے اس کے خیر النساء کی طرف جھک کر کہا۔ گویا اپنی شہدائیت پر مکھن لگایا۔ خیر النساء خوش ہو کر زور دے
 لگی۔ بھی دسترخوان کھینچ دیا گیا۔ کہ ان کی باتوں سے کہا ابھی خیر نے کیا تھا۔ ورنہ وہاں تو وہی مثل صادق آتی تھی۔ پھر
 پڑی اور لاڈلہ دیر میری تخت چڑھی۔ کہ اور مہر جو بی اور شام نے اپنا سر میاں چل لہرایا اور ادھر دیے اور چراغ روشن
 اور رات پھٹنے سے پہلے ہی سب کھپائی کر ادھبی تان کر سو گئے۔

مگر اس روز تو کھانے کے بعد بھی بڑی دیر تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور گیارہ بجے تک جاگروا کہ
 سلائے کا موقع ملا۔ البتہ عاقل اور کامل (کرم میاں کے بیٹے) جلد ہی سو گئے تھے کیونکہ عورتوں کی مغل میں مردوں کی شرکت ہونا
 نہیں سمجھی جاتی تھی۔

بہر حال۔ اگلے روز۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی کرم جہاں کے بعد اصرار رکھنے کے باوجود بھی شوکت جہاں نے
 نہیں۔ اور ہو کر طرف سے پریشانی اور تشویش کا اظہار کر کے ہوتی کو کہ کر جانے کے لیے اٹھیں تو خلاف دستور چونکہ جلدی
 خالی ہاتھ ہی آئی تھیں۔ اس لیے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولیں۔
 ”اے سینا ناس جائے اس حافظے کا۔ یہ تو باطل ہی پٹ ہو کر لیا ہے۔ یہاں لانے کے لیے دو نوکرے چلوں گے کیونکہ

”خیر۔ اسی لیے ایک چیز ہے۔ وہ بھی گھر بھول آئی۔ اصل میں شام بھی تو ہو گئی تھی۔ اسی لیے گھر بھٹ میں خیال ہی نہیں پڑا۔“
 ”چلو اچھا ہی ہوا جو بھول آئیں ورنہ جب بھی آتی ہو، ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور لائی ہو خواہ خواہ خود نوکر بار کرنا۔“
 ”اے زبیرا کرنا کیسا۔ لیکن دین سے تو آپس میں محبت بڑھتی ہے۔ اور نہ کہ تو خیر شام تک مجھوا دوں گی مگر اپنی بیٹیا
 کی چیز ہے اسی وقت دوں گی جب یہ میرے گھر آئے گی۔“

”کی چیز کیا چیز ہے وہ آپ کا بیگ، جو آپ نے اس قدر سیرت کر رکھی ہوئی ہے؟“ بڑی ہو کر اپنے عجبس پر قابو پانا مشکل
 ہوتا ہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”سب پہلے سے بتا کر اس کی قدر کھونے سے تو رہی۔ اور یہی، وہ تو میری بچی کی چیز ہے۔ سب سے پہلے تو ہی اسے دیکھے
 گی بعد میں کوئی اور۔ اسے چھو بھی جان، اتنا بیٹی بیٹی کہہ رہی تھیں۔ کیا ایک دو دن کے لیے بدلتا ہو میرے ساتھ نہیں بھیج
 سکتیں؟“ انہوں نے اتنی خوبصورتی سے سب کے دلوں میں شوق و جست کی چنگاری بھڑکا کر ایک دم ہی بات کا رخ کچھ اس
 طرح پلٹا کہ کرم جہاں کو چپ سی لگ گئی۔ کیونکہ انہوں نے آج تک اپنی کسی بیٹی کو اس کے سگے چچا ماموں خاندان دھکی بھی نہیں
 بھی تھیں۔ اور شوکت جہاں سے تو ان کی بہت دور پرے کی رشتہ داری تھی۔ بہر حال وہ ان کی خاطر اپنی کوئی
 بیت بالاصلول کیسے توڑ سکتی تھیں۔

”اصل میں بولا کچھ سے دور دور رہتی ہے مگر گھر میں اس کی موجودگی سے دلرس کا تو احساس ہوتا ہے۔ اور آج کل تو
 مسودا میں بھی بوی کے ساتھ شہر میں رہ رہے ہیں۔ اسی لیے گھر بھٹے کاٹنے کو دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے تولی انا ہا ہی
 ہوا کہ وقت دیکھا تو موقع اور یہاں چلی آئی۔ یوں بھی ہوئی طرف سے سخت پریشان ہوں آجکل۔ اسی خیال سے بیٹا کو لے جا بچا
 رہی تھی کہ تولی بچے کا۔“ کرم جہاں کو خاموش ہوا اور چپتا ہوا دیکھ کر شوکت جہاں ان کے یہاں کے دستور اور اصولوں سے
 پوری طرح واقفیت رکھتے ہوئے بھی اپنی بات پر چلی گئیں۔

”ہاں ہاں، محبت میں ہی ہے چھارہ ہی ہو۔ اسے غوردار عاقل اور کامل آجائیں تو ان سے پوچھ لو؟“ کرم جہاں نے گویا نہ سمجھنے
 کا بہانہ بھرا۔

”اے۔ آپ ماں ہیں۔ آپ کی موجودگی میں میں عاقل اور کامل سے اجازت لینا کچھ اچھی لگولگی؟“ وہ کچھ بڑا بولیں۔
 ”پھر بھی، بی بی سیم (دھ انہیں بی بی سیم ہی کہتی تھیں)۔ باپ کی جاء ہوتے ہی بڑے بھائی۔ ان سے اجازت لینے بھی ضروری ہوتی
 ہے۔ کرم جہاں نے انہیں بڑا مٹانے دیکھ کر کچھانے کے سہانے انداز میں کہا۔

”ہاں بچے پر اپنی اولاد، بڑائی ہی ہوتی ہے چھوٹی جان، اور کم جیسے لوگ زسے بے وقوف ہی ہوتے ہیں جو اپنے پیٹ
 کی میٹاں جوتے ہوئے بیٹی بڑائی بیٹیوں پر جان پھرنے سے بیخبر ٹھیکری دہن دراپنے ملازم کو بیچ کر کہاں روں سے مہلادو کہ ڈولی
 دروازے پر لگا دیں۔“ وہ بچہ بچہ خفا ہو گئی تھیں۔

”اے ماں جان، آپ کی کھیتی کے گھر ہی تو جانے گی بدلتا۔ کسی ایسے عرصے کے یہاں تو نہیں۔ اور یہاں تو اپنے
 گلوں کی چالیسی کھیتی چھٹی رہتی ہے کہ کچھ دے لے لے ہی نہیں۔ خیر النساء نے اس کے رونق جانے یا بمعنی دیران کی دلی
 آزادی کے خیال سے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا۔ کرم جہاں ان کی ناراضگی مول لیا نہیں چاہتی تھیں مگر اپنی رطابت اور
 جست جگر کے انہوں سخت مجبور تھیں۔ انہوں نے اس میدان میں براہ راست بدلتا سے پوچھا کہ وہ دہی جانے سے انکار کر کے
 ان کی بڑا بھائی کو دور کر دے گی۔

”اے سیم، اب اس قدر خفا تو نہ ہو لیگی، پہلے جس کا معاملہ ہے۔ اس سے تو پوچھ لو کہ یہ جانے لگا یا نہیں۔ کیونکہ میرے بغیر
 تو یہ کھیتی مانے کی عادی ہی نہیں رہیں۔ کرم جہاں نے بدلتا کی طرف دیکھ کر ساتھ ہی ساتھ انکھ سے کچھ اشارہ بھی کر دیا۔
 خیر النساء کو تو صرف اس چیز کے بارے میں معلوم کرنے کی پڑی تھی جو اسے نہایت کرنے کے کارکن وہ اسے اپنے ساتھ
 نہ جانا چاہا۔ یہی ٹھیک وہ تھا۔ اس سبب کے پیچھے چھپ کر شہر سے شہر لے کر انداز میں بولی۔

”اگر آپ اجازت دیں گی تو آج بچے کے ساتھ جلی باؤں گی۔“ اور کرم جہاں کو اس کی اس بدلتی پر غصہ تو بہت آیا مگر اب
 فوس نے اجازت دینے کی اس کے لیے کوئی کجی نہیں تھی۔ بلکہ اٹان کے سامنے شہرندہ کر کے رکھ دیا تھا۔ آخر یہ دلی خواہ
 انہیں اجازت دینی ہی پڑی۔ اور اجازت ملنے ہی شوکت جہاں کھیل اٹھیں۔ فوراً ہی اس کے کپڑے تبدیل کر کے اور دو کپڑے پہن کر

”جس کچھ عادت سی پڑی تھی ہے اماں!“ انہوں نے کسی سوچ میں ڈوبے ڈوبے کہا۔
 ”کہیں جلنے کا ارادہ ہے؟“ ماں نے دلی زبان سے پوچھا۔
 ”نہیں، ابھی تو نہیں۔ البتہ رات کو فزور جاؤں گا۔“ وہ بھی کچھ سی آواز میں بولے۔
 ”کیا ہسپتال؟“ ماں نے پوچھا۔

”جی ہاں، ظاہر ہے وہیں۔“ وہ قہر سے چمک کر بولے۔

”اے تو کیا وہاں رات کو ٹھہرنے کی اجازت ہے؟“ شوکت جہاں کو بیٹے کا بھوپراس قدر مائل ہوا نہایت کڑی رہا تھا۔

”اور کسی کو نہیں لیکن مجھے ضرور ہے۔ کیونکہ زہرہ کے کہیں کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔“

”اے ہاں، کیا شک ہے؟“ انہوں نے بجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

”واہ بہت جلد خیال آنا اس کی ضرورت پوچھنے کا۔“ بیٹے نے پھر طنز کا تیر چلا دیا۔

”اے تو کیسے پوچھیں کل تو تم بیٹی کو سنے کے صدمے میں مبتلا تھے۔ اور پھر جا بے اور چکیاں تو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ خیریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں تو ان پر بھی کسی کسی طرح قابو پایا جاتا ہے۔“ شوکت جہاں بیٹے کے طنز پر چمک کر بولیں۔
 ”اچھا۔ اگر بیٹی کے بدلے بیٹا ہوتا تو کیا اس وقت بھی آپ یہی کہتیں؟“ مسعود الحسن نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں، تو اور کیا کہتی۔ اے کیا میرے یہاں اولاد نہیں ہوتی۔ تمہاری بہنوں کے یہاں اولادیں نہیں ہوتیں۔ اے کوئی دنیا سے زلی اولاد چمک بات تو نہیں ہے۔ یہ وقت تو ساری عورتوں پر آگے۔“

”خدا آتا ہو گا مگر زہرہ پر تو مصیبت ہی کر ہی آئی ہے۔ اور بیٹی ہوئے کا مجھے تو ذرا سا بھی ملال نہیں۔ بلکہ میں بہت خوش ہوں اور اگر میری قسمت میں بھی ایک بیٹی بھی نکلی ہے تو میں اس کی بیٹوں کی طرح ہی پرورش کروں گا۔“

”اے خدا نہ کرے جو تمہاری قسمت میں بھی ایک بیٹی نکلی ہو۔ یہ تو تمہاری ہی مسمی اور اختیار پر موقوف ہے۔ اگر تم جاہلو تو نہیں ولی عہد بھی تیسرا کر سکتے۔ اے اللہ رکھے تم کو قہر ہو۔ تمہیں نہ تو عورتوں کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ زینہ اولاد کی۔“

”افوہ! اماں۔ پھر وہی ذکر ہے؟“ وہ جھجکا کر بولے۔

”ہاں تو اس ذکر سے سوا اور تم سے کہوں بھی کیا۔ عقل سے کام لے کر ٹھنڈے دل سے سوچو۔ جیو ایسا ہی ہے زہرہ کو طلاق نہیں دینا۔ تمہارے بااوصی عہد پر سوتلے کسے تھے اور تمہارے چپلے بھی یہی کیا تھا۔ تمہارے بیان تو بڑی کوئی معیوب بات نہیں ہے۔“

”ماں کہتی ہیں اور وہ چلے کے گھونٹ لیتے خاموشی سے سنتے رہے کہ ماں کی عادت سے واقف تھے۔ وہ اپنے موقف پر ڈھٹ جانے کی عادی تھیں۔ اور پھر کہاں تک ان کی بات کی نفی کرتے۔ اور ان کی خاموشی سے ماں بھیجیں کہ ان کا جادو چل گیا ہے۔ بڑی لجاجت سے بولیں۔

”ہاں ہاں ابھی طرح سوچ لو۔ لڑکی کی ایک جھلک تم نے دیکھ لی ہے اور نہیں بھی تو میں تمہارے سامنے۔ خود اسے ہی لاکھ لاکھ دوں گی۔ ایمان سے نکل بائنتان ہے وہ تو۔ ایسا نادر دار نہ ڈھونڈے نہ ملے گا۔“

”لا حول ولا۔ اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے پڑائے نہ ملنے میں ہلا فروغ یوں لگاتے تھے۔ ویسے ہوں گی تو وہ۔“ اچھی ہی کیونکہ سارا خاندان ہی خوبصورت ہے۔ ”بیٹے نے کھسکتے اور کچھ چوڑ کر کہا۔ تو شوکت جہاں کی جیسے بن ہی آئی۔

”مگر وہ تو کیا ہے اپنے خاندان میں۔ جاگرا سے دیکھنا۔ جاہل ہے تو میرے کمرے میں کسی کام کے پہلے جلا جاتا ہے مجبور تو نہیں کر رہی کہ صرف اسی سے شادی کر مگر کم از کم اسے اچھی طرح دیکھ لو۔“

”نہیں نہیں۔ تو بیکریں اماں! اب میں ایک پردہ نشین کے تقدس کو یوں دھوکے سے پکا مال کرنے سے نور ہا۔ یہ گھر انہی ہیں تو کبھی تو آنا سامنا ہو ہی جائے گا۔“ وہ گہرا کر بولے۔

”اے کوئی ہمیشہ کے لیے یہیں ٹوہرے ٹوہرے کی غرض سے تو نہیں آئی ہے جاری۔ میں زیادہ سے زیادہ کل شام تک اچھا

”جی جاتے گی۔ اتنی خشکوں سے بھری جان کو پٹا کر تو لائی ہوں اسے۔“ مگر وہ شش سے شش نہ ہوتے۔
 ”اچھا بھرو۔ میں بس ابھی آئی ہوں۔“ شوکت جہاں کسی خیال سے اٹھتی ہوئی بولیں۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل ٹی بیٹا چران و شش در بٹھا گیا۔ شاید وہ بھی سمجھا کہ ماں بدرا لسا، کو لینے گئی ہیں۔ اور اسی خیال سے اس کے پسینے سے ٹپکنے لگے مگر جب کچھ سی دیر بعد ماں باقیہ میں ایک پولی سی لے تنہا ہی کمرے میں واپس آئیں تو ان کی جان میں جان آئی۔ یہ پولی سیٹھا لو۔ اس میں مبینی کے کارچروں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے طلائی لنگن ہیں۔ بڑی نادر چیز ہے یہ۔ اور

”ابوں نے ہاتھوں کی طرح ان کے ہاتھ سے وہ پولی لے کر ان کی طرف دیکھا۔
 ”اے۔ اس طرح منہ کھولے کیا دیکھ رہے ہو۔ اس کی کچھ خبر نہیں کب چلی جائے۔ اس سے یہ کہنا کہ چونکہ تم پہلی بار یہاں آئی ہو اس لیے ہمارے یہ رسم ہے کہ ہم آنے والے کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے اور میں۔“ مگر وہ تو اچھل کر کمرے

”بہنیں، نہیں، اماں! معاذ اللہ۔ میں ایسی جڑات کبھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو خود ہی دے دیجئے۔“

”اے۔ لو۔ ایک بیٹی کا باپ ہو گیا اور یہ بھی کم کسی لڑکوں کی طرح بدکا جا رہا ہے۔ اسے! یہ تو میرے خاندان کے وقار اور عزت کی بات ہے۔ خیر۔ چل، ایسا ہی ڈروک ہے تو لا مجھے دے یہ پولی۔ اور میرے ساتھ چل۔“ شوکت جہاں کے

”خبر بردار نے وہیں ٹھکے ٹھکے کوئی اور ترکیب سوچ لی۔
 ”لیکن یہ آپ کے ساتھ جانا ایسا کیا فرض ہے۔ اور میں تو یہاں بخوری دیا کام کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ ساری رات

”زہرہ کی پریشانی میں آنکھوں میں کانٹنی لڑی تھی۔“ بیٹے نے گویا ان کے ساتھ نہ جانے کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔
 ”اے تو آج بھی کر لینا۔ کوئی میں نہیں اس پر پیرہ دینے کی غرض سے تو نہیں لے جا رہی۔ اور میں تو اسے یہیں جلا

”لیج لیکن یہ اخلاق کی گری ہوئی بات ہے اس لیے نہیں بلایا۔ آؤ۔ چلو تو کسی طرح۔“ ماں نے یوں کہا جیسے سخت عاجز لگی ہوں۔

”اچھا اماں! جیلا جاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ پہلے ذرا خود کو تیار تو کروں۔ آپ نے تو خواہ مخواہ اس معاملے کو تماشا ہی بنایا۔“ مسعود الحسن کو آخر گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے مگر یہ وہی جانتے تھے کہ ماں کو ملنے کا معنی ایک بہانہ تھا۔ کیونکہ بیٹے کو رضامند دیکھ کر ان کے دل کی کھیل اٹھی تھی اور انہوں نے بیٹے سے مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ وہ پولی لے کر واپس چلی

”چلی گئیں۔
 ”ماں کے جانے کے بعد وہ بستر پر اطمینان سے لیٹ کر ماں کی باتوں پر دیر تک غور کرتے رہے۔ وہ اگر کسی غلط

”اقدام کے لیے انہیں مجبور بھی کر سکتیں اور وہ اس پر بالکل تیار بھی نہ تھے۔ تب بھی سوچنے اور غور کرنے کے دوران وہ

”دشمن کی آنکھوں میں برابر جھلکیاں ملتا رہتا تھا کہ شش کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر صرف طور پر آنکھوں کے سامنے

”آہستہ آہستہ اسے بار بار دیکھتے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر ایک ہلکی سی جھلک دکھا کر چھپ جائے تو انسان کے احساسات

”اور جذبات میں ایک تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جو بیٹی کوئی ایسا احساس ابھرتا مسعود الحسن فوراً ہی اپنے خیالات کا رخ زہرہ

”کی طرف پھرتے۔“ یوں بھی اتنی حسین ہوئی کوسم کے کچھن کی سربراہی سے وہ آستانے کے کسی طرح فراموش کر دیتے۔

”مگر وہ کچھ لوں کہ جب دو تین گھنٹے سولہ گھنٹے کے بعد وہ صبحی ہوئی شام میں رات کے اوّلین پہرے کے آغاز میں ان کی آنکھ

”کھلی ہوئی اور آواز آواز ان گھڑیاں نظر پڑتے ہی وہ گہرا کر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوتے کہ سونیاں آٹھ بج جانے کا اعلان کر رہی

”تھیں اور چونکہ بارے زہرہ کے لیے چند بہت ہی مفرد و انکسٹن اور ادوات خریدی تھیں۔ اس لیے وہ جلد جلد تیار ہو کر

”بڑی لڑ جائی تھیں۔ آئے۔ تاکہ جو با کسی ملازم سے کہہ کر بھی تیار کرالیں۔ وہ جو کو آواز دے رہی تھیں والے تھے کہ سنانے ہی کچھ ناقص

”بڑے ہوئی ہوئی نظر آئی۔ رابدا رادی موی ششوں سے روشن تھی۔ اور اب۔ ہزار پردوں میں چھپا شش ان کے سنانے بے نقاب

”ہو گیا تھا۔

”مردود۔ سٹوڈل جم۔ چاند کی طرح دکتی ہوئی رنگت۔ محبوب اور ساسیمہ سانداز۔ اُمّ وہ تو بیل بدخشان

”کی نہیں اس سے بھی کوئی ماوراء چیرا نہایت ہوئی تھی۔ چند شایوں کو تو وہ نظر چھپکا تا ہی بھول گئے۔ مگر پھر ایک دم ہی کچھ

خیال آیا تو بیکار کر بولے۔

”ہم آپ کے بڑے احسان مند ہیں کہ آپ نے ہمارے غربت کدے تک آنے کی زحمت کی۔ مہینہ نہیں بلکہ شرف بخشا ہوا ہے۔ ہیکھ اگلے مہینہ خیر انداز میں کبھی بھی کر چوٹی سنتا، اور ان کی بوکھلاہٹ کو دیکھتا ہے جتنا نہ رہتا۔ ہزار ضبط کے باوجود ہرگز کھلکھلا کر نہیں پڑی۔ اور ادھر وہ تو جیسے چاروں خانے چپت ہی ہو گئے کہ ادھر تو اس کی ہنسی کی آواز کانوں میں نفرتی گھنٹہ بن کر گونجی، اس پر آبدار ہوئی جیسے دانتوں کی ہموار پٹی۔ یوں لگا جیسے ستاروں کی کوئی لکیر بد انسان کے خوبصورت ہونٹوں درمیان یکسویت جھلکلا اٹھی ہو۔

”ہم بھی آپ کے بڑے شکر گزار ہیں اتنے گراں بہا تحفے سے نوازا۔“ وہ انہیں اس قدر مہبت دیکھ کر شرم سے گلگوں ہونے چہرے کے ساتھ بولی۔

”ہیں۔ کیسا تحفہ ہم سمجھے نہیں؟“ وہ اس سے جواب کے بالکل متوقع نہ تھے۔ اس لیے اسے بولتا دیکھ کر ان کی ٹپک اٹھ اٹھ رہی تھی کہ ماں کے جنا دینے کے باوجود رنگوں کو بالکل بھول ہی گئے تھے۔

”یہ۔ یہ رنگیں۔“ واقعی بہت خوبصورت ہیں۔“ وہ کوئی الحظ اور نادان لڑکی نہیں تھی۔ بلکہ پورے جوہیں پس کی پختہ کی لڑکی تھی۔ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے منی سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ دونوں ہاتھ ان کے سانسے بڑھا کر بولی۔

”اوہ، اچھا اچھا یہ رنگیں۔“ وہ لنگنوں سے زیادہ اس کی کندنی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگے۔ پھر اپنی اسی ہاتھوں میں بولے۔

”لیکن۔ لیکن آپ کی کلائیوں سے زیادہ خوبصورت تو نہیں۔“ اور اس نے لالچوں کی طرح شہکار دہی کھائی۔ عجیب معاً انہیں احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں اور کس پوزیشن کو کھڑے ہیں۔ تو کچھ ایسے پٹیلے کہ اس کے ہاتھ چھوڑ تیزی سے باہر نکلتے اور بد انسانے بیشکل منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روکی۔ اور سانسے ہی کچھ خاملے پر ایک کمرے کے دروازے کی اوٹ میں لپکتی شوکت جہاں نے جو سب کچھ درس چکی تھیں، اپنی اتنی زبردست کامیابی پر خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے دوڑ کر بد انسان کو گلے سے لگا لیا۔

وسیع وسیع آسمان پر طلوع کے اشارے سے ہوتا ہو جیسے تھے۔ شاد و خوار کی سواری ابھی مشرقی افق سے آسمان کے انتہائی آخری کناروں پر نمودار ہوئی تھی۔ زندگی کے سنگامے کو خیر پوچھنے سے قبل ہی جاگ اٹھے تھے لیکن شوکت جہاں کی صبح تمام رات میں شدید درد رہنے کی وجہ سے اب ہوئی تھی۔ ان کی پیشانی پر کسی باریک کپڑے کی چمکی مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی اور وہ ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ بھی مسعود الحسن ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور مٹی اٹانے کے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے انہیں سلام کر کے بولے۔

”اگر زہر سے ایسی ہی نفرت تھی تو کم از کم آپ نے بولی کو تو آکر دیکھ لیا ہوتا۔ سوجھی کو ککاح میں تو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی ماں۔“ بیٹا ایک تو اتنے ہی ملا تہمید شروع ہو گیا تھا۔ دوسرے نہ سلام نہ احوال پرسی۔ اس پر کبھی کیا ہوا کہ شوکت جہاں تھلا ہی اٹھیں۔ بڑی خنوت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر بیٹے کی اتنی میٹھی بات کا جواب پھر بھی نہ دینا سکا کہ خود مجرم ضمیر تھیں۔ بہو گزشتہ روز پورا ایک ہفتہ ہسپتال میں گزار کر گھر واپس لوٹی تھی۔ اور انہیں اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی کہ کم از کم اس کے کمرے میں ٹھکانا ہی آئیں۔ بلکہ وہ تو بھوکے آنے کی پھر تھکتے ہی اپنی ایک عزیزہ کی عیادت کو پہلی گئی تھیں۔ شام کو واپس آئیں تو سر میں شدید درد کا ہمارا کر کے ہلاکھانے پہنچے ہی سو گئی تھیں۔ بیٹے کی گفتگو اور انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے ان کی تکلیف یعنی مزدور کو باطل گردانا ہی نہیں۔ اس لیے تھلا اٹھنے کے باوجود بھی انہوں نے نہایت تحمل سے کام لیتے ہوئے گلے کا سا اندازا چنایا۔

”اسے لو اس موٹے آدھا مٹی کے درمیں تڑپ تڑپ کر پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ اب کہیں جا کر لوساٹو میں آئی ہوں تو تم گلے شکوے کر لے بیٹھ گئے۔ جھوٹے منہ اتنا بھی نہ پوچھا کہ اماں تم کبھی ہو۔ دراصل میرے دودھ میں ہی کچھ خرابی تھی جیسی تیرہری ساری اولادی میری طرف سے غافل ہے۔“

”مگر اماں! اگلے شام تو آپ بالکل بخیر و عافیت تھیں بلکہ پورا دن خالہ سرور جہاں کے ہاں گزار کر آئی تھیں۔ پھر وہاں سے آئے ہی یہ اچانک آدھا مٹی کا درد کیسے پڑ گیا آپ پر؟ بیٹا بھی ان سے سخت کبیرہ تھا۔ اسے طنز چھلے انداز میں بولا۔

”اے تو کو کیا میں مکر کر رہی تھی۔ یا پھر سر پر پٹی باندھ کر کوئی دھونک دیا جا رہے ہیں۔ ارے میں نے تو اس موٹے درد کی وجہ سے رات کا کھانا ٹانگ نہیں کھا یا۔ بھائی! آج تو جاکر رسوں اور رشیدان سے پوچھ لو جو ایک بھورابھی رات کو منہ میں

رکھا ہو تو سورا اور حرام کے برابر ہی ہو۔ انہوں نے بیٹے کی بات پر چمک کر کہا۔

اپنے کھانے پینے کو وہ بہت اہمیت دیتی تھیں اور بیٹے کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی اور یہ بھی کہ وہ باتوں میں مال سے جیت نہیں سکتے۔ زیادہ کچھ کہیں گے تو وہ دلوں اور پٹانے لگیں گی۔ مگر اس لمحے ان پر سخت کوفت سوار تھی۔ وہ ان کی بات کے جواب میں بولے۔

”خیر، مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں اماں۔ میں تو بس آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس بات پر بڑی فز اور غمزدگی کی صورت میں مجھے اندہ پاک نے اپنی ایک امانت سے نوازا ہے۔ اور مجھے یہ بالکل گوارا نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں آپ اپنی طرف سے دوسروں کو کوئی غلط تاثر دیں۔ انہوں نے یہ بات بہت تیکھے اور گنہگار بننے کے لیے کہی تھی۔ جس پر شوکت جہاں بھڑک کر بولیں

”اے میں سے خوب جانتی ہوں۔ تو یہ اپنی زبان نہیں بلکہ بھوک کی زبان بول رہا ہے۔ ورنہ اب سے پہلے تو میرے مرنے میں زبان کے بجائے لوہے کا گوشت کا تو پتھر ہی تھا۔ تو بھلا کسی خرمصورت سے لیا ہوتا ہے اس خطا نے اپنی کمزوری کو کیا لا حول دلا اماں۔ خدا کو یاد کریں۔ اس سے جاری ہے زبان سے تو کیا اشارہ اور کیا بٹا بھی مجھ سے آپ کی بیگمائی کی کاغذ نہیں کیا اور آپ میں کتنی بڑا اہتمام نگاہری میں اس بے گناہ پر۔ یوں تو بڑی با شرع ہیں آپ؟“ ان کی بدگمانی پر بیٹے نے کبھی تا کوئی وہ قدر سے امانت بھرنے انداز میں بولا۔

”اے ماں میں تو میرے خیال میں بے درمن اور بے ایمان ہوں۔ جیسی تو تو مجھے اتنا برا علم دے رہا ہے۔ بچتے بچتے اے ماں تو اگر کوئی بھی بیٹھے والی ہو تو اولاد کی نظر میں اس کا درجہ بھی ماں کا سا ہی ہوتا ہے۔ شوکت جہاں بات کا تکرار کرنے میں لپٹا تھا۔ بگڑ کر بولیں۔

”تو توبہ! استغفار اماں۔ آپ سے تو بات کرنا بھی محال ہے۔ خدا خواستہ با شرع کہنے سے میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔“ مسعودی ان کی اتنی سخت سست سے گھر کر بولے۔

”اے بات کرنا ہی کیا ہے۔ کو کر اب تو تیار سے ساتھ رہنا بھی محال ہو گیا ہے۔ اور تم سے کچھ بعید نہیں کہ ایک دن آہ بھی کھے دو گے۔ آخر اس خرافہ کا چلایا ہوا جادو کبھی تو سر چڑھ کر بولے گا اور ماں کی ایسی دیکھ باتوں نے تو بھر بھر انہیں مرتا ہوا سنا کر رکھ دیا۔

”اماں۔ زہرہ کہ اپنے غلط خطا بات سے نوازنے سے پہلے یہ سوچ لیا ہوتا کہ وہ میری بوی اور اس گھر کی عزت سے اگر آپ اس طرح اس کی تذلیل کرتی رہیں تو پھر میں بھی اسے اور اپنی بیٹی کو لے کر پتھر والی جبلت منقل ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ مسعودی نے بڑے طیش کے عالم میں گواہی دینا شروع کر دی اور پھر فوراً ہی کمرے سے نہیں بلکہ گھر سے ہی باہر نکل گئے کہوں بھی وہ اس وقت کہیں باہر جانے کے ارادے سے تیار ہو کر آئے تھے۔ مگر شوکت جہاں یوں سنی بیٹھی رہ گئیں جسے انہوں نے جھوٹا ہو گیا ہو۔ پھر بچاؤ ان کا ساکت سا جسم حرکت میں آیا۔ دونوں ہاتھ سر پر بندھی بیٹی کی جانب اٹھے اور پھر ہونچنے کے انداز میں انہوں نے بیٹی کو آکر دو فرس پر دے مارا۔ اور اپنی خیمہ خیم مہر کی بیٹی کی گھسک کر دونوں پر فرس پر لگا دیے۔

”ہوں تو یہ بات ہے مونی ڈانچن چڑیل بیچیل میری! انہوں نے معنی خیزی سے سر ہلکا کر معلوم کس کی صفات کو اپنے ہونے خود کلامی کے انداز میں کہا اور اٹھتی ہوئی بولیں۔

”پہلے میرے اراٹوں پر ڈاکر ڈالا اور اب میرے غلبت جگر کو بھی مجھ سے چھیننا چاہتی ہے۔ اسی میں تو میرا جینو امر دندہ۔

گی۔ بد بخت نامہ رادے! ان کا ساٹوا سا بھرہ غصے اور جلی سے تپ سا رہا تھا اور انھوں میں بڑی غضبناک سی نظر ناک سی چمک عموماً آتی تھی مگر بستر سے اٹھنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھیں بلکہ سامنے مقابل کی دیوار تک جا کر بڑی غصہ لاری سی کیفیت میں پھر پڑی مہر پر آ بیٹھیں۔

اصل میں پتھر والی جو بیٹی ان کی سوت منور خاتون کی ملکیت تھی جسے ان کے شوہر اپنی زندگی میں ہی منور خاتون کے نام کر گئے تھے۔

یونکہ انہوں نے کوچہ میں ہی سے خاص طور پر اس بیٹے کو اپنی جیل ماسوت سے مرعی کی طرح اپنے پردوں میں چھپائے رکھا تھا۔ کوچہ کے بیٹے اپنی کٹنی، ڈکیت اور میوا صفت سوت کا سایہ تک نہ بڑنے دیتا تھا۔ حد تو یہ کہ بیٹے کو کوچہ میں سے جی کر کے اصل نام کے بجائے انہیں گرسے ہوئے القابات سے متعارف کرتی رہی تھیں جو ان کے حق پر ڈاکر ڈالنے کی پاداش میں ہوتے تھے۔ اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

بیٹے نے اس کے لیے تجویز کر رکھے تھے۔

میں صرف اپنے ہی خاندان کے رشتہ داروں کی اور شرافت کو دی جاتی تھی۔ اور اس زمانے میں اپنے خاندان میں رشتہ داروں کا کوئی احتمال بھی نہ ہوتا تھا۔ ہاں البتہ اپنے گھرانوں میں بڑے خاندانوں کے اردے کا ایک ہی حیثیت ضرور رکھی جاتی تھی۔ اور مقصود احسن کی شادی کے معاملے میں بھی صورت شکل کو نہیں صرف خاندان کو اہمیت دی گئی تھی اور دستور کا یہ ہے جو ہر جگہ اور ہر صوبہ میں کی صورت میں ان کے والد نے کر لیا تھا کیونکہ ان کی والدہ تو ان کی صوبہ میں وفات پائی تھیں۔ بہر حال اس زمانے کے دستور کے مطابق مردان خانہ اور زنان خانہ ایک ہی گھر کے دو حصوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔ شوہر کو شرط کھیلنے کا مینیا یا ضبط تھا۔ پھر شکار کھیلنے کے بہت شائق تھے بلکہ ایک طرف سے تو ان کا محبوب ترین شغل تھا۔ بھڑکنا۔ مومر سائیکل میں ضرور اچھا بھڑکنا۔ مگر عام طور پر ان کے دل میں کسی کی خاطر نظر آجایا کرتی تھیں۔ نہ تو بی ہوتا تھا اور نہ وقت گزارنے کی کوئی سامی ایجاد ہی۔ لیکن بیوی اور گھر کے بزرگوں کی چوری چھپی کبھی کبھی گمان سے چلے جاتے تھے۔

لیکن ٹکی مزاج بیوی کی انویسٹی گیشن بہت تیز اور فعال تھی۔ انہوں نے اپنے جاسوسوں کا جال مردان خانے سے باہر نکال دیا۔ یہاں کے ہر شخص کو جاننے کے باوجود انہیں ان کی ایک ایک نقل و حرکت اور ایک ایک فعل کی ان کو خبر ہو جاتی۔ اور یہ وہ کچھ ایسا رانی کہن ڈانسی تھیں کہ مریاں کو بھیجی کا کھانا یا یاد آ جاتا تھا۔ مگر یہ ساری عیشوہ طراریاں اور شہر غم سے ان کی وقت بیک بیک سے جب تک ہر صوبہ میں ہوا تھا یا تو بہت برداشت جواب دینے کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔ اور ہر صوبے میں صرف ایک نیریزہ اور لاد کو جو دھڑے سے بعد دیگرے تین عدد بیٹوں کو جنم دیا۔ اور یہاں نے ساری رواداری بالائے طاقت رکھ کر کھلے کھلا بیرونی دھچپوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بیوی نے وہ ویلا بھی چھایا اور احتجاج بھی کیا مگر میاں کے کان پر جوں تک نہ رہی۔

مرد و عورت کے بدلے لیتا ہے تو پھر عورت کی قدر رتی ہے نہ اہمیت۔ پھر بھی مقصود احسن شریف اور منصف مزاج تھے۔ انہوں نے اپنے ظاہری حسن سلوک سے بیوی کی اہمیت کو برقرار رکھا۔ یوں ہی وہ بہت رحمدل اور خدا ترس تھے اور اسی صلہ رحمی کے نتیجے میں ہی انہوں نے اپنی اصلیتی غریب عسقلانی کیا تھا۔ ڈھلتی عمر کے شوق یا ولوں کے تحت نہیں۔ اصل میں ان کا ایک مصاحب راحت مرزا جو ان کے جال خواروں میں سے تھے طبعا بھی بہت نیک اور نیکو قسم کے انسان تھے۔ یوں تو مصاحبوں کی سرشت میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا کی خوشامد در آمد اور چالوسی کرنے میں ایک دوسرے پر مبنی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بات بھی کرتے ہیں تو کھٹکھا اور گنگلا کر اور زبان بھی ایسی ڈھونڈا اور عاجزانہ ہوتے ہیں کہ کیا کوئی زرخیز غلام ہوتا ہوگا۔ اور یہ سب آقا کے دل میں جگہ کرنے، لطیف چڑھنے اور آقا کی کوتاہی عنایتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنے کی غرض سے کرتے ہیں۔ مگر راحت مرزا مصاحب خاص اور کنگلا کا شکار ہوتے ہوئے بھی خوشامد اور چالوسی سے گریز کرتے تھے۔ تقاضا پسند اور غیر نور انسان تھے۔

انہوں نے کبھی انعام و اکرام اور روپے پیسے کی تمنا نہیں کی تھی۔ وہ اگرچہ باتوں یا چرب زبان نہیں تھے مگر کبھی بے بات بھی کرتے اور جھلکے بھی چھوڑتے تو موقع مل دیکھ کر ہی۔ وہ ذات کے فعل تھے اور قد کاٹھ اور شکل و صورت کے بھی تھے اور ان کے چہرے سے برستی شرافت، نجابت اور برہماری نے ہی مقصود احسن کو جن کا لقب عالی مرتبت تھا کچھ اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ ان سے ایک عقیدت سی رکھنے لگے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب شوکت جہاں نے ان کی تیسری بیٹی کو جنم دیا۔ تیسری بیٹی کی پیدائش پر دل ہی دل میں اس قدر مقصود احسن اپنے مصاحبوں اور ایک شناسا کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے کہ انہی کی رعیت کے ایک لڑکے نے ملازم کے ہاتھ اطلاع بھیج کر راحت مرزا گھڑ سواری کے دوران گھوڑے سے گرا۔ شدید زخمی ہو گئے ہیں اور ان کی حالت کشمکش کا ہے۔ مگر شطرنج کھیلنے والوں کو مملوکوں کی لیے قرار دیا گیا ہے کہ کھیلنا بھی چرسی کے سگرت کے دم کی طرح ہوتا ہے کہ ایک دو کس ملے سے امارتے ہی انسان دنیا و مافیہا سے ہٹا کر دے جاتا ہے۔ شطرنج کھیلنے والوں کی محویت اور بے خبری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شطرنج کھیلنے کے دوران اگر انہیں کسی کی موت کی خبر ملے جاتے تو ان کی محویت کوئی شے نہ اٹھانک میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ گونگے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔ مگر راحت مرزا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ ان کی خبریں مقصود احسن کچھ اتنے ہر سال ہوتے کہ سب کچھ چھوڑ کر فرما رہے تھے کہ وہ خاص کو کبھی تیار کرانے کا حکم دیا اور پھر تھوڑی دیر میں خود بھی تیار ہو کر اپنے مصاحبوں کو شطرنج میں کھانا

کراحت مرزا کے عزت کے لیے کی طرف روانہ ہو گئے۔

کراحت مرزا کے دوسرے سرسہرے ایک کنگان محلے میں بنے پھرے سے دو کمروں کا مکان راحت مرزا کی اقامت گاہ تھا۔ کنگان محلے کی سڑک پر مکانات، غلیظ گلیاں، اور مکان بھی بہت پرانا تھا۔

اس پر راحت مرزا کی خود دارانہ اور مسکین سی شخصیت کی کیا انصاف سا محسوس ہوا تھا اس راحت مرزا کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے علاقے کے رئیس کو۔

یوں بھی ایسے کسی پس ماند ملاقات میں آنے کا پہلا اتفاق تھا اور ایسے کسی گھر کو کیا علاقے میں قدم رکھنا ان کے شایان شان نہ تھا۔ مگر چونکہ راحت مرزا کا سوال تھا اور وہ ان کی طرف سے سخت پریشان تھے اس لیے اس لیے انہیں ان سادگی بائیکوں کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔

انہوں نے اندر کمرے میں قدم رکھا تو ایک لمبے کوٹھنک سے گئے۔ دونوں کمرے آگے پیچھے بنے ہوئے تھے۔ اور ایک نشست گاہ یا بیٹھک بھی جس کے سرورپی دروازے سے وہ اندر داخل ہوتے تھے۔

یوں لگا تھا جیسے آنکھوں میں آجیالاسا آڑا یا ہو۔

قریب نشست گاہ قیسی اور اعلیٰ فرنیچر اور اریسی اشیاء سے آراستہ نہیں تھی۔

لیکن فرش پر بچھا ایرانی گھر قیسی قابلین۔

اور پرانے زمانے کی سی ایک مسند نما کوچ اور اس کے ساتھ کے دو صوفے۔ دیواروں پر آویزاں راحت مرزا کے آباؤ اجداد کی بڑی بڑی تصاویر اور کمرے کے کونوں میں رکھے آئینے اور بڑے بڑے عکسوں میں سب سے تازہ پھول اور ایک کہنہ دلانی گھڑی بالہ جو دوسرے کمرے میں کھلتے ہوئے دروازے کے اوپر دیوار پر نصب تھا۔

اس قدر سادگی میں بھی اتنی پرکاری

اتنی جاہلیت۔

اتنی صفائی اور قرینہ۔

راحت مرزا کی اعلیٰ ذوقی کا بین ثبوت تھا۔

سامنے دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

مقصود احسن کے ملازم خاص نے آہستہ سے دستک دی تو وہ تھوڑا سا کھل گیا۔ جیرت کی بات تو یہ تھی کہ گھر میں کوئی دوست آنے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں خالی خالی سے کوئی۔ آخر ملازم خاص کو مداخلت ہے جا کر مگر یہ ہونا ہی پڑا۔ وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو باہر ہاتھ پاؤں کے قریب ہی راحت مرزا اپنے مہرے ناپائیدگ برزخوں سے جو روبرو ہی حالت میں چپٹ لیٹے تھے۔ خادم تو یہی سمجھا تھا کہ وہ آنا آئندہ آنا ابیر راجہوں ہو چکے ہیں اور پٹ کر اپنے آقا کو ان کے کونہ کرانے کی خیر اہم سنانا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً راحت مرزا کی ایک زبردست کراہ سنائی دی اور وہ جلدی سے نشست گاہ میں پٹ کر اپنے آقا کو ملا لایا۔ راحت مرزا ہر شاید چڑنی طاری ہو گئی تھی۔

وہ آنکھیں بند کر کے ایک سیفی جاوڑے ساکت سے لیٹے مقصود احسن نے ان پر تھوڑا سا تھک کر انہیں دو تین آوازیں دیں کہ میں جا کر انہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر تک انہیں یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے۔

"کچھ دیر ہو موزمیا بیٹھے کھا کر بیٹھے انہوں نے اپنی پہچان کرنے کی کوشش میں دوسرا سوال کیا۔

مگر زمانے ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے انہیں تکتے رہے۔

کچھ گرسے۔ کچھ گرسے؟ کہاں چوٹ آئی۔ کچھ تو بناؤ مرزا بھائی۔ پہچانتے نہیں کیا۔ میں عالی مرتبت ہوں۔ مقصود احسن ان کی اتنی خاموشی پر راضیت نہ کر سکے۔ ان کے دل میں اپنے آپ میں نہیں کے بے خبری ہمدردی اور عقیدت تھی۔ جواب پھر بھی نہیں ملا تو انہوں نے ان کی کلائی پر آنکھیاں لٹکا کر ان کی بغض دیکھی۔ پھر سیدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے ہوئے ہوئے۔

کچھ گرسے۔ کہاں چوٹ آئی۔ کچھ تو بناؤ مرزا بھائی۔ پہچانتے نہیں کیا۔ میں عالی مرتبت ہوں۔ مقصود احسن ان کی اتنی خاموشی پر راضیت نہ کر سکے۔ ان کے دل میں اپنے آپ میں نہیں کے بے خبری ہمدردی اور عقیدت تھی۔ جواب پھر بھی نہیں ملا تو انہوں نے ان کی کلائی پر آنکھیاں لٹکا کر ان کی بغض دیکھی۔ پھر سیدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے ہوئے ہوئے۔

وہ تو اطلاع دیتے ہی جلا گیا تھا مسکرا کر۔ شرافت نے تباہا مقصود احسن نے راحت مرزا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کچھ بجا

بالکل ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

”جاؤ ہمارے ذاتی علاج ڈاکٹر شف فاروقی کو جلدی سے لے کر آؤ۔“ انہوں نے شرافت سے کہا تو شرافت کچھ ہراس ہو کر بولا۔

”لیکن آپ یہاں تنہا؟“ تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

”ہماری فخر نہ کرو ہم یہاں ہر طرح محفوظ ہیں بس کچھ ٹھنڈی کی چوتھائی میں ڈاکٹر کو یہاں پیش کر دو۔“ اور شرافت کو بڑے اُن کے حکم کی تعمیل کنا پڑی۔ اور وہ ڈاکٹر کو لینے چلا گیا تھا۔

مقصود الحسن ابھی تک کھٹکے ہوئے اور بڑی تشویش کے عالم میں راحت مرزا کے سستے سستے جسم کے طرف دیکھ رہے تھے۔ بہر مرنوی چھائی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں اس بات پر غصہ تھا کہ اس قدر بیمار رہنے میں کب کب کسیر کی عالم کوئی بانک کو بہ نہ پکارا۔ شاید ان کے بال بچے نہیں ہیں مگر کم از کم کسی محلے والے یا واقف کار کو ان کے حالات میں ان کے پاس تو ہونا چاہیے تھا۔ اور مساف اس بات پر غصے کو برسوں سے راحت مرزا کے ساتھ اپنے منہ کے باوجود اپنے لئے کبھی بھول کر بھی معلومات کیس نہ چھانچا ہی کہ ان کی گزراؤات کیسے ہوتی ہے کتنی بڑی تھی ہے اور کتنے بچے ہیں البتہ یہاں تک ان کے معاشی مسئلے کا تعلق تھا تو مقصود الحسن آنا ضرور جانتے تھے کہ وہ گزراؤات اور خطاطی میں بڑے ماہر ہیں اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے اور یہی نے ان کے گھر راستگی اور حیثیت کو بچھتے ہی اندازہ لگایا تھا کہ گھر میں کھڑا بہت جو کچھ بھی ہے ان کے معاشی کی یاد کا رے گھر پر رہ رہتی اور وقت وہ بالکل ہی بھٹی دست ہیں۔

پھر بھی انہوں نے اس دو کون میں مشکل گھر کو کس قدر غریب اور سستے سے رکھ رکھا ہے۔ اور انہوں نے تو راحت مرزا کو اتنا اطمینان دیا ہے کہ وہ انہیں نوازتا تھا کہ وہ اپنے دوسرے صاحبین کو فوار سے بہتے کہا پھر بڑی تھاکا کہ وہ ہاتھ پھیلا کر اس سے ملنے کو وہ انہیں کچھ دینے حاصل مستحق تو ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی زبانوں پر برکت و خود ادا کی ہر پر نیت ہوتی ہیں اور جو دست و پا کر کے سے مرزا پر نیت رکھتے ہیں۔ انہیں اپنی اس غفلت پر غصہ سا ہوتا تھا۔ اوروہ ڈاکٹر کے انتظار میں گزراؤات ایک ایک بل کی طرح گزراؤات پر سہاڑی طرح گزراؤات تھا کہ انہیں گزرتے ہوئے بیوں میں سے کوئی ایک بھی سفاک بل راحت مرزا کی زندگی سے استوار راستے کے رشتے کو اپنے سنگ بہا کرے جلنے کے دیپے نظر آ رہا تھا۔ یعنی اضطراب مایوسی اور ملال میں گھرے مقصود الحسن۔ ابھی ڈاکٹر شرافت

کا ایک ایک بل ہی گزرتے رہے تھے کتنی انہیں سنانے اندر نہیں نکلے ورنہ دروازے پر دستک کی ملکی سی آواز آتی۔ جسے پہلے تو انہوں نے کالوں کا دھوکا کچھ کر تو جبر نہیں دی مگر چند ہی لمحے بعد جب دروازہ ہلکی سی پر جرابت کے ساتھ کھٹکا سا ہوا تو وہ چونک کر تجسس نظروں سے اسی طرف دیکھنے لگے کہ مبادا ہول کے دباؤ سے ہی دروازہ کھٹکا سا تھا۔ ہوسے کچھ تو وہ بھی تھے لیکن دستک کی بھائی ہوئی حواس انہوں نے اپنے کالوں سے ہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے تجسس ہو گئے تھے مگر کچھ ہی دیر بعد وہ ہم اور دروازہ چرہ ہو گیا۔ اور اب کے دستک کی آواز دروازے سے آتی تو ان کے قدم خود خود ہی دروازے کی جانب اٹھ گئے۔

”کون ہے؟“ انہوں نے پڑی پڑی پر رعب آواز میں سختی سے پوچھا۔ اور جابا دروازہ صرف اتنا کھلا کہ جس کے دیہات ایک بی ہی سکر سٹ کر گزر سکتی تھی۔ اور اسی گھری میں سے ایک چھوٹے سے طشت میں رکھا اور جالی کے خلیبورت اور ان کے گرد بونٹوں سے دکھاؤا دکھاؤا کلاس ٹوڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک مڑمڑ سی آواز سنائی دی۔

”اگر محنت نہ کیجیوں تو میرے جبرائی ہی دودھ کا گلاں میرے مقصود الحسن انتہا کو پہنچے ہوئے تجسس پر قیالو نہ رکھے، انہوں نے غنا طبعی بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں نہیں، محنت کا کھلا کیا سوال لیکن پھر آپ مجھے یہ بتائیے کہ مرزا صاحب کو یہ حادثہ کب اور کہاں پیش آیا۔“

”گزشتہ شام کو شہر سے واپس لوٹے ہوئے، معلوم ہے، یہی میں جواب ملا۔“

”اوہو کل شام سے اور طالع ہیں اب وہی گئی ہے۔“ وہ خود گلائی کے سے انداز میں تاسف سے بولے۔

”ایسا کوئی تھا ہی نہیں جس کے ذہن بچے آپ کو مطلع کیا جاسکتا۔“

”کیا مرزا کے گھروں کوئی اور روم موجود نہیں؟“

”جی نہیں۔“

”اور اہل خانہ؟“

”وہ بھی نہیں ہیں۔“ یہ سنا کر آپ کی مرزا کے کیا نسبت ہے؟

”ابا جان میرے بھائی بڑے گوارا میں۔“

”اور آپ کی والدہ صاحبہ کہاں ہیں۔؟“

”وہ میری معزنی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔“

”تو آپ الگویٰ اولاد ہیں مرزا صاحب کی۔“

”جی ہاں۔“ دل گرفتہ سے لہجے میں کہا گیا۔ اور پھر طشت کو دور اُسے کی چھری سے گزرا کر اس نے کہا۔

”براہ کرم، دودھ پیچھے ابا جان کو بلاویں۔“ اور مقصود الحسن جن کی کیفیت اس کے کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی ہاتھ رکھا طشت اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے کر فوراً ہی مرزا صاحب کی طرف پٹ گئے پھر خود ہی راحت مرزا کے پاس بیٹھ کر پوچھ کر انہیں دودھ پلانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر پھر دودھ ملنے کے بجائے منہ سے باہر گزراؤات انہوں نے جبک کر زور پر کئے طشت میں گلاس رکھ دیا اور آٹھ ہی رہے تھے کہ کتنی اپنے سات سے جسم کو جنبش دینے کی وجہ سے راحت مرزا کے منہ سے ایک کراہی نکلی۔

مقصود الحسن سمجھ کر انہیں ہوش آگیا ہے۔ اُٹھتے اُٹھتے پھر بڑی پرہیزگاری سے اُٹھ گیا۔ اور ان کا شانہ ہلا کر مرزا پر پکارنے لگے۔ تب کہیں عا کر مرزا کی بندگیوں میں ارتقا ش سنا پیدا ہوا اور پھوٹی دیر بعد انہوں نے اُٹھ کھڑے انہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بہت بابت پست اور کزور آواز میں بولے۔ ”عالی مرتبت آ۔ آپ۔۔۔“ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن انہیں ہوش میں آنا دیکھ کر مقصود الحسن لہجے بتانی پرتا ہوا بولے۔ ”فوار آئی بولے۔“

”ہاں میں عالی مرتبت ہوں شکر ہے تم نے مجھے پیمان بہا تم گھراؤ نہیں میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے وہ کسی بھی لمحے آتا ہوگا کہ تم میری بات کچھ رہے ہو۔“

”جی ہاں۔“ لیکن ڈاکٹر کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کیے مگر ریکوری درخواست میں لیے کہ وقت بہت کم ہے۔ ”راحت مرزا نے ہماری بات بہت اہم ایک ایک کونوں کی زندگی کی طرح قوت کو باقی بچاؤ کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔“

”اے نہیں نہیں ہمارے سوتے ہوئے تیر وقت کی کسی کے نہ دے میں نہ پڑو۔ کھانا لالک کر علاج معالجہ ہوگا تو تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ انہیں نے گویا راحت مرزا کی قوتی ہوئی بہت بندھائی۔

راحت مرزا کچھ دیر پھر انہیں بندے کے رہے پھر آپ ہی آپ بڑے زور سے چونک کر انہوں نے انہیں کھولیں۔ اور جہاں تک نظر پہنچا کتنی ہی وہاں تک انہوں کو کھمایا۔ اس سے شاید تکلیف اور کرب سے ہی ان کا چہرہ متیر سا ہوا تھا۔ پھر ان کی نگاہیں قریب پیچھے مقصود الحسن کی جی لگا ہوں سے آگئی تھیں۔

”عالی مرتبت وقت بہت کم ہے اتنا موقع ہی نہیں کہ کچھ عرض کر سکوں۔“

”بس اپنی ایک امانت آپ کو سونپنا چاہتا ہوں۔“ یہ بقرے ہی انہوں نے علیحدہ ٹمٹروں اور اندلی اندلی حسنی ہوئی آواز میں کہے تھے۔

”کسی امانت مرزا۔؟“ جو کہ اپنی بات یا فیض کے ہکر انہوں نے پھر انہیں بند کر دی تھیں اس لیے مقصود الحسن جنہیں ان کی دم بدم بڑی بونی حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حالت نزع میں ہیں۔ ان کا شانہ ہلا کر اوچی آواز میں بولے۔ انہوں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا۔

”مے میری۔ بیٹی۔ جو۔ منور خاتون۔ اس۔ اس کا میرے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ سوائے آپ کے۔“ اُنکا کہہ کر راحت مرزا کی آواز نہر ہوئی مگر سوٹ ہتے ہی رہے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی گڑوں ڈھلک گئی مقصود الحسن اتنا اند پڑے ہوئے ان کے پاس آئے اور ان کی غیر وا انہوں کو اپنے ہاتھ سے بند کر کے سینے تک ڈھکی ہوئی چادر جو حرم اور ہے ہوئے تھی اس سے ان کا چہرہ بھی ڈھک دیا۔

انہوں نے سوائے اپنے باپ کسی کو اپنے سامنے اتنے نزدیک کبھی مرنے نہ دیکھا تھا۔ ایک اتنے بچے اعلیٰ صفات رکھنے والے صاحب کدائی بدلتی سے انہیں کچھ ایسا عمدہ پہنایا تھا کہ انہیں کسی دوسرے کرے میں موجود راحت مرزا کی الگونی بیٹی کو بھی اس خبر جانکاہ سے

فیصلے سے اُسے باختر کا مگر ان کی بات سن کر کچھ کہنے کے بجائے وہ کچھ نہ بولا وہ بھی بچھے بٹ گئی بلکہ اُن سے پشت کر کے کوئی ہوجا
کا اُنہل اور ہیشیا تک ڈھانچا ہوا سر بھی پردہ پوشی کیلئے ناکافی ثابت ہو رہا تھا مگر بے سودی تھا کہ وہ اُن کے اُن کے اُن کے اُن کے
کا جلوہ دیکھ چکے تھے وہ اس کے احتیاط کرنے پر ہلکی مسکراہٹ دیا کر پڑے۔
"لیکن ہم سب سے پہلے آپ کو یاد کروا رہے ہیں کہ نہ رشتہ اور نہ ہر تار ہمارا شعرا نہیں اگر آپ کو ہمارے فیصلے سے اختلاف ہو
چپ چاپ یہاں سے چلے جائیں گے اور پھر کبھی آپ کو کسی بھی تازہ دین نہیں ڈالیں گے۔ انکار یا اقرار کے صاف طریقہ پر
ایک مینسٹرن فوری جواب کے خواہاں تھے۔ وہ ناگزیر افرورہی مگر راحت مرزا جیسے لائق اور باشعور باپ کی بی بی مٹی
اور پھر شہری ماحول میں بی بی زہرا تھی۔ اور میر کی پورٹ تھی۔

اور سب سے بڑھ کر حالات کی جہی میں پس ہیں کہ زندگی کے بہت سے تلخ تجربوں کا مزہ بھی چکے ہوئے تھے
شادی کی پیشکش اسے ناگوار تو نہیں مگر زندگی کے وہ ان کے مرتبے اور مقام سے بخوبی واقف تھی۔
جانی تھی کہ یہ خاندان بدشعور کی کسی زندگی تیار نہ کر سکے گا اور وہ اس کے ساتھ نہیں گزار سکے گی۔ باپ کے سوا اس
کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہ رہا تھا۔ صرف ایک خالہ ہی تھیں۔ میاں کے انتقال کے بعد میں کے پاس وہ عرصے تک رہی تھیں
مگر خالہ بھی ایک دن داغ مفارقت دے گئیں تو پھر پھر پھر وہ باپ کے پاس آگئی تھی۔
بہر حال۔۔۔ ہر جگہ کہ تمام نزاکتوں سے باختر بھی پھر بھی اور فی الفور تو مثبت یا منفی کوئی فیصلہ ہی نہیں
تھی اور ادھر وہ تھے۔ شاید وہیں کھڑے کھڑے قاضی کو بلوائے کا قصد بھی کر چکے تھے۔ جیسے اگر وقت کے وقت نکاح
پھر وہ کبھی ہاتھ ہی نہ اڑے گی۔
"تو پھر کیا خیال ہے آپ کا اپنے فیصلے کو جائز سمجھ لیں؟" انہوں نے اس کی خاموشی سے انکار کر پوچھا۔ انداز بجا تھا
جیسی آپ کی مرضی۔۔۔ آخرا سے اقرار کے طور پر کہنا ہی پڑا۔
اور پھر وہی ہوا جو وہ سمجھ رہی تھی۔

اس وقت نہ یہی اسی شام۔۔۔ کل پانچ آدمیوں کی موجودگی میں اسی گھر پر ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔
پھر دو تین ماہ تک تو اس معاملے پر سمجھوتہ کی پھر اس طرح احتیاط اور پردہ پوشی کی گئی کہ حکومت کے کسی راز کی
کی جانی ہوگی۔

اور وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور شکر چھپائے نہیں جیتے تو یہ مثال تو ان کے معاملے میں صادق نہیں آتی تھی بلکہ اس
گریٹ تو شوکت جہاں کی انٹیلی جنس کو جانا تھا جس کی حسن کارکردگی کی وجہ سے یہ نہایت اہم خبر شوکت جہاں تک پہنچی
تھی پھر تو انہوں نے کچھ ایسا ہنگامہ کر دیا کہ شیطاں بھی کان پڑ کر کسی کو سننے لھڑے میں گھس گیا ہوگا مگر نتیجہ میں وہی
جو عام طور پر ایسی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے جنہیں ایسی ہی کسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
بات جب کھل گئی تھی تو مقصود الحسن نے بھی اسے مزید لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یوں بھی مرد کا کوئی راز عورت پر عیاں ہوجاتا ہے تو وہ قابل یا شرمندہ ہونے کے بجائے شرم ہوجاتا ہے۔
کیونکہ بات پھر آئے سانسے کی ہو جاتی ہے۔ اور مرد نے جھکنا بھی سیکھا ہی نہیں۔ بلکہ وہ اگر قابل بھی ہوتا ہے
اُن کا قابل کر کے۔

یوں بھی جب تک شوہر کی کوئی ایسی ویسی بات ہوئی سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس وقت تک شوہر کھل کر کچھ نہ
جرات نہیں کرتا۔ وہ رفاقت کی پاسداری کو برقرار رکھنے کی کوشش ہی کرتا ہے اور دوسرے معزز میں بیوی کی
اور دفا داری سے فائدہ اٹھا کر اسے بے وقوف بنا کر رہتا ہے یا پھر اسے دھوکا دیتا رہتا ہے مگر بات جب کھل جاتی ہے
پاسداری، مروت اور لحاظ کو بالائے طاقت کر کے کھینچ لیتا ہے اپنی من مانی کرتا رہتا ہے۔

بات کھل گئی تھی اس لیے مقصود الحسن، شوہر خاتون کو شوکت جہاں کے ساتھ بڑی جوتی میں لا کر رکھنا چاہتے تھے
شوکت جہاں کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے پھر ایک طوفان سا کھڑا کر دیا۔ شوہر خاتون خود بھی شوکت
ساتھ رہنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اس لیے ان کے لیے قہر والی جوتی خالی کر کے جس میں ان کے چند قریبی عزیز بھی رہتے تھے۔
جہاں کے تصرف میں دے دی گئی تھی اور شوہر کا یہ اقدام بھی شوکت جہاں کے لیے کسی سزا سے کم نہ تھا کہ ان کے
نے اُن کے لیے تو کبھی ایسے مان گئے نہیں کیے تھے۔

پھر اسی برس نہ ہو تھا۔ شوہر خاتون سے عقد ثانی کے بعد مقصود الحسن نے ہر وہ فیصلہ پسوں اور وابستگیوں سے بھر
کراہی اختیار کر لی کہ شاید انہیں شوہر خاتون کی صورت میں اپنا گھر مقصود دل گیا تھا اور ایک طرح سے وہ اسی کے ہو
سنا رہے تھے۔ بیٹے میں پانچ روز اس کے ساتھ گزارنے اور دروازہ شوکت جہاں کے ساتھ۔ اور شوکت جہاں یہ دو دن
کر رہے تھے۔ شوکت جہاں اور شوہر خاتون کے درمیان میں گزرا رہتیں۔

اور پھر کبھی پورے زمین کے سینئر بیگم تھیں۔
اس کے دل عہد کی ماں تھیں۔ راہ بڑی سوئی تک جھپک کر اٹھنا کہ شہر ان کبھی تھیں خزاؤں سے کا پڑ کر زور مامور تھے۔

اس لیے کبھی بھول گئی ہاتھ نہیں ہلاتی تھیں۔
جب کہ شوہر خاتون کی خوش سلیقگی اور نفاست کا یہ عالم تھا کہ گھر سے بولنا نظر آتا تھا۔
پودت کی باندی اور شوہر کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا۔ ان کے سارے کام بھی اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔
اور خوش خلق آدمی کو خلاف بھی ہوتا وہ بھی ان کے اخلاق سے متاثر ہونے لگتا رہتا۔ اس پر بھی صورت میں ہی بیگم۔
صلا جی ملکہ کو ذہنی آسودگی اور سکون ہی سکون ملے اس جگہ کے چچے تو وہ ساری دنیا کو تیاگ سکتا ہے۔
پھر بھی مقصود الحسن نے شوکت جہاں کے حقوق پامال نہیں کیے تھے۔ شوہر خاتون کے ساتھ ساتھ ساتھ وہ ان کو بھی نبھاتے
چلے آ رہے تھے۔

جب کہ شوکت جہاں سے ان کا دل بالکل میل ہی نہ کھاتا تھا۔ عقد ثانی کے بعد ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے جب وصل
کے ہجوم جذبات میں بیٹے ہوئے انہوں نے ان کا گھر ٹھٹھا اٹھا کر پہلی بار ان کا عرصے کی تلوہ دیکھا تھا۔
مگر جہاں کے بطن سے بھی ان کی دو اولادیں تھیں بالترتیب ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔

بہر کیف! میاں کی زندگی میں تو چاہنے کے باوجود وہ شوہر جہاں کا بال بکا نہ کر سکی تھیں اور میاں کے انتقال کے بعد بھی
چوڑی میں ہی کاغذ گزر چکا تھا اور یہ معاملہ ایک طرح ٹھنڈا ہی پڑ گیا تھا۔ اور پھر شوہر کے انتقال کے بعد خاندان والوں
میں آپس میں کچھ ایسی بیچوت پڑی تھی کہ معاملات کو نبھانا مشکل ہو گیا تھا۔ اور وہ نہ صرف بی بی باقی نہ رہے تھے جو شوہر کے ملنے
میں ہو کر رہے تھے۔ اس پر بیٹے سمیت چاروں بیٹیوں کو بھی ان کے گھروں میں آنا دیا گیا تھا۔ گویا اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔
جودہ کو ان کے خلاف کوئی مافوقا نام نہ نہیں۔ ان کے دل پر شوکت کی شکل میں شوہر کے لنگائے ہوئے زخم کی بالکل ہی کیفیت تھی۔
جیسے کوئی مہر اور کراہی زخم۔ وقت اور دواؤں کے مرہم سے آہستہ آہستہ بھر تو جاتا ہے لیکن جوں ہی زخم پر جاکر نہ کسی دہر
سے کھڑا ہوتا ہے تو پھر اسے اور تکلیف دینے لگتا ہے پھر مر رہا ہوتا ہے۔

اور بیٹے نے پھر والی جوتی کے حوالے سے دھکی دے کر واقعی بڑی بے دردی سے کھنڈن فرج ڈالا تھا۔
اور اب اس میں درد بھی ہو رہا تھا اور ساؤ بھی۔
اور زخم بھی ایسا ہو گیا تھا جیسے تازہ تازہ لگا ہو۔

اور وہ سوچ رہی تھیں۔ سوچے جارہی تھیں کہ یہ سب کیونکر ہوا؟
بیگم کی ان کی دھمپ جات تک رسائی کیسے ہو گئی۔؟

جب کہ انہوں نے تو اسے اس کے سامنے سے بھی محفوظ رکھا تھا۔
یوں بھی پچھلے ایک عشرے سے انہیں بے درپے مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی
کہ بچے کے بجائے پوتی ہوئی تھی گویا بچہ کے لڑکی بننے کی وجہ سے ناک تو قدرتی طور پر ہی ہو گئی تھی۔
مگر وہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بات کرنے کے بھی قابل نہ رہی تھیں۔ اس پر بیٹا تھا کسی طور پر عقد ثانی پر آمادہ ہی
نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک ذرا سی بات پر اتنی تنگ آمیز دھکی دے گیا تھا۔

اور اس پر مستزاد بالکل اصل نکار اور پریشانی کا سبب بدراستیا کا مسئلہ تھا کہ ادھر تو وہ اپنی ہٹ کی پوری اور
بات کی بی بی تھیں۔

اور ادھر کم جہاں نے ایک رات بھی معلوم کیسے صبر کر لیا تھا۔
لٹنے جا کر اور رمان سے وہ بدراستیا کو اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ اس ارادے سے کہ تین چار روز اپنے پاس رکھیں گی اور

بیٹے کو اس کے قریب لانے کی کوشش کریں گی، کہ موقع بہت اچھا تھا۔ یہ وہی ہسپتال میں تھی۔

اور بیٹا تو ایک ہی جلوہ دکھ کر بے خود سا ہو گیا تھا۔ مگر حکم جہاں سے دوسرے طبقے کی نوبت ہی دامنے دی اور اگلی صبح نوکے ہی نوکے عاقل کو بیچ کر بیٹی کو بلوا لیا اور وہ عاقل سے نکلے ہی کرتی رہ گئیں۔ اور پھر جہاں تک اپنی رہتی تھی خواہش کی بات تھی وہاں تک تو سب ٹھیک ہی تھا۔ یعنی وہ بد النساء کو اپنی چاچا پوسا ز باتوں اور امارت سے متاثر اور وہ بے کر کے شیشے میں اتار سکتی تھیں۔ مگر بد النساء کوئی لاوارث لڑکی تو نہیں تھی۔ اس کے سر پر سب سے بڑا ڈنڈا تو حکم جہاں کا تھا اور وہ دونوں بھائیوں کا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حکم جہاں ان کی امارت کے رعب میں آئیں گی۔ کسی قیمت پر یہ گوارا کرنے کی کہ ان کی کوری اور کنواری بیٹی کو ایک دو باجو کے بے نامہ دیا جائے۔ جب کہ ایسے معاملات انسان کی اپنی کسی بھوری اور پانچوں کے تحت ملے پاتے ہیں مگر حکم جہاں کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ وہ کسی کا دیا کھاتی تھیں۔ کسی کی دیکھتی تھیں۔ اور دھڑکے دینا کسی قیمت پر بھی زہرہ سے سکھ دوش ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے بد النساء کو اس کے عقید میں لاسے کا کوڑا مکان ہی باقی رہا تھا۔ اور ان ساری باتوں کا ذمہ دار انہوں نے بقول ان کے زہرہ جیسی گھٹی اور مکار عورت کو ہی قرار دیا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ جب تک یہ کمٹیوں کی خاصیت والی زہرہ اس گھر میں رہے گی اس وقت تک وہ اپنے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں گی۔

گمردہ بڑی پالیسی بردار تھیں اور کھلم کھلا زہرہ کی مخالفت کرنا نہیں چاہتے تھیں بلکہ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جو کچھ اس کے خلاف ہیں پروردہ کہہ کر ہی کریں گی۔ اور اپنی خوبصورتی سے اس کا چٹا کاٹ دیں گی کہ وہ کسی کو تو کیا خود ان کے لالچ بیٹے تک کو ہنسنے نہ ہوگی۔

وہ شہر کا ایک معنائی علاقہ تھا۔

گواہی رات کے اولین پہر کا آغاز ہی ہوا تھا۔

پھر یہی چہار طرف چوک کا عالم طاری تھا۔

یوں تو اس بستی کے باسی کھاپی کر سر شام ہی سو جانے کے عادی تھے۔ لیکن تنوڑی بہت جاگ اور لوگوں کی آمد و رفت تو پھر بھی جاری رہتی تھی لیکن ان دنوں چونکہ برکھارت نے اپنا رنگ جھار کھا تھا اس لیے پچھلے کئی روز سے آسمان بلبوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جو گزشتہ کئی روز سے مسلسل سارے سال کا جمع شدہ کوٹا دل بھر کے لہجے کی کائنات پر انداز ملنے کی حد تک اس سے باہر تھی سوئی تھی بس ہوا کا کوئی شوش بھونکا چھوٹا چھڑکتا گزرتا تو پانی سے لہریز یہ بلباں ایک دم ہی جھلک اٹھتیں۔ اور لوہوں چند لفظوں کو بلی بلی ٹپ ٹپ ہوتی اور پھر گھیر سناٹا چھا جاتا کہ اس کے نوک پر کتنے اور بلباں وغیرہ بھی موسم کے غیر متوازن تیور دیکھ کر اپنے اپنے ٹکالوں میں دیکے ہوئے تھے البتہ مینڈر جیسٹک مزور جب دستور اپنی اپنی راگنی لاپ رہے تھے کہ دفعتاً فضاؤں پر عیط اس گہرے منٹے میں ایک شور سا ہلکائی ایک تانگے کی آواز ابھری۔ اور بستی کے آخری سرے پر بنے ایک نیم بختہ مکان تک جا کر بند ہو گئی۔

تانگے میں کو جان سمیت کئی تین افراد سوار ہیں۔

اگلی سیٹ پر ایک بڑا سا گھڑ پہلو میں رکھے ایک طرف سکا اسٹا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھ ہے۔

پچھلی سیٹ پر پانچواں پر رکھے جست کے درختن شدہ ایک لمبے سے بکس پر پیر رکھے ایک برقعہ پوش خاتون بھی ہے۔

تاہم رکٹے ہی وہ عمر شخص جلدی سے نیچے اترتا ہے اور پھر بہت احتیاط سے وہ گھڑ تار کر نیچے رکھتا ہے۔ اس کے اتارنے ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھی خاتون بھی نیچے اتر آتی ہے۔ اس کے نیچے اترتے ہی وہ شخص جلدی سے ایک نوکری سمیت چوتھلی سیٹ پر خاتون کے پاس ہی رکھی ہے وہ بکس نیچے اتار کر رکھتا ہے اور یہ سارا سامان مکان کے دروازے کے آگے لے جا کر رکھ دیتا ہے۔ اور پھر مکان پر ایک نظر ڈالتا ہے جو گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔

خاتون بھی قدم بڑھا کر عین دروازے کے آگے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور اس شخص سے کہتی ہے۔

”اچھا اب تم جاؤ دینو بابا۔ خاتون نے گھڑی سینے سے لگا رکھی تھی۔

”درارے چلا جاؤں گا۔ بہو بیگم۔ پہلے آپ کو اندر تو پہنچا دوں۔“ دینو کہتا ہے۔

”نہیں نہیں تم جاؤ اگر یہ تاکے والا چلا گیا تو پھر اس خراب موسم میں تمہیں صبح سے پہلے یہاں کوئی سزا دی

نہیں ملے گی۔“ خاتون کہتی ہے۔

”پر، بہو بیگم پہلے یہ تو دیکھ لو کہ اندر کوئی ہے بھی یا نہیں۔ سارا گھر تو اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔“

”خیر ہوں گے تو سب ہی مگر سو رہے ہوں گے اور جن سے بھلی بھلی ہو گئی ہو بارش کی وجہ سے۔“ خاتون

کہتی ہے تو تاکنے والا جو اس اثنا میں نگاہیں کھینچ کر تاکنے کا رخ اسی سمت موڑ چکا ہے جو صبر سے آیا تھا برس

کرت بجے میں دینو سے کہتا ہے۔

”ارے بابا جلدی کرو میرا تو یہ روزی کمانے کا وقت ہے اگر گاڑی نکل گئی تو“

”ارے اتنی تو آئی کیا پڑی ہے جیسا۔“ مینا قسمت میں لکھا ہوتا ہے انسان اتنا ہی لکنا ہے۔ اب زمانا ہر

کو ایسے غیر وقت اکیلا چھوڑ کر کسی تو نہیں جاسکتا میں۔“ دینو نے کہا۔

”اب یہ بڑا جتہ ڈومہ، ہے بابا میرا تو نہیں۔“ مینا اتنے کھراب موسم اور رات کے وقت پورے تین کوئی کاؤنٹر

محل ایک روپیہ ہی تو دو گئے۔ کوئی، اسروہی راشنی، تو نہیں۔ چلتے ہو تو چلو ورنہ تاکنے والا تڑپے ہوئے لیجے میں پڑا۔

”ہاں ہاں بابا! آٹم پلے جاؤ۔ یہ میرا ہی گھر ہے۔ اپنی عمر کے چھ برس کے علاوہ سترہ برس میں نے نہیں رہ کر

گزارے ہیں۔ تم میری نگرانی کرو۔“

خاتون کی آواز سے کرب سا نمایاں تھا۔

”اچھا بیٹا۔“ خراب آپ کو کسکی رکے۔“ دینو نے تاکنے کا رخ کرنے سے پہلے گلو گریں لیجے میں کہا۔ اور پھر سلام کر

تا گئے کی طرف مڑا تو خاتون نے ایک پتیلی سے ایک ایک روپے کے دس تئکے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو بابا۔ یہ تمہارے کرائے کے پیسے ہیں ان میں سے دو روپے اس تاکے والے کو دے دینا۔ بے چارہ تھے تو

موسم بھی میں یہاں تک لے کر آ گیا۔“

”لے کر آ گیا تو کیا مفت آ گیا ایک روپیہ لے گا کرائے کا جبکہ آٹھ آتے گئے ہیں۔“

دینو نے خاتون کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی وہ تو دو روپے کرائے کا سن کر ہی چمک اٹھا تھا۔

”اچھا خیر میری ہر مرضی ہے تم اسے دو روپے ہی دینا۔ لو اب کسی طرح یہ پیسے تو سمجھاؤ۔“ خاتون دینو کی باتوں

زنج سے ہر کر بولی۔

”رہا بیسم اللہ۔“ دینو نے پیسے اس کے ہاتھ سے لے کر کہا اور پھر پتیلی پر رکھ کر متعجب سے انداز میں بولا۔

”اسے سارے روپے بہو بیگم۔ نہیں نہیں یہ میں نہیں لوں گا۔ بس دو روپے ہی کافی ہیں واپسی کا گریہ تو اب

پہلے ہی دے چکی ہیں۔“

”نہیں دینو بابا یہ تمہیں لینے ہی ہوں گے تم نے تو مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مگر میں تمہیں یہ آٹھ روپے نہ

میں دے رہی ہوں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں آتا رہی۔“

خاتون نے کچھ اتنا صبر اسے کہا کہ دینو کے لیے مزید لٹاری کوئی گنتی نش ہی نہ رہی۔

”ارے بابا اب چل میں چکو کسی طرح۔“ تاکنے والا انتہائی بیزاری کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ تو دینو خاتون کو ایک

رضعتی سلام کر کے اور بیٹھ بیٹھ براؤں دعا میں دیتا تاکنے میں جا بیٹھا۔ خاتون ڈیڑھائی آنکھوں سے کچھ دیر

دیکھتی رہی پھر دروازے کی طرف مڑ کر اس نے دستک دی۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے مگر اندر کا سامنا تھا

یہی مڑنا تا ہی نظر آتا۔

”اٹ کیا سب لوگ مردوں سے شرط باندھ کر سو رہے ہیں یا کہیں ایسا تو نہیں کہ سب کہیں گئے ہوں۔“

عاجزی سے ہو کر سوچنے لگی۔

یوں ہی رات کا وقت اور ہو کا عالم۔

ادھر باتوں میں ٹٹائی وہ گھڑی جسے وہ کسی متاع عزیز کی طرح سینے سے لگائے کھڑی تھی اب سنبھالی شکل

ہو رہی تھی۔

ادھر یہ خوف اور خطرہ بھی دامن گیر تھا کہ اگر کوئی ایسا ویسا اس طرف آنکلا تو اس نلے اور تنہائی میں کوئی ہانک

کوہکا نہ بکار کو آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے اٹھنے ہاتھ سے گھڑی کو سنبھالا اور سیمے ہاتھ سے زمین پر بڑا ایک بڑا

ساجتا خاکہ تقریباً ٹوڑ دینے کے سے انداز میں دروازے پر مارے لگی۔ تب کہیں جا کر اندر کہیں سے کچھ ایسی آواز آئی

جسے کوئی کنویں سے بول رہا ہو۔ کہ بات تو سمجھ میں نہ آئی مگر آواز ضرور سمجھ میں آگئی کہ اس کے لیے مالوس تھی، جسے

سن کر اسے اتنا اطمینان ہوا کہ اندر جاگ ہو گئی ہے اس کے باوجود بھی وہ مسلسل دستک دیتی رہی۔

”ارے بھئی کون ہے۔“ ذرا صبر سے کام لو۔ کچھ جی دیر بعد وہی مالوس سی مرانا آواز بند دروازے کی دوسری

سمت سے آئی۔ یہ اس کے والد مظفر حسین کی آواز تھی جو ایک ٹانگ سے معذور تھے اور بیساکھی کے سہارے چلتے

تھے۔ بعد بت باپ کی آواز سن کر آنسوؤں کا ایک گولا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا اس لیے جواب میں وہ ایک

لفظ جس منہ سے نہ نکال سکی۔

”کون ہے بھئی اتنی رات گئے۔ اپنا نام تو بتاؤ۔“ باپ نے پھر پوچھا۔ تب اپنی ریزہ ریزہ سی ہوتی کیفیت پر مشکل

تالو باکر خاتون نے جھنسی جھنسی سی آواز میں آہستہ سے کہا۔

”مم۔ میں ہوں آیا میں۔“ مے۔ زہرہ ہوں۔“

”ہاں میں کہا کیا۔“ زہرہ۔ ایک لمحہ صنائع کیے بغیر دروازہ کھٹ سے کھولتے ہوئے باپ نے گویا درمخیرت

میں غوطے کھاتے ہوئے پوچھا۔

”زہرہ تم۔“ دروازہ کھولنے کے بعد بیٹی کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر بھی مظفر حسین کے استعجاب میں

کی نہیں آئی بلکہ اس استعجاب میں تجسس بھی شامل ہو گیا۔ اور ادھر زہرہ جو اپنے آنسوؤں کی کوشش میں پوری لرز رہی

تھی۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہہ سکی تھی کہ باپ کو سلام تک کرنا قبول نہ گئی۔

اتنے ناوقت وہ بھی بالکل تنہا ایک کسمپرسی کے عالم میں جوان اور بیباکتا بیٹی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر مظفر

حسین کا ماضی ضرور شک کا شکار تھا۔ اپنی تفویض اور پریشانی کا اظہار اس پر نہیں کیا بلکہ گردن اونچی کر کے اس کے

چہرے پر دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”آؤ۔ آؤ اور کون آیا ہے تمہارے ساتھ۔“

اور اس سوال پر تو زہرہ کے دل کے زخموں کے گویا سارے ٹانگے کھل گئے۔ وہ تڑپ کر باپ کے سینے سے جا

لگی۔ اور پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ جھکیوں اور سسکیوں کے ساتھ اشکوں کا سیل سا بہا ہوا ہوا بولی۔

”ایا میں میرے ساتھ میری سیاہ بچی سے سوا اور کون آ سکتا تھا۔ میں تو۔ میں تو! اشکوں کے ابلنے نے مزید اسے

کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رکھا۔

مظفر حسین کو اسے دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ دل میں کچھ کا ضرور ہے۔ اب جو اس کی بات سنی تو اپنے لرزے ہوئے

ہاتھ سے آہستہ سے اس کے سر کو تھپک کر بولے۔

”میرے کلمہ لوجی اور اندر اپنی ماں کے پاس چلو۔ میں ابھی تمہارا یہ سامان بھی اندر رکھوائے دیتا ہوں۔“

اپنی بات کہتے ہوئے ان کی آنکھوں کے گوشے نم سے ہو گئے تھے۔ زہرہ نے بھی خود کو بدقت تمام سنبھالا اور

اپنے آنسوؤں کو جھپتی ہوئی ان کے سینے سے الگ ہی ہوئی تھی کہ ایک ادھر مگر خاتون جو بعینہ زہرہ کا بڑا ہادھا دکھائی دے

رہی تھی۔ زہرہ بھی میں داخل ہوئی۔

”ارے جیتنے جیتنے حلق چل گیا۔“ مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اتنی رات گئے کون آیا ہے۔“ تب بھی مظفر حسین نے ان

کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود ہی قدم بڑھا کر ان کے نزدیک آگئیں اور ڈیڑھ سی میں جیتے ہلکی پاور کے بلب

کا روشنی میں زہرہ کی طرف فوراً دیکھا۔

”ارے یہ تو میری زہرہ ہے۔“ ہے نا منہ صاحب؟ اور جواب میں زہرہ ہلکتی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔

”اے ہے کیا ہمایری سچی تو کیوں رو رہی ہے اور اتنی رات گئے کیوں آئی۔ کون سا آہ ہے ہمارے ارے کھ تو تیا۔“
 بیٹی کو اس قدر حاکم اور غیر متوقع وہ بھی اتنے ناوقت دیکھ کر شوہر کی طرح کھٹک تو وہ بھی گئی تھی۔ جو ان کے شانے سے لگ کر وہ اس قدر بیک بیک کر رہی تھیں انہوں نے اندر ہی اندر دہلی کر ایک ساتھ ہی کی سزا کر ڈالے۔

”اے جی بھلا کون آتا ہے میرے ساتھ۔ زہرہ نے روتے روتے موٹی سی آوازیں کہا۔

”ہیں کیا مطلب۔ کیا تو کوئی اتنی دور دراز سفر کر کے آئی ہے بیٹی۔“

”ماں نے دل میں سرسراہٹے اندیشوں کے هجوم سے ابھر کر پوچھا۔

”اے جی سہاگ کا حق سہاگ کی سہاگ ہی تو گئی تھی۔ اور۔ اور اب طلاق کا داروغہ لگا کر اکیلی ہی۔“

شدت گریہ سے زہرہ کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی تھی سانس کی بات سن کر راجہ بیکھر کے دل کو کانپا ہوا دھچکا لگا۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا سجھا گیا۔ لاکھوں اکراںہوں نے ٹاسی کا سہارا لیتے ہوئے جہجہ کر کہا۔

”یہ تو کیا کہہ رہی ہے زہرہ؟ نہیں نہیں ایسا ممکن ہی نہیں بھلا ایسا اندھیر بھی کہیں ہو سکتا ہے۔“
 دو مگر زہرہ کے ساتھ یہ اندھیر ہو چکا ہے راجہ بیگم اور حقیقت۔ حقیقت ہی پر تھی ہے اسے بھلا یا تو نہیں

جاسکتا۔ تم اسے اندر کرے میں نے جا کر آرام سے بٹھا دو۔ پھر اطمینان سے باتیں بھی کر لینا۔“

مخفیہ حسین جن کے دل پر زہرہ کے منہ سے طلاق کا لفظ سن کر ایک قیامت سی گزر گئی تھی۔ بوری کی خفگی بھلا کے پیش نظر انہوں نے نہ دے نہ کیا سہاگ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ یوں بھی وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھیں زہرہ خود ہی ان کا دیکھ کر ڈر رہی تھی۔ وہ بہتے ہوئے آنکھوں کے ساتھ بولی۔

”ہاں اے اندر چلیے۔“

اور مہرمان بیٹی ایک دوسرے کا سہارا لیتی اس آخری کمرے میں آئیں جواب راجہ بیگم کے تعارف میں رہتا تھا۔

معنوں میں ان کا رہائشی گھر تھا۔

اس مختصر سے کمرے میں مقابل کی دیوار کے پاس ایک تخت بڑا تھا جس پر خوش رنگین جام بھی ہوئی تھی اور بائیں طرف دو نواری پلنگ۔ جن میں سے ایک پر ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکا بے مدھ پڑا سو رہا تھا۔ دوسرا پلنگ راجہ بیگم کا تھا۔

زہرہ نے ماں کے ساتھ اس کے پلنگ کے قریب آئے تھے سب سے پہلے سینے سے چٹائی ہوئی پونگنی کو پاتنی کی طرف رکھ کر اپنے ہاتھوں کا تھک کو اس کے بوجھ سے آزاد کیا۔ پھر ماں کو احتیاط سے پلنگ پر بٹھا کر خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

گو آنسوؤں کا ایک تناشا سا اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا لیکن گریہ میں وہ شدت نہیں رہی تھی البتہ جیسے نہ اندر گھر گھٹائیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد برسنے لگی ہیں بس کچھ ہی حال زہرہ کا مٹی تھا۔

راجہ بیگم نے پلنگ پر بیٹھنے کے بعد اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ انہیں دیکھ کر تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی پہنچی ہوئی ہوں ان کا چہرہ بھی دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ زہرہ کو معلوم تھا کہ اس لمحے وہ در در کو بے گناہ سے گزر رہی ہیں۔

”اے جی! وہ روتی ہوئی پھر ان سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگی چپکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہیں پھر بائیں بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پیرتے ہوئے کہا۔

”تیرے دل پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس کا مجھے بھی احساس ہے بیٹی۔ عورت بیوہ ہوتی ہے تو بوجھ بھاری اپنے زندگی کے سامنے اور مضبوط سہارے سے۔ بچہ جانے پر یہ سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ مٹتا ہی جاتا ہے کہ خدا کی شینت کچھ کر رہا ہے جانتا ہے مگر یہ موٹی طلاق اس کا داغ مٹانے نہیں مٹتا۔ بلکہ اُنٹا عورت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تو نے ایسی کیا خطا کی تھی جو اس نامراد شقی نے تجھے طلاق دے دی۔“

”جرم تو وہی تھا جی کہ میں پہلوئی کی زینہ اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن انہوں نے خود اپنی غم سے

مجھے حلقہ نہیں دی بلکہ اپنی ماں کے بہت عبور کرنے پر ہی دی ہے۔“
 بچے حلقہ میں ڈوبی ڈوبی آواز میں بتایا اور پھر دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو لہجے لگی۔ اپنی پریشانی میں زہرہ نے آنکھوں میں ہنسی نہیں اتارا تھا۔

اس نے اب تک ہر قسم سے نہیں جاننے کے بہت مجبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔

”اے جی! وہ روتی ہوئی پھر ان سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگی چپکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہیں پھر بائیں بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پیرتے ہوئے کہا۔

”تیرے دل پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس کا مجھے بھی احساس ہے بیٹی۔ عورت بیوہ ہوتی ہے تو بوجھ بھاری اپنے زندگی کے سامنے اور مضبوط سہارے سے۔ بچہ جانے پر یہ سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ مٹتا ہی جاتا ہے کہ خدا کی شینت کچھ کر رہا ہے جانتا ہے مگر یہ موٹی طلاق اس کا داغ مٹانے نہیں مٹتا۔ بلکہ اُنٹا عورت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تو نے ایسی کیا خطا کی تھی جو اس نامراد شقی نے تجھے طلاق دے دی۔“

”جرم تو وہی تھا جی کہ میں پہلوئی کی زینہ اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن انہوں نے خود اپنی غم سے

مجھے حلقہ نہیں دی بلکہ اپنی ماں کے بہت عبور کرنے پر ہی دی ہے۔“
 بچے حلقہ میں ڈوبی ڈوبی آواز میں بتایا اور پھر دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو لہجے لگی۔ اپنی پریشانی میں زہرہ نے آنکھوں میں ہنسی نہیں اتارا تھا۔

اس نے اب تک ہر قسم سے نہیں جاننے کے بہت مجبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔

”اے جی! وہ روتی ہوئی پھر ان سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگی چپکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہیں پھر بائیں بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پیرتے ہوئے کہا۔

”تیرے دل پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس کا مجھے بھی احساس ہے بیٹی۔ عورت بیوہ ہوتی ہے تو بوجھ بھاری اپنے زندگی کے سامنے اور مضبوط سہارے سے۔ بچہ جانے پر یہ سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ مٹتا ہی جاتا ہے کہ خدا کی شینت کچھ کر رہا ہے جانتا ہے مگر یہ موٹی طلاق اس کا داغ مٹانے نہیں مٹتا۔ بلکہ اُنٹا عورت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تو نے ایسی کیا خطا کی تھی جو اس نامراد شقی نے تجھے طلاق دے دی۔“

”جرم تو وہی تھا جی کہ میں پہلوئی کی زینہ اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن انہوں نے خود اپنی غم سے

مجھے حلقہ نہیں دی بلکہ اپنی ماں کے بہت عبور کرنے پر ہی دی ہے۔“
 بچے حلقہ میں ڈوبی ڈوبی آواز میں بتایا اور پھر دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو لہجے لگی۔ اپنی پریشانی میں زہرہ نے آنکھوں میں ہنسی نہیں اتارا تھا۔

اس نے اب تک ہر قسم سے نہیں جاننے کے بہت مجبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔

”اے جی! وہ روتی ہوئی پھر ان سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگی چپکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہیں پھر بائیں بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پیرتے ہوئے کہا۔

”تیرے دل پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس کا مجھے بھی احساس ہے بیٹی۔ عورت بیوہ ہوتی ہے تو بوجھ بھاری اپنے زندگی کے سامنے اور مضبوط سہارے سے۔ بچہ جانے پر یہ سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ مٹتا ہی جاتا ہے کہ خدا کی شینت کچھ کر رہا ہے جانتا ہے مگر یہ موٹی طلاق اس کا داغ مٹانے نہیں مٹتا۔ بلکہ اُنٹا عورت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تو نے ایسی کیا خطا کی تھی جو اس نامراد شقی نے تجھے طلاق دے دی۔“

”جرم تو وہی تھا جی کہ میں پہلوئی کی زینہ اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن انہوں نے خود اپنی غم سے

مجھے حلقہ نہیں دی بلکہ اپنی ماں کے بہت عبور کرنے پر ہی دی ہے۔“
 بچے حلقہ میں ڈوبی ڈوبی آواز میں بتایا اور پھر دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو لہجے لگی۔ اپنی پریشانی میں زہرہ نے آنکھوں میں ہنسی نہیں اتارا تھا۔

اس نے اب تک ہر قسم سے نہیں جاننے کے بہت مجبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔ اور اسے سب کچھ کی باتیں ہیں کہ ماں کے بہت عبور کرنے پر اس نے تجھے طلاق دی ہے اسے کوئی اور دل پر چڑھ گئی۔

”اے جی! وہ روتی ہوئی پھر ان سے لپٹ گئی۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگی چپکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہیں پھر بائیں بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پیرتے ہوئے کہا۔

”تیرے دل پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اس کا مجھے بھی احساس ہے بیٹی۔ عورت بیوہ ہوتی ہے تو بوجھ بھاری اپنے زندگی کے سامنے اور مضبوط سہارے سے۔ بچہ جانے پر یہ سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ مٹتا ہی جاتا ہے کہ خدا کی شینت کچھ کر رہا ہے جانتا ہے مگر یہ موٹی طلاق اس کا داغ مٹانے نہیں مٹتا۔ بلکہ اُنٹا عورت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تو نے ایسی کیا خطا کی تھی جو اس نامراد شقی نے تجھے طلاق دے دی۔“

”جرم تو وہی تھا جی کہ میں پہلوئی کی زینہ اولاد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن انہوں نے خود اپنی غم سے

راہِ یحکم ملامت میرے انداز میں کہتی ہوئی جلدی سے اسے اپنی طرف کھسکیں۔ اود پوٹلی کی بندش سے جلدی کو آزاد کرا کے بے تانہ اسے اٹھا کر پہلے اسے سینے سے چھٹا پھر کمرے میں جھپٹے لب کی دھم دھم دھن اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن جی نے تو کچھ ایسا بلبلا کر دنا شروع کیا کہ نانا بھی بیساکھی ایسا کھنکھن و ہیں پینگ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”ارے نہیں۔ آپ سے بھلا یہ چُپکی ہوگی۔“

رابعہ بیگم نے اسے چمکارتے ہوئے کہا پھر اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر ہلکورے دینے لگیں۔ مگر ہیرو طرح خاموش ہی نہیں ہوئی اصل میں وہ بڑی دیر سے بھوکی تھی جب تک ماں کی گود کی گرمی اسے طمطمی رہی وہ بے سرح بڑی سوئی رہی اور اب ماں نے بائیں ڈال دیا تھا تو سوتے سوتے اچانک ہی وہ جاگ اٹھی تھی اپنے چپ کرانے کی کوشش کئے باوجود روئے ہی جا رہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے یہ بہت بھوکی ہے ورنہ میری گود میں آکر تو روتا بلکتا۔ کچھ بھی بہل جاتا ہے رابعہ بیگم نے زہرہ سے کہا۔“

”جی ہاں اس کی شیشی میں وہی بھول آئی ہوں۔“ زہرہ بیزاری سے بولی۔

”ہا میں تو کیا کم اسے اپنا دودھ نہیں پلا میں؟“ اور حجاب میں باپ کی موجودگی کی وجہ سے ذہرہ شرم میں
نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اور پھر اس نے حضورؐ کو سامنے کر کے کھڑا کیا۔ اور وہ اس کی چوٹی پر بیٹھ گیا۔
رکھی تھی۔ بچی کے منہ میں لگادی۔ جیسے منہ میں لیتے ہیں بچی حضورؐ کی ذریعہ فیصلہ ہو گئی۔
”اے چھٹی سے کیونکر پیٹ بھرے گا اس کا تم اپنا دودھ کیوں نہیں پلا میں اسے؟“ رابعہ بیگم نے نہ جانے کس
میں کہا۔

”ہوتا ہی نہیں تو پلاؤں کیسے۔ کم ہی اترتا ہے۔“ باپ کی وحید سے زہرہ نے ماں کی طرف تھوڑا سا اشارہ کر کے کہا۔

”اے کیسی ماں ہے تو بچی۔ لو بھلا تو پرسوں صبح کو دہاں سے روانہ ہوئی ہوگی اور آج رات کو کہاں شیشی وہیں بھول آئی تو اس خفیہ سی جان کو تو بالکل ناقتے سے ہی مار دیا ہوگا تو نے“ راجہ بیگم کو روہ کر کے لاپرواہی پر غصہ آ رہا تھا۔

”جبھی کو بے چاری اتنی دہلی اور کمرور ہے۔ بھلا غضب خدا کا چھ وقت ہو گئے اسے درد ہوئے بیسے ہے یہ ۶ اہوں نے اس کا فعیقنا کرتے کرتے ایک دم ہی پوچھا۔

درتین ہینے دس دن کی زہرہ نے بڑی میزاری سے بتایا۔
 "مگر یہ تو مشکل سے دو مہینے کی بھی نہیں لگ رہی۔ ذرا تھک رہی ہو گی۔" دس دس ہر روز

نئے آخری فقرہ شہر کو مخاطب کر کے کہا جو سچی گو گو د میں لینے کے لیے بے تاب سے مور ہے تھے۔

”بڑی کا نام کو لودھڑاں ہے اس کا کیا نام رکھا۔ تم نے بڑا البعہ بلیم بچی کو دیکھ کر گویا برغم بھلا بھلا انہوں نے آہستہ آہستہ اسے تھپکتے ہوئے لچھا۔“

”بدبختی“ زہرہ جلے کئے انداز میں بولی۔

نام تو بھی ملک رکھائی نہیں گیا اس کا۔ مگر میں اس بدبختی سے کہنی مول اٹھی کیونکہ اس کی وجہ سے مرگھڑ میرا بڑا

پچھو جسے جھین گیا ہے۔ اسی لڑکیاں جب اتنی بدتمت اور منحوس ہوئی ہتی تو پھر خدا انہیں پیدا بھی کیوں کرتا ہے؟
کے لوگ اچھا ہی کرتے تھے تو بھی ان کے سدا ہوتے ہی زمین میں ڈوب کر، اگر

نمبر و پر پھر ریت طاری ہو گئی۔ آپ انجیل پڑھنے کے خیالات اس نے تو جابلوں کو بھی مات کر دیا۔ اسے پہنچے میں بھی تو کسی کی بیٹی ہی
 ۱۸۔ اس میں سن رہے ہیں آپ انجیل پڑھنے کے خیالات اس نے تو جابلوں کو بھی مات کر دیا۔ اسے پہنچے میں بھی تو کسی کی بیٹی ہی
 جو دنیا میں اکھڑ کر رہا ہے۔ رات بھر کھڑی رہی اس کی بیٹی کی باتوں پر کڑھ کر کہیں۔

[illegible]

یہ کہ ان نعت کے بیٹے جو اس معصوم کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ ہو۔ ورنہ بیٹیاں تو خدا کی امانت ہوتی ہیں۔ اس کے بندے کے پاس اور ہمارے لیے تو آج کی شب بڑی مبارک ثابت ہوئی ہے کہ ہمارے گھر کے شوئے انگن میں ستروں بعد خداوند تعالیٰ نے اپنے نابغ ایک پھول کھلایا ہے۔ بالائی بجھے پھول ہی کو سمجھتے ہیں۔ پیارے پیارے نازک اور چمکے اور کٹی سے پاک۔ سینے نصف ترستے سے اور بڑی کا نام تو فرح جہاں رکھا لیتا تھا۔ ہمچی اس بیٹی کا نام شمس النساء رکھ دے۔ آج سے شمس النساء ہے بیٹی۔“

نہایت ناسی برائی تمام تر شفقت بچھا د کرتے ہوئے کہا۔ مگر وہ بچی کو دھنگ سے نہ سمجھا سکے۔ وہ ان کی گودی

”ہاں، ان کے سر تو زخموں سے بھی گھرا ہوا ہے۔ اور آج اس ننھی سی جان کے ذرا سے چھینے چلنے

”مگر سچی کا آواز بھی نہ ٹھہرے۔ یوں زما بھگا کر جانی ہے جیسے غبارہ بھٹ گیا ہے۔ اتنی کمزور ہے سکر آواز

میں نے اس کا کہنا ہے اتنی طاقت آجاتی ہے۔

یوں کہ وہ بمشکل چھ برس کا تھا جب زہرہ کی شادی ہوئی تھی۔ اور اس وقت وہ اسے کچھ ایسے بھی غور اور تعجب سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا لگ رہا تھا۔ بیکہ اس کی آنکھوں میں تو وہ اب تک چھ برس کا ہی لگتا تھا۔ اور پھر چھوٹے

سب کو اتنے دیر بعد کھجاتا آتے ہی تو اپنی پریشانی میں اسے اس کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ سکراب وہ مکملی باندھے اسی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”یہ سنا پتہ ہے اسی؟“ عید نے اب پوری طرح بدلا ہو کر پوچھا۔
 ”نہی تو تھو تو جانیں یوں تو بڑے عقلمند بننے کی کوشش کرتے ہو۔“ ماں نے منہ کر کہا۔

مگر بعد کے جیسے قسمی نہیں۔ زہرہ پر نظر پڑنے سے ہی وہ استعجاب اور اچانک مل جانے والی خوشی کہ ملی جیسی کیفیت میں
پیارے عینک کے انکھڑا ہوا۔

پاپ اور اس وقت کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا اس کی بائیک میں آواز مٹی اب بھاری اور مردانہ سی سولہ تھی پھر وہ کہے کہ خواب دیکھنے سے پہلے ہی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ زہر وے اس کے سر پر ہاتھ پھر کر حرف مانتا اللہ کہا۔

”اب کب انہیں آپ کو کوئی اطلاع بھی نہیں دی آپ نے۔ اور وہ جہاں کہاں ہے، تمہیں نے یہ بھی
 جانی سے ملاقات، وہ بھی اس کمزیر کے عالم میں، اس خیال سے نہرو کو دل بھجوا دیا۔“

”مذہبِ حبیب ہے باپ اور وادی کے پاس۔ اس وقت تو یہی آئی ہے۔ یہ تمہاری نھنھی سی مہمان۔“

وادی کی کیا بات ہوئی آپا میں نے تو اسے اپنے بچک دیکھا ہی نہیں۔ اسے تو آپ کو ضرور ساتھ لانا چاہیے تھا۔ عبدالکلام امین بھی

"اب ایک ہی کو سافنا نا دو بھر سو رہا تھا۔ دودھ کو کیسے لاتی۔ شیر لو ماموں جان تم اپنی اسی جاتی سے اپنا دل بہو زہرہ نے جواب سے بچنے کے لیے بھی کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا مگر بھی بھڑکے بیچ کر رونے لگی۔

"اب کہاں تک بھوکا مارو گی اس غریب کو۔" عقروڑا سا دودھ کی پلاوہ۔

رابعہ بچہ نے زہرہ سے کہا تو منظر حسین جو بیسا کھی سے ہمارے اس آئینہ میں اٹھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ سید کو کتنا افسوس ہوا۔

"بیٹے تم میری اتنی تو قہر دیکھ کر سب کچھ بھول گئی ہو۔ ذرا تم کی نعمت غافل نہ کرو کچھ لو کھا لے۔ پینک کوئی پتھر بھی گونہ

"اے ہاں۔ یہاں تو یہ مواظفہ ہی اتنا خراب ہے کہ ذرا دیر میں بات بھول جاتی ہوں۔ معتبر وہیں اچھی اٹھ کر دیکھیں۔

رابعہ بچہ نے پشانی پر ہاتھ دارتے ہوئے کہا۔

"نہیں اکی! آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔" عبید لولا۔

"نہیں بھئی! مجھے اسی وقت بالکل اشتباہ نہیں۔ میں نے یہاں بھی خوب پیرٹ بھر کھا لیا تھا۔"

علم اور پریشانی میں زہرہ سے بھلا کچھ کیا یا جاتا، اس لیے اسے غلط جانی سے کام لینا پڑا۔ اس کے انکار پر بھیدنے

مستفسر اسے نغلوں سے مال کی طرف دیکھا تو باپ لول اٹھے۔

"مگر فکرو اسامہ دودھ ضرور پی لیا کہ اس موصوم کا کسی طرح پیرٹ تو بھرے۔"

باپ سے شرمایا تو انہوں نے دھکے دھکے انداز میں کہہ دیا۔ زہرہ نے شرم سے سر جھکا لیا۔

بچہ عبید نے کھینچنے میں اس کے لیے دودھ لگا لگا منظر حسین کے پاس ایک بھری چولہا تھا جو اپنے دور ملازم

کے درمیان انہوں نے ایک انگریز شکاری سے خریدا تھا اور چونکہ رات کے وقت رابعہ بچہ کیل کو کھڑا دودھ پلانے کے قہر

نہ تھیں اس لیے عبید نے ان کے مختصر سے چلنے کو جلا کر اس پر دودھ گرم کیا اور ایک نفیس کلاس میں ڈال کر بہن کو پیش کر دیا۔

"اچھا! تم اپنے آبا میاں کے کمرے میں جا کر سو جاؤ بیٹے۔ یہ زہرہ تمہارے پتنگ پر سو جائے گی۔" ماما نے اس سے کہا تو زہرہ نے

منع کرنے کے باوجود وہ باپ کے پاس دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

تب بھی کو پیرٹ بھر کر دودھ پلانے کے بعد زہرہ اٹھی اور اپنا ہرقہ تہہ کر کے کونے میں رکھ کر جوت کے بڑے سے عڑ

پر کھڑکھیر کے پتنگ پالشی اور بڑی درمیک جوت کو کھینچے رہنے کے بعد اس نے دھبی سی آواز میں ماں سے کہا۔

"اکی! کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا شک نہ نہیں۔ جہاں میں ایسی ماکر چھپوں کہ کسی کو نظر ہی نہ آؤں؟" اس کا بچہ کچھ ایسا راز

ساختھا۔ ماں کے دل پر ایک چوڑ سی پٹری۔ وہ ایک آہ سی بھر کر بھی کو اعتباط سے اس کے پاس ٹٹتی ہوئی لپٹیں۔

"ہاں بیٹی! جب سے تم اکی ہو۔ میں بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اب دنیا والوں کی نگاہوں سے کیسے بچوں گی۔

ان کی زبانیں بند کر دیں گی۔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ میری بے گناہ بچی پر یہ ستم جھپٹوں کے فرق کی وجہ سے توڑا لیا

تو کون میری مائے گام بیکہ سننے والے دوکر نہیں گئے اور ہنس کر لڑائیں گے کہ دنیا والوں کا یہ بھی ایک خاصہ ہی ہے۔"

"کیا کروں اکی بہت مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں ورنہ میں نے تو بہت چاہا۔ دعا بھی کی اور کوشش بھی کہ کسی طرح بچے ہوں

ہی آجائے مگر۔"

"اے نوج۔ موت تیرے دشمنوں کو آئے بیٹی۔ اور موت اور زندگی تو خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔ بندہ خواہ کچھ چاہے۔

مرغی سے ہی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔ بھیکر نے ایسی احمقانہ بات کیوں سوچی؟" رابعہ بچہ اس کی بات کا ٹکڑا لپٹیں۔

"تو میری کافرئی کرتی کیا جانتیں نہیں آپ کہ مجھے معاشرے میں ایک مظہر کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ اکی کو کسے پتہ چاہیے کہ میں

کو خوش جاسکتا ہے کہ ان کا پیشہ وہی ہوتا ہے۔ مگر مظہر۔ اسے تو آوارہ بدچین اور بیسوا قرار دے کر معاشرے کے سامنے

حیثیت دے دی جاتی ہے! انا کہہ کر زہرہ آواز گھونٹ کر رونے لگی۔

میں کسی سخت جان ہوں کہ جانتے جانتے پھر اس کو بھری دنیا میں لوٹا۔ علامہ تین روز تک میں موت وزلیست کی کشمکش میں

میں کسی سخت جان ہوں کہ جانتے جانتے پھر اس کو بھری دنیا میں لوٹا۔ علامہ تین روز تک میں موت وزلیست کی کشمکش میں

بتا رہی تھی پھر بھی ہے۔ کسے خدا کے اہد اب جو سنا تھا وہ تو جو ہی چکا، تم خود کو ان نکلوں میں نہیں گھلاؤ۔ وہ جو کہنے میں ناکہ حب کو

اسے ہی سن رہے تھے کیا ڈرنا۔ تو یہی بات تو بڑی ہی گئی ہے۔ اب رو رو کر خود کو مکان کرنے سے غاموہ۔ قسمت کا کھانا سمجھ کر اے قبول

میں رو با تو دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ تو یہی بات تو بڑی ہی گئی ہے۔ اب رو رو کر خود کو مکان کرنے سے غاموہ۔ قسمت کا کھانا سمجھ کر اے قبول

سرور۔ ماں نے بھجایا۔

مگر اکی تو جہاں بھی تھیں وہیں تھیں۔ دوسری کے باحقوں اس کی جتنی بے قدری ہوئی ہے وہ میری دل جانتا ہے۔ اس

مگر اکی تو جہاں بھی تھیں وہیں تھیں۔ دوسری کے باحقوں اس کی جتنی بے قدری ہوئی ہے وہ میری دل جانتا ہے۔ اس

کے باپ کو اسے میرے ساتھ بھیجے پر راضی نہ تھے۔ لیکن ان کی ماں نے کسی طرح اجازت پائی تھی کہ ایک لڑکے کو اس جیتی ہوئی کھجور سے چھین لینا

کے باپ کو اسے میرے ساتھ بھیجے پر راضی نہ تھے۔ لیکن ان کی ماں نے کسی طرح اجازت پائی تھی کہ ایک لڑکے کو اس جیتی ہوئی کھجور سے چھین لینا

جانتی تھی۔

بات کہنے کہنے پر کو کھنت خاموش ہو گئی۔ یہاں بھی خاموش لپٹی مل جاتی تھی اس کی حالت پر کڑھتی رہیں۔ یوں بھی دل تو

اپنی۔ بات کہنے کہنے پر کو کھنت خاموش ہو گئی۔ یہاں بھی خاموش لپٹی مل جاتی تھی اس کی حالت پر کڑھتی رہیں۔ یوں بھی دل تو

بچی کے لیے پرخوں پر ہوا تھا بکھتر بھی کیا۔ کچھ دیر بعد زہرہ خود ہی لولی۔

"اکی! میں اب آپ کو بتاؤں کہ بھیر پکڑا بیٹی ہے۔ پورے دو ماہ رشتہ کے بھلنے کے گھر میں چوروں کی طرح چھپی رہی ہوں کہ

انہاں مان تو اسے بھی جسے چھین لینے کے لیے پوری تھی۔ کہتی تھیں کہ یہ بیٹیاں ہمارے گھر کی عزت میں یہ تمہیں مفلک الحال لوگوں

کے ہاں نہیں جا سکتیں۔ اور اکی انہوں نے اپنے بیٹے سے زبردستی یہ قسم کھوائی تھی کہ اگر دوسری بار بھی میرے یہاں بیٹا نہ ہوا تو وہ مجھے

ملاؤ دے دیں گے۔ ورنہ یقین کریں اکی وہ مجھے ملاؤ دینے کے بالکل حق میں نہ تھے۔"

زہرہ کی آواز پھر بھسنے لگی۔ تو وہ خاموش ہو گئی۔

"ہاں بیٹی۔ قسمت کا کارڈ ملا ہے ساری۔ مگر اب تم سو جاؤ۔ اتنے دن کی تھکی ہوئی ہو۔ یہ رنج اور ملال تو اب زندگی بھر ہی جان سے

چٹا ہے گا۔"

رابعہ بچہ نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور پھر اٹھ کر کھڑی بھلائی اور خود بھی اپنے پتنگ پر آکر لیٹ گئیں پچی تو خود ہی دیر بھر

بھلا کر اور اپنی کھجور اٹھوں کو اچھڑا کر کھڑک کھڑک کی سوئی تھی۔ کہ دیے بھی پچی منہ میں جلتے ہی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شکر لڑو

کوئی کئی پورے عرصہ کو سخت تھکان کے باوجود اپنی پریشانی میں درمیک بندھ بیٹھ آئی۔

"وہ عجائبات اور ایک حساس سے دل کی مالک بڑی سادہ لوح اور گڑبگڑی تھی۔ یکے میں اگرچہ ستر برس گزرے تھے تو پوری

آسودگی کے ساتھ تو زمین گزرا ہے تھے۔ باپ بھگت کے ٹھکے میں پورٹ کا روٹی جینیت سے ملازم تھے۔ سستے زمانے تھے اس

لے آلم سے باؤں پھلا کر گزرتا رہا جو جاتی تھی۔ البتہ خوبصورتی اس کے والدین کو ان کے خاندان کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ اور سب

سے بڑھ کر شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ سبھی نہ نہیں مگر مظہر حسین اور رابعہ بچہ میں دور کی رشتے داری تھی۔

رابعہ بچہ رشتے میں مظہر حسین کی چچا زاد جوڑی تھیں۔ قسمت سے رابعہ بچہ کے والدین بھی اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جبکہ

مظہر حسین کے بعض رشتے دار خاصے مقول اور آسودہ حال تھے۔ اور اتفاق سے مقصود الحسن کی سگی بھانجی مظہر حسین کے ایک بھانجی

سے بای ہوئی تھیں۔ یوں تو پریس میں رہنے کی وجہ سے رابعہ بچہ اور مظہر حسین کی عزیز و دور رشتے داروں سے کم ہی میل ملاقات

ہوتی تھی۔

مگر معلوم کیسے اور کیوں کہ شوکت جہاں کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ مظہر حسین کی اگلی بیٹی عدو ہے۔ حسین وہیل ہے۔

وہ تو پہلے ہی کی بڑی سے ایک خوبصورت اور ایسی بہو کی تلاش میں تھیں جو لے زبان اور دل دانی ہوئے کے ساتھ ساتھ ان کے

خو کی ملازمتی ثابت ہو۔ اور ایسی صفات رکھنے والی کہ انہیں اپنے خاندانوں میں نہیں مل سکتی تھی۔ گو یہ بات نہیں تھی کہ اس زمانے کے

اپنے خاندانوں کی لڑکیاں اپنی ساسوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ بلکہ وہ تو ساسوں کے ہاتھوں غلام بھی آٹھ لڑکیاں تھیں مگر اس

مرمت میں جھگڑے ٹپٹے بہت ہوتے تھے۔ اور نوبت ملازم لقا پر پہنچ جاتی تھی۔ اور ملازم شوکت جہاں کے نزدیک اتنی

بیموہبت تھی کہ وہ اس جھگڑا پانا نہیں جانتی تھیں۔ دوریاں موزور حاصل تھیں مگر اس میں تعلقات برقرار تھے۔

شوکت جہاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ زندگی بچی ایسے گھرانے میں بیاہی گئی ہے۔ جو کھانا پیتا موزور ہے لیکن اوسط طبقے سے تعلق

رکھا ہے اور ایسے گھرانے کی کووری طرح نکس میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس پر بیٹے کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس کی بوری بہت

خوبصورت ہو۔ شوکت جہاں جیسی شاعرانہ ذہن رکھنے والی خاتون نے مظہر حسین کے گھرانے کوئی ناکا۔ یوں بھی اس چھان بین میں

مال جواب میں خاموش رہیں کہ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے۔

"اکی! ان کے خزانے میں کی کی بڑ جاتی جا گروہ مجھے ایک بیٹے سے ہی نواز دیتا مگر اس نے تو مجھے تباہ ویرا کرنے کو دیکھا

دی جبکہ ڈاکرئی نے تو قمر جہاں کی پیدائش پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آئندہ میرے یہاں زندگی ہوئی تو میری جان سے کڑی چٹے گئے

بیسے کی عمر تھی آگے نکل گئی تھی۔ لہذا انہوں نے بلاناشریہ کا پیغام زہرہ پر سے طلالہ مظفر حسین گرا بنے سے بڑی مشیت سے
میں بیٹی دینے سے حق میں بالکل نہ تھے۔

لیکن وہی کمزوریاں اور مجبوریاں جو خصوصاً اوسط طبقے کے لوگوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں گونا گونا
گوں سال قبل ہی ایک پہاڑی زخمی ریکیچہ کی انتہائی کاروائی کے نتیجے میں وہ اپنا دایاں پاؤں گنا بیٹھے تھے۔ وہ لوگوں کے
اور شہر میں جتنی جگہ تھے وہ نہ پوری ٹانگ میں ہی زہر پھیل گیا تھا۔ لہذا نوکری سے بھی رٹا کر شہر میں آ گیا۔ وہ لوگوں کے
ذاتی مسائل کی ملکیت تھی جسے طرانت کے دور میں دوسرے شہر میں رہنے کی وجہ سے انہوں نے کر لے کر لے چلا۔ کچھ عرصے
ہو جانے کے بعد اس میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے انہوں نے خالی کر لیا تھا۔ اور پیش کے سوا اور کوئی ذریعہ آمدنی ہی نہ
جیکر نہ رہی تھی۔ شادی پر انہیں خاصا معقول سرمایہ درکار تھا۔ جو شاید وہ پوری زندگی بھی فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ یوں بھی زیادہ کامیابی
میں واضح نہ تھا۔ اور شہر میں جہاں کچھ ایسی چیزیں تھیں جہاں ان کے کچھ ٹریڈ بزنس کی اپنی مجبوریاں کے پیش نظر انہیں بالآخر مضامین
پڑا تھا۔ اور جس کا نتیجہ ابھی برسرِ بعد بیٹی کی طلاق کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ جبکہ وہ تو بہت پہلے سے ایسی ہی کسی صورت
صورت حال کا سامنا کرنے کے متوقع تھے۔

بہر حال۔ زہرہ چھوٹی بیٹی کے ساتھ بیگم کی بھتیجی تھی۔ کافی دن تو اپنے اس دردناک انجام کا سوگ منائی رہی مگر گزرا
ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے درد میں کمی آتی آتی۔ اور وہ بھی گھر کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔ مگر اگرچہ کچھ بڑے
علم سے اور سب سے زیادہ جگہ ہنسائی اور انکشت غنائی نے بتائے کی طرح بٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ بہتر سے کالو
ایک طرف مظفر حسین ہی تھے جو ذرا بھلے چنگے نظر آتے تھے۔ یا پھر عبدالغفار جو شمس النساء کے بیٹے تھے۔ اور سب سے کالو
علم بھی تھے اسے اپنی بیٹی ہی کہتا تھا۔ اور شاید یہ عبدالغفار کی توجہ اور محبت تھی جو شمس النساء جیسے تنکے میں بھی جان پڑ گئی
اور وہ تو نانی کا بھی آنکھ کا تارا تھی ہوائے نہرو جو معصوم سی جان سے ہمیشہ نفرت اور اکٹا ہٹ کی کا اظہار کرتی تھی۔ اور
اس بات پر اسے ٹوکتیں۔ باپ بھی آہستہ سے سمجھاتے اور بھائی تو باقاعدہ احتجاج کرتا لیکن زہرہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے
کان سے اڑا دیتی۔ اصل میں تو وہ شمس النساء کو بھی اپنی بربادی کا تمام تر زور و تار سمجھتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر شمس النساء کو
باپ پر کڑی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہی اسے اپنا سونہریا یاد آتا۔ وہ شوہر جو اس کی بیٹی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کی جہیز
آج بھی پور تھی۔ یہ تعلق قطع ہوجانے کے باوجود اب بھی اسے ایک دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔ وہ آج بھی اس کا مجازی نانا تھا۔
یا پھر وہ اسے ایسا ہی سمجھتی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس سے اس کا سرشتہ قطع ہو چکا ہے۔
وہ ہمہ وقت کھم کھم اور کھوٹی کھوٹی سی اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔
اس کے ساتھ نہائے ہوئے حسین اور خوبصورت جذلوں سے پُر رنگین دنوں کو یاد کرتی رہتی۔
کبھی مٹکراتی۔ کبھی روتی اور کبھی اپنی بے بسی پر نہایتی۔
اور ایسے ہی اگر بیٹی سامنے آجاتی تو وہ اسے دھتک کر رکھ دیتی۔
نانی جیانی اور نانا معذور۔

اس لیے عید ہی بچی کی جہیز گری رکھتا تھا۔
وہ بہت دہن اور بزرگوار کا تھا۔
ان دنوں انھیں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔
وہ اپنی جماعت میں اول یا دوم ہی آتا تھا۔

باپ کے معذور ہوجانے کی وجہ سے بچپن ہی سے اس نے اپنی بابت سے زیادہ ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔
اور زہرہ کے ایسے سے زہرہ کے بعد سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا تھا۔

جب بھی بہن کو زردہ اور دل شکستہ سا دیکھتا تھا کہ بہن آپ پر توڑے گئے اس ظلم کا معذرا دینے سے بدلتی
لوں گا۔

بہن کہتی رہتی تو ابھی بہت جھوٹے ہو اور پھر بدلے نہ کر دو گئے بھی کیا۔ کوئی کچھ میرے وہ خوبصورت دن تو نہیں دلیں

وہ کبھی نہیں ان کے ساتھ گزرے ہیں۔ تم تو میرا بس اپنی بڑھائی کلاہف توجہ دو اور کچھ سن کر دکھاؤ کہ میرے بچے
کے علم کی ترقی کے ذریعے ہی زندگی بچنے میں وہ نہ سارے زمانے کی محنتیں دل میں لیے قبر میں اتر جاتے ہیں۔
اور جواب میں وہ بہت چڑچوڑ ہو کر کہتا۔
میں تعلیم میں صرف کر دوں گا اور دولت بھی آپ دیکھیں گا یا! انشاء اللہ ایک دن میں ترقی کرنے کرتے فلک کی بندلوں تک
پہنچاؤں گا۔ مگر معذرا! میں تعلق دار کی اولاد کو کچھ نہ بخشوں گا۔
پتا چلے گا کہ اصل اولاد تو یہ جہیزوں تمہاری بھانجیاں ہی ہیں کیونکہ ان سے انتقام لوگے۔ عجب ایسے غلط خیالات کو دل
وہ نہ لے کر دل دو اور دنیا میں آئے ہو تو اچھے اور نیک کام کرو تا کہ آئندہ ان کا نام روشن کر سکو۔

زہرہ جواب میں سمجھتی تو وہ خاموش ہوجاتا۔ یوں بھی ان دنوں وہ محض ایک بچہ ہی تھا اس لیے اس کی سوچ بھی فحشاء تھی
کہ زہرہ کو بھی خیال تھا۔
وقت نے اپنی دکان میں کچھ اتنی دھبلی چھوڑی تھیں کہ سسک سسک تڑپ تڑپ اور حالات کی بعض میں تپ تپ
کرمی دقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہو کہ کتنا آگے بڑھ چکا ہے۔ اور اس گزرنے ہوئے وقت میں اس چھوٹے سے کہنے
نے کیا۔ کچھ بڑے کہیں کچھ پائے کا احتمال کم از کم نہ ہو کہ لیے تو باقی ہی نہ رہا تھا۔ اس مصیبت کی ماری نے کھوئے کے معاملے
میں سب سے پہلے تو اپنے شوہر سے ابتدا کی تھی۔ پھر چند سال بعد ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیں اور ان کے چار سال بعد باپ کی معذرت
پر زہرہ کو رحم آگیا اور انہیں بھی دیوٹی جھیلوں سے آزاد کروا گیا۔ اب لے دے کے عید ہی رہ گیا تھا۔
بائیں ٹیس سالہ کرلی جوان بھائی۔

اس کا وہ دھارہ۔
شخص انسان بھی وقت کی حدیں پھیلا کر گزرنے کی چوٹی تھی۔ اور ایک اسکول میں پڑھ رہی تھی۔
اصل میں والدین کے انتقال کے بعد عید نے اپنا آبائی مکان بیچ دیا تھا اور فری شہر کے ایک کرائے کے مکان میں بہن
جانی کے ساتھ آگیا تھا کیونکہ اس نے شہر کے دھڑکاچ میں داخلہ کر لیا تھا۔ اور بہن اور بھائی کا پیٹ پالنے کے لیے اپنے
ایک مشفق استاد کی وسالت سے وہ دو مہینے ٹیوشن بھی پڑھا تا تھا کہ اس زمانے میں تعلیم کا خاصا چار ہو گیا تھا اور بہت
سے پرائمری اور مڈل اسکول بھی کھل گئے تھے۔ زمانہ بھی خاصا ترقی کر گیا تھا اس لیے شہر میں سکونت اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔
پھر وقت گزر چکا آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ عید نے فرسٹ ڈویژن میں گزیر جوش کھینچ لیا۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی
وادی میں جماعت مسلم لیگ کی تحریک شروع ہو گئی۔ اور پاکستان حاصل کرنے کا مطالبہ زورور پڑھا۔ اور ہندو سیاسی پارٹی
کا ٹکس اور پرنسپل سامراجی حق کی آواز کو ہمیشہ کے لیے دبانے کے دوپے ہو رہے تھے اور تیج میں ہندوستان میں جہاں سو
ہندو مسلمانوں کے خون سے سولی کھیل جا رہی تھی۔ پھر جوہی پاکستان کو مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ کشمیر کے پشتے ہی لگ گئے۔
سلاوت کی آگ اس علاقے کے آس پاس بھی لگنی شروع ہو گئی تھی۔ جہاں عید اپنی بہن اور بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔
وہ بھی پاکستان کا دل سے حامی تھا۔ ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے باغیوں نے لگائے مسلمانوں کو گھر میں کی طرح
کھینچے دیکھا تو اس نے بھی پاکستان ہجرت کر جانے کی ٹھان لی۔ اور نہایت خاموشی اور رازداری سے پاکستان جانے کی تیاریاں کر لے
لی۔

اصل میں اس دنوں مہاجرین کے لیے جو اپیش ٹرینیں چلی تھیں۔ ان سے زیادہ تر تباہ گزین ہی سفر کرتے تھے جو راستے
میں ہی کاٹ کر ٹھیک کر دیے جاتے تھے۔ ایک آدھ ہی خوش قسمت ٹرین ہوتی تھی۔ جو صحیح و سالم پاکستان پہنچ جاتی تھی اور عید
کیا کوئی غصہ مول نہیں لیتا تھا۔ وہ کچھ چپے چپے اپنا سامان بیچ کر سوائی سہارے تک کھٹ خریدتا تھا۔ کیونکہ جمع جگہ کی تو
کچھ نہیں پاس۔ زہرہ کے پاس صرف غصہ سا زور تھا۔ اور مہر کی رقم نہ اس نے مسعودا حسن سے مطالبہ کیا تھا نہ انہوں نے
توڑ دیا تھا۔ بہر حال اب ان خودوش حالات کے پیش نظر بہت مجبور ہو کر جب عید نے زہرہ کی طرف سے ادھر اس کے مرنے کی رقم
کا مطالبہ کیا تو جواب میں شہر میں جہاں نفس نفیس خود آ پینچیں۔ اس لیے عید رقم کا بھی بندوبست کرنے لگا ہوا تھا شہر میں جہاں
نہائے کی غصہ کی رقم زہرہ کے آگے ڈالی اور لپٹی کا بازو پکڑ کر لو لیں۔
تمہارا ضرور ہو مگر اس کی رگوں میں خون باپ کا ہی دوڑ رہا ہے اور یہ اب تک تمہارے پاس رہی تو میں نے کوئی

اعتراف نہیں کیا، اس خیال سے کہ جہاں کا بھی حق بنتا ہے مگر اب میں نہیں اتنی رعایت نہیں دوں گی کہ تم اسے اپنے ہاں پاکستان لے جاؤ۔

زہرہ نے دیکھا شوکت جہاں کے بال بچے کی طرح جھک سے ہوئے تھے۔ کمر بھی غھڑی سی جھک گیا یعنی اور غصہ سلوٹوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مگر غصہ اور غم وہی عقادہ بھی اب پیچھے کی طرح بے زبان اور ناکوان سی زہرہ نہیں رہی تھی۔ پچیس سال کی ہو گئی تھی۔ ورتن کی طرف بھینٹی اور بولی۔

”ہیں، اس کا اب آپ سے مدد کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ یہ میری بیٹی ہے اور اسے میں نے بڑی مصیبتیں اٹھا کر گزارا ہے۔ میرا اسے مرکز پرگز آپ کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اگر آپ کو اپنی عزت عزیز سے فوفا ایماں سے لے کر ایک بیٹی کے لیے تو میں نے دل پر صبر کی سب کچھ لی تھی اب وہ دوسری بیٹی ہے۔“

اور دوسری بیٹی کا ذکر زبان پر آتے ہی اس مگر رنج و غصہ نے چپ چاپ رونا شروع کر دیا۔

”اوسے وہ بے چاری زندہ ہوئی تو پھر میں اس پر بھالے میں اتنی دوردراز کا سفر کر کے تمہارے پاس کیوں آئی۔ تم نے اس کی خبر نہ لی۔ اور وہ معلوم تمہارے ہونے میں مجھارہ وہ کے۔“ فقر اور صبر اور محنت اور بڑی ہی محنت بھونک کر نکلیں۔ زہرہ کے دل پہ تو اس خبر نے کچھ دیا۔ وہ بھی پوچھا کہ سن سہی کھڑی رہ گئی تھی۔

”مگر۔ مگر آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟ بڑی دیر بعد زہرہ کے منہ سے یہی نکل سکا۔

”اسے تم تو اپنے غم میں مبتلا تھیں۔ پھر بھلا اطلاع دے کر میں نہیں بے موت مارنے سے زوری تھی مگر اسے کوئی کام نہیں رہا تھا تو پھر بھی انسانیت کا ایک رشتہ تو تھا۔ شوکت جہاں نے رومال سے اپنے آنسو پونچھے ہوئے کہا۔ اور پھر بولے۔

”پہلے سینے سے لگا یاد کرو کہ اس کا سر خیم کر اس سے لولیں۔“

”میں تمہارے باپ کی ماں، تمہاری دادی ہوں اور تمہارا باپ تم سے ملنے کو تڑپ رہا ہے۔ اتنا بڑا گھبراہٹ ہمارا کر دیا۔

مگر بھی اس کے برابر نہ ہوگا۔ وہاں تم شہزادیوں کی طرح رہو گی۔ کیوں چلی گئی میرے ساتھ۔“

اور بولتی ہے باپ اور دادی کے بارے میں کچھ علم ہی نہ تھا۔ صحتی کہ یہ تک نہیں معلوم تھا کہ اس کی کوئی بہن بھی تھی اور ماں کی محبت سے ہمیشہ محروم رہی تھی۔ اور اب دادی کے دیشا نہ تھا اور انہیں اپنا اور جد سے داری کو نہ کہ ان سے نہ۔

پھر یہ عرب بھی ہو گئی تھی اس نے دادی کے سوال پر پہلے ماں کی طرف دیکھا جو سخت ترچہ و تاب کھاتی دادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیوں میری جان نہ چلے گی نامیرے ساتھ۔“ تو اس نے شرمائے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہل دیا۔

”وہ دیکھانے لے، بچی تو تیار ہے چلنے کے لیے۔ سچ ہے خون کی کشش اسی کو کہتی ہیں۔ اچھا اب تو اسے اجاہت دے۔“

”نہیں اماں جان! میں اسے آپ کے ساتھ نہیں جانے دوں گی جو بیٹی اندر جا کر اپنے اسکول کا کام کر لے۔ وہ نہ بیٹا سے خفا ہو جائی گئے۔ زہرہ نے شوکت جہاں کو کھرا کھرا جواب دے کر مٹی کی طرف کھسکا جس طرح گھور کر کہ اس کی جان لگا گئی۔ اور وہ دادی پر ایک نظر ڈال کر دوسرے کمرے میں جانے لگی تو دادی نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ لیا اور زہرہ دہاڑیں۔

”اے خدا میں بھی تو دیکھوں کیسے نہیں بھیجے گی تو اسے۔ اسے اور غفور ذرا شریف کو لے کر اندر تو آ۔ اور ادرہ چھڑ

نے اپنے دونوں ملازموں کو اندر طلب کیا اور ادرہ وہ دوسرے ہی کیوں اندھا لگے جیسے پہلے سے ہی تیار رکھ دی تھے۔

”چلو بیٹا کیے جا کر کھڑی ہو جاؤ۔ اتنے میں تم بھی آئی ہو۔“

انہوں نے کھڑے ہوئے۔ تودہ وہاں پچیس سالہ کو بچہ کر رہے تھے۔ جبکہ زہرہ بے چاری چھٹی چلائی ہی رہی تھی۔

جہاں کے کان پر چونک نہ رہی۔

”دیکھو زہرہ۔ آخری بار کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے کام لے۔ تمہاری بیٹی انہوں میں جا رہی ہے دشمنوں میں نہیں۔ جب بھی اپنے

سے ملے۔ مگر یہ جگہوں کی جائیداد اور دیر پیسہ ہے اسے اسے بھی کچھ چین اٹھانے دور اور آخر یہ سب سے کسی کا ہونے

کے حق سے محروم کرنے پر تھی۔ پورے تو مگر کبھی دوبارہ پیدا ہو جاؤ تو اسے ایک جھوٹا سا مسکن بھی نہ کر نہیں دے سکتیں۔“

شوکت جہاں نے وہ رقم جو وہ ساتھ لائی تھیں وہ اٹھا کر اس کے قریب ہی بچھے تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔ مگر زہرہ نے نہ

مسل یعنی اور چلائی رہی اور انہیں برا بھلا کہتی رہی۔ شوکت جہاں نے بھی اس ڈر سے کہ کہیں کوئی پاس ٹوکس والا

نہ نہ کہنے کو نہ کہ دور ان کی بچائی ہوئی شطرنج کی لمبا ہی نہ الٹ جائے۔ مزید وہاں رکنا گوارا نہ کیا اور اس موٹر میں بیٹھ کر ایش

پہنایا۔ خود کھس کے ایک دوسرے کی تھی جو اسی شہر میں رہتا تھا۔

زہرہ کی بیٹی کے بوسے لے بسی سے تھک چکے کھاتی رہ گئی۔

زہرہ کی بیٹی کو شوکت جہاں کو دھک دے کر بھی باہر نکال سکتی تھی۔

جبکہ وہ اپنی تو شوکت جہاں کو ہی اس کے سامنے آنے نہ دیتی۔

سب سے بڑھ کر تو خود بھی کوئی اس کے سامنے آنے نہ دیتی۔

اور حق سے کا اپنی تو بچی کو ملازموں کی گرفت سے بھی بچھا سکتی تھی۔

کر یہ مارا کہ تجارت اور محبت کا ہی تھا۔

مگر۔ کراچی کے کیپکس اور کچھ فطری کمزوری نے زہرہ سے بہت جرأت اور استقلال کی دولت تو چھین رکھی تھی پھر بھلا

دیکھے کہ کسی تھی اس لئے اور ترپنے کے۔

نچو شام کو بیدار تھکا ہارا نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاندا۔ اور کس کس طریقے سے خود کو انسانیت کو زنج کر کے والے قصا بولے

چلا تھا۔ دایاں یا تو گویا تادیبی لٹ چکے تھا۔

وہ بھی جسے اس نے اولاد سے بڑھ کر چاہا۔

چھوٹی سی عمر سے نہ جانے کس طرح محنت مشقت کر کے اس کی پرورش کی تھی وہی اس سے چھین لی گئی تھی۔

خانگی کے چپن بٹے پر اسے جتنا غصہ آتا۔ جتنا ملال ہوتا تھا۔

بیکر اس کا خون لوگوں اٹھا تھا۔

جی چاہا کہ اٹھا کر اس فلم پر خانوں کی نکتہ بولی کر کے رکھ دے۔

مگر وہ اسے سمجھتے کہ مجبوری اور بے بسی اس کے سرور کی بڑیاں بن گئی تھیں۔

کہ حالات کی کچھ اتنے بہتر ہو رہے تھے کہ اگر وہ چاہتا بھی تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور وقت بھی تو خفا نہ رہی محنت اور کوشش کے بعد جہاں کی طرف وہ پیش قدمی ہی مل سکتی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ پہلے بہن اور

جانی کو سامنے بھیج دے گا۔ بعد میں خود جائے گا۔ مگر گھر واپس آیا تو بھی کبھی کوئی غائب پایا۔

آنا وقت تھا نہ موقع نہ تھا بچی کو واپس لانے کی کوشش کرنا۔

چنانچہ دل میں ہی محنت لیے بہن کو ساتھ لے کر لا ہوا گیا۔

پاکستان کی پاک اور مقدس سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد کافی عرصہ تو دونوں بہن بھائی کو ہمارے کمپ میں رہ کر گزارنا پڑا تھا کہ

کون مان بچان ولا تھا نہ عزیز رشتے دار۔ مگر یہ عید کے گھوم بھیر کے سب سے پہلے ایک جھوٹا سا مسکن خرید کر رہائش کے مسئلہ پر کیا کچھ نہ

بہن سے ہوا تھی اس کی محنت بہت غلاب رہے تھی۔ اور عید جانا تھا کہ نہ تبدیلی آج دو کا سبب بنائیں بے کدہ آکا کو بھی کی

بہن کو غم انداز رہا ہے۔ یوں تو عمر سے زہرہ کو کھانسی کی شکایت تھی۔ کبھی بڑھ جاتی اور کبھی دوا دارو کرنے سے کھٹ

ماتہ نہ ہوا کہ تو یہ مسئلہ کھانسی کی شکایت رہنے لگی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ خانگی کیفیت بھی۔ اور اس کے خیال سے عید نے

بہن کو نہ کھڑے رہنے کا خیال نہ تھا جس کا نقشہ ہمارے چائے کی ضرورت کو نظر انداز کر کے بنایا گیا تھا۔

بہن کو نہ کھڑے رہنے کا خیال نہ تھا۔

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

معدوم اور ترپنے جیسے کہ ایک بڑھ چھت تو بہتر آگئی تھی۔ مگر زہرہ چندوں بھی اس چھت کے نیچے آرام نہ کر سکی۔ علاج

پہنچا پھر بہن کی فکر ادھر فکر روزگار۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے تو کیا کرے کہ ایک روز جب وہ تاش معاش کے سلسلے میں پھر پھر کر گھر واپس آیا تو بہتر سے پوچھا۔

”کیا کوئی کام مل گیا ہے؟“ (وہ اسے دلدل میں بھٹایا ہی کبھی بھتی۔)

”نہیں مگر ٹھیکرس بات کہ آپ ایک نہ ایک دن مل ہی جائے گا کہ اس نے بہن کی پریشانی کے پیشِ نظر بات کو لا بہت نہ پڑے گا۔“

”مگر کب ملے گا آخر جبکہ میں تو صرف اسی میں جی رہی ہوں۔ تمہارے روزی کمانے کا کوئی ذریعہ پیدا ہو جائے تو کہہ دو۔“

”ابھی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا۔ مہرے ہوتے بھلا آپ کسکتی ہیں۔ واہ کیا مجھے ایسا ہی کمزور سمجھ رکھا ہے آپ نے؟“

”نہیں بھتی۔ یقیناً جاؤ اب مجھ میں آگے چلنے کی سکت نہیں ہے۔ حال جائے ہو کیا۔ بہن کے دل کے زخموں سے واقف نہیں اسے جیتا حالات کے چکر کے لگ لگ کے پھٹ گئے ہیں۔“

”اسے آپا آپ تو صابریں میں سے ہیں۔ ایسی باؤسانہ باتیں کر کے بیکار میں اپنی ساری ریاضت کو رائیگاں کیوں کر رہی ہیں۔“

”نہیں بھتی! صبر کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور میں اس حد سے بھی زیادہ صبر کر چکی ہوں۔ ہائے مجھے تمہارے تو اس بات پر تعجب نہ کیجیے اپنی شہرہ کو گنگے سے نہیں لگا رہی ایک محنتِ شعری نظر اس پر نہیں ڈالی۔ کبھی اپنے پاس بھی نہیں سلا با۔ حالانکہ وہ بھی جان کسی فکرِ کمزیری طرف دیکھ کر تھی کبھی بھی تو خود مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ مگر جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ کیا میری ماری گئی تھی میری کہ اس بے قصور سے اپنی بربادی کے سارے بدلے دے رہی تھی۔ اسے کیسی آج نہیں یہ بات بتا رہی ہوں کہ میری کوتاہیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے ہی ولدی کے ساتھ اتنی خاموشی نے چلی گئی تھی۔“

اس نے پلٹ کر میری طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ اسے جیتا میں تمہارے آگے یا تھوڑی ہوں صرف ایک طرف اس سے ملوا اور صرف ایک بار تاکہ میں اس کے سامنے یا تھوڑ کر اپنی زیادتیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ لوں مگر بار بھٹا۔ پس ایک بار۔ پھر تو میں ہلکی بھلی ہو کے اپنی قبر جہاں کے پاس چلی جاؤں گی بھتی تمہیں خدا کا واسطہ۔“

اٹ نہرہ کی کیفیت بذاتی ہی ہو گئی۔ وہ بھائی کے آگے یا تھوڑ کر اس کی منتیں کر رہی تھی۔ پور بھائی کا دل۔ کیا کی دل شکستہ باتوں پر پھینچا جا رہا تھا۔ وہ دگرختہ سے بچے میں لولا۔

”آپا خدا کے لیے خود کو سنبھالیے۔ آپا کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے تمہارے چھین جانے کا غم نہیں ہے۔ میرا دل تو خون کے آئینہ ہے آپا۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر پوری کوشش کروں گا کہ کسی طرح تم کو ان غالموں کے چنگل سے بچاؤں۔“

مگر آپا آپ کچھ تو صبر سے کام لیں۔ ”مگر جواب میں زہرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بلکہ اس غم میں کھل گئی کہ دن نہ ہی آتا تو دیکھی۔“

یہ سانحہ تو اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ بہن کی جدائی نے نہ صرف اس کی کمزوری تھی بلکہ جو جسے بھی بہت کر دیا ہے۔“

اور اس نے بہن کی میت کے آگے کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنی بے گناہ اور پیاری بہن کا انتقام نہیں لے لے سے نہیں بیٹھے گا۔

فیروز پور روڈ پر آگے جا کر وہ ایک مختصر لیکن خوبصورت سی کوٹھی تھی۔

اولیٰ جنوری کے دن اور جاڑا شہاب پر۔ بلکہ ایسے کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی کسی بھی لمحے پارہ فقط انجاد سے گرتا محسوس ہوا تھا۔

اصل میں گزشتہ دنوں موسم سرد مہا کی پہلی بارش یعنی ہوا میں پڑنے کی وجہ سے کڑی دھوپ کی طرح سردی ایک دم ہی چمک اٹھی تھی کہوئے کوئے سوئیڈر، کوٹ اور جیسٹر زنجی اس ملا کی سردی میں ناکافی محسوس ہو رہے تھے۔

دن کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ لیکن فضاؤں میں پھیلی ہوئی ہلکی دھند اور ریح لیتے ہواؤں نے اس دھوپ کو بھی جیسے ٹھنڈا کر دیا تھا اور اسی ٹھنڈی ہوا کی نیم جان سی دھوپ میں پروٹی برآمدے کے ستون سے لگی۔ خاتون خانہ سلسلے کچھ فاصلے پر۔

میں دوڑ پر دوڑاں دوڑاں ٹریفک پر نظریں جمائے کھڑی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے پسندیدہ فاسٹی رنگ کی سلکس لڑھی اور فلیٹ کپڑے اور زیب کپڑے کے باوجود اپنے سر اپا کو شمر کے گرم شال سے اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی ان کے پیروں کو تھوڑی تھوڑی درجہ حرارت میں گرمی کی کمی سی پیدا کر رہی تھی۔

ان کے انداز سے اضطراب بھی نمایاں تھا اور انتظار کی صبر آزمائیت بھی۔

اس لمحے میں روڈ پر عام دنوں کی طرح گاڑیوں اور سواروں کی اتنی زیادہ آمد و رفت نہیں تھی بلکہ اکا دکا گاڑیاں ایسی تائیں اور سائیکس وغیرہ ہی وقفے وقفے سے گزر رہے تھے۔ خاتون خانہ کی نظروں ٹریفک سے ہٹیں تو سیدھی کلائی پر بندھی رست وای پر پڑ گئیں۔

وہ دراز قد، پھر سے بدن اچلی دگت اور کھڑے نقشے کی حامل کلائی خوش شکل خاتون تھیں سن بھی یہی کوئی خاصا اٹھائیس سال کا تھا۔ ان کی غلافی آنکھیں گہری یاسیت کی غماز تھیں۔

اور جو جس سے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ناگواری سی منتشر تھی۔ وہ باہر سڑک پر دیکھتے دیکھتے اکتا جاتیں تو پلٹ کر اندر دیکھتے دیکھتے مگر پھلٹ کر باہر نکل آتیں۔

گویا ایک طرح سے وہ ٹہل نگار ہی تھیں۔
اصل میں تو وہ اپنے شوہر کی منتظر تھیں۔
جن کی آمد کسی لمحے بھی متوقع تھی۔

ان کے شوہر گذشتہ ڈھائی تین ماہ قبل اپنے قریب المرگ والد کی طبی پرستیا پورہ اندھا یا گئے تھے۔ انہوں نے خط کے ذریعے اپنی بیوی کو اپنے والد کے رحلت کر جانے کی اطلاع دی تھی اور پھر خط کے ذریعے آمد کی اطلاع لکھا تھا کہ بس آج شام کی گاڑی سے دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ اور وہاں سے جہاز کی سیٹ بک کر کے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس حساب سے تو گذشتہ روز قبل ہی انہیں آجانا چاہیے تھا۔ اور وہ پچھلے دو روز سے پورے کوکارے کراہ پورٹ بھیج رہی تھیں۔ بلکہ پہلے روز تو خود بھی ابر پورٹ گئی تھیں۔ مگر بعد میں صرف ڈرائیور کو بھیج دیا۔ پھر کتنا کھانا کھا اور تازہ آج بھی کہہ رہے تھے کہ ان کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ ان کے آنے کا کوئی ٹکٹ چکا تھا۔ اور خاتون خانہ کا اضطراب منتقلی اور کوفت میں بدل گیا تھا۔ کیونکہ وہ سخت بدگئی کا نشانہ تھیں۔ گو فطرتاً وہ شکی مزاج نہیں تھیں۔ نہ ان کے شوہر ہی شوقین مزاج اور ادھر ادھر تاک جھانک کرنے والے۔ بس ان کے حالات نے ہی انہیں کچھ شکستہ مزاج بنا دیا تھا۔

بچپن میں ہی جب ان پر چار دن طرف سے لاڈ پیار کی بارش ہو رہی تھی تو قدرت نے ماں جیسی نعمت کا ان پر بھیج دیا تھا۔ تب باپ ہی سے انہوں نے اپنی ساری توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ دوسرے مومنوں میں وہ بہت محبت اور توجہ کی منتھی تھیں۔ مگر وہ ماں کا لٹن میلا ہونے سے قبل ہی دوسری شادی چاہیے تھے۔

تین بڑے بھائی تھے۔

جان چھڑکنے اور اپنی تنقیدیں نیچا ور کرنے والے۔

لیکن چونکہ ان سے کافی بڑے تھے اور پھر بچپن ہی سے باپ کی سخت گیری اور غفلت سے بھانپوں کا لب بھی ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی ان سے مکمل نہ سک تھیں۔ انہیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا کچھ نہیں گیا ہو۔ یا پھر وہ خود کہیں گم ہو گئی ہوں۔

پھر جب وہ سن بلوغت کی حدوں کو چھوئے لگیں تو سب سے زیادہ جان چھڑکنے والے بڑے بھائی تو وقت کب کے بیرون ملک سدھار چلے گئے۔

متھیلے بھائی نے بھی شادی کر لی تھی اور چھوٹے بھائی جو کہ زیر تعلیم تھے تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے امپٹس پل گئے اور اپنے غم پالنے کے لیے وہ خود ہی رہ گئی تھیں۔

پھر جوان ہوئیں تو متول تھراتے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی شاید ادھر ادھر سے ان کے میقات آتے شروع ہو گئے۔

والد چونکہ اس وقت تک حیات تھے۔

اس لیے انہوں نے ان کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو ایک اعلیٰ اور شریف خاندان سے تھے۔ لیکن دو ہاجو تھا۔

دوست کا بیٹا تھا اور اس کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا تھا کہ اس کی بیوی جو اس کی سگی چیزا زاد اور عطیہ کی تھی ایک حادثے کا شکار ہو کر شادی کے چھ سات ماہ بعد ہی چل بسی تھی۔ اور وہ شخص بھی اپنی محبوب بیوی کی اور محبت کے مہار سے اپنے بقیہ زندگی گزارنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اور عقد ثانی پر کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوئے۔

لیکن اس شخص کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے سے ان کا کوئی وارث پیدا ہو جس سے آئندہ ان کی نسل بڑھے۔ اور کچھ اس شخص کے المیے کے پیش نظر ہی کہ وہ دنیا کو تیاگ کر ہی بیٹھ جائے باپ نے بالآخر پورے برس بعد اسے عقد ثانی پر آمادہ کر لیا۔ لیکن والے افسوس کہ دوسری بیوی اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم

نہ گوراج ہونے کی وجہ سے بیوی کا مدد بیکل چیک کر لیا گیا تھا۔ شوہر نے خود اپنا کرایا تھا۔ پھر بھی تہمت ہمیشہ بولنے لگے اپنی سرلی تھی۔ جبکہ وہ شخص علی گڑھ کالج سے بی اے کا سند یافتہ تھا۔ روشن خیال اور نئی اقدار کا حامل تھی۔ اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔

لیکن اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں وہ بیوی کو ہی دوش دیتا تھا۔

یہ بھی باپ کے مہم اصرار اور پوتے کی خواہش کو پورا کرنے کی غرض سے ہی اس نے یہ دوسری بیوی کا تعجب اپنے سر لیا تھا۔ اگر نہ اسے دوسری شادی کی خواہش تھی نہ بچے کی تنہا۔ بلکہ وہ تو دوسری شادی کرنے کی حماقت کر کے ہی بچتا رہا تھا۔ اور زبان سے نہ بھی اپنے رویے اور انداز سے وہ بیوی پر ظاہر نہ ہی کرتا تھا کہ اس سے شادی کر کے اس نے جیسے اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

بیوی خود بھی اس کے احسان تلے پس جا رہی تھی۔ شروع سے ہی دونوں کے ازدواجی تعلقات ناخوشگوار تھے۔

کیونکہ شروع دن سے دونوں کے درمیان ایک تنگ اور پانچ سی حامل ہو گئی تھی۔ یوں بھی وہ شخص کچھ تھا ہی نظر نہ آتا تھا۔

اور بیوی پر ہمیشہ ہی جتنے کی کوشش کرتا کہ یہ زبردستی کا سودا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی مرحومہ بیوی کا سوگ مناتا ہی نظر آتا تھا۔

گو اس میں شک نہیں کہ اسے اپنی مرحومہ بیوی سے بہت محبت تھی۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ پورے آٹھ برس کے طویل عرصے میں وہ اس کے لیے حکایت پارینہ بن چکی تھی۔ کہ یوں بھی وقت میں ہی تو ایک خوی یا خرابی ہوتی ہے کہ

کے دھاروں کے ساتھ ساتھ حالات میں بھی تبدیلی پیدا کرنا چلا جاتا ہے۔ گزرے ہوئے کل میں جو گزر جاتا ہے وہ حال اور پھر مستقبل کی تیز دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

البتہ کچھ ایسا کچھ یا اس ایسی ہوتی ہیں جو پچاس کی طرح دل میں اتر جاتی ہیں اور بری طرح کلکتی رہتی ہیں۔ تو اس شخص کے دل میں بھی وہ ٹھنک باقی تھی۔

کچھ اس وجہ سے بھی کہ جبریرہ عقد ثانی کرنے کے بعد بھی وہ اپنا گھر مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اور کچھ اس لیے بھی کہ دوسری زبردستی سر پر بیوی صاحب شروت تھی۔

جبکہ مالی اعتبار سے وہ شخص کم مانگ کا شکار تھا۔ باپ کو داد کی طرف سے کوئی معقول ورثہ نہیں ملا تھا کہ دادا کا مال و زمان کی تلہ خرچی اور عیاشیوں کی نذر ہو گیا تھا۔ سو تنہا ماں۔ یعنی باپ کی پہلی بیوی تعلق دار مقصود الحسن کی تنہا بیٹی تھیں اس لیے اولاد زینہ کے معمول کی خاطر اس کے باپ نے عقد ثانی کر لیا تھا۔ تب کہیں جا کر دوسری بیوی کے بطن سے وہ شخص پیدا ہوا تھا۔

پہلی بیوی یعنی مقصود الحسن کی تنہا بیٹی تو جبریرہ کی صورت میں جو مال و متاع ساتھ لانی تھیں وہ ان کی بیٹیوں کی شادیوں پر آٹھ گیا تھا۔ اور دوسری بیوی کا تعلق چونکہ اوسط طبقے سے تھا اس لیے وہ صرف ضرورت کی چیز ہی ساتھ لاسکی تھیں۔ اور ادھر باپ کی وہی مش تھی کہ رسی جل گئی مل گیا۔ اندر سے کھولے ہوئے تھے مگر باہر سے

ایسے ملے تھے کہ زبردستی کوئی کام نہ کر سکیا کسر شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو بچا کچھ تھا وہ بھی ان کی فتنوں خرچی میں ختم ہو گیا تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر باپ کے بہت تنہا نے بھانپے پر وہ شخص عقد ثانی پر آمادہ ہوا تھا۔

بیوی کے دم سے ہی چار چاند لگے ہوئے تھے۔ لیکن ظاہر نہ ہی کرتا تھا کہ اسے بیوی کے روپے پیسے کی کوئی طمع ہے نہ اس کی ذات میں کوئی دلچسپی ہی۔ اور اولاد

195

پیدا نہ کر سکنے کی پاداش میں اسے بالکل ہی بے وقت کر کے رکھ دیا تھا۔
 بیوی بے جاری بھی اپنی اتنی بڑی غرونی کی وجہ سے احساس کمتری کی کچھ ایسی شکار ہوئی تھی کہ ہر دم اندر
 خاموش رہتی تھی۔ کہ اولاد کی وہ بھی دل سے خواہاں تھی۔

کنتارا مان تھا اسے مان بیٹنے کا۔
 مگر جب کا تب تقدیر نے اس کی قسمت میں اولاد ہی نہیں کبھی تھی تو صبر کرنے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا تھا۔
 بس اسے ہر دم بی دھڑا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کا شوہر اولاد کی خاطر ایک اور شادی نہ کر لے۔
 فلاں جگہ گیا ہے تو کسکھلے ہی چک رہی ہو گیا ہو۔
 یا پھر کہیں خفیہ طور پر کسی سے تعلقات استوار نہ کر سکے ہوں۔
 اور اس کے بھی وہ کچھ ایسے ہی شکوک و شبہات میں مبتلا تھیں۔

آخر جب ٹہل ٹہل کر اٹھا کر کتے کرتے دن کا ایک بج گیا تو وہ شوہر کی طرف سے مایوس ہو کر ڈرائنگ روم میں
 گئیں۔

اصل میں ان کی بیوی ہونی کا راجھی تک ایر پورٹ سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس کی واپس کے انتظار میں
 ڈرائنگ روم میں ہی رگن پڑا تھا اور نہ اتنی شدید سردی میں وہ میدھی اپنی خواب گاہ میں جا کر لحاف میں دبک جاتیں۔
 وہ جو بڑی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ گھر کی ادھیر عمر بانی ملک خوار احمدی بیوہ نے اندر کہیں سے وارو کو کھڑا
 دی۔

”وہن بیگم کھانا کب کا تیار ہو چکا ہے۔ کیا میرے بچوں کو۔۔۔ مگر کوفت اور کھسیا ہٹ کے عالم میں ان کی بھوک بھی لگتی ہو۔“
 انہوں نے سیزار کن لیجے میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ میرے بچوں کو کھانے کی ضرورت نہیں بس تم کھا لو اور خانسا مال کو بھی کھلا دو۔“ اس کو کھدے جواب سے صاف غلہ
 تھا کہ وہ کچھ بھی کھانے پینے کے موذ میں نہ تھیں اور احمدی بیوہ اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر جانے
 پہلے دی زبان سے کہا۔

”کھانے کا وقت نکل جاتا ہے وہن بیگم تو بے وقت کھانے سے طبیعت پر گرائی رہتی ہے۔ میان سرکار تو ان ہی
 آتے نہیں لگ رہے۔“

”وہ تو اب شاید ہی کبھی آئیں۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں اور پھر کخت سے لیجے میں بولیں۔
 ”جب میں بے وقت کچھ کھانے پینے کی عادی ہی نہیں تو پھر طبیعت پر گرائی کا کیا سوال۔“ احمدی بیوہ نے ہر کچھ ہنر
 کہا جواب میں ایک ٹھنڈا سا سبب بھرتی واپس پلٹ گئیں۔ اور بھی چند لمحے بعد ہی کارکنے کی آواز آئی تو یہ جانتے ہوئے
 بھی کہ شوہر نہیں آئے ہیں ان کا دل بڑی طرح دھڑکا اٹھا۔

مگر جانے غصے اور کوفت کی وجہ سے دھڑکا تھا یا شویش کے باعث۔ حالانکہ وہ بہت مستقل مزاج اور طبعی
 طبیعت کی مالک تھیں۔ لیکن شوہر کے معاملے میں تقریباً ہر عورت کسی نہ کسی پہلو اپنی فطری کمزوری سے مات ضرور کھاتی
 ہے۔ سو وہ بھی ایک عورت ہی تھیں۔

ڈرائنگ روم کے تمدن کی چاب سناٹا دینے لگی تھی اس لیے اپنی بے گلی پر قابو پاتے ہوئے وہ صوفے پر سنبھل کر
 اس انداز میں بیٹھ گئیں جیسے ڈرائنگ روم کی خوشبو سارے ڈرائنگ روم کو محیط کر تی نظر آتی تو اچھا لگے

لیکن اگلے ہی لمحے جب ایک مخصوص اور مالووس کی خوشبو سارے ڈرائنگ روم کو محیط کر تی نظر آتی تو اچھا لگے
 کے عالم میں انہوں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تو ستری پیس کے گرم سوٹ میں ملبوس انہیں اپنے شوہر
 سامنے ہی کھڑے نظر آئے۔ اور ان سے نظر پٹتی ہی بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا کر بولے۔

”السلام وعلیکم“
 ”وعلیکم السلام“ وہ ان کے سلام کا جواب دیتی ہوئی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ دل بھی عجب انداز میں دھڑکا

بے غفہ سا انداز اور تھپ تھپ ٹاپ ان کے لیے سخت اچھبے کا باعث بنی جارہی تھی۔ وہ آنکھوں میں جامد ہوئی حیرت
 کے ساتھ ان کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

”اب آپ نے تو خود سلام کرنے میں پہل نہیں کی تو ہم نے سوچا کہ ہم ہی کر لیں۔“ وہ ان کی ہر کیفیت کو نظر انداز
 کرتے ہوئے ان کے قریب آ کر بولے۔

”لیکن قاعدے کے مطابق تو آنے والے پر ہی سلام میں پہل کرنا واجب ہوتا ہے۔“ انہوں نے اپنی حیرت پر قدرے
 قابو پا کر کہا۔

”ہا ہا ہا یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر خیر اپنی سناٹے اتنے عرصے کیسی رہیں آپ۔“ انہوں نے ان کے جواب پر ہنس
 کر پوچھا۔

”ابھی ٹھیک تھا۔۔۔ مگر اتنا توڑ سا جواب ملا۔“
 ”خاطر سے ظاہر ہے معلوم بھی کچھ ایسا ہی جو رہا ہے۔“ انہوں نے ان کی بات کو منہی میں اڑایا۔

جواب میں وہ انہیں شاکی سی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

”مگر یہ خشکی کی بیکسی جو کچھ بھی سہی جائز ہی ہے جان آپ کو واقعی انتظار کی سخت زحمت اٹھانی پڑی
 ہوگی۔“ وہ ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں منانے کے سے انداز میں بولے۔ جواب میں وہ نظر نہ اٹھا کر کھڑی رہیں۔

”لیکن میں اپنی غیر حاضری کی ساری کسر بھی ابھی پوری کر دیں گے کچھ معلوم بھی ہے ہم آپ کے لیے کیسی انمول
 سوغات لائے ہیں۔“

انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ان کا چہرہ تمام کر بڑے پیار سے کہا۔ اور شوہر کی بات پر خوش ہونے کے بجائے
 وہ بکا لکھی رہ گئیں کہ یوں بھی شوہر کی بریات۔ یعنی ان کا اس قدر چوچال موڈ۔ نرم سارویہ۔ آتنا التفات اور

گرم جوشی جی کہ تعجب کا باعث تھی کہ یہ سوغات۔ وہ بھی بڑی انمول سی سوغات لے کر آنا۔ جبکہ وہ کسی خوش وقتی میں
 تو انہیں لائے تھے نہ وہاں سے کوئی معرکہ کی سرک کے آئے تھے بلکہ وہ تو اپنے والد کی نازک حالت کے پیش نظر بڑے

بذکائی سے حالات میں دوڑے دوڑے انداز لائے تھے اور باپ کے آخری سفر میں انہیں الوداع کہہ کر آ رہے تھے۔ یوں
 بھی انہیں والد کے پاس جانے کا یہ پہلا اتفاق تو نہ تھا۔

بلکہ جب وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے دہلی میں مقیم تھے تب بھی سال میں دو مرتبہ باپ سے ملنے سیتا پور ضرور جاتے تھے
 اور بال کم و بیش ماہ دو تیرہ ماہ کا عرصہ گزار کر رہی آتے تھے۔ یہ ان کے لیے کوئی انوکھی بات تو نہ تھی، نہ ہی وہ کبھی کوئی

سوغات لائے تھے۔

مگر اس مرتبہ چونکہ واپس میں کچھ زیادہ ہی عرصہ لگ گیا تھا اور وہ گھر پر تہہ دارہ گئی تھیں شاید اسی وجہ سے انہیں خوش
 کرنے کے لیے وہ کوئی سوغات لے آئے ہیں۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ کہ اس کے علاوہ تو سوغات لائے گا انہیں

کوئی بھروسہ ہی نظر نہیں آتا تھا۔

”بھئی دادو تعجب ہے ایک تو ہم آپ کے لیے اتنی اچھی سوغات لائے ہیں اور آپ ہیں کہ پلٹ کر بوجھ تک نہیں کہ
 ہر ایس کی ہر کچھ شے آپ کے لیے اٹھا لائے ہیں۔“ انہوں نے بیوی کو اس قدر متعجب اور خاموش دیکھ کر کہا۔

”اچھا مگر ہم خود ہی دیکھتے دیتے ہیں کہ ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں۔“

وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر بولے۔ تو بیوی نے بھی سوچا کہ یقیناً وہ کوئی خاص چیز ہوگی ورنہ وہ اس انداز میں کسی
 چیز کو نہ لائے کے عادی تو نہیں ہیں۔ اس اٹھارہ سال کے دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر وہیں رک کر انہوں نے ڈرائنگ روم کو

اگر ڈریں۔۔۔ اور پھر واپس پلٹ کر صوفے پر آ بیٹھے۔

”تجھے آپ بھی ہمارے پاس ہی چھو جائیے۔“ انہوں نے بیوی کو مخاطب کر کے کہا۔

”اوکھل اس دھبے سے کہ اس کچھ وہ حد درجے چھنس ہو رہی ہیں۔ میان کے آتے ہی ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پھر لگی ہی
 شہزادوں ہاتھوں پر صرغ کھل بن پٹی کوئی شے بڑی اچھا لگتی تھی۔ تو وہ اٹھتے ہوئے تباہ نہ

دوتوں کو جو جھل کرنے کی غرض سے بولیں۔

”ماشاء اللہ بالکل اور جی کڑیا گئے ہیں یہ بٹیا تو میاں سرکہ خدا آپ کو ان کی خوشیاں دکھائے۔“ اور امجدی ہوا کی بات پہنچ کر کھولیں۔

”امجدی اتر جا کر باونچ خلیے میں بیٹھو۔ جب ضرورت ہوگی تم ہمیں بلا لیں گے۔“

اور امجدی ہوا کی سردی خوشی کا فخر ہو گئی۔ وہ منہ دکھائے کھائے کھائے سے نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی ثاقب نے اپنے پیچھے ہنسنے لگا۔

”کیا کھاؤ گی کڑیا؟“ انہوں نے مودی کو کیڑ نظر انداز کرتے ہوئے جی سے پوچھا۔ تو جواب میں جی نے اپنی معصوم اور چمکی لٹائی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر کھانے کی میز سے کچھ لے کر مودی کی طرف ڈش کی طرف انگلی اٹھادی۔ فزوش میں منگت سے امجدی اور

دیگر دیکھ رہے ہوئے تھے۔ ثاقب نے ایک سیب اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”پہلے کھا لکھا پھر یہ سیب کھانا۔“ ٹھیک بے ناگرایا۔ چلو یہ سیب یہاں اپنے سامنے میز پر رکھ دو۔“ مگر جی نے سیب نہ رکھنے کے بجائے منہ پر مٹی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا۔

”اچھا جی چلو یہ کھاؤ۔“ ثاقب نے تھوڑا ہنس کر کہا اور سیب کو پھینک دیا اور کھانے کی غرض سے چھری اٹھانے کے لیے اڑنا۔

کی طرف ہاتھ ڈھکا تو فوراً تھوڑا ہنس کر جی چھری اٹھا چکی تھیں۔ اور سیب چھیل کر تھوڑا سا کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے پیچھے پلٹ کر جی کے آگے سر کا دی۔

”اوپاں۔ بہت اچھا کیا آپ نے۔“ ثاقب نے خوش ہو کر کہا۔ اور پھر جی کے ہاتھ سے سیب کو فخریہ بچہ کو دیتے ہوئے کہا۔

”اس نے صبح منہ دھوئے نہ دیکھا تھا۔“ میرے خیال میں ایک سیب ناکافی ہوگا۔“

”لیکن پیٹلے سے تو تھوڑے دیر پہلے ہی کھا گئے تھے۔“ فخریہ بچہ نے پہلی بار مصالحتہ سارو تیرہ بتا۔ اور پھر پلاندیہ کی سی

سہی جی کی طرف دیکھنے لگیں۔

جی نے سر اڑا کر انہوں میں ہلکے ہلکے گھونگر سے بڑے تھے۔

گوری رنگت اور کھڑے کھڑے سے نکتے پر سرنگ آونی سویر اور سیب کھاتے ہوئے پھول سے گالوں میں بڑے کڑھتے بڑے

لنگ رہے تھے کہ وہ کچھ دیر تک اس پر نظر ہی جمائے بیٹھی رہیں۔ ثاقب نے بھی انہیں جی کا ہاتھ دیکھتے دیکھتے لگا لگا کر ان سے ہر

”اچھا جی کڑیا۔ تم اپنا کھانا کھاؤ اور ہم اپنا۔“ لیکن وہ جگہ گزیرنے کا مقولہ ہے کہ لیدر زفرست تو پہلے آپ بسوا لند کریں۔“

جی نے بات کرتے کرتے وہ جی سے مخاطب ہوئے تو انہوں نے ان کی توقع کے برخلاف خاموشی سے پلاڈ کی ڈش اپنے آگے رکھی۔

”اس کا کام کیا صرف کڑیا ہی ہے یا کچھ اور بھی؟“ انہوں نے دو تین فوالوں کے چال اور اپنی پلٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر پلاڈ

کی ڈش ثاقب کی طرف رکھا دی۔

”ابھی تک توصیف کڑیا ہی ہے۔“ ثاقب نے اپنی پلٹ میں پلاڈ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر شامی کباب اور گیٹن کی تاجی پلٹ میں ڈالنے

کے بعد انہوں نے کہا۔

”اصل میں بڑے بڑگانی حالات میں ہماری یہ چھوٹی بہن ہیں سو نہی گئی تھیں۔“ پھر وہ خاموش ہو کر کھانا کھانے لگے۔

”تعب ہے ایک اتنی بڑی ذمہ داری قبول کرنے کے باوجود جی آپ نے اس کی کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی۔“ فخریہ بچہ نے لہذا

سر ہلنے شہادت کو پھر ہوا دی۔ ثاقب نے ان کی بات کی جہنمیں پیچھے منک و ثقیات کو محسوس کر کے کھاتے سے ہاتھ کاڈا کرتے

ناگوار سے لہجہ میں بولے۔

”تعب تو ہمیں ہوتا جیسا ہے ہمارا اور آپ کا بارہا طویل سالوں کا ساتھ ہے اس کے باوجود جی آپ ہماری فطرت اور مزاج کو

سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکیں۔“ فخریہ بچہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

گردن میں سوچا ضرور۔ ہونہر مجھ سے زیادہ بھلا آپ سے کون ذوق ہوگا۔ ثاقب کو ان کی یہ خاموشی بہت گھلی۔

”کچھ یاد بھی ہے ہماری شادی کو تین عرصہ ہوا ہوگا۔“ انہوں نے بڑے تھکی سے کام لے کر پوچھا۔

”یہ کوئی بات تیرے سال۔“

”نہیں بلکہ پورے چودہ سال۔“ ہماری شادی سٹھ میں ہوئی تھی۔ اور یہ سلاہ ہے۔“ انہوں نے تیز لہجے میں گویا جی کے آگے

نہی کی دیر پہلے کا ڈونگا اٹھا کر اپنی پلٹ میں کھاتے ڈال کر انہوں نے دست مال کے نیچے سے گرم جیاتی اٹھائی اور خاموشی

کے ذمے جانا کر کھانے لگے۔ مگر ان کے تیز تیار ہے تھے کہ وہ شد یہ قسم کی کوفت میں مبتلا ہوئے۔

فاخرہ بچہ نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور جگ سے گلاس میں پانی اٹھ کر آگے آگے بہتے

تھے۔

مگر وہ کھانے سے تیز تھوڑے دیر بعد ہی آپ کی نظر میں جھنجھٹا رہا۔ اور ایک ہم نہی کہ ہم نے

آپ کے بہت کئے تھے بلکہ وہ غلغلے کے باوجود بھی بڑا بھلا نہیں کہا۔ پھر انہوں نے آخری دو لے کھانے کے بعد گلاس میں پانی،

نیل کر اسے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

نیل کر اسے ہاتھ میں نہیں آپ کہ میں آپ سے زیادہ اولاد کی خواہش تھی ایسی تمنا جس کو آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اور ان کی اس

بات پہ فخریہ بچہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ گلاس بیوں سے لگا کر پانی پینے لگے تھے۔

"اے نہیں۔ مگر قبول افندہ کیا بات ہے۔ عذر و شف تو آپ نے مجھے پیشا ہے۔ یہ اتنی بڑی رقم کہ اسے کراہا ہے۔ یہ رقم میری ملکیت بن گئی ہے تو میں جی جاتی ہوں کہ اس رقم کو اس بچی کے اخراجات کے لیے۔"

"واہ تو کیا سہارا تھا کہ ہمارے منہ پر بار دینا چاہتی ہیں آپ؟ اور ثاقب ان کی بات کو جھوٹ سمجھ کر بھٹنا بنا باغ نہیں نہیں۔ آپ کی عطا کردہ چیز تو مجھے ہر شے سے عزیز ہے۔ میرا مقصد تو صرف یہ تھا کہ جب آپ نے اس رقم کو اس بچی کے لیے عطا کیا تو اس کی حیثیت سے میں بھی اس ذمہ داری میں شریک بن جاؤں گی۔ اور فخر و فخر نے تو اپنی اپنی بات کی وضاحت کی مگر ثاقب حسن کا دل ان کی اس تاویل کو ماننے پر آمادہ نہ ہوا۔ بڑے اصرار سے بولے۔

"بہر حال ہم نے تو اپنی طرف سے آپ کو ایک حقیر سا نذرانہ پیش کیا ہے۔ اب یہ آپ کی خوشی اور مرضی پر منحصر ہے اسے قبول کر لیں یا پھینک دیں اور پھر بھی کو ساتھ والی کرسی سے اتار کر ساتھ لے جانے لگے تو فخرہ بیگم طوطی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"مجھے بھی اس بات کا غم ہے کہ آپ مجھے ابھی تک نہیں سمجھے ثاقب حسن۔ ورنہ آپ اگر تھمتنا مجھے ایک سوئی بھی دیتا تو بھی میں بہت جیتی سمجھ کر حرجاں بنالیتی۔ یہ رقم تو پھر بھی بہت بڑی ہے۔"

"آجی! انہوں نے یوں کہا جیسے ان کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ فخرہ بیگم کو پھر مزید کہہنا مناسب نہ لگا۔ وہ بھی کچھ متوجہ ہو کر بولیں۔

"جی ہاں مگر اس بچی کے نام کا کیا مسئلہ ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی نام تو ضرور ہو گا اس کا۔"

"اگر سوچا بھی تو اب تک ہمارے علم میں نہیں آیا پھر انہوں نے بچی کی ٹھوڑی ادھی کر کے پوچھا۔

"بھئی گڑیا آخر تمہارا کوئی نام ہے یا نہیں؟" جواب میں بچی پیران کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا یہ کچھ بولتی بھی ہے؟" فخرہ بیگم نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ بولتی کیوں نہیں گرشا یہ اپنے موڈ سے ہی بولتی ہے۔ اور تھوڑا بہت سمجھ بھی لیتی ہے۔ اگر اس کا کوئی نام ہو تو تو فرما دیجئے انہوں نے بتایا۔ تب فخرہ بیگم نے بچی کے کپھول سے رضا کروا دیا ہستہ سے چھو کر اس سے پوچھا۔

"آہا بڑی اچھی بچی تو تم کیا نام ہے تمہارا؟" بچی نے کچھ دیر تک کبھی ثاقب اور کبھی فخرہ بیگم کو دیکھنے کے بعد کہا "چھل بت"۔

"ہائیں کیا شہرت؟" ثاقب نے پوچھا۔

فخرہ نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ وہ دیکھا کوئی نہ کوئی نام تو ضرور ہے اس کا۔

"ہاں تو پھر تمہارا بچی تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"چھل وت۔" بچی نے نام دہرانے میں خاصی دیر لگائی۔ پھر بھی دونوں مہیاں جوی کے پلے کچھ نہ پڑا۔

"اچھا دیکھو یہ کیا ہے؟" فخرہ بیگم نے دماغ پر زور دے کر بے حد فروٹ وٹش میں رکھے سیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بچی سے پوچھا۔ اصل میں وہ اس کا لفظ معلوم کرنا چاہ رہی تھیں۔

"جیہب۔" سیب کو دیکھ کر بچی کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

"معلوم ہوتا ہے سیب اسے بہت مرغوب ہیں؟" ثاقب حسن نے قیاس آرائی کی مگر فخرہ بیگم کے نام باجھل و تکرار حل کرنے میں ہی مصروف تھیں۔

"اچھا تو یہ سب کچھ میں بولتی ہے۔ چھل وت چھل وت۔ یعنی سل و ط۔ کیوں تمہارا نام سلوط ہے نا بچی؟" انہوں نے گویا کے نام کا استعمال کر کے بڑے فخر سے اسے انداز میں شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بچی سے پوچھا تو جواب میں بچی نے اثبات میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "مگر بالکل نیسا نام ہے یعنی عام نہیں ہے۔ اور میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اس بچی کا کچھ نہ کچھ نام تو ضرور ہو گا۔" فخرہ بیگم نے اسے خیر خاص ہو یا عام۔ مگر آپ تو بیکور کی نصیحت میں ماہر ثبات ہوئی ہیں کہ اس کا نام تو معلوم کر لیا۔ ورنہ تم تو جھل وٹ سے شاید عمر بھر نکل سکتے۔ ثاقب خوش ہو کر بولے تو اسی دیر میں فخرہ بیگم پہلی بار ذرا اٹھ کر بیٹھیں۔

"لو بھئی آپ کڑی وہ۔ وہ ہاں بھائی جان کی گود میں بھی تو جاؤ۔" بچی کے رویے میں چمک دیکھ کر ثاقب نے بچی ہونے کی کوشش کی مگر فخرہ بیگم ان کی بات ان سنی کر کے میز کی طرف پلٹ گئیں اور چھری بوا کو پیکار نے لگیں۔ تب ثاقب

اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔

سلوط کو گود میں لیے اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔ کراں کی اپنے بارے میں وضاحت پر جوی کے دل سے سارے ٹھکڑے مٹ گئے ہوں گے اور کراں کو سمجھ رہے تھے کہ ان کی طرف سے بدگمان اور شکوک نہیں اور اب اس انکشاف پر کوشش و ادنیٰ اولاد پیدا ہو کر فخرہ بیگم کو شیش سے ہی ان کی طرف سے بدگمان اور شکوک نہیں اور اب اس انکشاف پر کوشش و ادنیٰ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں کہ ان کے سلوط کے معاملے میں تو بالکل ہی ٹھکڑے مٹ گئے ہوں گے تو اس بات پر بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ والد کے طلب کرنے پر اندازے تھے۔ ایسا پورے تین ماہ گزار کر اسے بھی تو چھوٹی بہن کا درجہ سنا کر گناہ نہیں کرنا تب ان کے اور ثاقب کے زیر سایہ پروان پر واضح رہی اور اس میں شک نہیں کہ فخرہ نے اس کا پورا پورا خیال تو رکھا لیکن اپنی وہ ممتا اس پر بچھا ورنہ رنگیں جو ایک ماں اپنی اولاد پر کرتی ہے اور خود ثاقب بھی جو کچھ عرصے تک اس کی پوری پوری خبر گیری کرتے رہے تھے۔ مگر جب انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ فخرہ نے ذہنی طور پر بچی کی ذمہ داری قبول کر لی ہے وہ اس کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے تھے۔

سلوط خود جب گھبراہٹ میں تھی تو دونوں میاں بیوی نے بھائی اور بھانج کی حیثیت سے خود سے متعارف کرایا تھا۔ اور ان کی حیثیت سے نہیں۔ جب تک ناچھ تھی اس وقت تک اسے رشتوں کو سمجھنے کا شعور ہی نہیں تھا لیکن جوں جوں اس نے بچوں کو سمجھا اور بچی بولی گئی تو اسے رشتوں کا علم ہی نہیں بلکہ روتوں کا احساس بھی ہوتا گیا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بھائی نہ ہوں بلکہ بھائی کتنے محبت کرنے والے اور جان بھر کئے دے دے ہوتے ہیں مگر وہاں بھائی تو جی ہی سدا کی لکڑی کے برادے کی طرح خشک اور کھوری۔ مگر بھائی بھی کچھ عجیب غیر واسطہ اور بیگانے والے ہوتے تھے۔ شاید اسی لیے دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کے دل سے رشتوں کے لیے غم نہ کیا تھا۔ البتہ کھانا، لباس وغیرہ اچھا ہی مہیا کیا جاتا تھا مگر رنج و محنت کا تسنی بھی ہوتا ہے۔ بھائی بھانج کے بیچ سے سلوط پر وہ چپین ہی سے بچھ رہی تھی۔ یوں بھی ایک مرتبہ وہ آٹھ سو سال کی بچی تو فخرہ کے ساتھ ٹانگ پر جانے کی غمگین تھی جی اور اس غمگین تھیں جیسے میں اسے فخرہ بیگم سے ایک زمانے دار تھیں کھانا پڑا تھا کہ جس کی جوت وہ بڑی ہو کر بھی محسوس کرتی تھی۔

بھائی سے اس کا دور ہی تھا۔ کھانا کھانے کو کہہ دیا کہ وہ تو بھائی سے بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے اور ان کا مزاج بگڑا یا مٹا یا ہی رہا تھا۔ اصل میں تو بھائی اور بھانج کے دلوں میں کچھ ایسی کہیں بڑی تھیں کہ جو کھلنے کے بجائے دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ معلوم دونوں کے اسے کیا اختلافات تھے۔ جو کچھ بنتی ہی نہ تھی۔

اور یہ بات اس کی سمجھ میں بھی نہ آتی۔ اگر ایک روز اس کو اس سے واسطی پراس نے ان دونوں کی گفتگو سن لی ہوتی۔

گو بڑی بات اس وقت بھی محسوس نہ آتی تھی۔ بس اسی قدر پہلے بڑا تھا کہ بھائی کسی کاروبار کا آغاز کرنے کی غرض سے بھائی جان کو نامادین دینا چاہتے تھے۔ مگر بھائی کسی طور پر بھی اپنی جائیداد دینے کے حق میں نہ تھیں۔ اب اسے ایک معلوم تھا کہ کاروبار شروع کرنے کا فخرہ بیگم کو اب اظہار۔ اصل میں تو شروع ہی سے خود اس کی ذات و دنیا دہی ہوئی تھی۔

بہر گز۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات نے بھی بدلتا گیا تھا۔ بھائی جو ہمہ وقت گھر میں اینٹھنے نظر آتے تھے۔ اب ان سے معروف رہنے لگے کسی کئی روز تک گھر سے غائب ہی رہتے تھے۔

گوہا۔ ات چلے سے بھی زیادہ سدرہ گئے تھے۔

فخرہ بھائی جب بھی سادوں پر سے رعبادوں کو سمجھنے کی زندہ مثال بنی نظر آتی تھیں۔ اور بہت پریشان پریشان سی بہنے لگی تھیں۔

فخرہ بیگم کو بھی سدا سے ہی اتوں نظر آتا تھا۔

البرجیب سے ڈی ڈی ایڈا دیکھا گھر کے سنانے اور دریائے بھٹوٹی دیر کے لیے نجات مزدمل جاتی تھی۔

عالمی کا نو ذرا اب رستے کی ایک وجہ بھی تھی کہ بھائی اب دنوں گھر سے غائب رہتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ دو دو یا تین دو یا چار سو گئے وہ بھی نہیں ایک آدھ روز کے لیے ہی اور پھر نہ یہ بتا کر جاتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ اور بڑی اپنی بچی کے بارے میں کچھ کہتے تھے۔

کہ وہ بھی وہ فخرہ بیگم کے ساتھ ہی ڈی ڈی لاؤنچ میں بیٹھی کوٹڑہ پروگرام دیکھ رہی تھی کہ اس کے بھائی جان تعزیر بادو

کبھی کبھی وہ خالص پوری اردو بولتے تھے اور نہ ہی وہ لہجہ استعمال کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی — خیر —
 مٹی کا سی بائیں بھائی بھانجے تو کیا اس کی بے تکلف سہیلی نے بھی نہیں کی تھیں اب جو انہوں نے دیکھا

پھر کئی روز گزر گئے۔ بھائی نے کچھ کہا نہ بھائی نے ہی کچھ بتایا۔

استاذوں کے بعد تعطیل ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کا تمام وقت گھر میں ہی گزرتا تھا۔ بھائی نے دوپہر قبل
 لیا تھا کہ کلک کے علاقے میں ایک بنگلہ خرید کر اس میں آجسے بٹے۔ ملازموں کا تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اور یہ

اس روز وہ بھائی کے ساتھ لان میں بیٹھی سہ پہر کی چلنے پوری تھی کہ ایک لمبی سی خوبصورت کار گیٹ سے
 ہو کر عین ان کے سامنے روک کر پڑی۔ شاید کار چلنے والے نے ان دونوں کو لان میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے
 نے پورے کے بجائے کار وہیں روک لی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ تو وہ بھائی بھی اسے دیکھتی رہ گئیں۔
 دروازہ پوٹا چلا جسم اور وجہ چہرہ اور ایک شاندار سا وقار۔ گویا لیس یا لیس برس کا ہی لگ رہا تھا۔
 کو دیکھ کر بھائی نے بھائی بھی گھر سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔

وہ کار سے اتر کر سیدھا ان دونوں کی طرف ہی بڑھ آیا اور بہت ہی مہذب انداز میں دونوں کو سلام کر

اس نے پوچھا۔

”کیا شام قیام صاحب اس وقت گھر پر موجود ہوں گے؟“

اس کی نظریں سلوٹ پر پڑیں اور سوال وہ فخر سے کر رہا تھا۔

”جی نہیں۔ وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں لیکن اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو غالباً آپ اسے ایچ ڈرائی صاحب ہیں۔ فخر گیم
 نے ایک خلیق سی سکرٹ کے ساتھ پوچھا تو اس نے بڑے خوبصورت سے انداز میں منہس کر کہا۔

”ابو۔ اندازہ — غالباً اور اسے۔ ایچ ڈرائی صاحب۔ بڑا طول کھینچ دیا آپ نے تو صرف ڈرائی ہی کافی تھا۔ ویسے

اگر میرا اندازہ بھی غلط نہیں تو غالباً آپ بھی مہتر حسن ہی ہیں۔“

”جی۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً۔ لیکن آپ تشریف تو رکھیں۔ فخر گیم نے شہر کی گفتاری کی حد توڑتے ہوئے کہا تو سلوٹ کو اپنی مات
 پر کی آٹھوں پر بھی تکیں نہیں آیا۔ اس کی بھائی کسی سے اس قدر مروت اور اخلاق بھی برت سکتی ہیں۔ یوں بھی ان کے چہرے
 پرانی گفتگو پہلی بار دیکھنے میں آتی تھی۔

”شکر ہے مہتر حسن تشریف رکھنے میں مجھے کوئی تامل تو نہیں۔ لیکن چند منٹ بعد ہی میرا کسی سے ایک ضروری اپنا منتھٹ ہے اس
 لیے معذرت۔ اس نے بڑی شائستگی سے معذرت کی۔

”نیک پیر ڈرائی صاحب۔ یہ بات ہمارے دستور کے خلاف ہے کہ مہمان دروازے سے جھانک کر ہی واپس چلا جائے
 آپ اسے ایک کپ چائے پینے کے عرصے تک تو رکنا ہی ہو گا۔ فخر گیم نے مہتر حسن کے انداز میں بولیں۔

”نیکس دروازہ تو بہت پیچھے رہ گیا۔ میں تو ان تک جھانک چکا ہوں۔ یوں بھی یہاں آتا تو اب مجھ پر فرض نہیں فرض ہو گیا
 ہے۔ اس نے پھر کسی روز منہ فرمانہ ہو کر کہا۔ اس وقت تو معاف کر دیں۔ وہ بھی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری کے شیر سے میں ڈوب
 چلا۔

ابھی چائیں معاف کیا بشرطیکہ وعدہ جلد ایف کیا جائے۔ فخر گیم نے منہس کر بولیں۔

جی ہاں ضرور بلکہ جلدی۔ ابھی غلام حافظ۔

وہ پھر اپنی مجلس میں تھا کہ اس کی دم چلا گیا۔ اور وہ جو اپنی بھائی کے قریب لان چہرے پر بیٹھی بھائی کی شہر کی کلائی اور خوش اخلاقی

خندہ پیشانی سے ایک انہی اور غیر دے کے ساتھ پیش آنے پر بھی ابھی تک درخت حیرت میں غوطے کھا ہی تھی۔ بھائی کی کڑوا
آواز اور شونت بھرے سے لہجے سے اس کی بڑی طرح چونکی جیسے بحر حیرت میں اچانک اٹھنے والے کسی تھیرے سے اٹھنے والے بھائی
پھینک دیا ہوا۔

”کتنی مرتبہ کہا ہے کہ کسی غیر دے سے سامنا ہو جائے تو ٹھکر چلی جائے گا۔ لیکن تم نے شاید بے غور قیام پر ہی ہمارے
میری کسی بات پر کان ہی نہیں دینے۔ اب دو دو چھٹی بچی تو نہیں تم۔ بائیں بچی ہو۔ آج تمہاری شادی کروں تو کل تمہارے
گی۔ بھائی تم۔“

اٹ بھائی نے تڑا بھی تھا تو بھلا کس طرح کہ ان کے آخری فقرے پر وہ گورہ گئی۔ کہ ماں نہ تو بڑی بات اس کے
گمان میں بھی شادی کا تصور نہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو سخت اور غم سے چہرہ جھکائے مٹی سی بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر اندر چلے گئی تو
نے پھر کہا۔

”اب اندر جانے سے فائدہ۔ البتہ آئندہ اس بات کا خیال رکھنا۔ اور ہاں اب گھر میں بیٹھ کر موزا زاری کی تہمت عاقل
میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے لکھانے کی فائل نہیں ہوں۔ اور جو اب میں چپ چاپ ہے کہ کسی پریوں بیٹھ گئی جیسے کسی میں تھا
جو جس نے فوراً اسے یقینی کیا ہوا۔

”میں تمہاری ماں تو نہیں ہوں لیکن میں نے تمہاری بروش مزدور کے ہے اور مجھے یہ بالکل گوارا نہیں کہ گھر گرجی کے معاملہ پر
پھر کھلائی جاؤ یا نہاں ہاں سے میں لوگ غلط فہم نہیں۔“ بھائی نے صاف انداز میں بولیں۔

”میں تمہاری ماں تو نہیں ہوں۔ یہ فقرہ تو وہ پہلے ہی کئی بار کہہ چکی تھیں۔ گویا وہ اس فقرے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس نے
یہ بالکل نہیں کھلا تھا البتہ جب پہلے بار انہوں نے یہ فقرہ استعمال کیا تھا تو اسے بہت افسوس ہوا تھا کہ وہ کاکوئی نہاں چھٹی نہیں
تھیں۔ خود بھائی بھی اس سے ایسے بے نیاز تھے کہ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی ہوشیار یا پھر دارالامان جیسے ادارے میں
گزارتی آئی ہو یا پھر اس کے سرپرست اس کے لیے بالکل غیرادب و غلطی سے ہوں۔

اسے افسوس تھا تو صرف تعلق کو خیر باد کہنے کا۔ اور بھائی نے تو اب کہا تھا جب کہ اسے تو بھائی کی گفتگو سے بہت پہلے
گیا تھا کہ اس کا مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی پورا نہ ہو سکے گا۔ اس معاملے میں شدید تو بڑی چیز وہ بلا سا اجماع بھی نہ تھی کہ
میں ایک مرتبہ کسی بات پر فکیر کرنے پر اس نے بھائی سے تھپکھٹا تھا۔

اسے تو اس کے حالات نے چھوٹی سی عمر سے ہی بہت حساس بنا دیا تھا۔
ذہانت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔
حالات کو سمجھنے کا پورا پورا شعور بھی رکھتی تھی۔

البتہ سڑکار اور چالاک بالکل نہ تھی۔
اس کی محرومیوں نے تو اس کے منہ پر چپ کی مہر لگا دی تھیں۔

وہ خاموش ہی نہیں رہتی تھی بلکہ سے دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی گنگ بوند کی چیز
ہیں زندگی کو ایک مجبوری اور محسوس ہوتی تھی کہ اس کے گھٹنے پر محسوس کرتی تھیں۔

جب کہ فخرہ بیگم اس کی خاموشی کو اس کے گھٹنے پر محسوس کرتی تھیں۔
کتنے افسوس کا مقام تھا کہ صرف ایک شے کی بنا پر انہوں نے اپنے دل میں چھپے منہ کے لازوال جذبے کو بھی نہیں
اس پر وہ کچھ فطرتاً طور پر مزاج اور اکل کھری بھی واقع ہوئی تھیں اور کچھ اس اچھ اور ضد کی بھی وجہ تھی۔ ایک مرتبہ
کو تیلی کرنے کی خواہش کے سلسلے میں انہیں ہو گئی تھی کہ وہ اپنے کے باوجود بھی سلطوی طرف منتقل ہو سکی تھیں۔

کے مردار سے مراد رویت اور بھائی کی غفلت اور بے اعتنائی تھی جس نے سلطوی کے معصوم سے دل اور احساسات کو
نکد پہنچائی تھی کہ کچھ دیر سی ہو کر وہ کئی بھی اور شاید اپنے حالات نے اسے بہت حساس اور با شعور بنا دیا تھا۔ وہ اپنی
پھرت اور لڑپن اس میں بالکل نہیں تھا اور دوسرے ماحول ہی کچھ ایسا خشک اور بیگانہ سا لگتا تھا۔ اس نے اپنے
کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہ تھا۔

بھائی نے یہ کہہ کر اب تم گھر میں بیٹھ کر امور خانہ داری کی تربیت حاصل کر لو گویا اس کی تعلیم کا سلسلہ متعین کرنے

ہے۔ میں دو ٹوک فیصلہ کر دیتا تھا کہ بھائی سے زیادہ بھائی کی تقریباً ہر بات یا فیصلہ حرف آخر کی طرف ہی ہوتا تھا اور
میں جب کوئی داری کی تربیت حاصل کرنے کا سوال کرتا تو بھائی نے تو اسے سلطانی بنائی کر دیتی اور کو شہرہ درگ سے لے کر
میں نے سلطانی اور کھانا پکانا سب ہی کچھ سمجھا رکھا تھا۔ پھر وہ مزید کس قسم کی تربیت دینا چاہتی تھیں۔ یہ اس کی سمجھ میں ہی
تھی نہ تھی۔

بلکہ دوسرے معنوں میں امور خانہ داری کی تربیت حاصل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ بھائی اور خصوصاً
بھائی کی مٹی و نہایت تھی۔
میں میں چند ماہ سے درانی صاحب کی گھر میں آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور ان کی آڑ بھگت اور خاطر مدارات
کرنے میں وہ شاید اسے تربیت دینا چاہتے تھے۔

بھائی نے گھر کے منہ پر اسے سو پھ دینے تھے۔
پھر تعلیم کو خیر باد کہنے کوئی تین یا چار ماہ کی گزرے تھے جب ایک روز درانی صاحب کو نصحت کرنے
کے لیے اسے گھر کے سامنے کھانے کے لیے کھانے میں بلا کر ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے لیے پوچھا۔

”کچھ مائی بھی میری درانی صاحب جو آج کل شب و روز ہمارے گھر میں دیکھے جاتے ہیں کون ہیں؟“
بھائی کے سوال کرنے کے انداز میں معنی نیازی بھی تھی اور تھوڑا سا خوف بھی۔ مگر جب اسے درانی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہی
دیا۔ ماں اس کے کہ وہ گزشتہ دو تین ماہ سے تقریباً ہر دو سرے سے اس کے بھائی کے پاس آ رہے تھے ان کے دوست تھے
اور ان کی بات و دم میں ہر دو بیٹھ کر اپنی خاطر کرانے کے ساتھ ساتھ بھائی اور بھانجے سے باتیں کیا کرتے تھے اور وہ بھائی کی
تہنید کچھ کچھ نوان کے سامنے۔ نہیں پڑی تھی۔ البتہ بھائی کو کبھی اس کی موجودگی کا خیال آتا تو وہ اسے بھی کھانے میں شرکت کے
کے لیے بلواتے کرتے تھے اور انہوں نے اسے درانی صاحب سے متعارف کر دیا تھا۔ وہ بھی بے حد سحر سی طور پر۔ تو پھر وہ جیسے بھائی کو کچھ
بتاتی۔

”شکر ہے انہیں ڈھب کا کوئی پار نہ تو ملا۔ خاندانی بھی اور ہم وطن بھی۔ کم از کم ان لوگوں کی طرح۔ ضمیر فروش اور لیے ایمان
نہیں۔“ بھائی نے خاموش دیکھ کر خود ہی بڑبڑائیں۔

”میں ان لوگوں کی طرح بھائی جان تمہا نے کچھ اور کوئی نکر اس کے ہونٹوں سے یہ سوال پھسل گیا۔ جب کہ بھائی کی کسی بات پر
وہ کوئی سوال کرنے کی عادی نہ تھی۔

”ہائیں۔ کسی لوگوں کے بارے میں ہو پھر دی ہو تم۔ میں تو درانی صاحب کی بات کر رہی تھی نا۔ صاف ظاہر تھا بھائی نے
اس کے سوال کا جواب گول کر دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنے سوال پر بغیض سی ہو گئی۔
”درانی صاحب تمہارے بھائی جان کے خیر نفس پار نہ رہیں۔ بڑے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ بلند شہر کے رؤسا
میں سے ہیں۔“

بھائی انا کہ کچھ خاموش ہو گئیں۔ اور چونکہ اس کے لیے یہ معلومات دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ اس لیے اس نے بھائی
کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔

پھر یہ حال بہت نرغوس اور مذہب انسان میں اور نہایت اعلیٰ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر عزت کا کوئی احساس
نہیں ہوتا۔ بھائی نے درانی صاحب کے اطوار اور شخصیت کے بارے میں مزید انکشاف کیے۔ اور اتنا اندازہ تو اسے
پتہ تھا کہ بھائی سے زیادہ بھائی درانی صاحب کی شخصیت اور حیثیت سے بے حد متاثر اور مرعوب ہیں۔ گویا بھائی کا درانی
صاحب کے بارے میں اس قدر طب العنان ہوا تھا کہ اس کے لیے تعجب کا باعث نہ تھا اس لیے ان کی اس بات پر بھی اس نے
کوئی توجہ نہیں دیا۔

”کچھ بارے میں پالیس کے جیل میں ہیں پھر بھی اب تک مجرور زندگی ہی گزار رہے ہیں۔“ بھائی نے ذرا سے توقف کے بعد پھر کہا۔
”میں نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہاں انڈیا کا تو معلوم نہیں لیکن یہاں پاکستان میں تو ان کا دور روز دیک کا کوئی عزیز ہی موجود نہیں
ہو سکتا۔ میں ان کی کچھ مدد ہی کر سکتا۔“

بھائی انا کہ کچھ بات کر رہی تھیں۔ یہ معلوم اسے سنا نا چاہ رہی تھی یا درانی صاحب کی ہمدردی میں کہہ رہی تھیں۔ وہ
کوئی توجہ نہ کر رہی۔ بھائی بھائی درانی صاحب سے اس کا کوئی واسطہ تھا نہ نسبت جو بھائی کی باتوں پر اسے کوئی جھنجھو ہوئی۔

صلوٰت جہاں کی بینی اور شوکت جہاں جیسی بد حصلت اور شقی دل عورت کی نوا سی جو جس نے ایک بقی کو ماں کی جگہ پر رکھا۔
وہ کر جان سے مار دیا اور دوسری بونی کو چھین کر ماں کو قبر میں اتار دیا۔ پھر بونے کی خواہش میں نئی جو ہو گیا کر لائی لیکن پھر اسے
دل میں ایسے خاک کا پوند نہ ہو سکی۔ یہ ہوتا ہے خدائی عذاب۔ کسی بے گناہ پر ستم توڑنے کا نتیجہ اور وہ مسعود الحسن جو ستم سے بچا ہوا
نیک خانہ میں مبتلا رہ کر مرے بھی تو ایسے کچھ ہری کے عالم میں کہ کوڑی کو ٹھنڈی ہو گئے۔ باب کی عیاشی میں اڑائی ہو گئی۔
چچا زاد اور سوتیل بھائی قابض ہو گئے تھے۔ اتنا اٹا نہ بھی نہ چھوڑا کہ بیٹوں کو اچھے گھرانوں میں بادیہ رہے۔ اصل میں وہ
بڑا اتھا مسعود الحسن پر۔ امی، جانی، اماں، آپا کا اور ماں کی کہ آپا کاظمی تو امی جان اور اماں کو لے بیٹھا تھا جس کی
بدمرئی کے بعد گریسے دو دنوں فوت ہو گئے تھے اور پھر آپا بھی۔
وہ سانس لینے کو ذرا رکے — پھر بولے

اور پھر وہ اپنی زندگی کے سب سے زیادہ کریناک اور اذیت ناک تجربے سے دوچار ہوئی۔ ہاں۔ وہ ایک تجربہ کیا تو ہے
 شادی کے بعد قیصر شاہ بر لکی کو گزرنے لایا کرتا ہے اور جو — شوہر کے یا بھی نشانات، اظہارِ رضا اور جذباتوں کی شدت
 سے مزین ہوتا ہے۔
 سرگرمی کے طرف تھا۔

”جی ہاں اس کے منہ سے خود بخود نکلا۔

”ہوں۔ انہوں نے کہا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولے۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ میں نہیں طلاق نہیں دوں گا۔ لیکن تم یہ سمجھنا کہ میں نے تمہیں طلاق دے کر تمہاری عزت برباد کر دی ہے۔ مگر تو پہلے سے میرے بنے بنائے ہو گرا میں شامل ہے۔ دیکھو بانی داوے کیا کہ اپنی پوری زندگی ایک بڑے بڑے ساتھ نکاح میں بندھے بندھے آسانی سے گزارا کوئی؟ ہر سوال ہی میسر نہ آئے گا۔ اس کی کچھ بھی نہ آئے والا۔ اس لیے اس نے وہ خاموش رہی۔

”دیکھو یہ مذاق ہے نہ تمہاری قوت برداشت کی آزمائش بلکہ اس معاملے میں میں بہت سنجیدہ ہوں۔ میں نہیں مانتا کہ میں تمہیں چاہتا ہوں بلکہ صاف صاف بتا دیتا ہوں کہ میں اس وقت تمہیں ہمیشہ کے لیے تمہارے لیے چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اب تم میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ میں ہی تمہارے پاس آؤں گا نہ تمہیں بلاؤں گا۔ یعنی تم کو اب ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ رہنا ہو گا۔ مگر تم میرے ساتھ میرے ساتھ رہنا اور ہاں بچوں والا آدمی ہوں۔ میرے پاس میرے لیے بہت کچھ ہے۔ اور نہ یہ سب تمہاری بات ہے۔ مگر تم میری منگواؤ۔ اور تم کو محتاط ہو کر رہنا پڑے گا۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری عزت برباد ہو جائے۔ یہ فائدہ اٹھا کر تمہارا دلجوئی بھائی تمہارا سودا کر دے گا۔“

”اُف درانی صاحب یہ کیا کہہ رہے تھے۔ کہ ان سے بھٹکا راجا حاصل ہونے پر طمانیت کے احساس کے ساتھ ساتھ وہ مضطرب ہی ہو گئی۔ یوں بھی جس گھر سے ہمیشہ کے لیے خلاصی ملی تھی اس گھر میں دوبارہ ہمیشہ کے لیے واپس جانے کا خیال بہت تکلیف دہ اور غمناک تھا۔ تو وہ درانی صاحب کے گھر کو بھی سمجھتی تھی جہاں کم از کم ان چاندنیوں میں بات بات پر روک ٹوک اور خطرے کا کوئی نہیں تھا۔

وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئے تھے اور وہ اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سن کر مہر بہ لب۔ مگر جب انہوں نے اند جانے کے بجائے اس کے بھائی کے منگنے کے باہر کی کارروائی تو فوکلومی کے سے انداز میں بولے۔

”آپا کو بھی صرف ان کے کہہ پڑوں میں نکلا لگتا تھا اور پھر جلد ہی پھر جیڑا پھرتا تھا۔ مگر یہ کہہ کر وہ روت۔ بلکہ یہ کہہ کر وہ روتی گئی تھی۔ ابا میں نے تو اپنی سبب شرافت اور کم ہمتی کی وجہ سے آپا کا حق انہیں واپس دلوانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی مگر میں۔ اور پھر وہ ایک دم ہی اس سے مخاطب ہو کر بولے۔

”وہ پچاس ہزار کی رقم، زیورات کے جھرمٹ اور دائیں چوڑے ہی تو تھی نا تمہاری کل جمع پونجی۔ تو کہہ دینا اپنے دوستوں سے کہ میں ان سے بھی نہیں زیادہ بڑی چوٹ دے چکا ہوں۔ وہ اسمگلنگ کے کاروبار سے حاصل کی ہوئی باون لاکھ روپے کی دولت ہے۔ وہ بھی میری تحویل میں آچکی ہے۔ ابھی دو بجے کی فلائٹ سے برونی مالک کی میر کو جارا ہوں۔ لہذا مجھ سے رابطہ قائم کر لیتے۔ تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ سو دی ثابت ہوگی۔ اچھا۔ اب تم چاؤ۔ ہاں۔ مگر ایک منٹ۔“

انہوں نے اپنی بات کہتے کہتے دوش پوز میں ہاتھ ڈال کر ایک موٹا سا بار اٹھایا اور پھر اس سے مخاطب ہو کر بولے۔

”وہ لوہیہ کنٹینر سمجھنا لو۔ میں نے تمہیں رونما ہی نہیں دیں نا۔ اگر ہوسکے تو اسے سہاگ کی نشانی سمجھ کر اپنے پاس رکھنا۔“

اور پھر انہوں نے اگلی ہی لمحے وہ کنٹینر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ مگر اس نے وہ کنٹینر باہر اترنے سے قبل ہی اپنے گلے سے اتر کر زمین پر پڑ گیا۔ اور پوری قوت سے ٹوڑ کر ان کی گود میں پھینک دی گئی۔ اور بھاگتی ہوئی گیت کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ بھاگ کر گیت اندر چلی آئی تھی۔

غم دھننے اور کھسیا ہٹ کے بدلے اس کی آنکھوں کے آگے زمر سے سے ناچ رہے تھے۔

پورچ کی بالائی سیڑھی تک آئی تو پورا کر دیں گر پڑی۔

آخر باون لاکھ روپے کی رقم۔ زیورات کے جھرمٹ۔ پچاس ہزار اور انچی بربادی کوئی معمولی چٹ یا چھوٹا نقصان تو نہیں تھا۔

کریسٹینا نے وہ عجیب و غریب تجربوں سے دوچار ہوتی رہی تھی۔

کریسٹینا نے وہ عجیب و غریب تجربوں سے دوچار ہوتی رہی تھی۔ جن میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور ذہنی کا سرور اور انتقامی سارو یہ تھا۔ اور انہوں نے اب جتنی بھی باتیں کہیں۔ وہ محض دھمکی باز اور انوکھیں ہو سکتی تھیں۔ بلکہ ہر بات حقیقت اور صداقت پر مبنی تھی۔ اس لیے اس کا تورا کرنا بہت مشکل تھا۔

دن کا پھر صبح سا تھا اور گھر میں ہمیشہ کی طرح آبی بول رہا تھا۔ یوں بھی یہ گھر کے کینوں کے آرام کرنے کا وقت تھا۔ تو کراچی اس وقت کہیں اور صبح صبح ایسا نظر آئے تھے۔ اسی لیے اسے کسی نے گیت سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

گرتے۔ وہ خود ہی تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو کراچی ہوئی اٹھی اور کال بل پر انگلی رکھ دی۔ تب بھی۔

غامی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اور بھائی اپنے چہرے پر ناگوار سے اشارات لیے سامنے ہی کھڑی نظر آئیں۔ گو پوسے چار روز سے پٹ کر اس کی حرکت دینے پر وہ دل میں دو دنوں سے سخت کیدہ تھی۔ پھر بھی باون لاکھ روپیہ دھب جانے کی بات تھی۔ اس نے بھائی کو سلام کیے بغیر ہی بے تابا نہ پوچھا۔

”بھائی جان کہاں ہیں۔“ اور پھر اگر تم اپنے بھائی جان سے ہی ملنے آئی ہو تو پھر کسی وقت آجنا کہہ دو۔ اس وقت تو وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔ بھائی نے

”اُف۔“ اور وہ بھائی جان یا یہ طعن و تشنوں کا موقع نہیں ہے۔ جلدی بتائیے کہ بھائی جان کہاں گئے ہوئے ہیں۔“ وہ بھائی کے سامنے پہلی بار پوری جڑھا کر بڑے برہم سے انداز میں بولی۔

”مگر تم جانتے ہی کیوں ہیں جو یہ معلوم ہو کہ کہاں گئے ہیں۔ لیکن تم خاص طور پر انہیں کیوں پوچھ رہی ہو کیا میں کسی قابل نہیں۔“ بھائی کے لیے سے اب شکوہ سامنا تھا۔

”میں بھائی جان یا یہ بات نہیں۔ بلکہ وہ مکار اور فریبی شخص ہیں چکر دے کر چلا گیا ہے۔ وہ بھائی جان کو۔“

”کون کون چلا گیا ہے۔“ بھائی نے اس کی بات قطع کر کے پوچھا۔

”وہی درانی بھائی جان۔ وہ میری زندگی بھی برباد کر گیا ہے۔ اور پھر وہ بھائی سے لپٹ کر روئے لگی۔“

”یہ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم گڑیا۔“

بھائی نے بھی زندگی میں پہلی بار اسے خود سے لپٹا کر اسے گڑیا کہتے ہوئے پوچھا تو اس نے رو کر دہریں داخل دہریں دہریں پر ہونے کو کہنے لگی۔ انہیں ساری بات بتادی۔ اور باون لاکھ روپے کا سن کر بھائی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اسے لے کر۔

میری اسے کہنے کی طرف بھاگیں۔ اور فون پر اس جگہ جہاں ثابت جن کے موجود ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ درانی صاحب نے اپنی فلائٹ کا وقت دیکھ ہی بتایا تھا۔ اور وہ چاہے وہی تھیں کسی نہ کسی طرح۔

تاہم بھائی کو پورے پچاس ہزار لگے۔

نہ نہ بہت باہمی رشتہ جو یہ اور پورے چلی جائیں لیکن۔ تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی تمام ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی اور اب وقت ہی نہیں آیا تھا۔ ان کی کوئی شے شامت ہی آتی تھی۔

ثابت حسن ان دنوں کو شدید انتظار کی ادب سے گزار کر شام کو لوٹے تھے۔ اور بیوی کی زبانی ساری بات سن کر پہلے تو۔

”میں نہیں جانتی۔“ تھا کہ جب سلوٹ نے رو کر اصل بات بتائی کہ انہوں نے اپنی بہن کا انتقام اس سے لیا ہے اور باون لاکھ روپے ہونے پر ان کی رقم غمگین کرنا۔ بھی انتقام کا ہی ایک حصہ ہے تو وہ دل پر ہاتھ رکھ کر جب تک گئے تھے۔

مگر یہ دل کا درد نہ تھا بلکہ وہ شاک تھا جو اتنی خطرہ رقم لٹ جانے پر انہیں پہنچا تھا۔ بہر حال پھر اس کے سامنے کے بعد۔

تاہم جس نے درانی کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ بلکہ نہ تو کوشش کر لی لیکن درانی انہیں نہیں مل کر دیے۔

نہیں۔ ہماری فیملی بھی ساتھ جاری ہے۔ بھائی نے اپنی ساوگی میں کہہ دیا۔
 چلیں میں آپ کو اس کے گھر تک چھوڑ دوں۔ اس نے انہیں ڈراپ کرنے کی پیش کش کی۔
 نہیں بے شکریہ۔ ابھی تو ہم کو بہت سے کام منائے ہیں۔

بھائی نے بھینچا چھڑانے کی غرض سے یہاں نہ گھبرا۔ تب وہ ان سے ہاتھ مل کر چلا گیا۔ اور بھائی نے اپنے گھر میں اندری اندر انہیں خوف ساد میں گہرا کیا۔ وہ جلد جلد سلوٹ کا ویزا حاصل کرنے کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا۔
 کو گھر سے نکلنے تو بڑی سختی سے تاکید کر کے جاتے کہ ان کی غیر موجودگی میں خواہ کوئی بھی ان سے ملے نہ سکے۔ دروازہ کھول کر جواب ہی دینا۔ دو مہینے تو خیریت سے گزر گئے اور کوئی غیر معمولی غیر واقفہ نہ ہوا۔ مگر جو بھی شب آگے رات گنگ جگ، گھبراہٹ میں سوئی ہوئی سلوٹ کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ سیاہ بڑوں میں دو قد آدمی اس کے بنگ کے دروازے پر کھڑے تھے۔ جن پر نظر پڑتے ہی خوف و دہشت سے وہ چلنے لگے۔ ایک نے اس کے زیادہ چپنے ہڈے کا موقع نہیں دیا۔ ایک نے اس کے منہ میں کچھ مٹھنسا اور دوسرے نے اسے کون جگر پر چڑھ کر پھر بھی مزاحمت کے طور پر زور زور سے ہاتھ پیر جھلنے لگے۔

یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ رات قب میں اس وقت بیت الخلا جانے کی حاجت محسوس ہو گئی تھی۔ اور وہ جوتی میں بیڑ ڈال کر اٹھے ہی تھے کہ کچھ انہیں سلوٹ کی چھین سنا دیں۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر وہ اپنے کپڑے بدل کر پھر پواسٹول رکھ کر سوئے تھے۔ بہن کے چپنے چلائے کی آواز آئی تو وہ ریوڑ اور لے کر اس کے کمرے کی طرف دوڑے۔ انہیں وہ دونوں آدمی سلوٹ کو اس کے کمرے سے باہر نکال لائے تھے۔ بھائی نے نزدیک آکر ہوائی فائر کی آواز سن کر مسخ دیکھ کر سلوٹ کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بھائی نے بعد میں آکر یہ سہکا مدد دیکھا تو بڑی سناٹیں۔ اسے خوب بڑا بھلا کہا اور اس کی خوبصورتی کو ان بار بار دیکھ کر کاؤنڈر اٹھایا۔ اس روز تو بھائی بھی بھائی کی بات کے قائل ہو گئے تھے۔

وہ خود بھی اپنی خوبصورتی سے سخت نالاں تھی۔
 کہ اس کی خوبصورتی ہی اس کے لیے جان کا وبال بن گئی تھی۔

یوں بھی دیکھتے ہیں ہی آپا ہے کہ قدرت کو کسی کو بڑی فیاضی سے کسی نعمت سے نوازتی ہے تو دوسری غیر متحمل سے غریب ہی رکھتی ہے جیسے کہ اسے رکھا گیا تھا۔

ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور بہن بھائیوں کے پیار و اخلاق سے اور پھر — وہ بھائی کے لیے ساپ کی چھوٹی بھائی بن گئی تھی کہ اگلے بیتی نہ بھٹکتے۔

تب بھائی اور بھائی نے خاصی سوچ بچار کے بعد سوجھ بوجھ میں مشورہ کیا اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر اپنے منہ بھائی شعیب منصور کے پرانے ملازم غنظ علی کو ملا کر سلوٹ کو بھائی کے پاس چند ضروری ہدایات کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور خود ہی کو لے کر اندر چلے گئے۔

تو یہ تھے وہ معاملات۔
 واقعات یا باتیں جن سے وہ کوشش کے باوجود اس قدر کاہ نہ کر سکی تھی یوں بھی ایک تو بتانے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا دوسرے ہوا تو بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اسے کتنا چاہتے لگتا تھا۔ اس کا اندازہ بھی اسے اب ہوا تھا اور وہ خود بھی دماغ مند رہیں اس کی صورتی سہا کر بیٹھتی تھی۔

پھر بھلا اس دل اور کس منہ سے تپاتی کہ اس کی زندگی کو ایک ایسا المیہ پیش آیا ہے جس سے اس کا پورا مستقبل بھی تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بلکہ میرے سے اس کی پوری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ اور اپنی پوری کتنا بیان کرتی آسان بھی تو نہ تھی اگرچہ اتنا ہی کہ اتنا ہی کاروائی کے نتیجے میں اس کی یہ درگت جی ہے تو شروع سے انتقام لینے کی وجوہات بھی بیان کر رہی تھی۔ بھائی کے ناجائز اور غیر قانونی کاروبار پر بھی روشنی ڈالنی پڑی اور پھر سب سے بڑھ کر اپنے بارے میں جی تپا نہ تھا۔ جبکہ اپنی طرف سے ہی وہ مطمئن نہیں تھی کہ کچھ اپنے بھائی کی سلی بہن سے یا پھر بھائی بیوی کی اولاد کی حسرت پوری کرے۔ غرض سے اسے کسی یتیم خانے سے اٹھا کر لائے تھے۔ اور پھر کس دل سے اس قدر شدید اور مصیبتی جذبہ

ہو سکتا کرتا۔
 جو حالات کے اس قدر سنجیدگی اختیار کر گئے تھے کہ بتائے بنا کوئی چارہ ہی نظر نہ آ رہا تھا۔ بلکہ اس مرتبہ تو اس نے مذاق پر ہنس دیا۔ وہ اماں جان رسولی گیم۔ کو سب کچھ بتا دے گی۔ اور پھر اماں جان اسفند کو سارے معاملات سے آگاہ کر کے سوتی پڑا۔ وہ اماں جان بھی ریں کی کہ اس کا خیال چھوڑ دے۔ اور یوں سانب بھی مچھانے گا اور لاٹھی بھی نہیں لوٹے گی۔
 یہ بھی طرح بھائی بھی ہے تو اسفند میری رو داد میں کر لیتا تھا جسے کنارہ کشی ہو چلے گا۔

وہ اس کا جذبہ بچا ہی ہے تو اسفند میری رو داد میں کر لیتا تھا جسے کنارہ کشی ہو چلے گا۔
 وہ اپنے رشتہ روز سے مسلسل سوچنے سوچنے سے یہی ایک کارگر نہ ہو سچو بھی تھی اور اگلے روز وہ اماں جان کو سب کچھ بتا دینے کا حکم دیا کہ اس کے بچے پر سکون سی نظر آ رہی تھی کہ اس کی قسمت نے یہاں بھی اس کی سوچی سمجھی تہ پر پچاک پیر دیا اس روز بھی یہی ملتان سے اماں جان کے بھائی کی سخت عملات کا تار موصول ہوا تو اماں جان نے ایک ٹوٹا لے کر بغیر فوراً درخت سرخاندہ لیا۔ کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک ہی تو بھائی تھے ان کے۔ جو انہیں جان سے بھی — زیادہ عزیز تھے۔

وہ پریشانی میں روٹی ہوئی اسے یہی نقشہ کام چھوڑ کر سر پیر کی ٹرین سے ملتان سدھار گئیں۔
 ان کے جانے کے بعد ایک طرح سے تو وہ بالکل ہی تنہا رہ گئی تھی کیونکہ ننھا کا ٹوٹا بھی ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ دن کے وقت تو کبھی کبھی کوڑھی آجاتی تھی اور نازش بھی لیکن رات کو تنہائی کا احساس بہت بڑھ جاتا تھا۔ اور وہ اتنی محتاط ہو گئی تھی کہ ہمیشہ دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا کر بیٹھتی تھی کہ اسفند کی طرف سے اسے اطمینان نہیں تھا کہ کب اس کا منہ اٹھے اور وہ بے دردی کرے میں چلا آئے۔ کہ وہ ہمیشہ ہی اس سے بہت فری ہوئے کی کوشش کرتا تھا اور بڑی بے باک طبیعت کا مال تھا۔ کسی کی موجودگی کا خیال نہیں کرتا تھا۔ نہ کسی مصیبت کو ہی خاطر میں لاتا تھا۔

تو اب تو وہ بالکل تنہا تھی۔
 اور تنہائی کا تو وہ عرصے سے خواہاں تھا۔
 بس اس وجہ سے وہ اس قدر احتیاط برتی تھی۔
 حتیٰ کہ اس سے سامنا ہونے کا امکان نہ ہوتا تو فوراً ہی کہیں چھپ جاتی۔ تاکہ ہمیشہ کی طرح وہ اسے دیکھ کر بے قابو نہ ہو جائے۔

اگر اس سے بھی سامنا بھی ہو جاتا تو یوں لا تعلقی اور بیگانگی بن جاتی جیسے کوئی واقفیت یا جان پہچان ہی نہ ہو۔
 اور ادھر وہ تھا کہ اس کی ان احتیاطوں اور گریز پر چپکے چپکے مسکراتا رہتا تھا۔

دیر کا سانس اور پورے نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اور وہ جہاں تک آئی تھی وہیں صلیب تک کر رہ گئی۔ کیونکہ اسفند نے اسے دیکھ کر ہلکا ہونے لگا تھا۔ اس کی نگاہیں اس پر جم رہی تھیں اور یہ صورت حال اس کے لیے بے چارہ کی طرح تھی۔ وہ جانتے جانتے رفتن نہ پائے مگر اس کے مصداق اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آٹے بیروں واپس لوٹ جانے کے سانس سے گزرتی ہوئی لپٹے رہا تھی۔ مگر اسے چلی جانے سے منع ہی کچھ ایسا نازک تھا کہ اس سے نظریں چار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے اسے مزید کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا اور رسیوں کو کریدل پر رکھ کر بولا۔

”ابو۔ آپ کہاں غائب تھیں؟“
وہ بس۔ بھائی رہیں آج مجھے اپنے گھر لے گئے تھیں۔ اس کا بوجھ سپاہ ضرور تھا لیکن اندر سے لوکھا ہٹ صاف

نہاں تھی جیسے اسفند محسوس کیے بغیر رہ سکا۔
”ابو۔ مگر اس میں اس قدر ڈرنے یا سہنے کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ یعنی آپ کو کم از کم تقویٰ دیر کے لیے اس گھر کی پوریت سے تو نجات مل گئی۔ پھر دیرس کا پڑا ہے آپ کو؟ اور وہ اندر ہی اندر اس خیال سے دل کھلی کر اسفند کی طرف سے توجہ کی کیفیت کو بھانپ گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بوکھلا کر بولی۔
”نہیں نہیں۔ میں بھلا اس سے ڈروں گی۔ میں تو۔ میں تو۔“

”مجھ سے اور کس سے۔“ اس نے عجیب سے انداز میں تقویٰ سا چمک کر کہا، تو مملوٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔
”اگر میں پہلی بار نہایت غیر ارادی طور پر اس کی طرف نگاہیں اٹھیں تو اس کے چہرے پر پھیلی مٹی خیر مسکراہٹ اور انکھوں کے اندر ایک خوفناکی سی لہجہ کو دیکھ کر نہ صرف فوراً ہی جھک گئیں بلکہ ان کی زردیں مزید کھڑکھڑانے لگیں اور وہ اپنے رہائشی کمرے کی طرف بھاگی۔ حالانکہ وہ اسے پکارتا ہی رہ گیا۔

”مارے مارے ذرا ٹھہریں تو مملوٹ۔“ یہ آپ بھاگی کہاں جا رہی ہیں۔ مملوٹ۔ مگر اسے مزید ٹھہرنا یا امننا گوارا ہی کب تھا۔ لہٰذا دن سے اسے اسفند کا بوجھ ہی تو کھانے کا رہا تھا اور کسی ایسی صورت حال کا سامنا کرنے سے تو وہ اب تک بچی آ رہی تھی۔ اس نے ٹوڈر کے مارے پلٹ کر بھیجے بھی نہیں دیکھا کہ کہیں وہ اس کے تعاقب میں نہ آ رہا ہو اور علیٰ سہولت سے اپنا کمرہ کھول کر اندر گھس گئی اور پھر اندر سے کھٹکنا لگایا۔

کمرے میں آنے کے بعد۔ اپنے بھولے ہوئے سانس اور منتظر دھڑکنوں پر قابو پانے میں بھی اسے خاصا وقت لگا۔ اور پھر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ اس کے تعاقب میں نہیں آ یا بلکہ اس کے آنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تب اس نے نام تبدیل کر کے وضو کیا۔ کیونکہ اس نے ابھی تک عثمانی نماز ادا نہیں کی تھی۔ اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ عثمانی نماز کے بعد ہی عبادت شروع کر دے یا پھر آدھی رات کو بعد از ہو کر تہجد کے وقت سے فجر کے وقت تک عبادت کرتی رہے جب کہ اسے سخت پسند بھی آ رہی تھی اور ادھر آدھی رات کو اٹھ کر عبادت کرنا بھی آسان نہ تھا کیونکہ ایک تو ایسا الارم بالام والی گھڑی بھی موجود نہیں تھی جو مقررہ وقت پر اسے گہری نیند سے اٹھا کر بٹھا دیتی۔ دوسرے یہ آدھی رات بارات کے پچھلے میں کچھ کھانا کھا کر باقی کسی کارے وار دے کر نہ تھا۔ کہ رمضان المبارک میں بھی۔ جھیلے ہو کر کھانا بھی اس کے لیے کسی مشکل ترین مسئلے سے کم نہ ہوتا تھا۔ آدھے مہینے تک بھابھی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھانا بھی نہیں تو افطار کا طمانیت پر بھی لگا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے سوچ رہی تھی کچھ کھانا نہیں جاتا تھا۔ ماسوائے میند کے جھونے کھانے کے۔ یہی وہیم گئی رمضان المبارک کے آخری دنوں میں وہ اوّل وقت ہی سوچی کھا کر اور روزے کی نیت کر کے ہی سو جاتی تھی۔
”توڑنے پر تانا کھا تھا کہ دونوں مل کر عبادت کریں گی تو زیادہ لطف آئے گا تو اس کا احساس اسے اب تباہیو کر عبادت کرنے کے خیال سے ہورہا تھا۔ بہر کیف وہ ابھی تک کسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ دو فتنہ بند روزے پر زور سے دھک بونی اور یہی طرح اچھل پڑنے کے ساتھ ساتھ دل بھی اچھل کر تعلق میں آ نکلا۔ یہ پوچھنے کی ہمت بھی نہ پڑی کہ دروازہ کس کے ہاتھ سے کھولا جائے۔ وہ توجہ دوسری دھک کے ساتھ کمر کی آواز سنائی دی۔

”کیوں نہ آئے؟ آپ کا خون آیا ہے۔“ تب حلق میں آ نکلا ہوا دل تقویٰ بہت زین میں آیا۔ اور وہ خود کو منبھاتی ہوئی دیر سے اسفند کے کھٹکنا کر دروازہ کھولا اور لہرائی ہوئی آواز میں کمر سے پوچھا۔
”کس کا خون آیا ہے اس وقت؟“

دو تین روز مزید اسی خاموشی سے گزر گئے تھے۔
اسفند بھی اسے اس قدر اطمینان دیا تھا کہ اس سے دور دوری رہا تھا۔ اور یوں مملوٹ کو اب اس کی طرف سے بے اطمینانی اور فکر سادامن گیر تھا وہ کسی حد تک بد ہو گیا تھا۔

شعبان المکرم کا مہینہ تھا اور شب بارات کا دن۔ نازش کو چنے کی وال کا حلوہ بہت مرغوب تھا۔ لیکن جب بھی بنانے کی کوشش کرتیں کبھی دال پتی رہ جاتی کبھی سٹھاس کم جب کہ فخرہ بیگم نے مملوٹ کو قسم قسم کے کھانے پکانے میں جانی کراہ اور اس کی اس خوبی سے نازش بھی بخوبی واقف تھیں اور اس روز صبح ہی صبح آ کر اس خیال سے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھیں کہ چنے کی وال کا حلوہ بنانے میں اس سے مدد لیں۔ نیلما بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔ اور ادھر سے نازش بھی لگتی تھی۔
کچھ دیر وہ بھی حلوہ بنانے میں نازش کا ہاتھ بٹائی رہی پھر دوپہر کے کھانے کے بعد نیلما کو لے کر چلی گئی۔ مگر مملوٹ تو تمام دن ہی قسم قسم کے حلوے بنانے اور نازش کے ساتھ ان کے عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والوں کو حقے میں سے ملانے رہی۔ شام ہوئی تو نازش اور کوڑے بڑے اسے رات کے کھانے پر روک لیا۔ اصل میں یہ دو کمرہ تو یہ تھا کہ نازش کے گھر سے شام تک نیلما براہ راست اپنے گھر چلی جائے گی۔ بس اسی خیال سے وہ رات کے کھانے پر گئے ہوئے نیلما کو بھر حال جب رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر پہنچی تو جاتے ہی کمر لے گیا خیال سے وہ رات کے کھانے پر گئے ہوئے نیلما کو روک لیا۔ اور وہ آئندہ روز کسی وقت آئیں گی تو وہ بالکل تباہ رہ جانے کے خیال سے ہراساں ہو گئی۔ اور دن بھر دل میں پچھتانے لگی کہ کوڑے کے اس قدر اسے روکنے کے باوجود وہ یہاں کیوں چلی آئی۔ جب کہ جانے کی ہمت بھی دور نہ لے اس کے ساتھ مل کر عبادت کرنے کا لہذا شوق بھی نہ رہا تھا کہ نیلما کے برامان جانے کے خیال سے وہ کوئی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اور اب آگئی تھی تو واپس جانا ممکن ہی نہ تھا کہ کہیں منصور کو ڈراؤنٹ ہو کر کرب کا چاچکا نہ تھا۔ ادھر کمر بھی اسے نیلما کے رک جانے کی اطلاع دے کر جھپکے کے پیلو سے ہوتا نہیں پیچھے غائب گیا تھا۔ گھر پر مسلط سناٹا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ گھر میں اس وقت کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ اور یہی اطمینان دینے کے وہ اندر داخل ہوئی تو کارڈ پر روبرو کر کے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اسفند کو اپنے عین مقابل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

”جی جیوٹی بی بی صاحب کا کہہ کریم نے بتایا۔ نیلما کے خون کا سن کر اسے تعجب ضرور ہوا مگر پھر بڑی محنت سے
ناؤ کھان رک گئی ہے اس لیے خود سے تادینا چاہ رہی ہوگی۔“

اس نے لاؤنج میں پہنچ کر ریسپورڈر اٹھایا تو نیلما اس کی آواز سنتے ہی بولی۔
”ارے آپ سلوٹ آیا۔ تو آپ گھر پہنچی ہیں؟“ وہ۔ یہ بھی کوئی سوال تھا۔ جب کہ نیلما کو ابھی من مہلک
وہ گھر واپس آگئی ہے۔ اس نے اس کے چند ذکر بات کرنے پر چل کر کہا۔
”ہاں ظاہر ہے پہنچ ہی گئی ہوں۔ ابھی تو تم سے بات بھی کر رہی ہوں۔“

”ہاں ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے“ نیلما بولی۔
”تو پھر؟“ اس نے نیلما کے انداز میں پوچھا۔
”ارے کچھ بھی نہیں سلوٹ آیا۔ وہ اصل میں تو میں نے بھائی جان کو بلایا تھا۔“
”اچھا اچھا تو بلا وہ مجھے لایا وہ تبار اکرم؟“ وہ جھپٹے لہجے میں بولی۔ کرکیم کی اس حماقت پر اسے سخت کوفہ ہوا۔
”خیر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے میں نے آپ کے بارے میں اس سے پوچھا بھی تو تھا۔ اس لیے وہ آپ کو بلا لیا۔“
نیلما نے یہ کہہ کر گویا بات بنائی۔

”اچھا۔“ ٹھیک ہے مگر تم تو اب کل صبح ہی آؤ گئی تھیں؟ اس نے بونہی گویا رسیل تک رہ پوچھ لیا۔
”نہیں کل صبح نہیں البتہ دن میں کسی وقت بھی جاؤں گی کیا پتا شام ہی ہو جائے میری واپسی میں۔“ نیلما ہنس کر بولی۔
پھر فری پوچھا۔

”مگر یہ بھائی جان کہاں ہیں؟ اور اسفند کا ذکر آتے ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بہت سوچ کچھ کر بولی۔
”کیا کریم سے ملنے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟“
”ہاں ہاں پوچھا تو تھا مگر وہ ان کے بجائے آپ کو بلا لیا۔“ نیلما نے ہنس کر کہا۔ وہ جواب میں خاموش بی بی۔
”تعجب ہے اس وقت بھائی جان کہاں چلے گئے۔ جبکہ یہ وقت تو ان کے آرام کرنے کا ہے۔“ نیلما خود ہی بولی۔
”اب مجھے کیا معلوم؟“ وہ پیچھے مڑ کر بھیکتی ہوئی بولی۔ مبادا کہ وہ یہیں کہیں موجود ہو۔
”افوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا۔“ نیلما نے کہا۔
”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”یہی بھائی جان کا اس وقت غائب ہونا۔ جب کہ کریم تو کھد ہا تھا کہ وہ گھر پر ہی موجود ہیں مگر وہ یقیناً کبھی
ہی گئے ہوں گے یہی تو وہ ان کے بجائے آپ کو بلا لیا۔“ نیلما بولی۔
”ہاں ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر تمہیں ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے ان کی؟“ نیلما کو بار بار اسفند کا نام لیتے دیکھ رہی تھیں
معتب سے ہونے بغیر نہ سکی۔

”ارے وہ اپنی ساس نرسین آئی ہیں نا ان کے ایک کزن کمرن میں بھائی جان کے کو لگ تھے۔ وہ آج کل انہی
ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور بھائی جان سے ملنے کو بے تاب ہیں۔“ نیلما نے بار بار بھائی کو پوچھنے کا اصل سبب بتا دیا۔
وہ رائے دینے کے انداز میں بولی۔
”مگر ایسی جلدی کیا ہے وہ صاحب تو کل بھی کسی وقت مل سکتے ہیں تمہارے بھائی جان سے۔“
”نیکین مشکل یہ ہے کہ وہ صبح کی فلاٹ سے یو کے واپس جارہے ہیں میرا مطلب ہے وہ وقت ہی کہاں ہے ان کے
پاس؟“ نیلما نے کہا اور پھر شاید ناز کے اسفند پر اسے بتانے لگی کہ اسفند گھر پر نہیں ہیں اور وہ اس سے بات کر رہے
”اچھا سلوٹ آیا۔ آپ ایسا کریں کہ اگر بھائی جان بھی آجائیں تو ان سے کہہ دیں کہ فوراً ہی مجھے فون کر لیں۔“
گی نا۔ نیلما پھر اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ اٹ پھر وہی اسفند کا ذکر۔ وہ جھلکیوں کر ہامی بھری لیتی جب کہ بات
تو کجا وہ اس کے سامنے پڑنے سے بھی کڑائی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ اگر ان سے نہ کہہ سکی تو کریم سے بتا دیکر ضرور کہہ دوں گی کہ تمہارے بھائی جان کے اتنے
وہ ان تک فوراً تمہارا پیغام پہنچا دے۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنا پہلو بچا دے ہوئے کہا۔

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے نزدیک آ جانے سے وہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔
”آپ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن میں آپ کی ان ساری اداؤں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اور آج آپ کو ایسا سبق
ملے گا کہ آپ کو تمام خبریں اور باتیں ملیں گی۔ اس لیے یہ رات میری ہے اور اسے میں ہی کرے میں آپ کے ساتھ
ہو کر گزروں گا۔ افسوس وہ نہ کر سکا کہ وہ بھائی جان سے بات سے وہ ڈر رہی تھی اس سے اس کا سابقہ بڑے والا تھا۔
جس خطے سے اب تک خود کو نہ بچا لے آئی تھی وہ بالآخر سرسبز مڈلائے کی لگا ہوا پھر بھی وہ دہشت سے کام لے کر بولی۔
”نہیں۔ نہیں۔“ مجھے کچھ بھی سمجھنے کا شوق نہیں۔ آپ پلیز ایسے ہر خیال کو دل سے نکال دیجیے اور یہاں سے
بچے جائیے۔“

”ارے تم بھی کچھ بتاؤ سلوٹو بھئی کہ تمہارے کیا ارادے ہیں۔ روزے تو تم بھی رکھتی ہوگی نا۔“
 ”جی ہاں بلکہ پورے روزے رکھتی ہوں مچھلے اکا۔ سلوٹو اچانک مٹی طبع کیے جانے پر چونک کر بولی۔
 ”واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے ورنہ ہمارے تو زیادہ رنگنڈے دار ہی ہوتے ہیں۔“ گنڈے دار سے ان کی مدح
 چند ایک روزے چھوڑ کر رکھنے سے مٹی۔
 ”لیکن مچھلے اکا! سال بھر میں صرف انیس تیس روزی تو تیر ہوتے ہیں۔ خدا کے عائد کردہ ایک فرض کی
 کے لیے یعنی تین سو سنیہ دنوں میں سے صرف تیس دن۔ اور پھر اس فرض کو قضا کرنے کی معافی بھی تو نہیں ملتی
 اور مرض کے عذر کے ساتھ بعد میں پورے کرنے کا حکم عائد کیا گیا ہے۔“
 ”واہ جزد اک اللہ۔ بڑی ہمت والی جی ہو تم بھی! معیوب منصور نے حبیب پر کہا۔
 ”چلیں پھر تو سلوٹو اپاکی وجہ سے سحری بھی بڑی مٹھا مٹھا داخل جایا کرے گی روزے داروں کو ٹیٹا چاک کر بولی۔
 ”کیوں ان پر کیوں کو قوف ہو کا سب کچھ۔ جوان بہنوں کے ہوتے ہوئے ایک بھائی کو دوسروں کا مہر نہ ہونا
 نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نیلو فر تیار کیا کریں گی سحری اور افطاری۔“ اس نے اصل میں تو اس کی طرف داری میں کہا تھا مگر
 کی بات کو اس کی غلطی کا ہی ایک اظہار سمجھی۔
 ”ہا ہا نیلو فر آپا کو تو بھی میں بھی چھوٹا چھوٹا نہیں آتا۔ کچھ کچھ نا تو بڑی بات۔ نیلما مسکرا کر بولی۔
 ”نہیں آتا تو سیکھ جائیں گی۔ مگر آج سے پورے رمضان بھی سحری پر انھیں گی اور روزے بھی کھیں گی۔“ مندرجہ
 ہی پتیرہ بدل کر تند ویزہ لہجے میں بولا۔ نیلو فر نے تلکار پٹیلے باپ کی طرف اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔ تو زینت توڑا ہی پڑی۔
 ”ارے لو۔ اصل بات تو پھر وہیں کی وہیں رہ گئی۔ جی، اگر چہ آرمی بھی روزہ رکھیں گے تو کھانے کے کیا کاروبار۔
 غاسماں سے کہہ کر وہی تیار کرادوں۔“
 ”ارے بڑی بوجا اتنا کچھ تیار ہوا رکھا ہے بھی کیا کم ہے جو مزید فراوانشی کھانا پکوا یا جائے۔ البتہ کھیلے یا نہیں کھاؤ
 ضرور کرادیجیے۔“
 ”جی ہاں اور اس کے ساتھ میرے لیے دو انڈے بھی ابلوا لیجیے میں تو ٹیبل روٹی کے سلاسل اور کھنکھائی لگاؤں۔“
 نیلما بولی۔
 ”اور تم کیا کھاؤ گی سلوٹو۔“ شعیب منصور نے سلوٹو کا دل رکھنے کی غرض سے پوچھا۔
 ”میں تو سرے سے سحری کھانے کی عادی ہی نہیں ہوں مچھلے اکا۔ بس اس وقت جو کھا لیا ہے اسی پر روزہ
 قیامت کرے سو جاؤں گی۔“
 ”نہیں اب اس قدر تکلف سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں سلوٹو۔ اگر چہ اب یہی معمول رہا تو عید تک لیٹا ہوا
 کر کا بنا ہو جاؤ گی۔“
 شعیب منصور نے کہا تو سلوٹو ہنستی ہوئی بولی۔
 ”نہیں نہیں مچھلے اکا۔ میں تو سرے سے اسی معمول پر چلی آ رہی ہوں۔ سحری اس لیے نہیں کھاتی کیا تو اتنا
 سینے پر رکھا رہتا ہے۔ یا پھر سحری پر کھایا ہوا تمام دن روزے کو مکروہ کرنے کا باعث بنا رہتا ہے۔
 ممتی تو یہ صورت ہنستی بھی یوں بھی پہلی بار سے بنتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ ساری کینڈی بھول کر
 سالا سے تکتا رہ گیا۔ جب کہ اس کے سحری پر نہ اٹھنے کی عادت کا اس کو وہ بھی بدی سمجھا تھا کہ وہ کدو لٹکی سے کھانے
 اس کے سحری کے وقت نہ اٹھنے پر اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا تھا نہ اس سے شک ہی تھا ماسو نیلو فر کے لیے
 کی غلطی کے در سے نہ چاہتے ہوئے بھی رات کے پچھلے پہر اپنی بیٹی یعنی منی منی میں غل ڈالنا پڑا تھا۔ نماز وہ ضرور
 مٹی گھریص فجر اور مغرب کی مین سلوٹو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کھینچنے کے سے انداز میں سو سو گھرے کرے جو سحری کھانے
 جاتی ہے تو اس کا اظہار عموماً وہ دہر دہر کر کے کہنے کے لیے کرتی ہے۔ اور باپ اور بھائی پر یہی ظاہر کیا جاتا ہے
 سے ہے۔ اور اسے یہ بات نیلما بہت ہنس ہنس کر بتاتی تھی۔ بھلا ایسے روزے اور نماز سے فائدہ ہی کیا تھا جو
 کے در سے ادا کیا جا رہا تھا۔ کاش انسان اپنے خدا سے اس حد تک ہی ڈرے تو اس کی رحمت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی
 وہ بڑے تاسف سے اکثر سوچتی۔ مگر اس کے افسوس کرنے سے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ وہاں تو پوری نہ بھی آتی۔

”بے ہے یہ اور ناغل نظر آتی تھی۔“
 ”جی ہاں بلکہ پورے روزے رکھتی ہوں مچھلے اکا۔ سلوٹو اچانک مٹی طبع کیے جانے پر چونک کر بولی۔
 ”واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے ورنہ ہمارے تو زیادہ رنگنڈے دار ہی ہوتے ہیں۔“ گنڈے دار سے ان کی مدح
 چند ایک روزے چھوڑ کر رکھنے سے مٹی۔
 ”لیکن مچھلے اکا! سال بھر میں صرف انیس تیس روزی تو تیر ہوتے ہیں۔ خدا کے عائد کردہ ایک فرض کی
 کے لیے یعنی تین سو سنیہ دنوں میں سے صرف تیس دن۔ اور پھر اس فرض کو قضا کرنے کی معافی بھی تو نہیں ملتی
 اور مرض کے عذر کے ساتھ بعد میں پورے کرنے کا حکم عائد کیا گیا ہے۔“
 ”واہ جزد اک اللہ۔ بڑی ہمت والی جی ہو تم بھی! معیوب منصور نے حبیب پر کہا۔
 ”چلیں پھر تو سلوٹو اپاکی وجہ سے سحری بھی بڑی مٹھا مٹھا داخل جایا کرے گی روزے داروں کو ٹیٹا چاک کر بولی۔
 ”کیوں ان پر کیوں کو قوف ہو کا سب کچھ۔ جوان بہنوں کے ہوتے ہوئے ایک بھائی کو دوسروں کا مہر نہ ہونا
 نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نیلو فر تیار کیا کریں گی سحری اور افطاری۔“ اس نے اصل میں تو اس کی طرف داری میں کہا تھا مگر
 کی بات کو اس کی غلطی کا ہی ایک اظہار سمجھی۔
 ”ہا ہا نیلو فر آپا کو تو بھی میں بھی چھوٹا چھوٹا نہیں آتا۔ کچھ کچھ نا تو بڑی بات۔ نیلما مسکرا کر بولی۔
 ”نہیں آتا تو سیکھ جائیں گی۔ مگر آج سے پورے رمضان بھی سحری پر انھیں گی اور روزے بھی کھیں گی۔“ مندرجہ
 ہی پتیرہ بدل کر تند ویزہ لہجے میں بولا۔ نیلو فر نے تلکار پٹیلے باپ کی طرف اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔ تو زینت توڑا ہی پڑی۔
 ”ارے لو۔ اصل بات تو پھر وہیں کی وہیں رہ گئی۔ جی، اگر چہ آرمی بھی روزہ رکھیں گے تو کھانے کے کیا کاروبار۔
 غاسماں سے کہہ کر وہی تیار کرادوں۔“
 ”ارے بڑی بوجا اتنا کچھ تیار ہوا رکھا ہے بھی کیا کم ہے جو مزید فراوانشی کھانا پکوا یا جائے۔ البتہ کھیلے یا نہیں کھاؤ
 ضرور کرادیجیے۔“
 ”جی ہاں اور اس کے ساتھ میرے لیے دو انڈے بھی ابلوا لیجیے میں تو ٹیبل روٹی کے سلاسل اور کھنکھائی لگاؤں۔“
 نیلما بولی۔
 ”اور تم کیا کھاؤ گی سلوٹو۔“ شعیب منصور نے سلوٹو کا دل رکھنے کی غرض سے پوچھا۔
 ”میں تو سرے سے سحری کھانے کی عادی ہی نہیں ہوں مچھلے اکا۔ بس اس وقت جو کھا لیا ہے اسی پر روزہ
 قیامت کرے سو جاؤں گی۔“
 ”نہیں اب اس قدر تکلف سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں سلوٹو۔ اگر چہ اب یہی معمول رہا تو عید تک لیٹا ہوا
 کر کا بنا ہو جاؤ گی۔“
 شعیب منصور نے کہا تو سلوٹو ہنستی ہوئی بولی۔
 ”نہیں نہیں مچھلے اکا۔ میں تو سرے سے اسی معمول پر چلی آ رہی ہوں۔ سحری اس لیے نہیں کھاتی کیا تو اتنا
 سینے پر رکھا رہتا ہے۔ یا پھر سحری پر کھایا ہوا تمام دن روزے کو مکروہ کرنے کا باعث بنا رہتا ہے۔
 ممتی تو یہ صورت ہنستی بھی یوں بھی پہلی بار سے بنتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ ساری کینڈی بھول کر
 سالا سے تکتا رہ گیا۔ جب کہ اس کے سحری پر نہ اٹھنے کی عادت کا اس کو وہ بھی بدی سمجھا تھا کہ وہ کدو لٹکی سے کھانے
 اس کے سحری کے وقت نہ اٹھنے پر اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا تھا نہ اس سے شک ہی تھا ماسو نیلو فر کے لیے
 کی غلطی کے در سے نہ چاہتے ہوئے بھی رات کے پچھلے پہر اپنی بیٹی یعنی منی منی میں غل ڈالنا پڑا تھا۔ نماز وہ ضرور
 مٹی گھریص فجر اور مغرب کی مین سلوٹو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کھینچنے کے سے انداز میں سو سو گھرے کرے جو سحری کھانے
 جاتی ہے تو اس کا اظہار عموماً وہ دہر دہر کر کے کہنے کے لیے کرتی ہے۔ اور باپ اور بھائی پر یہی ظاہر کیا جاتا ہے
 سے ہے۔ اور اسے یہ بات نیلما بہت ہنس ہنس کر بتاتی تھی۔ بھلا ایسے روزے اور نماز سے فائدہ ہی کیا تھا جو
 کے در سے ادا کیا جا رہا تھا۔ کاش انسان اپنے خدا سے اس حد تک ہی ڈرے تو اس کی رحمت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی
 وہ بڑے تاسف سے اکثر سوچتی۔ مگر اس کے افسوس کرنے سے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ وہاں تو پوری نہ بھی آتی۔

کون نظر انداز کرے دہی لیکن سحری کے وقت اسے نظر انداز کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کیونکہ زینت کتنی باہر سے پوچھ کر پہنچ گئی۔ یا نہیں گئے۔ یا پھر کہیں۔ ان کے لیے جلدی سے دواندے اُبال کر لے آئے۔ میں تو اگر سحری پر اندے کھا لیتا تو میں کبھی نہ پہنچتا۔ میں کو دیر تک کھنی کھنی ڈکارا کرتی رہی۔ یہ تمہارے بچے تھے کہ تو سر سے اندے کھاتے ہی نہیں۔ ”تسب سے چاہتے ہیں۔ اس سے پوچھنا پڑتا تھا۔ ایسے کوئی نہ کوئی چیز تو گھر پر ہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قصور سارا سلوول کی ذمیت دے دیا تھا۔ لیکن وہ بہت غیور اور خود ارادتی۔ وہ اسی کی ایک غلطی کی وجہ سے اس سے خفا ہو گیا تھا۔ تو وہ اس سے بات کرنے کے لیے بل گیا۔ کو باجی کروا کر غصہ کر رہی تھی۔ کیوں بھی اس نے کسی کے شک جھکا نہیں سیکھا تھا۔ اور اس نے تو بارگاہی کی مدد کر لی تھی۔ کہ کوہنہ نہ رہا تھا۔ اور اس کی غلطی دور نہیں ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے جو کہا تھا کہ آئندہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنا تو وہ ایسا کیا نہ کر کے اس کو یہی جتنا ناپاوار ہوا تھا کہ وہ بر تعلق کو تو نہ چکا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ وہ اپنے طور پر تو اس کی اس ناراضگی بالاصلطی غور ہی سمجھتی تھی کہ اس طرح کم از کم اس کی دیواری سے ٹوچی ہوئی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اسے اپنے اور اس کے دو میناں کا حال سمجھنا پڑا۔ باندیوں کا بھی شدت سے احساس تھا۔ اور اس ہی احساس کی طرف مائل ہونے سے روک دیتا تھا۔ ورنہ اس کی ناراضگی اس کے لیے سب مان روح بن جاتی تھی۔ اور اس وقت تو اسے بڑی ہی کوفت ہوئی جب زینت کے کہنے پر وہ اس سے پوچھ کر اسے کاشیے مطلوب ہے۔ اور وہ اسے جواب دینے کے بجائے مان کو محض طلب کر کے بس فلاں چیز کافی ہو گئی یا پھر انکار کر دیتا تھا۔

رونے سے باق ماندگی سے وہ رکھ رہی تھی یا پھر اسفند۔ ورنہ زینت سمیت کسی کو بھی دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ رمضان مہینہ ہے۔ نیلا تو خیر کاشیے بھی جاتی تھی۔ مگر گزلفور۔ اپنی کالہ کر زیادہ تر گھوٹی ہی پیر تھی۔ یا پھر گھر میں دہی تو دیکھ کر وہیں نہ مینوڑ سکتی رہتی۔ یا دی سی آبر فلیں دیکھتی رہتی۔ کالہ سے آنے کے بعد نیلا بھی کچھ ایسے ہی مشاغل میں مصروف ہوجاتی۔ اسے روزہ ہوتا تو اتنے ہی بڑے کر سوجاتی تھی۔ عید کی بڑے جوش و خروش بلکہ اتنا ہم سے منانے کی تیاریاں نصف رمضان سے ہی شروع ہوتی تھیں۔ زینت کا زیادہ وقت خریداری میں ہی گزرتا تھا۔ لباس نو اس کیلئے کے سوا ان کے تھے تو زینت اور ذیلو فریام سے ملتی تھیں۔ اور ایک مہینہ کی کوئی سوٹ سوا ان کے تھے۔ شادی کے بعد ہی عید آئی تھی اس لیے ناز پر اور در احمد سوٹ بلکہ ناندی۔ ساس کے بھی گڑے تیار کرانے لگے تھے۔ اُنڈا کالیک بھاری میٹھ وہ ناز کے لیے باہر سے لاتی تھیں اور طائی جڑاؤ سیت لگاتی تھیں۔ بنوایا تھا۔ مٹی اور ادا کی عید ہی جاری تھی۔ اس لیے مٹی کے لیے زورات کے دو سیٹوں کے علاوہ۔ پانچ عدد جڑے اور جڑوں سے جمع کرے پرس اور جوتیاں اور در جوتوں کا کچھ کی جوتیاں۔ پانچ کلو مٹھائی۔ ڈوکرہ بھر پل۔ سیروں سونا۔ چھوڑا۔ چربی۔ دو دھکے کے اکیاون روپے اور خشک میوہ علاوہ ازیں احمد سوٹ کے لیے دو گرم سوٹ۔ دو شوار اور آٹا بھام سوٹ۔ شیروانی۔ شیروانی کے اٹرفروں کے بٹن۔ طائی لفٹ نکس۔ شیونگ کا بڑا سیٹ۔ سینٹ اسپرے۔ سلیم شامی۔ موز سینڈل اور بوط۔ کٹی کٹ بنیان۔ رد مال اور ازار بندنگ اس عید میں شامل تھے۔ بلکہ ناز کے ساس سسر اور ندیل کے سوٹ اور تحائف بھی۔ گو یا دوسرے معمول میں جینز اور چڑھانے کا سامان تھا سارا پوتا تر تھا اس لیے بڑے دھڑلے سے نئی چیزوں کا اضافہ کر کے بیٹی کے میکے والوں کی دھاک سسرال والوں پر مٹھانی جاری تھی۔ بس روپے پیسے کا قیل قشمار لائی مثل تھی کہ جتنا گڑا لوگ اتنا ہی مٹھا ہوگا اور جہاں تک گڑا لٹانے کا سوال تھا۔ بڑے زور و شور سے عید۔ منانے کی تیاریاں گم ہو رہی تھیں۔ گھر کی نئے سرے سے سینگ اور سجاک کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ ایک ڈوکرہ رنگ کینی سے بھی رابطہ رکھا تھا۔ ادھر نازش اور کوثر بھی اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ اور نوں رمضان المبارک کا تبرک مہینہ بالآخر اختتام کو پہنچا۔ چاند والے روز بھی۔ تلاش ایسا کہے باوجود بھی عید کا چاند نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ لوگ ایک روزہ بڑے جانے کا کام کرتے تھے۔ اور کچھ لوگ بوڈھی عید منانے پر بیزار کی کا اظہار۔ کہ وہی مطلع کے برابر آلود ہوجانے کا رانا مسئلہ پیش آ رہا تھا۔ لیکن جبکہ ہی بریویدر ریڈیو اور ٹی وی سے دوسرے شہروں میں چاند دیکھے جانے کی خبر کے ساتھ ساتھ اگلے روز عید ہوجانے کا اعلان ہوا۔ پوری کراچی میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لوگ باگ خریداری کے لیے برساتی چیزیں کی طرح گھر وں سے نکل کر ماروں بازاروں اور گھروں میں بکھر گئے۔ اور یوں عید کے استقبال میں دو کا ماروں کے ساتھ ساتھ نیکی اور کشتہ والوں کی پانچ گئی۔ اور جو لوگ گھر میں رہ گئے۔ وہ بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

یہ چاند رات کو خریداری بھی ایک ریت سی گئی تھی کہ جو لوگ شروع رمضان یا پھر رمضان عید کی ساری تیاری کر چکے ہیں۔ وہ بھی چاند رات کو کوئی نہ کوئی چیز خریدنے نکلے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چاند رات کی خریداری کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

یہ تو یہ بھی کہنے لگا کہ یہ چاند رات کو کچھ نہیں خرید تو کچھ عید بھی پچھلی گزرتے گی اور منے کی بات یہ کہ روزے رکھنے والوں سے زیادہ روزے خوجا چاند رات کو جوش و خروش سے منانے ہیں۔ عید کا چاند نظر آنے کا اعلان کیا ہوا کہ سلام کے لیے آئے والوں اور۔ ایک دوسرے دلوں کا ایک باتنا سا بندھ گیا۔ سب سے پہلے ناز و اپنے شوہر کے ساتھ والدین اور چھائی کو سلام کرنے آئی۔ اس نے بعد میں زینت کے دروازے کی نوکیلا ہونے کی کوئی دوست احبابوں کے بیٹے اور بھائی بھی۔ اور زینت دستور کے مطابق سب کے سلام قبول کر کے انہیں عید یاں دے دے کر رخصت کرتی رہی۔ اس پر ٹیلیفون کا سلسلہ بھی ایک تسلسل سے جاری رہا۔ یہ تھا۔ وہ اسے بھی جھٹکارتی تھیں۔ اور کھلا کھلا خفا سامان کو عید کے لیے قسم قسم کے کھانے تیار کرنے کی مہمات بھی دیتی جا رہی تھیں۔ ان سب سے زیادہ ڈیکوریشن کے آنے کی فکر اور بھی جنہیں رات کے نوے کا وقت دیتا تھا۔ اور گرمی کی وجہ سے شام ہی تھی۔ ان سب سے زیادہ زینت کے اشاروں پر پیر کی کی طرح ناچ رہا تھا۔ کبھی اندر جا کبھی باہر بھی کچھ میں تو کبھی بیٹھتی میں۔ کبھی ایک ہی کچھ تھی۔ ورنہ زینت کے یہاں سے اتنے میٹھے اور اتنے نکلے ہونے کو لڑاؤ۔ کتنی میں چاہے کچھ ہو گئی تھی۔ منو کر لڑاؤ۔ یہ کرو کر لڑاؤ۔ یہی علم تھا کہ دوڑ کر لڑاؤ ہو کر دیا تھا۔ اور دو دو راہی بیٹی کو لے کر کھانا کھا کر سلام کو آئے تھے۔ نازش اور کوثر شاپنگ کے ہنگامے پر تھیں۔ اس لیے ملو فر ورنیلا ان کے ساتھ جانے کے لیے ماں سے پیسوں کا تقاضا کر رہی تھیں۔ اور زینت جھجھکا جھجھکا کر رہی تھیں۔

”اگر نازش کو جانے کی ایسی ہی جلدی ہے تو انہیں جانے دو۔ تمہارے پاس بھی کاربہ تمہیں مل جاتی جانا۔“ وکلیں آج تمام رات ہی کھلی رہی گی۔ اور تمہارا چیرن تو خریدیں تم نے۔ اب کوئی نمی چیر باقی رہ گئی ہے جو غلامی کی ضرورت پیش آسکتی۔ اتنا بھی تم لوگوں احساس نہیں کہ گھر جانوں سے بھرا پڑا ہے اور بھی سیکڑوں کام ہیں میں تنہا کیا کروں گی۔“ مگر دونوں بیلیاں نازش کے ساتھ ہی جانے پر رضد تھیں۔ انہیں اپنی کوئی نہ کوئی ضرورت یاد آگئی تھی۔ آخر زینت کو انہیں بھیجنا ہی پڑا۔

اسفند معلوم اس وقت کہاں گیا ہوا تھا کیونکہ ڈیوٹی سے تودہ سیر پر کوئی داپس نہ گیا تھا۔ رات کے دس بجے کل کر آیا تو زینت بیٹوں کو دیر ہوجانے اور ان کی لبرانی کا دو ناروری تھیں کہ آسیدیا سار انیلو فر کا تھا اور ڈیکوریشن کے سرپرکٹر انہیں ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے اتنے ہی بیٹیوں کی شکایت کے ساتھ ساتھ شکوہ سنا لیا۔

”تم بھی خوب ہی ہو یا۔ دو چار ہیں شوہر کو ساتھ کے کرتیں سلام کئے کی تھی اور تم غائب تھے۔ میں نے تو بعضی رسم بھالنے کے طور پر تمہاری طرف سے احمد کی جھیلی پر ایک سوا یک روپے رکھ دیے ورنہ دناتو زیادہ ہی چاہے تھا۔“

”پلیٹ آپ نے جو دے دیا وہ کافی ہے۔ ورنہ میں تو ایسی لغو رسومات کا سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔“ اسفند نے گاگاری کا اظہار کرتے ہوئے کیا۔ اور پھر کوئی خیال آیا تو فوراً ہی ملنے پر ہاتھ رکھ کر ماں کے کچے جھک گیا۔ اور ماں نے اس کے سر کو سینے سے لگا کر بڑے دلا دھڑے انداز میں ملات کی۔

”رسموں کے قائل نہیں ہو تو یہ یہ سلام دعا کیسی۔؟“

”مسلم تو دعائیں لٹنے کا ایک وسیلہ ہے۔ کیا آپ ان سے بھی محروم رکھنا چاہتی ہیں مجھے۔“ وہ بھی ایک کاشیاں تھا۔ ماں کی ممتا میں بوشل لٹنے کا ایک جذباتی سا فخر ہوا لگتا۔

”اے خدا اگر میں میں محروم کیوں کہنے لگی۔ تم تو میری کھنوں کی روشنی ہو۔ جسم کا ایک ٹکڑا ہو خدا تمہیں ہمیشہ زندہ اور سلامت شلو آؤ اور گھر۔“ ماں کی ممتا فوراً ہی بھوک لگتی۔

”میں۔ آپ کی دعا میں ہی تو میری زندگی کا کل سرمایہ ہیں۔“ وہ ماں کے سینے سے مرٹنا ہوا بولا۔

”اٹو۔ بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں تمہیں۔ مگر تم نے کچھ کیا پایا یا۔“ آج تو کھانے پینے کا کسی کو بوش سے نہ پڑا۔“ زینت نے کہا۔

”میں نے بھی کھانا تو نہیں کھا یا مگر منہ ضرور جھنکا لیا ہے۔ اصل میں چند بے تکلف دوستوں کے نرے میں چھنس گیا تھا۔ بس انہوں نے مجھے اپنی سیر میں چیرن لکھا کہ میری بھوک ہی آزادی اللہ کو لڑ ڈنگ پینے کو زور وں چاہ رہا ہے۔“ اسفند نے کہا تو زینت ولس ”اے تو مجھے کیوں نہیں۔ میں نے تو ایک مہینہ دو در در میں ملو کر رکھے ہیں۔ جو سی ڈرنگ چاہی ہو۔ اچھا شہر میں خود تمہارے رہنے آتی ہوں۔“

”میں نہیں آپ تکلیف دگر کی تھی۔ میں خود فوج سے نکال کر پی لیا گا۔“ اسفند نے ماں کو کو لڑ ڈنگ لانے سے باز رکھتے ہوئے کہا اور مزید کہہ کر بولے سیدھا بیٹری کا رخ کیا۔

تو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ جلو شا باش تم جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔

اٹ یہ زینت کہہ رہی تھیں وہ بھی اتنے دلا ر اور اپنائیت سے۔ وہ بھلا اتنے خلوص اور پاکیزگی سے
سکتی تھی۔ خوراجی بادام لپکتے کی باریاں فرج میں کو کر تیار ہونے جلدی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد وہ بھی زینت کے ساتھ ان کی کار میں فرٹ سیٹ پیٹھی چاند رات کی رونق اور جواہر
اٹھاری تھی۔ زینت صرف اُڑد کیا ہوا ایک لینے کی تھیں۔ شاپنگ کرائے نہیں پھر بھی انہوں نے۔

کے ساتھ میچ کڑی کے فیروز کی رنگ کی کا مدانی کی چوڑیاں اسے دلواری تھیں۔
اگلے روز عید تھی۔ وہ گدگد شہب تین بجے کے قریب جا کر سوئی تھی کیونکہ جو میٹھی اور نکلن چیزیں اس کے
کی گئی تھیں انہیں پکھانے اور بنانے میں اسی رات سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ آٹکھ بھی کھلی کو نیکالے اُڑد

پر۔
”ارے سلوٹ آیا ہر دحضرت کب کے عید گاہ سدھا رکھے اور آپ ہیں کہ اب تک پڑی سو رہی ہیں۔ کچھ
آج عید ہے عید۔ مٹی کبہ رہی تھیں کہ رواج کے مطابق مرد سوتیاں کھا کر عید گاہ جلتے ہیں ملک آپ کی وجہ سے
بھائی جان سوتیاں کھائے بغیر ہی چلے گئے۔ نیلما نے اسے ہلا جلا کر گہری نیند سے اٹھاتے ہوئے ایک رات
ساری باتیں کہیں تو وہ نیند سے بوجھل آگھوں اور ڈکنے ہوئے سر کی وجہ سے جھجلا کر بولی۔

”کیوں کیا رواج کے مطابق میرے سوا انہیں کوئی اور سوتیاں نہیں کھلا سکتا تھا“
”کون کھلاتا؟ مٹی ڈیڈی کو تیار کرانے میں لگی رہیں اور ہم دونوں اپنی اپنی تیاری میں لگے رہے کیونکہ
بعد ہی جمالوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر واسپی پر کھالیں گے سوتیاں۔ وہ تنکے پر سر رکھ کر دوبارہ آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی۔
”ارے آپ پھر سونے لگیں۔ میں تو آپ کو اپنا یہ عید کا ڈرہیں اور اس کے ساتھ میچ کرتی چیزیں دکھانے کی
اور آپ سے عید ملنے بھی۔ مگر تیار ہونا کچھ آٹکھ آپ کو ابھی تک ہے رہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو سونے نہیں دوں گی یہ
اٹھ کر جلدی سے تیار ہو جائے۔ مٹی بھی آپ کو پوچھ رہی ہیں۔“

تب بڑی کسلندی محسوس کرتی ہوئی وہ اٹھ کر تیار ہوئی۔ طبیعت تو نہیں گوارا کر رہی تھی شعیب منصور کے
ہوئے کپڑے پہننے کو مگر گدگد شہب رات زینت نے بہت تاکید سے کہا تھا کہ وہ۔ وہ کپڑے ضرور پہنے۔ کپہ
بادل خواستہ اسے پہننے ہی پڑے تھے۔

پورے روز لکھے تھے اس لیے دبی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسی کہ روزے پورے ہوئے پڑھوڑی کے اٹھار
سے ہوتی ہے۔

لیکن دل تو اندر سے خوش نہ تھا۔ اندر اسی نے ڈیرے ڈیرے ہمارے تھے۔ اس لیے ایک انڈو گی سی خاندان
اسفند کے بات میں پہل کرنے پر بلکہ بات نہ کرنے کی قسم توڑنے پر یہ انڈو گی ڈور نہ ہوتی تھی۔
ظاہر تھا اس اتنی بڑی زمین میں اپنے ایک دہنارہ جانے کا احساس اسے کوئی خوشی تو نہیں بخش سکتا تھا۔ جب کہ
طرف سے غیروں میں گھری ہوئی تھی۔ جو اسے اپنا کہنے کو تیار نظر آتے تھے۔

اسے معلوم تھا کہ نیلما اسے سونے سے اٹھ کر جلد جلد تیار ہوجانے کی تاکید کرکے اس غرض سے نہیں آئی کہ وہ سب سے
ساتھ مل کر عید کی خوشیوں میں حصہ لے بلکہ اس سے کام لینے کی غرض سے اسے بلانے آئی تھی۔ ارادہ تو تھا خدا
عید کا نیلما اس پہننے کا لیکن نیلما نے جس انداز میں مردوں کے سوتیاں کھائے بغیر عید گاہ بٹلے کا ذکر کیا تھا اور جس انداز
میں کیا تھا اس کے پریش انگراں نے صرف منہ دھونے پر اکتفا کر کے شعیب منصور کی خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے

دیا ہوا عید کا فیوزی جوڑا زیب تن کیا۔ مگر چوڑیاں پہنیں نہ کوئی اور ریور۔ حتیٰ کہ میک اپ کے نام کی کوئی چیز بھی
پہنیں لگائی البتہ بال ضرور سوار سے اور پھر کمرے سے نکل آئی۔

اندر پہنچی تو لاٹو کچھ کورڈیور سے لے کر بیٹری اور کین سلساں پڑا دیکھ کر وہ کچھ گھبرا کر خانساں اور کریم عید کی نماز

نہیں پہنچی تو لاٹو کچھ کورڈیور سے لے کر بیٹری اور کین سلساں پڑا دیکھ کر وہ کچھ گھبرا کر خانساں اور کریم عید کی نماز

نہیں پہنچی تو لاٹو کچھ کورڈیور سے لے کر بیٹری اور کین سلساں پڑا دیکھ کر وہ کچھ گھبرا کر خانساں اور کریم عید کی نماز

نہیں پہنچی تو لاٹو کچھ کورڈیور سے لے کر بیٹری اور کین سلساں پڑا دیکھ کر وہ کچھ گھبرا کر خانساں اور کریم عید کی نماز

بہنے ہیں اور زینت اور دونوں لڑکیاں اپنے اپنے کمرے میں ہوں گی۔ نیلما نے کہا تھا کہ مٹی آپ کو پوچھ رہی تھیں۔
بے زینت سے سوچا کہ زینت سے جا کر معلوم کر آئے کہ وہ اسے کیوں پوچھ رہی تھیں۔ مگر پھر یاد آیا کہ وہ عید گاہ سے واپس
نے دے ہوئے تھے۔ اس لیے شہب خورم وغیرہ شجاس کی بڑی خوشیوں میں نکال کر میز پر لگا دینی چاہیے۔ ورنہ برس کے
بہن دن بھائی جان خواہ مخواہ ہی برمان جائیں گی۔ اس لیے اس نے کریم اور خانساں کے واپس آنے کا بھی انتظار نہ کیا
وہ شامیت ساری چیزیں جلد جلد فرج اور باٹ کیس سے نکال کر قہینے سے کھانے کی میز پر لگا دیں جس پر کریم نے

دہن شامیت ساری چیزیں جلد جلد فرج اور باٹ کیس سے نکال کر قہینے سے کھانے کی میز پر لگا دیں جس پر کریم نے

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔
بے بی سے جائے کی بیاباں اور کراٹر پینس ہی لگی تھیں۔

میں کہ نماز کا وقت ہی نکلا ہوا تھا اور وہاں چند دوستوں سے عید ملنے ملائے کی وجہ سے سارا دن غریبہ آئے تھے۔ اور چونکہ انہیں بہت شکوک لگ رہی تھی اس لیے یومی کو کمرے میں نہ پا کر سیدھے ڈرائنگ روم چلے گئے۔ اور خطاب عادت سلوٹ کو قدرے تیز لے گئے۔ بات کو تادم کردار سے کے آگے ہی شکوک کے لیے غریبہ طرف سے پیڑھ مچی مگر زینت سلانے ہی کھڑی تھیں اور اس سے بات کرتے کرتے ان کی نظر جو مٹی شور مچا رہی تھی بات کو ہی خوبصورتی سے نہیں موڑا بلکہ لہجہ بدل دیا۔ اس کے باوجود بھی شعیب منصور بہت کچھ تھوٹے تھوٹے راز پر بڑھتے ہوئے بولے۔

جی آپ ک جان کے کیا کہنے وہ تو کھر کے قریب کوئی پناہ بھی چھوڑا جائے تو اس سے بھی نکل جاتی ہے۔ ورنہ میں شعیب منصور مسدا کر بولے۔

لوٹکائے اپنے کمرے میں واپس آگئی۔
 میک اپ کرنا اور تیار ہونا بھی بے کار کیا تھا۔ کیا تھا اگر یہ تینوں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتیں۔
 وہ دل ہی دل میں اپنی ناقدی پر ملول ہوتی رہی۔ اتنی ناشور بھی۔ خود کو اپنی عمر سے بڑا ہی کبھی تھی۔ مگر غور نہ
 کبھی بھی اسے ناچھوہتے سے بھی چھوٹا نہ لگتا تھے۔ صبح سے اسفند کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے پہلے ہی چڑچڑاہٹیں لگتی تھیں۔
 صبحی اور اب تو کمرے سے نکلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لباس تبدیل کر کے لیٹے جلنے کا سوچ رہی تھی۔

لباس تبدیل کرنے کا ارادہ کر لینے کے باوجود وہ خود پر طاری سکنی اور افسردگی کی وجہ سے بڑے اٹھی نہیں بلکہ ملول ہی ہو کر اپنے لباس
 نو دیکھنے لگی کہ یوں تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب نمک تقریباً ہر عید ہی محروموں اور رنج کا احساس دلاتی ہی گزری تھی اور
 ٹاڈی کے تلخ ترین تجربے کے بعد تو عید کا دن اس کے لیے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوتا کہ ایک تو محض اس کی وجہ سے حالات بہت
 خستہ و خراب ہو گئے تھے دوسرے تو اس کے دل سے جینے کی امنگ ہی جاتی رہی تھی۔ بوسے رونے کھتی۔ بچکانہ نماز ادا کرتی۔
 یکن عید کے دن لباس نمک تبدیل کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی بھائی بیگانہ تھے تو بھائی سخت ہزار اور نالاں۔ وہ لباس
 پر تو باندھتی پرواہی کسے ہوتی تھی۔ مگر اس عید پر تو بڑے غلوں سے اس کے لیے عمدہ لباس نوا یا گیا تھا جسے بڑے اہتمام کے ساتھ
 پہن کر اس نے اتنے سارے لوگوں کے درمیان رہ کر گویا زندگی میں پہلی بار بڑی امنگ کے ساتھ یہ عید منائی تھی تو وہ بھی کس قدر
 دلچسپی اور عوس ثابت ہوئی تھی اور وہ۔

بڑے رنج اور تاف سے پہنے لباس کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ دوسروں کا بھٹنا ہوا یہ لباس پہن کر اور اتنی ٹیپ ٹاپ
 کرتے ہیں۔ ایسا کیا کیا ہوا ماسو انجروی اور اپنے کید و تنہا ہونے کے تکلیف دہ احساس کے جوشاید ماں کے پیٹ سے ہی اس کے
 ۔ جو بھٹنا ہوا تھا۔ اور یہ سارے اہتمامات۔ یعنی یہ لباس۔ یہ میک اپ اور جوڑیاں وغیرہ تو ان لوگوں کو ہی زیب دیتے ہیں جن
 کوئی مڑنے والا ہوتا ہے۔ چاہنے والا ہوتا ہے۔ تو پھر اتنا کر بھینک کیوں نہیں دیتیں۔ پ۔

کیا تامل ہے؟

کس کا انتظار ہے۔؟

تبدار کوئی ایسا ہے طے والاتی نہیں جسے دیکھا کر دماغ صاف کرو۔ اپنی تعریف پر کھل اٹھو

ہوئے بے وقوفی ہے ہر امر۔

وہ کچھ ایسے ہی دل آزار سے خیالات لیے کچھ زیادہ ہی ملول اور افسردہ سی دوپٹے کو بیدلی سے بیڈ پر ڈال رہی تھی کہ دفعتاً دروازہ
 پر پڑوہوڑا سا کھسکا اور اسفند اندر داخل ہوا۔

”کبھی بھی نہیں۔ میں آپ چلے جائے“ اس کی موجودگی اسے بڑا مضرب کردی تھی۔ یوں لگی کہ کسی نے کہا کہ وہ نہیں۔
 ”ہائیں یعنی چلا بھی جاؤں۔ مگر یہ عتاب کس سلسلے میں؟ آخر میری خطا“ اس نے قدم بڑھا کر جھکے ہوئے چہرے پر غور کیا۔
 ”نہیں نہیں۔ کبھی خطا کیسا عتاب۔ میں آپ جس مقصد سے آئے تھے وہ تو برا ہو گیا نا۔“
 ”بھلا کس مقصد سے آیا تھا میں؟ وضاحت کر سکیں گی؟ وہ ایک دم ہی پھر شروع ہو گیا۔ اور وہ اپنے غلط اظہار میں نہ کرنے پر کٹ کر رہ گئی۔ جلدی سے بات بنا کر بولی۔
 ”عید کا مبارک باد دینے آئے تھے نا آپ سو مے دی“

”گویا اب میں چلا جاؤں۔ یہی چاہتی نا آپ؟“ وہ عجیب چپکلی سے انداز میں مسکرا کر بولا اور وہ اشتباہ میں مبتلا کر دے۔
 ”اچھا اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں اسے رد تو نہیں کر سکتا۔ وہ قدر سے سنجیدہ ہو کر بولا اور اس نے خاموش رہنا چاہا۔
 یوں بھی اس خیال سے کہ کوئی اسے بلانے آیا تو کہے اس کے دم پر ہی جاری تھی۔
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن ہمارے ہاں خالی غولی مبارکباد دینے کا رواج نہیں ہے۔“ اپنی بات کہنے کے دوران میں اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بزنس پیپر میں لپٹی ہوئی کوئی شے نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
 ”بھئیے۔ مگر قبول افتد۔“ مجھے بڑی مسرت ہوئی، مگر وہ قدم اور پیچھے ہٹ گئی اور مستغفرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
 ”یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟“

”صرف ایک حقیر سا نذرانہ جو بندہ عاجز عیدی کے طور پر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہے۔“ وہ عقیدت سے انداز میں تھوڑا سا جذباتی ہو کر بولا مگر وہ مزید چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔
 ”نہیں نہیں۔ آپ رشتے میں مجھ سے چھوٹے ہیں اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔ میں کسی سے بھی کوئی تحفہ وصول کرنے کی قائل نہیں ہوں۔“
 ”مگر میری بات اور ہے۔ کیا اس حقیقت کو آپ ٹھیکلا سکتی ہیں جو اس قدر غیر سرت برت رہی ہیں۔ اچھا چھوڑیں اس خلف کو۔ میں خود ہی آپ کو بہانے دیتا ہوں۔“

اس نے بزنس پیپر کو بھلا دے ہوئے کہا اور پھر سرخ رنگ کے ٹھیکس کیس کو کھول کر اس میں رکھا اور عید کا تحفہ اسے دکھایا۔
 ”کیس میں بھلائیوں اور فروزے کا جڑاؤ ٹیکس دیکھ کر وہ بری طرح شیطانی لیکن اسفند نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جلدی سے وہ ٹیکس اس کی صراحی وار خوبصورت گردن میں پہنا دیا اور پھر بڑی گہری اور پسندیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
 ”ماشاء اللہ۔ شاید یہ ٹیکس خاص طور پر آپ ہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کس قدر رنج رہا ہے آپ پر؟“
 اپنی تعریف تقریباً سب ہی کی کمزوری ہوئی ہے اور تعریف بھی وہ ہستی کرے جس پر اپنا سب کچھ واردینے کو ہی چاہتا ہو۔
 ”سولو کمزور لمحوں کی گرفت میں ایک بار پھر آگئی تھی۔
 اپنی تعریف پر اس کے رخسار دھکنے لگے۔

بارہی سے پلکیں بھی رخساروں پر جھک سی گئیں اور یوں تشکر کا ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔
 ”فرار اچھا ہے۔“ وہ شفق کا بازو دیکھ کر سنگھار میں کڑھتا ہوا بولا اور اسے سنگھار میں لے آئے کے سامنے کھڑا کر کے بولا۔
 ”خدا دیکھیے تو کتنی خوبصورت لگے ہیں آپ۔ میری آنکھیں خوشیہ ہوئی جا رہی ہیں۔ اور وہ سرخ ہوتے جیسے اور خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ آتش پر صرف ایک ایسی ہی سی نظر ڈال کر دیکھ کر وہ اس کے سینے پیچھے کھڑا آئینے میں ہی کچھ ایسی پریش اور ناراضگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسے اس سے نظر ملنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکی۔
 ”شاید آپ کو پسند نہیں آیا؟“ اس نے آئینے سے نظریں ہٹا کر سولو کی چمکی چمکی سی بار بار نظروں پر انہیں مرکوز کر کے پوچھا۔
 ”نہیں تو۔ بہت ہی اچھا ہے۔ انتہائی خوبصورت۔ آپ کا بے حد شکریہ۔“ وہ اس کی دل آزاری کے خیال سے کچھ زیادہ ہی پسند کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔
 ”ارے نہیں ممنون اور مشکور تو میں آپ کا ہوں کہ آپ نے اسے پسند کر لیا۔“

”اتنی اجازت تو دے دیں گی نا کہ اس پر اپنے دلی تاثرات ثبت کر دوں۔“ وہ اس کے خوبصورت ہاتھ کو غور سے دیکھتا ہوا اپنی

چہ بول۔۔۔ مگر نہیں۔ اب زیادہ فری ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔“ سولو نے اندر ہی اندر گہر کر بھلا کر شگفتہ لبوں سے ہنس کر کہا۔
 ”اوہ۔۔۔ مگر نہیں۔ اب زیادہ فری ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔“ سولو نے اندر ہی اندر گہر کر بھلا کر شگفتہ لبوں سے ہنس کر کہا۔
 ”نہیں نہیں۔ اب زیادہ فری ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔“ سولو نے اندر ہی اندر گہر کر بھلا کر شگفتہ لبوں سے ہنس کر کہا۔
 ”نہیں نہیں۔ اب زیادہ فری ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔“ سولو نے اندر ہی اندر گہر کر بھلا کر شگفتہ لبوں سے ہنس کر کہا۔

وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔

وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔

وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔

وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔
 وہ اندھ نظر بیکار کا مدھنکا کی شکل۔

اسفندیار کا ایک اس کی طرف گھوما اور اس کے خالی گئے نظر ڈال کر بولا۔

”میں نے وہ فیکس خاص طور پر اسی اوکیشن موقع پر بیٹھنے کے لیے آپ کو دیا تھا کہ اگر زنیور کے معاملے میں فیکس کیلکس کا شکار نہ ہوں مگر آپ شاید ان بار کیوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں یعنی تو اسے کہیں پینک انی مرزا پر معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسی بے قاعدگیوں برداشت نہیں کر سکتا۔“

آغا کمرہ کی تیزی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔ آف کیسا کیلا اور روشن لہجہ تھا اور اس نے کہا بھی تو کیا کہ اسے مزاج اور سخت سے سخت بات کو سہارا ملنے والی لڑکی کو جسے اول تو کبھی غصہ نہیں آتا تھا اور کبھی آتا بھی تھا تو وہ دھڑک کر کے اور دھڑک کر خود کو ہی سزا دے لیتی تھی کہ منہ سے کچھ نہ کہے یا کسی اور پر اپنا غصہ اتارنے کا اس میں ہوتا ہی کہاں تھا اس کو اس سے کچھ اتنا غصہ نہ آیا۔ اس کا جی چاہا ہر شے کو چھونک کر رکھ دے۔

سارے جسم میں آگ سی بھڑکتی تھی اور ہال کو ڈارنا اس سے دو چہرہ ہو رہا تھا۔ وہ بلیٹ کو زنیور کہنے کے بجائے ہی فیکس کی کیفیت میں باتیں لینے ڈانٹک ہال سے باہر آگئی۔ کہ اب ایک منٹ بھی وہاں کرنا اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ ایک بیلیٹ نما آراستہ دیر آستہ سے کہے میں بہت سے ملازم اور سرے کھانے کی قافیں اور دوڑتے اور کرشمے اٹھاتے ہوئے آ جا رہے تھے اور انہیں میں اتفاق سے اسے سپیل منصور کا نوکر مارشل کریٹ ہاتھوں پر اٹھانے آتا نظر آیا تو اس نے ٹوڑی سے دھڑک کر کہا۔

”سونا شل۔ یہ کرپٹ کسی اور کو دے دو اور بھاگ کر قدیر کو باہر سے بلالو میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے اور میں فیکس گھر جانا چاہتی ہوں۔“ مارشل اس سے بھی طرح واقف تھا کہ وہ شعیب منصور کے گھر کی ایک فرد ہے۔ اس پر اس کے اندر میں اس نے اپنی تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بلاتل جی آگیا کہ کر قریب سے گزرتے اس کے سر سے کے ہاتھیں کرنا شروع اور پھر فوراً ہی قدیر کو بلانے لگا۔ اور وہ بیچ اور کو روک دیکر خود کو غور کر کے پورچ کی میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ کہ وہ کسی کے ٹوہین لانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ بار بار پھر کر ایکا لکھ گھڑے کا ارادہ کر بیٹھی ہے۔ یہ بھی بہت غیبت ہو اٹھا کہ اس نے سب کا کھنچ میں مصروف تھے اس لیے سنی نے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔

پھر تصویر ہی دیر بعد مارشل قدیر کو سنا تلے واپس آگیا۔ مگر قدیر کا دل نہیں بلکہ پیدل چل کر آیا تھا۔ کیونکہ اس روز موت کی وجہ سے ساری کاروں کو گیسٹ سے باہر ہی پارک کر دیا گیا تھا۔ اس نے قدیر کے سامنے بھی یہی بات دہرائی جو مارشل سے کہی تھی۔ تو قدیر بولا۔

”جی اچھا۔۔۔ میں آپ کو منٹوں میں گھر چھوڑ آؤں گا۔ بس ذرا صاحب بہادر سے اجازت لے لوں۔“ تو وہ بڑک کر بولا۔

”لو اب اتنی ہی بات کے لیے اجازت لوگے کیا مجھے جانتے نہیں تم۔“

اور مارشل نے بھی کہا کہ بس چند منٹ کی تو بات ہی ہے۔ اجازت لینے کی ضرورت ہے جا کر جلدی سے سنی کو گھر چھوڑ آؤ۔ تب کہیں جا کر قدیر نے اسے گھر لے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور اسے کہہ بیٹھو راناؤں کی سمت روانہ ہو گیا۔

پھر اسے پھر تیار ہونے کے لیے کہہ کہ کن راستوں سے گزرتی رہی۔ قدیر نے ہوائی جہاز کی رفتار سے کار چلانی اسے تو اس وقت ہوش آیا جب کار شعیب منصور کے گیسٹ میں داخل ہوئی۔

کریم اس لیے گیسٹ کے نزدیک کبھی جا رہا تھا کہ وہاں سے باتیں مٹھا رہا تھا گاڑی کو گیسٹ پارک کرتے دیکھ کر وہ جھٹکا ہوا آیا۔ اور جلدی سے گھر کا داخلی مقلد روانہ کھول دیا۔ اصل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید گھر والے واپس آ گئے ہیں۔ مگر جب اس نے گھر کو کار سے برآمد ہونے دیکھا تو اسے سخت اچھٹا ہوا۔

”سلوٹی بی بی آپ۔۔۔ آپ کیسے آگئیں۔۔۔“ وہ اپنے جتس بہ قابو نہ رہا کہ اس نے بوجھا۔

”میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے جلی آئی ہوں۔ اور سب تصویر دیر بعد آئیں گے۔ تم ایک روک کہ باہر دروازہ کی طرح لاگ کر دو اس لیے اپنی طبیعت کی خرابی کا اظہار اپنے لب و لہجہ سے بھی کیا۔“

”ابو تو آپ کے لیے چائے یا کافی بنا دوں۔ یا پھر ٹیڈی بوتل لا دوں۔“ اس نے یہ کہہ کر گویا اخلاق نبھایا۔

”نہیں بس ہربانی۔ میری طبیعت بری طرح مارشل کر رہی ہے۔ میں اب بڑکے سوؤں گی۔ بس تم اتنا روک کہ باہر دروازہ لا کر دو۔“

کرم کی خاطر داری اس سے سخت کھلی۔ وہ قدرے بیزار کن سے لہجے میں بولی۔ اور پھر سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

دماغ میں اب تک سرخ آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اور بدن میں شعلے سے دھک دے تھے۔

پورے راستے وہ کچھ ایسی ہی کیفیت میں تپتی آئی تھی۔

کرم نے کچھ کی صلاحیت بھی مفقود ہو گئی تھی۔

گراؤ نہ دیا تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے پر دھیر دھیر سے ہی ساری صلاحیتیں۔

گراؤ نہ دیا تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے پر دھیر دھیر سے ہی ساری صلاحیتیں۔

ساری حیات یکدم جاگ اٹھیں اور اس کے ساتھ ہی اسفندیار کا تحقیر آمیز رویہ اور اہانت آمیز الفاظ بھی۔

اس کی گفتگو تو اب بھی سماعت میں مسلسل ٹیپ کی طرح بج رہی تھی۔

”میں نے وہ فیکس خاص طور پر اسی اوکیشن پر بیٹھنے کے لیے آپ کو دیا تھا کہ اگر زنیور کے معاملے میں فیکس کیلکس کا شکار نہ ہوں مگر آپ شاید ان بار کیوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں یعنی تو اسے کہیں پینک انی مرزا پر معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایسی بے قاعدگیوں برداشت نہیں کر سکتا۔“

آغا اس نے سب کیوں کہا۔ کیوں کہا۔

کیا مجھے وہ مجھے۔ کیا میں ایسی ہی گری بڑی ہوں یا اس کی محکوم ہوں۔

صاف ظاہر ہے وہ میری ذات میں اپنی دہشت کے سامان ڈھونڈنے کو مجھ سے ایک جزوقتی کیل کیل رہا ہے۔

درنا اس کی نظر میں میری کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں۔

وہ صرف میری خوبصورتی اور جانی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

جب تو انا خود مختار ہوتے ہوئے بھی اس نے آج تک مجھے کسی معاملے میں بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب کے سامنے وہ مجھ سے اس قدر لالعلقی اور دور دور رہتا ہے۔ جیسے میرا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

اور میں ہوں کہ زندگی کا ایک سنگین تجربہ اٹھا کر بھی اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گئی۔

سب کچھ جانتے ہوئے بھی کتنی آنکھوں سے دھوکا کھاتی۔

تف سے مجھ پر۔ جو میں نے اس کے چند جذباتی نقود سے متاثر ہو کر اس کا تحفہ قبول کر لیا۔

وہ بھی۔ کسی اور کی امانت ہوتے ہوئے ایک غیر محرم شخص سے صاف اور صریح گناہ ہی ہوا ہے تو۔

تجبی تو اس کی اتنی جلد راز بھی مل گئی۔

اور سب سے بڑھ کر گناہ گاری کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس سے دل ہی کیوں لگایا؟

کیوں ایک غیر اور نامحرم شخص کی محبت میں گرفتار ہوئی۔

وہ بھی سب کچھ جانتے ہوئے۔

انتہے تجربہ بات اٹھانے کے بعد۔

میری امت واقعی ماری گئی تھی۔

بے یمن اس جان العری کی شوریدہ مری نے نہ دھائی کر دیا تھا۔

درنہ سب کچھ جس کا وہ گاہے بگاہے مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ اسے کچھ لینا کچھ اتنا مشکل تو نہ تھا۔

مگر میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی دھوکا کھاتی رہی۔

سارا قصور میرا ہی ہے۔

وہ غصے اور تلافی کی آگ میں جلتی بڑی دیر تک اپنے لہجے پر بھی سب سوچتی رہی۔ پھر اس خیال سے کہیں وہ لوگ واپس آکر اس سے اس کے یوں بلاتے ایک دم ہی وہاں سے چلے آئے پر استفسار نہ کرنے آجائیں وہ جلدی سے اٹھی۔ لباس تبدیل کیا اور اپنے نزدیک وہ ٹیبلٹس انکسٹنٹ ہماری سے لگا لکھنا کھول کر باہر آئی۔ اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ان لوگوں میں سے ابھی تک کوئی ایک بھی واپس نہیں بلٹا۔ اس نے سیدھا اسفندیار کے کمرے کا رخ کیا۔

”دروازے کا کھٹکا تو کھلا ہوا ہے بجائی جاویں۔ آپ اندر آجائیے۔ اس نے بستر پر بیٹھ لیٹے ہی دروازے کے پت کھول کر اندر آ گئیں۔ تھوڑا تو اچھے نہیں تھے مگر اسے بستر پر لیٹا دیکھ کر انہوں نے یہ کہیں خراب ہو گئی تھی تو مجھ سے یا چھوٹی دلہن یا پھر بچپنوں سے ہی کہہ دیا ہوتا۔ نہ کہتے ہوئے ہی وہ بہت کچھ کہنے سے گزیر گیا اور قریب آ کر بولیں۔

”بہتر ہے کہ میں نہیں ضرور لینے کا سا تھا۔ اچھا۔ مگر مارشل اور تندر کو تو اچھی طرح معلوم تھا کہ طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے میں گھر آئی تھی۔ کے کپتے پر تدریجی تھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ لوگوں نے کم از کم ان دونوں سے تو پوچھ لیا ہو تو۔ جو تھوڑا عوامی وقت رہا دیکھو۔ سلوٹو بھی تدریس کیلئے مجھے میں بولی۔

”خیر وہ موجود ہونا تھا سو ہو گیا۔ مگر آپ کی طبیعت ہے تمہاری جو خلاف معمول ابھی تک لیٹا نظر آ رہی ہو نہ زینت اس کی مزاج پر ہی بھی کی تو بھلا کسی طرح۔ طبیعت تو رات ہی خراب ہو گئی تھی میری۔ اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی سی کسٹمنڈی محسوس ہو رہی ہے۔ لیٹے لیٹے تو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ البتہ آپ کو مجھ سے کوئی کام لینا ہے تو اٹھ جاتی ہوں۔ سلوٹو نے کہا تو زینت جلد سے بولیں۔

”نہیں نہیں تم لیٹی رہو۔ کاموں کا کیا ہے وہ تو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔ اچھا اگر تمہاری طبیعت خراب ہے تو میں تمہارا ناشتا نہیں کرے میں بھجوا دیتی ہوں۔“ انہی بات کہہ کر وہ کریم کو آواز دیتی ہوئی اس کے کمرے سے نکلتی۔ انہوں نے ہر بات اپنے مطلب کی تھی۔ مگر جوئے میں بھی یہی نہیں پوچھا تھا کہ ایسی کیا طبیعت خراب ہو گئی تھی تمہاری۔ اور آپ کو ہو؟ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس سے کام لینے کی غرض سے ہی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ اصل میں عمار کا وہ دن تھا اور رات کو ناز پر درے شہر ہزار دوسرا دل والوں کی دعوت تھی۔ اور زینت ہی چاہ رہی تھیں کہ وہ اگر ناشتا کھاؤ بیٹھے مگر اس پر بھی غصہ موار تھا۔ اور سب سے براہ کرم۔ ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی ناقدری پر وہ اس دن برداشتہ ہو گئی تھی اس لیے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیے سارا دن بستر میں ہی پڑی رہی تھی۔

مگر دروازہ تو یہاں نہیں چل سکتا تھا۔ جبکہ وہ خود بھی اس قدر آرام کرنے کی عادی نہیں تھی۔ گندہ شب بھر بھی اس کی مزاج پر ہی کوئی تھی اور کوئی شرتو خاصی دیکھ کر اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ کچھ اس لیے بھی اس کے دل سے محظوظ نہ ہو چکا تھا۔ یوں بھی اسے اگر کسی بات کی فکر تھی تو وہ اسفند کو اس کا دیا ہوا نیکیس لوٹانے کی۔ جس کے لیے اس نے ہزاروں یہی توسیلاتوں ترکیبیں ضرور سوچی تھیں۔ اور اسی سوچ و بچار میں مزید دو دن اور گزر گئے تھے تب بھی اسے یہ ترکیب بہت مناسب اور موزوں لگی کہ کسی طرح خود اس کے کمرے میں جا کر وہ نیکیس کہیں رکھ آئے۔ کوئل یہ تھی کہ پہلے تو عید کی چھٹیوں کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر ہی میں رہتا تھا اور جو باہر بھی جاتا تو ہمیشہ اپنا کمرہ مقفل کر کے ہی جاتا تھا۔ پھر چھٹیوں ختم ہو گئیں تو وہ اپنی دیوٹی پر جانے لگا۔ گھر واپس لوٹا تو۔ جس زیادہ ترانے کمرے میں ہی رہتا تھا۔ البتہ ناشتے اور کھانے کے وقت وہ اپنا کمرہ کھلا چھوڑ کر ہی نکلتا تھا۔ اور سلوٹو نے دن وقت اور موقع نا کا تھا۔

اس روز اتفاق سے عام تعطیل کا دن تھا۔ عید کو گزرے کل چھ روز ہی ہوئے تھے۔ مگر عید کی خوشیاں اب تک جاری رہی تھیں۔ جیسی کہ دن زینت اس وقت کریم اور جعدا سے اس کے کمرے کی صفائی کرائی تھیں جب وہ ناشتا کرنے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔ اور چونکہ اس کا قاعدہ تھا کہ کبھی کے دن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد لاٹھی میں بیچہ کچھ وقت اخبار بینی میں گزارتا تھا۔

گویا سلوٹو کے خیال میں نیکیس اس کے کمرے میں رکھ کر لے لائے اس سے بہتر کوئی موقع ہی میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے وہ اس سے بدظن اور کبیدہ ہوئی تھی اس نے اس کے سامنے پڑنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ جی کہ اس کی وجہ

دہانت بھی علیحدہ بیچہ کر کے تھی اور کھانا بھی کوئی نہ کوئی مہاندہ کر کے کھانے کا وقت ٹال کر کھاتی تھی۔ اور اس روز دس نوٹس کے تحت میں وہ ناشتا کرنا ہی قبول نہ تھی۔

دس نوٹس کے تحت میں وہ ناشتا کرنا ہی قبول نہ تھی۔ دس نوٹس کے تحت میں وہ ناشتا کرنا ہی قبول نہ تھی۔ دس نوٹس کے تحت میں وہ ناشتا کرنا ہی قبول نہ تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اسفند کب کا ناشتا ختم کر کے لاٹھی میں جا چکا تھا۔ اور بس یہی موقع تھا سب سے بہتر نے اپنے کا انتظار کر رہی تھی۔

بس اسی طرح خاموشی سے اسے چاہتی رہے گی جیسے اب تک چاہتی آ رہی ہے کچھ دھنستہ تو اس کی دھنستوں نے دھو ڈالا تھا اور کچھ۔ ان ساری باتوں نے۔ جو وہ صرف اپنے ضمیر اور دل کو اطمینان دلانے کے لئے اس سے مخفی کر رہی تھی کہ وہ سب کھلنے کے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ وہ بستر پر ایک زانو لے کر ایک ہی پہلو سے کھائے ہوئے تھی۔ دل تپتی ہوئی رہ رہا تھا گردن اس کو ابھی سے اٹھانے کے لئے تیار تھا۔ وہ غمگین نہیں تھی۔ وہ تو ایک دم ہی باہر سے جوتیوں کی کٹ کٹ کی آواز آئی تو اس نے بے خبری سے اس طرف توجہ دے کر دھڑکیا۔

”اوہو سلو تو آپ یہاں بھی بیٹھی ہیں اور وہاں کھلے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ جیسے ناجلدی سے مرزا بھوک کے مارے ہو رہا ہے۔“ نیلغا دروازے سے ہوتی آتی تھی۔ کئے کا انداز کچھ میز رکن سا تھا جسے محسوس کر کے سلو طے لکھ ”اے ایسی سخت بھوک لگ رہی تھی تو قہر نے کھا لیا ہوتا مجھے کیوں بلانے لگیں۔ اور آج ایسی کیا خاص بات ہو گئی بلانے لگیں۔“ ورنہ میں تو بنا بلانے خود ہی پہنچ جاتی ہوں۔ اب بھی بس آ رہی تھی۔“ نیلغا اس کے ساتھ ہاتھ کرتی گئی۔ ”یہ تو میں نے ہی کہا تھا کہ سلو تو آپ بس آتی ہی ہوں گی۔ مگر بھائی جان انہیں بھلا کون سمجھا سکتا ہے۔ بے کسی آپ کی کیا ہو گی کہ حکم صادر کیا کہ پہلے سلو کو بلانے چکھ کر نثار دے کر لے۔“ نیلغا بولی۔ اور اس کا دل آہستہ سے دھچکا کھا کر چھوڑ دیا۔ ”پہنچ چھ تو بڑی زیادتی کی تم پر تمہارے بھائی جان نے۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔“ اس نے بے باک مذاق میں ڈاڈا۔

”اُسے چلو بڑی شرم ہو گئی ہو تم۔ وہ بے چارے سب کے ساتھ۔ اخلاق برتتے ہیں میری خصوصیت یہ کیا ہے؟“
 نے ایسا منہ بنالیا جسے نیلے کا مذاق اسے گر آن گوارا ہو۔

نیلات بھی فقرہ چھینکنے سے باز نہیں آئی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے دونوں جُپ چاپ جا کر اپنی اپنی کرسی پر گھس گھس کر بیٹھ گئی۔

بھئی، اب اتنے عرصے سے یہاں رہی ہو گھری کی ایک فردن گئی ہو پھر بھی اس قدر تکلف سے کام لیتی ہو۔ کبھی ہاکی نہ چیرنے لیا کرو۔

”ہاں یہ تو کسی حد تک درست ہے۔ اس روز ہسپتال صاف کے سہاں بھی۔ سب سے اگک تھلگ سیر ی تھیں۔ جاں بچو۔“

یوں بھی۔“

مگر سنا اور ملس ہو، تو اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب آپ لوگ بھی ان سے کس ہونے کی کوشش کریں۔

بجز یہ ہو کر نہیں۔ لیکن یہ کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔ مگر کچھ تھو خود ان کا بھی ہے کہ یہ

تے کے انتقام پر یہ ہلکا سا تہقبہ لگایا۔ تو میرٹے کیلوفنی طرف دیکھا۔ اور بولیں۔

”اسفند سوئیٹ ڈش سے اپنی پلیٹ میں۔“

اب آپ کیوں چپ ہیں، ابھی تو کچھ اظہارِ خیال کیجئے۔ "زینت نے شعیب منصور سے کہا۔

[illegible]

اس لئے اسے زینت کے بجائے ہونے موڈ کی پردا ہونی، نیلوفر کے پھولے ہوئے منہ کی۔
کہ شعیب مضمون بھی تو اس کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

کمال ہے لیکن ایسا کیا کہہ دیا جو آپ مجھے یہ شکوکہ کر رہی ہیں بہ شعیب منصور نے گردن کو ایک جھلک سلائے کر کہا۔

”محمی ہم ریست ہاؤس میں ٹہریں گے۔ میں نے سوچ ہی خون کر کے دو کمرے ریزرو کرالیے ہیں۔ پھر دریاں اور قلعہ بھی دیکھیں یہ بھی جو جہاں ہے گا۔ مہرودریاں اور قلعہ بھی سے جائے ہوں گے۔ ورنہ بیسیں گے کہاں۔“

چاہیے کہ وہ چلتے پرچہ ہو جائے۔ انہوں نے ایک محنت کرنے والی ماں بن کر دیکھ کر ہنس کر کہہ دیا۔
مقتا اسے اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف محض اولاد کی خوشی کی خاطر کے لیے بعض باتیں کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔
پھر وہ سسلوٹ کی طرف بڑھتی ہوئی اونچی آواز میں بولیں۔

”ارے یہ تم کباب بنانے کیونکر مہم ہو گئیں۔ ہاتھوں میں مہمیں لگ گئیں تو ساری رات نیند نہیں سنے گی۔
یہ فعلوں کام۔ خانا ماں کے ہاتھوں میں کیا مہم کی گئی ہے جو خانا سلام بھی نہیں کر سکتے۔“

ابھی کچھ دیر پہلے کھانے کی میز پر اپنی نشتر زنی اور پکا کر ایک دم کی کاپلیٹ سے زینت کا یہ دھوپ چھان رہا
اس کی چھ مہمیں بڑا یادہ تعجب اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں ان پر ایک نگاہ ڈال کر بولی۔

”مگر بھائی جان خانا ماں بے چارے کو تو ابھی کتنی چیزیں تیار کرنی ہیں۔ کیم بھی اس کے ساتھ کام میں نہ جاوے
ہے پھر بھلا یہ درجنوں کباب کون بنائے گا اور کون تلے گا اور اب میں باقی نازک بھی نہیں ہوں کہ مہمیں لگنے کی دوسرے
سو بھی نہ سکوں۔ یوں ہی جب کام کرنا ہی ٹھہر آؤ تکلیف کو بھی برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔“

اس کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اپنا نیت بھری ہمدردانہ گفتگو
متاثر ہوئی ہے بلکہ اس نے تو ان کی بات کا جواب بھی کچھ انکار کر دیا تھا کہ وہ اپنا سامنے لے کر دیکھ لیں۔ پھر بھی
کسی طرح اسے چلتے کے لیے آمادہ کرنا بھی ضروری تھا۔ کچھ زیادہ ہی شہدائیں لہجے میں بولیں۔

”ارے چھوڑو یہ اس وقت کیا شیخت دکھانے بیٹھ گئیں تم۔ یہ بھی بھلا کوئی تمہارے کرنے کا کام ہے۔
”شیخت کیسی بھائی جان۔ کمال ہے آپ نے تو کیا ہمتا کہ خانا ماں اور کریم کو تو برا بھلا کرنے کی بھی مہلت نہیں
ڈراتم جا کر کم از کم شافی کباب بھان کر کے شیخت دکھانے بیٹھنے پر وہ گردن کو اڑھستہ سے جھٹکے قدرے تکیے سے بیٹھ
بولی تو زینت نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔“

”ارے وہ تو میں نے اس خیال سے کہہ دیا تھا کہ ماشاء اللہ تمہارے ہاتھ میں مہارت ہے تم ذرا اپنے سامنے سال
وغیرہ ڈلوادو گی اور تم ہو کہ ساری ٹھیکہ لڑی۔ اپنے سر لے کر کھینچ لیں۔ چلو ایسا ہی کارنے کا شوق ہے تو صرف تھک
ٹھکیاں بنا دو۔ تن کوئی اور لے گا تم کو جلدی سے جا کر سو جاؤ۔ مگر میں نے کبھی کارنہ کا سونا۔ الارم والی مہمیں تو
گی تمہارے کرے میں۔ مگر سسلوٹ نے الارم لگا کر سونے کی بات سنی ہی کہ۔ وہ تورات کے تین بچے اٹھنے لگا کہ
ہی بدگئی۔“

”لیکن تین بچے اٹھ کر کیا کرو گی بھائی جان۔ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے میں کباب تل کر کھا لیں میں رکھ دیتی ہوں
پھر تو تشنہ نہیں ہوں گے یہ کباب۔“

”ارے۔۔۔ میں کوئی ایسی پاگل ہوں جو رات کے تین بجے تمہاری نیند میں فعل ڈال کر تم سے کباب تناول کر لیں
تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تم دیر سے سوئیں تو میں بچے اٹھنا مشکل لگے گا۔ ایسا کرو کہ ابھی سے کوئی معقول سا لباس لٹا
کر رکھ لو۔“

زینت ہنس کر بولیں۔ جلتے کیوں اس لیے اصل بات کہنی ان سے مشکل ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ بیٹے بھتیجے
ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اس کی لگوتی اور بھتیجی چھو بھی سے کوئی بھتیجی وغیرہ نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے دل پر چڑھا
اس سے اتنی یگانگت برت رہی تھیں ورنہ وہ اس کی بات سے کہہ دیتا۔

”لباس نکال کر رکھ لو بھائی جان؟“ سسلوٹ نے کچھ بڑا اتنا اس نے منع کر دیا۔
”ہاں بھئی۔ کپڑے نکال کر ساتھ ساتھ استری بھی کر کے رکھ دو گی تو بس نہیں۔ وقت کے وقت پہننے کا
کسر ہی رہ جائے گی۔“ انہوں نے پھر بھی اپنا مقصد واضح نہ کیا۔

”میں تو کیا آپ لوگ مجھے رات کے تین بجے چھوٹے آکا کے یہاں ڈراپ کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ تعجب سے اچھ
کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

”ارے کیا بچہ جی جی مجھے باؤلا سمجھ رکھا ہے تم نے جو رات کے تین بجے نہیں سہیل بھائی کے یہاں ڈراپ کرو گی۔
پلنگ پر نہیں چڑھا کیا میں نے تو شام کو ہی نیلسے کہہ دیا تھا کہ تم کو بتا دے مگر شاید وہ بھول گئی ہوگی۔ یوں بھائی جان

زینت نے ہنس کر بولی۔

بہنوں نے اپنے اپنے شانوں پر کیمڑے اور دودھ بنیں لٹکا رکھی تھیں۔ اور نسلانے ایک ہاتھ میں ایک چھڑا لے رکھا تھا۔ نیلانے بیروں میں جو گرز پھنس رکھے تھے اور نیلو فرنے کو رٹ شوز سمیٹ دینوں کے لیے اسکارف باندھ رکھے تھے۔

یعنی وہ انہوں نے جو نئے رائیڈنگ ہورس انھیں مسواری کے ٹھوڑے، خریدے ہیں ان کے لیے جدید طرز کا اصطبل

”نہیں۔ میں کیوں پوچھنے لگی“ نیلو فرنے برا سامنے بنا کر کہا۔

نیلما طغنا کرتی ہوئی بولی تو نیلو فرلا جواب سی ہو کر بولی۔

کہ مجھے سلطو کے دو بے سے شرمندگی سی جو رہی تھی۔ کہ کبھی جھینپ رہی ہیں، کبھی شرابی ہیں اور کبھی پونہ لڑتے ہیں جیسے کسی کو خاطر میں نہ لاری ہوں۔ ایسی ٹیکس سے تو ایک دم عاری ہی ہے یہ لڑکی۔ نیلو فرنیچر سے غریب توڑے۔

”ہاں۔ وہ ملس ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔ مگر نیلما نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عروج ان کے نزدیک نیلما کو چپ ہو جانا پڑا۔ شروع شروع میں تو سب آہستہ آہستہ چل رہے تھے مگر تھوڑے آگے جا کر سب تیز رفتاری تھی۔

”بھی آسمان کی دور اور جاننا ہو گا؟“ مبینہ کی صوفی کی بھائی طلعت نے راستے کی طوالت سے اکتا کر پوچھا۔
”بس تقریباً نصف فاصلہ رہ گیا ہے“ مبینہ نے بتایا۔

”پھر تو ہمیں دوڑ لگانی چاہیے تاکہ یہ فاصلہ کسی طرح ختم نہ ہو“ طلعت کی بہن نے رفعت بولی۔
 ”نہیں بھئی! یہاں چلنا مشکل ہو رہا ہے اور تم دوڑ لگانے کو کہہ رہی ہو۔ اگر اسی سے تنہا گئے تو کچھ سارا یہ گزراں گے“ طلعت ہنسنے لگی۔

”تنگری کچھ زیادہ فاصلہ تو نہیں مشکل سے تین فرلانگ ہی ہوگا اور ہم دونوں تو صبح جو گنگ کے لیے نکلے ہیں دو دو میل تک بھاگتے چلے جاتے ہیں“ تمیزہ بولی۔

”بھئی پکنک پر آئے ہیں۔ کوئی زبردستی تو نہیں لائے گئے۔ تھوڑی بہت اسپورٹ میں شپ تو سمجھیں میں بولی جاتی ہوں۔“

وہ سب کے سب جن میں ٹینک کے دو کزن بھی شامل تھے ایسی بگڑتی سی گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف میں سبزہ سی سبزہ اور درخت سی درخت اُگے ہوئے تھے آگے آگے ایک دختر اور اس کے ساتھ ایک لڑکا اپنے ہاتھوں میں

میں گھوم کر کھیتوں کی طرف چلا گیا اور یہ لوگ ایک چٹانی سے علاقے میں داخل ہو گئے۔ مگر یہ علاقہ اتنا مشکل نہ تھا۔ درخت اور پودے یہاں بھی اہل ہمارے تھے۔ صبح کی رو پہلی اوزنہ کی حرارت میں ڈوبی دھوپ اب غائب ہو چکی تھی۔

اصل میں اس کی پینل ریل اسے بہت تنگ کر دی تھی جسے بہن کروہ سخت کھنکھار رہی تھی کیونکہ گوسے چلنے پر اندازہ نہیں تھا کہ اتنا چلنا پڑے گا جب کہ چلنے پھرنے کی ٹوا کھی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ کوئی معقول پینل ایسی نہیں تھی۔

اس نے وہ کالا سینڈل پہن لیا تھا۔ وہ بڑھاپے

کسی کی وجہ سے اپنی تفریح میں وقت ضائع کیا جائے اور پھر وہ پیچھے ہی تو رہے گی۔ اسی لیے سب بہت بے فکر ہو گئے۔

زیر سے کٹ کر علیحدہ چیلے لگا اور جب وہ دونوں کھلی آگ نکل گئے تو وہ اسے دھونڈتا ہوا پلٹ کر پیچھے آگیا۔

میں نے کہا ابھی سے تھک لیں آپ۔

نہیں۔ میں تو بے گناہ تھا۔ تو اور کیا کرے گی۔ چلائے ٹینیل میں بھی کہیں پنک پڑھتی جانی ہے۔ تعجب ہے آپ کو اتنا بھی ظریف سمجھ کر کہ جانے کا اتفاق نہیں ہو آپ کو؟ وہ صاف گونہٹا اس لئے کوئی بات کہنے میں ہاک نہیں

[illegible]

یہ سب کچھ سن کر وہ بے حد غصہ ہوئی اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں نے اسے کیا کیا ہے کہ اس نے مجھے ایسا کر دیا ہے۔

وہ اپنی صاف گوئی میں تھوڑی سی نا اوری میں مبتلا رہا۔ حالانکہ وہ بہت سادہ جیسے میں بات کرتا تھا۔ ملائیکہ نے اسے لکھ لکھا دیا۔ دوسرے اس کی گفتگو کے ہر لفظ سے اسے طنز سا جھلکتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی باتوں سے وہ محسوس کرتی تھی۔ احساسات مجروح ہو کر رہ گئے تھے۔ دل کٹ کے رہ گیا تھا۔ اور دل تھا کہ کبھی جلنا رہا تھا پھر

نہیں۔ جب انہیں بہن کرلیک جہالت آمیز مقدم اٹھا ہی جکی ہوں تو اب انہیں اتاروں گی نہیں؟
خادمہ، ہر موچہ آملے مائے کھنے کی بڑی ٹوٹ چلے۔ اس نے جھٹنے سے انداز میں بوجھا۔

”نائب ہے۔ آخر اس بچکانہ سی فصد سے حاصل کیا ہو گا۔ آخر آپ کس وجہ سے اتنے شدید کمپلیکس کا شکار ہیں

وہ اس کی عقلی باتوں پر متعجب سا ہو کر بولا تو اس کا دل چاہا کہ سب سے بڑی کمی تو یہ ہے کہ مالی اعتبار سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ دوسرے آپ لوگوں سے میری کوئی رشتہ داری بھی نہیں ہوتی بس آپ کے بھیجھو کے

میرے سب سے بڑے بچے جانی ہوں۔ اسی لیے آپ کے ہاں میری قدر لی جاتی ہے۔ ذرا غصہ نہ کرنا، جیسے کہ دیکھ رہے ہیں۔

شہباز نے یہ بات بڑا غصہ سے کہی تھی۔ وہ آواز دھمکی سے کہتا تھا کہ اس کی کھڑکی پر ہاتھ نہ رکھو، ورنہ اس کی کھڑکی پر ہاتھ رکھنے والے کو مار ڈالتا ہوں۔

انجام دہی کو مقدم رکھیں، تھوڑا سا اس نئی تہذیب میں خود کو ڈب کر دیں۔ میرا مطلب یہ زمانے

انہیں نہیں نہیں۔ میں آپ کی امانت نہیں ہوں۔ میں سمجھی آپ کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ ایسا ہر خیال آپ اپنے دل سے نکال دیں۔

میں نے ایک نئی گرم گرم مٹائی پانی بھر جانے کی وجہ سے اس نے رندھے ہوئے کچلے ساتھ کھا کر پوں بھی حالات
 دیکھنے پر کچل خلیج میں وہ بری طرح جکڑی ہوئی تھی اس کا بھی است پورا پورا احساس تھا۔
 دیکھنے پر چوڑی بات آخر اس کا کیا کیسا ہے آپ کو۔ آخر کس وجہ سے آپ خود کو مرے قابل نہیں سمجھتیں۔ کچھ

نہا جتا مریخ مل رہا تھا اسے سب کچھ بتا دینے کا۔ مگر بعض مواقع منسلحتوں کے تبادلے میں کچھ اس بری طرح پئے ہوئے

اپنے معاملات کا خود مختار ہوں۔ تم میری پسند نہیں، محبت ہو اور یہاں کسی

وہ جس تیزی سے آپ جی آپ اس کے نزدیک آئی تھی اس سے بھی کہیں زیادہ سرعت سے اس سے علیحدہ ہوئی امد
ہو چکی ہوئی جس راہ سے یہاں تک آئی تھی اسی راہ سے واپس پلٹ گئی۔
مردہ بھی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہ تھا اور اس کی اس جنونی سی ادا کو اس کی شرم پر محمول کر رہا تھا۔ اس
یہ وہی تھا کہتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا۔
مردہ تھوڑی دور آگے جا کر ہی ٹنگ گئی تھی۔
بادرے معنوں میں رکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”اب یہ یوان کے نزدیک جا کر معلوم ہوگا کہ یہ دونوں کہاں کیا کر رہے ہیں۔ لیکن بے ضرورت کوئی غیر معمولی بات ہے۔“
 ”بھی ایساں کر رہے ہوں گے بھائی۔ جو ان جیسے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔“
 ”صبر مطلق جو کچھ زیادہ ہی روشن خیال تھے انہوں نے لا روائی سے کہا اور زنت چوتھے ہوئے انہیں دیکھ کر کہیں۔“
 ”یہ دیکھ کر بے ہوشی سے سب ان دونوں کے نزدیک آئے تو اس قدر آگے بڑھ کر بولا۔“
 ”مخالف کیجئے گا انہی۔ آپ کے پاس کوئی ایکٹر یا جوئی یا چیلر ہوگی۔“

نوادہ۔ نوادہ۔ ریوڑ سے بچھا کر۔ واہ ڈیر سنی۔ تہ باتیں بھی بہت دلچسپ کرتے ہوئے۔
عبدالعلی نے ایک فلک شگاف حقیقہ لگا کر کہا۔ زینت نے غور سے سلوٹو کی شکل دیکھی۔

”اوہو۔ پھر وہی مرے کی ایک ٹانگ۔ لیکن میں آپ کی اجازت کا پابند نہیں ہوں بلکہ اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں نے آپ کی ذات سے کبھی کوئی توقع وابستہ نہیں کی بلکہ میں تو خود آپ کی توقعات پر پورا اترنے میں کوشاں ہوں۔“

اس کی باتوں پر سخت کدورت ہو رہی تھی۔ وہ جھٹکتے ہوئے لیجے میں بولا۔

”لیکن میں نے زندگی کوئی اچھی توقع آپ سے کبھی وابستہ نہیں کی۔ پھر آپ کے پورا اترنے کا کیا سوال؟ اور کون ہے اس طرح وہ اس سے بیچنا چھڑانا جانتی تھی۔“

”مگر کیوں؟ کیوں نہیں تھی؟“ وہ جوبڑسا ہو کر بولا۔ گلاس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ گہرے غم کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”دیکھیں سلطو! یہ میرے جذبات اور زندگی دونوں کا ہی سوال ہے، اور میں اس معاملے میں انتہائی سنجیدہ ہوں۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیے کہ یہ کوئی کھیل تھا یا آپ کا کوئی فریب۔ جو میں کھلی آنکھوں سے آپ کے ہاتھوں کا تاراجاؤں۔ وہ سختی سے دانت بیتچ کر۔۔۔ بڑی اصطلاحی سی کیفیت میں بولا۔ تو اس نے بھی سوچا کہ اب یہ دلت سے اور پھر وہ خودی بہت جبر سے اس سے بوٹھ رہا ہے۔ وہ اپنا نچلا ہوٹ ڈانٹوں میں دبائے جھللاتی آنکھوں سے کچھ دیر اس طرف دیکھتا رہی۔ پھر انگوٹوں سے نوکل جوتی سی آواز میں بولی۔

”ہاں۔ یہ فریب ہی تھا۔ مگر یہ میرے آپ کو نہیں دیا۔ بلکہ آپ خودی کھاتے رہے، لیکن اس نے اس کلمات کو نہ سمجھا۔“

کب ہوئے دی۔ وہ تو غصے کے مارے اپنے آپ سے ہی بند رہا۔

آفت۔ اسی بات پہنچنے سے اسی اٹھو گھنٹوں کیسٹا خون ساز سائز اٹھانکا کہ اس کی روح تک ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کھوپڑی کی طرح بھیرے اٹھو گھنٹوں کے کونوں سے آسنوں کی طرح جیسے کسی شمشاد کو ہلانے سے پتوں پر جمع شدہ بارش کی ہوندیں ایک ساتھ پڑ گرتی ہیں۔ وہ بھی یہی نظروں سے کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کابینہ بولی آواز میں بولی۔

”بہیں نہیں۔ فریب میں آپ کو نہیں دیا بلکہ آپ — میں — خود ہی فریب کھاتی رہی ہوں۔ کوئی تکلیف ہی نہیں ہو کر چاند کی تھنا کر بیٹھی تھی۔ جو جسمی پوری ہو ہی نہیں سکتی“

”اوہ۔۔۔ لا حول ولا۔۔۔ پھر وہی پبلیک سٹڈز دہ باتیں۔ سلی گرل۔ مجھے تمہاری کم مائیگی کا بھی علم ہے اور مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی گڑبگڑ بھی۔ جی کہ تم بھی مظلومے کچی اور میری منہ بہتہ ہمداری حسرت کی وجہ سے بند ہو رہے ہو۔“

جو احساس گناہ سے اور کچھ اسفند کے ساتھ دیکھ لیے جلنے کی وجہ سے اتنی آگزی لگ رہی تھی کہ بڑی ہنس رہی تھی جیسے وہ سچ مچ روتی رہی ہو۔ تب زینت نے اس کے پاس گھاس پر ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

صمد جلیل نے واقعی غضب کا اہتمام کر لیا تھا۔

سنتے کے باغ میں درختوں کے درمیان۔ ایک کھلے ہوئے وسیع قلعے کے سبزہ زار پر خوشنما اور دیدہ زیب بڑے بڑے نالیچے بچھوائے تھے جن پر بڑے قرینے سے سبز، سرخ، نیلے اور زرد رنگ کے گاونچے رکھے تھے۔ اور پرشامیانہ ٹماگیا تھا۔ ایک سرے پر شامیانے سے ماہر چھوٹی چھوٹی میزوں پر جگ اور گلاس رکھے گئے تھے۔ اور ان میزوں سے ذرا فاصلے پر ایک طرف ٹھنڈے پانی کے دو فلرز رکھے تھے اور دوسری طرف واش بیسن لگی دوئکیاں۔ اور وہیں۔ ٹائلیوں کے آخری سرے پر پتیلی جو کیوں کو باہم جوڑ کر دسترخوان بچھوائے گئے تھے جن پر پلیٹیں بھی تھیں اور یہ سب اس قدر خوبصورت اور نظیں سالک رہا تھا کہ سلوٹ تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول کر گنگ سہی ان ساری چیزوں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

زینت نے لے کر کہاں تک تو آگئی تھیں گلاس کے پاس بیٹھ کر اپنی تفریح کو خراب نہیں کر سکتی تھیں اور پھر صمد جلیل اپنی بہترین دوست قیصر اور منیر قیصر سمیت ان کے ساتھ ہی چلے آئے تھے۔ وہ سلوٹ کو ایک گاونچے کے سہارے آرام سے بٹھا کر خود بھی نہیں تھیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے وہیں کھڑے کھڑے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلوٹ سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”اچھا اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ کرم تو کسی نہ کسی کام سے ادھر آئے گا ہی کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس سے منگوانا“

”یہاں میرے خیال میں بہتر یہی ہو گا کہ یہاں کھڑے کھڑے چلنے پھرنے کی کوشش کریں۔ یہ کربلا میں جلا ہیں۔ ورنہ اگر سوچیں پڑھ کر کوئی بے گناہی نہیں رہیں گی۔“ منیر قیصر نے منورہ دیا تو صمد جلیل فوراً بولے۔

”ہاں علی ہذا القیاس بھائی۔ یوں بھی عموماً سوچ پر کی بڑی کاجوائنٹ بل جانے کی وجہ سے آتی ہے۔“

”ہاں لیکن یہ تنہا کیسے چل پھر سکیں گی۔ جب تک کوئی سہارا دینے والا ان کے پاس نہ ہو یا پھر کم از کم کوئی چھتری وغیرہ ہی ہو۔“ منیر قیصر نے منورہ دیا تو زینت جلدی سے بولیں۔

”خیر چھری کا دستیاب ہونا کچھ مشکل تو نہیں۔ کرم بار بار ادھر کے پھیرے لگا رہا ہے یہ اس سے کہہ کر معلوم ہو گا۔“
 ”نہیں نہیں۔ میں کوشش کر دوں گی کہ بلا سہارے اٹھ کر چل سکوں لیکن اگر چھری کی ضرورت پڑی تو وہ مجھے ملے گی۔“

سلوٹ نے گویا شعیب منصور کو اطمینان دلانے کی غرض سے کہا۔ اصل میں تو اسے معلوم تھا کہ یہ سب میرا سنا ہے کہ یہ تو سب ہے۔ اور یوں بھی اس کی وجہ سے کوئی بندھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اور وہ تو خود بھی شرمندہ سی بوری تھی کہ وہ سب کے لیے ایک مسکن بن گئی ہے۔ وہ سب تو پہلے ہی جانے کے لیے تیار تھے۔ اس کے اطمینان دلانے کی ایک سمت روانہ ہو گئے۔ اور جب یہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ کہ چھری کو ملے گا۔ آئی تھی۔ وہ تو دونوں کو یکجا دیکھ لے جانے پر خاص طور پر اس کی پوزیشن صاف کرنے کی غرض سے اسفند نے شخص ایک بہانہ لگا اٹھا جسے مصعوتا اسے ہی چھانا پڑ رہا تھا۔

ارد گرد کے تقریباً سارے بڑے پڑاوتے کے منتروں سے لدے ہوئے تھے۔ اسے جیسا بھی لگ رہی تھی مگر وہی اچھا ہوا تھا اور ضمیر پر کچھ اتنا وجد آج رہا تھا کہ اس نے نگاہ اٹھا کر پھلوں سے لدے درختوں کی طرف دیکھا ابھی نہیں۔ اعلیٰ کوئی چیز سے بھی کھینچنے کے باعث کی تھی میری سر پر آ کر آئی۔ لیکن وہی مثل تھی کہ اکیلا نہ رہتا جھلا نہ روتا جھلا۔ بس قائلوں کے فرش پر ہی ٹہل ٹہل کر ان سارے واقعات پر غور کرتی رہی جواب تک اسے پیش آتے رہے تھے۔ مگر احساس گناہ اس کو ایک غالب تھا کہ سوچ کے تانے بانے بار بار ٹوٹ ٹوٹ جاتے۔

جانے کہاں پہنچی ہوئی تھی وہ۔

یا خیالات کی کون سی جنگ زداری تھی وہ کہ وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ رہا تھا۔

جو بڑی سرعت سے گزر گیا تھا۔

دھوپ اس لمحے اپنی قنات کے ساتھ پوری شدت سے چمک اٹھی تھی۔

اور سورج نصف النہار کی حد پار کر گیا تھا۔

اور جیسا کہ زینت کا خیال تھا کہ کرم کسی کسی کام سے اس طرف آتا جاتا رہے گا تو وہ اب نکل کے آیا تھا۔ وہ بھی چند دوسرے ملازمین کے ساتھ جو شاید سختوں کے جوہر رکھنا نا چھٹنے کی غرض سے آئے تھے۔

اسے وہاں خلاف توقع اور گمان تنہا بیٹھا دیکھ کر کرم متعجب ہوئے بغیر نہ رہا اور اس کے پاس آ کر سہمہ روانہ ہوئے۔

”مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ اب آپ کے ساتھ ہی سلوک کیا جائے گا۔ آپ ناحق ہی ان لوگوں کے ساتھ آئیں۔“

اودھ تو گویا ان لوگوں کے رویے سے کرم کو بھی میری اوقات بتا دی ہے اس نے کھمکے کے ساتھ دل میں سوچا اور پھر فوراً

ہی کرم کے خیال کی تردید کرتی ہوئی بولی۔

”اے نہیں، یہ بات نہیں کرم۔ اصل میں میرے سر میں موج اٹھ گئی تھی۔ بھائی جان بے چاری خود ہی سہارا دے کر مجھے

یہاں لائی تھیں۔ اب میری وجہ سے بندھ کر تو نہیں بیٹھ سکتی تھیں اس لیے میں نے خود ہی بہت کد سن کر انہیں بھیج دیا ہے۔“

مگر اس کی وضاحت پر بھی کرم نے اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو خیر آپ جو کچھ بھی کہیں مگر میں

خوب جانتا ہوں۔

”نیکیا بجا ہوگا اس وقت کرم“۔ اس نے کرم کا دھیان پلٹنے کی غرض سے پوچھا۔

”ایک بچے والا ہے بی بی اور ادھر ابھی تک کسی کا بتا ہی نہیں۔ اور ادھر اس غلام قادر صمد جیل کا ملازم کے بچے

نے توجہ دی کر کر کے میرے ہاتھ پر پھلادیا ہے یہ کہہ کر کہ اس کے صاحب نے ٹھیک بارہ بجے کھا نا لگ جانے کا بولا تھا۔“

لو جھلا۔ بارہ بجے کھا نا لگا جاتا تو اب تک ٹھنڈا ہو کر کسی چوگا ہی نہ رہتا۔

کرم نے اتنے مختصر سے سوال کا اتنا طویل جواب دیا تھا۔ اور پھر مگر فوراً ہی اس طرف چلا گیا تھا جہاں دوسرے ملازم

کھڑے تھے۔ اور ابھی اس کی دوسرے ملازموں سے کچھ بحث و مکرار ہو رہی تھی کہ مخالف سمت سے کھوڑوں پر سورنہ

سینہ۔ عروج۔ ارم۔ مارید۔ طلعت، رخت، نیلوفر۔ نیلما اور نمینہ کے دونوں کزنز کا قافلہ آنا نظر آیا۔

ماہیہ۔ نمینہ۔ سینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور نمینہ کے دونوں کزنز تو نیلما کی علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

ماہیہ۔ نمینہ۔ سینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور نمینہ کے دونوں کزنز تو نیلما کی علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

ماہیہ۔ نمینہ۔ سینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور نمینہ کے دونوں کزنز تو نیلما کی علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

ماہیہ۔ نمینہ۔ سینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور نمینہ کے دونوں کزنز تو نیلما کی علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

ماہیہ۔ نمینہ۔ سینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور نمینہ کے دونوں کزنز تو نیلما کی علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

ماہیہ۔ نمینہ۔ سینہ۔ عروج۔ ارم۔ اور نمینہ کے دونوں کزنز تو نیلما کی علیحدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب کہ طلعت

بنت کے تھوڑے سے اور نیلوفر نیلما دوسرے گھوڑے پر بیٹھی تھیں۔
 جب شامیانے سے کھوڑی دوری رک کر کھوڑوں سے اتر گئے تھے اور نمینہ کے دونوں کزنز کو گھوڑوں کے

پہلوں پر لڑکھائیں آپس میں باتیں کرتی شامیانے میں آگئی تھیں۔

”چوہر زار! لو کیا آپس میں باتیں کرتی شامیانے میں آگئی تھیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

”جیسے آپ یہاں آگئی ہیں۔ اور وہ اسفند بھائی کہاں ہیں سلوٹ؟“

کبھی اونچی پرواز لیتے کبھی نہیں۔ اور کبھی دھکتا اور پھر پھر ۱۶۰ میل گھنٹہ کی رفتار سے۔ اور جب کسی چیز سے
 بے باغیہ کھاتا تو اپنے رگڑاٹے سے تھپی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ اور وہاں ہوا یہ تھا کہ کبھی درمیان ایک طرف سے
 کی پوری ہڈی دوڑنے اور قافین اٹھانے اور دوسری طرف سے اسفند پینے والدین اور ان کے دوستوں کے قافلے کے ساتھ
 آیا تو اُدھر اُدھر کی ہنسی ساری لڑکیاں ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”او جو تو یہ فکرا اسفند ان سب لوگوں کو ہنکا لانے کی غرض سے کہیں غائب ہو گئے تھے تمہیں اسفند پھر پھر پھر
 ”ہاں سب کو تو ہانک لائے ہیں۔ صرف گھوڑے کی کسر ہی رہ گئی ہے“

اور میں نے کہا تو سب کو ہنسی آگئی۔ سب آتے ہی بھوک کی شدت کا گھر کرنے لگے تھے۔ اس لیے سب نے اپنے اپنے
 کیا۔ اس آنتا میں کھانا بھی جو کیوں نہ لگایا جا چکا تھا۔ سب ہاتھ منہ دھو کر اطمینان سے چوبیس کے آگے بڑھے اور
 سے کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے دوران ہنسی مذاق بھی ہوتا رہا اور جھٹکے بھی چھوڑے جاتے رہے اور بے باغیہ
 ماحول میں کھانا ختم ہوا۔ تو تھوڑی دیر سستانے کے بعد پھر گھوٹنے پھرنے کا چیکو اٹھا تو رکیاں اس طرف چل دیں۔
 نے ان کے گھوڑوں کو باندھ رکھا تھا۔ اسفند اپنا گھوڑا ریٹ باؤس کے باؤس کیسر کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ وہ اٹھ کھانے
 بزرگ پانی آتشا کی سرگرو۔ اور یوں سلو پھر پھر رہ گئی۔

موج آجائے کی وجہ سے کسی نے ساتھ چلنے کے لیے اس سے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ عروج نے صرف اتنا کہ
 اگر وہ پھر نہیں سکتی تو اس کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جائے۔ کیونکہ یہ سب برج کی طرف جارہے تھے جو خاصی دور تھا۔
 کا بھی چاہ رہا تھا نہ ہر پنے خوبصورت پل کو دیکھنے کو۔ لیکن چونکہ اسفند بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا اور پھر گھوڑے پر
 بیٹھنا اسے مناسب نہیں لگا تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا تھا اور اب تنہا ہی وہ موج رہی تھی کہ کو بھلائی جگہ کی تھی۔
 پکنک منانے کی غرض سے اور اب یہ جھوٹ موٹ کی موج کا طوطا پالے سب سے الگ تھلک ٹرولوں میں بیٹھ
 رہی ہوں۔ بھلا کیا فائدہ ہوا میرے یہاں آنے کا۔

وہ جو کہتے ہیں تاکہ بڑے کاموں کے بڑے انجام کو کچھ بھی مشل اس وقت مجھ پر بھی صحابی صادق آ رہی ہے۔ کیونکہ کوئی
 قصور تو سارا میرا ہی ہے کہ میں اپنی حقیقت اچھی طرح جانتی ہوں۔ ورنہ اسفند تو میری ہر بات سے اعلیٰ ہے اور جو کچھ
 اپنے دل اور جذبے سے مجبور ہو کر نادانستگی میں ہی کر رہا ہے۔ اور میں ایک طرح واقعی اسے قریب دیکھتی ہوں۔ کا
 میں شروع شروع ہی میں اسے سب کچھ بتا دیتی تھی مگر میری بولی اور کمزوری ہمیشہ میرے آڑے آتی۔ اور اب میری خاموشی
 سے بات اتنی آگے نکل گئی ہے کہ اسے کچھ بتانا خود اپنی ذلت اور خواری کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ فصل میں
 شروع میں تو میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ میری خوبصورتی اور عمر کے اس پر بہار دور سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔
 اسے باہر کی ہوا کی ہوتی ہے اس لیے اپنے جزوقتی جذبات کو اتنا بے لگام کر دینے کا عادی ہے۔

اور مجھے اس قدر بے وقعت ہے۔ بے بس اور مجبور دیکھ کر وہ اور بھی شرماتا جا رہا ہے۔ جب اس کے خیالات
 کسی دوسری لڑکی کی طرف مبذول ہو جائے گی تو وہ مجھے بچانے کا بھی نہیں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کا جذبہ صاف
 اور وہ اس معاملے میں واقعی بہت سیریس ہے۔

وہ بھی اس قدر کہ اگر میں نے اس پر اپنی حقیقت ظاہر کر دی یا اپنی مجبوروں سے اسے آگاہ کر دیا تو اس نے مجھے
 چھوڑ بھی دیا تب بھی وہ مجھے اتنا ذلیل دھوا کرے گا کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔

مگر۔ اس طرح آخر میں کب تک اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہوں گی؟

کب تک اس کی محبت کا دم بھرتی رہوں گی؟

اور آخر کہاں تک یہ سلسلہ چل سکے گا؟

اس کا ذہن اس سمجھتی کو سلجھانے سلجھانے کھڑا ہوا ہی اٹھ گیا۔
 اور اس آنکھ میں وہ بھی بھول گئی کہ کہاں بیٹھی ہے اور وقت تیزی سے اپنے منازل طے کرتا کہاں کہاں پہنچ رہا ہے
 سوچتے سوچتے غمزدگی کی طاری ہونے لگی تھی۔ اور ذرا اس کی آنکھ جھپکی تھی کہ مراد آوازوں کی ٹھیک ٹھیک

بعضیں کھول کر دیکھا تو غلام قادر کی ملازموں کے۔۔۔ ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔
 درجن چنگاڑا۔

میں نے سہرہ وصل علی تھی۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

میں نے جبرک مسافت سے تھا۔ با۔۔۔ مشرق کا شہسوار۔۔۔ اب مغربی افق پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہا تھا۔

اور اب بھی — بھابی کا معاندانہ سلوک —

بھابی کا مغیرانہ اور بیگانہ سا رویہ۔

بات بات میں روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ

بچپن میں بھائی اگر اس سے کبھی یگانگت بھی رتے

یادداشت برمودا نورڈلن کے مادو جیسے ماہی پرانے آ رہا تھا کہ کھیل رہا تھا۔

جس نے بے بسی پر ترس کھا کر اسے اس گھریں لاکر ڈال دیا گیا ہو۔
 اے ابھی طرح یاد تھا کہ جب تک امجری ہو اس گھریں موجود رہیں وہی اس کی نگاہ جو اب

بدلو نے لی فیس داری بھائی رہی تھیں۔ مگر جب وہ آٹھ سال کی ہو گئی تو بھائی نے سب کچھ اس کی تنہی سی جان پر ڈال دیا۔
بھائی کا عجیب و غریب رویہ آج بھی اس کی سمجھ سے ما رہی تھا۔

اس رہ گئے بھائی۔ تو خواہ وہ کتنے ہی غافل اور مگالہ کہوں نہ تھے۔

اور آسانی سے بروائی کے باوجود بیڑی گول میں لاد سائی، یہی تھوڑا سا فرق کہ یہ ان کے لیے اس حد تک کہ اسے گھونٹ

اور جوتے جوتے کچھ اس قدر بدلا کہ انہوں نے اس کی نئی زندگی کا درپے اہم معاملے میں بھی بہت غیر منصفانہ اور جانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔

تھوڑی دیر کو اگر یہ بھی فرض کر لوں کہ وہ دزمانی کے منقلمہ ارادوں سے آگاہ نہ تھے تب بھی کیا انہوں نے:

کسی نے فتح ہی کہا ہے کہ جو انسان دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے پہلے خود اس میں گرتا ہے۔

دُرّانی سے میرا دور کا کوئی واسطہ رہا نہ بھائی جان سے۔

27

ہے یہ کس د

کے یہاں کس دل کے اور یہ روپ کی شادی کے ساتھ میری شادی محض جبر اور زبردستی کا

بیماری مرضی کو تو دور تک دخل نہ تھا۔

شیر غائبی ایسی شادیاں ناجائز قرار دی جاتی

پھر درانی نے تو مجھے اسی بے دردی سے غلام بنا کر رکھا۔

اس دھالی بین سالے کے کرے میں بن پکے ہیں۔ یہ سب بڑے بڑے

بندھن میں پابند کرو، ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر کے رکھ دیا بلکہ میری پوری جوانی

کے رکھ دی۔ میری تمام خواہشیں، ارمان، اُمَنگلیں حتیٰ کہ جینے کی لگن تک اس نے مجھ سے چھین لی ہے۔ اب الرمیرے

نے اسفند کو چا ہا ہے تو اس میں جھلون سا تہا ہوا۔ دل تو بی چا ہا ہے کہ اس عام و جاہل رس سے ایسا کیا ہو

اے قربیں اگر کر بھی سقین نہ آئے۔ بین میرا مدہب۔ میرا میر۔ بلند سب سے بڑھ کر کوہِ حلد ہے کوئی صفا درخت

اجانت نہیں دینا۔
تیرہ لکڑیاں کراؤں؟

کہ خدائے جل جلالہ کی ڈالی ہوئی بڑیوں کو پیروں سے اُتاروں؟

کیونکہ اس کی قید سے رہائی حاصل کروں۔

وہ تو بھی رات تک کروٹیں بدل بدل کر یہی سب سوچیں رہی۔

اس وقت تک کہ وہ جانے لگا تھا، یہ دیکھا جانے والا سنہ خواب ثابت ہوا تھا۔

اور اسفند سے محبت کرنا اس کے نزدیک کوئی گناہ نہیں تھا۔

البتہ اس سے جو بے ساختگی میں ایک غلط حرکت سرزد ہو گئی تھی اس پر وہ سخت متاسف اور پشیمان تھی۔

یوں بھی کافی عرصے سے وہ اخبارات اور رسائل میں وہ کافر مظالم کر رہے ہیں جن میں لوگوں کے شرعی مسائل اور ان کے

ایات درنہوئے بے بڑے غور اور وجہ سے پڑھی ارہی تھی۔ یس لاکھ دھو دے لے باوہو دے اے اپے غلبہ اس

بہر حال آنا کچھ سو جزا اور اتنے اخلاذ ارادے رکھنے کے باوجود وہ احساس گناہ سے خود کو نجات نہیں دلا سکی تھی۔

کیونکہ ایسی کچھ تو نہ تھی جو حائز اور ناجائز کے فرق کو نہ جان سکتی۔ اور ادھر بات اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اسفند کو ایسا

حقیقت سے آگاہ کرنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ کیونکہ آگاہ کرنے کی کوشش میں ہی اس کے خطرناک ارادے اور تصور بھانپ کر

فان لوہے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اس کے ہاتھوں ایک لبریر کناہ کا ارتکاب نہ بھی ہو سکتا تھا۔

جس نے بیکر کیا تھا وہ اس معاملے میں اسفند کو مزید اے برکھے دے سی نہ لادہ سی اے برکھے سی افسدہ پہنچو سی اور رڈ کر

میں نے بھی اسے غائب منظر رکھنے میں ہمت نہ کی اور بھاڑی اور بھائی اور بھانجہ کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی کہ وہ

حال کے اسے یہاں بھیجتے وقت ہی کہنا تھا کہ چار پانچ ماہ کی تو بات ہی سے تم کسی طرح یہ عرصہ وہاں گزار لینا۔ پھر یا تو ہم خود ہی

تو بھائی کے بتائے عرصے سے سات آٹھ ماہ اوپر ہی ہو گئے تھے اور بھائی

وہاں پہنچ کر اس نے ایسا ہی لے آئی تھی کہ بھائی بہت صاف اور رات کو بھی۔ اگر وہ اسے پاس بلائے گا ارادہ نہ کرے

کے قابل نہیں رہے۔ لہذا اب تو انہیں صبر اور خوشنودی سے حصہ دینا ہو گا کہ وہ

بہارِ نبویؐ کی روشنی میں

اور جہاں جا ہو قیام کرو۔

مگر اسے رخصت کرتے وقت ان کا بوجھ بکیر مانتا تھا۔

اور انکھوں کے گوشے جھپک سے رہے تھے۔

اور بس ایک ہی بات تو سنی جس کے اور ان کے درمیان ارتباط کا ذریعہ بنی تھی۔

یہی ایک بوجھ تو تھا جس نے اسے ان سے بطن ہونے سے روک دیا تھا اور انکھوں کے جھپکے ہوئے گوشوں نے اندازہ

اور اس دن کی آمد بجلدی متوقع تھی۔

اور بھائی کے آنے کے بعد وہ اگر اسفند سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی تو کھلو حضور سستی تھی۔ لہذا جب تک کے لیے وہ اسفند

یوں بھی اسفند کا سامنا کرنے کے تصور سے ہی اسے وحشت سی ہونے لگی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ میری موت کا

کر کے دو تین روز تو لینے کمرے میں بستر پر بے پروے گزار دے گی اور اس کے بعد تین چار روز کے لیے سہیل منصور کے بھائی

جانے گی کہ نازش اور کوشنے سے بڑے اصرار سے بلایا تھا مگر وہ عید کی گہما گہمی میں اب تک ان کے ہاں نہیں جا سکی تھی۔

اگر اسفند اس سے ملنے وہاں بھی پہنچ گیا تو وہ اسے تنہا میں ملنے کا موقع ہی نہیں دے گی اور اس کے بعد اسفند سے دور رہنے

کا کوئی شاقہ اختیار کرے گی۔ اس پر فی الوقت اس نے غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ

موافقت میں ہوتے ہیں تو خود ہی کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر دیتے ہیں۔

بہر حال اس نے سوچا تو یہی تھا کہ لنگے روز موقع کا غدر کر کے کہے ہی میں بڑی رہے گی۔ اور اگر کریم نے ناشہ

بلانے آیا تو وہ اس سے کہہ کر اپنا ناشتا ملکہ دونوں وقت کا کھانا بھی کرے میں منکولہ گی اور اگلی صبح دیر تک جاگنے رہے گی

وجہ سے اس کی آنکھ بھی دیر سے ہی کھلی تھی۔ اس لیے صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

مگر وہ اندر سے بند ہی کر رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کمرہ دھویا اور بالوں پر کنگھا پھیر کر دروازے کا کنگھا

کھول دیا اور بستر پر آکر لیٹ گئی۔

گھڑی پر نظر پڑی تو آٹھ وقت گزر جانے پر وہ سوچنے لگی کہ اور سب تو کب کا ناشتا کر چکے ہوں گے کہ آج بھی کاناں

نہیں ہے۔ دونوں لڑکیاں کالج چلی گئی ہوں گی اور اسفند ڈیوٹی پر اگر نہیں گئے ہوں گے تو اب جانے کی دالے ہوں گے پھر

کیا غیر معمولی بات ہوگی کہ کریم ناشتہ پر مجھے بلانے ہی نہیں آیا۔ یا ہو سکتا ہے کہ میری تکلیف کے خیال سے بھائی جان نے

یہاں آنے کی ممانعت کر دی ہو۔ کہ تبھی دروازے کو دھڑ سے کھول کر کریم بولا یا جو اس اندر داخل ہوا اور اسے بتا دے

پریشان کن ہجے میں بولا۔

”بی بی وہ بڑی بیا کی حالت بڑی خراب ہے۔ صاحب اور بیگم صاحب صبح چار بجے سے ان کے پاس ہسپتال گئے

ہوئے ہیں۔“

”ہاں جی۔ بی بی خیر ہیں۔ دونوں بے بی لنگ بھی۔ بلا ناشتا کیے ابھی بھی ہسپتال گئی ہیں۔ بیگم صاحب کا فون آیا تھا کہ ان

نے بڑے کاہنا: دھونڈی ہوئی بولی۔

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

”بی بی۔ ساری شکل تو وہ پورج ایک بنائے۔“

گھر پر ایک دیرانی سی چھائی ہوئی تھی اور سناٹا یوں بول رہا تھا جیسے کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔
 تھی تو پریشانی کی بات ہی۔ کہ ناز پر دور کے ہاں پہلے زندگی ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ موتی بھی بست ہوئی تھی۔ دوزخ گونگ ہو رہا تھا۔
 دوسرے اس کا بلڈ پریشر خون کا دباؤ بھی باقی ہو گیا تھا۔
 سلطو بھی اسی گھر میں رہتی تھی۔ ہزارہ لوگ اس کے لیے بیگانے بھی مگر یہ وقت تو تقریباً حکومت پرینچاؤ ناز کا کس کو کچھ پیچیدگی اختیار کر گیا تھا اس لیے بھی اس کی طرف سے بڑی فکر مند اور پریشان ہو رہی تھی۔ دل میں طوفان تھم رہا تھا۔
 سر اٹھا رہے تھے اور ہونٹوں سے ناز کے خیر و سلامتی کے ساتھ فارغ ہو جانے کی دعائیں جاری تھیں۔

یہ اسے بیٹے پر مجبور ہونا پڑا۔
 وہ چائے کا ایک سب لینے کے بعد بیابانی پر ٹھکا ٹھکا ہوا۔
 بارش کو بھی نہیں تھکنے کے باوجود رات گئی اس کے لہجے سے صاف عیاں تھی۔ جواب میں وہ کچھ دیر تک بالکل خاموش
 رہا۔ تو نہیں تھکنے کے بعد ہوا۔

کتری کا طعنہ کسی گالی کی طرح لگنے لگا تھا۔ غصے اور کھسبہٹ کے عالم میں وہیں کھڑی رہ گئی۔

”آپ اپنے دل پر اثر نہ کیجیے بی بی۔ بابا صاحب کی تو مذاق کرنے کی عادت ہے۔ یہ خاندان اس سے اس قدر ناظر ہے دیکھ کر کہا۔ تو وہ جلدی سے بولی۔

”اے نہیں خاندان۔ میں تو سوچی رہی تھی کہ ناز کی سسرال والے بیٹا ہونے پر کتنا خوش ہو رہے ہوں گے۔ اس کے خاندان میں تو زیادہ تر لڑکیوں کی بھر مار ہے۔ خیر آپ سودا کیا لائے ہیں اور کیا پکانے کا ارادہ ہے؟“ اس نے اتنی خوبصورتی سے بات پلٹ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس تاثر کو بھی بدل دیا تھا۔ جو اس کے پیٹ پر سے تھکا ہوا تھا۔

پھر خاندان اس سے وہ چیزیں دکھانے لگا جو وہ بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اور وہ اسے دو تین کھانے تیار کرنے کی ہدایت دے کر کہے میں واپس آگئی۔ اس پر اب بھی غصہ اور کھسبہٹ سوار تھی۔ کیونکہ اگر اس فنڈ نے مذاق پوچھ بھی لیا تھا تو اس کے پیٹ پر اسے تو کڑوں کے سامنے ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا جس میں اس کی اہانت کا پہلو نکلتا ہو۔ اور پھر اگر وہ اپنی بہن کی طرف نظر پڑتا تو اس پریشان بھی تھا تو اسے میرے ساتھ اس قدر بیگانہ سا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔

پھر وہی بات ہو گئی ناکہ وہ اپنی مرضی چلانے کا عادی ہے۔

اپنے موڈ سے جو جانتے کرتا ہے۔

اور اگر کوئی بات سمجھے نہ ہو گئی ہے تو صرف یہی۔

بھائی جان۔ بھائی جان جتنی کہہ دو رانی۔ سب ہی مجھ پر اپنی مرضی ٹھونکتے رہے اور اب یہ اس فنڈ بھی مجھے اپنی مرضی چلانا چاہتے ہیں۔

اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔

یوں بھی میں آخر تک ہلکے دوسروں کے اشارے پر اپنی جگہ پر ہوں گی۔

اور آخر میں نے خود کو اتنا بولا اور کڑو کیوں بنا لیا ہے۔

بقول اس فنڈ میں اس قدر کپکپاہٹ کیوں ہو گئی ہوں۔

کس وجہ سے آخر۔

صرف اسی لیے ناکہ دوستی ان لوگوں پر باہر بیڑی ہوں۔

مگر میں خود تو اتنی نہیں رہا۔

نہیں نے کبھی یہاں آنے کا تصور ہی کیا تھا۔

مجھے تو بھائی جان اور بھائی جان نے اپنے حالات کی خستہ حالی اور اپنی کسی مصلحت کے تحت یہاں بھیجا تھا۔

پھر میں خواہ مخواہ ہی کیوں شرمندگی اور خسانہ مندی کے احساس میں لپٹی رہتی ہوں۔

میں نے کئی سال قبل انٹرنیشنل کیا ہے۔ اور نیلا اب انٹرنیشنل پڑھ رہی ہے۔ ان تینوں بہنوں کے چہروں پر توان کا عالمی نے ترننا کی بخش دی ہے۔ اس پر میک اپ اور ٹیپ ناپ کی مدد سے یہ اتنی خوبصورت نظر آتی ہیں۔

مگر میں۔ میں اگرچہ بے پایاں اور بے حیثیت ہوں تب بھی۔ خدا نے مجھے خوبصورتی کی نعمت سے نوازا ہے۔

میرے چہرے پر ترننا کی اسی کی عطا کردہ ہے۔

اس پر مجھے تو بڑا سارے ہی کام کرنے آتے ہیں۔

اتنی صلاحیت سے کہ میں کہیں مروس بھی کر سکتی ہوں۔

پھر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے آخر؟

جو میں اتنا زیادہ احساس کمتری کا شکار رہتی ہوں۔

مگر یہ احساس کمتری نہیں بلکہ وہ احساس محرومی ہے جو میری پیدائش سے قبل ہی میرے۔ وجود کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔

اب میں اس فنڈ کو یہ سب کیسے بتاؤں۔

اور بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اب جس بیگانگی سے وہ مجھ سے پیش آتے ہیں خدا کرے وہ بیگانگی اتنی بڑھے۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

میں نے کابل چھوڑ دیا۔

دی پڑھائی کا تھکا اس لیے دونوں میں سے کوئی ایک بھی ماں کا ہاتھ نہیں بناتی تھی۔ اور اب سلووا جی کو بھی پڑھنا تھا۔
 بھی نہیں رکھتی تھی۔ کرینیت کا ہاتھ بنانے سے صاف انکار کر دیتی۔ گراباس کے رویے میں اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ ہاتھ
 باندھے کر دیا کرتی تھی وہ باقاعدہ حکم کے کرکرم اور غاساں سے کرواتی تھی۔ اب وہ دینی اور ڈری لاری کا بھی نہیں
 خاص طور پر کوڑے کے ساتھ خوب مہنس نہیں کئے اور اوچی آواز میں باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ اور کھانے کے دوران ضرور زچہ
 کام لینا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔
 اسفندہ نے تقریباً دوڑی اس کا سامنا ہوتا رہا تھا۔ اور وہ اس کی موجودگی کو بری طرح نظر انداز کرنے کے ساتھ
 کوثر اور شعیب منصر سے خوب باتیں کر لیتی تھی۔ لیونکنا ان دونوں نازوںی وجہ سے نازش اور کوثر تقریباً دوڑی کا چاہنے والا
 اصل میں تو اس کی نئی روش پر ہی کوثر نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔
 اسے خوب خوب سراہا تھا۔
 گویا کوثر کی وجہ سے وہ کافی دلیر ہو گئی تھی۔

[illegible]

سی کے دیکھ لی۔ مگر یہ کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتے یا انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔

یا پھر کوئی لڑکی ان کے معیار پر پوری ہی نہیں اترتی۔

مگر اس وقت چونکہ وہ بیٹے سے سخت کبیدہ اور شاکی تھیں اس لیے بھولے بھولے سے منہ کے ساتھ بولیں۔
”اب اس سلسلے میں میں کیا کر سکتی ہوں جبکہ خود انہیں ہی پابند ہونا پڑا انہیں۔ میں نے ایک دو نہیں مہینوں میں یہ

بڑھ کر لڑکیاں انہیں دکھا دیں۔“
”اوہ نوحی اب ایسا بھی نہیں کوئی لڑکی مجھے پسند ہی نہیں آئی۔ بلکہ آپ کی اطلاع کو میں ایک لڑکی پسند کر چکا ہوں۔“

پابند ہونے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔“
اس نے بتایا مگر کہنے کا انداز کچھ ایسا عجیب اور چلیچلن تھا ہوا سا تھا کہ ماں اور باپ دونوں ہی غمگین ہو گئے۔
دیکھتے رہ گئے۔ اور جب شعیب منصور نے اچانک آگیا تو غمی سے سرشار ہو کر اس خوش نصیب لڑکی کے پاس سے
سے استفسار کرنے کی غرض سے کچھ پوچھنا چاہا تو نگاہیں سارے استفسارات سمیت خالی تھیں ہی لوٹ آئیں کیونکہ وہ وہاں
جا چکا تھا۔

اس روز چونکہ چھٹی کے سلسلے میں رات کو ڈیر تھا اور نازش وغیرہ تو سہ پہر کو ہی آگئی تھیں اور کھانوں کی تیاری، ادھر
دیہات زینت کو سکون سے بیٹے سے بات کرنے کا موقع ملا تھا نہ شوہر سے کد رات گئے تک مہمان گھر میں رہے تھے اور
ان سب کو نصحت کرنے کے بعد ساری چیزوں کو قرینے سے لگو کر وہ اپنی خواب گاہ میں آئی تھیں تو چھٹن کے مارے ان
سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

پسند بھی ایسی ٹوٹ کر آ رہی تھی کہ جلد جلد۔۔۔ لباس تبدیل کر کے وہ بستر پر آ گئی تھیں۔ شعیب منصور تو سدا سے ہی
پسند کے بہت کچھ واقع ہوئے تھے۔ گو وہ بھی بوی سے ذرا پہلے ہی مکر سے میں آئے تھے مگر بستر پر بیٹے ہی خزلنے لینے کے بعد
انے دن تو بیٹے دونوں میاں بوی بھول ہی گئے کہ ان کے ذہنوں میں کوئی سوال بری طرح کلہاڑا رہا تھا۔ کیونکہ ان کے
ان شعیب منصور حسب معمول تیار ہو کر اپنے آفس چل دیے اور زینت بیٹی اور نواسے کے چار چوچیلوں میں لگ گئیں
مگر ان کی احمد سرور کا قاعدہ تھا کہ وہ آفس جاتے ہوئے کھڑے کھڑے ہی اور بیٹے کو ضرور دیکھ کر جاتا تھا اور
سنا تھا یا سنا اور سرور کے اصرار پر سرسراں میں ہی کھاتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے زینت کھانے میں کچھ زیادہ ہی
پرہیز کرتی تھیں کیونکہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی تھیں اور نواسے کے سارے کام خود اپنے ہاتھ سے
پاؤں پر کرتی تھیں۔ غرض کہ سب کے ہاتھ ایک تھا سا کھلونا لگا تھا اس لیے سب کی توجہ کا مرکز بناتا تھا اور ایک گود سے
دوسری گود میں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ ادھر احمد سرور کے والدین بھی پوتے کے دم و دیوانہ تھے اور اس کی محبت میں آکر
سناٹا ہی نہ دیتے تھے۔ نہ بن کا بس نہیں جیتا تھا کہ وہ کسی طرح بھو اور پوتے کو اٹھا کر گھر لے جائیں اور باتوں ہی باتوں
پسند خاص خواہش کا اظہار کرتیں تو زینت یہ کہہ کر کہ بس تھوڑے دن کا تو معاملہ ہے پھر تو آپ کی بہو اور پوتا ہمیشہ
ہم سناٹے ہی رہے گا ان کی اس خواہش کو رد کر دیتیں۔ ادھر سرسراں والے بھی زچہ اور کچہ کو دیکھتے آتے اور نیلے ولے
لہو کے اسباب بھی۔

فریاد سکون و یکسوئی سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا جو وہ بیٹے کی بات پر غور کرتیں یا اس سے یہ پوچھتیں کہ تم

نے کس لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔ یا وہ ایسی کون سی خوش نصیب اور دنیا سے نرمی لڑکی ہے جسے اپنی زندگی کی ناز و نیاز شامل کرنے کا تم نے فیصلہ کیا ہے۔

کچھ موقوف ہی ایسا نکلا تھا جو ایک دم ہی ان کا خیال اس مسئلے کی طرف چلا گیا تھا۔ اصل میں تو وہ غور و فکر پر بیٹھ بھی بار بار گفتگو ہو چکی تھی۔ نسوون نے ناز پر وراور پڑتے کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ کیا تھا اور نسوون نے یہ بھی عذر پیش کیا تھا جو ان کے اس مطالبے پر وہ کر رہی تھیں۔ اور ماں کے اس جواب پر نیلو فرسے کہا تھا۔

”جہ تو اس نشتے سے گڑے کے اشنے عادی ہو گئے ہیں آئی کو جب آپ اپنا کو اور اسے ساتھ لے جائیں تو بہت بہتر کریں گے“

”ارے تم تو خیر پھر بھی اسے کم ہی لیتی ہو۔ یہ تو اندر رکھے ہر وقت میرے کلیسے سے لگا رہتا ہے۔ میری سوچ اور دوھیال جانے کے بعد مجھ پر کیا بیٹے کی زینت وادی کی گود میں لیٹے نواسے کی پیشانی کو چوم کر بولیں۔

”اب نواسہ نواسی تو بیٹی کی طرح پرانے گھر کے ہی ہوتے ہیں بھائی جان آپ بھی ہو لے آئیے تو آپ کے گوشے سے غصی مٹی کلکار یاں کو گچھے لگیں گی۔“ نسوون ہنس کر بولیں۔ تب معاً زینت کو بیٹے کی بھئی بات یاد آئی۔ گھر ان کے کچھ کچھ پہلے ہی ناز پر وراور بولی۔

”اُمی جان مجی کے میں میں ہوتا تو اب تک ہو کیا دو تین پوتا لپوٹی بھی ہو چکے ہوتے ان کے گھر بھائی جان کو کوئی ناز پسند نہیں آتی جب کہ کمی تو انہیں ایک سے ایک بڑھ کر خوب صورت لڑکی دکھا چکی ہیں۔“

”ارے نہیں نازو۔ بابا اب اس معاملے میں کافی سیریس ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تو شاید کوئی لڑکی بھی پسند کر دینے زینت نے کہا تو نازو اور نیلو فر دونوں ہی حیرت اور مسترت سے اچھل سی پڑیں۔

”ہائیں کیا تمہی تو دونوں نے ہی یک زبان ہو کر کہا۔

”ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ کچھ گھنٹی والے دن مہار سے ڈیڑی کے کہنے پر خود بابا نے ہی بتایا تھا کہ اب وہ نازو کے بارے میں سیریس ہیں اور انہوں نے کوئی لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔“ زینت نے بتایا۔

”چھٹی والے دن کہا تھا اور آپ اب تک خاموش ہی بیٹھی ہیں۔ یہیں بتایا تک نہیں۔ واہ می یہ کیا بات ہوئی۔“

”نے شکوہ سا کیا۔

”ارے تو اس روز کے بعد سے فرصت ہی کہاں ملی۔ بلکہ خیر سے تم دونوں ماں بیٹے کے کاموں میں یاد ہی کہاں رہا۔“

زینت قدر سے غصی ہو کر بولیں

”مگر می وہ لڑکی سے کون۔ آپ نے بھائی جان سے یہ نہیں پوچھا۔“ نیلو فر نے سوال کیا۔

”بہنیں۔ اس روز کے بعد سے بابا کے ساتھ بیٹھنا ہی کب نصیب ہوا۔ ادھر میں سخت مصروف رہی اور ادھر میں میں ڈبل ڈبل انجام دیتے رہے۔ پتا نہیں یہ چارہ قوم کب سدھرے گی۔ خود ہی آپ میں لڑو کر جائیں گاتی۔“

”جی ہوتی ہے۔ نہ حکومت کا کچھ بگڑا ہے نہ دوسروں کا۔ البتہ زحمیوں کی مرہم ہی کرنے میں مصیبت ہے جارے دنوں کی آتی ہے۔“

”اوہو۔ جی بھائی جان آج کل اتنی دیر دیر سے گھر آتے ہیں۔“ نیلو فر بولی۔

”غیر۔ اگر آپ کو پوچھنے کا موقع نہیں ملتا تو میں آج ہی معلوم کر لوں گی بھائی جان سے خواہ وہ اتنے ہی لالچ آئیں۔ کوئی نہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے بلکہ بہت بڑی خوشخبری ہے یہ بھائی جان کا کسی سلیکٹ کر لیا۔“

”سے بالکل ہونی چاہی ہو۔“ ناز پر وراور جیسے سے انداز میں بولی۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے کھلا رہا تھا۔

”ہاں بھئی ہے یہ بڑا خوشی کا مقام۔ مہار بھی ایک ہی بھائی ہے جتنی خوشی مناد کہ ہی ہوگی۔ نازو کی بات سنو۔“

”ہائے جی می۔ میں تو مایوں، مہندی، شادی اور دیسے کے لیے ڈبل ڈبل ڈریسز بنواؤں گی اور نشتے کی نیلو سے بھی خوش ہو کر کہا۔

”جیسے انہیں ابھی سے کپڑے اور زیور کی چٹکی۔“ نازو نے ہنس کر کہا تو نسوون بھی ہنسنے لگیں۔

”اصل میں انہیں کپڑوں کا بہت کرپہ ہے اُمی جان۔ جیسی تو اتنے بے شمار ڈریسز ہوتے ہوتے بھائی کا دل نہیں بچتا۔“

”جس سے بولی۔ شادی میں تو نے کپڑے ہی پہنے کو جی جاتا ہے۔ تاہم وغیرہ سے بھی ایک سے ایک بڑھ کر ڈریسز پہنیں خیر بھائی کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”جہ نے بھی یہ تو بہنوں کا حق ہوتا ہے۔“ نازو کی سانس سرخ ہو گئیں۔

”ہائے کیا ہے؟ میٹھا خوشی سے کھلتے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں سے تصدیق چاہی۔
ہاں کہا تو انہوں نے یہی ہے، ”زینت نے مکھڑا سا جواب دیا۔

”اچھا۔ یعنی بھائی جان نے خود کہا ہے، ”نیلو نے سچ سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں بھئی تو کیا ہم اپنے دل سے گھڑ کر کہہ رہے ہیں۔ بھائی جان نے خود می اور نیلوی کو بتایا ہے۔

خوش ہو رہے ہیں، ”نیلو فرہنگ کے بار بار پوچھنے پر قدرے چڑھ کر بولی۔
”ارے نہیں بھئی تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کیا بھائی جان نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کس لڑکی سے ملانی ہے۔
نیلو نے گویا اپنے بار بار پوچھنے کی وجہ بیان کی۔
”نہیں۔ یہ تو نہیں بتایا، ”زینت بولیں۔

”کمال ہے مہم۔ اگر انہوں نے نہیں بتایا تو آپ کو خود ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کرب سے اہم اور ضروری بات۔
یہی تھی کہ نازو نے کہا۔

”ماں۔ گراس وقت کچھ موقع ہی ایسا تھا۔ شام کچھ می کی دعوت تھی اور سہ پہر تک سارے کام کو ختم کرنا پڑا۔
جب بابا نے یہ خوشخبری سنا لی تھی، ”زینت دل میں اپنی اس بچک پریشانی ہی ہو کر بولیں۔

”لیکن کیا سلوٹ بابا کی مگیٹر نہیں ہیں؟“ ”نسرین سے رہا نہ گیا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔
”اوئی نوج۔ خدا نکرے، ”زینت کے منہ سے بڑی بے ساختگی میں نکلا۔

”کیوں۔ کیوں۔ کیا کوئی ایسی دلی بات ہے؟“ ”زینت کے خدا نہ کرے کہنے پر نسرین نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔
”زینت کو خدا نہ کرے کہتے ہی غلط بات نکل جانے کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے جلدی سے بات بتانی۔

”نہیں خیر۔ وہ تو بہت نیک اور پیاری بچی ہے۔ مگر چپٹن سے ہی کسی سے منسوب ہے؟“
”ہائے کیا سچ۔ مگر تم نے تو ہمیں بھی نہیں بتایا نازو، ”نسرین کو اب بھی حیرت ہو رہی تھی۔ انہوں نے نازو سے پوچھا۔

”بس ای جان کبھی ایسا موضوع ہی نہیں نکلا اس لیے نہ بتا سکی ہوں گی، ”نازو نے اختصار سے کام لیتے ہوئے
ان کے شکوکے کا جواب دیا۔

”خیر ایسا اگر آپ لوگوں سے کسی کو نہیں معلوم تو میں ایک ذریعے سے ابھی ابھی یہاں کھڑے کھڑے معلوم کر سکتی ہوں۔
نیلو جو ان سب کی گفتگو سے بے نیاز کسی کھڑی دماغ لڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

”کیا۔ کیا معلوم کر سکتی ہوں؟“ ”نیلو نے جڑی سے پوچھا۔
”بھائی جان کی پسند، ”نیلو نے یوں سینہ پھلا کر کہا جیسے امریکہ کو دریافت کرنے کا سہا سہی کے سر ہو۔

”اچھا تو کیا تم پر ابھام و بہام بھی ہونے لگا ہے، ”نیلو نے اس کی بات کو اس کا بھینا قرار دیتے ہوئے کہا۔
”بھئی یہ تم نے پھر لوگ جھونک شروع کر دی۔ پہلے ان سے یہ تو معلوم کرو کہ یہاں کھڑے کھڑے کھڑی کی پوچھنا۔

کیسے کچھ بتا سکتی ہیں، ”نازو نے نیلو فرہنگ کے طنز پر انداز پر اسے ٹاکنے ہوئے کہا۔ ”زینت جو بڑی دلچسپی اور توجہ سے ان کی
گفتگو سن رہی تھیں انہوں نے مسکرا کر نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے نیلما سے پوچھا۔ ”ہاں بھئی، یہ سنو تو میں بھی جاننا ہوں۔

”سنو کیسا مہم۔ میں ابھی ابھی کوڑو کو فون کر کے پوچھ لیتی ہوں۔“
”کوڑو کو فون کر کے؟“ ”دونوں بڑی بہنوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”بھئی ہاں کوڑو ہی ڈیرسٹرڈ، ”نیلما نے شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
”مگر بھائی جان کی پسند کے بارے میں بھلا کوڑو کیسے کچھ معلوم ہو سکتا ہے؟“ ”نازو نے بہن کی بات کو مذاق پر محو

کرتے ہوئے پوچھا۔
”یہ ٹاپ سیکرٹ ہے بھائی جان کی، ”نیلما انشرواٹ بھرے انداز میں بولی۔

”چلو بہن شریک ہیں۔ یہ کہو کہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو، ”نازو نے دلار سے اسے دانے سے
”ارے نہیں تو یہ۔ اب اتنی بھی گستاخ نہیں ہوں کہ اپنے بڑوں کو بے وقوف بناؤں۔ ٹھیک ہے آپ کی بات

بات کا یقین نہیں آ رہا تو کوڑو کو فون کر کے ان سے پوچھ لیتی ہوں، ”نیلما ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولی۔

”اب پھر بیجے۔ یہ ہے ریسور اور یہ ہے ڈائل۔ اب مٹھوڑی سی انگلیوں کو زحمت دے دیجیے، ”نیلو فرہنگ نے نازو کے
”نیلما نے نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما
نے سائید نیل پل پر کھانا ہوا فون اٹھا کر نیلما کی گود میں رکھتے ہوئے ریسور بھی اٹھا کر اس کا ہاتھ میں تھما دیا۔ نیلما

"ہائے ہی رہے تھے اسے پوٹل کہہ کر پکارا تو اس کا نام سچ پوٹل ہی پڑ جائے گا۔ جب کہ تمہاری اطلاع کو وہ انسان ہے گئے گا نہیں۔"

ناز نے برا ماننے کے باوجود دموت سے کام لیتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ اصل میں پوٹل ایک چوٹا سا تیز خولہ صورت کا پتو لٹکا ہوتا ہے۔ اور کوشلہ میں نازو کے بیٹے کو پوٹل ہی کہتی تھی۔ نازو نے جس انداز میں بات کہی کہ کوشلہ زور سے ہنسنے لگی۔

"میں کسی رُسے سب سے میں تو اسے پوٹل نہیں کہتی ایسا بلکہ وہ ہنس ہی بہت پیارا بالکل پوٹل کی طرح ہے کوشلہ ہنسنے ہوئے کہلا۔"

"اچھا خیر چلو۔ جو چاہے کہہ لو۔ لیکن اس کا اصل نام شارع احمد ہے۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ نازو۔ بھائی کی پسندیدہ لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اسی لیے میں نے نوٹ کر لیا۔"

"کونسی بات۔" کوشلہ نے پوچھا۔ مگر نازو نے ایک دم ہی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ اس بات کی تہہ نہ ہونے لگا۔

"معلوم ہی ہے بھائی جان نے شادی کے لیے رضامندی دے دی ہے۔"

"ہائیں کیا واقعی؟" کوشلہ نے خوش ہونے سے زیادہ خیر سی ہو کر پوچھا۔

"ہاں سچی واقعی۔ بلکہ انہوں نے تو اپنے لیے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔"

"اور میری بیٹی کی لڑکی بھی پسند کر لی انہوں نے؟" کوشلہ نے پوچھا مگر اس کے لمحے میں ڈرامی بھی چونپالی یا اشتیاق نہ تھا۔

"ہاں۔ بس آپ تم جلدی سے اس لڑکی کا نام بتا دو۔" نازو نے کہا تو کوشلہ چپ کر گئی۔

"وہاں؟" یعنی کہ میں بتا دوں لڑکی کا نام ایسا ہے؟

"ہاں، نیلا تو یہی کہہ رہی تھی کہ جس لڑکی کو بھائی جان نے اپنے لیے سلیکٹ کیا ہے اسے تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اور یہی جاننے کے لیے تو ہم نے کل رات نہیں کتنے ہی فون کر ڈالے تھے۔ نازو نے اس سے چوکنے کا کوئی ڈنٹس لے لیا۔

"اچھا نیلا؟" اچھا شک شک تو ہیں نا۔ ورنہ آپ ہی بتائیں میں بھائی جان کی پرسنل سیکرٹری ہوں نہ ایدہ اور اور بھائی جان نے مجھے بتا کر اس لڑکی کو سلیکٹ کیا تھا۔ پھر بھلا مجھے کیا معلوم کہ وہ لڑکی کون ہے؟"

کوشلہ نے پھر اس انداز میں اپنی لاشی کا اظہار کیا کہ لڑکوں اس کی بات کا یقین ہی کر لیتا پڑا۔ اس کے باوجود بھی اس نے کہا۔

"ہاں تو تم شک ہی کہہ رہی ہو مگر نیلا کی عادت سے بھی میں واقف ہوں۔ وہ نیلو فز کی طرح بغیر جانے بوجھ کر بات نہیں کہتی۔ اور بیٹے بھلے اس کا دماغ تو نہیں خراب ہوا تھا جو اس نے تمہارا نام لے دیا۔"

نازو نے کہا تو کوشلہ کا دل چاہا کہ اسے سولو کا نام لے دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں اسفند نے کسی اور لڑکی کو پسند کر لیا ہو۔ اس لیے وہ چاہنے کے باوجود سولو کا نام نہ لے سکی۔

"خیر ذرا نیلا آجائیں تو میں ان سے پوچھتی ہوں کہ انہیں بیٹے بھلے یہ کیا مذاق سوچا تھا جو انہیں نے خواہ مخواہ یہ نام لے دیا۔" وہ بیٹے نام نہ نہ کرنا پڑا۔ اصل میں بھائی جان کی شادی کی خوشی سب سے زیادہ تھی ہی ہو رہی ہے۔ اس لیے میں نے بلا پوچھ ہی اپنے عشق میں تہہ سے پوچھ لیا۔"

"ارے نہیں یور ماٹھنڈا بیٹا۔ یہی کوئی بڑا ماننے کی بات ہے۔ تجھے خود بھی اتنی خوشی ہو رہی ہے اتنی اچھی خبریں کر کر آپ نے خود بھائی جان سے کیوں نہ پوچھ لیا لڑکی کے بارے میں؟" کوشلہ کو ایک دم ہی احساس ہوا کہ اسفند کی شادی ہو رہی ہے تو وہ بھی خوش ہو کر گئی۔

"بھائی جان سے پوچھ لیتے تو پھر کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر بھائی جان تو آج کل ڈے اینڈ ٹائٹ فوٹو ایڈنگ کر رہے ہیں مگر میں ہونے ہی کی ہیں جو ان سے پوچھنا سکتا نازو نے کہا تو کوشلہ سے زیادہ مضطرب ہو سکا۔

"اچھا پھر یہی ایسا نیلا آپا تو ڈھائی بجے تک کالج سے واپس آجاتی ہیں نائیں میں تین بجے تک آ جاؤں گی۔ اور پھر لڑکی کے بارے میں آپ کو بتا دوں گی۔" کوشلہ نے سوچا خوشی کا موقع ہے اور جب بھائی جان شادی کے لیے سیر میں

ہوئے ہیں تو بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ یعنی کہ میں سب کچھ معلوم ہے اور ظاہر ایسا کر رہی تھی کہ کچھ جانتی ہی نہیں۔ اچھا خیر اور اچھا بڑی چالاک ہو۔ یعنی کہ میں سب کچھ معلوم ہے اور ظاہر ایسا کر رہی تھی کہ کچھ جانتی ہی نہیں۔ اچھا خیر اور اچھا بڑی چالاک ہو۔

کوشلہ نے پوچھا تو بتا دو۔ کوشلہ کی بات پر نازو ایک دم ہی کھل کر گئی۔

"کیونکہ میں نے اچھا بڑی چالاک ہو۔ لڑکی کا نام سولو ہے اور بھائی جان کو نازو نے اسے بہت چاہتے ہیں۔"

"اچھا بھائی جان کو نازو کو جیسے سکتے سا ہو گیا۔ کیونکہ بڑی دیر تک اس سے کچھ لولا ہی نہ گیا۔ کوشلہ نے خود ہی کہی تھی۔ اور اس انکشاف پر نازو کو جیسے سکتے سا ہو گیا۔ کیونکہ بڑی دیر تک اس سے کچھ لولا ہی نہ گیا۔ کوشلہ نے خود ہی کہی تھی۔

وہ سولو آجائیں بھی بہت ڈیزرنگ اور تیز خوبصورت بھی ہیں۔ بھائی جان کی چوٹیں بڑی اچھی ہے نائیں

وہ سولو آجائیں بھی بہت ڈیزرنگ اور تیز خوبصورت بھی ہیں۔ بھائی جان کی چوٹیں بڑی اچھی ہے نائیں

لیا انہوں نے۔ مگر نازو سے کچھ بھی سننا نہیں گیا انہوں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

سولو کا نام سن کر اس کی ساری خوشی پھینک دی گئی تھی اور ساری چونچالی رخصت ہو گئی تھی اور اسے سخت تعجب کے ساتھ سولو کو فون سے پوچھ رہی تھی۔ اور ابھی ابھی کوشلہ نے جو کچھ کہا تھا کہ لڑکی کو نازو نے اسے لٹا دیا تو وہ کسی طرح یقین سے کوشلہ سے پوچھ رہی تھی۔ اور ابھی ابھی کوشلہ نے جو کچھ کہا تھا کہ لڑکی کو نازو نے اسے لٹا دیا تو وہ کسی طرح یقین سے کوشلہ سے پوچھ رہی تھی۔

کوشلہ نے پوچھا کہ لڑکی کا نام کیا تھا؟ اس کا بھائی سولو سے شادی کر رہا ہے۔ جب کہ وہ تو بھجور ہی تھی کہ اس کے بھائی نے کسی بہت مرنے پر بارہ گیا تھا اس کا بھائی سولو سے شادی کر رہا ہے۔ جب کہ وہ تو بھجور ہی تھی کہ اس کے بھائی نے کسی بہت

ای اور پھر عہدہ مارا ہو گا۔

کسی بہت ہی دولت مند ادا یہ دانت لڑکی کا انتخاب کیا ہو گا۔

مگر وہاں تو وہی شکل ہو گئی تھی کہ کھوٹا پھاڑ اور نکلا چوہا۔ کہ سہار کھوٹے کا کام بھی آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھاڑ کھوٹے وقت جیسے تو ان کی صرف کرنے میں انسان کے جسم کا تیل نکل جاتا ہے پس کچھ اسی طرح بھائی کے اس معاملے میں اگرچہ نازو نے تو ان کی صرف نہیں کی تھی لیکن بھائی کی شادی کا یہ معاملہ عرصے سے اس کے اور اس کی ماں کے لیے ایک پر اہم بابو تھا۔ اور اتنے میں بعد اس پر اہم کا عمل ہی اس کے ہاتھ آیا تھا تو جیسے چھت کی بیماری کی صورت میں۔

بہر گیت کچھ دیر تک تو وہ وہیں بیٹھ رہا تھا فون کے پاس بیٹھ رہی ساکت اور صامت سی بیٹھ رہی پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ گو ماں کو پوچھنا کر ان کی خوشیوں میں تنگیوں کو نہیں چاہتی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ ماں یہ بات بالکل برداشت نہیں کر سکتیں لیکن پھر بھی۔ بتانا تو ضروری ہی تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو دیکھا۔ ماں سامنے ہی کھڑی سولو سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ اور اس سے چونکہ اسے سولو کی شکل دیکھتی ہی کیا اس کا تصور تک گوارا نہ تھا اس لیے اس نے وہیں کھڑے کھڑے ماں کو لپکا کر کہا۔

"فون بلی آئے آپ کا فون آیا ہے۔ اور پھر پلٹ کر کمرے میں چلی آئی پھر کچھ ہی دیر بعد ماں کمرے میں داخل ہوئیں تو ریور کو کرڈل پر رکھا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"ہائیں تم نے ریور بھی رکھ دیا۔ کس کا فون تھا۔" کوشلہ نے نکال دیا پھر پوچھ کر لیا۔

"کسی کا نہیں۔ میں نے خود کوشلہ کو فون کیا تھا۔"

"اچھا تو کیا وہ لوگ میں ہی موجود ہیں؟"

"نہیں بلکہ دادو گئے ہوئے تھے زمینوں کی خریداری کے سلسلے میں۔ ابھی صبح کو واپس لوٹے ہیں۔"

"اچھا پھر کیا تم نے کوشلہ سے پوچھا۔"

"جی ہاں پوچھ لیا ہے نازو نے کروا سامنہ بنا کر کہا۔ زینت نے تو کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ بیٹی کا چہرہ پورا اترا سا ہے۔ اور اب وہ مجھ بھی بدلا بدلا سا۔ اس کے جواب دینے کے انداز پر انہوں نے بیٹی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ خیر تو ہے۔ یہ تمہارے موڈ کو اکیدم ہی کیا ہو گیا ہے۔ اور کوشلہ نے آخر تمہیں کیا بتایا؟ اور تب تھوڑی ذرا غامض رہنے۔ کے بعد نازو نے بہت بھگتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ کوشلہ نے بتایا ہے اسے آپ برداشت نہیں کر سکتیں گی۔ اور چونکہ زینت کا تجسّس انتہا کو پہنچ گیا تھا اس لیے وہ بھی کے سپیلیڈا بھجوانے پر مزاح کر گئیں۔

”اے تو ایسی کیڑی بات ہے جو میری برداشت سے باہر ہو گئی ہو یا نہ تو اگر کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو یہ کیا ہو گا تو ہماری حیات نہیں ہوگی کہ ان کی مخالفت کر سکیں۔“
 ”لیکن کاش انہوں نے کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو ہی پسند کر لیا ہوتا مگر یہ تو نازو نے کہا تو زینت اس کی بازو کر بولیں۔“
 ”آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو نازو۔ یا پھر نیلما کی طرح مجھے بھی سر پرانڈ دینا چاہ رہی ہو۔ زینت نے غصہ سے اس کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیجیے میں بھلا آپ سے مذاق کروں گی مگر۔ میں تو اس وقت اپنے اندر اتنی ہمت ہی نہیں پارہی کہ اصل بات آپ کو بتا سکوں۔“
 ”مگر آخر ایسی کیا بات ہے۔ کچھ بتاؤ تو مجھے بتا دیجیے۔ زینت زحج ہو کر بولیں۔“
 ”بات ساری یہ ہے کہ بھائی جان نے اپنی لائف پارٹنر کے طور پر سلوٹ کو پسند کیا ہے۔“
 اور سلوٹ کا نام سن کر زینت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی انہوں نے تعجب سے کہا کہ کیا ممکن آواز حلق میں ہی کہیں آگئی اور منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ مگر انہوں نے جلد ہی اپنی اس شوکہ زدہ سی کیفیت پر قابو پا کر کہا۔
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بونٹی اپنی نوعیت جتنا بڑا بالائی ہو۔ یوں بھی وہ ابھی بچی ہی ہے۔ اس کی بات کا کیا اعتبار۔“

”وہ بچی نہیں آزاد فضائوں کی پروردہ وہ بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔ اور پھر مگر اس نے کچھ دیکھا ہو گا تبھی تو کہہ رہی رہا سلوٹ کہہ رہی تھی کہ بھائی جان سلوٹ کو بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ اور بھائی جان کے بارے میں وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ بات کہہ رہی تھی۔ نازو نے کہا تو زینت چپ ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ ان کی نظروں میں معاً وہ سب کچھ نمودار ہو گیا جسے وہ اس وقت تک دیکھ نہ سکتی تھیں۔

وہ اس وقت سلوٹ پر اتنا ہرمان ہوتا۔
 موقع پاتے ہی اس سے تنہائی میں کھڑے ہو کر باتیں کرتا۔ چاند رات کی شب کو بھی وہ بیٹھ کر سلوٹ سے باتیں کرتا دیکھ کر جو تک سی کئی تھیں۔ مگر پھر انہوں نے یہ سوچ کر اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ آخروہ فائزہ کی نند ہے اور ان کے گھر کی ہمان۔ اس لیے بیٹا اگر اس سے خلاق و مروت سے بات کر لیتا ہے تو اس میں ان کا کیا کھٹ ہوتا ہے۔

وہ تو اور بھی بہت سی بری طرح دل پر گراں گوردی باتوں سے ہمیشہ چشم پوشی ہی سے کام لیتی رہی تھیں۔
 مگر اب انہیں ایک ایک بات یاد آتی جا رہی تھی۔ خاص طور پر ایک پردوں کا تنہائی میں بیٹھا ہونا۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ اور وہ جتنا یاد آتی جا رہی تھی انہیں اسی قدر سلوٹ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ ان کے خیالوں سا راقص اور فطور اسی کا تھا۔
 اسی نے اپنی خوبصورتی اور مسکین بلکہ اپنی مظلومیت دکھا کر ان کے خوبصورت جوان کم و اور خاصی بڑی اعلیٰ کے ملک بیٹھ کر بھٹکانے کی کوشش کی تھی۔

کیونکہ اس نے بابا کو پرچا یا ہوگا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔
 بلکان کی لالچی سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش، تبھی تو بابا اپنی آسانی سے اس کے دام میں آ گئے۔ اور ایک طرف سے وہ بابا کو بے وقوف بھی بنا کر رہی۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے بابا کو کچھ نہیں بتایا۔
 کیسی چلتا اور مکار لڑکی ہے۔ اور بد چلن بھی تنب ہی تو بابا کو اپنا دلوانہ بنا کر انہیں بھی گراہی میں ڈال دینا چاہتی تھی۔
 زینت پیچ و تاب کھاتی ہوئی سوچتی رہیں۔

سب سے زیادہ غصہ تو انہیں اس بات پر آ رہا تھا کہ جب اسے معلوم تھا کہ وہ کسی دوسرے مرد کی ملکیت ہے تو اس نے یہ بات اس وقت تک نہیں کہی تھی۔ وہ کیا خوب عملہ دیا تھا اس نے ان کے احسانات کا ان کے اپنے گھر میں باندھنے

”بابا نہ کہنے کا۔“
 ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے چوٹی سے پکڑا کر کچن سے باہر لائیں اور سب کے سامنے اسے خوب ذلیل و خوار کر دیں۔
 ”اگر کسی بھی حالت میں اپنی خواہش کو عمل جامہ نہیں پہنا سکتی تھیں یا پھر دوسرے معنوں میں عمل دہا مد نہیں کر سکتی تھیں۔“
 یہ وہ کسی کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“
 ”خود اس وقت کی ننگا کا معاملہ سامنے آ جاتا تھا۔ اور وہ یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھیں۔“

بولیں۔
 ”کیوں کیوں سلوط بچاری کیوں ماری گئیں اچھی بھلی تو گور لبر کر رہی ہیں ہمارے ساتھ نہ مارو نہ لڑو۔
 ”اے صرف گور لبر کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں گور لبر کرنا چاہیے تو آسان فٹ ہاتھ پر بھی کر سکتا ہے مگر اپنے
 بات کچھ اور ہی ہوتی ہے اور یہ آخر سلوط کب تک یہاں بیٹھی رہے گی۔ زینت نے کہا تو شعیب منسور جو اس ملک کی
 حالات سے واقف نہیں تھے ذرا اونچی آواز میں بولے۔
 ”بگم یہ آپ کیسی بے موقع باتیں کر رہی ہیں جب کہ بات سموری تھی سنی کی شادی کی۔
 ”بس کچھ ایک دم ہی سلوط کے ٹھکانے سے بے ٹھکانہ ہونے کا خیال آگیا۔ اور ثاقب بھائی سب سے بڑی غلطی
 چکے ہیں کہ اس کے شوہر کے ڈر سے اسے یہاں بھیج دیا ہے اور اس سے بڑی غلطی آپ یہ کر رہے ہیں کہ کسی کی ہمارے بڑے
 چھپا کر آپ نے اپنے گھر میں رکھ رکھا ہے۔ جتنی برا ماننے کی بات نہیں غلطی اصل میں سلوط کی ہی ہے جو وہ اپنے گھر
 شوہر اور گھر پر ملا ملکر بھائی کے گھر چلی آئی تھیں۔ جب کہ ذرا فی کھ تہی نہیں کر دیتی ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ اس
 سلوط سے دگنا ہے اور سلوط نے اسی وجہ سے اسے چھوڑا ہے۔ اور یہ تو آپ کی عزت کے لیے بھی خطرے کی بات ہے
 میرا مطلب ہے جب اس نے سلوط کو حاصل کرنے کے لیے ثاقب بھائی کے یہاں مندرے کر دئے تھے تو وہ یہاں
 بھی کدوا سکتا ہے یا پھر تانوفانی چارہ جونی کر سکتا ہے کہ آپ نے اس کی بیوی کو اس کی بلا امتازت اپنے پاس رکھ رکھا
 ہے۔ زینت شوہر سے ڈرنے کے باوجود بیٹے کو سنانے کی عرض سے ساری باتیں کہہ گئیں اور بیٹا جو اس کے ایک زنی
 کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی حالت نازک تھی اور اپنی شادی سے متعلق ماں اور بہن کی گفتگو پر بھی کان نہیں دھرتا
 ماں کے منہ سے سلوط کا نام سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور جب اس نے ماں کی زبانی سنا کہ سلوط شادی نہ
 ہے اور اپنے کھڑے شوہر کو صرف اس لیے چھوڑے بیٹھی ہے کہ وہ اور میرے کا ہے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ٹھکانا ہوا
 لاوا۔ اس نے جم کے آتش فشاں سے اچانک بہر نکلا ہو۔
 ہاں وہ ایک آگے ہی تھی۔ ایک بھڑکتی ہوئی۔
 ہر شے کو بھونکتی ہوئی آگ۔
 جو بک نخت اس کے اندر ہی کہیں بھڑکی تھی۔
 اور جس سے اس کا خون جوش کھٹکھا کر بال کی صورت میں سر کی طرف آ رہا تھا۔
 اور اس اور چڑھتے ابال کے زور میں وہ اچانک پلٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور شعیب منسور جو بیوی کی باتوں
 کے جواب میں کچھ کہنے والے تھے۔
 ”دبا ئے سنی۔ کیا بات ہے انہوں نے اس کے متغیر ہوتے چہرے کو دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔
 ”نقہ کشی جواب میں اس نے تھپتھپے برساتے اور سب کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔
 اب یہ کیسی آگ بھڑکی تھی ایک دم
 جوش کھاتے خون میں کیسا ابال آ رہا تھا۔
 کہ آنکھوں کے آگے بھی خون کی چادر سی نن گئی تھی۔
 اور سر پر بھی خون سوار ہو گیا۔
 اس لیے اس کا ہر احساس مٹ گیا تھا۔
 ماسواہر شے کو فنا کر دینے کے احساس کے۔ اتنا بڑا دھوکا۔ اتنا بڑا فریب وہ بھی مرنے کا یا ہے اس نے
 وہ اپنے جبروں کو بری طرح بھینچ رہا تھا۔
 اس کی نظریں اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں پر تھیں جن پر نظریں جمائے اور بڑی سختی سے کھول اور بند کر رہا تھا پھر
 اسی پوزیشن میں وہ آخر کوٹ کی کلائی کے خوبصورت چیسٹ کی طرف بڑھا۔ دراز کھولی اور اس میں رکھے اپنے ستارے
 چمکتے ہوئے ریوا لور پر گرفت جمادی۔

[illegible]

سب تصور اور مسند پر سلوک کی اصلیت کا برسرے کا ہونا، بات سے

گمراہ یا بشارت - نے انہیں سلوک کے بارے میں جو کہہ رہا تھا اس میں مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی زیادہ تھی اور حقیقت کمزری

کچھ دوسری باتیں - بابا بشارت کی زبانی سنی ہوئی باتوں کو حدیث کا کھسا سچہ بھی سمجھیں۔ اور اگر کبھی بھی سمجھیں سچے ہی

مغذی ماں بہن اودی خواہ تمہیں اور اسقدر حقیقت سے آگاہ کرنا ان کا فرض بنتا تھا۔ اور وہ موقع ایک شب شمس کو بلا کر

ان کے آگے کھانا لایا تھا اور انہوں نے جو آگ لگا رکھی تھی اس کے در وغل میں بیٹھ کے کھانا چھوڑ کر غصہ ناک سی کیفیت میں اٹھ کر کھانے

پر وہ صاف سمجھ گئی تھیں کہ اب سلوک کی خیر نہیں، سلوک کا پول کھول کر وہ ہلکی چٹکلی تو بگڑ گئی تھیں مگر ایک عجیب سی بے مینہی نے

انہیں آگاہ کیا تھا۔

یہ اسفند کا دوسری توڑ کبھی مائے کیوں ہو رہا ہے آج کل۔ جب کہ ذکر و سلسلو کا ہو رہا تھا پھر وہ کیوں اٹک کر چلے گئے کہ یہ کم
تیز سلسلو کے ذکر سے ان کا کیا تعلق۔ وہ اصل میں آج کل ایک بہت ہی سہل کس آہا ہوا ہے ان کے پاس اب ان کے جوان
ان کے جاہل کی حالت بہت غمخوار ہے بس اسی کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تو سارا سارا وقت ہسپتال
نہر رہے ہیں۔
فریاد بڑی خوبصورتی سے سلسلو کے ذکر کو مالتی چھٹی بولیں۔

میر کو مجھ معلوم نہیں لیکن ہے شاید کچھ ایسی ہی بات :
 "ہاں اور غریب مہربانے چاروں کو تو تاج کے ڈاکٹر مہنگی دواؤں کی لمبی چوڑی فہرست اور بلینک مار مار کر بلا علاج
 نہ دے دیتے ہیں" شعیب منصووظ نے ہر انداز میں ہنس کر بولے ۔

بابا صاحب ہسپتال سے ڈاکٹر قمر کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ابھی آپ کو بلا یا تھا۔ بول رہے تھے کہ کبھی رات کی حالت خراب ہے۔ میں نے فون سے بولا تھا کہ مجھ میں بابا صاحب کو بل کر لاتا ہوں۔ یہ وہ بہت جلدی میں تھی میری بات بھی نہیں سنی اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔ آٹا بک کریم کریم جہاں تک آتا تھا وہیں سے پلٹ گیا۔ ہر جگہ کہ اس سے وہ انتہائی غضب اور اشتعال کے عالم میں تھا بلکہ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ حتیٰ کہ ہر لڑکا اس سے عاری ہو گیا تھا۔ اور بس اس کے ذہن میں تو ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اس کے سر پر تو ایک ہی دھن سوار تھی۔

لیکن ایسے خطرناک موقع پر اس کے کہنے سے باہر نکلے ہی کریم نے اندر کہیں سے وارد ہو کر اس سے کہہ کہا تھا۔ اس کہنے کی کیفیت کچھ یوں تھی جیسے کوئی شخص خدشات سے پر کوئی مہم سر کرنے جا رہا ہو ادا سے خطرات میں پھریکھ کر اس کا کوئی دوست، کوئی بھی خواہ اسے باوجود بلند یعنی چلا کر اس خطرے سے خبردار کر دے۔ تو وہ اپنے قاصد کی تکمیل کی محنت میں اس کی آواز تو سن لیتا ہے مگر اس کی بات کا مفہوم بعد میں ہی سمجھتا ہے۔ تو یہی کیفیت کچھ خائفانہ بھی ہوئی تھی کریم نے چنانکہ وارد ہو کر اسے فون کے آنے کی اطلاع دی تھی اور اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر پر پیغام بھی سنا دیا تھا۔ لیکن چونکہ غیض و غضب نے اس کے ہوش و حواس گم کر رکھے تھے اس لیے وہ صرف کریم کی آواز ہی سن سکا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اس نے کریم کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا مگر نہ تھا۔ بلکہ سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ مگر جب اسے پیغام دے کر واپس چلا گیا تو وہ جس کے بڑھتے ہوئے قدم کر کے آگے مانے کی وجہ سے اس کے

پھلے جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح سو جائے۔ آخر جب بیکہ کسی طرح سویا ہی نہیں اور روئے ہی گیا تو اس نے ماں سے کہا

نہا بدعا کی کہ کچھ تو معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تھی، اندر ہی اندر لرزے کے باوجود جی کڑا کر کہہ بولی۔

”آپ اپنے ہوش میں تو ہیں۔ پس انداز میں بات کر رہے ہیں۔ کیا سمجھ رکھتا ہے آخر آپ نے مجھ کو وہ اصل میں اسے بھی اسفند کے اس قدر اہانت آمیز طریقے سے بات کرنے پر غصہ کیا تھا اور اس غصے نے اس کے کہنے کا حوصلہ دیا تھا۔ مگر جواب میں تو وہ کچھ زیادہ ہی آپ سے باہر ہو گیا تھا۔“

”موصف ایک مکار اور دھوکے باز لڑکی، جو اپنے غیظ اور ناپاک وجود پر معصیت اور شرافت کا نفل چھاننا بہ ایک برس تک میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی۔ مجھے احمق بناتی رہی۔ لیکن اب میں مزید بے وقوف نہیں ہوں۔ ہمتاری گرم خوردہ کھوکھلی اصلیت مجھ پر نقل جاتی ہے۔“

”اب تو کچھ وہ سمجھ رہی تھی وہ درست ہی نکلتا تھا۔ اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔“

”مجھے ابھی طرح معلوم ہے کہ تم شرافت اور عظمت کا دھونگ رچا کر ایک تھک سے دوںکار کرنا چاہ رہی تھیں کہ وہ میری خوبصورتی اور جوانی پر بڑا ناز ہے۔ جیسی تو تم نے اپنی فطری تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے اپنے شرف و عزت کو مجھ کو چھوڑ کر مجھے ناکار کیا تھا۔ تم اتنی ہرمانی اور گراہی بھی ہو سکتی ہو مجھے تو گمان تک نہ تھا۔ میں تو تمہیں مخلصانہ طور پر چھلایا ایسا بھول سمجھتا تھا جو شہم کا خصل ہے کہ رات کی تاریکیوں میں بھٹکتا ہے اور سب کو اپنی انسانی آنکھوں میں دھونگ مگر تم تو مجھ اور غلط فہمی میں کھلنے والا ایسا بھول ثابت ہوئیں جس کا رنگ، تازگی اور خوشبو سبھی کٹافوں میں رل کر میں بدل جاتا ہے اور تم وہی بعض زدہ عفریت ہو۔ بدکردار اور بدعین اور۔“ آف وہ کشتا آگے بڑھ گیا تھا۔ حد نہ کر گیا تھا۔

اور کبھی کیا رہا تھا کہ شرم اور ندامت سے کتنی سلوط کی برداشت جواب دے گئی۔

”اپنی زبان کو لگام دیجیے اسفند۔ آپ اپنی حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اگر میری اصلیت آپ پر نقل بھی گئی ہے تو لافان کے دائرے میں رہ کر بات کیجیے اور پھر جب آپ سب کچھ جان ہی گئے ہیں تو اس میں اس قدر غصہ دکھانے اور لگائے کی کیا بات ہے۔“

اور اس کے اس جواب پر وہ آگ بگولا سا ہو گیا اور بڑی طامت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یو ڈیٹیم لیں کو بچر۔ یہ تم کہہ رہی ہو۔ کیا تم کو اپنے کچھ بڑی ہی بھی شرم نہیں۔ ذرا بھی عزت نہیں رہی تو میں جب کہ تمہیں اپنا پول کھٹنے پر چلو پھر پانی میں ڈوب مرنے چاہیے تھا۔“

”نہیں مجھے تو کوئی ضرورت نہیں چلو پھر پانی میں ڈوب مرنے کی۔ کیونکہ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ نہ آپ کو دھوکا ہی دیا ہے۔ بلکہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے یا ہو اسے آپ کی طرف سے ہی ہوا۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ اعتقاد ہی رہا تھا کہ میں نے آپ کے جذبے کی حوصلہ افزائی کی نہ آپ کو بھجایا اور پرچایا۔ میں تو آپ سے ہمیشہ ہی کہتی رہی کہ میں آپ کے جذبے کی پذیرائی کرنے سے قاصر ہوں۔ ہمیشہ ہی اندیشہ کیا کہ سخت مجبوریوں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ آپ کا ہاتھ تمام چند قدم بھی چلنے کے قابل نہیں ہوں۔ اس لیے آپ یہ اخیال چھوڑیں مگر۔“

”نہیں، غلط بالکل غلط۔ تم نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا اور برا کہتی ہیں وہ تو سہرہ لڑکی کہہ سکتی ہے جو حیثیت اور قابلیت میں تمہاری طرح کمزور ہو۔ اور ایسے ہی کو مہلبیک کا شکا ہو کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتی ہے کہ لوگ کے گھروالے اسے قبول کرنے تیار نہیں ہوں گے مگر تم تو سارے تجربوں سے گزری ہوئی تھیں۔ گناہ اور نوب کے فرق کو اچھی طرح محسوس کر سکتی تھیں۔ یہ بھی معلوم تھا کہ تمہارے کہنے سے تو کسی نامحرم کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ کیہرہ شمار ہوتا ہے۔ جنہیں پہلی طرح معلوم تھا کہ میں تمہاری حقیقت سے لاعلم ہوں اور اسی لاعلمی میں تمہیں چاہہاں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی میں بٹھا ہوں پھر بھی تم مجھے اتنا جھوٹی محبت کا فریب دیتی رہیں۔“

اصل میں وہ سلوط سے متوقع تھا کہ وہ اس کی لعنت طاعت کے جواب میں کچھ کہنا تو کیا نگاہ اٹھا کر اس کی ذہن دیکھ بھی نہ سکے گی۔ مگر وہ تو بول بول رہی تھی جیسے اسے اپنے لیے پرندامت ہو نہ اس کے غضب و جلالت سے متاثر ہوئی ہو۔ یہی دیکھ کر وہ اسے قائل اور شرمندہ کرنے پر تیار ہوا تھا۔ مگر اس نے ایک طرح سلوط کی عزت کو چیلنج کیا تھا۔ اس کی ذہن کرنے میں کوئی کمزوری نہیں اٹھا چھوڑی تھی۔

”اسے کردار پر نہ صرف کچھ اچھا ہی تھی بلکہ اسے بدچلن تک کہہ دیا تھا۔“

اس نے کچھ برداشت کر سکی تھی مگر یہ بے بنیاد الزامات۔

اور سلوط سب کچھ مرکزی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”وہیں اور ذلیل مرکزی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔“

اس نے فحش میں بھی ایک دم ایسا ہال آگیا تھا۔

وہ اس کی بات کے جواب میں بھیجک کر بولی۔

”نہیں میں نے آپ کو سب تو گزرب نہیں دیا۔ نہ ہی آپ کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی البتہ میں اس کا اعتراف ضرور کرتی ہوں کہ میں چاہنے کے باوجود اپنی بابت آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکی۔ مگر اس کی وجہ وہ نہیں ہے کہ میں جلد سے ہی بدچلن کے ساتھ دل کی تمام تر گہرائیوں سے مجھے چاہتے ہیں مجھے دیکھ کر آپ کی بات سے آپ کی زبان آپ کے بس میں نہیں رہتی۔ آپ مجھ سے باتیں کرتے وقت بہت سی اخلاقی پابندیوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ پھر جیسا کہ یہ صورت حال میں کسی دل اور کسی زبان سے اپنے بارے میں لب کشائی کر کے آپ کے جذبات کو بھول کر لیتی۔ آپ کا دل توڑتی ہیں پھر یہی ہوتی تو نہیں ہوں۔ بلکہ میرے سینے میں ایک گوشت پوست کا دھڑکتا ہوا دل رہ رہے ہے۔ جیسے بہت بیلے آپ کے جذبات کی صداقت نے ٹوٹ لیا تھا۔“

اپنی بات کہتے کہتے سلوط کی آنکھیں بھیجک نکلیں اور آواز نڈھکی گئی۔

”ہو نہ آسودے سے ڈرانا عورت کا بہت پرانا حربہ ہے کہ وہ آسودے کی چادر کے نیچے اپنے جرم اور غلطیوں کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ میں تمہارے ان حربوں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ اگر دنا ہی ہے تو اپنے کرتوتوں کو رو۔ اپنی بھوتنی ہوئی قسمت پر آسودہ ہو۔ مگر مجھ سے کسی اچھے سلوک کی امید نہ رکھو۔ کیونکہ میری نظریں تمہاری حیثیت پر دوڑتی ہیں کبھی نہیں رہیں۔ میرے سامنے تمہارے یہ تریلہ جلتی نہیں چلیں گے۔“

وہ کھراحتی حقارت سے بولا کہ سلوط کے سپرد سے لگی تو سرنگ جا بیٹھی کہ وہ تو کچھ بھی اس کی موت، رواداری اور تنہا و غلطی کی حدیں توڑنے کے باوجود اس سے بھڑکی بہت رواداری سے بات کر رہی تھی۔ مگر وہ تو تھا کہ اس پر حاوی ہو کر تاجار با تھا۔ وہ بھٹکا نہ جیتی۔

”اگر آپ پورا ماؤ تھوٹا ہے اگر بادشاہ بھی ہوں تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ میری نظریں تو اب آپ کی حیثیت و دوکڑی کی کمی پر پڑی اور آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا مجھ پر اتنے نزدیک الزامات لگنے اور اتنی گرمی ہوئی باتیں کہنے کا۔ آپ بلیز اسی وقت بیان سے چلے جائیے۔“

ادریس کی کمر۔ وہ بھی سلوط کے منہ سے وہ چلا اپنے آپ میں رہتا۔ دانت نہیں کر بولا۔

”نہیں میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ بلکہ تمہارے لیے یہ بہتر ہو گا کہ ابھی اور اسی وقت اپنے ناپاک وجود کو کسے گھر سے لے جاؤ۔ تم مجھ سے سخت نفرت ہے اور میں ایک منٹ بھی تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کا دروازہ نہیں ہوں اس سے پہلے کہ میں تیرے گھر سے لے کر اپنے پرچور ہو جاؤں یو گیٹ آؤٹ فرم مائی ہاؤس۔ گیٹ آؤٹ۔“

”اب تم مجھے ضرورت نہیں پڑی ایسے غیر مذہب گھر میں رہنے کی جہاں گندی زمینوں کے لوگ رہتے ہیں۔ اور میں تو بہت چلی یہاں سے جانے کا سوچ رہی تھی۔ اب تو تمہارے کہنے سے ہو کر ٹوٹنا بھی میری توہین کا باعث ہو گا۔“

وہ جواب اتنی بے وقعت اور گری پڑی نہیں تھی جو اس کے اس بری طرح دھتکارنے پر بھی اس کے ہاں دھڑکنے کی میسر نہ رہی۔

”ہاں تو میں اگر اتنی ہی عزت مند ہو تو اب میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔“

اس نے جواب میں گویا محض آخر کے طور پر کیا اور پھر پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

اور زینت اور نازہ جو اس کے کمرے کی گھر کی سے کان لگائے کھڑکی کے تھیلے اس وقت وہاں پہنچیں جب سلوط نے اپنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنے بارے میں اس لیے نہیں بتا سکی تھی کہ مبادا اس کا دل ٹوٹ جائے یا جذبات

مجموع ہو جائیں۔ دونوں ماں بیٹیاں کھڑکی کی زریں چوکت سے کان لگائے بڑے غور سے ساری گفتگوں کی خبر لیں۔ انہیں احساس ہوا کہ اسقدر اس کے کمرے سے باہر جا رہا ہے دونوں جلدی سے کھڑکی سے بیٹیں اور دوسرے پاؤں پر بیٹھ کر دیکھنے لگیں۔

”لو دیکھا تم نے کس قدر مکار اور چلتا لڑکی ہے۔ کیسے بڑھ بڑھ کے باکو جواب دے رہی تھی جیوں کہ ہر اچھا ہی ہوا جوابا نے گھر سے نکلے کو کہہ دو اور نہ ایسی بدیلیں لڑکی کا کیا بھروسہ تھا۔ اگر خدا خواستہ کوئی افشاں نہ آتی تو زینت بستر پر بیکر آہستہ آہستہ ہاتھ پٹے ہوتے لو۔“

”جی جی! یہ تو فحش ہے مگر اس کا یہاں سے نظر آسان تو نہیں۔ کیونکہ یہاں سے نکل کر وہ جانے گی کہاں۔ یہاں کوئی جان بچان والا ہی نہیں ہے اور پھر اس کے جلنے سے خصوصاً آپ کے لیے بہت سے برا اثر ہو سکتا ہے۔ وہی مثل ہوگی کہ کھلانے کا نام نہیں ہوتا لائے کا نام ہوتا ہے۔ سب لوگ آپ ہی کو لازم دیں گے کہ آپ کے بارے میں اسے یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے اور ڈیڑی تو جی قیامت ہی کھڑی کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے سامنے آپ نے سلوٹ کا ذکر نہ کیا تھا۔“

ناز نے کہا زینت دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قابل ہو گئیں۔ یوں بھی ان کی تینوں بیٹیوں میں ناز ہی سب سے زیادہ عقلمند اور معاملہ فہم تھی۔ زینت قابل سی ہو کر لو۔

”ہاں۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں کیا تھا۔ مگر تم نے سنا نہیں بابا جس طرح اسے نکل جانے کو کہہ رہے تھے دیکھ دینے کی کسر رہ گئی تھی۔“

”خیر اب وہ تو اتنی بھی غیرت مند نہیں ہے۔ اگر بوقتی تو اپنا شوہر اور اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسروں کے گھروں میں یوں جھانکتی بھرتی۔“

ناز جو بحث پر اتنی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی بات۔ درکنے کی عادی تھی اور جب اپنی بات کرتے دیکھی تو بحث ہانے پر تیار ہو جاتی تھی۔

”خیر میں نے تو اسے گھر سے نکل جانے کو نہیں کہا۔ بابا نے کہا ہے وہ خود ہی جائیں۔“ بیٹی کی بحث کرنے کی عادت سے واقف زینت نے قصہ کوتاہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہیے جا کر دیکھنا تو چاہیے ہی کہ آیا وہ چلی گئی یا ابھی وہیں دھرنا دیے بیٹھی ہے۔“ ناز بولی۔

”اے لو کیا اب میں اس کام کی رہ گئی ہوں کہ بار بار جا کر یہی دیکھتی رہوں کہ بابا نے کیا کیا اور وہ کیا کر رہی ہے اور پھر جوں ہتھارے۔ وہ جا بھی کہاں سکتی ہے۔ فخر نے اسی لیے تو اپنی لاج سے سرمنڈی ہے کہ ہمارے سو کوئی بھی اس کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ ہوا ہوگا۔“

زینت اٹھتی ہوئی لو۔ اور پھر نگھڑے میں سوئے ہوئے نواسے کو آہستہ سے گود میں اٹھا کر اسے ناز کے بستر پر لٹائی دے دیں۔

”تھیں کتنا شغ کیا ہے کرات کے وقت نیچے چو جھوے میں نہ لایا کرو۔ مگر تم تو اسے سلاتی بھی اسی میں ہو۔ اتنی غمی سے نہاں ہے۔ اسے اپنے پاس سلا کر دو۔ نواہ تک مسلسل ماں کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے بچہ ماں کے پیٹ کی کامیابی سے پیدا ہوئے کے بعد بھی وہی کڑی جانتا ہے جو ماں کے قرب سے اسے حاصل ہوتی ہے یعنی تو یہ اتنا ہے جتنے رہتا ہے اور اس کے چلنے تک تو نہیں اسے اپنے پاس ہی سلانا چاہیے کہ بچے کا خون ہلکا ہوتا ہے۔ بزرگ خواتین بڑا دہم کر رہی ہیں طبعاً مسلمان خواتین بات۔ کیسے کو اس دور سے نہ تھا بھی نہ چھوڑتی تھیں خدا نخواستہ اسے اوپر ہی اتر نہ ہو جائے۔“

اور ماں کی بسی جوڑی تھوڑے پر ناز کو ہنسی آگئی۔

”جی وہ آپ کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ یہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا زمانہ ہے۔ آج کل تو پیدا ہوتے ہی بچے کھول کر اپنے رگڑ رگڑ کا زمانہ لیتا ہے۔ ورنہ پرانے زمانے میں تو سامے کے بچے کی آنکھیں تین روز بعد کھلتی تھیں۔ یہی حرکت ہوتی ہے جن جن کو چھپا کر بچا تھا۔ اور پھر چار ماہ بعد کھیں جا کر صورتوں کو پہچاننا تھا۔ مگر اپنے شاعر صاحب نے پہچانے اندر آپ کو پہچان کر مسکرائے گئے تھے۔“

بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

”یہ بڑے نواسے کے دھمکیوں کی تردید کرتے ہوئے انہیں ان دھمکیوں سے نکلانا چاہا۔“

باصواب کے ڈر سے نہیں کیا۔“

رہا تو کئی بھی بات تو نہیں کہ کریم کو بھی بتا چل گیا۔ یہ آخر کو ہمارے پریسینج کا معاملہ ہے۔ کریم کا چھوٹا سا دامع

نہیں تھی! امیر جنسی کا سن کردہ مجھ سے مفرد استفسار کریں گے۔ میرے خیال میں ان کے استفسار کا جواب یہ ہے کہ میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے لیا تھا۔

”اے بھئی! لہذا امیر جنسی و غیر جنسی کا نام۔ میں یہ کہہ دینا کہ ایک مفردی کام ہے۔ عزیمت بزرگی سے بولیں تو خود آپ اس کو لے کر آئیں۔ لیکن اگر ایک تو بزرگی بڑی اور بعد ازاں دوسرے میں بھی تو دعوت ہو کر شعیب منصور آفس سے جا رہے ہیں۔ اور اگر وہ بھی نہیں آتے تو کسی نے بھی گھر پہنچنے والے ہیں۔ مگر استفسار کرنے کے شام ہو گئی تھی کہ میں مغرب کے بعد نکل کر آئے۔ ناز و نوائے کرے میں یہ بھی بیٹھی رہی۔ اور عزیمت چائے کے لوازمات سجاے شوہر کے غسل خانے سے برآمد ہوتا تھا۔ کرتی رہی۔ وہ بہت نکر مندا و دیو بیگل سی نظر آرہی تھیں۔ خوشی کی بات ہوئی یا غمی کی بات ہو کر شعیب نے آئے جہاں سے کوئی بات نہ کہتی تھیں۔ بلکہ جب وہ نبادھو کر تازہ ہو جاتے اور کھانچا لیتے۔ تب ہی وہ ان سے ذکر کرتی تھیں۔ اپنے بزرگوں کی یہ فیضیت انہوں نے بھی گروہ میں بانڈھ لی تھی کہ وہ اب سے آئے تو آتے ہی کبھی اس سے کوئی بات کہو کہ وہ کمر و چھوٹے ہوئے۔ اور کوئی بڑی بات یا خبر سننا ہے تو اس کا چھانچا موٹو خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ بڑے میں ہو تاکہ اور کوئی بڑی بات یا خبر سننا ہے تو کچھ ایسا سوچتا ہے کہ از دو اجی زندگی میں تو انہیں اس کی تمام گولیاں ہی کھائی ہیں۔ جب شعیب منصور چائے سے فارغ ہوئے تب انہوں نے آہستہ آہستہ انہیں سلوٹ کے بارے میں بتا دیا۔ مگر وہ تو ایک اور طرح ہی آئے۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ سلوٹ کیسے کہیں جا سکتی ہے اور کہاں جا سکتی ہے آخر مفرد کہنے ہی اسے دیکھتے دیکھتے کر نکلا ہوگا۔ کھل رہا تھا نا کہیں اس کا بیاں رہنا۔ جیسی تو مفرد دی جاتا تھا کہ اس کے خلاف زہر مار رہی تھیں۔ انہوں نے اٹھا ہی تو یہی ہوا تھا۔

”نہیں نہیں حاشا دیکھا۔ میں نے اسے نہیں نکالا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ جارہی ہے۔ عزیمت شوہر کے تیر دیکھ کر ڈر رہی تھیں۔

”مگر کہ گئی وہ؟ کیسے گئی؟ کیا تھی؟ کیا کر رہی تھی وہ؟ جو تھیں جاتی نظر نہ آتی۔ اور کیوں گئی کوئی نہ کوئی تو بات ہو کر بلا وہ تو نہیں جا سکتی تھی۔ شعیب منصور نے کچھ زیادہ بڑا کر دیا تھا۔

”وہ کیا ہو سکتی تھی۔ رات کو تو اچھی بھلی ناز و ناک سے پاس بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ مگر ناز و ناک بڑی ہوشیاری کے ساتھ کرتی تھی۔ اس نے سلاطین کا صبح دیکھا تو سلمان سمیت غائب تھی۔ عزیمت نے منمناتے ہوئے کہا۔

”معتزم نے صبح ہی مجھے یہی یوں نہ بتا دیا۔ جو ساڈن کر ڈر کر۔ اب بتا رہی ہو۔

”کیسے بتائی۔ بار بار مجھے کے قریب تو خود مجھے بھی معلوم ہوا تھا۔ وہ بھی جب میں نے دیکھا گیارہ بج گئے ہیں۔ اور سلاطین انہیں لے کر گئے کو ان کی خیر خبر لینے کیسیا۔ مگر کہیں نے ان کو بتایا کہ ان کے کہے اور الماری کے دروازے جو پٹ پٹے ہیں۔ اور الماری کے پٹے اور سوٹ کیس سمیت خود سلوٹ بھی غائب ہیں تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے تو ناز و ناک تو بھی ڈنکے کچھ لیا کہ کہیں وہ ان کے بیاں تو نہیں گئیں۔ مگر انہوں نے بھی انکار کر دیا کہ سلوٹ بیاں نہیں آئیں۔ یہ تو ذرا ہی آپ کے آفس کی تو معلوم ہوا کہ آپ آفس سے چلے گئے ہیں۔ پھر کیسے آپ کو بتائی جب آپ کہیں ملے ہی نہیں۔ اور آئے بھی ہیں تو اب نام لگا کر۔

”میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب وہ کیا سبب تھا اس کے جانے کا؟ اور وہ کب گئی؟ شعیب منصور کو جیسے بیوی کی بات کا یقین ہی نہ آیا۔ انہوں نے دھڑک کر بیوی سے پوچھا۔

”اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کب گئی ہیں تو پھر کھانا میں انہیں جانے دیتی۔ اور سبب کیا ہو سکتا ہے ماسوا اس کے کردہ مجھ سے ملازمت کی تلاش میں تھیں مگر کسی بچہ کو خائیں کھینچ کر رکھی تھیں۔ مگر انہیں کوئی ملازمت ہی مل گئی ہو۔

”عزیمت نے حسن لاہوری کا اظہار کرتے ہوئے سلوٹ کے بارے میں تیا س آرائی کی شعیب منصور کو قطعاً آگیا۔ اور بڑے جذبہ کے عالم میں یہی طرح کر رہے۔

”ملازمت مل جاتی ہے تو یوں چورن کی طرح چھپ کر نہیں جاتے۔ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات مفرد کہہ رہے۔ جسے تم چھپا تا چاہ رہی ہو۔“

نہیں سلوٹ لیا کیا بات ہو سکتی ہے جو میں آپ سے چھپاؤں گی۔ سلوٹ نے کوئی نہ کوئی بندوبست تو کر لیا ہوگا اپنی مائٹس سے تو اپنے اطمینان سے نکل گئیں؟

”ہم تو اپنے اطمینان سے کہہ دیا کہ نکل گئیں۔ آخر بھری بھی تو کچھ حجت کے تحت ہے۔ اور وہ یہ سوج لینا کافی نہیں کردہ وہاں۔ جیسے اطمینان سے کہہ دیا کہ نکل گئیں۔ اسے کہاں دھونڈوں کہیں کا ش کروں۔ یہ کراچی تو عواض کی دلدل ہے۔ نہ مل جائے تو دوسرے جگہ سے مل جائے گی۔ پولیس میں بھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں کھوا اسکا کہ بدنامی ہوگی۔ صبح ہی بتا دیا ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کتنی کمزور ہے۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

”یہ تو اسے دھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اب اس وقت رات کو اس کی تلاش میں پولیس اپنا بعض محنت ہی ہوگی۔ تھماری۔

پاس ملا لیا ہے۔ بعد میں جب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا تو حالات کے پیش نظر جو مناسب معلوم ہو گا وہ کیا جائے گا۔
جا کر ان کی کچھ بات یہ بات آتی تھی۔ بھائی کے یہاں ٹھوڑی دیر بیٹھ کر اور بھائی بھابھ سے مشورہ کر کے غصہ منور ہو کر
لوٹے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

سلوٹ کی پریشانی میں زینت سارا دن ادھر ادھر پھرتی رہی تھیں۔ ڈھنگ سے کھانا کھا یا تھا نہ دوسری باتوں پر
اس لیے شوم کا انتظار انتظار کرتے سو گئی تھیں۔ شعیب منصور نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ کچھ سوچیں اور اپنی
تھیں۔ لباس تبدیل کر کے حلیہ سے لہجہ تبدیل کر کے تھے۔ گوسلوٹ کی پریشانی میں انہیں دیرینہ نیند نہیں آتی تھی۔
کر بیوی کی غفلت اور سلوٹ کے ساتھ گئی زینت پر غصہ آ رہا تھا۔ سلوٹ کے بارے میں بھی وہ سخت پریشان ہو رہے تھے۔
وہ کہاں گئی ہو کہ ہاتھوں میں چیز تھی ہو۔ اور اس کا کیا حشر ہو۔

انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی شرمناک حالت میں تھی۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ دن کے وقت گلی پر
مکمل ہے اسے ملازمت مل گئی ہو اور اس کے ساتھ رہا ہوا بھی ہو گا۔ تھی تو وہ اتنے پہلے ہوا تھا۔
گئی ہے۔ لیکن بے کہ خود کو اس جگہ ایڈیٹ کر کے کسی روز خود ہی ملنے آجائے۔ لیکن اگر ایسی بات نہ ہوئی۔ اور یوں ہی گئی ہے۔
نہ معلوم کن ہاتھوں میں پڑے اور اس کی کیا روک تھام ہے۔ اور اس طرح خوشامد زندگی بھر کی ٹوٹ کر آئے۔

چھریں فافہ اور سب سے بڑھ کر شایب کو کیا جواب دوں گا۔ کیا منہ لے کر ان کے پاس جاؤں گا اور شایب کو فافہ
زندگی کو اور بھی عذاب بنا دیں گے۔ پہلے یہ کیا کہ لکھنؤ میں رہتے رہے ہیں میری بہن کو رنگ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی زبان
برداشت کرتے کرتے۔ اس پر قدرت کی قسم طبعی ہے کہ اسے اولاد سے بھی محروم رکھا گیا۔ اور میری کسی چیز یا مال کو ہاتھ نہ
تو نہ تھا۔ ایک اتالیقی جان کا معاملہ تھا۔ ایک جوان اور پریانی عزت دار لڑکی کا معاملہ تھا۔ جس کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر
رکھی تھی۔ اور اب اس کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے خاندان میں ان کی نفرت ہو گئی۔ اور یوں غصے کا
غائب تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب تک اسے خود غائب نہ کیا جائے یا گھر سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس کی کوئی دھڑک
ہوگی۔

گزشتہ شب رات کے کھانے پر ان کی بیوی اور بیٹی اسفند ان کے اور اسفند کے سامنے جس طرح سمجھادی جا رہی تھی
اپنے گھر میں رہتے پر اعتراض کر رہی تھیں اس کو گھر سے پھونک دیتے تھے۔ اور انہیں یہ تو معلوم تھا کہ سلوٹ شادی نہ ہوے۔ اور پچھلے
سال سے میکہ بٹانے بھی ہے۔ اور وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اور شایب اس کے گھر پر
اسی لیے غمزدہ ہے کہ اس کا شایب جس سے متاثر ہو رہا تھا۔ لیکن بیوی کی زبانی انہوں نے جواب دیا تھا کہ میں نے تو
انہیں حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اور اس معاملے میں اسی وجہ سے زبان نہیں کھول سکے تھے کہ انہیں اصل حالات کا کچھ علم نہ تھا۔
یہی وجہ تھی کہ بیوی کے احساس دلانے پر کہ انہوں نے کسی دوسرے کی بیوی کو اپنے گھر میں رکھ رکھا ہے وہ چپ سے ہونے کو کہنے
لگے تھے۔

مگر اب آج کے تازہ معاملات پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یا تو سلوٹ نے گزشتہ روز زینت کی شکل
سُن لی تھی یا پھر خود زینت اور ناز نے اس کے لیے ایسی بات کہی ہے جس نے اسے ان کا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔
اگلے روز صبح کو ناستی کی میز پر سب موجود تھے۔ حتیٰ کہ اسفند بھی جو دورانیہ ہسپتال میں گزار کر اس وقت گھر پہنچے
ہوں تو ناز کو کھانا اور ناشا اپنے کمرے میں ہی کھا رہی تھیں لیکن اس روز وہ بھی زینت کے کہنے پر سب کے ساتھ ناشا کرتے
تھے۔ البتہ نیلوفر اور نیلا کالج جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ کمرے کے کچھ کتبے کے پیچھے تھے۔ شعیب منصور جو کچھ دیکھتے
تھے اس لیے انہوں نے بیٹے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، اور اس کے سلام کا جواب دے کر چپ چاپ ناشا کرتے رہے۔
زینت اور ناز بھی اپنی اپنی سوچ میں مگمگی تھیں۔

اسفند کچھ اتنے عین موقع پر ہسپتال سے آیا تھا۔ اور کچھ ایسے خستہ و خراب ہو گئے تھے کہ انہوں نے زینت کو اسے سلوٹ کے پاس
میں بتانے کی ہمت ہی نہیں بڑی تھی۔ یہی کیا کہ تھا کہ وہ ماں کے کہنے پر کاشا تیار رہے۔ مگر کہو۔ لباس تبدیل کر کے
چپ چاپ کھانے کی میز پر پہنچا تھا۔ وہ بھی بہت خاموش اور غمزدہ سی شکل بنائے خاموش بیٹھا تھا۔ ناز نے خود ہی اس

یہاں میں جائے اٹھ لی تھی۔ خلاف عادت وہ بھی چپ چاپ سی تھی کہ تبھی چھری اور کاٹا پلیٹ کے بیچوں بیچ رکھتے ہوئے
لیب منصور نے نشوونے ہوئے صاف کیے اور بولے۔

بچے اور کچھ سوچا نہیں۔ یہی سمجھ میں آیا کہ سلوٹ کو ایسے اوروں میں تلاش کروں جو لاوارث اور مصیبت زدہ لڑکیوں
ہو۔ لہذا دو عین اوروں میں توکل رات کو ہی جا کر دیکھ لیا۔ مگر وہ کہیں بھی نہیں ملی۔ اور ایسی
زینہ اور غفلت دیتے ہیں۔ لہذا دو عین اوروں میں توکل رات کو ہی جا کر دیکھ لیا۔ مگر وہ کہیں بھی نہیں ملی۔ اور ایسی
نہی ہو کر اس کا دل ناچنے لگی۔ تو انہیں کس وقت کی تھی وہ یہاں ہے؟

شعیب منصور نے اسفند پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔ جواب تعلق اور بے نیاز سا بیٹھا تھا جیسے وہاں مجھ
شعیب منصور نے اسفند پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔ جواب تعلق اور بے نیاز سا بیٹھا تھا جیسے وہاں مجھ

ہی نہ ہو۔ یا پاپ کی باتیں سن ہی نہ سکا ہو۔
یہی تو معلوم نہیں کہ وہ کب کب کبھی تھیں۔ رات کو یا صبح کو۔ وہ تو مجھے گیارہ ساٹھ گیارہ بجے کے درمیان کوٹھنے آکر

تیار کر دیا۔ سامان سمیت اپنے کمرے سے غائب ہو گیا۔
زینت نے جواب میں کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کب اور کس وقت ان کے گھر سے نکلی تھی۔ مگر

شعیب منصور تو جیسے بھرے ہی بیٹھے تھے۔
خواب تو بھرے دل میں ٹھنڈک بڑھ گئی ہوگی۔ کیونکہ بھابھ کے دل میں چھبی ناخوہ کے صرخی کھانسی کتنی آسانی سے آپ ہی

پہنچ گئی۔ انہوں نے طنز کے تیر طرائف بولے۔
اکال سے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بھی، بیٹے کی موجودگی میں ایک ایسی بات کہہ دینا جو جیسے سے زینت کے دل

میں واقعہ جیسا بن کر آ رہی ہوگی تھی۔ انہیں بہت کھلی تھی۔
کیسی باتیں کر رہا ہوں یا تم کر رہی ہو۔ تمہیں تو سب سے سلوٹ کا اچانک آ جانا ہی بہت کھلا تھا۔ ہمیشہ اس کے

فان نہ رہی تھی۔ رہتی تھیں۔ تمہارا سلوٹ شروع ہی سے بہت ناروا تھا۔ تم نے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ
ہاں سے جاکے پر مجبور ہو جائے۔ میں تو توں سے کہہ سکتا ہوں کہ تم نے ہی اسے گھر سے نکالا ہے۔ اور اب چندا چندا

کر رہی ہو کہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس وقت یہاں سے گئی تھی۔
شعیب منصور تو بیٹے ہی کے لیے بیٹھے تھے۔ اب جو بیوی نے مظلومیت کا ٹھکانہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ کمال ہے کیسی باتیں کر رہے

ہیں اب!۔ تو وہ بیٹے ہی کے لیے تھے زینت نے بھی کبھی مصورت کے ساتھ امر و طلب نظر دل سے پہلے ناز کی طرف دیکھا اور
پوچھا۔ اسے ماں سے کہہ کر آ گیا۔ وہ فوراً ہی بولا۔

”اور تو توڑی۔ سلوٹ تو مجھ سے نہیں میں نے گھر سے نکالا ہے میں نے۔“
”ہاں یہی کہہ رہے ہو تم اسفند۔ اپنے شوہر میں تو ہو۔ یا پھر ماں کی مہر دی نے تمہیں ایک ایسی غلط بات کہنے پر مجبور کر دیا

ہے۔“
بیٹے کے منہ سے ایک بہت ہی عجیب و غریب اور ناقابل یقین بات سُن کر شعیب منصور اچھل سے پڑے۔ انہوں نے قدرے

نہانگی سے ایک بے یقینی سی مثال کر کے پوچھا۔
”میں اسکا کوئی بات نہیں ہے ڈیڈی۔ اور میں کسی پریشانی میں آنے والا انسان بھی نہیں ہوں۔ مبالغے سے کام لینا بھی مجھے

نہ ہے۔“
اسفند کے سیدھے بچے میں کچھ اتنی قطعیت تھی کہ شعیب منصور کو یقین کر لینا ہی پڑا۔ اور انہوں نے بہت ڈھپٹ کر بڑے

نہانگی سے اس کے پوچھا۔
”مگر میں اسکا کوئی بات نہیں تھا اسے گھر سے نکالنے کا۔ یہ گھر میرا ہے اور اس میں میری مرضی اور حکم ہی چل سکتا ہے۔ پھر

نہانگی سے اس کے پوچھا۔
”مگر میں اسکا کوئی بات نہیں تھا اسے گھر سے نکالنے کا۔ یہ گھر میرا ہے اور اس میں میری مرضی اور حکم ہی چل سکتا ہے۔ پھر

نہانگی سے اس کے پوچھا۔
”مگر میں اسکا کوئی بات نہیں تھا اسے گھر سے نکالنے کا۔ یہ گھر میرا ہے اور اس میں میری مرضی اور حکم ہی چل سکتا ہے۔ پھر

اسفند نے باپ کا ادب لحاظ بھی نہ کیا۔ اور ایک جذب کے عالم میں باپ کو اھل دجوات سے الگا کر دیا۔
 ”لیکن اگر دونوں جوان بہنوں کے بھائی بنو تو زبان کو ذرا روک کر بات کرو کیونکہ جب جوان بہنیں آگے بڑھیں تو کوہیت اعتبار سے اور سوچ کچھ کسی لڑکی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ کسی سانی اور غیر مصلحتی پر نہیں۔ کیونکہ بہنوں کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ نا۔ سمجھ کبھی کسی کے متعلق زبان سے نکلی ایک فدا پسندی کی وجہ سے گرفت ہو جاتی ہے۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور انسان ہو اور اماں جان میں نیک اور اعلیٰ ہستی کے تربیت یافتہ سلاؤں کے کچے اور پختہ و مہذب و مدبر میری نظریں مرادگی سے عاری ہوتے ہیں۔ مروت و دی ہو تا ہے جو دعوت نیاز سافقتہ سافقتہ دل سے مزاح رکھے۔ اور کسی سخت اور غلط بات کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی۔ سچے میاں عاجز اور اسے مددگار آسانی کافی نہیں کہ انسان بڑھ کچھ کر ندی کی طرح چٹھتے ہوئے اس دور میں کوئی پرویشن اپنا کر یہ کچھ دیکھے گا اور ہماری لہر کی چوٹی سر کر رہی ہے۔“

باپ کی باتوں میں وزن بھی تھا نصیحت اور صداقت بھی۔ وہ چہرہ چمکائے بڑی خاموشی اور غور سے ال کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن جب شعیب نے بات ختم کی تو اس نے چھتھی سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ اور انہوں نے جو دیکھا کوئی بات اکیدم ہی مگر نے لگی ہے تو عہدی سے بولی۔

”لیکن میں نے سوط پر کوئی بہتان تو نہیں باندھا۔ کوئی تہمت تو نہیں لگائی۔ اور کیا اس حقیقت سے آپ انکار کر سکتے ہیں کہ وہ شادی شدہ ہے؟ اور شوہر سے ناجانی کی وجہ سے گزشتہ دو برس سے میٹھ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور فائدہ داران کے میاں نے اسے اسی عرصہ سے ہمارے پاس بھیجا ہے کہ ہمارے یہاں وہ اپنے شوہر کی دسوس سے محفوظ رہ سکے گی۔ کچھ فیصلہ کر رہی ہوں میں۔“

”نہیں یہ تو حقیقت ہے لیکن اس کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے کردار پر کچھ ڈھانچا ان کہاں کی شرافت ہے۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہوتے ہیں۔ جو انسان کو اتنا۔ عاجز اور بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے حالات پر گرفت کھٹے کی ذمہ داری نہیں رکھتا۔ شعیب نے منصور نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی باپ کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”تم کہاں چلے تو ہم آلام کو دین روز بعد آئے ہو، بڑی طرح تھک رہے ہوئے؟ زینت نے بیٹے کو کھڑا ہونے دیکھ کر کہا۔“

”ہاں ہاں۔ اب تم تو آرام ہی کر لو کہ کچھ عین کی ہنسی بھاؤ۔ کہ گھر کی مضافوں کو تم نے گندگی سے پاک کر دیا ہے۔ خوب عیش کرو خوشیاں مناؤ مگر اتنا سمجھ لو کہ اگر میں اس کی تلاش میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہ گندگی۔ وہ غلاظت کا ڈھیر سوط اسی گھر میں رہے گی۔ اور اب صرف فخر و فی کی زندگی حیثیت سے ہی رہے گی۔“

شعیب منصور بیوی کی بات پر مل کر بولے اور کچھ قدم بڑھا کر ایک جھپاک سے کھانے کے کمرے سے نکل گئے۔ مگر اسفند خاموش اور بلا کوئی تاثر سے ہی کھڑا رہا۔

”لوں کیا تم نے سنی۔ یہ سب کچھ کر گویا تمہارے ڈیڑھ نے تمہیں چیلنج کیا ہے کیونکہ اگر وہ ان کو مل گئی تو ان سے کوئی عیب بھی نہیں کہ اسے یہ سب آئے ہیں۔ اپنی بات کو لوہا کر کے دکھانے کی عادت ہے تا انہیں زینت بولی۔

”لیکن نمی بالفرض محال سوط اگر انہیں مل بھی گئی تو کھڑے لانے کے سوا وہ اسے اور کہاں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ڈیڑھ نے ان کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اور پھر یہ پھیر پھینک کا نہیں بھیجیا جان کا معاملہ ہے۔ سوط ان کی بہن کی تو ہیں نا۔ کوئی گھر کی پروردہ تو نہیں۔ اور پھر بھلا اس میں بھائی جان کو پہنچ کر نے کیا بات ہے۔ بھائی جان اتنا گھر پر رہتے ہیں کب ہیں۔ اور میری سچ بھی تو مانا زونے کا۔“

”اچھا تو چھوڑو اس مضمون کو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو اپنے بھائی جان کو آرام کرنے دو مضمون۔ راتوں سے سوئے چھٹی ہیں باسمل جاگتے ہی رہے ہیں؟ اصل میں زینت بیٹے کی خاموشی سے اندہ ہی اندہ بے حد تنگی ہیں۔ انہوں نے نازکی باتوں پر بھی دھیان نہیں دیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ انہوں نے بڑے دلدارے سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب انہیں کیا معلوم تھا کہ بیٹے کے دماغ میں خیالات کی کچھ ایسی کچھڑی پک رہی ہے جس کی کھنڈ بھند ان کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی۔

اسے سن رہے ہو بابا۔ جا کر آرام کریں نہیں کرتے مگر ہسپتال سے کوئی ایمر ہنسی کھل آگئی تو پھر اتنا موقع بھی نہیں دیا۔ انہوں نے اٹھ کر اس کا بازو ہلکا کر لیا۔ تب وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

”ماں! آرام کریں نہیں کرتے کیا پھر کوئی ڈیوٹی پر جاتا ہے؟ ماں نے کہا تو وہ۔ اچھا اچھا۔“ ہاں ہاں کہتا ہوا کھانے کا دارم کھانے اور بیٹوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

”بے سے نکل گیا۔ اور بیٹوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔
 ”وہ اپنے کمرے میں آیا تو کچھ دیر تک کمرے کے وسط میں ہی کب کر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر کچھ سوچ کر۔ فون کی دھماکہ کوئی نہ ڈال گیا۔ اور کھڑی دیر بعد وہ کسی فائینا اشاریوں میں اپنے لیے کمرہ ریزر کر رہا تھا۔ اس کام سے دن بھر اس نے اپنے سوٹ کیس میں چند جوڑے ڈالے اور پھر کریم کھلا کر وہ سوٹ کیس اس کو بھرتا ہوا دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے سوٹ کیس سے کیم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔
 ”ماں! وہ لاک کرتے ہوئے کریم سے کہا۔

جن بان جی ہاں۔ ابھی تو تیرے سہ سے دودھ کی ٹوبھی نہیں گھٹی۔ ابھی تو تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ یہ کہنا میری آپ شاید۔ تو یہ تو بے۔ اپنی ایک بات کیا بتا دی کہ آپ حسب عادت نکل اور شکون لینے بیٹھ گئیں۔ آپ سے کو کچھ کہنا نہ تھا۔

اس نے سلی کی گئی فستوں سے گھر کر ان کی بات قطع کر کے کہا۔
 "جانتی تھی کہ بات بھی ہے۔ اسے گھسے اس قدر غیر متوقع دیکھ کر میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس کے جلے کٹے انداز اور باتوں پر کتنی تعجب ہو کر بولیں۔"

"اب بات۔"
 وہ ایک طویل سی جانی لے کر بولا۔ تو سلی نے بیکر نے عینک سمیت غور سے اس کی طرف دیکھا۔
 "اے کیوں کیا کر اچھی سے ملتان تک پیدل سفر کیا تم نے جو فٹکی بھی محسوس ہو رہی ہے اور نیند بھی آرہی ہے۔ یہ کہو کہ میں بات کو انا چاہ رہے ہو۔ ہاں یہ بتاؤ کہ یہ ایسا ایک اطلاع دیے بغیر کیسے آگئے تم۔ اور کس لیے آئے ہو۔ بے۔"
 "کس لیے آیا جاتا ہے اماں جان۔ ملنے ملانے کی عرض ہی سے ہونا۔ اب مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں آنے کے لیے پاسپورٹ بڑا اور اعزاز نامہ حاصل کرنا بھی ضروری ہو گا۔ ورنہ نہ حاصل کر کے ہی آتا۔ بہر حال اب تو ابھی کیا ہوں۔ وہ قدرے مضطرب ہو کر

بولا۔
 "اے بھلا۔ میں چراؤ گے۔ بڑے طوطوں کو۔ میں سب سمجھتی ہوں تیری۔"
 "مما وہ غلط ہو گیا ہے اماں جان۔ ورنہ طوطے نہیں ڈھونڈ کر لے جاتے ہیں۔ تعجب ہے آپ تو زبان دان ہیں پھر بھی؟ اس نے سلی کی بات پھر قطع کی۔ تو وہ بھی اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے بولیں۔

"ارے بس۔ اب مجھے باتوں میں نہ ڈراؤ۔ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جو تو مجھ سے جیسا ناچا رہا ہے۔"
 سلی بیکر جو اس کے رنگ و ریشہ سے واقف تھیں کچھ ہی تھیں کہ وہ جان کر نال ٹول کر رہا ہے۔
 "نکال ہے اماں جان میں اور جلد آپ سے کچھ چھپاؤں گا۔ بس ایک ہی معمول سے زندگی گزارتے گزارتے تنگ آ گیا تھا اور آپ سے ملنے کو بھلا چاہ رہا تھا اس لیے چلا آیا۔ اچھا بہت بڑی دیر کے لیے تو مجھے ہلک جھپکنے کی اجازت دے دیں۔ یقین جانیں گا کہ میں نہیں سو سکا ہوں۔ وہ ہلک پر یو بی آٹا لیتے لیتے تھکے لیجے میں بولا۔
 "اچھا چلو سو جاؤ۔ مگر یہ کونسا طریقہ ہے سونے کا پہلے اپنا یہ بوٹ اتارو۔ اور پیراٹھا کر یہاں سر ہانے نکلیے کہہ کر آرام سے سو جاؤ۔"

سلی بیکر جو سر ہانے کی طرف بھیجی تھیں۔ اسے آرام سے لٹانے کے خیال سے اٹھتی ہوئی بولیں۔
 "اگر اماں جان۔ آپ کے کہنے کے بموجب اگر پیراٹھا کر لیتا تو کیا مجھ پر نہیں گونگا؟ اس نے مسکین سی صورت بنا کر پوچھا۔
 "نہیں گونگا۔ تم اپنی روک کر بولیں۔"

"اے یہ بڑا ڈنڈا کی بات پکڑنے کی عادت کب سے ہوئی تم کو۔ میں تو آرام سے پیراٹھا کر سونے کو کہہ رہی تھی۔ اور اگر نہ ہاؤ تو کم از کم نہ ہاؤ مجھ پر دھولو۔ ورنہ کیا یو بی دھول میں اٹے اٹے سونے کا ارادہ ہے؟"
 "نہیں اس وقت تو یو بی ٹھیک ہے اماں جان۔ یوں بھی کوئی ابھی مینہ تو نہیں سوتا۔ بس آدھ پون گھنٹے ہی سوؤں گا۔
 "نکال ہو نہ ہاؤ کی سارا جسم ہی دھو لوں گا۔"

اس نے جوتے تو نہیں اتارے البتہ ٹیکے سر ہانے کی طرف رکھ کر جوتے ہاتھ سے سونے لگا لگا کر لٹیتے ہوئے کہا۔
 "میں ہے۔ یہ تو کسی زبان بولنے کا ہے۔ تیرے دشمن ابدی میند سوئیں میرا تو دل بولا کہ رکھ دیا تو نے۔ بولیں۔
 "نہاں نہ کہہ کر ہر کلام آدمی کی زبان دوزخ کا کندہ ہوتی ہے۔ یوں تو بڑا کہنا ہے کہ تیرے دل میں اللہ کا بڑا خوف ہے۔"

سلی بیکر اس کی باتوں پر سچ بول کر بولیں۔

"ارے باجی جان ڈرا باہر آ کر تو دیکھیے کون آیا ہے۔ سلی بیکر کے چھوٹے بھائی کی بیوی۔ حال تو بیکر نے انہیں کلا کر لے کر سلی بیکر جو اپنے کمرے میں لوٹ کر پلنگ پر بیٹھی نظر کا چشمہ لگائے اپنے کرتے کا دامن ترپ رہی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ دے بغیر پلنگ پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔
 "اے ایسا کون آیا ہے میں نے آؤ اسے جس کے لیے ملی تڑپ رہا ہے اس کا تو کوئی خط آیا ہے نہ خبر خبری معلوم ہوئی ہے۔ اب میری بلا سے جو بھی آئے۔ بے۔"

گو آخری دونوں فقرے۔ انہوں نے قدرے نیچا آواز میں کہے تھے لیکن اند آتے ہوئے اس قدر سے لیے تھے۔ وہ دے پاؤں چلتا ہوا ان کے پیلوں میں کھڑا ہو کر بولا۔

"خط اور خبر خبر کے بدلے آپ کا یہ ٹکڑا مارا خود ہی حاضر ہو گیا ہے اماں جان۔"
 اور اس کی آواز سن کر وہ بیٹھ نکلی۔

"ہائیں تم گھنے۔ اسے کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ اسے تم کیسے آگئے تھے؟"
 "جی ہنسی جواب نہیں بلکہ آپ جاگتی آنکھوں سے میرا حقیق وجود دیکھ رہی ہیں بھئی، اسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ۔ وہ ان کے آخری فقرے کا جواب گول کر کے دھم سے ان کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔
 "و علیکم السلام۔ خوش رہو، شاد و آباد رہو، ہزار ہی عمر ہو تمہاری۔"

"ارے۔ کیا قیامت کے بودیے سمٹوانے کا ارادہ ہے جو تجھے ہزاری عمر کی دعا دے رہی ہیں جبکہ یہاں یہ عالم ہے۔ اٹھائیس آٹیس ہی گزارنے دوجہرگ رہے ہیں۔ وہ دھم سے ان کا بیکہ پلنگ کی پی پر رکھ کر ان کے آگے آٹا بچا ہوا لیتا ہوا بولا۔
 "دیکھو دشمن دود پارت نہیں ایسی کیا پریشانی لاحق ہے۔ مجھ جھڑاٹھ دن کی تو بیدار نش ہو۔ پڑھ کھڑا اگر قابل ہو گئے ہوتے تو اتنے ہی تپتی تمہاری عمر ہے۔ اسے میری گود میں تو آج بھی تیرا بچول سا وزن بھکتا محسوس ہوتا ہے۔"

”اچھا اچھا۔ دیری سوری اسفند میاں، مگر اب میری امان جان کو اتنی ہدایت کر دیجیے کہ یہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے کھانا بند کر دے۔“

اس نے جس طرح ہاتھ اٹھا کر اللہ میاں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سلیٹی بگم کو اپنی ہنسی روک کر مشکل ہو گئی۔“
”اے تو میں نے کب منع کیا ہے۔ جتنی دیر چاہو سولو۔ اتنے میں تہلے لے لیے کھانا تیار کر اتی ہوں۔“
سلیٹی بگم نے ہنگامے سے ہاتھ کی گھڑکی کا پردہ پھیلے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا؟ آج شکر علیؑ نہیں پکا جو میرے لیے آپ کھانا تیار کرانے جا رہی ہیں۔“ اس نے ہند آنگھوں کو کھول کر پوچھا۔
”اے بکا کیوں نہیں۔ مگر آج خشک دھارے چاول، اور ٹنگے کا لانتہ ہی بنایا ہے وہیں نے۔ اصل میں تو کڑو کوئی ہے۔“
”نہیں۔ اب زیادہ جھکندن نہیں کرتیں وہ کھانے پکانے میں اور میرے دم ہی کہتے ہیں۔ فخر سمیت کل چھ سالہ مالوہ پڑا ایک بیٹی دے دیتا تو کم از کم وہ ان کا ہاتھ تو تیار کر دیتی۔“

”اے انوہ امان جان ان وصاحتوں کی کیا ضرورت ہے سلا کیا میں کوئی غیر ہوں۔ اپنے ماموں کے یہاں آیا ہوں۔ جو کچھ وال دلیا انہوں نے پکھوایا ہو گا اس میں، میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔“
وہ سلیٹی بگم کی ہیکس میں ڈوبی ہوئی گفتگو پر چہرہ کر لولا۔

”اے دال دلیا کیسا خدا کے فضل سے برکت کھیں موجود ہے۔ تو کہو کہ مالوہ بگم پکانے والے کی کھانہ کسے کبھی کبھی جی چاہتی ہیں اور اب وہ تم کو صرف خشکے پر تو نہیں ترخانیں گی۔“ سلیٹی بگم بولیں۔

”اچھا اگر یہ بات ہے تو اڈ کی وہی دال جو میں بہت شوق سے کھاتا ہوں بکوا دیجیے مگر اس کے ساتھ آم کا چارہ بھی بنا چاہیے اصل میں ہمارے یہاں تو ایسی چیزوں سے بہت الرجک رہتے ہیں نا، اس لیے عرصہ ہو گیا کھائے، ہونے۔ وہ ہر کھانے بند کر کے لولا۔“

”اچھا۔ وہ بھی تیار کروں گی۔ مالوہ دھن کے یہاں تو ماشاء اللہ سات قسم کے چارہ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ بڑی بڑی بھجیاں میری بھانجی اور ہاں کیا تم اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں لائے۔“

”لایا کیوں نہیں۔ مگر صرف ایک سوٹ کیس لایا ہوں جو آتے ہی عانی جان کو تھکا دیتا تھا۔“
اس نے آنکھیں بند کیے کیے غصہ کو ڈھکے کے عالم میں کہا اور پھر کڑوٹ لے لی اور سلیٹی بگم بھی خاموشی سے کمرے سے باہر نکلیں۔

”لو دیکھا دھن ایک تو آیا ہی ہے تو یوں جیسے میری سات پشت پر احسان کر رہا ہو۔ دوسرے نہ معلوم کون سے ہل بوت کر آیا ہے جو تہی سو بھی گیا۔ اور یہ کہہ کر سویا کر اڈ کی چرری دال اندر آسم کے اچار کے سوا کچھ نہیں کھائے گا۔ لو بٹنا سو سے اس کے لیے حال بھی تیار کرو۔“

کمرے سے باہر نکلا کہ سلیٹی بگم نے اپنی بھانجی مالوہ بگم سے کہا۔

”تو دال تیار کرنے میں کون سے ہاتھ کھوٹے گئے ہیں باجی جان۔ زیادہ سے زیادہ آدھ پون گھنٹے میں تیار ہو جانا کہ اچھا اگر کامرتیاں تو منہ ان منہ پھرا رکھا ہے۔ لیکن بھلا کون کی کھانا بھگا۔ اتنے دنوں بعد تو اسفند یہاں آئے ہیں۔ شاید کپا پسا جو بھانجی فوج میں رکھا ہے میں چلی جاتی تھیں کباب میں تل دوں گی اور ایک آدھ چیز اور۔“

”نہیں۔ تکلف سے لے لینے کی ضرورت نہیں اس نے جس چیز کی فرمائش کی ہے وہی کھائے گا۔ ہاں اگر ذرا مقدار میں دودھ ہو تو تھوڑی سی کھیر پکا لینا۔ مگر ذرا جلدی کرنا۔ دوپہر کا کھانا وہ ساڑھے بارہ بجے کھاتا ہے۔“ سلیٹی بگم نے عار کے ساتھ لٹ لٹ کر کہا۔

”خیر آپ اس کی تو فکر نہ کریں۔ ابھی صرت گیلہ ہی بجے ہیں ایک گھنٹے کے اندر اندر دونوں چیزیں تیار کروں گی۔ حال بگم خوش دلی سے بولیں۔

”اندکھن لارہ کرنے لگیں تو سلیٹی بگم نے پوچھا۔
”مگر اڈ کی دال کس طریقے سے پکاؤں گی۔“

”اسی طریقے سے جیسے مونگ کی پھر دیری دال پکتی ہے۔“ مالوہ بگم نے جاتے جاتے کہا۔

”نہیں۔ جو دال اسے پسند ہے وہ دوسرے طریقے سے پکتی ہے۔ تم ایسا کرنا کہ ایک پاؤ دال پانی میں بھگو دو اور پھر پختہ ہو۔“
”نہیں۔ جو دال جب نرم پڑ جائے تو اسے دھو کر اس میں اتنا پانی ڈالنا کہ دال سے ایک پورا اونچا ہو۔ سات گھرے پختہ ہو اور دال کے برابر اور کباب کا کڑا کر اس میں ڈال دینا اور ہاں نو ثابت سرخ مرچیں بھی۔ جب دال کا پانی خشک ہو جائے اور دھواں اٹھ جائے تو اسے زبردستی اور زیادہ سے گھار دینا۔ اور اس پر پودینے کی پتیان کتر کر اور تھوڑی سی پس بونی بڑھانے اور دھواں اٹھ جائے تو اسے زبردستی اور زیادہ سے گھار دینا۔“ سلیٹی بگم نے اڈ کی دال پکانے کی ترکیب بتا کر پوچھا۔

”بڑھ چڑھ دینا۔ تھوڑی سی سوٹھ تو کھیں موجود ہے۔ خیر میں پس کر ڈال دوں گی۔“ مالوہ بگم بولیں۔
”نہیں پس بونی تو نہیں البتہ ثابت سوٹھ ضرور موجود ہے۔ خیر میں پس کر ڈال دوں گی۔“ مالوہ بگم بولیں۔
”اے نہیں رہنے دو اب کہاں سوٹھ پیسوں گی۔ یوں ہی بیٹھے بھلائے خواہ خواہ کی کلکھیر پڑ گئی تھارے سر سلیٹی بگم نے کہا۔“

”اے نہیں نہیں باجی جان۔ آپ کا نسخا کیا ہمارے لیے غیر ہے۔ اور اللہ اسے خوش رکھے ملتا ہی اسی طرح ہے۔“
”اے ہم اس کے اپنے گئے ہوں۔ غرور تو نام کو بھی نہیں اس کے اندر آتے ہی پیسے انہیں پوچھا پھر تھوڑے پون کو۔ اور خفاک ہو کر آئے۔“

”اے ہم اس کے اپنے گئے ہوں۔ غرور تو نام کو بھی نہیں اس کے اندر آتے ہی پیسے انہیں پوچھا پھر تھوڑے پون کو۔ اور خفاک ہو کر آئے۔“
”ہاں اللہ اسے غرور سے بڑی عسکر المزاج اور خفاک بچے ہے۔ اے ہاں وہ اس کا سوٹ کیس کہاں ہے۔ کیا لایا ہی مالوہ یا تو بیٹی تھی۔“

”نہیں نہیں سوٹ کیس تو لانے ہیں اسفند میاں میں نے اسے اسفند کے کمرے میں رکھوا دیا ہے۔ لیٹر وغیرہ بھی ابھی بنا لگا دلی کی۔ آپ کا کہہ تو چھڑا ہے اب اس میں بھلا وہ کہاں رہ سکیں گے۔ میں نے سوچا۔ جب تک وہ یہاں رہیں گے اس وقت تک اسفند جیک والے کمرے میں سو جایا کرے گا۔“ مالوہ بگم نے کہا۔

”نہیں کہہ اسفند کو لے شکاٹے نہ کرو۔ سانس کا اسٹوٹ ہے۔ جب چارہ اس کی پڑ معانی میں بھی غل پڑے گا۔ تم تو ایک چنگ برے کے بیٹا لو اور۔ وہ میرے ساتھ ہی رہ لے گا۔ اور یہ کسے معلوم کہ وہ یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے آیا ہی ہے یا نہیں۔ جس طرح اچانک ہی آیا ہے اس سے تو معلوم ہو تا ہے کہ کسی ضروری کام سے ہی یہاں ملتا آیا ہے۔“ سلیٹی بگم بولیں۔

”اچھا تو کیا آپ نے پوچھا نہیں اسفند میاں سے۔“ مالوہ بگم نے پوچھا۔
”نہیں غوریت یہ کہاں آئی۔ آتے ہی تو پکڑ کر سو گیا اب آٹھے کا تو پوچھوں گی۔“ سلیٹی بگم نے بتایا۔
”تو مالوہ بگم خاموشی ہو کر اس کے لیے دال بنانے میں چلی گئیں اور سلیٹی بگم اسفند کی سینڈ میں غل پڑ جانے کے ڈر سے اندر کے ہیں نہیں نہیں بلکہ وہی اندرونی برآمدے میں بچے تخت پر بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچنے لگیں۔“

”اچھا تو اس نے غور نہیں کیا تھا۔ دوسرے اس کے چہرے پر احتمال مل سکتا تھا۔ اور تجسیر ان کے بہت سے سوالوں کا جواب دے گا۔“
”نہیں۔ اگر کیا تھا۔ اس پر مستزاد آتے ہی ممکن اور غنڈہ کرٹ لگانا۔ گویا ان کے خیال میں دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ گوہ بہت ضرور جمعیت کی مالک تھیں پھر بھی چونکہ یہ معاملہ ان کے تحت ہو گا تھا اس لیے کافی تجسس ہی نظر آ رہی تھیں۔“
”تو زبردستی آپ ہی آپ معاملے کی تہہ نہ کھینچنے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر بھاؤ کے پاس چلی گئیں۔“

”تم لکھا لکھا کر دلی۔“ لائو میں بھی تھارے تھوڑا بہت ہاتھ تیار دوں۔ انہوں نے بھانجی سے کہا۔
”تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے بولیں۔“

”لام کہ لکھا ہے جو آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ آپ تو جاکر آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھیے باجی جان۔ میں ساری چیزیں آپ کی مرضی کے مطابق ہی پکاؤں گی۔ اتنا اطمینان رکھیے۔“
”اے تو شرمندہ تو تم مجھے کر رہی ہو۔ ورنہ میرا مقصد تو نہ تھا۔ میں تو ذرا دوستی لاکھ تھارے سر پڑ جانے کی وجہ سے لکھا ہی تھا۔“ سلیٹی بگم خفیت ہی ہو کر بولیں۔

”تم لکھا لکھا کر دلی۔“ لائو میں بھی تھارے تھوڑا بہت ہاتھ تیار دوں۔ انہوں نے بھانجی سے کہا۔
”تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے بولیں۔“

”لام کہ لکھا ہے جو آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ آپ تو جاکر آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھیے باجی جان۔ میں ساری چیزیں آپ کی مرضی کے مطابق ہی پکاؤں گی۔ اتنا اطمینان رکھیے۔“
”اے تو شرمندہ تو تم مجھے کر رہی ہو۔ ورنہ میرا مقصد تو نہ تھا۔ میں تو ذرا دوستی لاکھ تھارے سر پڑ جانے کی وجہ سے لکھا ہی تھا۔“ سلیٹی بگم خفیت ہی ہو کر بولیں۔

”تم لکھا لکھا کر دلی۔“ لائو میں بھی تھارے تھوڑا بہت ہاتھ تیار دوں۔ انہوں نے بھانجی سے کہا۔
”تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے بولیں۔“

”میں نے زبردستی کلام کیا ہے تو میری خوش نسیبی ہے کہ آج آپ نے سنا کوئی کام تو مجھے کرنے کو دیا ہے سب پر ہرگز سے تو ایسا کوئی خیال ہی نہ لائے۔ صالحہ بیگم، جو انکسار سے کام لیتی ہوئی ہو، کوئی بات نہ کہیں۔“

”ہاں ہاں خدا تمہیں خوش رکھے لو! وہ سہاگن ہو، تم جتنا میرا خیال رکھتی ہو اتنا تو اگر میری کوئی بیٹی بھی ہو تو یہ نہ رکھتی۔ سہلی بیگم ان کی باتوں پر خوش ہو کر کہیں۔“

”مجھے وہ عاصم دیتی ہیں تو ہمیشہ اپنے بھائی کو۔“ صالحہ بیگم ہنس کر کہیں۔

پھر آواز اٹھائی۔ اور سہلی بیکم اس وقت ابھی کی اتنی محبت، محنت اور جانفشانی کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ وہ جیسے سے باہر کمرچی اپنے کمرے میں نہیں گئی تھیں۔ لیکن آخر کب تک رجاتیں۔ انہیں اس وقت اسفند کا سونا بہت نکل رہا تھا۔ اتنے دنوں بعد آیا تو پرکھو کو یہ کیا یاد۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کھلا۔ یہاں ابھی تک اس سے بات کہنے نہ مل رہی ہے۔ کیسا بے پروا اور بے عرض پڑے۔ لوبھیلہ یہ تک پوچھنے کا موقع نہیں دیا کہ سب کیسے ہیں۔ کوئی زخم ہے یا نہ۔ کچھ کا کیا حال ہے۔ اور۔ اور وہ کچی سلووا۔ اس کی کمی ہی گزر بسر ہو رہی ہے۔ بس اب بہت پیڑ اور اس کے بچے کا کیا حال ہے۔ اور اس شرارت کے ہڈے کو۔ وہ یہی سب سوچتے سوچتے آپ ہی آپ کرے برساتنا ملا۔ ابھی جا کر بگڑ چکی ہیں اس شرارت کے ہڈے کو۔ وہ یہی سب سوچتے سوچتے آپ ہی آپ کرے برساتنا ملا۔ ابھی جا کر بگڑ چکی ہیں اس شرارت کے ہڈے کو۔ وہ یہی سب سوچتے سوچتے آپ ہی آپ کرے

مہاجر کیا ہے۔ پچھتو تو مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیا کرتا تھا کیا اب میں اس قابل نہیں رہی ہوں؟۔۔۔ اس کے کوئی مول جواب برسرِ کرولیں۔

”ارے نہیں اماں جان، صرف ایک ہی تو راز دار اور دوسرا ہے میرا۔ میری اماں جان! پچھتاہلی کے بعد تو نے اپنی دل کا سارا غبار نہیں تو نکالنے آیا ہوں۔ بتا دوں گا سب مگر آہستہ آہستہ۔ وہ جو لا کر بیٹھ گیا تھا، اس نے سہمی بیکم کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ اور سہمی بیکم بھی اٹھیں۔

”اے تو پھر اتنی حقیقتیں کیوں کی۔ پہلے ہی کہہ دیا ہوتا کہ بعد میں پوچھ لینا۔ خیر میں متباہار سوٹ کس میں مگلا دوں۔ معاملہ کرے میں ایک پلنگ اور والے کو کمرہ دیا ہے۔ دیکھ لیں کا ارا وہ تو تمہیں ارشد کے کمرے میں ٹھہرا کر رکھتا ہے۔ مگر میں نے کہا۔ اسے دن بعد تو میرا کچھ آیا ہے میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں گی۔ سہمی بیکم آپ ہی بولتی رہیں اور جھٹکا کھاتے سے نیک لگاتے بیچنا معلوم کیا سوچتا رہا۔

”اے ہاں۔ تم نے تو اتنے ہی سونے کی ایسی راغنی لاپی کہیں تو یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ گھر میں سب کیسے ہیں۔ نانا اور اس بچے کا کیا حال ہے۔ سنا تھا۔ اس کا کس بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ نئی زندگی ملی ہے اسے۔“

”جی ہاں۔ واقعی نانا کو نئی زندگی ملی ہے۔ ورنہ میں تو بالکل مایوس ہی ہو گیا تھا اس کی طرف سے۔ خدا کا شکر ہے نانا گئی اور اب ماں بیٹے دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور آج کل ہمارے یہاں ہی ہیں۔ باقی اور بھی سب خیریت سے ہیں۔ اس نے کچھ اس انداز میں بتایا جیسے محض ان کے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور ہو گیا ہو۔

”اچھا۔ اور تمہارا کیا حال ہے۔ تم تو ہسپتال میں ملازم ہو گیا چھٹی لے کر آئے ہو یا کوئی سروے کرنے کی عرض سے اور صکارخ کر لیا ہے۔ سہمی بیکم نے پوچھا۔

”جواب میرا ایک کمرہ حال و سہمی ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں۔ جواب میرا دو۔ ہسپتال کی ملازمت سے سہمی دے کر آیا ہوں۔ اور ان دونوں جہاؤں کے بعد جواب میں تین کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس نے کچھ میرا رکن سے انداز میں کہا۔

”اے ہے یہ ہسپتال کی سرور کیوں چھوڑ دی تم نے ننھے۔ مانا کہ خیر سے صاحب جان پیدا ہو۔ بہت کافی نیک بلیں بھی رکھتے ہو۔ پھر بھی بیٹا۔ یہ روپہ پیر تو ہاتھ لگی کی طرح ہوتا ہے جو دھلتے ہی صاف ہوتا ہے اور پیرہ جو کتنے ہی کپڑے بیٹے تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ تو اس لیے تو کہتے ہیں۔ پیرہ پانی کی طرح بہر تو نمٹوں میں جاتا ہے مگر آتا ہے جو کمرہ سے ہے۔ میرا مطلب ہے ملازمت کرتے بہتے تو قلع جگڑی میں، اضافہ ہی ہوتا رہتا۔“

سہمی بیکم نے اس کے ملازمت چھوڑ دینے پر ایک لیکچر سادے ٹوالا۔

”لیکن اماں جان، میں نے ہمیشہ کیلئے تو نہیں چھوڑی ملازمت، پھر عرصے بعد پھر کہیں دھونڈوں گا۔“ وہ الکی انصاف سی گفتگو پر قدرے چوڑ کر بولا۔

”اے ملازمت میں کیا لکھا ہے بیٹا! حق تو اپنا ذاتی کلیک کھو لو۔ سوچے پیسے کی بھی متباہارے پاس کوئی کمی نہیں ہیں۔ تم ماشا اللہ ہونا ڈاکٹر ہو۔ اتنی ساری ڈگریاں تمہارے پاس ہیں۔ چند ہی دنوں میں ہن۔ رستے لگے گا ہن۔“ سہمی بیکم نے مشورہ دیا۔

”جی ہاں، خیال تو میرا ابھی شروع سے یہی ہے لیکن فی الحال میں کسی بات میں بھی خود کو پابند کرنا نہیں چاہتا۔ اماں جان! اصل میں میں آزاد منشا آدمی ہوں۔ ایک جگہ نہ بیٹھ سکتا ہوں نہ کسی کام کا پوچھ لینے اور ڈالنے کا تحمل سوسکتا ہوں۔ میں اپنی ہی فطرت کے بموجب کراچی سے میرا دل اچھا ہو گیا تھا۔ اس لیے ملازمت پر بھی لات مار کر چلا آیا۔“

اسفند نے اتنی دیر میں پہلی بار اپنے بارے میں بہت ٹھنکی کرتا یا۔

”اچھا تو کیا یہاں مکان میں متباہرے مطلب کی کوئی ملازمت تمہیں مل جائے گی؟“ سہمی بیکم نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں یہاں مستقل انقامت کی عرض سے تو نہیں آیا۔ صرف تین چار روز قیام کی عرض سے آیا ہوں۔ وہ بھی صرف آپ سے ملنے۔ اس کے بعد آگے نکل جائوں گا۔ اور جہاں میرے مطلب کی ملازمت ملے گی وہ کروں گا۔“ اس نے بتا یا وہ

یہ صرف جاندار قیام کا سر کر بندہ ہی ہو گئی۔ مگر اہوں نے کچھ کہا نہیں۔ بلکہ موضوع ہی پلٹ دیا۔

”اور تمہارے چھوٹے اکا کیسے ہیں۔ بے چاری چھوٹی دلہن ہی مجھے خط کے ذریعے سب کی خبریں تک مطلع کرتی ہیں۔“ اور عرصے سے ان کا بھی کوئی خط نہیں آیا۔

”جی ہاں، اصل میں چھوٹے اکا نے حال ہی میں داد میں کچھ اضافی خریدی ہے۔ بس آج کل اسی وہ لوگ بھی بالکل خیریت سے ہیں۔“

”دیکھ ڈیکھ یہ تو آپ کی خط و کتابت رہتی ہے نا۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

— نہ تھا۔ میں بھی اس سے انکلا کر ہی رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راتوں رات چپکے سے گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔
اسفند یہ سب کہتے کہتے آپ ہی آپ سسک سسکا پڑا۔ اور سلی بیگم نے چپ سا دھڑکی جیسے اب بھی انہیں اس کی بات
یقین نہ کیا ہو۔ ان کی اس خاموشی پر وہ چور چور لولا۔

آپ سوچ رہی ہوں گی کہ اگر وہ شادی شدہ بھی تھی اور اس نے اس بات کو سچ سے چھپایا بھی تھا۔ تو اس کی ماں کا ہنسنا
بگڑنے اور مارنے کی کیا بات تھی تو ساتھ آپ کو بھی بتانا چلوں کہ موضوع فقیر سے محبت کا مکمل ریکارڈ ہوتا ہے
میں اور میں ان کے جھانسنے میں ایسا کیا تھا کہ سچ بچاؤں خانے چیت ہو گیا تھا۔ وہ تو کلا مکس تک پہنچنے سے پہلے
ہی اس نالک کا ڈراپ میں ہو گیا جو انہوں نے مصیبت اور شرافت کا مادہ اور شکر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ
میں نہیں۔ وہ ایسی بے گدار لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ تمہاری ہر بات کا یقین کر سکتی ہوں مگر اس بات سے بڑی
متفق نہیں ہو سکتی۔ سلی بیگم اس کی بات کاٹ کر ڈراؤنڈ لے لیں۔

”نہیں اماں جان۔ اس نے جو شرافت اور مصیبت کا ڈھونگ رکھا تھا۔ آپ بھی اس سے دھوکا کھائی گئی ہیں۔
ورنہ میں خود بگڑی رہتا ہوں کسی ہوشیار کا قہقہہ تو بیان نہیں کر رہا۔ واقعی وہ بہت مکار اور بھالاک لڑکی تھی۔ جی تو ہڈ
کھل جانے پر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور ادھر وہ ہمارے ٹوڈی صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسا کلمہ پڑے جارہا ہے
ہیں۔ اور اسے ہی تلاش کرنے پڑ رہے ہیں۔“

”ہاں تو وہ بھی جہانزیہ انسان ہیں۔ اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ کس تماش کی لڑکی ہے اور میں نے بھی ایک دنیا دیکھ
رکھی ہے۔ لاکھوں نے یہی ہزاروں لوکیں میری نظر سے گزری ہیں۔ میں نے انہیں پڑھا یا بھی ہے اور آدمیا بھی۔ میں اب
بھی تم سے بھی کہتی ہوں کہ وہ ایسی لڑکی نہیں جیسا تم اسے سمجھ رہے ہو۔ دیکھو میری نظروں سے کوئی بات بھی نہیں بچتی جو
دنوں میں وہاں تھی۔ تو اس کی ذات میں متباری بڑھتی ہوئی دلچسپی میری نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ تم اس سے بات کرنے
کے بہانے دھونڈا کرتے تھے۔ محض اس سے باتیں کرنے کی غرض سے بلا مقصد میرے کمرے میں آجاتا کرتے تھے اور
تمہیں دیکھ کر اس کے جہرے سے جو شرافت ہو رہی ہوتی تھی ان سے خوف اور گراؤ کا ریکارڈ اٹھاتا تھا۔ اس روز سہیل
منصور کے یہاں دعوت میں بھی متبار سے اسے سختی کے مظاہرے سے وہ خوف کے مارے نہ ڈھال ہی ہوئی تھی۔ اگر
ایسی دلچسپی ہوئی تو اس کے یہاں سے خوش ہوتی آرائی اور تہیں رجحانی بھاتی اور اگر دیکھا تو بھی تھی تو تمہیں اس کے بارے میں
اتنی غلط رائے قائم کرنی نہیں چاہیے تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ وہ کن مجبوریوں میں گری ہوئی تھی۔ اور اس پر کیا پڑی تھی۔
ہو گیا کہ پھر پڑے تمہارے پر اسے سنی تھی۔“

سلی بیگم کو اس کی الزام تراشی پر تازہ آگیا تو انہوں نے اچھی طرح اسے جھٹکا ڈالا۔ مگر چونکہ معاملہ بھی تازہ تھا اور
اسفند باپ کی ناکامی کا غم و غصہ سوا رہا تھا۔ اس لیے اتنی بڑی تقریر نہ جھڑکنے کی بھی وہ قائل نہیں ہوا۔ ان کے پاس سے لٹھا
ہوا بولا۔

”خیر، اگر میرے ساتھ یہ سب نہ ہو گزرتا تو شاید میں آپ کے ان ٹھوس دلائل پر ایمان لے آتا۔ بول ہی سنا لی کا قائل
ہوں نہ کی سنا لی پر یقین رکھتا ہوں۔ اور اگر سچ ہو تو میں نے ہی اسے گھر سے چلے جانے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے
اسے گھر سے نکالا ہے۔ اور یہ بات میں دینی کو بتا چکا ہوں۔ اس لیے اب مزید اس موضوع پر کوئی گفتگو نہ ہونی چاہیے۔
سلی بیگم سمجھ گئی تھیں کہ چونکہ اس کے جذبات عشق کے بڑی سخت جھوٹ کھائی تھے اس لیے وہ اس قدر آپ سے باہر ہو
رہا ہے تو پھر نہ کچھ سمجھا نا بے سود ہی ہوگا۔ لہذا خاموش رہنا ہی بہتر ہے کیوں بھی اگر عقل سے کام لے تو جتنا کچھ سمجھا
ہے وہی بہت ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

”ماں چھڑو۔ بلکہ دل انداز بائوں کو بھول ہی جاؤ اور آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ میں متبار سے لے لے بھی کھانا لاتی ہوں۔
مگر اس نے کہا۔

”نہیں۔ میں سب کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ ماموں جان تو آگے ہوں گے نا؟“
”میں وہ تو شام کو آؤں گے۔ البتہ ارشد وغیرہ ضرور آئیں گے ہوں گے۔ اچھا آؤ چلو سب کے ساتھ ہی کھاؤ سلی بیگم بولیں۔
اور پھر ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔

نہ کے بعد وہ دینک بیٹھا مانی اور ارشد وغیرہ سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر ارشد کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا جہاں
نہ کے پاس رہی تھا۔ جسے کھول کر اس نے ایک فائل نکالی۔ اور پھر فائل کے مطالعے میں کچھ وقت اور گزارا۔ اصل میں تو وہ
بوسٹ میں رہی تھا۔ اور نا احمادہ گفتگو سے بچنا چاہ رہا تھا اس لیے بلا مقصد ہی فائل کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا۔
اسی طرح ہی کچھ تھیں کہ وہ اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے اس لیے چپ چاپ اپنے بستر پر پڑ کر سو گئی تھیں۔
نہ کے پاس تو کچھ دنوں بعد صبح صبح کے کمرے پہنچے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ وہ بیچاری دل ہی دل میں
نہ کے لیے چھتائی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

نہ کے پاس چلے گئے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔
اے یہ کہاں چلے تم غصے۔ تم تو کبہ رہے تھے کہ دو تین روز آپ کے پاس ٹھہروں گا مگر تم تو ایک روز بھی نہیں ٹھہرے۔

بھی بیمار اور اپنے جھلسوں میں اٹھایا ہوا۔

اپنی بات کہتے کہتے ان کا گلہ نہ کر گیا تھا اور انھیں بھی ڈبڈبائی تھیں۔

”اچھا اچھا اماں جان میں جلد آنے کا وعدہ تو نہیں کرتا۔ البتہ آپ کو اتنا یقین ضرور لائے دیتا ہوں کہ میں نہ تو اپنی وہ سلی سلیک کی باتوں سے متاثر ہو کر بولوں گا اور پھر کاغذ میں لپٹے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے کا تو سلی سلیک سے کہہ رہا ہوں۔“

”اچھا اچھی رکھتا ہوں اس نے کہا۔ اور پھر دیوار پر آویزاں جھوٹے سے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں میں کھڑکرتے لگا۔

”دیکھو میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم نے سلوٹ کے بارے میں جو کچھ سنا غلط سنا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی کے منہ سے کوئی بات نکلنے سے خود دوسرے کے کانوں میں جلنے کی بہت مختلف ہوجاتی ہے۔ اب جیسے تم کسی سے یہ کہو کہ میرا غلام بچا جانے لگا ہے تو وہ اس بات میں متوڑا سا انداز کر کے دوسرے سے یوں کہے گا کہ اسفند تو فلاں جگہ جا رہے ہیں جانے کیا تیار کی ممکن کر لی ہے اور کسی بھی وقت پرواز کر جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی بات منہ سے نکلتی ہے تو اپنی ہی رہتی بلکہ برائی ہوجاتی ہے۔“

”لیکن سب کہنے سے آخر آپ کا مقصد کیا ہے۔ کیا آپ مجھے یہ یاد کرانا چاہ رہی ہیں کہ میں نے سلوٹ پر پرتان باندھا ہے۔ یا اس کے خلاف مجھے بھڑکایا ہے۔ تو میں اسے آپ کی زیادتی ہی سمجھوں گا۔ وہ بالوں میں کنگھا پھیرتے جیسے کسی کی طرف مڑ کر بولے۔

”نہیں۔ نہیں تمہاری ماں کا تو یہاں کوئی ذکر ہی نہیں میں تو محض تمہاری یہ اولیٰ بدلتی سی کیفیت دیکھ کر اپنی طرف سے تمہیں سمجھا چاہا رہی تھی۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ تمہیں سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے لیکن اس کا انتقام تم اس چارے پر اتنے رکیک الزامات لگا کر نہ لو۔ اگر اس سے ایسا ہی مشتق ہے تو چاہاؤ اس کے بارے میں جا کر معلومات۔“

”اورہ۔ اماں جان پلیز۔ اب اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہیں۔ بلکہ کوئی اور بات کریں۔“

وہ کچھ اس قدر جھنجھلا کر بولا کہ سلیک نے پھر۔ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ یوں اس کے اچانک آنے اور اچانک ہی جانے پر ان کو اتنا تعلق ہو رہا تھا کہ بات کرنے کو بھی کہاں چاہ رہا تھا۔ اس نے بھی خاموشی سے اپنا جیبی کنگھا پھیر کر جیب میں ڈالا۔ اخبار میں لپٹے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور سوٹ کیس کو بند کر کے مسکراتا ہوا سلیک کی طرف پلٹا۔ پڑا ابھی تک کھڑی ہی تھیں۔

”اچھا اماں جان کہا سنا معاف۔ اب میں چلوں گا۔ اور پھر ان کے آگے جھک گیا۔

”اچھا جاؤ میرے بچے تمہیں خدا کو سونپا۔“ مضبوطی سے ہزار کوشش کے باوجود سلیک کی گیم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہت سے آنسو جھپک پڑے۔ انہوں نے اس کے سر کو چومتے ہوئے کہا۔

”ہاں ابھی سے۔“ اس نے شرارت آمیز ہجے میں بھیجیں اچھا کر پوچھا۔

”بے ہے پاجی کہیں کا۔ اب جاتے جاتے میں میرے دل میں عین اتنا کر جا رہا ہے۔ خدا تجھے سدا سلامت رکھے میں نے تو تجھے اللہ کی حفظ و امان میں دیا ہے۔ اور تو ایسے بد فال منہ سے نکال رہا ہے۔“ انہوں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ سے ایک دھپ جاتے ہوئے ٹکڑ کر کہا۔

”اچھا۔ اچھا پھر تو ٹھیک ہے۔ اچھا السلام علیکم اور خدا حافظ۔“ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

”خانی اماں اللہ مگر تم جاؤ گے کیسے۔ اور خدا سے کہہ دیا ہوتا تو وہ جیسی ہی لے آتا۔ سلیک نے گیم نہ کہا۔

”نہیں ارشد کو کیوں رحمت دیتا۔ کیا میری ناگہمیں نہیں ہیں جو تھوڑی دیر میں چلنے کے قابل نہ ہوں۔“ اس نے کہا تو کپڑے کو بڑا اچھا بھرا کر یا تو وہ کار کے بغیر گھر سے قدم ہی نہ نکالتا تھا اور یا یہ عالم کہ سوٹ کیس لادے اب سواری بھی دھونڈنا پڑے گا۔

وہ مکر سے باہر نکلا تو سلیک کی گیم میں اس کے پیچھے باہر آگئیں۔ اور جب وہ صاف گیم سے رخصت۔۔۔ ہو کر باہر نکلیا

اپنے نسلو پختی اپنے کمرے میں آگئیں۔ آتے ہی ان کی نظر سب سے پہلے اس لفافے پر پڑی جواب تک ان کے تکیے پر لکھا تھا۔ اور اس لفافہ تھا جسے وہ اپنے سوٹ کیس میں رکھنا بھول گیا تھا۔ انہوں نے اپنے پٹنگ کی طرف بڑھ کر ملدی۔

”خانی اماں! اگر ارشد کو ملدی سے دوڑا کر اسے باہر بھیجاؤ۔ میں نہیں لگاؤں گا۔“ انہوں نے لفافے کے اندر دیکھا تو اس میں ایک رقم بھی رکھا نظر آئی۔

”اسے یہ پاس ہی پڑا اپنی نظر کچھ اٹھا کر انہوں نے اس رقم کو کھول کر پڑھا صرف ایک ہی سطر اس پر درج تھی۔

”خانی بہت ہی عزیز اماں جان کی خدمت میں حقیقتاً سزاوارہ جنہوں نے مجھے جو ہر انسانیت سے متعارف کرایا۔“

”خانی بھیم نے برقی آنکھوں اور کاہنیتے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر گئی۔ پورے دو ہزار روپے کی گڈی تھی۔ ان آنکھوں کی پڑی میں شامل ان کے دل اور دماغ میں دھیمے سے نکلتی رعائیں۔ اس کی فصل زینت پر باران رحمت بن کر برسنے لگا۔ وہ ہمیشہ کچھ ایسے ہی طریقوں سے انہیں شیعہ دیتا تھا کہ بھی ان کے بریں میں چپکے سے رقم رکھ جاتا۔ کبھی ان کے تکیے کے نیچے اور جب سے وہ ملتان بھی تھیں وہ ہر ماہ یا قاعدہ طور پر ان کا اکاؤنٹ نمبر معلوم ہونے کی وجہ سے ہلائی بالا پانچ صد روپے کی رقم ان کے پیسے میں منتقل کر دیتا تھا اور اس کی اطلاع سلیک کی گیم کے بیگ والے ہی انہیں دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے بونے بیٹوں نے باپ کے انتقال کے بعد ان کا پانچ صد روپے کا جو وکیل مقرر کر رکھا تھا وہ بھی اس بیگ میں جمع ہونا تھا۔

”گروہ جاتی تو کہہ سکتے کہ اسے مزید دو تین روز کے لیے روک بھی سکتی تھیں لیکن ان دنوں وہ جس ذہنی اور قلبی کیفیت میں گزر رہا تھا اس کا بھی نہیں پورا پورا احساس تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر وہ شہزادوں کی طرح عیش و آرام سے زندگی گزارنے والا۔ جیلا ان کے بدل کا اس بھائی کے بہت سی ہولتوں سے محروم گھر میں کیسے رہ سکتا تھا۔ جس کے کل تین رہائشی رہتے۔ بلکہ وہاں کی گیم۔ کیونکہ جس گیم میں وہ رہتے تھیں۔ وہ کسی سٹور یا کوٹری کا سافٹش پیش کرتا تھا۔ گولڈن گیم نامی کبھی ایسے ہی نہیں بلکہ بہت ہی اچھے وہ دیکھے تھے ایک ایسے مرد کے دل پر حکومت کی تھی جو بڑا ہی سخت گیر و تند مزاج اور فیصلہ خور اور جی سے بیزد کے لیے ایک دنیا تھی۔

کیونکہ وہ دولت مند تھا رئیس تھا۔

اور دولت ہی طاقت ہی ہوتی ہے اور کشش بھی۔

جس سے سب ہی زیر نظر آتے ہیں۔

مگر سلیک نے شوہر کے تقابل میں اپنی کم عمری۔ اپنی فطری صلاحیتوں، اور خوبیوں کے باعث نادار ہوتے ہوئے بھی ان پر حکومت کی تھی۔

بہت ہی اچھا وقت دیکھا تھا۔ مگر چونکہ زمانے کے سرو و گمر کا ہر اچھے ہوئے تھیں اس لیے اس عالم پیری میں بھی ہر زمانے کا محول کا خود کو عادی بنالیا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ تو تو یہی ہے کہ جب انسان پسیتوں سے اس طرح کا ایک دم بلند یوں بڑھاتا ہے تو بعد میں خواہ حالات کیسا ہی رنج اختیار کر لیں وہ زمین پر پاؤں دھرنے کو تیار ہی ہوتا۔

گھر ایسے لوگوں کا پیمانہ غلط بہت چھوٹا اور کچا ہوتا ہے۔

جس سلیک کی گیم کا طوفان ہی تو اعلان تھا۔ وہ بر قسم کے ماحول کا خود کو عادی کر لیتی تھیں اور اس سے دوسری دعاؤں کے ساتھ ان کی گیم سے اول اور خصوصی دعا بھی تھی۔

”خانی! تو ہی اپنے بندوں پر عنایات اور کرم کی بارش کرتا ہے۔ اور تو نے ہی اس عاجز اور گناہ گار بندی پر بھی بڑے احسان و اکریم کیے ہیں۔ اب تو آخرا کرم اور کرم کے کمرے تھے کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ مکان بنائے تاکہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام اسی کے گھر میں کاٹ سکوں۔“

اور سلیک کی گیم کا وہاں وہاں اس کے لیے دعا گو تھا اور اور ہر باہر تک کسی سواری کی تلاش میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اب جلتے تو وہاں کے رہائشی بھی جاتے تو بل کے ذریعے جلتے یا ہوائی جہاز کے۔

بلکہ وہاں آیا تو بڑے ذوق و شوق سے تھا۔ اماں جان کی محبت اور یاد اور سب سے بڑھ کر ان کی چھوٹی لڑکی اس کی اہل سنت کا خیال ہی اسے ملتان بھیج کر لایا تھا۔ مگر آتے ہی گھر کے ماحول میں رچی بوری سے اسے کچھ ایسی وحشت ہوئی کہ نہ تو وہاں رہا کرتا بھی اسے گھارا نہ ہوا۔ اور وہ اماں جان کو دل برداشتہ کر کے وہاں سے نکال آیا۔

اسے اپنے ذہن کے گوشوں پر اپنی جان چھڑکنے والی قرشتہ صفت اماں جان کی انگشتاں محسوس بھی ہو چکی تھیں۔ اور اس بات کا بھی احساس تھا کہ ماں اور بہنیں سچی کہ باپ نہیں اس کے اچانک کہیں غائب ہو کر
 پردہ ہری پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ مگر وہ کتا بھی کیا۔ باپ نے تو کوئی ایسا کہہ کر اسے پہنچ کیا تھا کہ سلوٹ کو اس کے پاس سے
 اسے پھر اس کے گھر میں لے آئیں گے۔ جبکہ اسے سلوٹ کا نام تو کیا تصور بھی گوارا نہ تھا۔ اسی لیے وہ گھر سے نکل کر کوئی
 چلا آیا تھا۔ اور اس کے دن اس نے اپنا اسٹے بعد درخواست بھی پیش کر دیا تھا۔ جس کی منظوری میں دن کے گھر
 روز تک وہ یہی سوچتا رہا کہ اب کیسے کوئی کرے۔
 کراچی سے واپسی اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔
 یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ زیادہ باندیوں سے گھبراتا تھا۔
 بلکہ کسی بھی بات میں اس قدر باندہ ہونے کا عادی نہ تھا جو اس کی آزادانہ فطرت پر بار بن جائے۔
 یوں بھی اگر کراچی میں اس کا دل لگا رہا تھا تو وہ بھی صرف سلوٹ کی وجہ سے جس نے اس کے خیال میں اس کے لئے
 اور سچے جذبے کو محض ایک جزوقتی کھیل ہی سمجھا تھا۔ یہ تو وہ مکی آنکھوں اسے دھوکا دیتی رہی۔ اور جب اس کے
 کا جذبہ چاک ہوا تو جیسے سے فرار ہو گئی۔ وہ یہ مانتے پر تو تیار ہی نہ تھا کہ وہ اس کی نشت ملائی کی وجہ سے گھر
 بھاگ گئی ہے۔ اس معاملے میں تو وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر اسے اتنا غیرت مند ہی کہہ
 کر رہا تھا۔
 اسفند بزار تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ با شعور اور ایک اہم عہدے پر فائز انسان بھی مگر نا تجربہ کار تھا۔ وہ غلو
 لا ابالی سا تھا اور والدین کی بے توجہی کا نشانہ بھی۔
 اس پر اسے اپنی اہمیت اور انفرادیت کا بھی شکت سے احساس تھا۔
 اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی زمینہ اولاد ہے۔
 شروع ہی سے بڑے رعب داب والے دادا کا منظور نظر اور دادی کی آنکھوں کا نور بن کر رہا ہے۔ اور دادا نے
 اسے بیٹے کی حیثیت دے کر اپنی زندگی میں ہی اسے اپنی حامیہ کے ایک وسیع حصہ کا مالک بنا دیا تھا۔
 اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کے والدین اس کی جا اور بے جا پوری کر کے دوسرے معنوں میں اپنی کوتاہیوں کا
 ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
 وہ اس کا موڈ اور تیور دیکھ کر چلتے ہیں۔ اور باپ سے زیادہ ماں اس سے تھوڑی تھوڑی خائف رہتی ہیں۔
 بھی ڈر ڈر کر بات کرتی ہیں اور اس کے سامنے لیے دیے ہی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔
 کہتا ہے اسے ہی پورا کیا جاتا ہے۔ وہ ہنستا ہے تو سب ہنستے ہیں۔ وہ بخیرہ ہوتا ہے تو سب کے لب ساکت ہو جاتے
 ہیں۔ گویا سب اس کے اشاروں پر نہا جتے ہیں۔
 مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آخر کس وجہ سے ہوتا ہے؟ جبکہ میں بھی ان انہوں میں سے ایک ہوں۔ اپنی کا خون اور
 گوشت پوست ہوں۔ ماں ہی کی اولاد ہوں۔ اور اسی واسطے اور رشتے سے ابا جان دادا نے مجھے اپنی جائیداد کے
 حصے کا مالک بنا دیا ہے۔
 تو یہی کسے بجائے اگر کسی غیر کا بیٹا ہوتا تو پھر یہ اتنی مراعات کیوں دی جاتی ہیں۔
 مجھ پر اس قدر انعام و اکرام کی بارش ہی کیوں کی جاتی۔ آخر میں کیوں مجھ پر حکم نہیں چلاتیں۔ کیوں مجھے نہیں ڈنٹتیں
 واپس کسی وجہ سے مجھے نہیں روکے تو کتنے کیوں مجھے۔ زارش نہیں کرتے۔ یہ بہنیں کیوں مجھ سے بے تکلف ہیں۔
 کیوں اٹھا اٹھا کر نہیں کہتیں کہ بھائی جان تمہیں یہ لادیکھے وہ لادیکھے۔ یا ہمیں فلاں جگہ لے چلیے۔ تھوڑی سی ڈنٹ
 ہی دیکھیے۔
 آفت اپنے گھر میں رہتا ہوں اور اپنے سگوں سے کسی قدر اہمیت محسوس کرتا ہوں۔
 کیا یہ غیر پر غلام نہیں ہے؟

ن سے تو کوئی اچھی ہے۔ جو مجھ سے مخالفت بھی نہیں کرتی۔ اور ہنس بول بھی لیتی ہے۔ تھوڑی سی ہے مذاق بھی کرتی
 من روز بھی کہہ رہی تھی کہ بھائی جان آپ کبھی تو ہمیں بھی ٹریٹ دے دیا کیجیے۔
 در سلوٹ کا نام لے کر تھوڑی ہی رہتی ہے۔
 دیکھو میری ماں جان ہی نہیں ہے ہاں چچا زاد ضرور ہے۔ مگر سگابھائی مجھتی ہے نا۔ پھر یہ میری بہنیں کیوں
 مجھ سے وہ اکثر و بیشتر ایسے ہی خیالوں میں انجھار بٹھاتا تھا۔
 اپنی بار اس نے اپنے اچھے موڈ اور شگفتگی کا مظاہرہ کر کے خود بھی اپنے اور بہنوں کے درمیان حامل تکلفات
 پرین کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھلک کے تھیں بات ہی رہا تھا۔
 بہنیں ہی بولی تھیں تو اس طرح جیسے باتوں کے درمیان کوئی لطیفہ یا چٹکلا سُن کر انسان اس سے لطف اٹھا
 رہتا تھا۔
 یہی وجہ تھی کہ وہ سلوٹ کی ذات سے اپنی ان ساری عمو میوں کا صلہ چاہتا تھا۔
 وہ اس کی خاموشی۔ عجب اور اگر گریز کو محض شرم اور احساس شرمی پر محمول کرتا تھا۔ اور اس کی شرم جھجک اور
 نزل کے احساس کو توڑ دینا چاہتا تھا۔
 وہ اچانک ہی بڑے عمدہ عروس طریقے سے اس کو اس قدر چاہنے لگا تھا کہ اسے دیکھے بغیر نہیں سے نہ رہتا تھا
 جہاں بھی ہوتا۔ سلوٹ کا قصود دل پر حا ط کیے رہتا۔
 مگر وہ تھی کہ کسی مرئیہ کو دیکھتا یا راز خیز پر جاتا اور کسی بیڈ پر کوئی نمی مرئیہ نظر آتی تو اس کے چہرے میں سلوٹ
 نے فزونی ڈھونڈتا۔
 وہ سلوٹ کو اس قدر چاہنے لگا تھا کہ سلوٹ اس کی اس چاہت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔
 یوں ہی وہ اپنی اتنی زیادہ چاہت کو سلوٹ پر ظاہر نہیں کر سکا۔
 جس کی وجہ کچھ تو اس کی اس معاملے میں نا تجربے کاری تھی۔
 اور کچھ اسے ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔
 بلکہ خود سلوٹ ہی نے اسے اظہار کا موقع نہیں دیا تھا۔ کہ اس پر ہمیشہ اندیشوں اور رسوائی کا ہوا چڑھا رہا تھا۔
 اور پھر سب سے بڑھ کر اسے اپنے جذبے کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالنا بالکل نہ آتا تھا۔
 پس وہ لوظت۔ فطری تقاضوں میں جو بے ساختگی اور بے پاکی ہوتی ہے اسے ہی اظہار کا ذریعہ سمجھتا تھا۔
 تو پھر ظاہر تھا کہ جب اس پر یہ عہدہ کھلا کہ سلوٹ شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کو اس جسم میں چھوڑے بیٹھی ہے
 روز بروز چاہے اور اس کی جوانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور محض وقت گزاری کی غرض سے اس
 سے نسبت کا میل کھیتی رہی ہے۔ دوسرے معنوں میں اسے خرب دیتی رہی ہے۔ اسے بیوقوف بنا تی رہی ہے تو اس کا
 پاسے باہر ہونا ایک لازمی امر تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اتنا آشیں زیر پا ہوا تھا کہ اسے گھر بدر کر دیا تھا۔
 اس کے باوجود بھی ایک چھانسن تھی جو ہر طرح دل میں کلک رہی تھی۔
 اس فحش تھی جو اپنے نوکیلے دندانوں سے اس کا قلب دھچکا دھچکا دیتی تھی۔
 اس کے لیے لگی تھی جو کبھی کل اسے چن نہیں لینے دے رہی تھی۔
 وہ اس کو اس شہر سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے اتنے پاک اور سچے جذبے کا اس بری طرح خون
 کا موڈ وہ گھر باہر نہیں ملازمت بھی چھوڑ کر ملتان آ گیا تھا۔ اور اب یہاں سے ایک نامعلوم منزل کی سمت جارہا تھا
 وہاں تک کہ اسے کجبت اندیشی ہوتی ہے۔ دوا لگی رہی تو ایک پراسانڈہ ہوتی ہے۔ یا پھر بے وقوفی اور بے حیائی کا دوسرا نام
 ہوتا ہے عقل ہی نہیں بلکہ انسان کی صلاحیتوں کو ناکارہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ ایک ایسا روگ ہوتی ہے جو کسی کو لنگ جلتے
 اٹھانے کا بھی چھوڑتی ہے۔

بہر حال جیسی بھی ہوتی ہے مگر جذبہ رعبت ایک ایسی اہل حقیقت ہے جسے جھٹلانا ممکن ہی نہیں۔ اس غفلت پر ارادے یا منصوبے کو دخل نہیں ہوتا۔

میں یہ تو آپ ہی آپ ایسا اچھا اور اچانک طور پر گویا ایک جھپکنے میں دل کو لگے کسی یاس یا بات سے غمزدہ ہو گیا ہے۔ تو ان کی آن میں انسان کے دل کی دنیا کو یہ کیسے بدل کر رکھ دیتا ہے۔

دیگر جیسے کوئل جان اپنی بیلی اور شیپوں کے فراق میں دشت و کوہ کی خاک نہ چھانا کرے کیونکہ کئی صورتوں میں اس کے جسم پر زخمیں پڑ سکتی ہیں۔

لی اسودلی کا سہارا نہیں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دو چار ہفتے والوں کو ایک دوسرے کے مقصود سے متاثر نہ ہو کر اپنا جہاز پیچھے کر ایک دوسرے کے حاصل ہی تو خجست کی سب سے بڑی لنگن اور اولین مقصد جو تاکہ ہے کہ عارضی اور مشوق تو خجست اور فی الحقیقت ان دونوں کی کیفیت میں ایک دوسرے سے زیادہ متاثر ہو جائیں۔

اگر ان کے راستے - یا سائیں جدا کر دیا جائے تو پھر وہ ایک مرکز پر قائم نہیں رہتے اور سدا اسیوں اور ان کا پڑنے کے اندھروں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور یوں حشریں اور تشنہ کامی ان کے جذبہ محبت کا کشیدہ ترک ہو جاتا ہے۔ جدا کرنے سے

فرمان کے حالات زندگی کے مطالعو سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو اور فراق کی صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے بی جاہلوں کا علیحدگی نہیں ٹانٹا ہوا گیا تھا۔ بلکہ سر سے لائف بلیش میں بیچ کر ہو گیا تھا۔ مگر وہ بچائی اور سادگی کا زمانہ تھا۔ گران کی زندگی کا زمانہ سرسبز تھا۔

تجسّی تو فخر مانے اپنی جوہری توانائی صرف کر کے اور اپنی جہان پر ظلم کر کے دودھ کو تیرکھو ڈالی تھی کراچی اور اودھ کی مدینہ تو کیا اس زمانے کی جوہری اصلی ہوتی تھی۔ مثلاً تالیکارا اثرات کا دور دور تک گزر رہا تھا۔ اس زمانے

محدود۔ وسائل نہ ہونے کے برابر۔
کھوٹ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس چیز کا نام ہوتا ہے۔

ایک نئے اربو کو بیچ کر بانی رہ جاتی ہے نوودہ بھی عواہش۔
 یسلی کو پانے کی خواہش۔
 شیریں کے حصول کی خواہش۔

گلاسٹن کے دل میں تو ایسی بھی کوئی خواہش نہیں تھی۔ یوں ہی وہ اس دور میں سائنس کے رہنما تھا جب دنیا فزکس میں برقی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں اب وہ دشت کی سیاحی یا کاکہ پہاڑی تو کر کے سے رہا تھا۔

البتہ شہروں اور دروہوں کی خاک چھپاتے ضرور نکلتا تھا۔
مگر سسٹو طے کی تلاش میں نہیں بلکہ وحشتِ دل کے ماحقوں مجبور ہو کر یا پھر صابر علی کے مکان سے کچھ فاصلے پر
جا کر سواری کے انتہائی کم سے کم کھڑے رہا، اس نے اس حال میں کوفہ کو دیکھا کہ اس نے

گو روپے پیسے کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ اس کے پاس اس وقت بھی تین چار سزا کی رقم موجود تھی۔ اور اس کے علاوہ اس کے پاس کراچی کے ایک معروف بینک کی چیک بک بھی موجود تھی۔ اس نمک کی شاخیں ملک میں با

ملک سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں اور وہ بڑی آسانی سے اپنی حسب ضرورت رقم اس بینک کی کسی بھی شاخ سے لے سکتا تھا۔ مگر اس نے وقت کٹنے کے خیال سے ریل کے سفر کو ترجیح دی تھی جس انفاق سے جس وقت وہ اسٹیج پہنچا، لاہور

جائے والی میں بقیہ فارم پر کوشش کیے تیار تھی۔ اس سے فوراً ہی اسی کے گلاس کا کلمت خرید لیا۔
سوار ہو گیا۔

جب کہ اس کو پہلے میں دوسرا فزوں کی گنجائش تھی۔ بہر حال اگلے روز شام کے قریب وہ لاہور پہنچا اور دیرین سے اس کے لیے ایک کارکن سے لاہور کے کسی بڑے ہوٹل کا پتا ہو گیا۔ پھر کسی لیوا اس ہوٹل میں پہنچ کر کے کاہنہ اور اس کا دوسرا بیوی کے

سوخت لکھن کے کرائے میں چلا آیا۔ یہ بھی ایک فائوستار ہو گیا تھا اور کمرہ بھی تو کراچی کے فائوستاروں کے درجہ پر تھا۔

و پھر بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ خواہ کہیں بھی جانا ہو مگر وہ ہر حالت میں لاہور سے ضرور نکل جائے گا چھ دن تک لاہور میں سو کر اٹھتے ہی اس نے اپنی اگلی منزل کا تعین بھی کر لیا۔

اسلام آباد کا تعین۔

اگلے دن علی الصبح ہی وہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس روز بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

پھر اس نے سوچا کہ وہ جلد از جلد لاہور چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح دن نکلا تو وہ بھی جہاز سے اپنی سیٹ تک کروانے کی غرض سے نیچے میجر سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر اس کے دونوں شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیے اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اس کا مدت سے چھڑا ہوا جگڑی دوست آفتاب انصاری اس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”آخا تم؟“ اس نے جذباتی سے انداز میں غعر مارنے کے سے انداز میں کہا اور پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔

آفتاب باج فٹا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں اسفند کا قد چھ فٹ ایک انچ تھا۔ اور اس سے گلے ملنے کے لیے اسے جھکتا پڑا تھا۔ وہ وہاں کاؤنٹر کے آگے ہی ایک دوسرے سے بغلیگر ہو گئے تھے اور وہاں موجود لوگ بڑی دلچسپی سے دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”یاد آکھیر سا تڑکے کی ہی تھوڑا سا قدر تھا لیا ہوتا تو مجھے اس قدر جھکتا تو نہیں پڑتا۔“ اس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر آفتاب سے ملیدہ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”یاد رہی تو کمال ہے میری جھوٹے تھکاؤ وہ بڑے بڑے لوگوں کو میرے سامنے جھکوا دیتا ہے۔“ آفتاب نے کچا کر جواب دیا تو اسفند ہنسنے لگا۔

”چلو یہ اچھا ہی ہوا جو تم اس وقت آگئے ورنہ بعد میں آتے تو میں یہاں سے فلامی — کچکا تھا۔“ اسفند نے ہنس لیا۔

”بہ کیا۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جس طرف فلامی کرتے کا ارادہ تھا تھا ہارا۔ آفتاب نے پوچھا۔

”ہاں اس میں شک نہیں کہ رعایت بھی حاصل ہوتی ہیں اور سہولتیں بھی مگر ایک لمبے دھڑلے میں ہوتی ہیں۔“

طرح ایک دینا تو نہیں خرید سکتے۔ آفتاب اٹھا اسے قابل کرنے کی غرض سے بولا۔

”خیر۔ خیر۔ یہ محض ہتھکڑیاں ہیں۔ یہ ورنہ دینا تو ہم بھی نہیں خرید سکتے۔ اچھا چھوڑو اس ذکر کو یہ بتاؤ کیا نام

شادی بھی کی یا یوں ہی تنہا ایک بیٹے سے زندگی کی کاڑی چیلنج رہے ہو؟“

”نہیں بار۔ ابھی تو صرف دو بہنوں کے فرائض سے ہی سبکدوش ہو سکا ہوں جب کہ دو چھوٹی بہنیں مریض مری کی دوزخ

ہی بیٹھی ہیں۔ والدین کی بڑی اولاد ہوں اور والد صاحب کو ریا کرمنٹ مل گئی ہے۔“ آفتاب نے اپنی عداوت کو دھڑلے کی بجائے

بیان کی۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہو جانا؟“ اسفند بولا۔

”نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو بوی آجاتی ہے تو اخراجات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ یہ پرہیز

کرتی کہ اس کے شوہر کی کمائی کسی دوسرے پر خرچ ہو۔ خواہ وہ شوہر کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ بڑی انجمنیں اور تنگیاں پیدا ہو جاتی ہیں

اس طرح ویسے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تیری بہن کی شادی کے بعد ضرور اپنی شادی کر لوں گا کیونکہ سب سے چھوٹی بہن میری بہن

کی ہے اور جب تک اس کی شادی کا وقت آیا دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اس طرح میں

بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ جمع کر سکا ہوں گا۔“

آفتاب نے مزید بتایا پھر کہا۔

”ارے چھوڑو یا اس فضول ٹاپک کو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں آج کل یہاں لاہور میں قیامت ہوں؟“

”بس ابھام ہوا تھا۔“ اسفند نے روکھا سامنے بنا کر کہا۔

”اب زیادہ اسامات بننے کی کوشش نہ کرو یا ر اور سیدی سیدی طرح بتاؤ۔“ آفتاب قد سے ہچک کر بولا۔

”اوہو سیدی، یہ ایسی کوئی پراسرار بات تو نہیں ہے تمہیں یاد تو ہوگا وہ الف ایس سی میں ٹیکر نامی ایک لاکھ ہمارے ساتھ چلا

ہاں ہاں وہی نام ہے ہم سب چمک چمک کر دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ آفتاب اس کے مزید کہنے سے قہقہے لگا رہا تھا۔

”خیر۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں چھوڑا تھا۔“ لوگ ہی چھوڑتے تھے۔“ اسفند بولا۔

”ہاں ہاں تم تو ہماری سدا کے کوئی آسمانی مخلوق مگر یہاں شیر کا کیا ذکر۔“ آفتاب خاصا متحسب سا نظر آ رہا تھا۔

”بھئی وہی تو کوئی تین بیٹے قبل برسے اتفاقاً طور پر جب میں راؤنڈ پر تھا میری اس سے مدھیر ہو گئی تھی۔“

”ہائیں مدھیر؟“ آفتاب نے کہا۔

”ہاں کیونکہ میں تو اسے بالکل نہیں پہچانتا تھا۔“

”مگر وہ زبردستی تمہارے متھے لے گیا تھا۔“ آفتاب اس کے چہ چہا کہ بات کرنے پر چڑھ کر بولا۔

”نہیں خیر متھے دھنے تو نہیں پڑا تھا۔ بلکہ وہ اپنے والد کے گرد سے آپریشن کے سلسلے میں ہسپتال آیا تھا۔ اتفاقاً ہے جو

سے سامنا ہو گیا تو مجھے فوراً پہچان گیا۔ اور اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم آج کل لاہور میں قیامت ہو۔“ اسفند نے قیامت

آفتاب اپنے مانتے پر زور ڈالنے کے سے انداز میں تعجب کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”کمال ہے۔ اسے تو میں نے اس روز کے بعد سے جس روز کا چھوڑا تھا کبھی دیکھا ہی نہیں پھر اس نے میرے متعلق کہاں

سے اتنی معلومات فراہم کر لیں؟“

”اب یہ تو خدا ہی جانتے۔ مگر ضرور موار کہ اس کی معلومات بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ ورنہ لاہور کا رخ کرتے ہی تمہاری

طرف سے میں ایک شخص میں مبتلا تھا کہ نہ معلوم تم طومبی یا نہیں۔“ اسفند نے کہا۔

”چلو خیر میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یاد تو رکھا۔ ورنہ آج کے اس بے ثبات دور میں تو اپنے سے کمتر دشمنے دار کی

قابل اعتنائی نہیں سمجھے جاتے۔“ آفتاب نے اظہار ممنونیت کے طور پر کہا۔

”اب یہ چھوٹے کی باتیں مجھ سے تو نہ کرو۔ ورنہ گدی پر ایک ایسا ہاتھ دوں گا کہ ساری کپڑی نکل جائے گی تمہاری۔“ سند

نے ہاتھ اٹھا کر اسے دھمکا یا تو وہ منسنے لگا۔

”ویسے بانی داوے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے لاہور آنے کا مقصد کیا صرف مجھ سے ملاقات کرنا ہی تھا؟“ آفتاب نے پو

”خیر۔ خیر۔ یہ محض ہتھکڑیاں ہیں۔ یہ ورنہ دینا تو ہم بھی نہیں خرید سکتے۔ اچھا چھوڑو اس ذکر کو یہ بتاؤ کیا نام

شادی بھی کی یا یوں ہی تنہا ایک بیٹے سے زندگی کی کاڑی چیلنج رہے ہو؟“

”نہیں بار۔ ابھی تو صرف دو بہنوں کے فرائض سے ہی سبکدوش ہو سکا ہوں جب کہ دو چھوٹی بہنیں مریض مری کی دوزخ

ہی بیٹھی ہیں۔ والدین کی بڑی اولاد ہوں اور والد صاحب کو ریا کرمنٹ مل گئی ہے۔“ آفتاب نے اپنی عداوت کو دھڑلے کی بجائے

بیان کی۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہو جانا؟“ اسفند بولا۔

”نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو بوی آجاتی ہے تو اخراجات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ یہ پرہیز

کرتی کہ اس کے شوہر کی کمائی کسی دوسرے پر خرچ ہو۔ خواہ وہ شوہر کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ بڑی انجمنیں اور تنگیاں پیدا ہو جاتی ہیں

اس طرح ویسے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تیری بہن کی شادی کے بعد ضرور اپنی شادی کر لوں گا کیونکہ سب سے چھوٹی بہن میری بہن

کی ہے اور جب تک اس کی شادی کا وقت آیا دونوں چھوٹے بھائی بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اس طرح میں

بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ جمع کر سکا ہوں گا۔“

آفتاب نے مزید بتایا پھر کہا۔

”ارے چھوڑو یا اس فضول ٹاپک کو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں آج کل یہاں لاہور میں قیامت ہوں؟“

”بس ابھام ہوا تھا۔“ اسفند نے روکھا سامنے بنا کر کہا۔

”اب زیادہ اسامات بننے کی کوشش نہ کرو یا ر اور سیدی سیدی طرح بتاؤ۔“ آفتاب قد سے ہچک کر بولا۔

”اوہو سیدی، یہ ایسی کوئی پراسرار بات تو نہیں ہے تمہیں یاد تو ہوگا وہ الف ایس سی میں ٹیکر نامی ایک لاکھ ہمارے ساتھ چلا

ہاں ہاں وہی نام ہے ہم سب چمک چمک کر دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ آفتاب اس کے مزید کہنے سے قہقہے لگا رہا تھا۔

”خیر۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں چھوڑا تھا۔“ لوگ ہی چھوڑتے تھے۔“ اسفند بولا۔

”ہاں ہاں تم تو ہماری سدا کے کوئی آسمانی مخلوق مگر یہاں شیر کا کیا ذکر۔“ آفتاب خاصا متحسب سا نظر آ رہا تھا۔

”بھئی وہی تو کوئی تین بیٹے قبل برسے اتفاقاً طور پر جب میں راؤنڈ پر تھا میری اس سے مدھیر ہو گئی تھی۔“

”ہائیں مدھیر؟“ آفتاب نے کہا۔

”ہاں کیونکہ میں تو اسے بالکل نہیں پہچانتا تھا۔“

”مگر وہ زبردستی تمہارے متھے لے گیا تھا۔“ آفتاب اس کے چہ چہا کہ بات کرنے پر چڑھ کر بولا۔

”نہیں خیر متھے دھنے تو نہیں پڑا تھا۔ بلکہ وہ اپنے والد کے گرد سے آپریشن کے سلسلے میں ہسپتال آیا تھا۔ اتفاقاً ہے جو

سے سامنا ہو گیا تو مجھے فوراً پہچان گیا۔ اور اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم آج کل لاہور میں قیامت ہو۔“ اسفند نے قیامت

آفتاب اپنے مانتے پر زور ڈالنے کے سے انداز میں تعجب کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”کمال ہے۔ اسے تو میں نے اس روز کے بعد سے جس روز کا چھوڑا تھا کبھی دیکھا ہی نہیں پھر اس نے میرے متعلق کہاں

سے اتنی معلومات فراہم کر لیں؟“

”اب یہ تو خدا ہی جانتے۔ مگر ضرور موار کہ اس کی معلومات بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ ورنہ لاہور کا رخ کرتے ہی تمہاری

طرف سے میں ایک شخص میں مبتلا تھا کہ نہ معلوم تم طومبی یا نہیں۔“ اسفند نے کہا۔

”چلو خیر میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یاد تو رکھا۔ ورنہ آج کے اس بے ثبات دور میں تو اپنے سے کمتر دشمنے دار کی

قابل اعتنائی نہیں سمجھے جاتے۔“ آفتاب نے اظہار ممنونیت کے طور پر کہا۔

”اب یہ چھوٹے کی باتیں مجھ سے تو نہ کرو۔ ورنہ گدی پر ایک ایسا ہاتھ دوں گا کہ ساری کپڑی نکل جائے گی تمہاری۔“ سند

نے ہاتھ اٹھا کر اسے دھمکا یا تو وہ منسنے لگا۔

”ویسے بانی داوے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے لاہور آنے کا مقصد کیا صرف مجھ سے ملاقات کرنا ہی تھا؟“ آفتاب نے پو

کرتی ہیں جہاں کے باشندوں کو طبی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں، اسفند نے کہا۔

”کیوں کیا اب جھارڈی لگا کر دو انہیں نیچے کا ارادہ ہے۔ کیوں فضول باتیں کرتے ہو تم جیسا اعلان کرنا یا نہ کرنا ہر دو درجے کے ڈاکٹر اور میں جو عام طور پر کیا ڈورز موتے ہیں، شامل ہوتا اچھا لگے گا۔“ آفتاب مل کر بولا۔
”سو ڈاٹ۔“ بھیجی میں کی ثوابت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے جوتے درجے کے ڈاکٹروں کے ساتھ ایک ایک ایسا لگا کر دو انہیں شامل ہو سکتا ہے تاکہ مجھے دیکھ کر دوسرے اونچے درجے کے ڈاکٹر بھی غیرت پکڑیں، اسفند نے قدس نے فریہ انداز میں کہا۔
”تب تو تمہیں ایل آر سی۔ بی کے بجائے آر۔ ایس دی بی ہی ہونا چاہیے تھا،“ آفتاب نے جملے کے انداز میں کہا تو اسے قادی جڑنے کی کوشش میں ایک بالکل ہی مختلف بات کہنے پر اسفند سنسنی مٹتے دوبراہو گیا۔
”واہ یار۔ یہ آر۔ ایس۔ وی۔ بی کی بھی خوب کہی تم نے،“ اس نے ہنس لینے کے بعد کہا۔
”ہاں تو بھر اور کیا کہتا۔ تمہارے دماغ میں تو کچھ ضل و غلط ہو گیا ہے۔ ورنہ اتنا توجہ لیا ہوتا کہ تمہارے ملک میں میرا حصہ ہے جس میں پیمانہ لوگ موجود نہیں ہیں۔ یہ جو تمہارا دوسرا ایلا در کراچی ہے اس میں بھی ایسے غریب اور غفلت کالانہ کی کوئی کمی نہیں، بلکہ میرے انداز کے مطابق تو اس اتنے بڑے شہر میں امیروں سے زیادہ ایسے ہی لوگ آباد ہیں۔ ستم و ستم کلینک کھولو اور ایسا ہی خدمت خلق کا جذبہ اور غریب اور ناداروں کا درد تمہارے دل میں ہے تو ان کا مفت علاج کرو۔ خدا تو تبت اور جڑے کو ہی دیکھتا ہے نا،“ آفتاب نے بڑے غلوس دلائل دے کر اسے سمجھایا۔ تو جواب میں اس نے لڑکائی کی۔
”لیکن مشکل تو یہی ہے کہ میں ایک جگہ جہاں نہیں بیٹھ سکتا۔“

”ہوں تو اس کا مطلب ہے تمہارے والدین نے بے تحفہ بیل کی طرح تمہیں بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے یا پھر تم ان کے کنٹرول سے باہر ہو۔“ اچھا یہ تو تیار و شادی وادی بھی کی یا اب تک یہ بھی اہل پھیروں کی طرح ہے۔“
”ارے یہ یار شادی وادی بھی کبھی کر لی گئی۔ ابھی تو ایک عمر بڑی ہے،“ اسفند نے اس موضوع کو لاپرواہی سے اڑاتے ہوئے کہا اور کھ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر بولا۔
”اوہو۔ یا تو میں بالکل خیال ہی نہ رہا کہ مجھے تو اسلام آباد کے لیے میٹنگ بک کروانی تھی۔“

”کیوں۔ اسلام آباد کس خوشی میں جا رہے ہو،“ آفتاب نے پوچھا۔
”بس یونہی ذرا گھومنے پھرنے۔ اصل میں اسلام آباد میں ڈیڑی کی فرسٹ کزن عائشہ بھیمو کے بڑے بیٹے عطا علی خان منسٹری آف ہیلتھ میں سیکریٹری لگے ہوئے ہیں، بس انہی کے پاس جا رہا ہوں،“ اسفند نے بتایا۔
”کیا کسی غشتی شفا خانے میں شمولیت کے لیے سفارش کرانے؟“ آفتاب نے جھپٹتے سے لہجے میں پوچھا۔
”نہیں بھئی۔ بس یونہی ملنے کی غرض سے، کیونکہ میں نے سوچا کہ جب لاہور تک آگیا ہوں تو ذرا اُس کے بھڑکاسلا مل کر کی بھی سیر کر لوں،“ اسفند بولا۔

”لیکن جہاں تک سیر سنانے کا تعلق ہے، پاکستان کی حدیں اسلام آباد تک تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ یہ کہو کہ مجھے ہمارے دورہ اسلام آباد میں بعض اپنے مطلب کا کام ڈھونڈنے جا رہے ہو،“ آفتاب قدرے جھج کر بولا۔
”ہاں کسی حد تک تو تمہارا خیال درست ہی ہے۔ کیونکہ اسلام آباد میں۔“
”غیر خیر تم خواہ اپنے کزن سے ملنے جا رہے ہو یا وادی علاقوں کی خاک چھانے۔ مگر اتنا جان لو کہ آج تو میں تمہیں کسی قیمت پر نہیں جانے نہیں دوں گا،“ آفتاب بولا۔

”لیکن میں آج تو جا ہی نہیں سکتا اب تو کل ہی جاؤں گا،“ اسفند بولا۔
”اونہوں۔ کل بھی نہیں،“ آفتاب نے کہا۔
”کیوں بھئی، یہ کیا بات ہوئی؟“

”بات و ات تو کچھ نہیں ہوئی، بس تم مجھ سے ملنے اتنی دور دراد کا سفر کر کے یہاں آئے تھے۔ اب یہ بھی بعض اتفاق ہی تھا میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے لاہور سے باہر تھا۔ لیکن آج آتا تو آتے ہی اپنے ضروری کام نمٹانے کے بعد فارغ ہوتا تھی لیکن سرفراز نے تمہارا کارڈ ہاتھ میں تھماتے ہوئے بتایا کہ تم میری غیر موجودگی میں مجھے پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ اور فلاں ہو مل میں نام ہو

کرتی ہیں جہاں کے باشندوں کو طبی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں، اسفند نے کہا۔
”کیوں کیا اب جھارڈی لگا کر دو انہیں نیچے کا ارادہ ہے۔ کیوں فضول باتیں کرتے ہو تم جیسا اعلان کرنا یا نہ کرنا ہر دو درجے کے ڈاکٹر اور میں جو عام طور پر کیا ڈورز موتے ہیں، شامل ہوتا اچھا لگے گا۔“ آفتاب مل کر بولا۔
”سو ڈاٹ۔“ بھیجی میں کی ثوابت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے جوتے درجے کے ڈاکٹروں کے ساتھ ایک ایک ایسا لگا کر دو انہیں شامل ہو سکتا ہے تاکہ مجھے دیکھ کر دوسرے اونچے درجے کے ڈاکٹر بھی غیرت پکڑیں، اسفند نے قدس نے فریہ انداز میں کہا۔
”تب تو تمہیں ایل آر سی۔ بی کے بجائے آر۔ ایس دی بی ہی ہونا چاہیے تھا،“ آفتاب نے جملے کے انداز میں کہا تو اسے قادی جڑنے کی کوشش میں ایک بالکل ہی مختلف بات کہنے پر اسفند سنسنی مٹتے دوبراہو گیا۔
”واہ یار۔ یہ آر۔ ایس۔ وی۔ بی کی بھی خوب کہی تم نے،“ اس نے ہنس لینے کے بعد کہا۔
”ہاں تو بھر اور کیا کہتا۔ تمہارے دماغ میں تو کچھ ضل و غلط ہو گیا ہے۔ ورنہ اتنا توجہ لیا ہوتا کہ تمہارے ملک میں میرا حصہ ہے جس میں پیمانہ لوگ موجود نہیں ہیں۔ یہ جو تمہارا دوسرا ایلا در کراچی ہے اس میں بھی ایسے غریب اور غفلت کالانہ کی کوئی کمی نہیں، بلکہ میرے انداز کے مطابق تو اس اتنے بڑے شہر میں امیروں سے زیادہ ایسے ہی لوگ آباد ہیں۔ ستم و ستم کلینک کھولو اور ایسا ہی خدمت خلق کا جذبہ اور غریب اور ناداروں کا درد تمہارے دل میں ہے تو ان کا مفت علاج کرو۔ خدا تو تبت اور جڑے کو ہی دیکھتا ہے نا،“ آفتاب نے بڑے غلوس دلائل دے کر اسے سمجھایا۔ تو جواب میں اس نے لڑکائی کی۔
”لیکن مشکل تو یہی ہے کہ میں ایک جگہ جہاں نہیں بیٹھ سکتا۔“

”ہوں تو اس کا مطلب ہے تمہارے والدین نے بے تحفہ بیل کی طرح تمہیں بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے یا پھر تم ان کے کنٹرول سے باہر ہو۔“ اچھا یہ تو تیار و شادی وادی بھی کبھی کر لی گئی۔ ابھی تو ایک عمر بڑی ہے،“ اسفند نے اس موضوع کو لاپرواہی سے اڑاتے ہوئے کہا اور کھ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر بولا۔
”اوہو۔ یا تو میں بالکل خیال ہی نہ رہا کہ مجھے تو اسلام آباد کے لیے میٹنگ بک کروانی تھی۔“

”س بات کچھ روز گزر گئے تھے پھر بھی میں سارے کام پھوڑ کر ایک امید موبوم پر ایکسپریس ڈیلیوری کی طرح تمہارے پاس پہنچا۔“ آفتاب نے کہہ کر مچلے گئے۔ اب میں اتنی آسانی سے تو نہیں جاتے نہیں دوں گا،“ آفتاب نے میکرڈی سی جانی۔
”اوہ! آفتاب! کتنے کہہ کر تم نے ملے گئے۔ اب میں اتنی آسانی سے تو نہیں جاتے نہیں دوں گا،“ آفتاب نے میکرڈی سی جانی۔
”دیکھ تم تو اپنی ڈیوٹی پر ہو گئے۔ تمہارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوگا جو میرے ساتھ گزرا سکو گے،“ اسفند بولا۔
”نہیں کل تو مجھے کی وجہ سے غام غمٹیل ہوگی اور منہ پر اور انوار کو میں آن ڈیوٹی ہوں گا کیونکہ اپنے آفتاب رپ سے پورے

بہاؤ دیتا ہوں اور قاعدے کے مطابق دینین روز کی بھی تولی جاتی ہے،“ آفتاب نے کہا۔
”اسفند کچھ سوچنے کے بعد بولا۔
”اچھا چلو تمہاری خاطر یہی ہوتی۔“

”بڑا۔ یہ بات ہوئی نا۔ تم کہہ اب ہو مل میں نہیں بٹھو گے۔ سمجھے؟“ آفتاب خوش ہو کر بولا۔
”ہاں کیا مطلب۔ یہاں نہیں بٹھوں گا تو پھر کہاں بٹھوں گا؟“ اسفند نے چونکنے کے سے انداز میں پوچھا۔
”ہاں۔۔۔ بٹھو۔۔۔ بھی جاتا ہوں،“ آفتاب بولا اور پھر ٹی بی انگلیاں مار کر کچھ سوچنے لگا۔
”ہاں۔ وہ یہ ایک کزن لاہور میں مزنگ کے علاقے میں رہتا ہے،“ اس نے کچھ روز بعد کہا تو اسفند بری طرح چونک کر بولا۔
”مزنگ کے علاقے میں۔ اس علاقے کا نام تو میں نے پہلے ہی نہیں سنا تھا۔ مگر یہ علاقہ ہے کہاں؟“

”انماں جہاں تو لاہور کے حدود اور حد سے واقف ہی نہیں ہو تو میں مزنگ کا محل وقوع تمہیں کیسے بتاؤں۔ ہاں البتہ اتنا بتا ملتا ہوں کہ یہ علاقہ کبھی شہر کے وسط میں ہے اور بہت گنجان ہے اور اس علاقے میں زیادہ تر اوسط اور پچھلا طبقہ ہی آباد ہے۔ بہت مل چڑھا ہی جا رہا ہے۔ لیکن میرے کزن اجمال احمد نے حال ہی میں اپنے آبائی مکان کو نئے سرے سے نوکری کے بجگے تبدیل کر لیا ہے۔ بس اسی بنگلے میں تمہارے لیے ایک پراسٹش کر مٹھن کرادوں گا۔ باقی اللہ اللہ اور فیصلہ،“ آفتاب نے اس کے سوال کے جواب میں اپنی تفصیل بیان کر دی۔ لیکن معلوم ہو گیا سوچنا رہا۔

”کیوں کیا میرے کزن کے گھر رہنے پر نہیں کوئی اعتراض ہے؟ دیکھو اتنا اطمینان نہ در دلا دیتا ہوں کہ اجمال ایک تو اس گھنٹہ تمہارا ہے دوسرے زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا ہے۔ اس لیے تمہاری پرائیویسی میں کسی کے دخل ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہوگا،“ آفتاب نے اسے خاموش بلکہ کرم سا دیکھ کر پھر کہا۔

اب اسے کیا معلوم تھا کہ اسفند اس وقت اپنے پھوپھا اور پوجی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چند سال پہلے مزنگ کے علاقے میں رہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں یہ خیال بھی گردش کر رہا تھا کہ کہیں وہ دونوں بھی اسی مکان میں زور رہے ہوں۔ تب کا مزہ جانتے پر زور ڈالنے کے باوجود بھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔
”اچھا میں بنگلے میں تمہارا کزن رہتا ہے اس کا کوئی نمبر تو ہوگا؟“ یادداشت کی سطح سے کبھی کے گھر کا نمبر پٹ گیا تھا اس نے آفتاب کی اپنی ساری باتوں کے جواب میں یہ سوال کیا تو آفتاب تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یار مجب کرم کے لڑو قمر کی چیز ہو گئے ہو۔ بھلا ایسا کون سا گھر ہو سکتا ہے جس کا کوئی نمبر ہوگا۔ اور پھر نہیں آج کے گھر کے نمبر کیا ہوگا۔“ اور اس کی بات پر وہ بھی خیالوں کی دنیا سے نکل کر ایک دم حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

”اوہ۔ ہاں ہاں واقعی مجھے کیا سروکار۔ میں نے تو بس ویسے ہی باقی داوے ہی پوچھ لیا تھا،“ وہ گڑبڑا کر بولا۔
”یار۔ ایک ضرورت تبدیلی دیکھ رہا ہوں تمہارے مزاج اور انداز میں گم کر گیا یہ وقت کی تھکامات سالہ گردش نے پہل کی

سے پھر کسی مردوش اور نہ جین کی محبت نے جو بیٹھے بیٹھے ایک دم ہی کہیں کھوے جاتے ہو۔ بات بھی کرتے ہو تو غیر جانبدار مافی سامانہ۔ ویسے شے ہے کہ الہ الذی نہ اللہ ہی آخر کیا پکڑے؟“ آفتاب نے تعجب اور تجسس کی ملی جلی کیفیت میں سر کھینچ کر اس کے لہجہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے آخری فقرے کہہ کر گویا اسفند کی کھنٹی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا جس سے اسے تکلیف تو بہت پہنچی لیکن اس نے ایک عجیب سی مسکان اپنے مونوں پر سماتے ہوئے کہا۔

”تمہارا سر۔۔۔ ورنہ بھلا میرے ساتھ کیا جگہ ہو سکتا ہے۔ کبھی بڑی سیدی اور صاف ستھری زندگی ہے اپنی تو۔“
”اچھا تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ آفتاب کو تو اس سے ہو مل نے نکالنے کی ہی پڑی تھی۔
”کیسا فیصلہ،“ اس نے پوچھا۔

”مجھے وہی مزنگ میں شفٹ ہو جانے کا،“ آفتاب اس کے چند رانے پر بھلا کر بولا۔

”میں نے مزنگ میں رہوں یا یہاں میرے لیے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور پھر جب پھر روز سے پہلی رہ رہا ہوں
مزید دو عین روز گزارنے میں حرج ہی کیا ہوگا؟“ اسفند بولا۔

”ہونہر حرج ہی کیا ہوگا۔ پانچ صد روپے کرے کے اور ڈیڑھ دو سو روپے اوپر کے اخراجات کے گویا مزید دو سو روپے
نہیں بھی میں تمہیں ایسی عیاشی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ اماں تاروں کا خزانہ بھی تو اتنی عیاشی میں خالی ہو جائے گا
سیدھی طرح ابھی اور اس وقت مزنگ والے گھر میں شفت ہو جاؤ؟ آفتاب اپنی بات پر اڑ کر بولا۔

”ارے نہیں یار۔ اب میں ایسی عیاشی بھی نہیں کر رہا اور پھر پیسہ خرچ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ کوئی انسان اسے اپنے
قبر میں تو نہیں لے جاتا؟“ اسفند نے اس کی بات کو لاپرواہی میں اڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں قبر میں تو نہیں لے جاتا لیکن یوں پانی کی طرح بھی نہیں بہا نا ہے جیسے کہ تم بہا رہے ہو۔ یوں مذہب بھی اتنی فضول شے
جائز نہیں رخصلے اپنے بندے کو میاں دروئی اختیار کرنے کی جگہ جگہ تکفین کی ہے؟ آفتاب اسے قائل کرنے کی کوشش سے ارشاد دیتا تھا
کا حوالہ دیتا ہوا بولا۔

”پانی پانی جو ذکر رکھنے اور پیسہ خرچ نہ کرنے والوں کے لیے بھی ایک پوری سورت اتاری گئی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو کچل کر
گیا ہے اور بخل کرنے والوں کو خدا بالکل پسند نہیں فرماتا۔ جگہ جگہ ایسے لوگوں کی مذمت ہی نہیں کی گئی بلکہ انہیں بکلی کرنے سے باز رکھنے
کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ رہا فضول خرچ کا سوال تو فضول خرچ کی تو وہ ہوتی ہے جو انسان اپنی بساط اور اوقات سے بڑھ کر اپنے پیسے کا
زیاں کرتا ہے یا پھر بکرا اور واپیا ت چیزوں پر اپنا پیسہ لٹا دے۔ مثلاً دیر پر۔ لاٹری پر۔ ویڈیو گیمز پر۔ موٹر کار
شادی بیاہ اور دیگر بہت سی تقریبات میں جو اہمیت اور فخر ہوتا ہے۔ مانتے ہو تو ہیں اس پر۔ ناچنے گانے والوں پر کھانا اور ڈیڑھ
میں درمیان اپنا خیال تو یہ ہے کہ اگر انسان کو اپنی جیب پر گرائی۔ زیر باری اور فخر و پریشانی کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنی ضروریات
پر یعنی چاہے رقم خرچ کر چکا ہے۔ اب بھی یہ دیکھ لو۔ میں صرف بد ضروریات پر ہی پیسہ خرچ کرتا ہوں۔ خالصتاً اہل پرہیزگار
اسفند نے ایک تقریر کی صورت میں اپنی بات کہی تو آفتاب نے یوں غلام کر لیا جیسے اس کی بات تو جبر سے سنی ہی نہ ہو۔
”غیر متاثرانظر ہو بھی سہی لیکن میں تمہارا دوست ہوں اور تمہارے کسی بھی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے کہ
رہا تھا۔ اب تم مزنگ والے بنگلے میں جاتے پر تیار نہیں ہو تو ہمیں زیر دوستی اٹھا کر تو نہیں لے جا سکتا؟ آفتاب کا انداز ایسا
تھا جیسے وہ برا مان گیا ہو۔

”ارے آفتاب یار۔ میں نے انکار کیا ہے۔ تم مجھے مزنگ سے لے جانا ہے پھر بد ضروریات میں چلا جاؤں گا؟“ اسفند نے آفتاب
کی توقع کے خلاف مزنگ چلنے پر آمادگی کا اظہار کیا تو آفتاب خوش ہو کر اس کے پیٹنے پر ہاتھ مار کر بولا۔
”ارے جو جو میرے پیٹے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔

”اچھا اچھا بڑا گوار مرنگ تو بعد میں چلین گئے اس وقت تو تم ہمارے ساتھ ذرا سیر پاٹے کو چلو۔ کہو کہ آج کے دن کا
کرایہ کل صبح آٹھ بجے تک پورا ہوگا۔ اتنے تم میرے کمرے کی بھاری پونچھ کر دو لے جانا۔“ اسفند ایک دم چیخاں مابو بولا۔
”ہاں ہاں خوب سمجھے۔ اور تمہاری اطلاع کو اس وقت ماہ دولت جب میں باہل قدم ریزہ زبانی آئے تھے۔ لہذا اگر شاہد
اور منگل پورہ سے بھی آئے جلتے کا ارادہ ہے تو بلا خوف و خطر چل پڑو؟“ آفتاب بولا۔ کہہ دلا کہ کر کے دونوں دست و پا
سے باہر نکل آئے۔

پھر دونوں بڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے اور رات کے آٹھ بجے واپس لوٹے۔ اسفند نے آفتاب کو اپنے اصل
رات کا کھانا ہول میں ہی کھلایا۔ اور جب کوئی دس بجے کے بعد آفتاب اٹھ کر اپنے کمرے واپس چلا گیا تو لباس تبدیل کر
کے بستر پر لیٹنے کے بعد اسفند کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ کہہ دماغ تو اس کا اسی وقت نے اچھا ہوا تھا جب آفتاب نے
اسے مزنگ کے ایک بنگلے میں منتقل ہو جانے کی پیشکش کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اتنی دیر تک ٹھہرتا رہا تھا تو اس سامنے
عرصے میں اور اس وقت بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اپنے حلقہ پر زور دینے کی کوشش میں مصروف رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی
اپنی پیچھے کے مکان کا نظریہ نہیں اڑا رہا تھا۔ حالانکہ انگلستان میں اپنی رہائش کے دوران اسے اپنی پیچھے کے ملک کی طرف سے دوغلی

”بہت سے جن کا اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب بھی دے دیا تھا لیکن چونکہ پچھلے خط کا جواب دیے کئی سال
پہلے اس لیے ان کے گھر کا ہنر فتن سے محو ہو گیا تھا۔

”بہت سے جن کا اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب بھی دے دیا تھا لیکن چونکہ پچھلے خط کا جواب دیے کئی سال
پہلے اس لیے ان کے گھر کا ہنر فتن سے محو ہو گیا تھا۔

”بہت سے جن کا اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب بھی دے دیا تھا لیکن چونکہ پچھلے خط کا جواب دیے کئی سال
پہلے اس لیے ان کے گھر کا ہنر فتن سے محو ہو گیا تھا۔

”بہت سے جن کا اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب بھی دے دیا تھا لیکن چونکہ پچھلے خط کا جواب دیے کئی سال
پہلے اس لیے ان کے گھر کا ہنر فتن سے محو ہو گیا تھا۔

”بہت سے جن کا اس نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب بھی دے دیا تھا لیکن چونکہ پچھلے خط کا جواب دیے کئی سال
پہلے اس لیے ان کے گھر کا ہنر فتن سے محو ہو گیا تھا۔

ان قیدی سے گزرتے ہوئے غلوں میں اس شخص نے بھی اس کی طرف بڑے تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔ اور اس شخص کی نظروں میں پہچان کے سائے سے بھی ہارے تھے بلکہ اسفند سے اس کی نظریں بھی چار ہوئی تھیں۔ مگر اسفند جوں کی ہی چھو پہچان کر اس کی طرف بڑھا۔ اُس نے نظریں ہی نہیں کُڑائیں بلکہ منہ بھی دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر چونکا اسفند قدم بڑھا کر کشش کی طرف بڑھا۔ کشش تو قسمت سے سبز پتی روشن ہو گئی اور درکشہ لالائیزی سے دلکش کو بھگا گیا ہوا اُٹنے لے گیا۔ اور اس اسفند کاغیر درکشہ سے کہہ کر چلے جانے میں ذرا سی کسر ہو گئی۔ اسفند جلدی سے ہٹ کر بیٹھ پاتا پڑ پڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر وہاں کھڑا ہی سوچتا رہا کہ کس کیسے کہہ اور شخص تو نہیں تھا جو چھو پھاسے اتنی زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔

بے قہار ہے اور پھر اسے ایران اور مغرب سا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اصل میں وہ چودا ہا جس پر وہ واقف تھا۔ جانے وقت بھی اس کے لئے قہار ہے۔ اور کشتہ والا پتلی سی سرخوں کے موڑ کا نشانہ ہوا اس طرف سے نکلا تھا۔ اور چونکہ کشتہ کا سفر اس کے لئے ایک نیا شے ہے۔ اس لئے اس نے بالکل دھیان ہی نہیں اور دیا تھا کہ وہ اسے کن کن راستوں سے نکال کر لے گیا تھا۔ وہ تو کچھ آگے جا کر قسمت تو خفا ہی ہے اسے یہ دیکھ لیا تھا۔ اور دیکھا کہ اس کے پاس آگیا تھا۔ تو اس کے ساتھ ہی بڑی آسانی سے گھر پہنچ گیا تھا۔ یہ حال احمد کے وزیر سیکنڈ ٹریٹا۔

بہنہ زادہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ عالمی طور پر بالکل فطاش تھا۔ اس صورت حال میں اگر بے چارہ پر مقدمہ بھی چلا تو انکا نقصان ہی ہوتا۔ جب کہ دوسرے کاربے دار سے بھی میں کیس لڑ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس اسمگلر سے مکان خالی کرنے کی ایک سوچ بھی۔“

[illegible]

میںوں افسوس کی اس میں کیا بات ہے بیٹھی، آپ کا ذاتی مکان تھا کہ آپ ہر طرح سے اسے خالی کرانے میں کوشش کرتے تھے۔ کوئی ساری زندگی تو کمرائے دار کرانے کے مکان ہر قبضہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔" اسفند نے گویا یہ کہانیاں کو اٹھے برعکاس کیا۔

ہاں جھلا دیجیے کرارہ وار کر کہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے کے مکان پر قابض ہو کر بیٹھ جائے۔ اس لیے میں نے ایک بہت بھور و کورہ حال چلی تھی۔ میں نے اس کے گروہ کے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ قائم کر کے کہ ہفت میں خدان جگر تھکے تھے کہ گھر کا پانچواں تہن بتا دیا تھا اور یہی سوچ کر بتایا تھا کہ وہ لوگ جو بنی اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے ان کے دوسرے وہ خود ہی مکان چھوڑ کر جھگال جائے گا لیکن مجھے یہ اندازہ بالکل تھا۔ اگر بارہ دہشتیں کھنے والوں کی منتیں اور عزائم اس قدر ناپاک ہوتے ہیں۔ ان بدلتوں نے صرف اسے چاہوں طرف سے گھر یا ملک اس کی حران میں بر بھی ہاتھ فٹانے کی کوشش کی۔ ایک رات اس کے گھر میں غنڈے کترو ادبے ہوئے کو آٹھا کر لے جانا ہی چاہتے تھے کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا اور اسے فائر کر کے ان غنڈوں کو کھینچا۔ وہ لوگ واقعے کے تیسرے ہی دن لڑکی اچانک ہی کہیں غائب ہو گئی۔ اور شاید اس غم میں وہ اگلے ہی روز چپ چاپ مکان خالی کر کے چلا گیا۔ گو یہ آخری فقرے اجمال نے بڑی خجالت اور تاسف سے کہے تھے لیکن اسفند نے اس کے لب و لہجے پر بالکل دھیان نہیں دیا بلکہ اس کے ذہن میں تو اس کے بابا شرافت کے کچے یہ فقرے گونج رہے تھے۔

ایک بات ذہن میں ضرور رکھ لیجئے نئے صاحب کو نند اور بھابھ کے رشتے میں قبلی کی کاٹ ہوتی ہے جھوٹی بھابھ (نند) نے بھابھ کو بتایا ہے وہ بھابھ کو کہہ دینا ہے ہمارے ذہن کو نہیں۔ اب اس میں کوئی بات سچ ہے اور جھوٹی ہے تو وہ نیلی جھوٹی والہی جانتا ہے کہ اور بابا شرافت کے ان فقروں کی بازگشت کے ساتھ یہاں رہنے سے ایک بوجھ سا اثر عامر ہو رہا تھا۔

”ہا ہوا تو کیا وہ اس مسئلہ پر شہری چھوڑ گیا؟ اس نے یوں پوچھا جیسے اجمال کی باتوں میں بہت دلچسپی لے رہا ہو۔
 ”ملا رہے ہیں لاہور سے بھی کہیں چلا گیا ہو گا جو دو برس ہوئے تو آئے آج تک پوچھ کر بھی نظری نہیں آیا۔“ اجمال
 نے اندھڑی کانٹا پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر اس نے کہا۔

”اے دلجو! کچ رہا ہے۔ کمال ہے باتوں میں وقت گزرنے کا! حساس ہی نہیں ہوا اور باتیں بھی ایسی غیر متعلقہ —
 ہنسی کیا سوچ رہے ہوں گے کہ یہ مخصوص پورے پوری گفتار سے بھر کر نہ بڑھکا ہو اسے۔“
 ”اے سہیلیاں! بزرگ کا کیا سچے کو آپ کی دلچسپ باتوں نے بہت متعلقہ کیا ہے سطر اجمال!“ وہ خوش دلی کا
 جواب نہ کہہ کر کھنکھولے۔

تاریخ طبرستان کے ایک ہی دور زندہ کس لائق :- اجمال نے سسکا کر کہا اور پھر اٹھتا ہوا بولا :- تھوڑی دیر کے لیے غارت خانہ جوں کا تو اصل میں کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور جا کر دیکھ لوں پھر آپ کو کھانے کی میز تک زحمت دونوں کا اٹھانہ تو شکر ہے ۔ آپ بائبل تکلف نہ کریں ۔ مجھے اس وقت درسی بھی اشتہا نہیں ہے کچھ بھی کھانے کی ۔ اسے اسفند تو تکلف سے کام لیتا ہوا ایلا و اجمال نے بڑی شامی نظر وں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ۔

کمال ہے اسفند صاحب۔! آپ اس قدر تکلف سے کام لے رہے ہیں درودہ آپ کا دوست اُن صاحب ہونے پر افسوس کرتے ہیں انہیں بلکہ تنگ دل بھی ہے اگر آپ اس کے یار ہیں تو ہم یاروں کے یار ہیں۔ سپریم غریبیت سے کام لیتے ہیں آپ۔ یا آپ اگر بہت مقوی اور مرنے والے کھانے کے عادی ہیں تو حکم کیجیے وہ بھی منظور تیار کروالیں گے۔

اے سر کون شرمندہ کرتے ہیں آپ۔ آپ میں کوئی آسمان سے تو نہیں اُتراسیجھا سادھا سا آدمی سا آدمی ہوں۔ میرے خود کو کدوہ خوراک کا کبھی خور نہیں بنایا بلکہ دال اور چٹنی بھی مل جانے تو صبر و شکر کے کھا لیتا ہوں۔ "احمال کے پناہ پر بھرے شکوے پر اسفند جھینپ کر بولا۔

"ہا ہا ہا۔ دال اور چٹنی۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی کبر نفسی سے کام لینے کے عادی ہیں آپ۔ تو چلے یہی مگر ان کے طرح اس عزت کدے پر کھانا نہ کھانے کی قسم تو تو زہری دیکھیے آپ "احمال اس کی بات پر ایک ہتھ پر لگا کر بولا اور اسی آتا ہوں کہہ کر اس کے رہائشی کمرے سے نکل گیا۔

اور اس کے جاتے ہی اسفند پھر اس کی رہائی مانی۔ ہاتوں پر غور کرنے لگا۔ اپنی چھو بھوک اتنا زیادہ غلط بیانی پران کے لیے اس کے دل میں جو ایک خاص مقام تھا وہ بھی اس کی نظروں سے گر گیا۔ اور چھو بھوکے خلاف مال کی وہ مانی باتیں سچ نظر آنے لگیں جو اکثر وہ پیشہ وہ اس سامنے ڈھرائی رتی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی چھو بھوکے پاس ملے اور ان کی اس قدر گری ہوئی باتوں یا سننے دیگر لازم تراشی پر انہیں خوب ملامت کرے۔ مگر چھو بھوکے پاس سنا سنا آسان تو نہ تھا۔ اور اجمالی نے تو چھو بھوکا اور چھو بھوکا ہارے ہیں۔ یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے ہی نہیں لاہور سے ہی چلے گئے ہیں لیکن یہ بات وہ جیسے مان لیتا تھا جب چند گھنٹے پیشتر اس نے اپنی آنکھوں سے چھو بھوکا بہت قریب سے رکھتے میٹھا ہوا دیکھا تھا اور یہ سوچتا تو اس کی حماقت تھی کہ وہ شخص چھو بھوکا بمشکل تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھو بھوکا لاہور میں ہی موجود ہیں۔ مگر کہاں، اس سوال کا جواب دینا واقعی ممکن تھا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ملازم اسے کھانے پر بلا لے گا۔ اور اسے بالکل خوشحال اجمالی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہی پڑا۔

جب کہ وہ اس پر زیادہ بوجھ ڈالنے کے بالکل حق میں نہ تھا کہ اس کے یہاں قیام کرنا ہی کیا ممکن تھا۔ بہر حال، کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے رہائشی کمرے میں آیا تو چھو بھوکے کے بجائے تمام وقت چھو بھوکا اُٹا ہوا معلوم کرنے کے بارے میں ہی سوچتا رہا کیونکہ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی کہ وہ سے مار رہا تھا کہ کہیں سولہ لوگ کہ انہی کے پاس نہ آگئی ہو درودہ جا کھان سکتی ہے اور جہاں تک وہ دیکھ کے اسے تلاش کرنے کا سوال تھا تو وہ اپنی خوشی میں اب تک کامیاب ہی نہ ہو سکے ہوں گے۔ ہاں جیلا اپنے غدار اور پرہیزگار کراچی شہر میں کسی کو ڈھونڈنا کتنا ممکن ہی کہاں ہے۔ وہ تو اگر خدا خواست چھو بھوکے پاس نہیں پہنچے ہوگی۔ تو پھر یقیناً بہت غلط فہمیاں میں پہنچ کر ہی نہ آئے ایک بڑی اور خوبصورت بلکہ بے یار و مددگار لڑکی جب کہ اسے قدم نکالنے سے تو اسے جلی بوشاکوں کے اندر چھپنے بیٹھنے کے آسانانہ خوراک نہ پالتے ہیں اور اگر وہ چھو بھوکے پاس واپس نہیں پہنچے ہوگی تو یقیناً کسی طرح اور باقی شخص کی ہوں کا شکار بن کر ہوگی اور اسے آبرو کرنے کا ذمہ دار ہیں ہوں گا۔ میں۔

نہیں نہیں۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ لاہور میں میرے قیام کی مدت چاہے کتنی ہی بڑھ جائے۔ میں چھو بھوکا کو کھون کر ہی رہوں گا۔ میری سب سوچتے اور پتہ کرتے اسے جتنا تک نہیں چلا کر کتنا وقت گزر چکے ہیں۔ اس کی عمریت تو اس وقت وقتی جب چھو بھوکا ملازم چائے کی ٹرے ہاتھوں میں لائے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چائے کی ٹرے سینئر ٹیبل پر رکھی تو اسفند نے اپنی عمریت سے جو تک کر کہا۔

یہ تم میری چائے یہاں کیوں لے آئے۔ جیسے کہہ دیتے تو میں اندر آکر تمہارے صاحب کے ساتھ بی بیٹا۔ "پرچی چھوٹے میال کو کھنڈہ ہوا کہیں باہر چلے گئے ہیں اور جی آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کو اندر بلائے کیا تکلیف دہی تھی۔ ملازم نے من کا نام شرمندہ عرف شیرا تھا جواب میں کہا اور پھر چھک کر اس کے لیے بیالی میں جانے لکھنے لگا۔

نیکوئی پاؤں جی۔ اس نے بوجھا۔

اسفند بولا۔ تو اس نے بیالی میں دو دو اور چینی ڈال کر سینئر ٹیبل کو تھوڑا سا آگے کر کے چائے کی پیالی کے قریب سے بٹھے۔

آپ کچھ کھائیں وی نا صاحب جی۔ یہ بسکٹ اور شامی کباب۔ کچھ تولیں ناں جی۔ "نہیں میں پیچھے ہی کافی ہے۔ وہ تروٹے سے انداز میں بولا کہ ایک تو سر پر کچھ کھائے کچھ کھانے کا عادی نہ تھا۔ اسے اس کا ذہن اس سے سخت الجھا ہوا تھا۔ ملازم نے کچھ نہیں کہا۔ اور بیسیلوں کو باہر جھڑکھڑکھڑا کر کھڑا ہوا۔ جب کہ اس کا اس طرح۔ سرور ہونا اسفند کو بہت کھٹا۔ وہ چائے کے چند گھونٹ حلق سے اُٹارنے کے بعد بڑی اُفرت دیکھ کر بولا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے پڑنے ملازم ہو۔ بہت ہی بے شکا سا سوال تھا پھر بھی شیرا ایک دم پھر ڈک ہی اٹھا اور زبردستی بولا۔

ابھی صاحب جی پرانا ملازم کیسا میں نے کیا میرا تے بوجھی اسی گھار بچہ پیدا ہو یا سی۔ اسے جڑا اچھوٹے میال جی ہے نا میں نے ان میں سے کو کھلا ہے۔ اس نے آدھی آدھی رو دیا آدھی بھائی میں بتایا۔ گواں کی بات ابھی طرح اسفند کے پلٹے نہیں پہنچے۔ مگر کچھ ہی دیر میں اس کے تحت اسفند کے ذہن میں ایک خیال کونما۔ بات تو اس نے غصے سے اسے ٹھٹھانے کی غرض سے فرمائی تھی۔ مگر جب ملازم کی رہائی اسے یہ معلوم ہوا کہ اجمالی احمد کے گھر کا درودہ ہے تو اس نے اپنے اس خیال کے تحت اس کے اس کی ذات میں دلچسپی لیتے ہوئے تھوڑا سا مسکرا کر کہا۔

اجالہام گویا تم اس گھر کے شیشی تک خواہو۔ اب بات خواہ شیرا کے پلے بڑی یا نہ بڑی مگر اس نے اپنی ساری۔ نہیں نکال کر ان میں سے سر ہل دیا۔ اسفند کچھ دیر تک تو یہی سوچتا رہا کہ جو بات وہ چھو بھوکا بتاتا ہے اس کی ابتدا کیسے کرے۔ ی ان میں چائے کی پیالی میں چھو بھوکا تھی جس کی کچھ وجہ یہ تھی کہ شیرا نے اس کی پیالی میں فرج کا ٹیڑا اور دو ڈالا تھا۔ اس نے چائے کو شہزی ہو گئی تھی۔ جسے اسفند حسب عادت آہستہ آہستہ پینے کے بجائے جلد ہی پی گیا تھا۔ اس نے پیالی خالی کر کے اسے بھی تو شیرا نے جلدی سے پوچھا۔

جی ایک کپ بور داہر بنا دوں۔ "حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اسی پہلے شیرا کو باتوں میں الجھانے کا فرض اس نے ان بات میں سر ہل دیا۔ شیرا نے اس کی پیالی کے بجائے دوسری صاف شہزی پیالی میں جلدی جلدی اس کے لیے چائے انڈلی اور پھر بڑے ادب سے اس کے ہاتھوں میں چائے کا کپ تھا دیا۔

بھٹکا تو ابھی نیا نیا ہی بنا ہے۔ "اس نے پوچھا۔

ہاں جی نواں نواں ہی بنا ہے۔ یہ لگے تے ایک مکان جی سی۔ "شیرا نے بتایا۔

اچھا اچھا۔ تو گویا مکان کو توڑ کر بھٹکا تو کیا گیا ہے اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ پلاٹ وغیرہ پر بنا گیا ہو گا۔ "اسفند بولا۔

نئی۔ پلاٹ ولات کیسا۔ اسے تے چھوٹے میال جی کے دادا کا گھر سی۔ براہر آگے والے پورٹ میں چھوٹے میال جی ہونا ہونا ہی۔ پچھلے دو کمرے اوس نے کرائے سے چڑھا ہے ہوئے تھے۔ جی دو دو رولا بیسی مکان کا کچہ (قبضہ) چھوٹے۔ نامش کی چھوٹے میال جی نے علامت میں پورے ایک سال۔ تب جا کر مکان کا کچہ (قبضہ) ملائی چھوٹے میال جی نے۔ چھوٹے میال جی کے۔

اچھا دوسرے کرائے دار نے بھی بڑی مشکل سے گھر خالی کیا ہو گا کہ اسفند اب اصل مقاصد کی طرف آتا ہوا بولا۔

نئی۔ وہ تو ڈرا شہر (شریف) بندہ سی۔ بالکل بکری چھیا۔ اس نے کیا جگہ (جگہ) کرنا تھا۔ اوس نے چھوٹے میال جی نے درودہ کا کے پھلوں ہی جھکا دیا سی۔

چھو بھوکا صاحب نے یہ اچھا ہی کیا کیونکہ وہ اچھا ہی تھا۔ اور اسے لوگوں کو گھر میں رکھنے سے انسان بہت ہی مشکل تھا۔ مگر کیا وہ تنہا ہی رہتا تھا۔ "اسفند نے شیرا سے مزید باتیں اگلو اسے کی غرض سے بڑی چالاکی سے کام لے کر چھوٹے میال جی سے پوچھا۔

نئی جی دوڑنا نیاں وی میں اس کے ساتھ۔ ہیک اس کی دانی (دیوی) سی تے ہیک بھین۔ پرچی ڈوی شہر

353

اور عجب (عزت) والیاں عقین و دلاں گھر سے باہر قدم نکالنا۔ نہ کسی سے ملنا جلتا۔ بس اپنے کام سے کارباز
برائے کی جبین (دین) و دی سوئی (خوبصورت) سی۔ ایسی سوئی جیسی رانیاں ہوندی ہیں۔ جسے نمایاں گھر سے اس کی
کھدھوئی (خوبصورتی) سے فیذا (خاندانہ) ٹھایا۔ اپنے دو چار بندے اکٹھا کر کے اس کے گھر وچ کدوا دیے۔ اور بس
بات سے ذکر وہ مکان چھوڑ کے سن گیا (بھاگ گیا)۔ پرچی چھوٹے میاں جی وڈا نیک بندہ ہے اس نے کسی ہی پشت
نہیں کدواے تھے اپنے بندے۔ "شیرا نے اپنی آپ سب کچھ اگل دیا۔
"ہاں ہاں ظاہر ہے۔ اجمال صاحب تو بہت ہی ڈسینٹ آدمی ہیں اور بہت ہی مہمان نواز۔ مگر کیا وہ ان کے
چھوڑ کر ہی چلا گیا۔"

"جی صاحب جی۔ اسے اسمگلر کو نہ کہیں۔ وہ بے چارے خود اسمگلروں کے چھندے میں پھنس گیا سی۔ شہر ہی
جی اسمگلر جہاں اسے غریب دی ہوندے ہیں۔ جتنا کہ وہ تھا۔ پورے دو دن وہ لپکڑا ہوا رہا۔ چھندے کے نہیں گیا۔ وہ نے
پورہ میں رہندا اسے۔ پر میرے سوا کسی لڑکی ہی پتا نہیں کہ کدھر رہندا اسے۔ چھوٹے میاں جی فون دی تھیں۔ "شیرا
نے آخری فقرہ بڑی زار دار انداز میں بتایا۔ تو گویا اسمگلر کی باجیں کھل گئیں۔

مگر۔ اپنی خوشی کو اس نے شیرا پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔
"لیکن اس ہی اہم قدر زار داری سے کام لینے کی کیا بات ہے جو تم نے اپنے چھوٹے میاں جی سے بھی اس بات کو چھپی
رکھا ہے۔" اسمگلر نے بولہ کی بات کا سلسلہ جاری رکھنے کی غرض سے پوچھا۔

"جی وہ بتانے کی کلفت نہیں ہے۔ پر شی آ کھدے کہتے، اوتے فیر تانا ای پڑیں گا۔ وہ جیڑی اس کی جبین
سی۔ وڈی بدنامی ہوئی سی اس دی۔ ایس غلے وچ کہ وہ دے چارہ منہ چھپا کے ویٹھ (بیٹھ) گیا تھئے فیڈ میں کسی دن
کیا تانا تھا۔ ویسے دی صاحب جی کو فی بندہ کسی کی عیبت ٹکا چھپا کے کھدا ہے اسے اس کا رب بھی اس بند
کی عیبت پر پردہ ڈال دیندا اسے میرے مولا دا چھراں (دھڑل) اسے کہ توں کسی دا اک عیب چھپاے گا۔ میری تری دی
عیباں تے پردہ ڈال دیواں گا۔" شیرا نے یہ آخری فقرے تو بڑے سیدھے سادے انداز میں کہے تھے مگر اسمگلر کے قلب
بران سادگی سے کہے فقرے نے بڑا گہرا اثر کیا کہ اس بے چارے سیدھے سادے اور چارلے شخص کو بھی اتنی بات
ملی تھی کہ نا خواندہ ہوتے ہوئے بھی وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں بات کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بڑے اظہار جلتے گا
تو اس نے کچھ سوچ کر اس سے پوچھا۔

"یہ منغل پورہ آخر بے کس طرف میں تو لاہوری میر کرنے کی غرض سے ہی آیا تھا۔ اور تقریباً پورا لاہوری گھم بھر کر بچ
یا حتی کہ شہیدہ تک بھی ہوا یا۔ مگر منغل پورہ کا نام آج تمہاری زبان سے پہلی بار ہی سن رہے۔"

"وہ جی بس لاہور شہر سے چند کوس آگے ہے۔ پورا شہر آباد ہے ادھر وی۔ پر کوئی ایسی دیکھنے والی نہیں ہے۔
شیرا نے اٹھا کر سدھا ہوتے ہوئے بولا۔

"خیر، پھر بھی ایک علاقہ تو ہے ناں۔ اب کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرو کر نام کو کوئی
میرے ساتھ چل کر مجھے وہ جگہ بھی دکھا دو۔" اسمگلر نے کہا۔ اصل میں وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے ولس کر ایے دارے گھرے
چلو۔ لیکن جھلکے کہتا کہ شیرا کو کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کر ایے دارے اس کی قرابت داری ہے۔

"پر صاحب جی منغل پورہ دی میری کرنی ہے تے چھوٹے میاں جی کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر کر آئیں۔ بعد
کس طرح آپ کے ساتھ جاسکا ہوں۔" اس کی بات پر شیرا کچھ بدک گیا۔

"اسے نہیں بھائی، اب میں اتنی سی بات کہے لیے اجمال صاحب کو تو ہرگز زحمت نہیں دوں گا۔ ہاں البتہ
کی کار خود ڈرا ٹیوکر کے کہتے منغل پورے جیوں گا۔ اور پھر جب سے آیا ہوں میں نے تم کو کچھ بھی نہیں دیا۔ حالانکہ
کتھے دل اور مستدی سے میرے کام کرتے رہے ہو۔ ساتھ کے ساتھ تمہیں تھوڑی سی شاپنگ بھی کرادوں گا۔ کیوں نہیں
ہے ناں؟" اسمگلر نے گویا اسے انعام و اکرام کا لالچ دیا۔
"اچھی نہیں صاحب جی! آپ کی وڈی (بڑی) مہربانی۔ آپ تے ملائے مہمان ہیں جس کربا ب کر لیندے تے۔"

یہ میرے لیے سب تے وڈا انعام اسے۔ "میرا دو دنوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر بڑے فدا یا نہ انداز میں بولا۔
"خیر، صرف خالی خولی نہیں کربا ب کر کے تو کام نہیں چلتا۔ ہم تو نہیں کوئی نہ کوئی انعام دے کر دیں گے۔
بس تم نام کو اپنے سارے کام منہ سے کہے بعد تیار ہو جانا۔ ادراہ جاڈیہ ٹرے یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔" اسفند
کھڑا ہوا بولا تو چٹکا جی۔ "کہہ کر شیرا نے ٹرے اٹھائی اور خاموشی سے کمرے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی لیسٹ وچ میں وقت دیکھا تو معا سے یاد آکر آفتاب بس گھنٹہ آدھا گھنٹہ
ہیں بیٹھی ہی والہ ہوگا۔ پہلے سوچا کہ اسے ساری بات بتائے مگر کچھ خیال آیا کہ جھوپیا کی شہرت اچھی نہیں ہے اور اس کا یہی
"دو گھر ٹو میاں ہے جس سے کسی دوسرے انسان کو آگاہ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے ادھر اس پر منغل پورہ جاتے ہی
جس سوچتی۔ اور اس سے سپر ڈھل رہی تھی۔ اور ابھی منغل پورہ جاتے ہیں بھی تین گھنٹے باقی تھے۔ اس لیے اس نے بیٹے سے
نوٹ آکر جلدی جلدی پتا اور پھر آفتاب کے آکر بیٹے جاتے تک کا وقت گزارنے کے لیے وہ جھپٹے جھپٹے اجمال کے سیکلے
سے خامی دور نکل آیا۔ اور اس وقت ادھر ادھر گھومتا رہا جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو گیا کہ آفتاب اگر ادھر تھوڑی دیر
کا انتظار کر کے واپس چلا گیا ہوگا۔

وہ سخت بے چینی میں مبتلا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اگر کچھ جھوپیا تک پہنچ جاتے۔ اس لیے وقت بہت سست رفتاری
سے گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس برائے اس بات پر بھی پورا اطمینان نہیں تھا کہ شیرا واقعی اسے اس کے جھوپیا کے گھر کا پتا
بتا دے گا۔ یوں ہی اس نے شیرا کی باتوں سے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی۔ بات ایسی ضرور تھی جسے شیرا چھپانا
چاہ رہا تھا۔

بہر حال خدا کر کے شام بھی رات میں ڈھل گئی۔ وہ گھر واپس آیا تو اجمال احمد کہیں باہر جانے کے لیے تیار کرنا نظر آیا۔
اس کے ہاں ایک جیب اور دو کپڑے تھیں۔ اسفند بہت مختصر اور خود راد آدمی تھا۔ پھر بھی اپنی ضرورت کے تحت اس نے
اپنی دھاری کوچ کر اجمال سے کہا۔

"مجھے زرا چھڑائی تک جانا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں خود آپ کی کار ڈرائیو کر کے لے جاؤں۔"

"اوہ ہاں ہاں، بعد شوق۔ یار کیوں خواہ خواہ اتنی غیرت سے کام لیتے ہو۔ مہمان کے لیے تو ہم اپنا دل بھی پلیٹ
میں دیکر کا حذر کر دیتے ہیں۔ ایک کار کی کیا حیثیت۔ یہ میری نہیں آپ کی ہے۔" اجمال اتنی اپنائیت اور فراخ دلی کا
ظاہر کرتا ہوا بولا کہ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"واہ ایک طرف کہہ رہے ہو کہ غیرت سے کام لیتے ہو اور دوسری طرف مہمان بھی کہتے ہو۔ بہر حال اسے بنڈل آف
بٹنسس۔" اس نے اپنی شرمندگی اس طرح مٹائی۔

"ہاں ہاں بات تو تم نے بڑے پتے کی کہ ہے۔ بہر حال میرے کار کی چابی۔ باقی باقی بعد میں ہوں گی۔ خاص طور پر
آپ کے بنڈل آف بٹنسس کا ریشن۔" اجمال نے ہنس کر کہا۔ اور چابی اس کے ہاتھ میں تھادی۔

"ادکے سبیر ز۔ بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ پھر ڈرا ساتھ ہی لیں گے۔" اجمال اپنی
کار کی طرف بڑھنے سے پہلے بولا۔

"اچھا سوئی سلائیٹ۔" اسفند نے بھی چابی گھا کر گراج کی طرف کار رخ کرتے ہوئے کہا جس کے باہر ہی دوسری کار
کڑی تھی۔ اجمال تو سی وقت زن سے کار لے آ تھا۔ مگر دوسری کار کے قریب پہنچ کر اسفند کو کچھ دیر تک شیرا کا انتظار
نہ تھا جو ابھی تو جی کہتا ہوا کہ صاحب جی جلدی لوٹ آئے گا کیونکہ میرے کھانا لگانے کی دہائی بھی میرے ہی گھر ہے۔
بہر حال اسے کار میں بیٹھا کہ اسفند نے کار اسٹارٹ کی اور اسی سے منغل پورہ کی سمت اور اس پر پوچھتا ہوا بالآخر
منگل پورہ پہنچ گیا۔ لیکن دیر تک تو ادھر ادھر بلا مقصد کا گھمنا مار رہا تھا اس نے شیرا سے کہا۔

"کیا یہاں کے بازار میں تمہارے طلب کی کوئی چیز مل جائے گی۔ اصل میں کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ ورنہ سب سے
اگر کچھ بازار چلتے۔"

"نہیں نہیں صاحب جی! میوؤں کچھ وی نہیں چلے۔ یوں وی تنخواہ دیندے ہیں چھوٹے میاں جی میوؤں پورے
اور بڑے مہینا۔ بس ایسی بوت لے۔"

”خیر وہ تو تم تمہارے میاں جی تمہیں کام کام معاوضہ دیتے ہیں۔ لیکن میں تو انعام دینا چاہ رہا ہوں۔ ابھانے پر پورے اپنا انعام اور ان روپوں سے جو چیز چاہو خرید لینا۔“ دوران گفتگو ہی اسفند نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پلوہ نکال لیا تھا۔ جسے کھول کر اس نے سو روپے کا ایک کرڑا اور اچلا لٹکا لٹکا کر پھیلا سیدھے میرے حوصلے پر چڑھ کر طرف بڑھانے ہوئے کہا۔

”نہیں جی نہیں میں نے تو نہیں لینا۔ کسی انی تکلیف کیوں کر دے او۔“ کچھ ایسے ہی رسمی سے جھکے کہنے کے بعد گویا ہزار نانا کر سنے کے باوجود دیر لاتے وہ لوٹ اس کے ہاتھ سے لے ہی لیا۔ اور پھر پرجوش انداز میں سیلوٹ کرنے کے سے انداز میں کہا۔

”ابھانے سلام صاحب جی!“ اور اسفند آہستہ سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے دماغ میں اگر طرح طرح کے خیالات کی کچڑی پک رہی تھی۔ تو دل میں بھی طرح طرح کے طے جملے احساسات کی کھد بد ہو رہی تھی۔

ایسے حالات سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوا تھا جن میں زندگی اتفاقات پر ہی منحصر ہو کر رہ گئی ہو۔ ہاں یہ اتفاقات ہی تو تھے جو ایک لڑکے سے بڑا کر رہے تھے۔ اس کا لاہور آنا بھی ایک اتفاقی امر ہی تھا کیونکہ لاہور نے نہیں اس کے کسی ارادے کو دخل نہ تھا۔ پھر اس کے بعد آفتاب چانک اور غیر متوقع طور پر مل جانا کہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر تو وہ اسی روز اسلام آباد جاتے کے لیے پرتول رہا تھا کہ چانک وہ اس نے آگیا۔ پھر اس کا ہونٹ کا قیام چھوڑ کر جمال احمد کے ہاں رہائش اختیار کر لینا۔

پھر پھر چانک کا چانک نظر آ جانا۔

اور جمال کی زبانی پھر پھر کے حالات کا علم ہونا

اور سب سے بڑھ کر شیر محمد کی زبانی یہ معلوم ہونا کہ پھر پھر لاہور میں موجود ہیں اور محل پورہ میں رہتے ہیں۔

ہاں یہ سب اتفاقات ہی تو تھے۔

جو کم از کم اس کی زندگی کو ایک نئے تجربے سے دوچار کر رہے تھے۔

کم از کم اسے یہ تجربہ تو ہو گیا تھا کہ کوئی بات جس کے بارے میں انسان کو ایک ادھیڑ بئی سی لگی ہو۔

اگر قدرت کو منظور ہوتا ہے تو خود بخود کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

جیسے کہ اس کے ساتھ ہوا تھا۔

اسے پھر پھر کے بارے میں ایک جستجو تو لگ گئی تھی لیکن اس میں اس کے کسی ایسے عزم کو کوئی دخل نہ تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈ نہ پھوڑے گا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ وہ اس محلے کے کسی شخص سے ان کے بارے میں معلومات فراہم کرے گا اور یہ معلومات ڈاکٹرانے سے بڑھ کر کوئی بھی فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فی الوقت اسلام آباد جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس پر جمال نے بھی اتنی ساری باتیں کی تھیں مگر ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ لائیے اگر آپ کی سیٹ ہی بک کر لینی ہے تو میں آپ کا یہ مسئلہ حل کروں۔ کچھ اس وجہ سے بھی اسے اس کے ہاں ایک دور واز مزید قیام کا کہا نہ سامل گیا تھا۔

بہر گزیر لاہور کو سو روپے کا لوٹ تھا کہ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا تدبیر کی جائے جو پھر پھر کے گھر تک رسائی ہو سکے۔ اگر اس سے یہ

کہنا کہ مجھے اپنے اس کرانے دار سے ملوانے کے لیے جو تو یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہ ہوتی، شیراز سوچے بغیر نہ رہتا کہ صاحب کی کڑی نگرانی
ملکی ہوئی ہے اس انتہائی بے رحم واسطہ شخص سے۔ آخر بہت سوچ بچ کے بعد اسفند نے اس سے کہا۔
”تم نے تو جیسا کہ چاہتے ہو دیکھ رکھا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ اگر تباہی دل چاہے تو اس انگڑے سے جا کر مل آؤ۔ اتنے میں بھی میں سے پہلے نہ
دیکھ لوں گا۔“

”جی جی۔“ شیراز شاید اس کی پیشکش پر ایک دم عمل درآمد کرنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ یا پھر ایسی کسی بات کا متوقع نہ تھا۔ اس
قدر سے ایک کر کہا۔

”ہاں بھئی، اب بار بار تو تمہیں یہاں آنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ تم اگر چاہو تو چلے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں یہاں سے پکڑ
کر لوں گا۔ میرا مطلب ہے کہ میں بھالوں گا؟ اسفند نے ایک مقام پر حرکت کے کہنا سے کارروک کر کہا۔ شیراز نے کچھ دیر سوچا پھر
دروازہ کھول کر نکل کر آیا۔

”جنگ جی۔“ وہی مہربانی آپ کی۔ دس منٹ پہلے اس جگہ پر آ جاؤں گا۔“
”خیر خیر تم اطمینان رکھو اگر وہاں پہنچنے سے پہلے دس منٹ بھی لگے تو میں تمہارا انتظار کر لوں گا۔“ اس نے غبار
سے کہا اور کار کے ڈرائیو میں آگے بڑھنے پر اس نے کار بھڑکی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

شیراز سڑک پر اس کے مخالف سمت میں بنی ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہی جلدی سے کار کو یورس دے کر اسی گلی میں
اور جب اس لمبی سی گلی کے ایک سرے پر جا کر شیراز نظر سے اوجھل ہو گیا تو وہ کار سے اتر کر بیٹھے بٹے قدم اٹھاتا اسی طرف گیا۔
جس طرح شیراز مڑا تھا۔ وہ بھی ایک تنگ سی گلی تھی جس میں اوپر تلے بڑے بے ڈھب انداز میں کچے پختہ مکانات بنے ہوئے تھے اور
اسی گلی کے آخری سرے پر بنے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا شیراز دستک دے رہا تھا۔ اور اس اسفند کے لیے اتنی جان لینا
کا فی تھا۔ بھوکھلے مکان کی نشاندہی اس نے کر ہی دی تھی، اسی لیے وہ اُسے پیروں چل کر اکسین آ بیٹھا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے
لگا کہ اس وقت شیراز کی موجودگی میں بھوکھلے مکان کے باں جانے کا موقع ہی نہ تھا۔ تو یہ بھی اس کے لیے ایک عجیب وغریب تجربہ ثابت ہوا۔
یہ نہایت غیر متعارف ہی۔ کار سے اتر کر چروں کی طرح شیر محمد کے پیچھے آنے کی حرکت۔ کہ وہ تو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں
سوچ سکتا تھا کہ ایسی کسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ یا پھر اپنی زندگی میں اسے اتنے پیچھے طریقے سے سرفراز کیا کہ تجربے
سے بھی گزرتا پڑے گا۔ گویا ہر بات ہی اس کے لیے نرالی اور انوکھی ثابت ہو رہی تھی۔

بہر حال شیر محمد حسب وعدہ پانچ منٹ بعد ہی واپس آ گیا اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا جلدی سے کار میں بیٹھ گیا اور پھر دلوانا
گھر چلے آئے۔ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ شیر محمد کو دھاپ کر کے وہ پھر مکمل پورہ چلا جائے گا۔ لیکن اجمال احمد اس کے انتظار میں باہر ہی نہیں
رہا تھا۔ اسی لیے اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

مگر گھر روزانہ شے سے فارغ ہوتے ہی وہ جلد جلد تیار ہوا۔ اجمال کی کار کو تصرف میں لانا اسے گوارا نہ ہوا۔ پول بھی وہ جگہ تو کبھی ہی
آیا تھا اس لیے چپ چاپ گھر سے نکل کر باہر آ گیا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر مکمل پورہ کا رخ کیا اور پھر اس
جگہ جہاں کار کو روک کر شیراز کو اتارا تھا ٹیکسی روکی اور کرادیا اور اس کے زیادہ پاچلا ہوا اسی لمبی سی گلی میں داخل ہو گیا۔

بھوکھلے مکان کے گھر کا رخ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی خیال تھا تو کسی کرانے اس قدر اچانک اور غیر متوقع اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا
دیکھ کر بھوکھلی اور بھوکھلی قدر متعجب ہوں گے۔ ممکن ہے پریشان اور شرمندہ بھی ہو جائیں یا پھر میرا اچانک نزول انہیں ناواقف
گزرے۔ خیر جو بھی ہو۔ لیکن کم از کم مجھے اصل واقعات کا علم تو ہوجائے گا۔

یہ تو معلوم ہوجائے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

بس وہ بھوکھلے مکان کے گھر پہنچنے تک یہی سوچتا رہا۔

پھر اس نے دروازے پر پہنچ کر دست سے دستک دی۔

مگر جب بیٹھ کر دیکھا تو کچھ اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دروازے کو بڑی طرح دھڑکھڑایا۔ تب کہیں جا کر دلوانے
کی دوسری طرف سے بھوکھلی لہری ہوئی کسی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”بھئی، کون ہے؟“ بلجے سے بڑی ہی مترشح تھی اور تندہی بھی۔

”میں اسفند ہوں بھوکھلی۔“ اس نے یوں کہا جیسے کسی کو سر پرانہ دیتے وقت بہت لہجہ کر کہا جاتا ہے۔
”ہیں۔“ سچ کو یہ اندر سے دروازہ کھولے بغیر ہی فارخہ بے یقینی کا اظہار کرتی ہوئی پولیں۔

”چچ کی کمرہ ہوں۔“ بلکہ اپنے زندہ وجود میں یہاں موجود ہوں۔ مگر پہلے آپ دروازہ کھولے تو یقین ہی دلاؤں؟ اسفند قد سے
چھٹی انداز میں بولا اور اگلے ہی لمحے فارخہ نے دروازہ کھول دیا اور اپنے لاڈلے بیٹھے کو اپنے بیٹے جاتے وجود میں مسکراتا ہوا
دیکھنے کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

بہر حال اس کے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ شادی مہر کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں۔

اچانک دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ اور یہ تو خوشی کے آسوتھے بیٹے۔ اتنی زیادہ خوشی ملی تھی کہ مجھے شادی مرگ کا گمان ہونے لگا۔ اپنی بات کہتے کہتے آسوتھو چھٹے کے باوجود ان کی آنکھوں سے پیراں نکلوں کی لڑائی سی بہہ نکلیں۔ جن کو جلدی جلدی پوچھ کر انہوں نے فرمایا: ”آؤ۔ اندر آ جاؤ بیٹے۔“ مجھے تو اپنے رونے دھونے میں خیال ہی نہ رہا کہ تم ابھی تک دھڑکنے کے آگے ہی کھڑے ہو۔ اور نہ پوچھو تو میں تمہارے لیے چائے اور ناشتا تیار کروں۔“

”نہیں پچھو بیگم میں چائے اور ناشتے سے فارغ ہو کر آیا ہوں۔ بولیں میں چائے کی پیٹا ہوں۔ آپ سلیف ذکر کریں۔“ وہ اندر شائے پر ہاتھ لگا کر انہیں اندر لے جاتا ہوا بولا۔ صبحی کی کتنا تھا مشکل بارہ مرلے فٹ۔ سامنے ہی ایک رہائشی کوٹھری ٹاکر ہوتا ہوا کھڑی سے ملتی غمگناہ۔ باورچی خانہ اور پھر صبحی کی بائیں جانب بیت الخلا تھا۔

انتہا چھوٹا اور تنگ سا مکان کہ جسے دوسرے معنوں میں انسانوں کی کابک ہی کہا جاسکتا تھا۔

دیواروں پر کاجی کا روغن۔ کمرے میں قدم رکھا تو اس کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔ کہ اس میں فرش پر ایک مٹی کی بری بچی تھی۔ اور وہی پر ایک میل خوری چادر۔ ایک کونے میں صراحی اور ناشتے دان وغیرہ لگاؤ۔ اور دوسرے کونے میں بان کی ایک کھڑی چارپائی دیوار کے ساتھ تکی کھڑی تھی۔

اف۔ تو یہ پچھو کی رہائش گاہ ہے۔ میری اتنی تازہ دم میں ملی۔ نیلی اور وضع دار پچھو کی۔ جو بہت نفاست پسند تھیں۔ بے حد نازک طبع تھیں۔

بلکہ جن کو صفائی ستھرائی کا مینا تھا۔ وہ شل تھی کہ آنکھ میں ہاں آجائے مگر کیا مجال جو گھر یا لباس پر ہلکا سا میل نظر آجائے وہ اس سے ملتی اور تنگ آؤ معمولی سے کپڑے کی سادگی میں بلبلوں تھیں۔ وہ جہ کے گھر کے ملازم بھی اس سے کہیں بہتر حالت میں رہتے تھے اور بہتے ہیں۔

آخر یہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ پچھو بیگم ان حوالوں کو کیسے نہیں؟ جب کہ ان کی ذاتی مالی پوزیشن بھی بڑی مستحکم ہے۔

دلچسپی چوٹوں کی دھمک میں اس نے بہت آدردہ ہو کر سوچا۔ اپنی آگاہی اور عزت پچھو کو اتنی خست و خراب حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سونیاں سی چھینے لگی تھیں۔ شاید راسی وجہ سے وہ ایک دم ہی اپنے تجسس اور تعجب کو زبان نہیں دے سکا تھا۔

اس کوٹھری ٹاکر کے میں داخل ہوتے ہی فاخرہ ایک کر چارپائی کی طرف بڑھیں۔ اور اسے جلدی سے بچا کر گرنے میں پڑے صندوق پر رکھی ہوئی چاقو آٹھا کر چارپائی پر بچھاتا چاہے وہی تھیں کہ اسفند نے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے وہ چاقو لیتے ہوئے کہا۔

”یہ اتنے تکلف سے کام کیوں لے رہی ہیں آپ۔ میں تو آرام سے آپ کے ساتھ یہاں نیچے فرش پر بیٹھوں گا۔“ مگر تم نے تو بھون بھون رکھی ہے۔ فرش پر بیٹھنے میں تمہیں تکلیف ہے۔“

انہوں نے کہنا چاہا تو وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر بولا۔ ”نہیں پچھو بیگم آپ میری تکلیف کی پروا نہ کریں۔ میں ہر ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کا عادی ہوں۔“ اسفند نے جاہم کو بلایا۔

پر کھٹے ہوئے کہا اور پھر اپنا گریٹین پیپ درجواں اتار کر وہی پر بھی ملتی سی سوئی پر بیٹھ گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ساری باتیں ایک ساتھ ہی بوجھ لے۔

سارے سوالات ایک دم ہی کڑا لے اور یہی سوچ رہا تھا کہ بات یا سوالات کی ابتدا کیوں کر کرے کہ فاخرہ نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”ہاں اب بتاؤ۔ گھر میں تو سب خیریت سے ہیں نہ۔ چھوٹے اکا کسے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے بھی کراچی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ اور ہاں وہ ہماری نانوا۔ بیلیا بیسی ہیں۔ اپنے گھر میں خوش تو ہیں تا۔“ انہوں نے ایک دم ہی کئی سوالات کڑا لے تھے۔ اندر ہی اندر طول اور متاسف ہونے کے باوجود وہ قدرے شوخ سا ہو کر بولا۔

”جی ہاں بفضل تعالیٰ گھر میں سب خیریت سے ہیں۔ جی ڈی ڈی اور بنیں سب ہی اور چھوٹے اکا بھی بعد انجی فلی خیر و عافیت سے ہیں۔ جی کہ اماں جان بھی اور ناز و تواپے گھر میں آئی زیادہ خوش ہیں کہ انہوں نے اس خوشی میں اپنے گھر میں ایک فرد کا اضافہ بھی کیا۔“

”ہاں تو کیا خیر سے ناز پر درماں بھی بن گئیں۔“ انہوں نے مسرت آمیز حقیر سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ایک عدد بہت ہی خوبصورت اور پیارے سے بیٹے شاعر احمد کی۔“ اسفند شگفتہ سے لہجے میں بولا۔

”جلد نامہ مبارک کے رقم کو بھی اور ناز کو بھی۔ نام بھی بہت خوبصورت ہے تو مولود کا۔ خدا اسے عہدے۔“ اور اسفند نے ہلکی سی آہیں کھینچ کر کہا کہ بچا جی اسے بھی کچھ کم عزیز تھا۔

”جی ہاں میں آئیں کہا کہ بچا جی اسے بھی کچھ کم عزیز تھا۔ اب شادی کے بعد خصوصاً ماں بن کر تو اور بھی بکھر آئی ہوگی۔“ اس نے صوفیائی کچھو بھی صرف ایک ہی موضوع پر بات کیے جاری ہیں تو ان کی بات کے جواب میں اختصار سے کام لیتا ہوا بولا۔

”جی ہاں ظاہر ہے پچھو بیگم۔ کبھی نہیں آئیں بلکہ کچھ عجیب سی بھی ہوگئی ہیں ماں بن کر۔ لیکن۔“

مگر اس کے غریب سی ہوگئی ہیں کہنے پر فاخرہ بیگم کے نے تاشکی سے ہنسنے پر اسے آگے مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ”واہ عجیب ہو جانے کی بھی خوب ہی تھیں۔“ اسے بیٹھ جیسے دلہنا پہ کا بھین دہن بن کر لڑکی پر آسمان ہے۔ اسی طرح زچگی کا بھی بھین ہوتا ہے۔ پس وہی آیا ہوگا ناز پر۔“

فاخرہ نے ہنس لینے کے بعد کہا۔ ”مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کا تجسس اس سے انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر فاخرہ سے پوچھا۔“

”یہ پچھو چا جان نظر نہیں آ رہے پچھو بیگم کیا کہیں گئے ہوئے ہیں۔“ میاں کے ذکر پر فاخرہ بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزریا۔

”ہاں وہ تو بہت سویرے ناشتا کرنے کے بعد ہی چلے گئے تھے۔“ انہوں نے عجب گھم سے انداز میں جواب دیا۔

”کیوں کیا وہ نہیں ملازمت کر رہے ہیں۔“ اسفند نے ان کے گھر سے جواب پر تھوڑا سا الجھ کر پوچھا۔

”نہیں جیلا ملازمت انہیں کہاں مل سکتی ہے۔ بس ایک مزدوری کام سے شہر گئے ہوئے ہیں۔“ فاخرہ بولیں تو اسفند خاموش سا ہو گیا۔

”مگر تم اپنی سناؤ کیا تم یہاں لاہور میں کسی کام سے آئے ہو۔“ صحاف ظاہر تھا انہوں نے یہ بہرہ کر شوہر کے ذکر سے احتراز کیا تھا۔ اسفند بھی سمجھ گیا اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں۔ کوئی مقصد کار فرما تھا نہ کوئی دوسری مرض و غایت تھی۔ بس یوں کچھ لیجے کہ صرف آپ کی کشش مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی تھی۔ پچھو بیگم یہاں ہر تو میں قدرت کی مصلحتوں اور اتفاقات کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ اب۔ اب ان اتفاقات کو نہ کیجیے جو ابور ہر کچھ پیش آئے کہ میں ٹلر تو انظر کان میں تھا کہ اگر ایک بگڑی دوست زبردستی بولیں کی رہائش ترک کر کے نے زبردستی ترک نہ کیا۔ اپنے ایک کزن شیخ اجمال احمد کے نو تعزیرات میں جہاں میں صرف دو دہائی ہیں گزائیں۔ تیسرے روز اسلام آباد جانے کی عرض سے جہاں کی سیٹ بک کر لے کر اسے نکلا تو راستے میں بہت غیر متوقع اور اتفاقی طور پر مجھے پچھو چا جان نظر آئے۔ اور مجھے تو کیا میسے تو زشتوں کو بھی گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ اجمال کی کرایہ دار روکی ہیں۔ وہ تو واپسی میں حالات سنبھال رہی تھیں کہ کسی کوٹھری کی ساری حقیقت پھر پر عیاں ہوگئی۔ اور میں کسی نہ کسی طرح آپ کا بچا ہنگامہاں تک پہنچ گیا۔“

”ہاں تمہارے پچھو چا جان نے تمہارا ذکر تو کیا تھا۔ مگر تمہیں لاہور میں دیکھ کر وہی سمجھے تھے کہ کسی اور پر انہیں تہا را گمان ہوا ہے۔ ورنہ تم ہی سوچو تمہاری لاہور میں آکر تو انہیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ پوچھو تو میں بھی یہی سمجھتی تھی۔“ پھر فاخرہ بیگم نے غیبت کر کے کہا کہ انہوں نے اپنے آگے کھینچ کر اس سے پوچھا۔

”تمہارے لیے یہاں بناؤں۔“

”نہیں شکر یہ ان اور سکرٹ کا تو میری زندگی میں کوئی گزری نہیں۔“ وہ الجھے الجھے ذہن کے ساتھ بولا۔

پلو یہ تو بہت اچھا ہے۔ فاخرہ نے مسکرا کر کہا۔

361

”جی ہاں وہ تو سب ہی یکنے پھیر چکے تھے سب کیا ہے۔ یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ آخر آپ اور پھر بھائی اسی گلی گلی گھوم رہے ہیں۔“ کیوں ایسی۔“ کیمپری کے حلق میں نظر آ رہے ہیں۔ کیمپری کے دل کو دھچکا سا لگا آپ کو اس غلطی کے بعد اس نے اپنے تئیں ہر تالو نہ پاس کا تو اس نے پوچھ لیا۔ جواب میں فخر نے پانڈن کھول کر صاف میں سے ہاتھ نکالنے کے بعد کہا۔

”ہاں ضرور لگا ہوگا۔ مگر اب تو لوں سمجھو کہ سارے جسم کی سوزیاں نکل گئی ہیں اب صرف آنکھوں کی سوزیاں نکالنی باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”جی۔ میں سمجھا نہیں۔“ پھر پوچھا۔ ”ان کا معاملہ اسفند کے تھے نہ پڑا تو اس نے قدر سے ایک کر لیا۔“

”نہ ہی سمجھو نہ سمجھ رہے ہو۔ کیونکہ جب سمجھنے کا وقت آئے گا تو خود ہی ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔“

فخر نے پھر پانڈن پر تھکا اور چونا لگاتے ہوئے ایک پڑمردہ کی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ ”اسفند کو ان کا یہ سلیلاں کی ٹھکانا اندازاً بالکل نہ بھایا وہ قدر سے چمک کر بولا۔

”کمال ہے پھر پوچھو آپ نے خود ہی تو جسم اور آنکھوں کی سوزیوں کا ذکر چھیڑا اور اب خود ہی اس کی وضاحت سے گزر رہے ہیں۔“

لیکن آپ کی اطلاع کو اتنا بتا دوں کہ میں بھی آپ کے حالات سے کسی حد تک باخبر ہو چکا ہوں۔ یا باشرافت نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔“

”ہاں، یا باشرافت نے تمہیں ایسا کیا بتایا ہے جسکے میری توان سے کوئی گفتگو ہی نہیں ہونی تھی ماسوا اس کے کہ ہم دونوں پاکستان سے باہر جا رہے تھے اس لیے سلوٹ کو کچھ دے کے لیے تھیلے کا کے پاس کراچی بھیج رہے تھے اور بس میں نے تھیلے کا کسے نام ایک خط دے کر بھیج دیا تھا۔ بلکہ ہمیں ملا ہو رہا تھا یا کسی مقصد سے تھا کہ وہ سلوٹ کو اپنے ساتھ کراچی لے جائیں اور توڑ جاتے ہیں تو کھارے پھر چائے جان سی سے بھی زیادہ بات کرنے کے عادی نہیں ہیں اور ان دنوں تو وہ کچھ نفسیاتی پریشان سے ہو رہے تھے پھر بھلا یا باشرافت نے کیسے۔ وہ بات کرتے کرتے ایک دم ہی خاموش ہو کر کھسوٹنے لگے۔

انہوں نے تقریباً کچھ ہی خیریت پوچھی تھی۔ مگر اب تک اشارے بھی سلوٹ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور اسی بات پر اسے حیرت ہی نہیں کوفت بھی ہو رہی تھی۔ اب جو اتنی دیر بعد ان کے منہ سے ایک دم ہی سلوٹ کا نام نکلا تو وہ پہلو بد کر رہ گیا۔ پوچھنا تو یہ تھا کہ

چاہتا تھا۔

کہ آخر اس بیگانگی اور بے شباتی کی وجہ کیا ہے۔

اور یہ شوہر کی بہن سے جلا پہلے کا سب کیا ہو رہا ہے کہ خود اس نے بھی تو اپنی ماں کو پھر پوچھ کے خلاف زہر لگنے دیا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں پوچھ سکا۔

بلکہ فخر نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔

کیونکہ انہوں نے اپنی سوچ سے نکل کر اس کی سوچ پر ایک زندقہ سی ماری۔

”اچھا ابھی۔ اس کا جواب ملے تو نے یا باشرافت سے اتنی سیدھی لگائی ہوگی۔“ درہ میں بھی تو کہوں کہ یا باشرافت کو لگا تو ہونا سے رہا۔ وہ لوں اچھل کر درہ سے بولیں جیسے کسی بہت ہی گہرے راز پر سے پردہ اٹھالیا ہو۔

”یہ بلوکوں سے پھر پوچھو گیم۔“ اسفند نے پوچھا۔

”اے یا باشرافت کا نتیجہ ہے نامراد۔ میں لاہور میں ہی رہتا تھا۔ ہوا کا ہل الوجود ایک نمبر کا۔ یا باشرافت نے ہی خط لکھ کر اسے ہمارے گھر ملازم رکھوایا تھا۔ درہ سا وقت ماں باپ کے سر پر بوجھ بنا بیٹھا تھا ہی رہتا تھا کجبت۔ اب غلطی اس کی سبب لگائی ہو یا باشرافت سے اور انہوں نے اس میں نیک مرچ لگا کر ٹوکوں سے کیا کہا ہو۔“

فخر نے اتنی دیر بعد پانڈن کا کڑوا سا منہ دیکھ کر کہا جواب تک وہ بات میں ہی لیے بیٹھی تھیں۔

”وہ یا باشرافت نے تم لوگوں کو کیا بتایا ہے۔“ انہوں نے پانڈن کے بعد اسے ایک طرف کھینچ کر دیکھ لیا۔

”بس یہی کہ سلوٹ اپنے والد انور پر کھڑے اس وجہ سے پھر پڑے بیٹھی ہیں کہ وہ بوڑھے ہیں۔ اور شاید انہوں نے کوئی اور کچھ بتا کر اس کی وجہ سے انہیں اغوا بھی کیا گیا تھا۔“ اسفند نے بتایا جبکہ کچھ چلائے کی بات اس نے خود اپنے دل

کے کچھ تھے تو نہ۔“ اسفند کر کہاں ہیں۔ یا باشرافت۔“ فخر نے گلے پیٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے کہا۔ ”میں بھی سمجھو گیم۔“ اسفند نے اسفند زانی سے انداز میں کہا۔

”اب وہ تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن کچھ مل گئے تو میں ان کی گدی سے زبان کھینچے بغیر نہ رہوں گی۔“ لوجھلا اتنا ہاتھ اہم اس

علاقہ کی ہے۔ اور یہ لوجھلا تو آج ہی رہتا ہے۔ یہ سچی ہوا اس کی کہاں تو میرا نام بھی فخر نہیں۔“ فخر نے جین جین کی کی کیفیت میں لایا۔

”لیکن اس سے حاصل ہی کیا ہوگا پھر پوچھو گیم۔“ الفنا تو فخر کے سر پر ہاتھ تروں کی طرح ہوتے ہیں جو کان سے نکل جائیں تو

پھر پڑا جاسکتا ہے نہ واپس ترکش میں ہی ڈالا جاسکتا ہے۔“ اسفند انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

”ہاں۔“ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مگر اتنی بے بنیاد باتیں کر کے کسی کو بدنام کرنا وہ بھی ایک نیک اور شریف لڑکی کو

یہ طور پر ہی جائز نہیں اور اب معلوم چھوٹے کا وغیرہ سے بھی یا باشرافت نے کیا کہا ہوگا۔ واقعی بڑی غلطی ہو گئی سلوٹ

ان کے ساتھ کراچی بھیج کر۔ اس سے تو اچھا قیام اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔“ فخر نے پھر پوچھنے کی باتوں پر قائل ہو کر

”کیا درہ اور پھر پوچھو گیم۔“ اس نے پھر طنز سے کہا۔

”ارے نہیں بچے۔ کیسا درہ اور اس کے درہ اور۔“ وہاں تو والد آباؤ جانا ہی دو بھر ہو رہا تھا۔ فخر نے پھر پوچھ لیا۔

”اچھا تو آپ لوگ اللہ آباد گئے تھے۔“ اسفند نے یوں کہا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

”ہاں۔“ مگر کتنے ہی تھے تو کیا کار ہی ہوا تھا وہاں جانا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں تاکہ قسمت میں جو کچھ لکھی ہوئی ہے وہ ہر جگہ

ماننے آتی ہے کہ وہ دنوں سے سفر کی مصوحتیں اٹھائے اللہ آباد پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صاحب معاملے کو بیکار

پڑے بیٹے کے بیان رہائش اختیار کر لی ہے۔ لہذا واپسی کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ پاسپورٹ میں بیکار لکھا تو کہیں

ہم ہی نہ جھگڑا تو ہمیں کام اور نامراد لوٹ رہے تھے کہ قدرت کو خود ہی ہماری حالت زار پر رحم آگیا۔ مگر کے پرانے ملازم نے

ہماری پریشانی پر جواب کر دیا کہ صاحب کو تار دے دیا تھا۔ جس روز ہم واپسی کے لیے پر توڑ رہے تھے اسی روز رانی صاف

خود آ گئے۔“ اپنی روئندہ کہتے کہتے فخر نے کوئی خیال آیا تو وہ اٹھتی ہوئی بولیں۔

”اے بے شایہ بندہ! کتنی ہے۔ بس ایک منٹ ذرا میں جا کر چوہا بچھاؤں۔“

اتنا کہہ کر وہ اس کو غڑھی نما کر کے سے باہر نکل گئیں۔ فخر۔ یہ پھر پوچھو گیم تو میرے منہ کا استعجاب لینے پر تلی ہوئی ہیں۔

ایک تو گفتگو میں اتنی طوالت اس پر چوہا بچھا جانا بھی اچھی نہ کیا تھا اسفند نے ان کے جانے کے بعد سخت ناگواری سے سوچا۔

بارے وہ چوہا بچھا کر جلدی واپس لوٹ آئیں اور آتے ہی بولیں۔

”اے اے مجھے باورچی خانے میں جاتے جاتے خیال آیا کہ تم بھلا درہ صاحب کو کیا جانو۔“

”ظاہر ہے میں جان ہی کیسے سکتا ہوں۔“ اسفند بولا۔

”ہاں۔“ وہاں ہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ اصل میں درہ صاحب ہی سے تو سلوٹ کا نکاح ہوا تھا۔ یعنی سلوٹ کے شوہر تھے

وہ تو فخر کے بچہ تھے یہ کہہ کر گویا درہ صاحب کا اس سے تعارف کرایا۔

”گھر گئے تھے کیا مطلب ہے آپ کا۔“ کیا میں نہیں۔“ اسفند نے یوں کہا جیسے ان کی بات کی تصدیق کرنا چاہا ہو۔

”نہیں اب نہیں ہیں۔“ فخر نے پھر پوچھ لیا کہ اور پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک۔ جتنی مسودات اس کا زہر کو طلاق دینا اور

درہ کی کامیابی کی شہادت پر پھر اسے ہوا کہ ان تمام لینے کی قسم کھانا۔ اور پھر اس کے بعد کے سارے واقعات سب کچھ ہی اسفند

کو گواہ کر کے بعد انہوں نے کہا۔

”میں جب درہ کی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی اہتمام کارروائی مفاد کی بنا پر ہوئی تھی۔ یعنی سلوٹ کا مسعود الحسن

مستادن سے دور کراچی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مسعود الحسن کی چھوٹی بہن کی سوتیلی بیٹی تھی تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ بڑی دیر

مستادن کرتے رہے۔ جب ملے تھے تو پڑے آڑے سے تھے انداز میں ہی ملے تھے مگر اصل حالات سے باخبر نہ تھے

مگر ہماری اتنی خاطر مدارات کی کہ ہم شرمندہ ہو ہو گئے۔“

دو دنوں ہاتھوں میں پھولوں اور ٹھکری چند استعمانی چیزوں کے پیٹ مقام رکھے تھے۔ آتے ہی سب سے پہلے ان کی نظر اس پر پڑی۔ تو انہوں نے نزدیک کر دو دنوں پیٹ چار پانی پر ڈالتے اور وہ جو انہیں دیکھتے ہی احتراماً مائل ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اس سے بے فکر ہوئے انہوں نے کہا۔

”آخا صبی آج یہ عید کا چاند رجب کے مہینے میں کیسے نکل آیا۔ ٹھیک ٹھاک تو ہو تم۔“

”جی۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مگر وہ ان سے علیحدہ ہو کر سکھاتا ہوا ہوا لولا تو انہوں نے فوراً ہی اس کی بات کارا

کہا۔

”دیکھو صبی آپ شکوے شکایات کا دفتر کھول کر نہ بیٹھ جانا۔ ہم نے تمہیں اس روز روڈ کو اس کرتے ہوئے بہت نڈر سے دیکھا ضرور تھا لیکن ہم تو کیا ہمارے تو فرشتوں کے بھی وہ ہم گمان میں۔ نہ تھا کہ تم لوں پیادہ پاؤں بھی اور ہر نظر پڑ جاؤ گے۔ ہم تو یہی سمجھ کر بھی کسی اور پر تمہارا دھوکا ہوا ہے۔ ویسے بھی تم پہلے کی نسبت خالصتہً خود اور بڑے ہو گئے ہو۔“

”جی ہاں یہی میں بھی انہیں بتا رہی تھی کہ آپ ان کو پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔“

”خاخرہ نے فوراً ان کی بات کی تائید ہی

کہا۔

”جی ہاں مجھے بھی آپ کے لوں چشم پوشی سے کام لینے پر تعجب ہی نہیں ملا ہی ہوا تھا۔ بہر حال اب تو آپ نے مجھے پہچان لیا نا۔“

اسفند نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔ شائبہ حسن بھی اب تک کھڑے تھے۔ دو دنوں پیٹ پیچھے کے چار پانی پر بیٹے ہوئے ہوئے۔

”جوڑوں کے درد کی وجہ سے ہمیں فرش پر بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ تم بھی ہمارے پاس یہیں بیٹھ کر بیٹھ جاؤ۔“

”نہیں نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

اسفند جلدی سے فرش پر بیٹھا ہوا بولا۔ پھر شائبہ حسن بھی اس سے سب کی خبر پوچھنے لگے اور وہ انہیں بتاتا رہا۔

”جولو شکر ہے خدا کا سب خیر و عافیت سے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں لیکن وہ ہماری جھوٹی بیوی (ہیں) کیسی ہیں ان کے بارے میں تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”پھو بھوکے لیے ہیں بہن کی خیریت معلوم کرنے کا اشتیاق نمایاں نہیں تھا۔ بلکہ کچھ ایسا تاثر تھا جیسے وہ طنز سا کر رہے ہوں۔“

اسفند کی بھی ایک مرتبہ ہچکچاہٹ ہو گئی۔

”وہ پھو بھو گیم سے بھی کچھ ایسا ہی سوال کیا تھا اور میں بتانا ہی چاہ رہا تھا کہ دفعتاً آپ آگئے۔“

اس نے ایک بار ہر طرف نگاہیں پھرائیں۔

”لو بھلا انہی باتیں کر رہے ہو اور اصل بات بتا کر ہی نہیں دے رہے تمہارے اندر سے ابھی چھپتا نہیں گیا خاخرہ مسکو کر بولیں۔“

شائبہ حسن اس کی شکل غور سے دیکھ رہے تھے۔ اسے آخر اصل بات بتانی ہی پڑی۔

”ویسے اب تک وہ ہمارے یہاں بڑے آرام سے رہیں لیکن میرے کراچی چھوڑنے سے چار پانچ روز قبل ہی کسی کو بتائے بغیر گھر سے چلی گئی تھی۔“

اب بھلا گئی۔

”ماہیں یہ کیا کہہ رہے ہو، کہیں مذاق تو نہیں کر رہے۔“

لو بھلا سوچنے کی بات ہے وہ بے چاری تہہ کی کوتاہی نہ کہیں جاسکتی ہے۔

”ارے یہ آپ کو کیا بتائیں گے ہم بتاتے ہیں۔“

شائبہ حسن نے نہایت ناگوارانہ سے لہجے میں اپنی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ماہیں آپ بتائیں گے۔ میں سمجھی نہیں۔“

خاخرہ نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

”ہاں ہم ہی بتائیں گے۔ یہی ایک اتفاق ہی تھا یا ہماری خوش بختی جو قدرت نے خود بخود ہمیں تمام حقیقت سے آگاہ کر دیا۔“

شائبہ حسن نے جیب سے ڈاک کا ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔

”پھو بھولنے جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالتے ہوئے جو طرزِ خطاب اختیار کیا تھا اس نے اس کے عین عین اور نوبت کو

پہنچا رہا تھا۔

خیر بھو بھو کی خصلت اور طرزِ نظم میں وہ جو ایک زبردست تبدیلی دیکھ رہا تھا اس کے لیے نہایت غیر متوقع ہی نہیں بلکہ نہایت عجیب و غریب تھی۔ کہ کہاں وہ اکل کھڑے اور کم گوئے انسان جو بات کرنے میں کچھ ایسے غلے سے کام لیتے تھے جیسے انہیں اپنے الفاظ کا خزانہ ختم ہو جانے کا شدید لاحق ہو۔

اور بات بھی کرتے تھے تو ایسے ریتیلے انداز میں کہ مخاطب کے ملحق کے نیچے تک ریت ہی ریت بھر جاتی تھی۔ اس پر نہایت براعتاً اور بگاڑنا سارو یہ۔

”مگر آج تو وہ بالکل ہی نئے انداز میں۔ دوسرے منوں میں بڑے تیاگ سے ملے تھے۔“

بڑی یگانگت کا اظہار کرتے ہوئے خاخرہ اس کی خیریت پوچھتی تھی۔ گویا گفتگو کرنے میں بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب اسے سلوٹ کے ذکر سے پہلو بچاتے دیکھ کر۔ اس پر طنز بھی کر بیٹھے تھے۔

اور اس سے اس کی تمام تر توہم و تمان کی طرف ہی تھی۔ کیا پھو بھو کو سلوٹ کی تشدد کی اطلاع مل چکی ہے۔ اگر مل چکی ہے تو پھر انہیں اس کے گھر چھوڑ کر ملے جانے کی وجوہات بھی معلوم ہو گئی ہوں گی۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ سلوٹ کو اس نے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا تا یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہوگی۔

چہرے پر سراپکی کا سا نڈر لے اس نے لٹھے کی چوڑائی میں سوچا۔

اس انہیں شائبہ حسن نے غافلانہ میں سے خط نکال چکے تھے۔

”ہوں تو مجرم اس خط کا ہم تک پہنچ جانا بھی کسی مجرم سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے پرانے تھے پر یہ کیا۔“

خاخرہ وہ تو بہت نکمٹ ہوا کہ شیر محمد نے دوسری ڈاک کے ساتھ یہ خط بھی وصول کر لیا تھا۔ پڑھا کھا بھی نہیں ہے پھر بھی معلوم کیسے سمجھ گیا کہ یہ خط ہمارے نام آیا ہے۔“

پھو بھو نے خط کھولتے ہوئے کہا۔

خاخرہ ان کی باتوں سے زچ سی ہو کر بولیں۔

”افوہ آپ خواہ مخواہ ہی بات کو اتنا طویل کیوں دے رہے ہیں۔“

آخر یہ کس کا خط ہے اور آپ بڑھ کر کون نہیں سلاتے۔

”ہیکم میرے گھر سے۔“

خط بڑھ کر سنانے کی غرض سے ہی نکالا ہے۔“

انہوں نے ترش سے لہجے میں کہا اور پھر خط کی عبارت پڑھ کر گڑبگڑ کر دس اور پھر تندر سے توقف کے بعد انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

قبل بھائی اور بھائی جان۔ آداب

میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ شکانہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی ہوں جس کا انتخاب آپ نے اپنی مرضی اور حکم سے کیا تھا۔ لیکن فکر کی بات نہیں میں اس وقت جہاں رہ رہی ہوں وہاں۔ مجھے پورا پورا تحفظ مل رہا ہے صرف اس خیال سے کہ میری چاہک گشت گئی آپ کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث نہ بنے یہ چند سطور اظہارِ قلم کر رہی ہوں اب خدا کرے میرا یہ خط آپ تک پہنچاؤں تاوقت کے بعد انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

بوتے کی طرح ہر غلط باتوں میں پہنچ جائے کیسے خدا کے بھروسے پر ہی ارسال کر رہی ہوں

باتی۔ والسلام۔

جب وہ خط پڑھ رہے تھے۔ خاخرہ اٹھ کر ان کے پاس ہی آکھڑی ہوئی تھیں۔

انہوں نے خط ختم کیا تو ایک گہرا سانس لے کر بولیں۔

”یہی سلوٹ نے تو اپنا نام بھی نہیں لکھا کہ شاید پریشانی میں بے چاری بھول گئی ہوگی۔“

آہ غلوم بختی۔

”خیر غلوم تو کیا ہمارے ہاتھوں ستانی ہوئی ہے اور اگر نام نہیں لکھا تو فرق کیا پڑ گیا۔“

اس کی تو خبر دہری سے ہم نے

پہچان لیا ہے۔“

شائبہ حسن پرندہ کی سے بولے۔

”ہائے بے چاری بختی غلوم کس کے در پر پڑی ہوگی اور کس حالات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اسے۔“

اس کے پاس تو اتنی

”نہی نہ ہوگی۔“

کیا بالکل ہی غالی ہاتھ۔“

گئی تھی تمہارے گھر سے۔“

خاخرہ ہیکم نے بڑے مزین انداز میں بات کرتے کرتے اسفند کو مخاطب کر کے پوچھا۔ تو وہ جو چور سا بنا بیٹھا تھا دہری زبان سے بولا۔

367

”نہیں۔ وہ صرف اپنا وہی سوٹ کپس لے کر گئی تھیں جو لاہور سے ساتھ لائی تھیں۔“

”بہن! اس بات کا سخت انکسوس ہے اسفند میاں کہ ہر بات کا علم ہوتے ہوئے آپ اب تک ساری باتیں دبا کر لے رہے۔“

”ثاقب حسن کے لیے میں شکایت نہیں ملاحت ہی تھی۔ اسفند خرمندگی کے مارے کوئی جواب ہی نہیں دے سکا۔ اصل میں تو سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔ اور وہ جو بہت صاف گو اور ہمیشہ سچ بات کہنے کا عادی تھا یہ گویا اپنی جہان ہوا۔ وہ اصل بات بتا کر خود کو کھوپھی اور بھوپھا کی نظروں سے گرا لے۔“

”بہر حال۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہمارے اعمالوں کی پاداش میں ہی ہوا۔ ہم اس معاملے میں کسی کو دوش نہیں دیں گے لیکن میں میاں آپ تو اس گھر کے ایک اہم فرد ہیں۔ کیا آپ اس معاملے پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ یعنی کس بات سبب ہو کر ہماری دنیا کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا؟“ سچو پچائے جیسے سچے لیے میں پوچھا۔ تب بھی وہ انہیں اصل بات بتانے کی ہمت نہ کر سکا اور بہت سوچ کر بولا۔

”خیر روشنی تو کیا ڈالوں گا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے۔ لیکن یہ ہے یہ سارا فساد بابا شرافت کی جھوٹی اور بے نیا دانتوں نے پھیلا یا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہی سوط کے متعلق بہت غلط اور غلط باتیں مئی اور چھوٹے اکا کو بتائی تھیں۔ اور انہیں سب کے رویوں سے تنگ اس سوط ہمارا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔“

”اسے نہیں یہ ساری آگ اسی امراد بلی کی لگائی ہوئی ہے ورنہ بابا شرافت کو کوئی اتھا تو نہیں ہوتا جو وہ جھوٹی اپنے دل سے گھر دیتے۔“ فاخرہ فوراً ہی بولیں۔

”خیر خیر جس کی بھی لگائی ہوئی ہے۔ لیکن وہ ایسا کیا باتیں تھیں جنہیں سن کر بھائی جان وغیرہ بابا شرافت کی زبان پر ایمان لے آئیں۔“

”ثاقب حسن نے جن کے چہرے سے ناگواری ہوا مگر اسی پوچھا تو اسفند کے کچھ بولنے سے پہلے فاخرہ بیگم نے اسفند کی زبانی سنی ساری باتیں شوہر کے گوش گزار کر دیں۔“

”خیر بلی کو تو ہم ایسی چار چوٹ کی مار دیں گے کہ اس کا سارا کھانا پیارا برابر ہو جائے گا۔ لیکن یہیں تعجب اس بات پر ہے کہ اگر ہماری دنیا کا گرد اٹھنے کا وغیرہ کی نظروں میں مشتبی بھی ہو گیا تھا تب بھی وہ ان کے پاس ہماری امانت تھی۔ انہیں کیا حق پہنچا تھا اسے گھر سے چلے جانے کے لیے مجبور کر دینے پر۔“ ثاقب حسن کے لیے میں رعونت سی برائی۔

”ہاں بھلا دیکھو یہ کیسے شقی دل لوگ ہیں۔ بچی گھر سے چلی گئی اور انہوں نے ہمیں اطلاع تک نہیں کی۔ بھلا جان جہاں لڑکی کس کے رحم و کرم پر پڑی ہو گی۔ زمانہ تو پہلے ہی اتنا خراب ہے سارے ہم تو اسے کہا ہے یہاں بھیجے ہوئے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے یہ سارا کیا دھرا تمہاری ماں کا ہو گا۔ ریل سے لکھی تھی نا۔ ہوائی جہاز سے نواہز ادوں کی طرح جاتی تو تم لوگ اسے سرانگھوں پر بٹھاتے۔ اسے دولت نے تم لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔ تم سے انسان کی پہچان بھی چھین لی ہے جیسے ثاقب اسٹیشن جا کر میرا ٹکٹ خریدے۔ میں تو آج ہی کراچی روانہ ہو جاؤں گی اور وہاں پہنچ کر بھائی جان کا گریبان کھینچ کر باتیں کروں۔“

”فاخرہ جو خط سننے کے بعد شوہر کے پاس چار پائی پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ ایک دم ہی ہیر کی کراٹھی ہوئی بولیں۔“

”اس قدر جذباتی بننے کی ضرورت نہیں۔ فاخرہ بیگم آپ کیا سمجھتی ہیں کہ ہم اتنی آسانی سے کسی کو چھوڑ دیں گے سارے ہم تو سب سے جھگڑا کا کاروبار کر رہے ہیں۔“ ثاقب حسن کو گویا انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

”لیکن ڈیڈی تو آپ سے زیادہ سوط کے لیے پریشان ہیں پھر بھائی جان! سارے کام چھوڑ کر پورے دن کلابے انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔“ اسفند باپ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش میں بولا۔

”لیں دیکھا آپ نے میں نہ کہہ رہی تھی کہ سوط کو گھر سے نکالنے میں بھائی جان کا ہاتھ ہو گا۔ خیر وہ تمہاری ماں ہیں خواہ تم بڑی ماں۔ مگر میں انہیں ایسا مڑا چکاؤں گی کہ ساری عمر یاد رکھیں گی۔ کیونکہ بہت سہلے میں ہے ان کے علم پر وہ تمہارے باپ کے آفس جانے کے بعد تھوہر پر توڑ کر قتل کریں۔ اور پچھلے دکا کے سامنے ایسی بیگنی کی بنی رہی تھیں جیسے ان کی غلطی

ہوں۔ پوری سیٹی چری ہیں وہ۔ ان کا کالٹا تو پانی میں نہیں مانگتا ہے۔ شکر کہ وہاں جان کے زیر سایہ پروا ان چڑھے ہوئے نہ۔“

”ارے یہ آپ کی جیلے جھپولے توڑنے بیٹھ گئی ہیں۔ گیم۔ لو بھلا اسے بتا رہی ہیں جیسے ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ اسے انہی کی بے سلیکی کی وجہ سے تو آج آپ اپنے سگون سے لکھی بیٹھی ہیں۔ مگر آپ کے لیے نہ ہی ہمارے لیے ان باتوں کا موقع نہیں۔ ہمارے گھر کی بہت تو معلوم کن باتوں میں بڑی ہوئی ہے ہماری نواس وقت جان پر بنی ہوئی ہے۔“ ثاقب حسن کا دیکھا

”ابھی بات کرتے کرتے ایک دم ہی کرخت سا ہو گیا۔“

”آپ کی جان پر بنی ہوئی ہے تو میں بھی کوئی خوش کے شادیانے نہیں بجا رہی۔ میری میری موت کا مسئلہ ہے۔ خود میرا دل بھی ہلکے دم سے ہو رہا ہے۔ ارے جانو تو میری پالو تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے وہ تو ہر انسان جی وہ بھی آپ کی بہن۔“

”فاخرہ میاں کی بات کا برا مان کر بولیں۔“

”اچھا تو گویا آپ نے اسے میری بہن تسلیم کر لیا ہے۔“ ثاقب حسن نے عجب سے عجب میں پوچھا جو چھتا سا بھی تھا اور تسخرا نہ ہو۔

”واہ کیوں نہیں کرتی۔ بہن ہے تو بہن ہی۔“

”دیکھیے ہم غلط سننے کے عادی ہیں نہ آپ کہنے کی اس کے باوجود بھی محض حالات کے پیش نظر غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔“ ثاقب حسن نے ان کی بات کاٹ کر فوراً انہیں ٹوکا۔

”لیکن میں نے اسے پک پک تو سمجھی نہیں سمجھا ادا یہ آپ ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔“ فاخرہ بیگم قدرے ٹھنڈی سی پروکر بولیں۔

”ہاں۔ تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر آپ نے اسے ہمیشہ میری بیٹی۔ میری اپنی اولاد دھرو سمجھا کہہ دیکھے کہ یہ بھی غلط ہے۔“

”ثاقب حسن نے تہذیبی سے انداز میں کہا۔“

”نہیں خیر غلط تو نہیں مگر میرے اولاد سے غرومی کے مسئلے سے آپ بھی واقف تھے۔ اور پھر آپ کے والد اتنے ضعیف ہو چکے تھے کہ اس عمر میں ان سے کوئی اتنی جھوٹی اولاد ہونے کا میں یقین بھی نہیں کر سکتی تھی۔“ فاخرہ بیگم دیکھی پروکر بولیں۔

”مگر یہ بہت سمجھ خیال تھا آپ کا۔ جیسی تو آپ نے اسے میری اولاد دیکھ کر اسے بھی اپنی محبت اور توجہ سے نہیں لولا۔“

”مگر نہ کہ میری بہن ہوئی تو آپ کا رویہ کیسے جدا گانہ ہی ہوتا۔“ ثاقب حسن نے کہا۔ اور فاخرہ بیگم کوئی جواب ہی دینے والی تھیں کہ ثاقب حسن نے کہا۔

”بہر حال۔ آپ کی اطلاع کو سوط میری بہن نہیں بیٹی ہی ہے۔ جسے صرف میں آپ کی وجہ سے باپ کا پیار دے سکا۔“

”توجہ۔ سارے میں دل بھر کے کہی اسے سینے سے بھی نہیں لگا سکا۔ میں نے تو اس سے کبھی محبت کے دو سیٹے بول بھی نہیں کہے۔“

”اس انکشاف پر جان فاخرہ ہی کہہ کر اچھل پڑیں وہاں اسفند کا منہ بھی حیرت سے کھلا کھلا رہ گیا۔“

”مگر ثاقب حسن نے زور سے بولی کے ہیں پھر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ تو اپنی دھن میں بولے چلے گئے۔“

”اسے ہم نے تو اس پر ایک ظلم توڑا ہے۔ وہ ہماری طرف سے بھی جھپلی نظروں سے دیکھتی تھی تو ہم منہ پھیر لیتے تھے۔“

”انہیں شروع شروع میں کالو بیتی تھی تو ہم اسے دھمکا کر بھائی جان کہنے پر مجبور کر دیتے تھے۔“

”وہ ہم سے ہمارے اتفاقات کی خواہاں ہوئی تو ہم اسے بری ڈانٹ دیتے تھے۔“

”وہ کسی بات پر مدد کرتی تو ہم اسے بری طرح مجبور کر دیتے تھے۔“

”ہم نے اس سے اس حد تک بے اعتنائی اور بیگناگی برتی کہ بڑی ہو کر اس کے سارے احساسات مردہ ہو گئے۔“

”مگر اس پر۔ اس پر بھی شاید ہمارا بس نہیں چلا تھا۔“

”مجھے تو ہم نے اسے اپنے سے بڑی عمر کے انسان کے ساتھ جھونک دیا تھا۔ اُن ہم کتنے ظالم اور جاہل ہیں۔ اور کہہ کر ناظر سے بھی خدا نے ہمیں گلوں کی طرح شگفتہ اور حسین سی بیٹی دی تھی مگر ہم نے اس کی بھی قدر نہیں کی۔ اور آج۔“

”نہیں انہیں بند کیے۔ ایک نہ بانی سی کیفیت میں یہ سب کچھ رہے تھے۔“

کوئی جھکی جھکی نہ سسکی۔
مگر بند آنکھوں سے نکلتے اشکوں کے موتی ان کے چہرے کو چھو رہے تھے۔

انہوں نے اپنی بات کہتے کہتے ٹوک کر زور سے اپنا غلغلہ ہونٹ کاٹا۔
میاں کو روکے دیکھ کر فارخہ بیگم کا بھی دل جھرا آیا۔ اور ان کی آنکھوں میں نمی خیز آنسو گرنے لگی تھی۔ لیکن اس کے سوا
پراچہ زیادتیوں کے احساس نے انہیں مذمت اور بھتاوے کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا اسی لیے بالکل خاموش تھیں۔ اور
اسفند وہ تو کچھ ایسی کم سن سی کیفیت میں بیٹھا تھا جیسے اسے ارد گرد کا ہوش ہی نہ ہو۔

”مگر ہم اس معاملے میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرائیں گے کیونکہ یہ ہمارے اپنے اعمالوں کی سزا ہے جو ہم نے اپنے
اور مل رہی ہے۔ یہاں کے قانون کا تو کوئی بھروسہ ہی نہیں۔ خرید و بیع جاسکتا ہے مگر قدرت کا قانون اٹل اور انول
ہوتا ہے اور ہم اسی قانون کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔“ ثاقب حسن نے اتنا کہہ کر پھر تھوڑا سا توقف کیا اور بولے۔
”لیکن ہم نے جو کچھ کیا تھا آپ کی محبت میں کیا تھا آپ کی وجہ سے کیا تھا۔ مگر خدا ہمیں معاف کرے بہت بڑا کیا تھا۔
بلکہ ایک طرح خود پر ہی ظلم کیا تھا۔ کیونکہ جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔ آخرت تو دوسری بات ہے دنیا میں ہی وہ ظلم
ظالم پر ہی لوٹ آتا ہے۔ اور یہ ظلم کا فلسفہ قرآن اور سنت کی روشنی میں تو بہت اداق اور بہت ہی مفصل ہے۔ لیکن
ثاقب حسن اتنا کہہ کر خاموش سے ہو گئے۔ تو فارخہ نے بیٹھی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

”آخ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ کیسا ظلم اور کس کا ظلم۔ کیا آپ کا مقصد دلالتی سے سلوٹ کو یا وہ دنیا ہے؟
”نہیں۔ یہ بالکل ہی دوسرا معاملہ ہے۔ بہر حال یہ ہم بھی بتائے دیتے ہیں تاکہ دل پر برسے سے پرالوہ نہ ٹھٹھ
جائے۔“ ثاقب حسن بولے تو اسفند بھی بہت تن کو ش ہو گیا۔

”آپ کو معلوم نہیں فارخہ ہم نے درہ کے کس کس کو چھو کر کیا ہے بے چارہ کی اور بے بسی کی کن کن منزلوں سے گزرے
ہیں اسے ہم نے تو کئی جانوں پر نہیں واقعی خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔“

شدت غم سے شاید ثاقب حسن کی آواز تڑخ گئی تھی اسی لیے وہ پھر خاموش ہو گئے۔ فارخہ خود بھی مذمت اور بھتاوے
کی اذیت میں مبتلا تھیں اسی لیے انہوں نے اپنے دل ہی سے اس لیے تھے اور اسفند بھی سناٹوں کی زد میں آسا لکت سا بیٹھا تھا۔
”آپ کو یاد ہوگا جب بچی رپورٹ کے مطابق آپ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم قرار دی گئی تھی تو آپ پر زور
ملاں اور مالوی کا تاثر دیکھ کر ہم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ کسی دوسرے کے بچے کو مستقبیٰ کر لیں۔ لیکن آپ نے ہی سختی
سے انکار کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر بڑی اولاد پر خواہ آپ کتنی ہی جان ماریں گے وہ کبھی اپنی نہیں ہوگی۔ اور بڑی اولاد کو دلوانے
کے باوجود آپ کی منشا بھی تسکین نہیں پاسکتی گی۔ جبکہ اولاد کی خواہش ہماری کمزوری بن گئی تھی۔ بلکہ ہم اولاد کی خواہش میں
پاکل ہو رہے تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے خاندان میں پوتے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے یعنی اگر عمار کی کوئی
نرینہ اولاد ہوتی تو ہم بلا جانی کی نصف جائیداد کے وارث قرار دیے جاتے۔“ وہ بات کرتے کرتے پھر خاموش ہو گئے۔

”مگر آپ کے والد کے پاس اتنی جائیداد تھی ہی کہاں۔ وہ تو سنا تھا کہ اپنا سب کچھ عیاشی و سرگرمی کے لیے خرچ کر کے
بنا نہ رہ سکیں۔“

”نہیں نہیں بہت غلط لفظ استعمال کر رہی ہیں آپ۔ شاید یہ بھول گئی ہیں کہ وہ ہمارے والد تھے اور ان کے احترام کا
اطلاق آپ پر بھی مرتب ہے۔“ ثاقب حسن نے فوراً ہی انہیں ٹوکا۔

”ہاں ہاں ہوتا تو نہ لیکن جو سنا تھا وہی کہہ دیا۔“ فارخہ نے برا مان جانے کے خیال سے فوراً ہی کہا۔
”ہاں اس کے باوجود بھی باوا جان کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ جو کہتے ہیں ناکر اما بھی سبھی سوال کا مالک ہوتا ہے تو کوئی بھی
مثلاً ان پر بھی صداقت آتی تھی۔ بہرکیت باوا جان کی پہلی بیوی سے بڑے بھیا اور باجی اماں تھیں۔ دوسری بیوی سے جن
ہم اور تیسری بیوی سے مسعود الحسن تعلقہ دار کی بھوتی ہیں جنہیں صرف چار لڑکیاں ہی تھیں۔ بڑے بھیا کی پہلی بیوی کی اولاد تو
لڑکی ہی تھی مگر اس سے چھوٹا ایک لڑکا بھی تھا۔ اسی لیے باوا جان کی وراثت میں ان کی پورے تین بڑی بیٹیاں بھی تھیں۔
کے مقابلے میں ہمارے ہاں اولاد ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور ہمارے ایک مجبور بیٹے کی بھی کم بختانی ہوئی تھی۔
کر چکے تھے۔ اور ادھر باوا جان ہم پر جان بھرتے تھے۔ اس پرستہ زور بڑے بھیا ان کی زندگی میں ہی بڑی صدمہ کی لڑ

دوسرے مضمون میں ہم نے ساری خواہشوں اور تنخواؤں کو داؤں پر لگا رکھا تھا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہہ لیں یا قسمت
نہاں ایک اتنی آس امیدوں کے بعد اولاد بھی ہوئی تو ایک لڑکی کی صورت میں۔“ ثاقب حسن ایک تسلسل سے بولتے بولتے
نایاب ٹھٹھ گئے تھے اس لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

”یعنی سلوٹ فارخہ سے بولے بغیر نہ رہا گیا تو انہوں نے یہی کہہ دیا۔
”ہاں سلوٹ ہی۔“ ثاقب حسن نے ٹھٹھ سے ہنسے سے ہنسے میں کہا۔
”لیکن سلوٹ تو زامیدہ تو نہیں تھی جب آپ اسے میرے پاس لائے تھے۔“ فارخہ نے کہا۔

”نہ صرف ڈھائی سال کی تھی۔ مگر خدا بہت عاف کر کے ہم نے لڑکی پیدا کرنے کی پاداش میں خزانہ کو قلعی اور روحانی۔ بڑی
نہی نہیں۔ ہم نے بیٹے کے بجائے بیٹی کو ان کے پہلو میں پڑا دیکھ کر کونرا ہی اٹھایا اور اسے اپنی سبھی زاد و نعمت آرائی تو پہلو میں
بڑا اور سارو کی اور تڑپتی رہ گئیں ہم نے سلوٹ کو انہیں بیٹا لگا کر انہیں کیا۔ باوا جان کا ڈنڈا سر پر تھا اس لیے ہم۔ خوری طور
نہی ملایا نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن باوا جان کی آنکھ بند ہوئے ہی۔ ان کے چالیسویں کے بعد ہم نے انہیں ملایا دے دی۔

371

370

اور سلوط کو لئے کر بیان چلے آئے۔

انہوں نے بات کرتے کرتے ایک مرد آہ بھری اور بھرگو یا ہوئے۔

”قدرت نے مرد پر عورت کو قوام بنا کر اس لیے برتری دی ہے کہ وہ اسے پورا پورا تحفظ دے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھ کر اسے حساسات اور خواہشات کا احترام کرے کہ وہ دوسرے قتلے میں ایک کو دور اور نازک سی شے ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اس پر جبر و ظلم کی انتہا کر دے۔ شوہر کو تو اسے معلوم اور زرخیز سمجھے۔ اس کے حقوق یا نال کرے۔ اس کے احساسات اور خواہشات کا کھانا کھٹ دے اور اپنا سب سے بڑا ہتھیار یعنی طلاق کا لفظ بار بار اس پر استعمال نہ کرے۔ بلکہ تصور بے قصور صرف اپنی حاکمیت کے زعم میں اسے مرد سے طلاق ہی دے دے۔ جیسے کہ ہم نے دی تھی۔ اور وہ نیک بخت جو کبھی حرف شکایت نہ لاتی تھی۔ ہمارے ارادوں سے آگاہ ہو کر کھنوسے کا پنوت تک کا سفر تنہا طے کر کے ہمارے پاس آتی تھی۔

کس قدر رونی اور گورگڑا آتی تھی وہ سچی کہ ہمارے قدموں میں سر میری رکھ دیا کہ مجھے طلاق نہ دیں۔ اگر آپ میری رفاقت نہ فرمائیں تو آپ کر سکتے تو آپ کو اختیار ہے۔ آپ کبھی میری شکل نہ دیکھیں۔ جہاں چاہیں رہیں میری بیٹی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے میں لہجہ مجھے طلاق نہ دیں میں اپنے بیدار کرنے والے کی قسم کھاتی ہوں کہ کبھی آپ سے کوئی تعلق رکھوں گی نہ توقع ہے۔ آپ کے نام ہی جیسے جیسے زندگی گزار دوں گی۔ دیکھیں میرے سر پر میرے باپ کا سایہ نہیں ہے۔ بہن ہیں تو وہ پردیس میں اور مہمانی اور بھانجہ وہ بہن بھتیجہ طلاق یافتہ کو اپنے گھر میں قدم بھی نہیں رکھنے نہیں دیں گے۔ وہ رورو اور تڑپ تڑپ کر کہتی ہیں۔ مگر ہمارے کان تو بھرے ہوئے تھے اور دل بچتا رہا۔ اور ہمارے ہاتھ میں تو جیسے ساری خدا کی تھی کہ ہم اس کے شوہر پر ہمیں تو اس کی باتوں نے کچھ زیادہ ہی بھڑکا دیا اور ہم نے مشتعل ہو کر وہیں کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔

گلارندہ جانے کی وجہ سے ان کی آواز نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تیزی سے امدت نہ ہوئے انھوں کو سختی سے لاکے کے باوجود انھوں کی چند لڑائیاں ان کی بچوں سے پہلے کر ان کے دامن پر آ گئیں۔

”لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا۔ یہ اتنا بڑا ظلم میں تو کبھی بھول کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ فاخرہ کے دل میں موت کی ہمدردی ایک دم ہی ابلی تو انہوں نے طاعت آمیز لہجے میں کہنا چاہا۔ مگر ثاقب حسن نے انہیں فقرہ پورا کرنے کی ہمت نہیں دی۔

”اگرے ظلم کیا تھا تو اس کی سزا بھی تو ملتی ہے۔ اور بھلا ایک ظلم کیا تھا۔ سب سے پہلے تو خدا کی ناشکری کے مرتکب ہوئے تھے۔ کہ لڑکی ہی بھی خدا نے ہمیں اولاد دے تو نوازا تھا۔ اور انھوں کو قدرت معاف نہیں کرتی۔ اس پر ہم نے غلامی پر اتنا بڑا ظلم بھی تو کیا کہ انہیں طلاق دے کر اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور اس سے بڑا ظلم یہ کہ خود اپنے جگر گوشے کو بھی محبت اور التفات نہ دے سکے۔ اور خود اپنے ہاتھوں اس کی زندگی تباہ کر دی۔ بلکہ اسے اپنے ہاتھوں سے کھو بی دیا۔ اب ہمیں معلوم ہے قدرت ہمیں اس کی اتنی بڑی سزا دے گی کہ ہم اسے کبھی نہ دیکھ نہ سکیں گے۔“ انہاں کہہ کر ثاقب حسن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

فاخرہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور اس گریہ فزائی میں ان کا ساتھ دینے لگیں۔

”ارے آپ کیوں رورہی ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا کہ اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود آپ دنیا میں ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ آپ نے تو اچھے برے وقت میں کتنا ہمارا ساتھ دیا ہے آپ نے سلوط کی سرق قبول کر کے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ آپ تو ہماری حسن اور جنت ہیں۔“ ثاقب حسن بیوی کو روتا دیکھ کر بھری اور دلی آواز میں بولے۔

”نہیں نہیں خدا! آپ مجھے یوں تو ٹھنڈے لفظوں کی مار نہیں دیکھے مگر ثاقب میں تو پہلے ہی پھینکا دے کی آگ میں جھسی جا رہی ہوں کس قدر شرمندگی محسوس کر رہی ہوں اپنی کوتاہیوں پر۔ میرا دل تو اس بچی کے اسیے پر خود ہی مڑنے لگے ہو۔ باہر سے میرے روتے تو میرے دل میں تو میرے قریبی کو بھی شرمسار کر کے رکھ دیا ہے۔ ارے مرد عورت کا دل ممتا کے جذبے سے بڑبڑاتا ہے اور میرے دل میں تو یہ جذبہ نشاطیں مارتا تھا لیکن میں نے بعض شک اور غلط فہمی کی بنا پر اس جذبے کا کھانا کھٹ دیا تھا۔ ہم تو آپ کے قصور و ازار اور خطا کار ہیں ہم تو منہ نہ نہیں رکھتے کہ۔“ انہاں کہہ کر فاخرہ، بچکیوں اور سکیوں سے رونے لگیں۔

”آپ نے اس غریب سے ہمارا انتقام لیا اور قدرت نے ہمارے ظلم اور زیادتیوں کی ایسی سزا دی کہ ہماری بیٹی کو ہی ہم سے قہقہہ لیا۔ اب ہم شاید کبھی اسے دیکھ سکیں۔ آپ کو کیا معلوم فاخرہ بیگم ہمارا سینہ غم سے بھٹا جا رہا ہے۔ ہم جاگنی کی کیفیت میں گزار رہے ہیں۔ ہائے آج تو ہم بالکل ہی برباد ہو گئے۔“ ثاقب حسن بچوں کو کہہ کر رونے لگے تو اسفند نے اٹھ کر ان کا شانہ چھتیا تے ہوئے کہا۔

”دل کو سنبھالیے بھو بھیا جان۔ آپ کی تسلی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ سلوط کا خط تو آپ تک پہنچ گیا۔ خدا نے چاہا تو وہ بچی بھی نہ کہیں آپ کو مل جائیں گی۔ بلکہ میں ان کو دھونڈ کر لاؤں گا۔ ملک کا چپہ چپہ چھان ماروں گا ان کے لیے۔ یوں بھی بھو بھیا جان۔“ وہ ٹوٹے سے جب خدامل جاسا ہے تو وہ انسان ہیں۔ آپ اس قدر مالوس نہ ہوں۔“

”ہاں ہاں بیٹا خدا تمہیں عذر دے تم پر بے لوث فریضہ انجام دو گے تو خدا تم کو اس کا بہت بڑا اجر دے گا۔ ہماری تو بیٹی ہی نہیں دل بھی ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت کہاں کہ اسے تلاش کرتے بچیں۔“ فاخرہ بیگم خوش ہو کر بولیں۔

”نہیں بھو بھیا جان۔ آپ اس طرح عفو غنیت کا اظہار کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ کیونکہ سلوط کی تلاش میں میری اپنی خیرین میں شامل ہوگی۔ اس لیے کہ میں بہت پہلے ہی انہیں اپنے لالچ پارٹر کی حیثیت سے سلطنت کر چکا ہوں۔ اور اصل میں میرے اندر مائدہ زدوں کے کی وجہ سے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی۔“ اسفند نے بڑی صداقت سے اصل بات بتادی۔

”ہاں۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں اسفند بیٹے۔“ ثاقب حسن رونادھونا بھول کر اچھل پڑے۔

”اسے سنیں گے کیا میں تو ان کی غیر متوقع آمد سے ہی ٹھٹھک گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔“ فاخرہ نے آنسو بہتے ہوئے کڑا سی آواز میں کہا۔ مگر اسفند نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ثاقب حسن کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”بھو بھیا جان کیا میں سلوط کا خط دیکھ سکتا ہوں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ لومرور دیکھو کیونکہ آپ تم نے اقبال جرم کر کے اسے تلاش کرنے کا وعدہ ہی کر لیا ہے تو پھر

حال انکریل اور بااثر شرافت کی زبانی بہت پہلے ہی وہ سن چکا تھا کہ سلوٹو شادی شدہ ہے۔ لیکن اب بھوپھو کی زبانی سلوٹو کی ساری روداد سن کر اور یہ جان کر کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ وہ سلوٹو کی طرف سے بدولی سا ہو گیا تھا۔

کونکواسے اپنے معیار پر پوری اتارنے والی کسی ایسی رقیق زندگی کی تلاش تھی جو خوبصورت اور حیا دار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش خلق اور اچوتی بھی ہوگی۔ بالکل شفاف پائینوں میں کچلے ترو ترازہ کنول کے اس پھول کی طرح جسے کسی انسانی ہمت نہ ہو۔

اور اس پر طلاق یافتہ بھی۔

دل و جان سے چما لیتا تھا۔ اس ہستی پر صرف اس کا حق نہیں ہے یا وہ عوض اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس کی ملکیت بر بہت پہلے ہی کو فی اور مرد اپنا قبضہ چا چکا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ زندگی جیسے کام کا معاملہ ہوگا اور یہ بھی کہ سلطو کے بارے میں اس کی ماں اور بیٹوں کے خیالات کیا ہیں۔ اور وہ سلطو کے ساتھ گھر کی ایک بڑی وردہ لڑکی کی حیثیت سے ہی پیش آتی رہی ہیں۔ اور پھر سب سے بڑا سوال یہ کہ، لکھنؤ، نرینہ اور اولاد جو لڑنے کی وجہ سے ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔

اور بہت غور و خوض کرنے کے بعد بھی اب تک کسی جیسے پروردگار پہنچا تھا۔ دروازہ کھولا تو اسے اسی رورسہ سن
 رہا تھا جیسے سلوٹ کو دھونڈ نکالنے کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ شام کی فلائٹ سے کراچی لوٹ جانا چاہیے تھا کیونکہ
 کالے نے کراچی کی مہربانی ہوئی تھی جس میں سلوٹ نے خط لکھ کر کہہ چکا تھا بھیجا تھا۔ مگر وہ پورے سات روز کا عرصہ
 متعلقہ کر کے سرگودھا جا رہا تھا۔ اب یہی نہیں تھا کہ اسے سلوٹ پر کئی ایسی زیادتی کا کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ بلکہ
 اسے تو اپنی زیادتی پر سخت افسوس تھا۔ رنج تھا۔ پچھتاوا اور ندامت تھی۔ اس کے خیال میں اس نے سلوٹ جیسی

برجہ کے چھوٹے بچہ کو اس نے اپنے خط میں ہی اطمینان دلایا تھا کہ وہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ لیکن پھر بھی زمانہ آنے کا ہے۔ اپنے جان پہچان والوں پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا لکھنؤ میں آج بھی ایسا حال ہے۔ اور محرم و ہوس کے زمانہ آگئے ہیں۔ تو پھر بعد اس کے تحفظ کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ تو ایک رواجی سے ماحول کی پرورش ہوئی ہے۔ جس نے اس کی تربیت کی ہے۔ جیسے جبرئیل ایک بڑے شخص کے پنے باندہ دیا گیا تھا۔ تبھی وہ کوئی اجتماع نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے آپ اطمینان رکھیں چوہا جان انشاء اللہ میں جلد ہی انہیں دھونڈ لگا لوں گا لیکن صرف ایک شرط پر کہ انہیں اپنی تحویل میں لینے کے بعد آپ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیں گے۔“

”ہاں ہاں بالکل۔ اس طرف سے تو تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہاری یہ شرط دل و جان سے پوری کر دیں گے انشاء اللہ۔“

مناقب حسن نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے مکتب سے بچے میں کہا۔ پھر منتظر ڈیریز میدان کے پاس بیٹھ کر روزانہ دروازہ سے جلدی آنے والے عیدہ کر کے اپنی عامری قائم نگاہ پر چلنے آیا۔

سے گاڑی کو بھٹکانے کے لیے جا رہا تھا۔ اس کا رخ سرکودھانہ کی طرف تھا۔

جہاں پیشینگی کے اسے ایسی جلدی تھی نہ اسی کو فی ایجنسی ہی نہ لگتی تھی جو گھڑی کی جو تھکان میں سارے فاصلے پر بار بار

البتہ اسے پہلی بار سرکودھانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہ شام پڑنے سے قبل ہی اپنی منزل پر پہنچا جاتا تھا جبکہ

ابھی تو سرپرہی داخل رہی تھی۔

آسمان کی نیلی ردا کو سرمئی بالوں کی ہلکی سی تہہ سے ضرور دھانپ رکھا تھا مگر مغربی افق پر سمٹ جلتی والی اچھوٹے

برکاش کا، دوسری طرف، ایک شگفتہ اور آواز سے اس کے دل کو اچھا

وہ واقعی اس سے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔
اس کے خیالات بھٹکے ہوئے تھے۔
اور بھٹکے ہوئے خیالات کے تسلسلے بنانے میں اس کا ذہن بُری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔
ذہنی اُٹھاپوں کی یہ کیفیت اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے تھی۔ جب ایک بھٹے قبل وہ جو بھیاسے بڑے
دعوے سے یہ کہہ کر بلکہ ان دونوں میں لہو می کو یہ اطمینان دلانے لگا کہ آج تھا کہ انہیں پریشان یا ہراساں ہونے کی طرف

374

اے یہ جو کہ ہوا میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ہی سر اسر دم دار اور قصور دار ہوں۔ مگر کراچی اتنا بڑا شہر ہے جس میں سرکوں کی طرح عموں کا بھی ایک جال سا بنا ہوا ہے۔ پوری ایک بھول بھلیاں ہے یہ شہر کراچی سمندر کی عمیق گہرائیوں کی طرح اس میں بھی کوئی شے کم ہو جائے تو پھر اس کا ملنا عموں ہو جاتا ہے۔ میں بھلا اسے کہاں کہاں ڈھونڈنا پھر دوں گا۔ یہ تو۔ قدرت کا ہی کوئی کرشمہ ہو گا یا پھر حالات اور اتفاقات بہرہ موتوں ہو گا کہ وہ ایسا ہی رنج اختیار کر لیں جیسا کہ میری یہاں لاہور میں آمد پر کیا تھا کہ ایک تو ہوٹل سے اجمال احمد کے دھکے میں میرا منتقل ہونا۔

دوسرے بہت اتفاقی بلکہ حادثاتی طور پر پھوپھا کا نظر پڑ جانا۔ شیران کی ربانی تمام واقعات کا پرتا چلنا اور پھوپھو تنگ رسانی یہ سب کسی انسان کے بس کا کام تو نہ تھا۔ یہ تو قدرت نے ہی کچھ ایسے حالات پیدا کیے تھے۔

درہ ملتان سے روانگی کے وقت میرے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ لاہور پہنچنے کے بعد پھوپھو بگم اور پھوپھا جان سے میری ملاقات ہوگی اور بہت اتفاقی طور پر سلوٹ کا خط آئے گا جس سے اس کا کچھ اتنا بتاؤ مل جائے گا۔ لہذا جب واپس کراچی جاؤں گا تو اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش ضرور کروں گا اور اگر قدرت کو منظور ہو تو میری کوششیں رائے کاں نہیں جائیں گی۔ درہ۔

بس وہ کچھ ایسے ہی خیالات میں غلطیاں اور پچھلایسی فکروں میں گھرا تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ یا پھر دوسرے معنوں میں اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔ ہوش تو اسی وقت ہی آیا جب سانسے طائف سمت سے آئے ایک تیز رفتار اور دو قیامت ٹرک کی زد سے اپنی لینڈ روور کو بچانے کی غرض سے اس نے گاڑی بائیں سمت کا پانی چاہی مگر ٹوٹی قسمت سے آگے سرک کا بائیں حصہ تیز رفتار ٹریفک کی آمد و رفت سے ٹوٹ گیا تھا اس نے رفتار ہلکی کیغیر تیزی سے اسٹریٹنگ کو بائیں سمت گھمایا تو گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو کر تیزی سے دلدلی فٹ پاتھ پر آری اور ایک تناور درخت سے جا ٹکرائی۔

ٹکراؤ اس قدر شدید تھا کہ اس کی طرف کا دروازہ جیسے دھبائی میں اس نے لاک بھی نہیں کیا تھا۔ زور سے ٹکڑا اور وہ ایک شدید جھٹکے سے نیچے دلدلی زمین پر آگرا۔ اس شدید جھٹکے میں سرسری طرح اسٹریٹنگ سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔ اور خون کی ایک تھلی سی سرسے بہہ نکلی تھی۔

مگر اس ساری تکلیف سے بے نیاز وہ کچھ دین لٹ پت زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ ٹرک اسی تیز رفتاری سے کب کا زن سے اس کے پاس سے نکلی کہ بہت دور چلا گیا تھا۔ اور وہ ایک کسمپرسی کے عالم میں بے مدد زمین پر پڑا تھا۔ معلوم دیتا تھا یا مگر کیا تھا۔ دور دور تک کسی متنفس کا پتا نہ تھا۔ جو کم از کم اتنا ہی معلوم کر لیتا کہ وہ کس حال میں ہے۔

کتنی عجیب بات تھی۔ ہر دم کراچی کے لیے پرتو لٹنے والے کو معلوم کون سی عبوریاں لاحق ہو گئی تھیں جو وہ اجمال احمد کے گھروں کی چوک کر رہ گیا تھا۔

یا پھر یہ خوش حادثہ اس کا منتقل ہونا۔ وہ پھوپھا کے یہاں سے آیا تھا تو اسی عزم کے ساتھ کہ سب سے پہلی فلائٹ سے وہ کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اپنی رہائش گاہ پر آ کر اس کے خیالات نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ جس کی وجہ سے دل سے وہ لہن اور انگ ہی ختم ہو گئی۔ جس کا اظہار وہ پھوپھی اور پھوپھا کے سانسے کر کے آیا تھا۔

اس سے دوہرے کھانے کا وقت تھا۔ مگر اس کی بھوک دیر پاس سب کچھ اڑ چکی تھی۔ اس لیے کمرے کا اندر سے کھٹک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور اگلے پونے دو گھنٹے ہوئے دل کے ساتھ معلوم کیا کیا سوچ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھولا نہ پڑا۔

دروازہ کھلتے ہی آفتاب اندر آگیا۔ اس کے پیچھے اجمال بھی تھا۔ ایک تو یہی بات بہت عجز معمولی تھی کہ آفتاب دوہر کے وقت آیا تھا۔ جب کہ ہمیشہ وہ ڈیوٹی انجام دینے کے بعد شام کو ہی آتا تھا۔ دوسرے اجمال اس کے پیچھے لگا لگا اس طرح بھی ماس کے کمرے میں نہیں آتا تھا۔ بھال اسے اس معاملے میں زیادہ متحسب نہیں ہونا پڑا۔

آفتاب نے آتے ہی اسے پہنچنے تک لگاتار ہونے اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کر دی۔ آیا آج خلاف معمول میرے اس وقت اچانک ہی ٹپک پڑنے پر متبیین تعجب تو ہو رہا ہو گا۔ مگر کیا کروں نت ہی کہے۔ میرا اثر اس قدر ہو گیا کہ وہاں کر دیا گیا ہے۔ اس لیے آج میں آف ڈیوٹی تھا۔ سوچا تم سے ملنا چلوں۔ یہ تم نے تو تم نے بڑی راہ دکھائی۔ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایک دم ہی۔ اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ

بول ڈالا۔ میں وہ درگھوٹنے چلا گیا تھا۔ مگر تمہاری روانگی کب تک ہوگی؟ آفتاب سرگودھا جا رہا تھا اور وہ ابھی تک کے کون کے گھٹن ہی دھڑنا دیے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے اس نے بڑی سکی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ آج شام کی ٹرین سے فیصل آباد جا رہا ہوں۔ ٹرا سفر ہونے کی وجہ سے تین یوم کی جچی ملی ہے۔ اب اچھی کی طبیعت ناما رہے اس لیے یہ جچی گھر پر ہی گزاروں گا۔ اس کے بعد سیدھا سرگودھا پہنچ جاؤں گا۔ آفتاب نے اپنا پروگرام بتایا۔ چلو یہی اچھا ہی ہوا کہ تم بھی آج ہی روانہ ہو رہے ہو۔ اسفند نے کہا۔ آفتاب اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔

”اچھا تو کیا تم بھی آج شام ہی یہاں سے کوچ کرنے والے ہو۔“

”ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ ابھی تکنگ کرانے جلنے ہی والا تھا کہ تم آگے۔ اپنی بات ادبچی رکھنے کی غرض سے منظر غلطیانی سے کام لے کر بولا۔

”لیکن اگر تکنگ بھی کرائی تو شام کی فلائٹ تو تمہیں ملے گی ہی نہیں۔ البتہ کل صبح یا شام کو ہی جا سکو گے۔“

آفتاب نے کہا۔

”چلو تو جہاں ملتے دن رحمت دی وہاں ایک رات اور سہی کیوں اجمال صاحب۔“ اسفند نے پھپکی سی سکراہٹ کے ساتھ اپنی بات کہہ کر اجمال کو مخاطب کیا۔

”واہ یہ بھی خوب رہی۔ سنتے تو یہی آئے ہیں بلکہ کچھ دستور بھی ہے کہ انسان آتا تو اپنی مرضی سے ہے مگر اس کی دلیپی دوسرے کی مرضی سے ہوتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آپ آفتاب کے نہیں میرے مہمان تھا۔ اب آپ کی یہ تکنگ و تکنگ بھی میری مرضی اور اجازت سے ہوگی۔“ اجمال نے بڑے مخلصانہ سے تلازلہ دیا۔

”او نہیں اجمال صاحب! آپ کو ملتے دن رحمت دے دی بس وہی کافی ہے۔ یوں بھی اب آفتاب کے جلنے کے بعد لاہور میں میرے لیے رہ گیا جائے گا۔ اور میں تو بہت پہلے ہی یہاں سے جا رہا تھا۔ مگر آپ خدائے سے پوچھ لیجئے کہ ان کے اصرار پر میں نے یہاں اتنا عرصہ بھی گزار دیا۔“ اسفند نے کہا۔ آفتاب نے ٹوکے سے جھٹک کر بولا۔

”کمال ہے یا راتم تو کچھ۔ کچھ کیپکسٹ سے ہو گئے ہو۔ یوں بھی تم اسلام آباد جا کر کون سے تارے توڑ کر لاؤ گے۔ اور اگر ایسا ہی سنا جی کا شوق ہے تو چلو میرے ساتھ سرگودھا چلے چلو۔“

”لیکن تم تو فیصل آباد جا رہے ہو اور میں اسلام آباد تو نہیں جا رہا۔ میں تو اب سیدھا کراچی ہی جاؤں گا۔“ اسفند نے کہا۔

”خیر یہ تو سبھی معلوم ہے کہ کراچی کے علاوہ ہم کسی اور جگہ رہی نہیں سکتے۔ کیونکہ کراچی کی رونق اور نہایت کے عادی انسان کا دل کسی اور جگہ ہی نہیں سکتا لیکن ہیساکہ تمہارا خیال تھا کہ کسی کشتی شفا خانے کے ساتھ وطن کے دور دراز علاقوں میں گھوم پھر کر اپنے خدمت خلی کے جذبے کو تسکین دو گے تو پھر اس سے

تو یہی بہتر ہے کہ سرگودھا چلے چلو بہت ممکن ہے کہ وہاں ہی ایم ایچ میں ہمیں کوئی معقول آسائی مل جائے۔
آفتاب نے بات اس کے مطلب کی کہی تھی اس لیے اس کے دل کو لگی۔

”ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو مگر اس کا کیا یقین کہ وہاں مجھے کوئی دیکھنی مل ہی جائے۔
اسفند اس کے مشورے پر دل ہی دل میں غور کرتے ہوئے بولا۔

”اب پانی سے پہلے پاڑھ باندھنے کی کوشش تو کرو۔ کیونکہ یہ ایسی کوئی حال یا غیر ممکن بات تو نہیں۔ تقریباً
دن ہی ہر جگہ بہت سی ایسی آسامیاں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ میں قسمت آزمائی شروع ہے۔ اور کچھ نہیں لوگے یا مقرر ہو کر گودھا
کی سیر بھی ہو جائے گی۔“

آفتاب نے کہا تو اس نے بھی سوچا کہ چلو کیا حرج ہے۔ اسی بہانے کم از کم میں ایک نئی جگہ ہی دیکھ لوں گا اور ساتھ
کے ساتھ وہاں کے ماحول کا اندازہ بھی لگاؤں گا کہ کیسا ہے۔ یعنی میری طبیعت سے میل بھی کھاتا ہے یا نہیں۔ یہی سوچ کر
اس نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے بقول تمہارے میں وہاں بھی قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گا لیکن ابھی تو تم خود بھی وہاں نہیں جانتے
یعنی تین چار روز بعد ہی جاؤ گے۔ اتنے میں میں بھی اسلام آباد کا پتہ لگاؤں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔“

”اوہو۔ پھر وہی مرے کی ایک ٹانگ۔ اسلام آباد جانے کے لیے کیا کسی حکیم یا ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے یا پھر
تمہارے لیے فرض ہو گیا ہے وہاں جانا۔ اسے بھی آرام سے نہیں لاہور میں ہی بیٹھے رہو۔ یہ اپنا اچھا رجحان آنا غور
یا ہیبت ناک بھی نہیں جس سے تمہیں جان جانے کا خطرہ لاحق ہو۔“ آفتاب کچھ اتنا پرو کر بولا کہ اجمال تو اجمال۔
خود اسفند کو بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”خیر یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ اپنی بات کو اسی طرح منواتے ہو لیکن میں نے انکار تو نہیں کیا سرگودھا جانے
سے آج بھر کا دن ہے۔ میں ہفتے کے روز وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔ دوست کے خلوص کے آگے آفریں
ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر بھی سن لو کہ تم اسلام آباد نہر گز نہیں جھاؤ گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ تم ہاؤس سے نکل گئے تو پھر
سے نکلے ہوئے پرندے کی طرح ایسے پھرے آؤ گے کہ کچھ بھی باقی نہیں آؤ گے۔“ آفتاب اٹھتا ہوا بولا۔

”ارے ائی یہ ایک دم کیوں اٹھ کھڑے ہوئے تم۔ اگر کھانا نہ سہی تو کچھ ٹھنڈا گرم پی بی بی لو۔ اجمال نے اسے الیک
ہی اسٹینڈے دیکھ کر کہا۔

”نہیں کچھ کھانے پینے کا موہو ہونا تو تم سے پوچھنے بیڑی کیا بی لیتا۔ اس وقت تو فوج پر سفر سوار ہے میں جا کر سامان بھی
چیک کرنا ہے۔ ایک ادھر چیر ادھر گئی تو پھر کون لینے آئے گا۔“ آفتاب نے کہا۔ اور پھر اجمال کا اشارہ غصہ کیا اور
اسفند نے ہاتھ ملا کر اسے سرگودھا پہنچنے کی تاکید کر کے اسی وقت چلا گیا۔

تویوں وہ دوست سے کیے دعویٰ کو ایفا کرنے کی غرض سے سرگودھا جا رہا تھا۔ ارادہ تو اس کا بذریعہ ٹرین لینے
کا تھا۔ مگر اجمال نے اسے ٹرین کے تکلیف دہ سفر سے بچانے اور کچھ اس غرض سے کہ وہ سنے مائل کی لینڈر وور جوائن
کی ملکیت تھی۔ اسے آفتاب تک پہنچانے کے خیال سے اسے ہی مشورہ دیا کہ اگر وہ کار کے ذریعے قومی شاہراہ سے
سفر کرے گا تو وقت کی بھی بچت ہوگی اور سفر بھی آسان ہو جائے گا۔

یہ لینڈر وور آفتاب بے چارے نے پانی پانی جمع کر کے خریدی تھی۔ اور وہ تو راستوں سے ناواقف ہی تھا۔ اجمال
نے اس کی سہولت کے لیے۔ اپنا ایک آدمی جو شاہین آباد اپنے گھر والوں سے ملنے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کر دیا تھا۔

شاہین آباد سے سرگودھا مشکل میں تینس میل پورا ہے اور راستہ بھی سیدھا۔
اس لیے اس شخص کے بہت کہنے سننے کے باوجود وہ اسے سرگودھا ہی پہنچا کر آئے گا۔ اسفند نے اسے رات
دری گوارا نہ دی۔ اور اسے اس کی منزل پر اتار کر تنہا ہی سرگودھا کا رخ کیا۔
کہ یہ حادثہ پیش آ گیا۔

جیسے آفتاب کے اصرار نے اسے اس حادثے سے دوچار کیا تھا۔
پھر اسے فضا یہاں تک کیلج لائی تھی۔ جو وہ سرگودھا سے ادھر ہی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ ٹرک والا تو
بہے جانے کے ڈر سے ٹرک کو کھٹکائے گیا تھا۔ اور وہ مشیت الہی کے رحم و کرم پر ٹرک کے کنارے درخت
تک پہنچ کر وہیں مت پت بے سندھ پڑا تھا۔

خام کا دھندلکا سیاہیوں میں تبدیل ہونے لگا۔ یا آسمان پر بھائی دلیوں کی دوسرے اندھ اچھڑ زیادہ ہی بڑھ
یا قہر جی شاہین آباد کی سمت سے آئی ایک ایبولینس جس میں کسی ہسپتال کا کچھ عہدے دار ڈاکٹر زبیر جا رہا تھا۔ اس کے
دب اکڑ کر۔

”بھئی کا کیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ایک آواز آئی۔
نہیں یہ تو ایک کیڈنٹ میں مرنے والے کسی شخص کی ڈیڈ باڈی (لاش) ہے۔ کسی اور نے اپنا خیال ظاہر کیا اور
پہلے جلد دروازے کھلے اور کسی شخص تیزی سے باہر اتر آئے۔

ان میں سے وہ اشخاص جو ڈاکٹر تھے۔ اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ بڑے غور اور توجہ
سے اس کا معائنہ کیا۔ اس کی نبض دھبی۔ زخم ٹوٹے۔ اور پھر ٹری جلیت اور پھر تری میں اسے احتیاط سے اٹھا کر ایبولینس
میں ڈالا اور سرگودھا شہر کے ایک سرکاری ہسپتال میں پہنچا دیا۔

اس کے تقریباً سارے جسم پر چوٹیں آئی تھیں۔ مگر سر کی چوٹ بہت خطرناک اور شدید تھی۔ خون بھی بہت بہہ
گیا تھا۔

اس کی نبض دھبی تھی نزع کا سا عالم طاری تھا۔ آپریشن تھینک کی میز پر وہ جا گئی کے عالم میں پڑا تھا۔
مسلسل چار گھنٹے سے ڈاکٹر زاس کی جان بچانے کی ان تھک کوششوں میں مصروف تھے۔ دوسرے تہ خون بھی دیا جا
رہا تھا۔ پوری چار بوتلیں چڑھائی گئی تھیں۔ لیکن یہ چار بوتلیں بھی اس کے جسم سے بہہ جاتے دلتے خون کی کو پورا نہ کر
سکتی تھیں۔

اسے مزید خون دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ہسپتال کے بلڈ بینک میں یونیورسل پول زید و مہر کا خون ختم ہو چکا
تھا۔ رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ اس پر مولدھار بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ سڑکیں دریا بنی ہوئی تھیں اور لڑکی
رات گئے۔ اس جھا جوں پرستے پانی میں یونیورسل پول کسی اور جگہ سے حاصل کرنا۔ جوئے شیر لاسنے کے مترادف ہی لگ
رہا تھا۔

ادھر زندگی کا ایک ایک لمحہ اس پر بھاری تھا۔ عرض حیات تنگ ہو کر بالکل موت کے دہانے سے جا لگا تھا۔ جبکہ
اس ہسپتال میں وہ سب کے لیے کیسے جینی تھا۔ یعنی کوئی اسے جانتا تھا اس سے کوئی واسطہ رکھتا تھا۔

اس کے باوجود بھی انسانی برادری کے مربوط سلسلے سے منسلک درد مندی۔ ہمدردی اور ایک دوسرے کے
کام سے کا جذبہ تقریباً اس کے تمام سیموں کے دلوں میں موجود تھا۔

وہ ہمیت پر ایک کرپل نوجوان اور بے یار و مددگار شخص کی جان بچا لینا جانتے تھے۔ اور اسی جدوجہد میں انہوں
نے دوسرے ہسپتالوں سے زید و مہر کے خون کی دستیابی کے لیے خون پر رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ مگر ابھی تک نہیں سے
نئی کوئی مدد نہیں آئی تھی۔ اور ادھر وقت تھا کہ نکل جا رہا تھا۔

بلکہ اسفند کی جان بھی کس کس خفا کی جد سے کسی بھی لمحے نکلنے کے لیے پر توتل رہی تھی۔ ہسپتال میں ایک کھلبلی
نئی تھی۔

نہیں تک لینے چہرہ پر تردد کے آثار لیے۔ انسانیت کے سب سے بڑے جوہر یعنی بے لوث جذبے اور
مہنہ کا اظہار کر رہی تھیں۔

کیونکہ اس موت کے دہانے پر کچھ سے شخص سے ان کی کوئی غرض ان کی تھی نہ ہی ان کا اس سے کوئی نزدیکی رشتہ تھا
نہ وہ انسان تھا۔ ان کا ہم قوم اور ہم مذہب تھا۔ سبھی کے قلوب سے اس کی سلامتی کی دعائیں نکل رہی تھیں۔
زنجبکی لبوں پر ایک ہی سوال تھا۔ کہ زید و مہر کا خون کہاں سے حاصل کیا جائے؟

اور بھی ہسپتال کی ایک بڑا دارو۔ معمولی سی نرس نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیں۔

”ڈاکٹر صاحب! میرا خون زہر و مہر ہی ہے۔ آپ جتنا چاہیں میرے جسم سے لے سکتے ہیں۔“

”آپ کا خون زہر و مہر کا ہے مس شان! مگر آپ کو کچھ معلوم ہے؟“ ڈاکٹر کے اس سسٹنٹ نے سہرا بوجھا۔

”مجھے معلوم ہے جیسی تو کہہ رہی ہوں۔ ویسے آپ چاہیں تو میرا خون ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔“ مس شان نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”لیکن مس شان! آپ تو خود ہی بہت نازک سی ہیں۔ بالخصوص اگر آپ کا خون زہر و مہر کا بھی ہے اور جسم سے بھی لیا تو پھر آپ کے اندر رہی کیا جائے گا۔“ سرجن انصاری بھی نہیں کر بولے۔ جو بہت ہی خوش مزاج اور خوش گوار ملنے جاتے تھے۔

”آپ میری فکر نہ کریں۔ ویسے بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ آپ پلیز زخمی کی جان بچانے کی کوشش کیجیے۔“

مس شان کا لہجہ بلیسی سا ہو گیا تھا۔

اس وقت وہاں دوسرے اور دو ڈاکٹر کھڑے تھے۔ نرس کے جذبے سے متاثر ہو کر انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور مس شان کو اس کمرے میں لے گئے جہاں خون ٹیسٹ کیا جاتا تھا۔ فوراً اس کا خون ٹیسٹ کیا گیا۔ نرس کا دعویٰ درست ہی ثابت ہوا۔ چنانچہ اگلے ہی چند لمحوں بعد اس کا خون لیا گیا۔ اور پھر اسے پندرہ بیس منٹ تک پلے رہنے کی ہدایت کر کے اور جوں و عزیزہ پلاک سب اس روم سے چلے گئے مگر مس شان کو جو جیسے قرار ہی نہیں تھا۔

وہ کبھی اٹھ کر بیٹھتی کسی لیٹ جاتی چہرہ پر تعجب کی زنجی نوجوان کا پیروں میں جکڑا چہرہ اور چہرہ پر کھنڈی موت کی زداری۔

آپریشن کی میز پر بے حس و حرکت پڑا سہرا پا۔ اور نازک میں غشی آکسین کی نالی بار بار سامنے آکر اس کے اضطراب میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

دل اندر ہی اندر ٹکڑے ہو جا رہا تھا اور لوہوں سے آہستہ آہستہ وعائیں نکل رہی تھیں۔ ”لے رہی رجم وہ جو کوئی بھی ہے اس پر رحم کر۔ لے زندگی دینے والے اسے بچالے۔ اسے زندگی دے دے۔ میری زندگی میری عمر بھی لے ہی مٹا کر دے۔ میں نے جس جذبے کے تحت لے اپنا خون دیا ہے تو اس جذبے کی لاج رکھ لے۔ لے میرے مولا تو میری سن ہے۔ میری سن لے۔“

اسے معلوم تھا کہ زخمی نوجوان کے جسم میں اس کا خون پہنچانے کی تیاری کی جا رہی ہوگی اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ صرف ایک خون کی بوتل جو اس کے جسم سے نکالی گئی ہے کافی نہیں ہوگی۔ جب کہ اس سے قبل چڑھائی گئی خون کی چار بوتلیں اس کے خون کی کمی کو پورا کر سکیں۔ اس کا دل جا رہا تھا کہ اٹھ کر جائے اور آپریشن روم میں نصب ٹیسٹ کے پیچھے سے اندر کا احوال معلوم کر لے۔

مگر وہاں ہسپتال کے عملے کے علاوہ کچھ اور لوگوں کی موجودگی کا بھی امکان تھا۔ اور وہ کسی کے سامنے پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے تو اپنا خون دے کر کسی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک انسانی فیضہ انجام دیا تھا۔

کسی کے سامنے جا کر وہ اپنی اس زندگی کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

یوں بھی یہ نفسیاتی اثر تھا۔

یا جسم سے خون کی پوری ایک بوتل نکل جانے کا سبب۔

جو وہ واقعی نقابت سی محسوس کر رہی تھی۔

اٹھ کر ڈیوٹی روم میں آئی تو سر میں ایک گھبرائی آنے کی وجہ سے دوکھڑی گئی۔ اتفاق سے ایک سینئر نرس سسٹنٹ نرس مس شان کو ڈیوٹی روم میں موجود تھی۔ اس کے دکھڑا جانے پر۔ وہ زبردستی اسے یکڑ کر اس سائڈ روم میں لے آئی جو کہ روم سکالہ تھا۔ وہاں عموماً طبیعت خراب ہونے پر نرسز اور سسٹنٹ ڈاکٹر آکر قیام کرتی تھیں۔ اصل میں تو چونکہ رات کا وقت تھا اور باہر سائڈ روم ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے جھپٹی دوا کر اس کے گھبرائی نہیں بھیج سکتی تھی۔ البتہ سسٹنٹ نرس نے جا کر ڈاکٹر کو بتا دیا تھا۔

مس شان بہت کمزوری محسوس کر رہی ہے، لہذا وہ جا کر اس کا معائنہ ضرور کر لے۔

مگر مس شان کا تلو اس روم میں بھی نہیں نکلا۔ سسٹنٹ نرس کے جانے کے بعد وہ پھر کچھ دیر بیٹھی۔

ایک بے کلی سی اس پر سلسلہ تھی۔

بلکہ اس کا دھیان اسی زخمی مریض کی طرف جا رہا تھا۔

ایک جتنو ایک جیک سی لگی تھی۔

زخم میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اور دل میں خدشات کی ایک دفعی جھل رہی تھی۔

کہیں اس کی قربانی رائیگاں نہ چلی جائے۔

یوں اس زخمی کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

اور سرجن عانت نے تو عاف صاف کہہ دیا تھا کہ صرف خون کی ایک بوتل کافی نہیں ہوگی۔ اس لیے مزید دوا میں بوتلوں کا

بے انتظام کر لینا چاہیے۔ اس پر ایک دوسرے سرجن نے کہا تھا کہ انتظام تو ہم نے کر لیا ہے لیکن اس اتنے خراب موسم میں

زخمی مریضوں کو فرام نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا فی الوقت تو مس شان کے خون سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ اور سک روم میں بیٹھے بیٹھے

جس اس سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ اٹھ کر پھر باہر نکلتی۔ یہی معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے خون دینے کا نتیجہ کیا رہا۔

وہ ستون کی آدیں ستون کا ہی سہارا لیے بڑی دیر تک آپریشن ٹیبل کے سامنے ہی کھڑی رہی۔

تب خاصے تکلیف دہ انتظار کے بعد آپریشن ٹیبل کا دروازہ کھلا اور دونوں سرجنوں کے ساتھ تین ڈاکٹر اور دوسریں

پہنچیں تو وہ ستون کی آڈے نکل کر بے تابہان کی طرف بڑھی۔

”ایسی نرس! کوئی خیر سہرا اس نے اسی بے تابہان لہجے میں پوچھا۔

”اوہ! میں۔“ وہاں ہاں، زخمی کے جسم میں آپ کا خون جڑھا دیا گیا ہے۔“ ایک ڈاکٹر نے بتایا۔

”تو کیا کوئی امکان ہے اس کے بچ جانے کا؟“ اس نے ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ چلتے ہوئے پھر سوال کیا۔

”خیر! امکان تو نہیں کر سکتے البتہ امید ضرور ہے۔ کیونکہ موت و نیست تو خدا کے اختیار میں ہوتی ہے۔ بندہ تو صرف

اقتضای ہی کر سکتا ہے سو ہم اس کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔“ اس ڈاکٹر نے کہا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔

”ویسے بانی داوے کیا اس سے آپ کی پھر رشتہ داری ہوتی ہے؟“ اسی ڈاکٹر نے پوچھا۔

”نہیں سر رشتہ داری تو دور کی بات میں تو اسے جانتی بھی نہیں! اس نے کہا۔

”پھر تو آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے۔ لیکن آپ کی سہرا کی رہی ہیں۔ کوئی دیکھ نہیں کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہوئی آپ کو

خون دینے کے بعد؟“ ڈاکٹر کو اس سے باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی خیال آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خاصی مقدار میں اپنا خون

ڈال دیا تو اس نے پوچھا۔

”نرس! میں بالکل ٹھیک ہوں! اس نے اتنا ہی کہا اور وہاں سے پلٹ کر ڈیوٹی روم میں چلی آئی کہ ایک معمولی سی نوار دوز

لے کر آئے۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے جتنا بھی پوچھ لیا تھا وہی بہت تھا۔

اس سرکاری ہسپتال کے تقریباً تمام ہی عملے میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ڈاکٹر نرس لے کر چھوٹے درجے کے ملازمین سمیت ہر

ذاتی اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

الگ الگ بائیں طرف تھی اور چونکہ مس شان کی ڈیوٹی رات کی تھی اس لیے اور کچھ اس لیے بھی کہ ساری رات وہ بہت بے سکن

نہ تھی اس کا چاند لینے والی دوسری نرس کے آنے سے قبل ہی وہ سسٹنٹ نرس سے اجازت لے کر اپنے گھپلی آئی تھی۔ اس کا گھبرا

ہوا کوئی ہسپتال سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بلکہ ہسپتال کی عین باؤنڈری وال کے پیچھے ہزار گز کے فاصلے پر بنے نرسوں کے

رہنے کے ایک کمرے میں ہی تھی۔ جہاں اس کی ہم پیشہ دوسری نرسیں بھی اقامت پذیر تھیں۔ پروین، شازیہ، عفت اور عظیم اس

سہرا کی ہم کمر تھیں۔

ان کے رستے دن ہی وہ سخت نقابت محسوس کرتی رہی تھی اور اس نے تو اس نقابت کا سبب کسی کو بتایا ہی نہیں تھا مگر

ان کے گزرنے کے آگے ہانڈ پھوڑ دیا تھا۔ ہاسٹل کی انچارج جو ایک پرائیویٹ کلینک میں مذاونت بھی تھی اور اس ہاسٹل کا نظم و نسق

چلا رہی تھی۔ سب کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے فوڑا ہی طاقت کا اچھٹن دیا اور تقریباً سارا دن ہی مختلف اوقات میں اسے دوسرے جوس اور مقوی غذائیں کھلاتی رہی تھی اور اس نے اس کے بہت کچھ کھانے کے باوجود اسے شام کو ڈیوٹی پر بھی نہیں جانے دیا تھا۔ جب کہ اس کا دھیان برابر اسی زخمی مریض کی طرف لگا ہوا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس نے اسے اپنا خون دیا تھا لیکن وہ صرف یہ جانتا تھا کہ زخمی کیسے ہے؟ کیا اس کے فم جانے کے کچھ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

آخر خدا خدا کر کے شام کو پریزن اور شفقت وغیرہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر آئیں تو ان کی دہانی اس نے یہ مشورہ سن کر زخمی زندہ بلکہ اس کے زندگی کی طرف لوٹ آنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں تو مارے خوشی کے اس کی ہاتھوں میں اس کو اٹھا لے کر وہیں گئے۔

زخمی نوجوان موت کے منہ میں جاتے جاتے واقعی زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ مس شان کون دینے کے بعد اسے مزید خون چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی جب کہ تقریباً سارے سر جڑ اور ڈاکٹر اس کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ مہم اس امید کو بوم پر کہ شاید ان کی کوششیں بار آور ہو جائیں اور شاید مالک کون دمکان اسے زندگی دے دے وہ اس کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ مس شان کا خون اس کے جسم میں داخل کرنے کے بعد بھی وہ اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے مگر ان کی بے لوث خدمات، انھیں کوششیں اور پھر سب سے بڑھ کر جذبہ ہر دم اور ہمدردی اس پر سزاوارتھ تھا۔ کا اتنا بڑا اثر شاید یہ سارے بے لوث اور بے کھوت صادق جذبے میں ہی نہ تھا بلکہ اس کے ہر جذبے میں بے لوث اور صادقوں کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

جیسی تو اس نے ایسے صادق اور۔۔۔ بے لوث جذبوں کو دیکھتے ہوئے زخمی نوجوان کو اس کی زندگی لوٹا دی تھی وہ نہر سے لے کر ہر دینک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو زخمی نہ ہوئی ہو۔ اس پر والدین، بہنیں اور سوتے دار۔

یعنی اس کے لیے سچے دل سے دعا میں کرنے والے۔ اس کی حالت زار پر رونے اور تڑپنے والوں کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کیسے زبردست حادثے کا شکار ہوا ہے اور تقریباً جل جنتے پڑے آگنی اور انجان لوگوں کی بے لوث خدمات، کوششوں اور صادق جذبوں کے طفیل موت کو شکست دے کر زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ اور خدا ہی دوسروں کے دلوں میں رحم و ہمدردی ڈالتا ہے۔ وہی ضرب المثل کہ خدا مہربان توکل مہربان۔

مگر بندہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تو اپنی عاجل مہمیری اور ناہمکری فطرت کی وجہ سے اس ارحم الراحمین کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کی رحمت تو بے پایاں اور بے حساب ہے۔ اس کی رحمت کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے کہ رحمت کے سارے باب اس کی طرف سے کھلتے ہیں۔ کرم کی برکھادی برساتا ہے۔

یقیناً روز تک موت و ذریت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ کر آیا تھا تو بڑے حیرت انگیز طور پر رو بہ صحت ہو رہا تھا۔ کہ اگر کوئی عارف تو اسے ایک مرید کی ہی کہتے تھے۔

پوری طرح خوشی میں آنے کے بعد اس نے سب سے اپنا تعارف بھی کر دیا تھا اور آفتاب کی تپتا تپتا کر اسے جھکایا تھا۔ آفتاب بڑی پابندی سے تقریباً روز ہی اس سے ملنے آتا تھا اور وہاں ہسپتال میں۔۔۔ اس کی ایک بہت ہی اعلیٰ ڈگری یافتہ ہونے کی وجہ سے تقریباً تمام ڈاکٹروں سے یہ دوستی ہو گئی تھی۔ اور وہاں۔

ایک جہیز بھی گرم بھی کہ ہسپتال کی ایک نرس نے اپنا خون دے کر اسے زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی لایا گیا تھا کہ خون کی چار بوتلیں چڑھانے کے باوجود بھی چونکہ اس کے جسم میں خون کی کمی پوری نہیں ہو سکی تھی اس لیے یو نیول ہول کی مزید ضرورت تھی جو موسم کی خرابی کی وجہ سے فوری طور پر دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے مجبوراً اس کی درخواست پر اس کا خون لیا گیا تھا۔ بہر حال دوسروں کے نزدیک یا دوسرے معنوں میں ہسپتال کے عملے کے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم یا خاص بات نہ تھی۔

کیونکہ طبی امداد کے طور پر عموماً ایسی مدد دینی ہی پڑتی ہے۔

مگر خود اسفند کے نزدیک یہ بہت اہم اور بڑی بات تھی۔

وہ اس نرس کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے اسے زندگی کے سب سے نازک لمحات میں اپنا خون دیا تھا۔

اس کے خیال میں وہ اس کی محنت تھی اور وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار اسٹاف کے لوگوں سے بھی اس کے متعلق پوچھ چکا تھا۔

بلکہ اسے بلا بھی چکا تھا۔

مگر یا تو وہ آف ڈیوٹی ہوتی یا پھر بہت مصروف۔

اور پھر اس کی ڈیوٹی عموماً رات کو ہی ملتی تھی۔

گورات کے آٹھ بجے سے گنتی تھی مگر جہاں وہ ہمیشہ کئی کئی گھنٹے رہتا تھا۔

وہاں ادھر۔۔۔ وہ اس کے انتظار میں سلیپنگ بے کے اثر سے بڑھ کر سو جاتا۔

یوں یہ کچھ لمبی کی روز تک قائم رہی۔

اصل میں مس شان نے والد سے اس سے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ درگروانی سے کام لے رہی تھی۔ کیونکہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے سامنے جا کر اسے خواہ مخواہ ہی احساس ممنونیت میں مبتلا کر کے گویا اپنی ایک چھوٹی سی نیکی کو برباد کرے۔

جب کہ بات سبھی کافی پرانی ہو چکی تھی۔

بلکہ ہسپتال کے عملے کے نزدیک آئی گئی ہوئی تھی۔

مگر وہ تھا کہ اس کے نزدیک نرس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے سوا کوئی دوسرا مقصد باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔

اب تک بیوی کی قید میں جکڑا پڑا تھا۔ ورنہ خود آٹھ کراس سے ملنے، اس کا شکریہ ادا کرنے جاتا۔

وہ بار بار آفتاب سے بھی اس بات کا تذکرہ کر چکا تھا۔

مگر آفتاب نے کبھی اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ بلکہ اکثر یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ۔

”اچھا بھئی۔ پہلے ٹیکہ تو ہو جائے پھر اس کا شکریہ بھی ادا کر لینا۔ وہ یہیں تو ملازمت کرتی ہے۔ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی۔“

یوں کہ آفتاب کے نزدیک اپنا ہونے کے کسی کی جان بچانی ایک لائق تحسین بات نہ تھی بلکہ اتنی ہی نہیں جتنی کہ وہ ظاہر کر دیتا تھا

ہاتھ لگاتا تھا۔ یوں تو اس کے زخمی تیزی سے بھر نے شروع ہو گئے تھے۔ پیشانی اسٹینڈنگ سے نکلتی تھی تو بھوں بری طرح پھٹ

گئی تھی اور نصف سرتک سر کی کھال بری طرح رکھ کھانے کی وجہ سے کٹ کر آکھوں اور پیشانی پر آ پڑا تھی جسے دوبارہ اپنی

بڑھانے کی غرض سے اٹھارہ ٹانگے۔ لگے تھے۔ گھٹنے گھٹیاں سبھی زخمی ہو گئے تھے اور گھٹنے کی بڑی اگر کوئی نہیں تو اپنی جگہ

سے کھسک کر زخمی تھی جسے آپریشن کے ذریعے اس کی جگہ پر سیٹ کر کے تلوے سے پنڈلی تک پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا جس کی وجہ

سے ہسپتال میں اس کا قیام طویل ہو گیا تھا مگر جب سے وہ ہوش میں آیا تھا اپنے سارے اجزا جات خود اپنی جیب سے ادا کر

ہا تھا وہ پھر رات سے اسپتال وارڈ میں منتقل ہو گیا تھا۔

چہرہ پر کیا۔ اس کی گفت و شنید۔ عادات و اطوار اور رکھ رکھاؤ سمجھی کچھ اس کے اعلیٰ طبقے سے ہونے کی نمائندگی کرتے تھے۔

پھر سب کوئی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ ڈگری اور تعلیم یافتہ انجینئر ہیں ڈاکٹر بھی ہے۔ اسی لیے سب اس کی بہت عزت

کرتے تھے اور وہ سب میں سے حد درجہ دلچسپ ہو گیا تھا۔ اور سبھی وجہ تھی کہ عام دستور کے مطابق جو ہسپتالوں کا ایک طبقہ سائنس گاہ ہے

اس کے قیام کی طوالت ڈاکٹروں اور ہسپتال کے عملے کی بے نیازی اور لا پرواہی کا شکار نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے برعکس اسے

خصوصی توجہ سے نوازا جاتا تھا۔

بہر کیف۔۔۔ پھر وہ بھی آگیا جب بیویوں سے آزاد ہو کر وہ اس قابل ہو گیا کہ ہسپتال سے دس چارج لے سکے۔ ایک بس

لے کر جوتی کی تکلیف دیتی تھی جس کی وجہ سے اس کے پیر میں لنگ سا آگیا تھا۔ اصل میں آفتاب نے اپنے ایک دوست

میں اشتیام کے ہاں جو اتفاق سے سرگودھا کا ہی رہنے والا تھا اس کی سبائش کا بندوبست کیا تھا اور محض اس کی خاطر ہی

ہنگوٹھ کی بجائی لے کر آیا تھا۔

اور جب تقریباً سارے ہی علی کا شکر ادا کر کے اور رخصتی کلمات کہنے کے بعد وہ آفتاب کے ساتھ باہر کا رخ کر کے نکلتی تھی اسے اپنی حسرت بڑی شدت سے یاد آگئی۔ اس نے چلتے چلتے کسی خیال سے رک کر سید نرس سسر خیا سے پوچھا۔
 ”میں شان کہاں مل سکے گی سسر خیا؟ اور اس سوال پر سسر خیا نے پہلے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر تھوڑا سا مسکرائی۔
 ”ڈارک روم میں سر۔“ اور اس کے مسکرا کر ڈارک روم کہنے پر آفتاب کچھ اور ہی بچھا۔ اسے ہو کا مار کر ہنستے بولا۔
 ”یار کیوں ایک معمولی سی نرس پر اپنی ازبخی خصلت کر رہے ہو۔ تم سے کھڑا ہو انہیں جا رہا۔ چلو سیدی طرح جیپ میں جا کر بیٹھو۔ مگر جیسے اس نے سمجھ نہائی نہیں۔

خیا کو مخاطب کر کے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔
 ”کیا ڈارک روم میں کوئی اور بھی موجود ہوگا۔ میرا مطلب ہے میں شان کو کیونکر شناخت کر سکوں گا؟ اس کے پاس کون کا جواب بھی سسر خیا نے دانت نکال کر ہی دیا۔

”سر سے شناخت کر لینا کچھ مشکل تو نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب وہ ڈارک روم میں پہنچتی ہے تو وہاں آجالا سا پھیل جاتا ہے۔
 سر وہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ دیکھیے۔ وہ سامنے۔ وہ جو ڈیوٹی روم کی طرف جا رہی ہے وہیں اس شان ہے۔“

سسر خیا کی زبان سے اس کا اتنا چٹا معلوم کرتے کرتے وہ سامنے آگئی تو آفتاب کو بھی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔
 ”کمال ہے۔ عجیب شاعرانہ مزاج رکھتی ہے یہ سسر خیا بھی۔ مگر اب تم بھی ذرا دل تمام کے ڈارک روم میں قدم رکھنا۔
 پہلے ہی چلتے ہیں لیڈر اور رہے ہو۔ اس کے سن کا جلوہ دیکھ کر کہیں پھسل پڑے تو کہیں پھر تمہارے ننھے میں پلا سرنہ بھڑانا پڑے۔“ آفتاب بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

”میں تمہاری طرح بے پندری کا بدھنا نہیں کر ڈرا کوئی ابھی صورت دیکھی اور ہو گئے ہمارے خانے چت۔ اور اس وقت میں کسی مذاق کے موضوع میں ہوں۔ انسانیت کے اصول کے تحت اس کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور میں۔“ وہ آفتاب کے فرائض فزون پر قدر سے بھڑکتے ہوئے انداز میں بولا۔

اسی اثناء میں دو ڈیوٹی روم کے دروازے تنگ پہنچ گئے تھے۔ اس نے ڈیوٹی روم میں قدم رکھا تو آفتاب غور سے دیکھنے لگا۔

”کیے بغیر نہ رہا۔“
 ”ذرا سنبھل کے میری جان۔ مگر اس نے اس کی بکواس پر کوئی دھیان نہ دیا اور سیدھا اندر چلا گیا۔ وہ بڑی سی ٹیبل پر رکھے کسی چارٹ پر چٹکی شاید اسی کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اس نے اس سے تھوڑے فاصلے پر رک کر پوچھا۔

”اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ ہی اس شان ہیں۔“ اور وہ بڑے غیر ارادی طور پر اس کی آواز پر چونکتے ہوئے سیدی ہو کر اس کی طرف پلٹی تو اس کے چہرے پر رنگا ہنسنے کی سی مسکراہٹ لگا جیسے زمین کی گردش بگڑ گئی ہو۔

اور زمین کو کیا کائنات کی برتنے سائیں سائیں کرنے لگی ہو۔ کہنے کو ہزار باتیں تھیں اور پوچھنے کو بے شمار سوالات مگر تعجب اور بے یقینی کی بیلا میں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گویا فی سلب ہو گئی ہو۔ اور دونوں پر تالے سے پڑ گئے ہوں وہ ساکت سا تعجب سے آنکھیں کھلا کر اس کی طرف دیکھتا رہا گیا۔

جب کہ اس کے برعکس اس شان کی خفاش پیشانی پر ناگوار کی کلکٹیں سی ابھر آئیں۔ اور صبر سے چہرے سے برہمی کے آثار ہوتا ہوا بونے لگے۔

اس نے میز پر ڈاڑھی چارٹ اٹھایا اور پلٹ کر ڈیوٹی روم سے جانے لگی تو آفتاب نے جن کے لیے سارا رمل اور بھیل نہایت ہی ناقابل فہم تھا آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے اس کے ڈیوٹی روم میں آنے کی غرض و غایت بیان کی۔

”یہ میرے دوست ڈاکٹر اسفند جو کہ تعجباً ہو کر گھر جا رہے ہیں اس لیے اس وقت آپ کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ آپ نے اپنا خون دے کر نہ صرف ان پر احسان ظاہر کیا ہے بلکہ دوسرے منوں میں انہیں خرید لیا ہے۔“

گو آخری فقرہ آفتاب نے بظاہر نہایت سادگی سے کہا تھا مگر نرس مس شان کو ذرا معنی سا لگا۔ وہ کچھ کر دہی کی سی ہو کر بولی۔
 ”میرے خیال میں آپ کو شدید قسم کا معاملہ مام ہے ورنہ میں نے کسی پر احسان کیا ہے نہ کسی کو خریدا ہے۔ میں ایک انسانی فریضہ ادا کیا ہے جس کی ادائیگی ہر انسان پر ہی لازم ہے۔“ اس نے آفتاب کی طرف دیکھ کر گھومے بغیر ہی کہا۔ اور پھر چپکے سے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

اس نے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی آفتاب اس کی طرف گھوما جو ڈیوٹی روم میں رکھی ٹیبل سے کچھ فاصلے پر اسی ساکت اور صامت کیفیت میں کھڑا تھا۔

آفتاب نے اس کے قریب نہ آیا۔ انکھوں کے سامنے پہلے ہاتھ دھرایا۔ پھر اس کی پیشانی چھو کر خوشامد انداز میں منہ بنایا اور پھر اس کی نبضیں ٹٹولنے لگا۔

”میرے معلوم کہاں پہنچا ہوا تھا اس وقت وہ کہ اس نے جنبش کی نہ بلکہ چھپکائی۔
 آخر جب تنگ آکر آفتاب نے اسے بری طرح جھنجھوڑا تو اس نے بری طرح آفتاب کو جھڑکا۔

”یہ کیا حماقت ہے، آفتاب تم پہلے ہوش میں تو ہو؟“
 ”ہائیں ہوش تو تمہارے گم ہیں اور انا تم سے پوچھ رہے ہو کہ میں اپنے ہوش میں تو ہوں۔ کمال ہے بارے تم تو اسے دیکھ کر ایسے چوٹ ہوئے جیسے اس سے قبل تم نے کوئی حسین چہرہ دیکھا ہی نہ ہو۔ جبکہ تم کو کئی سال انگریز کے پرستان میں گزار کر آئے ہو۔ جھلا وہ بھی دل میں کیا سوچ رہی ہو گی کہ ڈاکٹر سردار محمد اسفند اہل آریسی پر انہماک رکھ رہے ہیں بلکہ انہماک مشق کرنے کی غرض سے آئے تھے حد ہو گئی اس دیوان پن کی بھی؟ آفتاب نے اٹھا اسے لتاڑا۔

لیکن وہ اپنے حواس میں تھا ہی کہاں؟
 اس کے ہوش تو وہ گم گم گئی تھی۔ وہ ہی ایک معمولی سی لڑکی مس شان۔ وہ اسی کے خیالوں میں گم تھا۔

اور خود کو اس بات کا یقین دلانے میں کو نشان تھا کہ اس نے جو صورت ابھی دیکھی ہے وہ سلوٹ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اور ادھر آفتاب تھا کہ ایک تسلسل سے بولے جا رہا تھا۔ آخر وہ بہت تھجھلا کر بولا۔

”افسوس ہے تم تھوڑی دیر کے لیے اپنا منہ بند نہیں کر سکتے بیکار میں ہی میرے کان کھائے جا رہے ہو۔“
 ”میں تو گمان ہی کھا رہا ہوں مگر وہ تو تمہاری عقل ہی چر گئی ہے۔ کہ آخر بات کیا ہے کچھ تو بتاؤ؟ آفتاب نے اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہنوز ایک خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

”جب کوئی بات نہیں تو پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ چلو آؤ اب چلتے کیوں نہیں یوں تو بڑی جھلک دکھا رہے تھے۔“
 وہ آفتاب کی باتوں سے زچ سا ہو کر بولا اور اپنی بات کہتا ہوا ڈیوٹی روم سے باہر نکل آیا۔

”ہوں تو دل میں کچھ کا انداز رہے جو تم لوں کئی تار ہے ہو؟ آفتاب اس کے ساتھ ڈیوٹی روم سے باہر آتا ہوا بولا۔ کہ مجھے یا اتنا ہی بوجھ تو نہیں تھا جو اس شان کو دیکھ کر اس کے بے خودی کے مظاہرے کو سمجھ نہ سکتا۔

”اگر میں نہیں بار دال میں کچھ کالا ہے نہ ہرا۔ اصل میں میں تو اب تک ہی کھتا آ رہا تھا کہ وہ بہت ضعیف نہ ہو تو کبھی کبھی عورت ضرور ہو گی مگر اب جو اسے دیکھا تو سارے انداز سے ہی باطل نکلے۔ اور میں۔“

آفتاب کو اس قدر تجسس دیکھ کر آخرا سے بات بنانی ہی پڑی۔
 ”ہو نہ ہو اور میں۔ اور وہ جو سسر خیا اس کی تعریف میں طبل لسان نظر آ رہی تھی اس کی باتوں کو کیا تم نے دیوانے کی طرح سمجھا تھا؟ آفتاب اس کے ساتھ چلتا ہوا جیپ کے نزدیک آکر بولا۔

”ہاں میں اس کی باتوں کو بڑی ہی سمجھا تھا۔ کیونکہ جس انداز میں وہ ہنسنے لگا کہہ رہی تھی اسے میں نے مذاق پر ہی ٹھونک لیا تھا۔ جیسے تو میں ایک دم ہی سیر لین ہو گیا تھا۔ مگر اس کی اس وضاحت پر بھی آفتاب کو یقین نہیں آیا۔

”لیکن اسے دیکھ کر اگر تمہیں تعجب بھی ہوا تھا تو اس قدر تو نہیں ہونا چاہیے تھا کہ تمہارا زہر اہل شوق ہو گیا۔“
 آفتاب نے اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر جیپ اشارت کرتے ہوئے کہا۔

”اور جو بھی اب ہر اگر مگر کی رٹ لگا کر بات کا تکرار بنانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ میں تو اسے دیکھ کر اس صبر سے دھڑک رہا تھا کہ جھلا اس نازک انداز میں لڑکی کے جسم سے خون کی پوری ایک بوتل نکل گئی ہو گی تو اس کے زہر کیا کیا بار ہو گا؟ اس نے آفتاب کے تجسس کو ختم کرنے کی غرض سے مزید بات بنائی۔

”ہاں ہاں۔ اماں باقی تو اتنا ہر ہا کہ تم اسے دیکھ کر چاروں خانے چت ہو گئے۔ خیر اب زیادہ مسک نہ لگاؤ۔ ہم کو دنیا میں نظر رکھتے ہیں تمہارے رخ درشن پر اس وقت جو بمبائٹ کے بعد کسی کیفیت طاری ہے۔“

اس نے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

اس نے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

اس نے ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔

پہلے اسے تو معمول پر لے آؤ پھر مصافحہ کیا بھی پیش کر لینا۔ آفتاب بھی ایک کامیاب تھا۔ اتنا تو کچھ گیا تھا مگر کچھ ہے منور مگر کیا ہے یہ اسے معلوم تھا۔

”متبار سے دماغ میں تو شیطان نے گھونسل بنا کر رکھا ہے یہیں ایسی باتوں کے سوا اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر اب اس ناکم کو ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔ وہ اتنی بیزاری اور ناگواری سے بولا کہ آفتاب کو غافل ہی ہونا پڑا۔ اصل میں وہ اسفند کے خیالات میں بری طرح حارح ہو رہا تھا۔ جو بھی وہ چپ ہوا اسفند کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات کی ایک روسی چلنے لگی مٹس شان کا چہرہ۔ اندازہ نہ تو قدامت بلکہ پورا سراپا بڑا وجود کی صورت میں اس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔

وہی چہرہ۔ وہی رنگت۔ وہی سراپا۔ وہی نیکیا سا انداز اور وہی آواز جو اس کے دل میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی چیز بھی تو اس بات کی نفی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ سلوط ہی ہے۔ اور اگر وہ سلوط سے اتنی زیادہ مشابہت بھی رکھتی ہے تب بھی یہی ہی کہوں گا کہ وہ سلوط ہی ہے۔ کیونکہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ اتنا سامان اور صریح دھوکا۔ میں تو ہزاروں میں نہیں لگا سکتا ہوں اسے پہچان سکتا ہوں۔

وہ خواہی سی روپ اور کسی عین میں بھی میرے سامنے آئے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کی آواز بھی ہو ہو رہی ہے۔ ہاں وہ صدیقی صلوٹ ہی ہے۔ یہی تو وہ میرے بلانے کے باوجود میرے پاس نہیں آئی۔ میرا سامنا کرنے سے گریزاں رہی۔ کہ کہیں میں اسے پہچان نہ جاؤں۔ ورنہ اگر وہ مس شان ہی ہوتی تو مجھے دیکھ کر اس قدر چونکتی اور بھڑکتی نہیں۔ یوں جلدی سے کتر کر نہ نکل جاتی۔ نہ ہی اس قدر ناگواری اور برائی کا اظہار ہی کرتی بلکہ بڑے علاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتی کیونکہ بوقت رخصت میں اس کا شکریہ ادا کرنے ہی تو گیا تھا اسے کاٹنے یا چھڑانے کی نفی سے تو نہیں۔

یوں بھی یہ عام سی ترسیں بڑی ہنس مکھ اور تھوڑی تھوڑی خوشامدی سی ہوتی ہیں کہ ان کا پیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

اپنی طبیعت پر جبر کر کے دوسروں کی دلجوئی اور خدمت کرنا۔ اور ان کا غم بٹانا۔ مگر وہ سلوط ہی ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے رونے اور الزام تراشی نے اسے تجھ سے سخت بدظن اور متنفر کر دیا ہے۔ لیکن تجھ سے اس قدر متنفر ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنا خون دے کر میری جان کیوں بچائی ہے؟

جبکہ میں نے تو اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اب یہ سمجھ لوں کہ اس نے انجانے میں ہمدردی کے جذبے سے زیر ہو کر اور میری پسلی اور بے کسی پر ترس کھا کر مجھے اپنا خون دیا تھا تو میری بڑی ہونے ہی ہو گی۔ اس نے یقیناً زخمی حالت میں دیکھ کر مجھے پہچان لیا ہو گا۔ مگر وہ یہاں سرگودھا آئی کیسے ہو گا؟ جبکہ لفظ نے تو کراچی کی ہر گلی کی ہونے لگی۔

اور پھر دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے اور مجھے گھر سے لکھے۔ ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی نوکر چھوڑا تھا اور اتنے قلیل ترین عرصے میں وہ یہاں سرگودھا بھی پہنچ گئی اور میرے یہاں پہنچنے سے قبل وہ ملازمت پر بھی لگ گئی۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

پھر وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگا کہ سلوط کو اس کا گھر چھوڑے آخر کتنے دن ہونے ہیں۔ اس کے جانے کے اگلے ہی دن وہ گھر کو خیر باد کہہ کر موٹل میں چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے پورا ایک ہفتہ گزارا تھا۔ کراچی سے ستان اور ستان سے لاہور تین روز سفر گزارے تھے اور تین ہفتے لاہور میں۔ سرگودھا میں قیام کے علاوہ گویا پچیس دن اور اسی چونتیس دن کے عرصے میں وہ طویل فاصلے چھلانگ کر کراچی سے سرگودھا بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی ہسپتال میں اس کی انٹری سے بہت پہلے۔ کیونکہ وہ وہاں پہلے سے ہی ملازمت کر رہی تھی۔

مگر کس طرح اور کس کے ساتھ آئی۔ اور اسے ہسپتال میں اتنی جلد ملازمت کیسے مل گئی؟ کیا اس نے پہلے سے نرسنگ کی ٹریننگ لے رکھی تھی یا کسی کی خاص سفارش پر اسے ہسپتال میں ملازم رکھا گیا ہے۔

اور وہ۔ یہی کہاں ہے۔ کس کے پاس رہتی ہے؟

ان۔ اس قسم کے سینکڑوں سوالات تھے جو اس کے ذہن میں کلید کلید کر ایک دلدلی بن رہے تھے۔ وہ سوالات کی ایک یلغار تھے کہ باگم صم سا بیٹھا تھا۔ یوں جیسے جیب میں موجود ہی نہ ہو۔ آفتاب بار بار ان کیوں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے جیب کی رفتار بھی دیکھی کر رکھی تھی۔ ورنہ اس کے دوست اور کولیگ کیپٹن احتشام کا گھر چافٹی میں ہی تھا۔

اور چافٹی یعنی کینٹ ایریا ہسپتال سے کل چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اصل میں تو آفتاب یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا دوست ایک عام سی نرس کو دیکھ کر اس قدر حواس باختہ کیوں ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی فطرت مزاج بلکہ فکس کردار سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا دوست آجکل کے چھپوے لڑکوں کی طرح خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر پھسل جانے کا عادی نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت مؤثر۔ باوقار۔ مستقل مزاج اور معتبر انسان ہے۔ اعلیٰ نسب بھی رکھتا ہے اور حیثیت بھی۔

بہر حال وقت کم تھا اور آفتاب کو ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ اپنے کینیٹانڈر سے حادثے میں بری طرح زخمی ہو جانے والے کون کو ہسپتال سے گھر لے کر آئے گا۔ اس کا ذکر کر کے ہی تین گھنٹے کی چھٹی لے سکا تھا۔ اس لیے کیپٹن احتشام کے بنگلے پر اسے اتار کر۔ بلکہ احتشام کے بھائی سے اس کا تعارف کر کے اس کی رہائش کے لیے غرض کے کئے کئے میں چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔

وہ بھی خدا سے یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے تنہائی اور کیسوی نصیب ہو تو وہ سارے معاملات پر۔

فائدے دل سے غور کرے۔ اصل میں اپنے تئیں یارحقین دلائے کے باوجود بھی کس شان اصل میں سلوط ہی ہے اسے کبھی طور پر اظہار نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ حالات اور کوائف بھی کچھ ایسے تھے۔

اور پھر وقت کا دائرہ درمیان میں شامل ہو رہا تھا۔ دل تو یہی گواہی دے رہا تھا کہ بلاشبہ وہ سلوط ہی ہے۔ لیکن دماغ دل کی اس گواہی کی نفی کرتا نظر آ رہا تھا۔ حالات بھی تو کچھ ایسا رنج اختیار کر گئے تھے کہ ان سارے واقعات کا انحصار۔ اتفاقات۔ حادثات۔ معجزات اور کرشمات پر ہو کر رہ گیا تھا۔

یعنی اس کا مزنگ تک آنا اور جو پچھا پچھی سے ملنا تو اتفاقات پر ہی منحصر تھا۔ اور اس کے نزدیک ہر کوئی ایسا معجزہ یا کرشمہ نہیں تھا کیونکہ دنیا میں آئے دن ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔

مگر اس کا سرگودھا آتے ہوئے ایک حادثے سے دوچار ہو جانا اور ایک ایسے ہسپتال میں داخل ہو جانا جہاں انسان دوستی میں نرس مس شان کا سے خون دینا اور پھر۔ اس کی سلوط سے اتنی زیادہ مشابہت کہ اس کو چھپاؤ اور دوسری کو سامنے کر دو۔

پھر جتنے دلال اس میں کوئی خامی کوئی فرق نہ تلاش کر سکے۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اس نے پڑھا ہی نہیں۔ سن اور تجربہ بھی کھاتا کہ جڑواں بچوں میں آپس میں بہت مشابہت ہوتی ہے۔

بعض میں اتنی کران کی علیحدہ علیحدہ شناخت کے لیے۔ کوئی نہ کوئی شناختی نشان لگانا پڑتا ہے اور اتنی زیادہ مشابہت صرف جڑواں بچوں میں ہی ہوتی ہے۔ اوپر تلے کے بہن بیویوں میں اگر ہوتی بھی ہے تو اتنی زیادہ نہیں۔ اور ایسے لوگ جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ جن کی قومیت بھی جدا گانہ ہوتی ہے اور جن کی ان کی بھی اگر آپس میں مشابہت ہوتی ہے تو اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ اس مس شان اور سلوط میں تھی۔

حب کہ وہ بھوپنہا کی زبانی یہ بھی سن چکا تھا کہ ان کی دوسری بیوی کے لیٹن سے صرف اور صرف سلوٹ ہی کو لے ہوئی تھی۔ گویا اس کا امکان بھی ختم ہو گیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری جڑواں بہن بھی ہو سکتی ہے۔ اس نکتے پر غور کرتے کرتے وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ خود جا کر مس شان سے ملے گا اور یہ معلوم کرے گی کہ اس کا اصل معاملہ کیا ہے۔ ایک آس اسے یہ بھی بندھ گئی تھی کہ اگر وہ واقعی سلوٹ ہی سے تو پھر اس کے لیے تو مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔

چینگ تو بہت معمولی سی بات تھی۔ اسفند کو تو ایک بیتیاری سی تھی کہ نہ اٹھے چہن نہ بیٹھے چہن بس ایک ہی خیال ایک ہی تصور ایک ہی دھن کہ بس کسی نہ کسی طور پر مس شان کی اصلیت کو دور یافت یا دوسرے معنوں میں اس کی اصلیت کا پردہ چاک کر کے سلوٹ کو براہِ مد کر لے۔ گویا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح مس شان کو سلوٹ ثابت کر کے دکھائے۔

ان دنوں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بھوپنہا سے وعدہ کر کے آنے کے بعد سلوٹ کی طرف سے اس کا ہیر لیشن بہت خراب ہو گیا تھا یا اس کے بارے میں کیسے خیالات تھے۔ جن کے پیشِ نظر وہ سلوٹ کو کھوج نکالنے میں لیت لعل سے کام لے رہا تھا۔

جیسی تو بھانپنے پر کراچی کی مہر دیکھ کر اس خیال سے وہ لا پرواہ سا ہو گیا تھا کہ کراچی جیسے غدار شہر میں جو سمندر کی سرکش لہروں کی طرح جھوٹی بڑی ہر شے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے سلوٹ کو آسانی سے ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہ تھا۔ البتہ جب وہ کراچی واپس لوٹے گا تو اسے ڈھونڈنے کی کوشش مفرد کرے گا۔ اور اس کا اصل سبب یہی تھا کہ اس کے دل سے سلوٹ کے حصول کی لگن جاتی رہی تھی۔ وہ تو حالات کشاں کشاں اسے سرگردم حالے آئے تھے اور اس اتفاق پر تو وہ صدقِ دل سے کرمہ قدرت اور معجزات پر ایمان لے آیا تھا۔

اسے اسپتال سے آفتاب کے دوست کے گھر آنے دو روز ہو گئے تھے۔ اور جب سے بار بار وہ ان حالات پر غور کر کے واقعات کی کڑیاں جوڑتا رہا تھا۔

جس روز وہ کیپٹن احتشام کے گھر آیا اس سے اگلے روز انہی شدید مصروفیت کی وجہ سے آفتاب اس سے ملنے نہیں آ سکا تھا۔ اس نے فون پر اس سے معذرت بھی کر لی تھی۔ مگر اس سے اگلے روز بھی اس کے آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کیونکہ اس کی راہ دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی تھی وہ چاہتا تو خود بھی اسپتال جا سکتا تھا۔ مگر اسپتال جانے کا ایک تو کوئی جواز ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس کے ٹھٹھے پر جو بینڈیج بندھی ہوئی تھی وہ ہڈیوں کو آپس میں جوڑنے سے کہنے کی باندھی گئی تھی اور اس کے کھٹنے یا تبدیل کیے جانے کا کافی وقت کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

جبکہ چلنے پھرنے میں اسے کوئی تکلیف یا دقت بھی نہیں ہوتی تھی۔ بس کبھی کبھی پیر زمین پر ٹکراتے وقت اس کی ہلکی سی چپک مڑو غصوس ہوتی تھی۔ اور یہ کوئی ایسی قابل توجہ بات نہیں تھی۔

دوسرے وہ آفتاب کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ آفتاب کو نہ صرف بات کرنے کا ٹیٹ آتا تھا بلکہ اس کے غلے سے خاصا گھل بھی لیا گیا تھا۔ کہ اس کی فطرت ہی کچل سی تھی اور اگر وہ مس شان کے بارے میں کچھ سوچتا تو اس کے ذریعے پہنچا سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو مس شان سے ملنے اور اسے غور سے دیکھنے کو چلا جا رہا تھا۔ بس یہی ایک اشتیاق ہی ایک آرزو تھی جس نے اسے کمپن احتشام کے گھر کے اجنبی سے ماحول میں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ تو ایک دن بھی سرگودھا میں رہنے کا ارادہ نہ ہوتا۔

کیونکہ مس شان اس کی راہ میں ایک رکاوٹ سی بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور وہ اس کا مقصد حل کر کے ہی وہاں سے جا سکتا تھا۔ پھر حال پورا دن گزار کر کہیں بعد مغرب آفتاب نکل کے آیا تھا اس نے آتے ہی گزشتہ روز سے آگے کی گویا صفائی پیش کی۔

"ویری سوری یار پرسوں ڈو ٹی پر واپس پہنچے ہی کچھ ایسے اہم کام سر پر ڈال دیے گئے کہ ایک جھپکائی کی بھی ملت نہیں ملی یقیناً کرو دو راتوں سے سو یا ہی نہیں۔ آج تین بجے کے قریب کہیں جا کر فرمت ملی تو اتنا شک گیا تھا کہیں پہنچے ہی وری اور جو توں سمیت ہی پڑ کر سو گیا۔ اب آٹھ بجے تو بس لباس تبدیل کر کے سیدھا تہارے پاس چلا آیا۔ اور وہ جس کا موڈ آفتاب کا انتظار کرتے کرتے نہ صرف آف ہو گیا تھا بلکہ اس اجنبی ماحول میں تنہا بیٹھے بیٹھے وہ جو ریت کا شکار بھی ہو گیا تھا چھوٹے چھوٹے منہ کے ساتھ نروٹھے سے انداز میں بولا۔

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو کم از کم میرے سامنے تو تمہیں کوئی و مناحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہو گی میں تمہارے خرافات کی نوعیت سے بخوبی واقف ہوں۔"

"راہچا اگر واقعتی ہو تو پھر تمہارے رج روشن پر یہ اتنی موٹی چربی کی تہ کیوں جی نظر آ رہی ہے اس پر انداز تکلم بھی ایسا جیسے کورے شعلے میں پتھر بھر کر کوئی سے ہلار رہا ہو۔ آفتاب نے اسے منہ پھلنے دیکھ کر پوچھا۔

"چربی کی تہ میرے چہرے پر نہیں تمہاری آنکھوں پر چڑھ گئی ہے تبھی تو سامان کے اندسے کی طرح تمہیں ہر ای ہر نظر آ رہا ہے ورنہ میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں اب تمہیں دیکھ کر ٹھٹھا لگانے سے تو رہا تھا۔ اسفند نے جملے کئے کے سے انداز میں کہا۔

"بابا بابا یہ ٹھٹھا بھی خوب کہا تم نے۔ گویا رقص کے فن پر بھی تمہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ واہ کیسے ٹھٹھا کہا ہے۔ واہ جواب نہیں اس ادا کا بھی۔ آفتاب ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ اب آفتاب کو اس کی ناراضگی کا اصل سبب تو معلوم نہ تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی دودن کی غیر حاضری نے اسے ناراض کر دیا ہے۔ اسفند نے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا۔ بس اس پر ایک طبعی سگتی نظر ڈال کر رہ گیا۔

"ارے یار جب میری مجبوری سے واقف ہو تو پھر اتنا تنہا دکھانے کی کیا ضرورت ہے جانتا ہوں کہ اس اجنبی اور نئے سے ماحول میں تنہا رہ کر تم نے بڑی کوفت اٹھائی ہوگی۔ مگر خراب تو میں فارغ ہوں کل عام تعطیل ہے اور پرسوں بھی کچھ چٹی ہی ہوگی اس کے بعد پورا نہیں تو کم از کم آدھا دن بلکہ آدھی رات تو تمہارے ساتھ ہی گزارا کرے گی۔ آفتاب اسے اس قدر چہیں بھیس دیکھ کر بولا۔

"ہو نہ ہو آدھا دن اور آدھی رات۔ جیسے میں ساری زندگی یہیں گزارنے آیا ہوں۔ تپا نہیں وہ کوئی نئی غریبی تھی جو مجھے بیٹھے بیٹھے یہاں آنے کی سوجھی تھی۔ جو یہاں آکر ایسا جھنسا کہ آج میں بائیس روز بٹو کے اور کوشش کے باوجود وہاں سے نکل ہی نہ سکا۔ مگر اب ایک دن بھی مزید مجھے یہاں گزارنا گوارا نہیں میں کل صبح ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اسفند بگڑے بگڑے انداز میں بولا۔

"اچھا تو کیا تمہارے ٹخنے کی چوٹ ٹھیک ہو گئی ہے؟ آفتاب نے واپس کے لیے اس قدر سفید دیکھ کر اسے ٹخنے کی تکلیف کا احساس دلایا۔

"ٹخنے کی چوٹ کوئی ایسا مشکل یا تشویش ناک مسئلہ نہیں ہے۔ جو یہی بڑی اپنی جگہ پر جم جائے گی پینڈیج بھی کھول دی جائے گی اور یہ کام کراچی میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ زیادہ بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔ اس نے بیزار کن سے لہجے میں کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو تمہارے سر کے ٹانگے بھی خشک نہیں ہوئے۔ تمہیں جانے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ کرنل عارف کو دکھانا چاہیے تھا۔ اور چلنے پھرنے میں تمہارے پیر میں تکلیف تو نہیں ہوتی۔ آفتاب چاہ رہا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے وہ اپنے دوست کو جانے سے باز رکھے۔

"نہیں۔ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ سر کے ٹانگے بھی آدھے سے زیادہ خشک ہو کر جھڑکے ہیں۔ اور اگر نہ بھی جھڑے ہوں گے تب بھی میں یہاں سے جانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔ اسفند اٹل سے لہجے میں بولا۔

"خیر تمہاری مرضی۔ ورنہ میں نے تو ایک قاعدے کی بات کہی تھی۔ کہ ایک تو تم خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزور ہو گئے ہو۔ دوسرے جانے سے پہلے نہیں کم از کم کرنل عارف اور سرجن افتخار وغیرہ کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا۔ جنہوں نے تمہیں جانے کے لیے ایڑی اور چوٹی کا زور لگا دیا تھا بلکہ دوسرے معنوں میں دن کو دن سمجھا تھا۔ رات کو۔ رات آفتاب نے کہا۔

"خیر ان دونوں سرجنز کا ہی نہیں بلکہ تقریباً پورے ہی محلے کا شکریہ میں پرسوں وہاں سے روانگی کے وقت ادا کر چکا ہوں اور جہاں تک میری جان جانے کا سوال ہے تو وہ اللہ تعالیٰ نے ایک نرس کے دل میں میری ہمدردی اور رحم ڈال کر کچا ہی تھی۔ ویسے جی موت اور ذلیست خدا کے ہی اختیار میں ہوئی ہے کسی بندے میں اتنی تاب اور جمال نہیں کہ وہ کسی کو مار یا جلا سکے۔" اسفند بولا۔

"خیر یہ تو ایک جاہل شخص بھی جانتا ہے کہ موت و ذلیست خدا کے اختیار میں ہی ہوتی ہے۔ مگر موت کے منہ سے نکال کر زندگی کی طوٹ لے جانے کا فرمن بھی خدا نے بندے کو ہی سونپا ہے۔ ورنہ ایکسپلنٹ کے بعد جو حالت تمہاری ہو گئی تھی اگر ایسی حالت میں تمہیں یونہی چھوڑ دیا جاتا۔ یعنی یہ میل اللہ تو پھر آج تم کیوں پٹر پٹر باتیں کرتے نہ نظر آتے۔ ویسے یار ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تم نے اپنے شوق سے یہ میڈیکل لائن اختیار کی تھی یا محض اپنے والدین کی دیرینہ خواہش پر یہ لائن اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے؟ آفتاب اس کی باتوں پر قدرے جزمیز سا ہو کر بولا۔

"کیوں بھی یہ خیال تمہیں کیوں آیا۔ جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرا شروع سے رحمان ہی اس طرف تھا۔ اور پھر کسی پریشانی میں آکر وہ بھی سمجھتا کہ اپنا نو کرنے میں تو کسی کا بھی دخل برداشت نہیں کر سکتا تھا کیوں بھی میں نے جتنا پڑھا ہے اپنے شوق سے ہی پڑھا۔ وہ بھی قدرے چمک کر بولا۔

"تو پھر میں ہی کہوں گا کہ تم نے اتنا کچھ پڑھ کر محض نگہوں پر ہی لا دیا ہے۔ تبھی تو ڈاکٹر ہو کر تم ایسی باتیں کر رہے ہو جو صرف ان پڑھ ہی کر سکتے ہیں۔"

"آفتاب نے کہا۔ اور اسفند نے سوچا کہ اس نے آفتاب کی استہلال جانے کی اچھی خامی تجویز کر دے کہ سخت حما کا ثبوت دیا ہے ورنہ اتنا اچھا موقع ملا تھا اس شان تک رسائی کا۔ اب بھلا اس سے کیونکر کہے کہ میں تو تمہارے انتظار میں اپنی غرض سے بیٹھا تھا کہ کب تم آؤ اور کب میں کسی نہ کسی بہانے سے استہلال پونچوں۔

"یار یہ بے شباتی اور بے مروتی کم از کم تمہارے پیشے سے تو مطابقت نہیں رکھتی۔ تمہیں تو بہت علق بہت نفس اور غصہ المزاج ہونا چاہیے۔ اسے خاموش دیکھ کر آفتاب سمجھا کہ اس نے اپنی باتوں سے اسے قائل کر دیا ہے۔

"اوہو بسنی آخر تم چاہتے کیا ہو کیا یہی کہ میں کل اپنا جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اس نے دانستہ طور سا چہرہ دکھا۔

"خیر ممکن اند ناممکن کی بات تو رہتے ہی دو کیونکہ ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ انسان اتنا اپنی مرضی سے ہے اور ہمارا دوسری کی مرضی سے۔ لیکن میں اب تمہیں روکوں گا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنا چیک اپ ضرور کراؤ۔" آفتاب بولا۔

”مگر اب وقت ہی کہاں رہا ہے چیک اپ کرنے کا۔ صبح میں جا رہا ہوں اور اس وقت رات ہو گئی ہے اس لئے اس انداز میں کہا جیسے آفتاب کی باتوں سے زچ ہو گیا ہوں۔“

”رات ہو گئی ہے تو کون سی ایسی آدمی یا تہیں جو حقانی رات ہوئی ہے۔ ابھی تو مغربی افق پر شفق کے رنگ بھی نہیں دھندلائے۔ یہ کہو کہ تم جانے کے موڑ میں نہیں ہوئے آفتاب اس کے اوپر ڈر سے پکڑنے پر چڑھ کر بولا۔“

”اے نہیں یار موڑ موڑ کیسا۔ ہمیں نا کہیں تو چلنا ہی ہے تو پھر چلو اسپتال ہی چلے چلتے ہیں۔“ اس نے مزید انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسپتال جانے کے لیے آمادگی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”او گد۔ تو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آفتاب نے اس کی آمادگی پر خوش ہو کہا۔“

”ہیں تیار ہونا کیا ہے۔ میں کوئی بر دکھو کو تو جا نہیں رہا۔ بس اسی پینٹ اور شرٹ میں چلا چلتا ہوں۔ بہت ہوا تو اس پر کوٹ پہن لوں گا۔“

”ہاں کوٹ ضرور پہن لو کیونکہ گلابی جاڑا شروع ہو چکا ہے اور خشکی بھی بڑھ گئی ہے۔ آفتاب نے کہا تو اس نے آٹو کر کوٹ پہنا اور چپ چاپ آفتاب کے ساتھ اس کی جیب میں بیٹھ کر اسپتال کا رخ کیا۔“

وہ بڑے شخصے میں پڑ گیا تھا یعنی آفتاب کے ساتھ آئے تو آفتاب نے کیا کیا لیکن دل کی بات اسے نہیں بتا سکا تھا۔

اور پھر اس نے تو آفتاب پر ظاہر بھی ہی کیا تھا کہ اسے اس وقت اسپتال کی کوئی احتیاج ہے نہ دلچسپی۔ اس کے باوجود

بھی وہ چاہ رہا تھا کہ آفتاب کے ذریعے مس شان سے ملے اور اسی کی وساطت سے مس شان سے بات کرے۔ مگر

ایسا کرنے کو تکیہ نہ کرے۔ کیونکہ اسے کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہ تھا کہ سلوط سے اپنے تعلق کو بیان کرنا تو بڑی بات

وہ سلوط کا نام بھی اس کے سامنے لے کر یہ اس کا اور اس کی بھوسھی کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اور آفتاب کو اصل حقیقت

سے آگاہ کرنا وہ اپنے وقار کے منافی سمجھتا تھا۔

وہی بھی بھلا وہ سلوط سے متعلق ساری تفصیل کہہ کر بیان کر سکتا تھا۔ آفتاب سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس کے

بھوپکا کی بہن یا چرمنجی معنوں میں بیٹی گھر چھوڑ کر کہیں رو پش ہو گئی تھی وہ بھی اس کے گھر سے بلکہ خود اسی نے اسے گھر سے

نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اس من میں باقی تمام واقعات بھلا وہ کیسے اسے بتاتا کہ اس میں مس شان کی خوبصورتی

پر نہیں مرنا بلکہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ کیا وہ سلوط ہی ہے اور اسی لیے بڑی بے چینی سے تہہرامنظر تھا کہ

تم آؤ اور تمہارے ساتھ چل کر مس شان کی اصلیت کا پتا چلاؤں۔ اور اسی تجوئے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی

ہیں۔ میں حقیقت معلوم کیے بغیر یہاں سے جا ہی نہیں سکتا۔ وہ تو بس تمہاری دودن کی غیر حاضری پر شفق کا ایک اظہار

تھا۔ ورنہ میرا تو دور تک بھی وہی کا ارادہ نہیں ہے۔

گو مگوں کی کیفیت میں مبتلا وہی سوچے جا رہا تھا کہ آفتاب کو کون الفاظ اور معنوں میں اپنے اسپتال جانے کا مقصد

سمجھائے۔ آخریت سوچ و خیال کے بعد اس نے موضوع نکالا۔

”یار لویو تو تقریباً ہر اسپتال کا علمہ ہی فرض شناس اور مستعد ہوتا ہے لیکن۔ اس اسپتال کے علمے کے خلوص۔

اپنائیت اور توجہ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور خاص طور پر نرس شان سے جس نے مجھے اپنا خون دے کر

زندگی کی طرف لوٹا دیا۔ اصل میں تو شکر ہے مجھے اس کا ادا کرنا چاہیے۔“

”لیکن تم نے اس کا شکریہ ادا تو کر دیا اب کتنی بار کرو گے آخر جبکہ وہ تو ایسی بگڑی جیسے تم نے کوئی بے جا بات

کہہ دی ہو۔ آفتاب بولا۔

”لیکن میں نے تو اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ وہ تو تم نے ہی بیچ میں کو کر دے جانے کیا انٹ سنٹ بک دیا تھا تبھی تو اس کی تیوری ایک دم ہی چڑھ گئی تھی۔“ اسفند نے کہا۔

”لویہ اور ہوئی۔ اے گھاس تو اس نے تمہیں نہیں ڈالی تھی۔ اس پر اسے دیکھ کر تمہاری سٹی ہی گم ہو گئی تھی آخر مجھے ہی بیچ میں کو کرنا پڑا تھا اور میں نے اس سے کون سا ایسا اظہار عشق کیا تھا صرف تمہارے آنے کی ضمنی غایت ہی تو بیان کی تھی۔“

”ادباں ہاں یہ تو تم نے اچھا ہی کیا تھا۔ مگر میں خود اپنی زبان سے ایک مرتبہ اور اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

تمہارے بقول اگر وہ ایک معمولی سی نرس بھی ہے تب بھی ہر روز پر عورت کا احترام کرنا واجب ہے۔ خواہ وہ کسی بھی

بے تعلق رکھتی ہو اور اس نے تو مجھ پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ اسپتال پہنچ کر سب سے پہلے ہی اس کا شکریہ ادا

کرنے کا۔ اسفند نے آخر چندا عیاں کر ہی دیا۔

”ہاں ہاں تو یہ کہو کہ اس کے تیز نظر نے تمہیں گھائل ہی کر کے چھوڑا۔ ویسے وہ جو انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔

Love at first sight saves lot of money and time.

یعنی نظری محبت میں پیسہ بھی بچتا ہے اور وقت بھی، تو تمہارے لیے تو یہ بہت سودمند رہے گا۔ یعنی خیال رہا نہیں

اسا اس کے کہ وہ لڑکی تمہارے طبقے سے میل نہیں کھاتی۔“

آفتاب نے ٹھٹھ مار کر کہا۔ مگر اس کا لہجہ چھبتا سا تھا۔ اور وہ جو نہایت صبر و تحمل سے اس کی کبواں میں رہا

تھا۔ اس نے اٹھا اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری اس لو ٹینڈنسی (LOW TENDENCY) سے اس سے زیادہ اور میں کیا ایکسیکٹ۔ (توقع کر) سکتا

ہوں۔ ورنہ میں تو ایک اخلاقی فریضہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔ اہم یہ کہ اپنی بھنگی ہوئی ذہنیت میں بات کو کہاں سے

کہاں لے گئے۔“

”اے کاش جیسا کہ تم کہہ رہے ہو یہ بات وہیں تک محدود ہوئے آفتاب پھر فخر کئے سے باز نہ آیا۔ اسفند نے

اس کے اس فقرے کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ وہ اس گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا نہ اہمیت ہی۔ لوں بھی اس

نے یہ موضوع آفتاب کو پہلے سے ہموار کرنے کے لیے شروع کیا تھا۔ مبادا عین وقت کے وقت وہ ہتھے سے ٹکھڑا ہو جائے۔

بہر حال۔ کچھ دیر بعد راستہ تمام ہوا اور وہ دونوں اسپتال پہنچ گئے۔ اندر مہارت میں قدم رکھتے ہی فرش سے

الٹنی فٹنل اور دوڑوں کی طلی جلی بولنے ان کا سوگت کیا۔

اسپتال کا ماحول بھی وہی تھا جو تقریباً سارے اسپتالوں کا ہوتا ہے۔ وہی مریضوں کی آمد و رفت۔ وہی ادھر ادھر

پرتی نرسیں۔ اسٹریجر اور مرٹا لیاں دھکیلنے وار ڈولہائو۔ اکاد کاراؤنڈنگاٹے ہوئے ڈاکٹر ڈاؤر وارڈ کے کھٹے بند ہوتے

دردنازے۔ مگر اس پر بھی ایک سونا سونا پرت۔ ایک ویرانی سی۔ یوں بھی اس لمبے اسپتال میں اتنا ریش نہیں تھا۔

زندگی کی تحریک اگر دواں دواں تھی تو بہت نیچے تلے انداز میں ایک قاعدے کے ساتھ ایک گنجیری خاموشی چہار

فان مسلط تھی۔

”باہر تو کوئی نظر نہیں آ رہا تو سرجن عارف کے روم میں چلتے ہیں۔ آفتاب نے ادھر ادھر گھومتی غیر شناسا صورتوں کو

دیکھ کر آدھے کے چلنے اور چمکنے ہوئے فرش پر چلتے ہوئے کہا۔

جبکہ اسے کسی سرجن سے غرض تھی نہ ڈاکٹر سے۔ وہ تو اندر داخل ہوتے ہی ادھر ادھر دیکھ دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ

محبوب میں شان ملتی بھی ہے کہیں۔ یہی تو ممکن ہے کہ اس کی ڈیوٹی صبح ہو گئی ہو۔ اور رات کے بجائے صبح ہی تبدیل

لڑی گئی ہو۔ یا پھر اندر کسی وارڈ یا روم میں موجود ہو۔ اب صلا میں اس کی تلاش میں کرہ چھاننے سے تو رہا آفتاب

طاس سے سرجن عارف کے روم میں چلے کو کہا تو وہ انہی خیالات میں کھویا کھویا اس کے ساتھ سرجن عارف کے کمرے کی

فان بڑھ گیا۔ اور جب وہ دونوں ایک طویل راہداری سے گذر کر ایک نصف سے زیادہ کو ریڈر عبور کر کے سرجن

عارف کے کمرے تک پہنچے تو باہر بیٹھے ہوئے چیراسی نے ان کا راستہ روک کر بتایا کہ سرجن عارف ابھی تک نہیں آئے اور

انہی ان کے آنے کا کوئی امکان ہی ہے۔ تب آفتاب نے اسفند سے کہا۔

”چلو پھر واپس چلتے ہیں۔“

”ہاں خواہ خواہ یہاں آکر وقت ضائع کیا۔ اسفند بھی بولا کہ اس سے شان کے ملنے کی بھی کوئی امید نظر نہیں آ رہی

تھی اور اندر ہی اندر وہ بھگ سا گیا تھا۔ رفتاً آفتاب نے اسے ٹوکا مارتے ہوئے کہا۔

”لو سمجھو کنواں آج خود چل کر پیاسے کے پاس آ رہا ہے۔ خاصے خوش قسمت ہو تم اس معاملے میں۔“
 ”بائیں دھاٹ۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ اسفند۔ اس کے بھوکا مارنے کے باوجود بھی نہیں کھو سکا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔“
 ”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو وہ دیکھو سامنے۔ وہ تمہاری گل اندام اور ہری کار کڑ کر رہی ہیں۔ اور اس کی بات پر اسفند نے بہت چونک کر سامنے دیکھا۔ اصل میں دونوں دوست راہداری سمور کر کے سب سے پہلے اس کے پاس آئے۔ آگئے تھے۔ جہاں مریشیوں کے وارڈ تھے اور سرے پر ڈیوٹی روم۔ اور مس شان شاید ڈیوٹی سے ہی نکلی تھی اس کا بڑا ان دونوں کی طرف ہی تھا۔ اسے دیکھ کر اسفند کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔
 قدرت اس پر اس قدر مہربان بھی ہو سکتی ہے اسے یقین ہی نہ آیا۔

اصل میں وہ اس قدر غیر متوقع اس وقت نظر آتی تھی جب وہ اس طرف سے مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔ وہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ اور آفتاب کو پیچھے ہی چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اور وہ جواسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر جلدی سے دوسری طرف گھوم کر واپس جانے لگی تھی۔ وہ اس کا پچھا کرتا ہوا اس کے قریب جا کر بولا۔
 ”سینے میں اس میں آپ سے ہو تو اس نے کھڑی بھر کر اس کی طرف گھومے بغیر بڑے درشت بیچے میں کہا۔
 ”میں اس وقت سخت مصروف ہوں آپ بلز میرا ٹائم ویسٹ نہ کیجیے۔ اور اتنا کہہ کر وہ بڑی سرعت سے چلنے لگا اور ڈیڑھ گیس لگی۔ اور وہ اپنا سامنے لے لے وہیں کھڑا رہ گیا۔

”معلوم ہوتا ہے مس شان نے گھاس نہیں ڈالی۔ تبھی تو تم ریوڑ سے بھڑ جانے والے منڈے کی طرح ایک دم بے کسی کا اشتہار بنے نظر آ رہے ہو۔ مگر خیر ہمت نہیں ہارتے دریا بہ درست آید۔ آفتاب نے جو اسے مس شان کی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی جگہ پر ہی رگ کیا تھا۔ اچانک پیچھے سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو بری طرح چونک کر اس نے اپنے شانے پر رکھا اس کا ہاتھ جانتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔
 ”جو بھی تمہیں تو سوانے اول قول کہنے کے کچھ آتا ہی نہیں۔ ورنہ اس کی کیا مجال جو مجھے گھاس نہیں ڈالے ایک ہی ٹرس۔ مافی فٹ۔ اس وقت تو نہیں مگر آفتاب کے کہنے پر ہی اسے اپنی اور شان کے درمیان حیثیتوں کے فرق یاد آئی کے ہاتھوں خوار ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس لیے وہ ایک دم ہی کھول اٹھا تھا۔

”ہیں ہیں آتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بات کیا ہوئی کچھ تو بتاؤ۔ آفتاب نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔
 ”بات کیا ہوتی۔ اسی روز کی طرح غرہ دکھا کر گئی ہے۔ مگر خیر دیکھا جائے گا۔ آؤ اب چلتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ آفتاب مزید کوئی سوال کرے اسفند نے جلدی سے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ پھر جیب میں بیٹھے کے بعد بھی خاموش خاموش سا رہا۔ جبکہ آفتاب بہت کچھ تناڑ گیا تھا اور بہت کچھ کہنا بھی چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اسفند کی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ کہ اس سے کچھ اگلوںا تو کچھ اس معاملے کو زیادہ کر دینے پر وہ اس سے خفا ہو جائے گا۔ وہ اس کا موڈ بھال کرنے کی غرض سے اسے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں بیٹھ کر دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔ موضوع بدلا۔

اور دھڑکی باتیں ہوئیں۔
 اس کے باوجود بھی اسفند اٹھا اٹھا سا رہا۔
 پھر آفتاب اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر صبح آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور وہ شب خوابی کا لباس تبدیل کیے بغیر۔ بڑی دیر تک بیٹھا۔ اپنے اس حد تک گر جانے پر کھولتا ہی رہا۔
 آخر کچھ کا ضرورت تھی اس قدر بے قابو ہو جانے کی کہ اسے دیکھ کر بلا سوچے سمجھے اس کی طرف دوڑی پڑا۔ اور نتیجے میں منہ کی کھائی کیس قدر ذلیل ہوا ہوں میں خود اپنے ہاتھوں۔ آفتاب بھی کیا سوچتا ہو گا کہ یہ کس قدر گناہ گوارا انسان ہوں۔ کہ اتنی اعلیٰ حیثیت اور نسب رکھتے ہوئے بھی ایک معمولی سی ٹرس کی خوبصورتی پر فریفتہ ہو گیا ہو۔ آخر میں یہ کیوں قبول کیا تھا کہ میری بھی ایک مستحکم اور اعلیٰ شخصیت ہے۔ میں معاشرے میں ایک اونچا مقام رکھتا

ہوں۔ اور ذاتی طور بھی اونچا ہوں۔ اب آفتاب کو یہ تو معلوم نہیں ہو گا کہ وہ غیر معمولی حد تک سلوط سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور میں یہ معلوم کرنے کی غرض سے اسے اتنی اہمیت دے رہا ہوں۔ وہ تو ہی کچھ رہا ہے عمر کے آفتاب سے اور جوانی جوئی نے مجھے اس کی طرف مائل کر رکھا ہے۔ اور اس کی بیوی کچھ غلط بھی نہیں کہ ظاہری طور پر وہ کچھ دیکھ رہا ہے۔ اگر کوئی اور بھی دیکھتا تو یہی سمجھتا۔ تبھی تو وہ اپنی دانست میں وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے ہلکی سی تاننا رہتا ہے۔ نف ہے ایسے جذبے پر اور لعنت ہے ایسی کھوج پر۔ اب سلوط خواہ ساری عمر ہی نہ ملے میں تو اس کے پیچھے ڈر خواہ نہیں کروں گا۔

یہی سب سوچتے ہوئے اس نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ اور اپنی خیالات میں اُلجھے اُلجھے وہ سونے کی غرض سے بیٹھ گیا۔ چند کر دلیں لیں۔ اور سلوط کی تلاش سے بری الذمہ ہونے کے بعد۔ ذہن کو کچھ سکون ملا تو اس نے ہڈیوں کے دماغ سے پھر سوچنا شروع کیا۔

نہ دل۔ دماغ کا ساتھ دے رہا تھا نہ دماغ سے کیے گئے فیصلے کی تائید کر رہا تھا۔ بلکہ اسے سختی سے ڈانٹتے اور بھارنے کے باوجود جیسے جیسے کچھ رہا تھا کہ بلاشبہ مس شان سلوط ہی ہے۔ بڑے ٹھوس دلائل پیش کر رہا تھا کہ اگر مس شان سلوط نہ ہوتی تو میں اس کی بھی یہ خیال نہ ہوتی کہ اتنی حقارت سے اسے نظر انداز کر دے۔ اس کے سلوط ہونے کے اگلے اور پچھلے سارے ثبوت پیش کر رہا تھا۔

اسے سلوط کا رویہ۔ اس سے روگردانی کرنا۔ اس کے سامنے پڑے سے کتنا نا۔ اور سب سے بڑھ کر اپنا خون دینا۔ اور اسپتال سے دسجارج ہونے کے بعد اس سے سامنا ہونے میں سخت ناگواری اور یہ بھی کا اظہار کرنا۔ اور ابھی چند گھنٹے پیشتر اس بری طرح اسے دھتکارا دینا۔ نہ ثبوت بردلیل۔ اس کے سلوط ہونے کی تصدیق کرتی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ غلطی اصل میں اس کی تھی۔

اس نے اگر آفتاب کو اتنا ہی بتا دیا ہوتا کہ وہ مس شان کی خوبصورتی پر نہیں مر رہا بلکہ اسے ایک ایسی لڑکی تلاش کر رہا ہے جو ہو مس شان کی ہمشکل تھی۔ اور اس سے مس شان پر اس لڑکی کا شفیق ہے۔ اور اپنے اس شے کو یقین میں بدلنے کا کوشش میں وہ مس شان تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور پس۔ تو پھر بات اتنی نہیں کرتی۔ یا پھر کم از کم آفتاب کا ہریش اس کی طرف سے خراب نہ ہوتا۔

اسے ملان تھا تو صرف اس بات کا آفتاب کے سامنے اس کی پوزیشن کس قدر آکر ڈھونڈی ہے۔

اصل میں تو دل کی پکار پر اس نے یہ مصمم۔ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سلوط کو مس شان کے خول سے نکال کر رہے گا۔ خواہ اس کو شش میں اسے کتنا ہی خوار کیوں نہ ہو نا پڑے۔ اور پھر جو کچھ اس نے سوچا تھا اس میں خوار ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس معاملے میں آفتاب کا تعاون حاصل کیے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ اس شش و پنج میں تھا کہ آفتاب سے کیا کہہ کر اسے اس معاملے میں شامل کرے کہ وہ کسی قیمت پر بھی سلوط کے اتنے آسانی سے ہاتھ آجائے گا مو قع گنوا نا نہیں چاہتا تھا۔

گویا یہ مس شان کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا تھا اور اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ وہ سلوط ہی ہے۔ لیکن میں دل میں جیسے ہی سلوط کی محبت نے اسے کچھ آفتاب کے سا کر رکھا تھا کہ اس نے وہ پوری رات کچھ سوکر اور کچھ جاگ کر کاٹی تھی۔

لنگر دروزہ لٹھتے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ آفتاب اسے اپنے اسپینا پر وگرام تو کوئی خاص نہیں تھا۔ پھر یہی بد وقتوں میں کھانے کی غرض سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر تو ادھر ادھر باتیں کرتے رہے پھر اسفند نے کسی خیال کے تحت تیس سے چہچہا۔

”ہاں وہ تمہاری لیڈر روور ساس کا کیا بنا۔؟“
 ”کچھ نہ۔ آفتاب بولا۔
 ”اؤہ ویری سیڈ۔ گویا بالکل ہی ناکارہ ہو گئی۔ یہ تو تانف سے بولا۔

”میں خیر اسی ناکارہ تو نہیں ہوئی۔ صرف اجنبی کی باڈی بچک گئی ہے۔ اور باڈی کی دونوں سائڈز پر بھی ڈینٹ کیا ہے اور ڈینٹ بورڈ کے اوپر کاشیش بھی چھانچور ہو گیا ہے۔ دیکھئے اپنی اور ٹائڈ ویزو۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔“

”مگر اجنبی وہ تو ٹھیک ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ساری شوق ختم ہو گئی تمہاری برائڈ میوگلا کی کی۔ اور اتنا زیادہ نقصان بھی ہوا۔“ اسفند خجالت سے بولا۔

”ہاں نقصان تو بہت ہوا ہے۔ ظاہر ہے نئے سسے سے آگے کی باڈی بنوانے۔ ڈینٹ بھروانے اور میٹس کو بڑھانے میں غلطی رقم خرچ ہوئی ہے۔ لیکن اپنی جیب سے تو کچھ نہیں گیا۔ سب کچھ انشورنس والوں نے بھگتا ہے۔ لہذا اب تم یہ تمنا کرنا کہ اس نقصان میں پورا کروں گا۔“ آفتاب نے کماؤد چپ سا ہو گیا۔ کیونکہ حقیقت مشاہدہ ہی جاہد ہاتھ کر گاڑی کا جتنا نقصان ہوا ہے اُسے وہ پورا کرے۔

”کیوں بھی مس شان کے گرد اب تک کتنے پتھر لگائے ہیں تم نے۔“ آفتاب نے اسے خاموش اور کھڑا کھنکھایا سا دیکھ کر پوچھا۔

”میں تم سے ایک مشورہ لینا جا رہا تھا آفتاب۔“ اُس نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

”ہاں میں جلد بدل کے بارے میں تو نہیں ہو گا وہ مشورہ۔“

خیر فکر ہے کچھ ڈھب نہ تو آئے۔ اماں ہم تو ایسے فیاض ہیں کہ دور سے ہی مریض کی شکل دیکھ کر مرض کی تشخیص کر دیتے ہیں۔ آفتاب کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نہایت غیر سنجیدہ موڈ میں ہے۔

سخت کوفت کے باوجود اسفند کو مٹی سیٹھی۔ گردہ فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔

”بات اتنی مگے بڑھ گئی ہے دوست کہ میری سمجھ ہی ناکارہ ہو کر رہ گئی۔“ اسفند نے گویا تہید باندھنی چاہی۔ مگر آفتاب نے بھی بول اٹھا۔

”وہ تو ظاہر ہے۔ اپنی سمجھ تو تم مس شان کی چراگاہ میں چھوڑ آئے ہو۔ خیر فکر کرنے کی ضرورت نہیں ایسے معلوم پر بات اس سے بھی کہیں زیادہ آگے بڑھ جاتی ہے۔“

”جنہ میں جاؤ۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے خواہ مخواہ ہی جھینس کے آگے بن بجانی شروع کر دی تھی یا اسفند بدل کر بولا۔

”یعنی اب ڈاکڑی کا پیشہ چھوڑ کر کیا تمہارا کام ہی رہ گیا ہے۔ کی جھینسوں کے آگے بن جانے پھرے ہو۔“ سوچ سوچ کر ذہن پر ابھار دیا لیکن اسفند گری تو نہ کھڑا۔

”نہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں اکثر و بیشتر منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کو قبول تھا ہمارے اگلی سیدی ہواس کر لیا کرتا ہوں۔ پھر اس میں اس قدر بسکے کی کیا بات ہے۔“ اور ظاہر ہو نہیں سکا اس کی بات پر دل میں قائل ہو کر اسفند نے بھی سوچا کہ اس کی توفطرت میں مزاح ہے۔ اسے اس کی باتوں کا برا نہیں مانتا جیسے۔

”ہاں تو ارشاد۔“ آفتاب کا جھینس بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے اسے خاموش سا دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

”ارے بس ارشاد ارشاد کرنا۔ میں اصل میں ماس نرٹس مس شان کے بارے میں بڑا بڑا لڑ ہو گیا ہوں۔ تم نے تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس روز جب میں اس سے بات کرنے اس کی طرف بڑھا تو وہ میری بات سننے بغیر بڑی بے نیازی سے یہ کہتی ہوئی واپس پلٹ گئی کہ میں اس وقت بہت مصروف ہوں آپ جلد زیرائٹ ڈیسٹ نہیں کیجیے۔“ اسفند نے ابھی پوری طرح بات ختم نہیں کی تھی کہ آفتاب ہلک کر بولا۔

”اچھا کیا واقعی اس نے یہ کہا تھا۔ تب تو سمجھ کر تمہارا پردہ پار ہے۔ والند آٹھا اتنا انداز ہے تو۔“

”لاٹول دلا تو فو۔ یا ر تم اس قابل ہی نہیں ہو کر کچھ کہہ کر بتایا جائے مشورہ لینا تو درکنار۔“ اسفند جلدی سے انداز میں بولا۔

”مگر تانے کو اب رہا ہی کیا ہے۔ اسے سینڈوڈ میں مرتبہ تم نے غلوں میں دیکھا ہو گا کہ بیرونی سے پہلی ملاقات کسی ڈی سی کلر کے سبب ہوتی ہے۔ اس کی کار بڑھ جاتی ہے تو وہ لب مرکب، بنگلہ یا میان یا کسی میدان میں انجن بجھ کر آئے ٹھیک کرنے کی کوشش میں بے حال سی نظر آتی ہے۔ بھی میری صاحب کس سے اپنا کچھ خودا ہو کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ یا پھر بیرون ملتے جلتے بیروں سے بری طرح ٹکرائتی ہے اور لال پللی ہو کر برو کو کھینچ دھکیلتی ہے۔ برا اہل ہستی ہے اور کوسٹی بیٹیتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ میرے دانت نکالنے یا اظہار الفطرت کرنے پر ایک زمانے دار تھیر دھیر رسید کر دیتی ہے۔ اور پھر میرے جاتے ہی اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور پھر فوراً ہی عشق کے چکر چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور کیا ایک کاؤن کو پھانڈ دینے والے میوزک کی آواز کے ساتھ میری ہانگی ہانگی گلا پھاڑتی ہے۔“

اور جانے والے بالمو لوٹ کے ۳ لوٹ کے آئے۔

اور پھر صاحب جو اسی اثنا میں میلوں دور نکل جاتے ہیں۔ جواب میں وہیں سے ہانک لگاتے ہیں۔ جا میں ڈیڑا بالمو ابے وفا

”خیر مگر اظہار کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔ یعنی اس نے صرف مصروفیت کا ہی مندر کیا ہے۔ آفتاب کی طرف دیکھ کر کہتا رہا۔ اور وہ مگر نے تو میرے خاموش بیٹھا رہا۔“

”خیر مگر وہ نہیں دوست جیت انشا اللہ تمہاری ہی ہوگی اب وہ کچھ دھلے گئے ہیں بندھی قمیڑ میں آگے لگی۔“ آفتاب نے اسے یہ کہیں سا دیکھ کر اپنی مسکراہٹ کو دہلنے سے روکنا چاہا۔

”اب تم ایسا کیا کرو کہ اُس کے آگے سے پہلے ہی سہیل کے گریٹ پر جا کر کھڑے ہو جا یا کرو۔ اور جو پہی وہ قریب سے گزرنے لگے۔ پھر سے بڑھانے پھر حسرتیں سہیل کو کرنی دوں گا کہ ساغرالا پنا شروع کر دیا کرو۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔“ آفتاب نے اُس کے غصے میں غماز باندھنا شروع کیا۔ اسے بھی احساس تھا کہ آفتاب مذاق سے زیادہ اس پر طنز کر رہا ہے۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کی غرض سے سرکل بولا۔

”تمہارا۔ اب میں جہیں بار میٹوں کا آفتاب۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم مجھے کوئی معقول مشورہ دو گے۔ مگر تم نے اپنے پتھر میں اصل بات کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کروں گا۔ اب تو مجھے معاف کر دو۔“

”اچھا ابھی غلطی ہو گئی میرے۔ میں تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کروں گا۔ اب تو مجھے معاف کر دو۔“

”اچھا اچھا اب میری توجہ جو میں کچھ بولوں۔“ آفتاب نے کاؤن کی نوڈن کو کچھ کر لیا۔

”نہیں اب تم سیدھے گھر چلو۔ ویسے بھی ہم جمعے کے شہر کی خاک چھاتے پھر رہے ہیں۔“ اسفند بولا۔ آفتاب کو معلوم تھا کہ اب ڈاؤن کتنا ہی ہوجے۔ سفید گی کا کھنکھایا دبیر لہوہ اوڑھ لے کر اس کا دوست اسے کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ یوں بھی گھومتے گھومتے۔ ڈاکڑی کو بھی آفتاب نے بہت امرار کر کے اسے ایک ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھلایا۔ اور اسے احتشام کے گھر چھوڑنے کے بجائے میں نے ایک جہاں دوڑن شام تک بڑے دلچسپ مشاغل میں وقت گزارتے رہے پھر سر شام ہی آفتاب اسے اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ لیا۔ مگر کچھ عرصے کے لیے اسے پریشان رہا تھا۔

”وہ دن بھی یونہی بیکار گیا تھا۔ اور اس بات پر اسفند کو بہت کوفت ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ جلد از جلد سرگودھا سے نکل جانا چاہتا تھا اور اس سے زیادہ جلدی اسے مس شان کی اصلیت جاننے کے بارے میں تھی۔ مگر وہاں جتنی بھی جیانی اور بے قراری تھی۔ اتنا ہی ہمدردی کا کڑا تاجا رہا تھا۔ آفتاب کی چرب زبانی میں اُسے اصل بات بتانے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اور وہ اس حد تک کسی بھی چیز کے بچھوڑنے کا عادی نہ تھا۔ بلکہ کسی لمحے ہونے مسئلے سے جلد اوپر جاتا تھا۔

مگر چونکہ یہ سلوک کو شناخت کرنے کا مسئلہ تھا اس لیے وہ اب تک اس میں الجھا ہوا تھا۔ اس پر اُسے آفتاب پر وہ رکشہ آ رہا تھا جس نے اپنی بک بک میں اسے اصل بات بتانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک بک کھانڈا لپٹی کی دج سے ایک ڈیڑا اس پر طنز کر رہا تھا۔ اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ مس شان سے جا کر صاف صاف کہہ دے کہ میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ اس طرح میرے ساتھ پھو پھو کے پاس لا ہو رہا تھا۔

”مگر مجھے کی حد تک تو یہ ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے نزدیک عملی طور پر یہ سب کہہ دینا اتنا آسان نہ تھا۔“

”اگے روز شام کو آفتاب اس سے ملنے آیا تو کچھ انسا نیت کی جوں میں تھا۔ آتے ہی اس کی خیریت پوچھی اور پھر کشتہ دوز کے اپنے بھائی کو پھر پھر عزت دے بھی کی۔“

”اُسے نہیں مارا میں نے تو بالکل برا نہیں مانا۔ کیا تمہاری فطرت سے واقف نہیں ہوں میں تو قبول بحال بھی گیا۔“ اس نے جواب دینے میں شرمیلی سی نظر آئی۔ اس کے انتظار میں تیار ہی بیٹھا تھا۔ آفتاب نے اسے یہ سہیل کے پیشکش کی تو وہ کچھ فوراً ہی ساتھ

”مگر اُس کو کبوں چل رہے ہو۔“ آفتاب نے پوچھا۔

”وہ بس زمین پر پیر جاتے وقت ہلکی سی دھکی چپک ہوتی ہے۔ مگر یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں۔“ اس نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اگر خاص بات نہیں بھی ہے تب بھی تمہیں کم از کم دکھا تو دینا چاہیے تھا۔“ آفتاب نے گویا بڑی ترکیب سے ہسپتال کا ڈیوڑھی پہن کر کہا۔

”ابھی تو گویا آج بھی ہسپتال نہیں جاؤ گے۔“ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ وہاں جانے کی۔“ وہ بیڑی سے بولا۔

”اچھا۔ مگر وہ تمہاری مس شان۔“

”میری تو کیا وہ تمہاری ہی ہوگی۔ دیکھو پھر وہی باتیں کرنی شروع کر دیں تم نے۔“ وہ ایک دم ہی بگڑا اٹھا۔

”ارے نہیں یار۔ میں نے سوچا جب باہری نکلے میں تو کیوں نہ مس شان سے ملے چلیں۔ تم نے کہا تھا نا کہ بعد میں کبھی اس کا شکریہ ضرور ادا کرو گے تو میرا آج میں اسے باتوں میں لگا کر تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کر دوں گا۔“ آفتاب نے کہا۔

”بس تم تو معاف ہی نہ ہو۔ بات کرنے کا موقع فراہم کرنے کے بجائے مار کھلانے کے سبب متور پیدا کرو گے۔ اور بار بار اب سلوٹ کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ بس تم نے میری طرف سے کر دیا تھا۔ یہی بہت ہے۔“

”مگر یہ سلوٹ کون ہے۔ کیا مس شان کی طرف سے یا اس ہو کر تم نے کسی سلوٹ کا مبارکباد لیا ہے۔ یا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر جاگرتا کسی فطرت کے مالک ہو گے۔“ آفتاب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے بچے میں ایک ملامت سی پنہاں تھی۔

”ارے نہیں یار میں شان ہی کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا اصل نام سلوٹ ہی ہے۔“

”اچھا۔ مگر یہ معلومات تم نے کیسے فراہم کیں۔“ آفتاب نے پوچھا تو اس نے مختصر الفاظ میں اسے سلوٹ کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کے چھو بھائی کی سوتیلی بہن ہے اور چھو بھائی اور چھو بھائی کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اور وہ اسی کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔

”مگر تمہیں اپنے چھو بھائی کی سوتیلی بہن سے ایسی کیا نسبت تھی جو تم اس کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہو۔“

”کیونکہ یہ میرے چھو بھائی کی عزت کا معاملہ ہے۔ تم یہ سوچو کوئی جوان جہاں لڑکی راتیں چپکے سے گھرتے بھاگ جاتے تو۔“

اسفند بولا۔

”تو کیا وہ کسی کے ساتھ گھر سے فرار ہوئی تھی۔؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”نہیں بھی یہ وہ کیس نہیں ہے۔ وہ تو خفا ہو کر غصے میں تنہا ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور جب سے لایا ہے۔“

”اچھا تو یہ بات تھی۔ تعجب ہے تم نے یہ بات مجھے شروع میں ہی کیوں نہ بتادی۔“ آفتاب ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر ہلکا

”تم نے موقع ہی کب دیا پھر نہ تھا۔“ وہ نہ میں توکل تم سے ہی کہنا چاہ رہا تھا۔“ اسفند نے کہا۔

”خیر غمگسٹے اصل بات معلوم ہو گئی۔ ورنہ تمہیں اس موم کی سی نرس پر مائل دیکھ کر میں نے ہی تاڑ لیا تھا کہ تم بھی آجکل کے ذہنی

بے راہروی کا شکار نہیں دیکھیں زادوں میں سے ہو چاہے غلغلہ فانی قرار اور عزت کو پس پشت ڈال کر ایسی پستیوں میں گر جائے۔“ آفتاب نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

”کمال ہے تم تو میری فطرت سے بخوبی واقف ہو چکے ہو میرے بارے میں اتنی غلط رائے قائم کر لی۔“ اسفند قدرے گھبرائے ہوئے

”لیکن۔ اب کیا کرنا ہو میری ایسی عیادت کرنی تھی تم نے۔“ ویسے باقی واہے کیا مس شان نے ایڈمٹ کر لیا ہے کہ سلوٹ

ہی ہے۔“ آفتاب نے اس کے گنگنا جواب دے کر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”نہیں ابھی اس سے کچھ پوچھنے کا موقع ہی کب ملے۔ لیکن اب جلد ہی اس سے قبول والوں گا۔“ اسفند بولا۔ کچھ خاموشی۔

طاہر بی۔ آفتاب بھی غلط غلط اور معمول خاموشی سے جیب پلاتا رہا۔ پھر اسفند نے کہا۔

”اچھا چلو وہی چلتے ہیں۔ اگر سرجن عارف مل گئے تو ساتھ ساتھ پیر بھی دیکھا دوں گا۔“

آفتاب۔ کچھ نہیں بولا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ہسپتال کے کپانڈ میں کھڑے تھے۔

”یار ایشیا کر کے دیکھو ڈیوڑھی درم میں چلو۔“ کچھ دیر وہاں اس کے لئے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔“ آفتاب نے اس کے ساتھ ہسپتال

نفاذ کی طرف دھتے ہوئے مشورہ دیا۔

”مگر کوئی طبی مشورہ تو نہیں کروہ ڈیوڑھی درم میں تنہا ہی مل جائے وہاں دوسری نرسیں بھی موجود ہوں گی۔ اور وہاں جا کر اکیلی ہماری پرنسٹن

ہی ہو کر رہی۔“ اسفند نے کہا۔

”مجھے تو ریشٹن ہو کر رہنا ہے۔ کوئی تم وہاں اس سے اظہار عشق کرنے تو نہیں جا رہے۔ کوئی بہادر کریں گے کھانا

بغیر مال مل سکتا ہے یا پھر سرجن عارف کا بچہ چلیں گے۔“ آفتاب اس کی بچکیا ہٹ پر چڑھ کر بولا۔

”اچھا پھر چلو میں چلتے ہیں۔“ اسفند نے آدھہ ہو کر کہا۔ اس اثنا میں دونوں ہسپتال کی بیڑی میٹھیوں عبور کر کے آگے بڑھے ہی

نئے کوہ سمانے کی بلندی پر چلے گئے۔ اسے اتنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ کوئی دوسری نرس بھی تھی۔ اور وہ دونوں منٹھی مسکراتی

راہ میں بائیں کرتی نیچے آ کر رہی تھیں کہ آدھے میں پکڑ لیں۔ کبریا اسفند اس کی طرف لپکا۔ اور جی پی بی کے آگے کھڑا ہو کر بولا۔

”سلوٹ۔“ مس شان جو اس کے راستہ روک کر کھڑے تھے۔ پروتین سر جھیاں اور بیڈنگ گئی تھی۔

اس نے اپنی ساتھی نرس سے آہستہ سے کچھ کہا۔ اور جواب میں سر ہلا کر اس نے اسفند سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”جی، آپ کو کس سے ملنا ہے۔؟“

”ان سے میرا مطلب ہے مس شان سے۔“ اسفند نے انگلی سے مس شان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس

نرس نے مسکرا کر شان کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ دونوں کھسکھس کر نکل گئیں۔

”دیکھیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مس شان، آپ پہلے میری بات

سن لیں۔“ اس کی خاموشی سے اسفند کی کچھ ہمت بندھی تو اس نے تھوڑی سی عجلت دکھاتے ہوئے مس شان سے کہا۔

”تو مس شان اس کو جواب دینے کے بجائے دوسری نرس سے بولی۔

”پتا نہیں کون شخص ہے یہ، روز کے کچھ تنگ کرنا ہوتا ہے۔“ نئے شفا نام لے کر مجھے بکا رہا ہے۔ ذرا تم ہی اس

کی بات سن لو غصت۔“ اتنا کہہ کر وہ دو تین نرسیں لپک لپک کر چلی گئی۔ اور غصت نے پہلے بڑی ملامت آمیز اور لعنتی نظروں

سے گھور کر اسے دیکھا اور بولی۔

”تمہیں شرم نہیں آتی مسٹر۔“ بظاہر تو تم خالصے شریف لگتے ہو مگر حرکتیں ساری لو فوفوں کی سی کرتے ہو۔ آئینہ انگوٹھ نے

لے چھڑا تو تمہاری ایسی درگت بناؤں گی کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔ جاؤ و فغان ہو جاؤ وہاں سے۔“ اسے اس ہی طرح

دھتکار کر غصت بھی تیزی سے مڑی اور مس شان کے ساتھ اوپر چڑھتی چلی گئی۔ ایک تو اس کی آواز بہت اونچی تھی،

اس پر اوپر کانٹے کرتے ہوئے بھی وہ اسے بڑے گتے ہوئے الفاظ سے نواز رہی تھی۔

آفتاب نے اسے دیکھا اور بولی۔

آفتاب بھی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔

اور سانس طویل سی گئیدی کے آخری سرے پر ریسیمیشن پر بیٹھا شخص بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھا۔ یہ بھی غصت

فاسا لے وہاں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ اس کے باوجود بھی اپنی اس حد تک ذلت کے احساس نے اسفند کو سر ہٹا لیا

نور کھ رہا تھا۔ جی چاہا رہا تھا کہ جھپٹ کر اوپر چلے اور مس شان کو گھسیٹتا ہوا نیچے لاکر اتنا مائے کہ اس کا حلیہ

نی پھاڑ کر رکھ دے۔

اور اسے اتنا بھجور کر دے کہ وہ چیخ چیخ کر کہے کہ ہاں میں ہی سلوٹ ہوں۔ مگر اسی دم آفتاب نے بھی اس کی

شکایت اٹھ کر سر کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بہت

نرم جیسے اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”اؤ بار،“ وہاں چلتے ہیں۔“ ان آتی تھوڑا کلاس عورتوں سے اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں

”بار لڑکی کا ہنس کر دھانی تو ان چپ چپ کر لڑکی باتوں کو بھی اسی طرح ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینا

چلبے۔ آؤ دوست، لعنت بھیجیوں دونوں پر اور میرے ساتھ چلو۔ مگر اسفند ایک دم ہی اس کے ساتھ ہلنے پر آمادہ نہ ہوا بلکہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر چپ چاپ جیب کی طرف پڑھ گیا۔

”غصہ کرنا اسی لیے حرام ہے کہ غصے کی حالت میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ذرا سوچو غلطی کیا نہیں تھی۔ یہ جو فی نماز منجھے اور جھکے ہوئے نوجوان اپنی ہی قوم کی عزت و ناموس کے رہزن ہر جگہ زندہ مٹے پھرتے ہیں اس نے ہمیں انہی میں شمار کیا ہوگا، ہمیں اس طرح بغیر موقع اور محل دیکھے اس سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

آفتاب تو اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اور بھی بہت کچھ کہتا رہا تھا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد اسے صرف ایک بات ہی یاد رہ گئی تھی کہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ کیا غلطی ہماری نہیں تھی۔ اور وہ بڑی دیر تک صرف یہی سوچتا رہا کہ اس نے ایسی کی غلطی کی تھی۔ اسے چھڑا تھا۔ نہ کوئی عامیانا سافروہ ہی جیت گیا تھا۔ اور نہ کوئی عشقیہ ڈانڈاگ ہی بولا تھا۔ پہلے دوسرے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تھا اور آج بھی بہانہ ہی تھا البتہ اس نے اسے سلوٹو کہہ کر مزور مخاطب کیا تھا۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے منہ سے اپنا اصلی نام سن کر ہی وہ چڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اپنا نام سن کر اس کے پھر سے کا تاثر یکدم بدل گیا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ

ایک لحظہ کو اس کے چہرے پر ہم اور گجراہٹ کے سے آثار ہو رہے تھے تبھی تو اس نے اپنا چہرہ عفت کا بنا پھر کر اس سے کچھ کہا تھا۔

بلکہ عفت اس سے کچھ پوچھ رہی تھی اور اس کے استفسار پر اصل بات بتانے کے بجائے اس نے اتنا سنگین چوٹ بولا تھا۔ چنانچہ یہ کون شخص ہے روز آکر مجھے تنگ کرنا ہے۔ نئے نئے نام لے کر بیکار بنائے۔ ذرا تم ہی اس کی بات سن لو عفت۔ اور جواب میں عفت نے وہی کیا تھا جو ایک دوست کو کسی بد فاش شخص سے بچانے کے لیے ایک دوست کرتی ہے۔

کیونکہ ایک تو وہ اچھی طرح اسے جانتی تھی۔ اگر سلوٹو بھی نہیں تھی تب بھی اسے یہ بھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے جسے مرقی حالت میں اس نے اپنا خون دیا تھا۔

دوسرے وہ شکل و صورت اور لباس اور چلنے، کسی اعتبار سے بھی لو فہم نہیں لگتا تھا۔ اب سے کچھ دن پہلے جب وہ ہسپتال میں زیرِ علاج تھا تو آفتاب سے بھی سب کی شناسائی ہو گئی تھی اور سب اسے بڑے احترام سے کیپٹن صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور وہاں کا ہاؤس مرجن ڈاکٹر قیوم رضا، آفتاب کا پڑا واقف کا تھا۔ تو کیا اس نے میری باتوں ہوتی اپنی تدبیر کا بدلہ اس صورت میں لیا ہے؟ پھر اسے اپنے رویے اور اس اہانت آمیز گفتگو کا خیال آیا۔ جو اس نے ماں کے آگے بیٹے کی غلط بیانی پر اس سے کی تھی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے اس کی اہانت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اسے گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر یہ جو کچھ بھی کیا تھا کسی تھوڑے دن کے سامنے نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت میں اور وہ گھر سے تباہ تھے

مگر اس نے تو۔ نہ صرف خود بلکہ عفت سے کہہ کر میری تدبیر کروائی تھی۔ وہ بھی آفتاب کے سامنے۔ یہ سیشنٹ کے اور وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کے سامنے جو رکا تو نہیں تھا مگر اس نے یقیناً اس حوالہ دیا ہوگا کہ اس پر آفتاب کتاب ہے کہ میں اس کا خیال چھوڑ دوں۔ دوسرے معنوں میں گویا اتنی آسانی سے اس کا گناہ اڑا دیا ہے اپنے سرے لوں۔ نہیں نہیں، ایسا تو مر کبھی مجھے گوارا نہیں۔ اور پھر مجھے پھوپھا جان سے کیا وعدہ بھی تو دیا ہے۔ اگر مس شان، سلوٹو نہ بھی ہوئی تو بھی میں اسے سلوٹو ہی بنا کر پھوپھا جان سے کیا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے مس شان کو اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر نہیں، وہ سلوٹو ہی ہے۔ سلوٹو ہی ہے۔ یہ سب سوچتے سوچتے وہ بالکل ساہو گیا تھا۔

دور و مزید گزر گئے تھے۔ گویا کیپٹن احتشام کے یہاں اس کا قیام طویل ہوتا جا رہا تھا اور یہ احساس سارا گراں گزر رہا تھا۔ آفتاب دانستہ یا بے اختیار اپنی مصروفیات کی وجہ سے گزشتہ روز نہیں آیا تھا۔ وہ ہی انتظار کرتا تھا کہ آفتاب آئے تو وہ اسے اپنے رازوں سے باخبر کر کے اسی کے ذریعہ احتشام کے گھر سے کسی عہدے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ آخر شام کو آفتاب آیا تو آتے ہی اس نے معذرتی سے انداز میں کہا۔

”کل کتنی کوشش کی یار کہ وقت نکال کر تھوڑی دیر کے لیے تم سے مل آؤں مگر مصروفیت ہی کچھ ایسی نوعیت کی تھی کہ آنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔“

یار تم یہ اپنے ذائقے کی مصفاکیاں کیوں پیش کرتے ہو۔ اب میں مہمان تو نہیں رہا اور پھر خواہ مخواہ ہی یہاں جما ہوا ہوں۔ تمہارے پاس اتنا فالو وقت کہاں ہوگا کہ تم روز روز میرے پاس آتے رہو گے۔ اس نے لعجیب بے یارگی انداز میں کہا تو آفتاب سمجھا کہ اس پر ابھی تک غصہ چڑھا ہوا ہے۔ اس نے لعجیب سے کہا۔

”ہاں۔ کیا مطلب؟ تمہارا غصہ ابھی تک فرو نہیں ہوا جواب تم مجھ پر اتانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لو بھلا روز روز آنا تو دوسری بات، مجھے تو ہر وقت ہی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم میرے بلانے پر ہی تو ہال آتے ہو۔“

”اوسو، تم سمجھ نہیں یار، میرا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو تمہیں اتنی کڑی ڈیوٹی انجام دینی ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ بے چارہ احتشام۔ وہ بھلا اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا کہ میں تو اس کے گھر میں دھرنی دے کر بیٹھ گیا ہوں۔ اور ہر میری شکل یہ ہے کہ میں ابھی یہاں سے جا بھی نہیں سکتا۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ میرے لیے یہ کمرہ ہوٹل کا کمرہ ایک کراؤں۔“

میں نصیب دشمنان۔ تمہاری دماغی صحت تو ٹھیک ٹھاک ہے جو بیٹھے بٹھائے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے دیے کیا یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے یا پھر گھر کے مکینوں سے کوئی شکایت؟

”نہیں بھئی۔ نہ تکلیف ہے اور نہ شکایت بلکہ ان لوگوں کی خاطر ملازمت اور خلوص سے تو ہی ان کے اصالتوں پر باج رہا ہوں مگر۔“

”آفتاب نے اس کی بات کاٹ دی اس میں احسان کی کیا بات ہے پھر تمہیں اس کے گھر میں رہتے دن گزارتے ہوئے ہیں مشکل سے ایک ہفتہ۔ بقول تمہارے کوئی ساری زندگی تو رہنے سے رہے یہاں۔ اس لیے مزید بھننے دن رہنے کا ارادہ ہے آرام سے یہیں رہو۔ احتشام اپنا پڑا نیا رہا ہے ویسے باقی داوے کتنے دن رہنے کا ارادہ ہے یہاں؟ آفتاب نے بڑی خوبصورتی سے اس سوال کو الفاظ کا جامہ پہنا یا جو کچھ دیر سے اس کے ذہن میں کھیل رہا تھا۔

”ہاں۔ یہ تو معلوم نہیں۔ البتہ زیادہ عرصے نہیں رہوں گا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز میں اپنا کام نٹا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ اسفند نے بتایا۔

”مگر تو سام۔ آفتاب نے متحیر سے انداز میں پوچھا۔ کیونکہ جہاں تک اسے معلوم تھا مگر گودھالیں تو اسے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا جو اس کی واپسی میں رکاوٹ بنتا۔

”بھئی دی سلوٹو کو دریافت کرنے کا کام۔ اس کے علاوہ میری اوکون سی ایسی غرض اٹکی ہوئی ہے یہاں۔“ اسفند بڑی تانتا سے بولا۔

”ہاں تو کیا ابھی تک تمہارے سر پر سلوٹو کو برآمد کرنے کا بھوت سوار ہے؟ مگر کیا دور و زبیلے کا تلخ تجربہ تمہارے لیے کافی نہیں جو مزید خود کو خوار کرتے رہتے ہوئے بوجہ کمال ہے یا رتم لو ایک دم بینڈل قسم کی شے ثابت ہونے لگا۔ آفتاب نے تیز سمجھ میں اسے ملامت سی کی۔

”مزید کچھ کہنا چاہتے ہو اس سلسلے میں تو وہ بھی کہہ دو۔ پھر میں تمہاری ساری باتوں کا جواب اکٹھا ہی دے دوں گا۔“ اسفند جیسے بالکل یکساں کھڑا ہی ثابت ہوا۔

”مزید کیا کہوں۔ جبکہ تمہاری عقل تو شاید مجھے کے بجائے گدی میں ہے بلکہ میرے سے بھیجے میں ڈالی ہی

نہیں گئی۔ اب بھلا اپنے چھو بچا کی سوتیلی اور مفرد رہن کی ذات سے تمہیں ایسی کیا دلچسپی ہے جو تم اپنی عزت اور وقار کو داؤں پر لگانا چاہ رہے ہو؟ اس کی بات پر آفتاب چلے کٹے انداز میں بولا اور ادب اسفند کو ساری بات اس کے گوشہ گوشہ تک پہنچائی۔

”ہوں تو یہ بات ہے ورنہ میں بھی تو کہوں کہ اتنا شریف اور حسب نسب والا دوست اس قدر گراؤٹ سے کام کیوں لے رہا ہے۔ اور میں تو تمہارے یہ سب بتانے سے بہت پہلے ہی تجھ کی گھبراہٹ کا حال میں کالا کچھ ضرور ہے اس وجہ سے تو میں روز تمہیں جتنا سے تم سے کڑوی سبلی“

”افوہ۔ سید سے چلتے چلتے تم کچھ پڑوسی سے اتر گئے۔ میں تمہاری ذہانت کا امتحان تو نہیں لے رہا۔ میں تو اس بات کو کہ اس سے کہاں ملوں اور اصل حقیقت کیسے اگلاؤں کہ کیونکر اسپتال میں اس سے ملنا کچھ مناسب نہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو جانے کہ جب وہ اسپتال سے باہر نکلے تو گھر تک اس کا تعاقب کیا جائے تاکہ اس کا پتا معلوم ہو سکے۔“

”ہائیں تعاقب۔ نا بایانا۔ تعاقب تو میں نے کبھی دشمن کا بھی نہیں کیا زیادہ سے زیادہ یہی کیا کہ کجا گئے ہونے دشمن کا نشانہ باندھ کر گولی داغ دی۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا! آفتاب ایک دم ہی بدک بولا۔ اس کی باتوں سے اندیشوں سے زیادہ تمہیں ہلک رہا تھا۔

”تو پھر یہ کریں گے کہ کسی سے اس کا پتا معلوم کر کے سید سے اس کے گھر ہی پہنچ جائیں گے۔“

”ہائیں کیا کہا۔ اس کے گھر پر جاؤ گے تم اس کے گھر پر۔ وہ بھی گویا میرے کان سے پرہیز کرتا ہے۔ نہیں میری تو یہ تو یہی شکر کہ رہا ہوں کہ اس روز بیٹے۔ بیٹے بچ گیا تھا۔ جانے کون سی نیکی اڑے آگئی تھی۔ ورنہ جن کے ساتھ ساتھ تھیں کی طرح تمہارے ساتھ میں بھی پس کر رہ جاتا۔ کیونکہ تمہاری تو وہی شکل ہے کہ تم تو وہیں کے ستم نمک بھی لے ڈوبیں گے۔ آفتاب نے گویا ہنسی میں ہی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

”اچھا چھوڑو تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو نہ دو۔ مگر اتنا تو کرو کہ میرے ساتھ اسپتال چلے جاؤ۔ تم بے شک جیپ سے عزت تارنا۔ مگر جیپ میں میٹر کر میٹر انتظار ضرور کرنا۔ باقی کام میں خود نمٹا لوں گا۔ اور آفتاب نے تھوڑی دیر تک بچنے کے بعد کہا۔

”اچھا ملو یہاں تک تو میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ میں شان حسینہ عالم تو نہیں ہے جو اس کا حصول تمہاری زندگی کا نصب العین بن جائے۔ تم کہو تو میں اس سے کہیں بڑھ کر حسینہ اور خاندانی لڑکی کہانی لے لے کر ہم کر سکتا ہوں۔ دیکھو بڑا منہ کی بات نہیں یہ شخص میرا ایک غلطانہ سا مشورہ ہے۔ آفتاب نے اس کے نور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”جولوڈیہ اسپتال چلو اب مجھے کوئی اعتماد مشورہ نہ دینا کیونکہ صرف حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ سیرت۔ شرم و حیا کے ساتھ بھی بہت ہوتا ہے۔ بہت سی خوبیاں جو سلوط میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔“

”او کے چیف۔ ایڈیٹر دماغی ایلو جیو سیر۔ دل پری پر آنے یا گدھی پر۔ دل ہی ہوتا ہے جو پر یوں کی صفات کہ عیوں میں بھی دھونڈ لیتا ہے۔ آفتاب آخروں کی بات زبان پر لے ہی آیا کہ وہ بہت سطحی سی نظر رکھنے والا شخص تھا۔ اگر میں شان سلوط ہی تھی تو اس نے اسے ایک معمولی نرس کے روپ میں دیکھا تھا۔

اس لیے وہ سلوط کو خاطر میں ہی نہیں لارہا تھا۔ اسفند بھی سمجھ رہا تھا کہ اس پر اس سے کوئی اور ہی دھن سوار تھی اس لیے اس نے آفتاب کی بات کا جواب دینا یا اسے قائل کرنا ضروری نہ تھا۔

کچھ ہی دیر بعد۔ اسپتال کی باؤنڈری وال کے باہر جیپ رکو کر وہ جیپ سے اترا اور آفتاب کو جیپ میں ہی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اور سیدھا ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ اتفاق سے اس سے سسٹر فضا اور کئی دوسری نرسیں جو اس سے واقف تھیں وہیں موجود تھیں۔ جو اس سے بڑے تپاک سے ملیں۔ اور اس کی خیر خیریت پوچھتی رہیں۔ تب اس نے ادھر ادھر دیکھ کر سسٹر فضا سے پوچھا۔

”کیا میں شان آج آت ڈیوٹی میں ہی جو نظر نہیں آ رہی ہیں۔“

”نہیں۔ ان کی ڈیوٹی تو آج میڈرٹی وارڈ میں لگی ہوئی ہے اور وہ اوپر آفس میں موجود ہے۔“ سسٹر فضا نے صبا مارت کے اشارے پر تیار ہو کر اس کے انداز میں معنی خیزی تھی۔

”اودہ عجیب اتفاق ہے۔ اس روز بھی آپ کے بتانے پر میں ان کا لشکرہ ادا کرنے یہاں آیا تھا تو وہ کسی بغض کو اٹھانے لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اس تاثر کو توڑنے کی غرض سے جو سسٹر فضا نے باندھا تھا گویا میں شان کے بارے میں پوچھنے کی وضاحت کی۔

”ٹھیک ہے سر آپ اوپر جانے کی جگہ کی زحمت نہ کریں اسے میں بلوائے تھی ہوں سسٹر فضا بولی۔

”نہیں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے میں ابھی رات کی فلاٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ اگر آپ کچھ کر سکتی ہیں تو تانکیے کہ مجھے ان کے گھر کا پتا بتا دیجیے۔ اگر ہو سکا تو میں خط کے ذریعے ان کا لشکرہ ادا کر دوں گا۔

”وہ دے تو دے برابر والے نرسوں کے ہوشل میں رہتی ہے مگر آپ اسپتال کا پتا لکھ کر نرسوں کے ہوشل کے حوالے سے اسے خط لکھ سکتے ہیں۔“

ہوشل کی انچارج اس وقت اتفاق سے آفس میں موجود تھی۔ وہ سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اور جاتے ہی مدعا بیان کیے بغیر اس نے اس سے پوچھا۔

”میڈم کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کے ہوشل میں رہائش پذیر نرسیں میں سے کون کون سا ہے۔ جو سوال بے تکلفی نہیں بہت فاقی اور مشتبیہ سا تھا۔ انچارج۔ میڈم پریرانے بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر ناگوار کی کے اثرات ابھر آئے۔

”جی نہیں مجھے بالکل نہیں معلوم۔ اگر معلوم بھی ہوتا تب بھی نہیں بتاتی کیونکہ میرے ہوشل کے اصولوں میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ کسی ضرور پرہیز کو یہاں رہنے والے کسی فرد کے بارے میں کچھ بتایا جائے۔“ میڈم پریرانے بڑی صاف اور شہ آرد میں جواب دیا۔

”لیکن معاملہ کسی ضرور پرہیز کو نہیں میڈم بلکہ بڑا سیریس ہے۔ جس سے میں آپ کو باخبر کر دینا چاہتا ہوں۔“ اس کی بات پر وہ تھوڑا سا نرم پڑ کر بولی۔

”لیکن مجھے بھی تو معلوم ہو کہ آخر معاملہ کیا ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ بڑی بے خبری لڑکی ہے۔“

”نہیں وہ معصیت زدہ ہے نہ بے یار و مددگار۔ بلکہ اس کے سارے رشتے دار موجود ہیں۔ اس کے والد ہندوستان سے آئے ہیں اور اس کے ایک دم ہی غائب ہو جانے کی وجہ سے سخت غلیل ہیں۔ اسفند نے اس کی معلومات کی توثیق کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں جناب ہم آپ کی بات پر کیونکر یقین کر سکتے ہیں جبکہ آج سے پہلے ہم نے آپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ وہ ہر جگہ سے اٹھ کر گئی۔

”آپ زیادتی سے کام لے رہی ہیں میڈم۔ ورنہ ہم فوجی تفریح کی غرض سے نہیں آئے جیسا کہ میرے دوست ڈاکٹر اسفند نے کہا ہے معاملہ واقعی کافی سیریس ہے۔ اور ہم تو صرف اس کا نام ہی بول کر ناچاہتے ہیں اس سے رابطہ قائم کرنا تو ہمارا مقصد نہیں ہے۔ آفتاب جس کا جیسٹس اسفند کو ہوشل میں جاتے دیکھ کر انتہائی پہنچ گیا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بھی جیپ سے اتر کر آفس میں گیا تھا اور چونکہ ڈیوٹی سے سیدھا اس کے پاس آیا تھا اس لیے اتفاق سے لڑکی میں ملیں تھا۔

اور اس کی فوجی وردی نے ہی میڈم پریرا کو حد درجے متاثر کیا۔ بلکہ دوسرے معنوں میں ہما کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر زمانے بھر کا انکسار سمیٹ کر بڑی لمباحت بھرے لیے میں بولی۔

”آپ یقین جانیں سر۔ مجھے اس کا نام بالکل معلوم نہیں۔ البتہ اس کے بارے میں ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک ڈیڑھ ماہ قبل کراچی سے آئی ہے۔ بلکہ میری ایک پرانی دوست جو میری طرح ایک پرائیویٹ کلینک میں مدد وائف ہے نے اسے یہاں بھیجا ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ غلو راکا ایڈیس اس آپ کو دے دیتی ہوں باقی تفصیل آپ اس سے معلوم کر

لیجیے گا۔ میڈم پر یہاں کی بات پر دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر آفتاب نے اسفند کے قریب ہو کر آہستہ سے اس نے کچھ کہا۔ مگر اسفند نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میڈم پر یہاں کو غائب کر کے کہا۔

”جنہیں ہمیں کسی کا اندیشہ نہیں دوکار نہیں۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا ہم معلوم کر چکے ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ“

”تو کیا آپ اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں؟“ پھر پرانے سیمے سیمے متفکر سے انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔ فی الوقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ البتہ بعد میں اگر ضرورت پڑے تو ہم مجبور ہوں گے۔“ اسفند نے اسے مرعوب دیکھ کر قدرے دھوکے سے کہا اور دھیر دھیر اس سے جانے لگا۔ تنہائی سے انداز میں میڈم پر یہاں کو غائب کر کے بولا۔

اسفند اور آفتاب کے جانے کے بعد سسٹر پریرا کو ایک دم ہی خیال آیا کہ یہ دونوں کو حجام مونا شان کے بارے میں جو باتیں پوچھ گچھ کر کے گئے تھے وہی کہیں ہاسٹل سے سیدھے اسپتال پہنچ کر مونا سے اُسے تیس سے سو سالات تک کی باتیں یاد رہا وہ ان سے ڈر کر خود ہی کچھ نہ بک دے۔ اسی خیال کے تحت سسٹر پریرا نے اسی وقت اسپتال فون کر کے میڈیٹری ڈارڈ کا نمبر لیا۔ اتفاق سے خود مونا شان نے ہی ریسپونڈ کیا۔ سسٹر پریرا نے پوچھتے ہی پوچھا۔

ایک تو بہت خلاف توقع اور معمول پہلی بار اس نے مس شان کو فون کیا تھا اور یہی کیا کم تعجب کی بات تھی اس پر فون جس نوعیت کا تھا اس نے اسے سخت اٹھیں میں ڈال دیا تھا۔ آخر یہ چکر کیا ہے ہسٹری پر پراگیا کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی فون کرتے اور یہ کہنے کی کہ میں سیدھی ہاشل آؤں اور کہیں نہ جاؤں جبکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اور کہیں جاتی ہی نہیں۔ صرف کبھی کبھار مارکیٹ چلی جاتی ہوں تو وہ بھی چھٹی کے دن۔

پھر اس نے اسی بات کیوں کئی بار ظاہر ہے بلاوجہ تو نہیں کہی ہو گی یہ تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے یہ کہنے کا؟

کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جیسی تو کہہ رہی تھی کہ جب ڈیوٹی سے واپس آؤ گی تو بتاؤں گی۔ یہی سب سوجھ سوجھتے اس کا تجسس انتہا کو پہنچ گیا تھا اور ابھی صرف دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ اور اپنے ڈیوٹی آؤر ڈھکنے پورے ہونے تک تو تجسس کے مارے اس کی حالت ہی غیر ہو جاتی۔ اس لیے لچ ٹائم کے ٹوڑا ہی بعد اس نے میٹر ٹی ہوم کی وارڈن سے سرد و کا بہانہ کر کے آدھے دن کی چھٹی مانگی اور سیدھی ہاشل چلی آئی۔ اور تب سسٹر پرانی زبانی یہ معلوم ہوا کہ اسفند اپنے ایک دوست کے ساتھ اسے لپوچتا ہاشل آیا تھا اسے اپنے بیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی فحشوں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ سسٹر پرانہ کو ماسوائے اس کے کہ وہ ایک مصیبت زدہ اور بے سہارا لڑکی ہے جسے اس کی ایک بہت ہی عزیز دوست نے کراچی سے اس کے پاس بھیجا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ حتیٰ کہ اس کا اصل نام بھی نہیں۔ اور اب دو آدمیوں کے اچانک آجانے اور اس کے بارے میں استفسار کرنے پر وہ اس کی طرف سے خاصی مشکوک ہو گئی تھی۔

اس نے اسے یہ بتانے کے بعد کہ دو شخص جن میں ایک فوجی تھا تمہیں لپوچتے ہوئے آئے تھے اور تمہارا نام سلوٹا تیار ہے تھے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں جو تا فرد یا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم بغیر کسی کو بتائے چپکے سے گھر سے بھاگ آئی ہو اور تم نے اپنا نام بھی تبدیل کر رکھا ہے۔ تم نے ظاہر کیا ہے کہ تم اس دنیا میں تنہا اور بے یار و مددگار ہو۔ اور ان دونوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تمہارے سارے رشتے دار موجود ہیں کئی کباب بھی جو حال ہی میں انڈیا سے واپس آئے ہیں۔ سسٹر پرانے کو یہاں کی خبر لینے کے انداز میں کہا۔

”لیکن سسٹر یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ یقین مانیں۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”میں اب تمہاری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ وہ جس طرح بات کر رہا تھا اسے کسی طرح بھی جھوٹ نہیں سمجھا جاسکتا اور وہ مجھے وارن بھی کر گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ کسی وقت بھی تمہیں لینے آجائے گا۔ دیکھو مونا۔ خواہ وہ جھوٹ بول رہا ہو یا تم۔ لیکن کم از کم میں اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتی اگرچہ وہ دونوں کلاؤں کو تو میں بلا کسی انکوائری اور تصدیق تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔ کیونکہ اس معاملے میں ان دونوں سے ————— مگر لے کر اپنے ہاشل کی رپوٹیشن خراب نہیں کر دوں گی۔ میری مشکل یہ بھی ہے کہ میں تم کو یہاں سے کہیں بھیج بھی نہیں سکتی کیونکہ تمہیں غائب پاکر وہ دونوں میری گردن ناہیں گے۔ البتہ ایک صورت میں تم ان سے خود کو بچا سکتی ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنا پورا پورا تہمتہ داروں کے نام اور خود اپنا اصل نام بتا دو۔ ہم باں باتا مدہ انکوائری کریں گے اگر تمہاری بات سچ ثابت ہوئی تو پھر کسی کی مجال نہ ہو گی تمہارا حصول کے لیے ہاشل میں قدم بھی رکھ سکے۔“

لیکن وہ بھلا کیسے بتائی اپنا اصل نام۔

جبکہ وہ تو ہمیشہ کے لیے اسفند کی زندگی سے نکل آئی تھی۔

بلکہ وہ اس کی زندگی میں داخل ہی کب ہوئی تھی۔ خود اسفند ہی گو یا زبردستی اپنے ایک طرہ مذہب سے متصف ہو کر دوسرے معنوں میں باختر دھوکا اس کے پیچھے پڑ گیا تھا اور کچھ اس طرح پڑا تھا کہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی تھی۔ اور اسے اس بری طرح اپنی محبت میں غرق دیکھ کر وہ اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کر کے اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور جو کہ بات اتنی زیادہ آگے بڑھ گئی تھی اور ادھر وہ ایک ٹھکانہ ہوتی، ہستی تھی بلکہ

ایک دوسرے مرد کی ملکیت تھی۔ اس لیے اسے یہ گوارا ہی نہیں ہوا تھا کہ اصل بات بتا کر نہ صرف اسفند کی نظروں سے گرجائے بلکہ اس کی نفرتیں بھی مول لے لے۔

اصل میں تو شروع شروع میں وہ یہی — سوچ کر خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی تھی کہ جیسا کہ اس کے بھائی اور بھائی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دونوں زیادہ سے زیادہ چار ماہ بعد اسے واپس بلا لیں گے۔ کہ ہندوستان تو وہ صرف ایک ڈیڑھ ماہ قیام کی غرض سے ہی گئے تھے تو اسفند اپنے گھر خوش ہے گا اور وہ اپنے گھر خوش۔ پھر اگر اسفند اس کے معاملے میں سیریس بھی ہو گیا تو اس کے بھائی بھادوچ اسے اصل معاملے سے آگاہ کر دیں گے۔ اور اس طرح گویا سانپ بھی مر جائے گا اور لاش بھی نہیں ٹوٹے گی۔ بلکہ لاشی اسفند کی بددردیاں اس کے ساتھ ہو جائیں گی۔

لیکن چار سے چھ ماہ ہو گئے اور پھر جس سے ایک سال بلکہ ایک سال سے کہیں اوپر لیکن خبر لینی تو کجا خود بھائی بھادوچ بھی کی خبر نہیں ملی۔ حد تو یہ تھی کہ انہوں نے خط کے طور پر دو حرف بھی اسے لکھ کر نہیں بھیجے۔ بجاری لڑکی انھان سمیت ہر طرح سے حسین تر تھی۔

لیکن حیثیت کے لحاظ سے اس کی وہی مثل تھی جیسے سورنی اپنے بد غایروں کو دیکھ کر ناچتے ناچتے رگ جات ہے۔

شعب منصور کا گھر انا علی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

ان کے تمام ملاقاتی دوست احباب بھی تمام کے تمام متمول تھے اور ان سے بھی کہیں زیادہ تھے اور ایسے (ان کے اپنے سے بھی اونچی حیثیت کی لڑکیاں مانگتے ہیں۔

کیونکہ بڑے اسٹیٹس والوں کی لڑکیاں جہیز بھی بہت اونچا لاتی ہیں۔ اور پھر بڑی قوت بھرت۔ اسٹائش اور سب صفت لڑکیوں کو ہی پسند کیا جاتا ہے جو اصلی تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ پھر بھلا پیسے والوں کی اس دور رس بیاری دینی دہائی اور ایک روایتی مشرقی لڑکی کی وال کہاں تک سستی تھی۔ یوں بھی حیثیت اور اسٹائش کے سامنے آج کل جن اور شرافت کوئی وقت ہی کہاں رکھتے ہیں۔ کچھ یہ وجہ تھی اور کچھ اس لیے بھی کہ زینت اور نازش وغیرہ جب بھی کوئی بہت ٹھوٹل ٹھوٹل لڑکی اس کے بارے میں پوچھتا تو اس سے یہی کہہ دیتیں کہ اس کی تو منگنی ہو چکی ہے اور پوچھنے والا پھر چپ سا دھرتا۔ وہ تو اسفند ہی تھا جو اس کے لیے جھار کا کاشا ثابت ہوا تھا اور اس کے لانا بنا دیے جاتے ہیں تمام تر غلطی اس کی تھی۔

اس نے اگر شروع میں ہی اسفند کو حقیقت سے آگاہ کر دیا ہوتا تو بات اس حد تک نہ بگڑتی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ خود اسے بھی اسفند دل سے پسند تھا کیونکہ درانی سے تو زبردستی اس کے جسم کا سودا ہوا تھا وہ بھی صرف چار (ار کے لیے) مگر اس کے بعد بھی وہ درانی کے نام پر توجہ دھا دی گئی تھی۔

لیکن اسفند ہی وہ پہلی سستی پہلا مرد تھا جو اس کے دل میں آ بسا تھا۔ ایک دو نہیں سینکڑوں مرتبہ جب بھی اس نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تھا اسے اپنے دل کے سنگھاس پر اسفند ہی بیٹھا نظر آیا تھا۔ جبکہ وہ اسفند کے لیے بڑے خوشنود کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

پھر بھی دل پر کسے اختیار ہوتا ہے کہ دل اور خیالات دونوں ہی آزاد ہوتے ہیں۔

اور زندگی کے بیشتر اہم اور نازک مسائل میں بہت ہی غیر جانبدار نہ رول ادا کرتے ہیں۔ اور وہ اسے اس لیے بھی اتنا زیادہ چاہنے لگی تھی کہ وہ محبت کے جذبے کو بہت پاک اور مقدس سمجھتی تھی۔ اور وہ اس خوش فہمی کا مظاہرہ کرتے کہ جب اسفند کو اس پر بیعتی ہوئی بیدا کا علم ہو گا تو بعد دردی کے ساتھ اس کی حاجت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اور اگر درانی نے اسے آزاد کر دیا تو اسفند یقیناً اس کا ہاتھ تمام لے گا۔ کیونکہ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی اور بھادوچ اسے درانی کی قید سے آزاد کرانے کی غرض سے ہی انڈیا لگائے ہیں گو اسے یقین تو نہ تھا کہ ایسا ہو ہی جائے گا لیکن وہی مثل تھی کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔

اور بس اسی امید موہوم کے سہارے محض اسفند کی شدید چاہت کے بل بوتے پر اس نے اپنے اس معاملے میں چپ سا دھ رکھی تھی۔ مگر سبنا نڈا ٹھٹھا تو بھلا کس طرح۔ اور اسفند کی شدید چاہت کا پول بھی کھلا تو بھلا کیسے۔ کہ ڈراپ سین اس کی شدید اور ازلی نفرت پر ہی ہوا کہ اخلاق اور لحاظ کو بڑی شے اس نے تو روا داری اور موت کو بھی بالائے طاقت رکھ دیا تھا۔ اور جہاں موت باقی نہ رہے وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ماسوا بربریت اور حیوانیت کے کیونکہ انسانیت کا دوسرا نام مروت ہی ہے۔

ورنہ آپس میں مروت باقی نہ رہے تو انسان جانور بن کر ایک دوسرے کو کاٹنے پھاڑنے لگے۔ انسانیت میں اخلاق کا درجہ بھی دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ سب سے اصل مروت اور روا داری ہوتی ہے۔ اور اسفند نے سب کچھ اٹھا کر جھینک دیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اسے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا۔ اور اس کے گھر سے نکل کر ہر قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ان بڑھتے ہوئے قدموں میں کوئی قدم اس کی عزت پر حریف لائے گا یا باعث بننا تو اس سے پہلے ہی وہ خود کو ختم کر لے گی۔ پھر بھلا وہ اسفند سے کوئی واسطہ رکھنا پسند کرتی۔ بلکہ اسے تو مر کر بھی یہ گوارا نہ تھا۔

اس لیے سسٹر پریرا کو اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔
”نہیں سسٹر آپ میری بات کا یقین کریں۔ یا تو وہ شخص کسی اور کے دمو کے میں تھے سلوٹا گجھ بیٹا ہے یا پھر کوئی اور جکھ چلا نا چارہ ہے ورنہ میں تو اس اتنی بڑی دنیا میں تنہا ہوں۔ والدین تو کیا میرا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے تو آپ سسٹر فلورا سے معلوم کر لیں۔

”اچھا شک ہے پھر میں فلورا سے بات کر کے بھی نتیجے پر پہنچوں گی“ سسٹر پریرا نے کہا۔
اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ ایسا ہی ہے تو آپ سسٹر فلورا سے اس کی تصدیق کر لیں۔ کیونکہ جب یہ بات ہو رہی تھی اس وقت تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ سسٹر پریرا سے پہلے ہی سسٹر فلورا کو کراچی فون کر کے اسے ساری بات بتا دے گی کیونکہ وہی مہربان اور شفقت سی ہوتی اس کی راز داراں، حیر خواہ اور ہمدرد تھی۔ لیکن شام تک اسی کوشش میں فون کے ارد گرد منڈلانے کے باوجود وہی سسٹر فلورا سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ رات کو سسٹر فلورا کو فون کرنا بیکار ہی تھا کیونکہ فلورا کی ڈیوٹی شام کو ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس کا فون پر ملا ٹھکانا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جبکہ شام تک تو وہ یہی سوچ سوچ کر اپنا فون خشک کر رہی کہ پریرا نے ضرور فلورا سے بات کر لی ہوگی۔ اور اب وہ کسی وقت بھی مجھے طلب کر لے گی۔ اور کسے معلوم کہ میرے ساتھ ساتھ وہ ان دونوں کو بھی طلب کر لے اور مجھے زبردستی اس کے ساتھ جانے پر مجبور کر دے۔ اس سے پیشتر کہ ایسی کوئی بات ہو میں خود ہی کیوں نہ یہاں سے چلی جاؤں لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے کرے میں اس سمیت تین ترسیں اور رہتی تھیں۔ اور سب ہی اپنی اپنی ڈیوٹی جھٹکار والیں لگتی تھیں۔ ان میں عفت بھی شامل تھی۔

اس لیے فی الفور جانا تو بڑی بات وہ اچانک وری سامان بھی پک نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس نے سوچ دیا تھا کہ جب سب سو جائیں گی اس وقت وہ اٹھ کر چیکے چیکے اپنا سامان باندھ لے گی۔ اور اگلے روز بارہ بجے کے قریب جب پریرا نیچے آفس میں ہوتی ہے اور ترسیں اپنی اپنی ڈیوٹی بڑھو اٹھنا سوٹ کیس لے کر ملٹی دروازے سے نکل جائے گی۔ اس پر دو گرام کے تحت اس نے یہی کیا جو سوچا تھا۔ وہ مات کے بارہ بجے تک بستر پر خاموش بڑی اپنی دوامی کے سوتے کا انتظار کرتی رہی اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ سب بے سدھ پڑ کر سو گئی ہیں تو اس نے بہت احتیاط سے آواز پیدا کیے بغیر الماری میں رکھا اچانک سامان سوٹ کیس میں ڈالا۔ کیلے وغیرہ تو اس کے سوٹ کیس میں ہی رکھے رہتے تھے۔ البتہ سوٹ کیس کو بھی الماری میں ہی مقفل کر دیتی تھی۔ وہ کیونکہ الماری بھی مشترکہ ہی تھی۔ بہر حال اس نے اپنا سوٹ کیس الماری سے نکال کر اسے اپنے سر ہانے کی طرف بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ اور اس کام سے خارج ہو کر سونے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئی لیکن کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔ کہ کیوں تو اسفند

کا خیال اس دن کے بعد سے جس روز اسے زخمی حالت میں دیکھا تھا اسے بار بار آیا تھا۔ مگر ان خیالات سے کوئی اچھی بارداشت نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر ہوئی بھی تو صرف عکسوں کی دیر کے لیے بھر وہی اس کی امانت آمیز گفتگو۔ ختم سے آگے گولا بونا اور گھر سے نکال دینا ہی چشم تصور میں گھومتا رہتا تھا۔ اور پھر گھر سے نکلنے کے بعد کی ٹھوکریں۔ فلورا سے ملاقات اور پھر سرگودھا پہنچنا۔ اور اس وقت بھی اسے اس بے سرو سامانی اور کمپری کے عالم میں اسفند کے گھر سے نکل کر جو واقعات پیش آئے تھے ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے بلکہ کسی ظلم کی ریل کی طرح ایک ایک کر کے اس کی یادداشت کی سطح پر اتر رہے تھے۔

وہ رات کے نیچے کا عمل تھا جب وہ شعیب منصور کے گھر سے نکل تھی۔ شاہراہ فیصل پر ٹریفک اسی زور شور سے رواں دواں تھا جیسے کہ دن کی پہننگا مدمساعتوں میں ہوتا ہے۔

بسیں اور مٹی بسیں بھی انسانوں کے جوم سے لبریز۔ اسٹاپوں پر ٹھہر کر اپنے اپنے روٹس پر آ اور جاری تھیں۔ جلیقہ کا شاہراہ کے دونوں اطراف میں فٹ پاتھوں پر بھی ماہ گیروں کی آمدورفت جاری تھی۔ جبکہ وہ کوئی ایسی الہڑ اور معصوم دوشیزہ تو نہیں تھی کہ زمانے کے شیب و فراز سے واقف ہی نہ ہوتی۔

وہ جن لمحات میں گھر سے نکل تھی۔ ان میں ایک جوان لڑکی کے لیے قدم قدم پر خطرات نہاں تھے۔ اس لیے اس کی مثال کچھ ایسی ہی تھی جیسے بازوں اور شکروں کے زخمے میں ایک نئی مٹی کی کوری چڑھا ہوتی ہے۔

جسے ان عقاب نظر سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ملتی لیکن حتی الامکان وہ کوشش ہی کرتی ہے کہ عقاب نظر سے بچے ہی رہے۔ اور اسی کوشش میں اس نے فٹ پاتھ چھوڑ کر جنگوں کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چلتا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ جنگوں کے آس پاس کا ماحول قدرے سنان اور نیم تاریک تھا وہ چاہتی تو یہ راستہ چھوڑ کر سیدھی فٹ پاتھ پر آ جاتی اور کسی بس اسٹاپ پر رک کر بس کا انتظار کرتی۔

مگر اس کی تو کوئی منزل تھی نہ ٹھکانہ۔ سانسے سڑک پر رواں دواں بھاری ٹریفک کا ایک شور مچا تھا۔ کاروں بسوں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کی بیڈ لائٹس آنکھوں میں چکا چوندی پیدا کر رہی تھیں۔ مگر اس کے اندر تاریکی اور سناٹے سے آڑے تھے۔ وحشت اور دہشت نے ڈیرے سے جمار کسے تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جاچے تو کہاں جانے؟ کرے تو کیا کرے؟

مگر اس اتنے غدار شہر کراچی کے لاکھوں لاکھ بابوں میں سے کسی سے بھی تو اس کی واقفیت نہیں۔ کوئی ایک بھی تو اس کی جان پہچان والا نہ تھا۔ ماسوا سہیل منصور کے۔ مگر ان لوگوں سے تو ہمیشہ کے لیے بے تعلق قطع کر آئی تھی۔

لاہور بھی واپس نہیں جا سکتی تھی کہ اول تو لاہور میں اس کا بھتیجا کون؟ اور لاہور کی امانت نے ہی تو اس پر دنیاوی بہنم کے سارے دروازے کھول دیے تھے۔

بھائی اور بھائی کا بھی کوئی پتا و نشان نہ تھا۔ اور ادھر رات کے وقت تنہا بیویوں مڑکیں نا بھائی خود اپنے لیے ہزاروں خدشات اور خطرات پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ اس پر ادھر ادھر گھومتے پھیرے یا سفت انسانوں کا فون۔

اور وہ لمحے لمحے سے جو کتنا انداز میں ادھر ادھر دیکھتی۔ جنگوں کی باؤنڈری وال کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

یہاں تک کہ جنگوں کا سلسلہ ختم ہو کر کشل ایریا شروع ہو گیا۔ جہاں بہت گہما گہمی تھی۔ براہ کرمی پر ویزن اٹھو۔ مگرٹ بان کی دکان۔ الیکٹرانک پلانٹس کی دکانیں تھیں۔ اور اندر ایک سپر مارکیٹ بھی تھی۔ آگے بڑھتے ہی گاڑیاں دکانوں کے آگے پارک کی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ ایک سروس لین تھی پھر بھی اس پر ایک تسلسل سے کاریں ٹیکسیاں اور اسکوٹر وغیرہ گزر رہے تھے۔ اور ادھر ادھر بھی خاص تقاضا میں چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اور وہ بڑی آسانی سے سب کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ مگر کراچی میں ایک خوبی یا خامی یہ بھی ہے کہ عام حالات اور معاملات میں کوئی کسی کی

طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔

لیکن جوان لڑکی کی مثال رنگین آنچل کی سی ہوتی ہے جس کی ایک جھلک دیکھتے ہی مردوں کے دل غل غل اٹھتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ میں تو سوسٹ کیس بھی لٹک رہا تھا۔ اور وقت بھی ناواقعی کی نزاکت کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔ اسی پر بعض لوگ اس کی طرف متوجہ بھی ہو گئے تھے۔ گویا غلطہ عین اس کے سر پر منڈلانے لگا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کے نزدیک آکر اس سے کچھ پوچھے گئے۔ یا اسے تنہا دیکھ کر کوئی مذہب حرکت کر بیٹھے کہ عورت کی بیرو تو سیپ میں بند آبدار موتی کی طرح ہوتی ہے جس سے کوئی انسانی ہاتھ مس بھی کر جائے تو اس کی نرمی اور آب و تاب ماند پڑ جاتی ہے اسے ڈرنا تو بس اسی بات کا ورہ جان کی کسے پر واضحی۔ اس لیے ایسے حالات میں جن سے وہ دوچار تھی کوئی اور چارہ کار نہ دیکھ کر وہ جلدی سرسوس میں پار کر کے ڈٹ پاتا پر بس اسٹینڈر پر آکر کھڑی ہوئی۔ پھر تھکی ہی نہیں آئیں امداد سافروں کو اتاراد چڑھا کر اپنی راہ ہو لیں مگر وہ چپ چاپ کھڑی ہی رہی۔ حتیٰ کہ کسی اسٹینڈر پر بیٹھنے کے نیچے ایک بیچ بھی پڑا تھا اور اتفاق سے خالی تھا۔ مگر وہ اس بیچ پر بھی نہیں بیٹھی۔ کیونکہ منزل تو بڑی چیز اسے تو کسی سمت کا بھی اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر جھلسا کسی بس میں بیٹھنے سے فائدہ ہی کیا ہوتا۔ بڑے ہی گھٹن لمحات تھے اس لیے۔

کہ تیچے جو راستہ چھوڑ کر آئی تھی اس پر پلٹ کر جانا ناممکن تھا نہ آگے جانے کی کوئی راہ نظر آرہی تھی۔ کیسی بے بسی اور سپہی کے لمحات تھے کہ سوچ بھی نہ کا رہی تھی اور دماغ بھی جواب دیتا لگ رہا تھا۔ اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے ٹریفک پر بلا مقصد ہی نکلا ہیں مگر کوڑکیوں۔ نامعلوم کن خیالوں میں گم کھڑی تھی شانے پر ہلکے سے دباؤ کے ساتھ ہی ایک غیر مانوس مگر نرم سی آواز نے اس کی بند بند سی کیفیت کو یک طخت منتشر کر دیا۔

”کہاں جانا ہے تمہیں؟“ اس سوال پر اس نے گردن موڑ کر بائیں سمت دیکھا۔ شلوار سوٹ میں ملبوس، اچوٹا اور ڈھنکی کو ماتھے پر بالوں کی آخری حد تک ڈھانپے اور گھر کے چولانی دور کو بہت پیچھے چھوڑ آنے والے جھول کھائے ہوئے چہرے کی وہ ایک معمر سی خاتون تھی۔ جس کے چہرے پر عمارت کے عظیم ہونے کی بھی کوئی نشانی یا آثار موجود نہ تھے۔ لیکن اس کی آنکھیں۔

قدرے چھوٹی اور جستیں سی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اس کے خوف کو کسی حد تک زائل کر دیا تھا۔ لیکن وہ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی۔ کہ کہنے کو تھا ہی کیا۔

”کیا نوادار ہو یہاں؟“ اس نے پھر سوال داغا۔ اور اسے جھوٹ بولتے ہی بنی۔

”جی۔“ اس نے لپست سی آواز میں کہا۔

”اچھا مگر کہاں سے آئی ہو۔؟“

”لاہور سے۔“

”کب آئی ہو؟“

”ابھی۔“

”کیا تنہا ہو۔؟“

”جی۔“

”ارے تنہا آئی ہو تو۔ جن کے یہاں آئی ہو کیا وہ لوگ تمہیں لینے اسٹیشن بھی نہیں آئے؟“

”نہیں، کیونکہ میرا یہاں کوئی رشتہ دار ہے نہ واقف کار۔“

”اوہ تو پھر تم یقیناً یہاں کسی ملازمت کے سلسلے میں آئی ہو گی؟“ خاتون نے سر ہلا کر کچھ اس انداز میں کہا جسے وہ تنہا اس کی لڑکی آمد کا مفہوم سمجھ گئی ہو۔

”جی نہیں میں ملازمت کے سلسلے میں بھی نہیں آئی۔ اسے مزید جھوٹ بولنا گوارا نہ ہوا۔“

”تو پھر کیا گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟“ عورت نے ایک دم ہی مشکوک ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔ میں گھر سے بھاگ کر بھی نہیں۔ کیونکہ میرا تو یہاں نہ وہاں کوئی رشتہ دار ہی نہیں ہے۔ میں تو اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔“ اس نے پہلی بار کھل کر بات کی۔

”اچھا اگر بالکل تنہا ہو تو اب تک کہا درختوں اور جھٹوں میں زندگی گزارتی آئی ہو؟“

”اب تک۔“ سوال چونکہ بہت ٹیڑھا تھا اس لیے اس نے متوک نکلتے ہوئے سوچا۔ اگر اس خاتون کو اب بھی صحیح بات نہ بتائی تو عین ممکن ہے کہ میری طرف سے مشکوک ہو کر میرے لیے کوئی نئی مشکل کھڑی کرے۔

”جہاں کے ایک عزیز کے یہاں رہ رہی تھی؟“ اس نے بتایا بھی تو کچھ اس طرح جیسے دل سے گھر کی تباہی ہو۔ وہ خاتون سچ سچ اس کی طرف سے مشکوک ہی ہو گئی اور اسے قائل یا شرمندہ کرنے کی غرض سے آنکھیں منکا کر بولی۔

”لو ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی ہے ہی نہیں پھر یہ جہاں ایک دم ہی کہاں سے پیدا ہو گئیں۔ کوئی اور وقت یعنی وہ اتنے خدشات میں نہ گھری ہو تو اس خاتون کو بری طرح لتاڑتی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور اس کی ذاتیات میں دخل نہ دے۔ مگر اس نے تو عرصہ حیات ہی اس پر تنگ ہو رہا تھا مگر

عبادہ خاتون کے اس سوال کا کیا جواب دیتی کیونکہ اسے اپنے نجی معاملات سے آگاہ کر دے یا اتنا ہی کہہ دیتی کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہ رہی تھی انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ بخوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”دیکھیں آپ مجھے غلطہ سمجھیں میں کسی کے یہاں ڈاکہ ڈال کر رہی ہوں نہ کسی کے ساتھ بھاگ کر رہی۔ بلکہ میں واقعی ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔“

”ٹھیک ہے اگر تم مصیبت زدہ بھی ہو تو آخر کہاں رہی ہو۔ کون سے روٹ کی بس بکڑ نا چاہتی ہو جو آدھ جوت گئے سے یہاں کھڑی ہو۔“ بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ آدھے گھنٹے سے تو یہی نہیں بیان کھڑا دیکھ رہی ہوں۔“

”اسل میں تو میں لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے یہاں آکر کھڑی ہو گئی تھی ورنہ خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے تو پھر کوئی بس پکڑنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔“ اس نے کہا تو خاتون نے بڑی چوتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کمال ہے بظاہر تو تم پوری جوان اور سیانی ہو مگر یا تو باتیں بچوں کی سی کر رہی ہو یا پھر مجھے باتوں میں اڑانا چاہ رہی ہو۔“ یہی تم کہتی ہو کہ تم سیدھی لاہور سے یہاں آ رہی ہو۔“ وجہ تمہارا کوئی خطا ٹھکانے ہی نہ تھا تو اسٹیشن کے دینک دوم ہی میں کیوں نہ ڈک گئیں۔ یہاں۔۔۔ بازار کھڑے ہو کر اپنی آمد کو دواؤ۔ پر لگانے کیوں انگیں۔ دیکھو

میں خفیہ پولیس کی ایک کارندہ ہوں اور تجھ سے جھوٹ بول کر تمہیں سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔“ وہ تو آہستہ بول رہی تھی مگر وہ خاتون اتنی اونچی آواز میں بات کر رہی تھی کہ ارد گرد کھڑے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اس پر وہ تباہی ہو گئی کہ وہ خفیہ پولیس کے عین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس صورت حال سے ہم کراس نے ملتی سے لپچے میں کہا۔

”خدا کے لیے مجھے غلط نہ سمجھیے اور ذرا آہستہ بولیں۔ آپ اگر پولیس کے عین سے تعلق رکھتی ہیں تو خدا را بھ مصیبت کی مدد کیجیے۔ اور مجھے کسی ایسے ادارے تک پہنچا دیجیے جہاں مجھ جیسی لاوارث اور مصیبت زدہ لڑکیوں کو تحفظ دیا جاسکے۔ کیونکہ میری تو کچھ بھی نہیں آ رہا کہ میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ جہاں سے آ رہی ہوں ان لوگوں نے میری

زندگی کی ایسی عذاب بنا دی تھی کہ میں نے وہاں سے نکلنے ہی میں اپنی بہتری بھی سچ کے انداز پر آپ کو منوانے کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ شاید اسی قوت نے اس مشکوک خاتون کو متاثر کیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولی۔

”تم نے ایسے ناوقت اس گھر سے نکل آنے میں اپنی بہتری سمجھ کر سخت حماقت کی ہے۔ بہر حال سب کے اپنے اپنے حالات اور مجبوریوں ہوتی ہیں اور تمہاری بھی یہ کوئی مجبوری ہی ہو گی۔ لیکن میں اس وقت تو تمہیں کسی ایسے ادارے تک نہیں پہنچا سکتی البتہ میں تمہیں اپنے گھر لیے ملتی ہوں جہاں تم آرام سے رات گزار لینا۔ پھر میں کسی دالالان

کا پتا معلوم کر کے تمہیں وہاں چھوڑاؤں گی یہ

مگر خاتون کی اس ہمدردانہ پیشکش کو غنیمت سمجھنے کے بجائے وہ بدک سی اٹھی۔ کسی انجانی اور امانی خاتون کے ساتھ یونہی بلا سوچے سمجھے جا بھی کیسے سکتی تھی۔ پتا نہیں وہ کون ہوا در کس ہو۔ اسے ساتھ لے جا کر اور اس پر قبضہ کر کے کہیں کسی کے ہاتھ سے بچا دیا تو پھر وہ دین کی رہے گی مرنے کی۔ اسی خدشے کے تحت اس نے کہا۔
 "نہیں میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ آپ میں اگر تھوڑی سی بھی ہمدردی ہے تو میں مجھے کسی ادارے کا پتا بتا دیں میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔" خاتون نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔
 "تم خاصی سمجھدار معلوم ہوتی ہو اور مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہیں تو تمہاری عقلندی ہے کیونکہ آج کل تو انہوں پر بھی مشکل ہی سے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ تم اگر میرے ساتھ جاتے پر آمنا نہ نہیں ہوتو آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں ہمارے اس ٹھکانے پر چھوڑ دوں جہاں سے تم آئی ہو۔"

"نہیں نہیں وہاں اب ہر پلٹ کر جانا مجھے کبھی گوارا نہیں۔" وہ ہنسنے سے انداز میں بولی۔
 "تو کیا یہاں سڑک کے کنارے کھڑے رہ کر خود اپنے آپ ہی خطرات کو دعوت دو گی۔ دیکھو میں تم سے یہ تو نہیں کہوں گی کہ مجھ پر اعتماد کرو۔ کیونکہ ایسا کہنا نری حماقت ہی ہو گا کہ میں تمہارے لیے ایک بالکل ہی انجانی اور غیر مورت ہوں۔ البتہ اتنا اطمینان ضرور دلا سکتی ہوں کہ وہ جو اوپر بیٹھا اپنے بندوں کی ہر اچھی اور بری بات پر نظر رکھتا ہے۔ وہ میری نیت اور ارادوں سے اچھی طرح باخبر ہے اس لیے میری نیت اور ارادوں میں کسی غور کو دخل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم اس ذات برحق پر ایمان رکھتی ہو تو میرے ساتھ چلی جاؤ اور یہ تمہاری مرضی میں نہیں مجبور نہیں کروں گی۔ دوسرے مسمون میں اس خاتون نے اپنے ٹیک ادا دوں اور ٹیک نیت کا خدا کو

گواہ بنایا تھا۔ اور اس بات کا کوئی عام بندہ بھی کہہ سکتا ہے تو اسی وقت جب اس کا دل نورانیان سے نمودر ہو۔ اسی لمحے سوچا کہ اب مزید انکار اس کی راست گوئی کی تو بہن ہو گا۔ اس لیے اس نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
 "اچھا چلیے مگر برائے مہربانی۔ صوبہ وعدہ مجھے کل کسی ادارے میں ضرور پہنچا دیجیے گا۔" وہ پہلی بار ہنس کر بولی۔

"میں نے وعدہ تو نہیں کیا تھا لیکن اگر تم اسے وعدہ ہی سمجھ رہی ہو تو میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ کل ہی کو کسی دارالامان میں پہنچا دوں۔" اپنی بات کہہ کر اس نے قریب سے گزرتی ہوئی موٹر کار کو ہاتھ لے اشارے سے روکا اور پھر اس کے ساتھ رکشا کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"یوں تو عموماً میں بس سے ہی سفر کرتی ہوں مگر اب مزید بس کے انتظار میں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ اس لیے رکشا میں ہی چلتے ہیں۔" اور پھر اس کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر اس نے رکشا والے سے کہا۔
 "مارٹن روڈ لے چلیے اور پھر شاہراہ فیصل پر واپس پلٹ کر ایک موٹر ملنے کے بعد ناک کی سیدھ میں جو رکشا نے فرما تھا اور کھیں نیم تاریک مگر ٹریفک تھا کہ چاروں طرف سے اُبلے پڑا تھا۔

اصل میں وہ شہید ملت روڈ تھی جو شاہراہ فیصل سے شروع ہو کر جیل کے آخری سرے تک ختم ہوتی ہے۔ اور وہیں بائیں ہاتھ کو مارٹن روڈ کا ملحق تھا۔ خاتون تمام راستے ایک لفظ نہیں بولی تھی۔
 جہاں تک اس نے محسوس کیا وہ تمام راستے زبردست کچھ پرستی رہی تھی۔ رکشا والے نے اس کے بتانے پر انداز

ملی درگلی میں کو لوٹروں میں ایک کواد کے آگے رکشا روکی۔ خاتون نے پہلے اسے اتارا پھر خود اکر میٹر جھانک کر راکھ دیا۔ اور سامنے بیٹے ایک چھوٹے سے کواد کی طرف بڑھتی ہوئی اس سے بولی۔
 "آؤ ہم اللہ۔ اندر چلو۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر پہنچ کر کندھے میں پڑے بڑے سے تلے کو کھولا اور اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر بجلی کا سوچ دیا دیا۔

روشنی ہو جانے کی وجہ سے کمرے کی ہر شے واضح ہو گئی۔

کمرے میں ایک پلنگ۔ ایک چوکور میز دو کرسیوں۔ دو مندرتوں اور صراحی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ فرش پر ایک خوش نما سا گلیچہ چڑھایا ہوا تھا۔ مگر چیزوں کی شینک بکھرتے قریب سے لگی تھی کہ نفاس کے ساتھ ساتھ خوش سلیکی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اب تک منہ اسی طرح ڈھلنے کے صرف اس کی آنکھیں ہی تھوڑی سی نکلی نظر آرہی تھیں دروازے کے آگے بھی کھڑی تھی۔ خاتون نے دروازے کا اندر سے ٹھکانا لگاتے ہوئے اس سے کہا۔

"بیٹی آرام سے میرے پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔ اطمینان رکھو یہاں کوئی مرد تو کیا عورت بھی نہیں آئے گی۔ تم بے فکر ہو کر پناہ چادر بھی چہرے سے بٹا دو اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت دے دو۔ اصل میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں ابھی تک عشا کی نماز بھی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ بس ذرا نماز پڑھ لوں پھر تم سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔" سلوٹ پر گویا پھلپھلاہٹیں ہی اس کی پرہیزگاری کا پڑا تھا۔ اس کے دل میں جو شک و شبہات باقی رہ گئے تھے وہ بھی دور ہو گئے۔ عورت دوسرا دروازہ کھول کر باہر محسوس نہیں ہو کر گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد۔ وضو سے چہرہ لیے اندر آئی اس کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر جامنا بچہ کر نماز ادا کرنے لگی اور سلوٹ نے اٹھ کر پہلے دوسرے کھلے ہوئے دروازے سے باہر جھانکا۔

باہر اسے ایک تنگ سامعین نظر آیا جس کے بائیں طرف باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلاء بنا ہوا تھا۔ باہر صحن میں بلی کا پور کا بلیب چل رہا تھا اس لیے ہر چیز واضح اور صاف نظر آرہی تھی۔ باہر صحن میں بالکل سناٹا پڑا تھا پھر بھی سلوٹ نے اس کے پلنگ کی طرف پلٹنے سے پہلے دوسرے دروازے کی بھی اندر سے چھٹی لگائی اور اپنی چادر اتار کر اوپر اوپٹے کو قریب سے اوڑھ کر اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

پھر تھوڑی دیر نہیں بلکہ خاصی دیر اسے انتظار کرنا پڑا تب کہیں جاکر وہ خاتون نماز سے فارغ ہوئی اور جامنا تہہ کر کے اسے مندرت پر رکھ کر بولی۔
 "پہلے میں کھا نا گرم کر کے لاتی ہوں۔ آج توضیح سے کچھ کھایا ہی نہیں کام ہی کچھ اتنا پڑھ گیا تھا کہ سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ تمہیں بھی تو بھوک لگ رہی ہو گی۔"

"نہیں میں تو کھانا کھانے کے بعد ہی وہاں سے نکلی تھی۔ لیکن آپ ضرور کھائیں آپ نے ویسے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" سلوٹ بولی۔
 "ہاں ہاں بیٹی۔ میں تو ضرور کھاؤں گی میں بھوک کے معاملے میں ویسے بھی کچی ہوں۔ یوں بھی بیٹی بڑھاپے میں انسان صرف کھانے کے سہارے جیتا ہے۔ کیونکہ جوانی میں تو پانی بھی اسے خون بن کر لگتا ہے۔ اصل میں عمر کا فرق ہوتا ہے نا۔ خاتون نے کہا اور پھر چھٹی کھول کر باہر نکل گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں رٹے تھے جس میں بڑی نفاس سے کھانا چبنا ہوا تھا۔

ایک خوبصورت سے نقیشت پیالے میں تھوڑی سی دال تھی۔ ایک میں ساخن۔ اچار کی بوتل۔ ایک پلیٹ میں روٹی اور پانی سے بنا لب شیشے کا گلاس۔ جبکہ رٹے میں ایک سفید جھگ رٹے لافہ بھی بچھا تھا۔ رٹے کو اس نے ایک چھوٹی سی چوکور میز پر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے آگے بن بیٹھ گئی۔ سلوٹ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔ اس کے دل میں پھر شک و شبہات سر اٹھانے لگے تھے۔ کہیں یہ عین ایک دکھاوا ہی نہ ہو۔ پارسائی کا ڈھونگ ہی نہ ہو۔ چھوٹا سا بچہ ہی مگر کوٹور کے اس کمرے میں وہ تنہا تو ہرگز نہیں رہتی ہو گی۔ یہی سب سوچ سوچ کر وہ دل ہی دل میں ہنسی رہی۔

اور وہ خاتون بڑی باتوں کی ثابت ہوئی تھی اور ٹیپ کی طرح مسلسل بچے ہی جا رہی تھی۔
 "بازار کا کھانا خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو مگر مجھے تو اپنے ہاتھ کا پکا یا ہوا کھانا ہی مزہ دیتا ہے۔ اس لیے میں بیچ تر کے اٹھ کر نماز اور گھر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کھانا تیار کر کے جاتی ہوں۔ مگر سناؤ اس لیے نہیں لے جاتی کہ ایک تو فرست ہی مشکل سے ملتی ہے دوسرے ٹھنڈا کھانا مجھے بہتم نہیں ہوتا چاہو

413

مجھے بہت مرعوب ہیں مگر چاول کھانے سے میرے پیٹ میں الجھا لاسا ہوتا ہے جوڑوں میں بھی درد ہوتا ہے اس لیے عرصہ ہوا میں نے چاول کھانے چھوڑ دیے ہیں۔ اصل میں یہ کراچی کی ہوا بہت مرعوب ہوئی ہے ناس لیے ہادی چیزیں مجھے بہت نقصان دیتی ہیں؟

اف ادھر اس کی جان پر پختی اور ادھر یہ نہایت غیر متعلقہ اور فغول سی باتیں سننے کو مل رہی تھیں گویا دوسرے معنی میں خاتون کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کسی خوش وقتی میں اس کے یہاں نہیں آئی ہے۔ باوجود وہ داستانہ ایسی باتیں کر کے اسے پٹانا ناچا رہی تھی۔ مارے کوفت کے سلوط کا برا حال بدور با تھا۔ لیکن تا کیا نہ کرتا کہ مصداق وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کی لٹرائی کو برداشت کر رہی تھی۔

آخر کھانے کے اختتام پر وہ خاتون خود ہی خاموش ہو گئی۔ اٹھ کر خاموشی سے ٹسے اٹھائی اور پھر باہر نکل گئی۔

اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی دیر لگا کر آئی۔ مگر آئی تو ایک چھوٹی سی طیشی میں چائے کے دو کپ لے کر آئی۔ دیوں تو خاموشی گری پڑ رہی ہے۔ مگر ہم کراچی والے تو صد فی صد چائے کے رسیا ہوتے ہیں اس لیے یہی تمہارے لیے یہ گرم گرم چائے بنا کر لائی ہوں جبکہ چائے تو خاتون کی ٹھنڈی چیز یا مشروب پیش کرنی۔ مگر وہ غریب کے پاس خرچ ہے نہ بازار سے کوئی برت لانے والا۔ پس تھوڑی دیر کے لیے یہ کچھ لو کہ میا سا زولیا راگ۔ اب یہاں تمہیں برف میں لگا ٹھنڈا پانی بھی نہیں مل سکے گا؟

”یہیچے۔ یہاں ایسی کون سی برف کی عادی ہوں میں جیسا مل جاتا ہے وہی کھا پی لیتی ہوں۔ اصل میں، میں نے خود کو ہر طرح کا عادی بنا رکھا ہے۔“ سلوط بولی۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے بیٹی۔ کیونکہ اس طرح کا انسان بڑے سے بڑے حالات کا سامنا کر سکتا ہے۔ ہاں اب بتاؤ کہ تمہاری بھابی کے رشتے داروں نے تمہارے ساتھ ایسی کیا بدسلوکی کی تھی جو تمہیں ان کے گھر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا؟ خاتون نے گویا اب اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بڑی طویل داستان ہے خالہ جان۔ پس اتنا سمجھ لیجیے کہ کچھ ایسی ہی لوٹ لگتی تھی جو میں نے ان کے گھر سے نکل کر اپنی عزت پر بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ معاف کیجیے گا میں نے آپ کو خالہ جان کہہ دیا۔“ سلوط نے گویا کہہ کر بڑی خوبصورتی سے اپنے معاملات پر پردہ ڈالا۔

”خیر خالہ جان ہی کیا تم مجھے اتنا جان بھی کہہ سکتی ہو۔ لیکن اگر اتنی فلور اکہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ خاتون مسکرا کر بولی۔

”آئی فلور!۔ لیکن آپ تو مسلمان ہیں ابھی معشاک کی غماز پڑھ رہی تھیں۔“ سلوط نے سخت متعجب ہو کر کہا۔

”ہاں الحمد للہ میں مسلمان ہی ہوں۔ لیکن تمہاری طرح میری داستان بھی بہت طویل ہے۔ اگر موقع ملا تو پھر کبھی سنادوں گی۔ اس وقت تو تم اپنی سناؤ خاتون نے بدستور مسکرایے ہوئے کہا۔

”تمہیں پہلے آپ اپنی داستان سنا لے۔ ورنہ میری عادت ہے کہ جس کے عالم میں کوئی بات ہی نہیں کر سکتی۔“ اچھا پہلے تم چائے تو پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی تو کیا خاک مزادے گی؟ لیکن اس نے سنا تھا کہ بعض لوگ چائے یا پانی وغیرہ میں بھجھتی کی کوئی دوا ملا دیتے ہیں۔ کہیں ان آئی فلور نے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی ہو جو یہ چائے پی کر بعد میں مجھے ہتھتا نا پڑے۔

”آپ اپنی محبت سے میرے لیے چائے بنا کر لائی ہیں اس لیے انکار کرتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ ورنہ یقین جان میں صبح ناشتے کے سوا بالکل چائے نہیں پیتی۔ اور رات کو پینے سے تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ خیر یوں گی مگر ذرا ٹھنڈی ہو جائے۔ اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد گویا بہت خوبصورتی سے چائے پینے سے انکار کیا تو آئی فلور نے اُس کے آگے سے پانی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اگر نیند اڑ جاتی ہے تو ہرگز نہ پینا۔ یوں بھی بہت تھکی تھی گھر پر ہو۔ تمہارے چاند سے کھڑے ہو جو یہ استعمال سا فلز آ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کئی راتوں سے نہیں سوئیں۔ میرے خیال میں تو اب تم آرام سے پڑ کر سو جاؤ باقی باتیں ہم کل کسی وقت کر لیں گے اور اس نے سوچا کہ کل بائیں کرتے کا موقع ہی

کپ ملے گا۔ وہ تو کسی دارالامان میں چلی جائے گی۔ کب ہاں تنگی ہوئی ضرور ہوں مگر اب اتنی بھی نیند نہیں آرہی۔ اور کم از کم آپ کی داستان سننے کے قبل تو بالکل نہیں آئے گی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ارے بچی دنیا میں ایسا کون ہوگا جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی داستان۔ کوئی نہ کوئی المیہ نہ لگا ہوگا۔ جبکہ میں تو ایک بہت ہی معمولی بہت ہی حقیر شخص ہوں۔ خیر تمہیں اس قدر اشتیاق ہی ہے میری داستان سننے کا تو سنو۔ اس نے اپنی بات کہہ کر قدرے توقف کیا اور پھر بولی۔

”میں اپنی داستان تو تمہیں بعد میں سناؤں گی لیکن پہلے میں تم سے ایک جھوٹ بات کہنے پر معذرت کر لوں۔“

”جھوٹ بات۔“ سلوط نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں میں نے خود کو پوچھ لیس کا کارندہ ظاہر کر کے جھوٹ ہی بولا تھا۔ اصل میں اس وقت کچھ بچپن ہی ایسی تھیں کہ مصلحتاً مجھے غلط بیانی سے ہی کام لینا پڑا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر تم کوئی ایسی ویسی لڑکی ہو تو میرے

اتنے ذاتی استفسارات پر کہیں اٹھا مجھے ہی پھنسا دو۔ کہ آج کے کھوٹے اور مٹھلی زمانے میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کبھی کبھی کسی کی ہمدردی اور خیر خواہی کرنے میں اتنی آنتیں گلے پڑ جاتی ہیں؟ خاتون نے کہا تو سلوط بولی۔

”لیکن یقین جانیں اتنی میں آپ کو پوچھ لیس کے ٹکے سے متعلق سمجھ کر بھی بالکل مرعوب نہیں ہوتی تھی کیونکہ میرا ضمیر بگم نہیں تھا۔“

”ہاں ہاں میں تو چند سوالات کے بعد ہی سمجھ گئی تھی کہ تم بہت راست گو اور بے قصور ہو۔ لیکن یہ میرا اخلاق زمین تھا کہ میں تم سے اپنی دروغ گوئی کی معذرت کر لوں۔ بہر حال اس وقت رات کے گیارہ بج چکے ہیں تم اگر چاہو تو سو سکتی ہو ورنہ۔“

”نہیں نہیں آپ اپنی داستان سنا لے۔“ سلوط جلدی سے بولی۔ حالانکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ آئی فلور کو سخت نیند آرہی ہے۔ وہ بار بار جھانپاں میں لے رہی ہیں اور ان کی آنکھیں بھی بند ہو رہی ہیں۔ مگر اس کا خود ارادہ نہیں تھا سونے کا وہ ساری رات جاگ کر گزار دینا چاہتی تھی۔ خاتون نے پہلی بار تھوڑا سا منہ بنایا پھر دیوار کی طرف سرک کر ٹیکے سے ٹیک لگائی۔

”میرے والد گڑبھد کیشور میں انگریز کسٹمر کے اردلی تھے۔ بہت اچھی تنخواہ تھی اور تنخواہ کے علاوہ ٹپ وغیرہ بھی بہت مل جاتی تھی۔ اس پر ان کے پاس چند بیکھر زمین بھی تھی اور ذاتی مکان بھی۔ یعنی کوئی مالی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ میں تو اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کہاں سے آتا ہے اور کیسے آتا ہے۔“

مرض کھانے۔ کیک پیسٹر ہاں، بسکٹ، جاکلیٹ، ٹافیاں، پھل اور میوے کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو کھانے کو نہ ملتی ہو۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بڑا بھائی زبانی زمین کی دیکھ بھال کرتا تھا جو شہر سے باہر ایک قریبی گاؤں میں تھی اور جس میں ایک کا ذاتی یا آبائی مکان بھی تھا جس میں بڑا بھائی رہتا تھا۔ ہم باقی بہن بھائی اور والدین اباکو ٹیکے کی طرف سے ملے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ بڑے سے چھوٹی آپ بھائی اور اس سے چھوٹی بھائی کو ابانے ایک مشینری اسکول میں داخل کر رکھا تھا۔ اس بھائی سے چھوٹی بہن بھی اور میرے بعد چھوٹا بھائی۔ اتنے

لکھنوی عین سے زندگی گذر رہی تھی کہ آج کل کے زمانے میں کوئی چاہے بھی تو نہیں گزارا سکتا۔ میری عمر اس وقت مشکل سے سات سال کی تھی اور میں کچھ بہت ہی لاچار دکھنڈی واقع ہوئی تھی۔ کچھ ہوش ہی تھا کہ گھر

میں اور گھر سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یوں بھی گھر میں، میں کتنی ہی کب تھی۔ ہمارے بڑے دوس میں ایک سچی گھڑانا آباد تھا۔ آئی فلور اور انکل کر سٹورف۔ ان کے بھی کئی بچے تھے۔ میں سارا سال دن ان کے گھر میں تھیں ان کے بچوں سے کھیلتی رہتی تھی کبھی کبھی امماں سے اسی بات پر بہت ہنسی بھی تھی کہ میں گھر میں ملک کر کیوں نہیں بیٹھتی مگر اتنی

بامیلا ہمیشہ مجھے بیٹھے سے بچا لیتی تھیں۔

ان کے اور اماں کے درمیان بہت گہری دوستی تھی۔ آیا جو کچھ بھی کسٹمر صاحب کے بھال سے بچا کھالائے اماں

415

اس میں سے آنی یا میلکا کا حصہ منور علیحدہ نکال کر رکھ لیتی تھیں۔ مگر خود ان کے ہاتھ کاٹکا یا ہوا یا بھیجا ہوا کچھ نہ کھا تھیں۔ کیونکہ انہوں نے کتے پال رکھے تھے جو ان کے ہاتھوں اور کپڑوں کو حق کی کبھی کبھی منہ کو بھی جاڑ لیا کرتے تھے مگر وہ کبھی ہاتھ یا منہ نہیں دھو تھیں۔ جبکہ اماں بچے وقت نمازی اور پرہیزگار تھیں۔ اور ان بھی ہمارے مذہب میں کتے کی رال ناپاک ہوتی ہے۔ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں نیکی کے فرشتے نہیں آتے اور ہم کتے کو انتہائی بلیدہ سمجھتے ہیں۔ خیر آنٹی یا میلکا بھی اماں کی اس بات کا ذرا بھی برا نہیں مانتی تھیں۔ بلکہ اماں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی کتوں سے پرہیز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اصل میں اماں ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے تو یہی یاد ہے کہ بعض دن تو اماں انہیں پورا پورا کھانا بھیج دیا کرتی تھیں۔ انکل کو سٹوگر کو بڑے بدمزاج آدمی تھے ان کے بچوں کی ان سے جان نکلتی تھی لیکن میرے ساتھ وہ بڑی نرمی اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ بیسیوں بار انہوں نے آپا سے کہا تھا کہ مجھے اسکول میں داخل کرادیں۔

مگر چونکہ سرکاری اسکول ہمارے کو اڑے بہت دور تھا اور مشنری اسکول میں بھائی کو بھی مشکل سے داخل ملا تھا شاید اس لیے ابا نے مجھے اسکول میں داخل نہیں کرایا تھا۔ آنٹی یا میلکا بھی مجھے انگریزی کا قاعدہ پڑھایا کرتی تھیں کیونکہ اردو پڑھنی اور لکھنی انہیں آتی ہی نہیں تھی۔

بہر حال۔ جانے ایک دم ہی بیٹے بنائے سب کو کیا بوسا تھا کہ ابا نے بڑے بھائی کو بھی اپنے ملا لیا تھا۔ ادا ہم سب کو لے کر کوآرٹریس بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ دن کو بند ہو کر بیٹھے تھے یا رات کو لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ جیسٹلے کا وقت تھا۔ بہن شاہدہ گھر کی بندش سے ہی گھر کا گھر سے باہر نکل گئی تھی حالانکہ اماں نے آدازیں ہی دیتی رہی تھیں مگر میں بھاگ کر برابر والے آنٹی کے کواڑوں میں جا کر چپ گئی تھی۔ چہرے معلوم کیا ہوا تھا۔ یہی آنٹی کے اس چھوٹے سے اسٹور میں کب تک اور کتنی دیر تک چھپی رہی تھی۔

لیکن باہر نکل تو اتاں ہو چکی تھی۔ اور کچھ ایسا عمل چاہا ہوا تھا کہ انوں کے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ مثالیں ٹھانیں کی آدازیں۔ جے ہند اور ست سری امال کے فخرے اور لوگوں کی چیخ و دکار۔

ظاہر تھا میں ایک گھنٹہ ہی بچی تھی اس لیے ان ڈرافٹی آدازوں اور شور سے خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود جی میا تجس انتہا کو پہنچ گیا تھا میں یہ دیکھنے کے لیے اسٹور سے نکل کر سیدھی باہر بھاگی کہ باہر کیا ہو رہا ہے تو کسی نے بھاگ کر مجھے پیچھے سے دلوچ لیا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ آنٹی تھیں جنہوں نے منہ پر انکل رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور یوں میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"باہر نہیں جاؤ۔ باہر نہ مارا واسطے بہت کھتر (خطرہ) ہے۔ آؤ ہم تم کو اپنا باہر والا کھوتی میں چھپادیں۔ آؤ پورٹل" آنٹی جلدی کاتے مجھے اسٹور روم میں گھسیٹ کر لے گئیں۔

وہ بہت خوفزدہ لگ رہی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس لیے شاید میں بھی ڈر گئی تھی۔ ورنہ ان دنوں مجھے خطرے کا مفہوم ہی معلوم نہیں تھا۔

پھر آنٹی مجھے اپنے بچوں کی آنکھ بجا کر کواڑ کے عقبی حصے میں ہی ایک چھوٹی سی کوسٹری میں لے آئیں جس میں کاٹ کبڑا بھرا ہوا تھا اور اس قدر اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی نہیں دے رہا تھا۔

"دیکھو اچھے بی بی لوگ کے مالک (موافق) اور آرام سے بیٹھو۔ ہم ابھی سٹوڈنٹ اور لیڈر کتبیں اور سے نکال لے گا۔ دیکھو اگر تم باہر آیا تو اور یہ بوجھنا (تھکنے) لوگ چاکو سے تمہارا گلا کاٹ دے گا۔ آنٹی نے بہت غلٹ میں مجھے تاکید کی اور پھر بھاگ کر اندر چلی گئیں۔ اور مجھے دیکھو۔ میں اسی کھوتی کے فرش پر سٹوڈنٹ سی جگہ بنا کر بیٹھ لی اور پھر کچھ سا سوئی گئی۔ اپنی داستان یا تعداد سنانے ملتے خاتون کو شاید کسی دھڑلش یا دے خاموش ہونے پر غور کر دیا۔ مگر کچھ کچھ ہی دیر بعد۔ وہ اپنی آنکھوں کو کرکڑانے کے بعد بولی۔

"اور جب میری آنکھ کھلی تو سب ہو چکی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرا سب کچھ ٹپ چکا تھا۔ تباہ ہو چکا تھا۔ ماں باپ بہن بھائی اور گھر سے بندوں اور سکھوں نے جلا ڈالا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہا تھا ماسوائے میری اپنی ذات کے ورنہ بڑا بھائی اگر گاؤں سے بلا لیا جاتا تو اس کے بچنے کے تو امکانات ہو سکتے تھے۔ مگر وہاں تو سب ہی شہید

کر دیے گئے تھے۔ اور مجھ شتی دل کو دیکھو کہ میں ہمیشہ کے لیے اپنوں سے بچ کر جانے پر رونی۔ چلائی نہ تڑپائی۔ البتہ ٹنگ سی ہو کر رہ گئی۔

آنٹی کے ملنے جلنے والوں اور دوستوں کے بچے آتے تو میں بہت غریب انہیں اپنا کواڑ دکھا کر کہتی۔

دیکھو میرا کواڑ کتنا تھا۔ اس میں میں سے والدین اور بھائی بہن رہتے تھے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے سب کو مار ڈالا۔ اب میں ہی بچی ہوں۔ میں یہ کہہ کر کبھی میں بیٹھنے لگتی اور کبھی رونے لگتی۔

آنٹی نے مجھے اپنے یہاں پناہ دی تھی اور سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ مگر دوسروں پر یہ راز جلد ہی فاش ہو گیا کہ خانم علی کی چھوٹی بیٹی کو مسٹر کرستوفر نے اپنے یہاں چھپا رکھا ہے۔

مسلمانوں کے خون کے پیاسے کتے ابھی تک مسلمانوں کی بوسو نکلتے پھر رہے تھے انہیں معلوم ہوا تو آنٹی پر دھڑ دھڑاے۔ اور مجھے ان کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکل کرستوفر نے بھی کہا کہ ہاں اس مسلمان دکان کو ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا۔ آنٹی یا میلکا سی طور پر مانتی ہی نہیں۔

دوم نے فریاد کو اپنی بیٹی۔ بنایا ہے۔ اور اسے کرسمس بنا کر اس کا نام فلورادکھ دیا ہے ہم اس کو ہرگز ہرگز تم لوگوں کے حوالے نہیں کرے گا۔ آنٹی بھی اپنے موقف پر اڑ رہی تھیں۔ اصل میں تو میری زندگی باقی تھی اس پر قدرت کی مصلحت کچھ یہی تھی کہ اس نے آنٹی یا میلکا کے دل میں میری محبت ڈال دی تھی۔ جو ان درندہ صفت وحشی لوگوں نے زیادہ میل و محبت نہیں کی اور مجھے آنٹی کے پاس چھوڑنے کے لیے راضی ہو گئے۔

پھر میری پرورش آنٹی کے یہاں ہونے لگی۔ انہوں نے مجھے کچھ مذہبی تعلیم کے واحد مشنری اسکول میں داخل کرادیا اور خود بھی مجھے عیسائی مذہب کی تعلیم دینے لگیں۔ ہر اتوار کو وہ مجھے گرجا بھی لے جاتی تھیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بت کے سامنے وہ مجھے گھٹنے ٹیکنے اور سر جھکانے کو کہتیں۔ وہ مجھے بائبل کے کوئشن پڑھنے کو کہتیں تو میں وہ بھی پڑھ لیتی لیکن جب مقدس بائی بیٹے کو دیتیں تو میں انکار کر دیتی۔

اور جب بھی وہ مجھے سیکھ کے مخصوص اشارے کر اس بنانے کو کہتیں تو کراس بناتے ہوئے میرے معہ سے آپ بآپ کلمہ طیبہ جاری ہو جاتا۔ اور اس پر وہ کبھی کبھی اتنی خفا ہوتیں کہ مجھے مارنے بیٹھے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔

اور کبھی مجھے یہ ڈرا داتیں کہ اگر تم نے ہمارے کہنے کے مطابق نہیں کیا تو ہم بندہ اور سکھ لوگ تم کو پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر تمہیں قتل کر دیں گے۔

لیکن اس وقت مجھے موت کا مفہوم معلوم ہی نہ تھا البتہ میں گلا دلا کاٹ دینے کے خیال سے بہت ڈرتی تھی۔

اصل میں میرے لا شعور میں اماں کی بھائیوں اور بہنوں کو نصیحتیں اور ان کا سختی سے صوم و صلوة کا پابند ہونا رکھتوں سے اس قدر پرہیز کرنا تھا کہ اس مضبوطی سے جبر کر بیٹھ گیا تھا کہ آنٹی کا کوئی بڑے سے بڑا ڈراوا بھی مجھے شہ تر نہیں کرتا تھا۔ اور اس بات کا احساس تو مجھے بہت بعد میں ہوا اس وقت تو مجھے کچھ ہی معلوم ہی نہ تھا۔ اصل میں ہوائن ہیدا کشی مسلمان ہونے پر دھڑم دھڑم تک مسلمان دی رہتا ہے خواہ اس کی پوروش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہو وہ مسلمان ہی رہتا ہے کیونکہ اسے اندری اندر غلیبی طور پر ہدایت ملتی رہتی ہے۔ یہ میرا فانی تجربہ ہے۔

پھر اس سب ماحول میں گویا چھوٹی سے بڑی ہوئی۔ یعنی پورے چھ سال تک آنٹی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہی۔ اور اس عرصے میں آنٹی اور اصل سے ہر ملکر طریقے جو پورے ڈرا لاکر میں ان کا مذہب اپنانا مل کر جب میں آمادہ نہ ہوئی تو آنٹی نے میری طرف سے مایوس ہو کر مجھے خشنی ایک دن کے ساتھ جو پاکستان جاری تھی۔ لاہور بھیج دیا۔ لاہور میں بھی مجھ پر کافی دھڑلایا گیا۔ حتیٰ کہ کچھ سختی بھی کی گئی۔ مگر میری ناہاں میں نہ بدل سکی۔ اصل میں آنٹی یا میلکا نے وقت رخصت میرے ساتھ ہی اس ن سے کہہ دیا تھا کہ میری دی خواہش تو یہی ہے کہ یہ میرا مذہب اختیار کرے لیکن اگر یہ آپ کے بھلانے والی زمائے تو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیجئے گا۔ اصل میں میں نہیں چاہتی کہ اس بد کوئی زیادتی کی جائے کیونکہ اس

تم فکر نہ کرو میرے کلینک میں ڈاکٹر صاحب سے علاج کرانے ایک سوئٹل ورکر آتی ہیں۔ میں ان سے آج ضرور کسی ایسی ادارے کے بارے میں معلوم کروں گی جہاں تم عزت کے ساتھ رہ سکو۔ غلوارنے اس قدر خاموش دیکھ کر گویا اطمینان دلایا۔

ہیں۔ اچھا تم بھی جلد چلنا۔ اصل میں ڈاکٹر صاحب بڑے خردماغ ہیں۔ مگر خیر میں اس کا بھی کوئی بڑا کوئی بندوبست کروں گی۔ فلورائے اسے ساتھ سے جمانے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: تب وہ حضورِ دی کیسے کیسے سوچی۔

مگر جیسی کہ اس کی خواہش تھی، اور فلورا کا خیال تھا کہ وہ اس سوشل ورکر مریضے سے کسی دارالامان جیسے ادارے کا پتہ لے لے کہ اس روز وہ سوشل ورکر کی نہیں آئی۔ فلورائے دوسری نرسوں وغیرہ سے بھی پوچھا لیکن تقریباً سب ہی نے

فیضانِ جلالِ پور سے آئی ہوئی تھی، اس سے ملنے آگئی۔ وہ اب تک اس ہسپتال میں کام کر رہی تھی جس میں فلورائے عرصے تک ملازمت کرتی رہی تھی۔ دونوں بڑی محبت اور کرمِ انجمنی سے ملیں اور بڑی دیر تک بائیں کرنی نہیں کر ڈیوٹی کا سوال اٹھا۔

لیکن فلور کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوئی۔ رتبہ مٹا اُسے سلوٹ کا خیال آیا تو اُس سے شیشا سے پوچھا۔
 ”اے ہال شیشا، تم اُس مونا کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ مہارے پاس تو اسے رکھنے کے لیے جگہ بھی بہت

اور غفور اجل سے کے لاہور جانے سے انکار کر دینے کی وجہ معلوم تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔
 ”مگر اوکس علیہمیں نہیں۔ کیونکہ شیلہ پنڈی یا کسی اور شہر میں کوئی ایسا سنگ ہوم ہے جہاں کسی سے تمہاری وفایت

”ہاں ہاں۔“ فلوٹا نے جلدی سے کہا۔
 ”وہ آج کل سرگودھا میں رزموں کے ہوٹل کی انچارج لگی ہوئی ہے۔ تم اس سے بات کرو نا۔“

اچھا چلو میک ہے۔ ہر لمحہ بھی وئی سے بات کر لہ۔ مجھ سے زیادہ تمہاری اس سے گارمی چھتی تھی۔ وہ تمہاری بات ٹلے

419

”لیکن آپ نے اپنا نام کیوں نہیں بدلا؟“ سلوٹ نے پوچھا۔
 ”اے بیٹی! نام بدلنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ یوں بھی اگر نام کے کچھ اثرات بھی ہوتے ہیں تو فریدہ نام میرے لئے بہت

نہیں چاہا کہ ان کے دیے ہوئے نام کو بدل دوں۔" غلور اس نے مجھے بتایا اور پھر ایک طویل سی جاتی لے کر چلی۔
 "اوپر ایک بج رہا ہے، جیسی تو مجھے اتنی سخت نیند آرہی ہے۔ دیکھ بھی میں صبح کی اذان کے وقت اٹھنے کی عادی

کہ تنگ و شبہات میں تمام رات جاگتی رہو۔
 ”افہ“ انہی غلو رادل کی بات کیسے بڑھ لیتی ہیں۔ اس نے شرمندہ ہو کر دل میں سوچا اور جلدی سے جوابی۔

فلو تو کچھ ہی دیر بعد غالیچے پر لیٹ کر بے سندھ ہو گئی۔ مگر اسے بالکل فزید نہیں آئی۔ اس نے اٹھ کر پیچھے دروازہ
کے کھٹکے چیک کیے۔ پھر ملنگ پر بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتی رہی کہ کیا اس کی باتوں میں کچھ صداقت بھی ہے یا نہیں۔

مگر سے غائب ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ کہیں وہ میرے سونے سے فائدہ اٹھا کر کسی کونلے سے تو نہیں گئی۔ یا پھر مجھے اس مکان میں اکیلا بھڑو کر کے چھپت نہ رکھ لی ہو۔ اس خیال نے اسے دہلا کر

اچھے پرفروش ہو جائے ہی تھے کہ وہ کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔
 "اے تم بھی جاگ گئیں۔ چلو اچھا ہوا۔ جلدی سے جا کر دمنو کر آؤ۔ اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے اس نے کہہ کر یہ

بہر حال۔ اس نے محض اس پر یہ جملے کی خاطر وہ اس کی طرف سے بدگمان نہیں ہوئی ہے اٹھ کر وضو کیا اور پھر کمرے میں آکر نماز پڑھا دی۔

روم میں پہنچی۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اسے ہوسٹل میں آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لیے اس کے روم میں کوئی موجود تھا۔ اس نے روم میں آکر ایک لمبھی صانعہ دکھائی۔ جلدی سے الماری کھول کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور پھر روم سے نکل کر عقیبی دینے کا رخ کیا اور بڑے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی یہ نیچے پھیلائیٹ کھول کر ہاسٹل سے باہر نکل آئی۔ فلور اسکے پاس جانے کے سوا اس کا اور کوئی شکار نہ تھا۔ کوئی راستہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس لیے اس نے ایک رکشہ لے کر سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔

”مثلاً دوبر کی گاڑی سے لاہور واپس جا رہی ہوں۔ اگر کوئی کامیہ ساتھ بھیجنا ہی ہے تو پھر ساتھ کے ساتھ اس کا ٹکٹ خرید لو، میرا کن جوئی ہے نادہ شام کو میرا ٹکٹ خریدنے جائے گا تو ساتھ کے ساتھ اس کے ٹکٹ کے پیچھے بھیجے اسے دے دوں گا اور غلامانے ایک مایوسی پڑی ہوئی مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگیں: ”اور تیرے تو فتنے کے ہیں بولی۔“

کے ساتھ ترگودھا پہنچ گئی۔ فلورادافنی اس کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ اس نے سلوٹ کی پوری داستان سن کر کہ اس نے فلوراد کو یہ بتایا تھا کہ دراصل دزانی اس کے پیچھے چلا ہوا ہے اور جو شی انقام مید اس کی جان لینا چاہتا ہے جن لوگوں کے یہاں جا کر وہ اس سے چھپی تھی۔ انہوں نے اس سے ساز باز کر کے اس کا ہاتھ دما تھا۔ اس لیے اسے وہاں سے

مرگ و دھماکے کے بعد اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بالخصوص اپنی خوبصورتی کی وجہ سے۔ یوں بھی وہ ایک معمولی سی زس تھی۔ اور آج کے حرص و ہوس کے زمانے میں کسی بے حیثیت اور بے زر کی کوئی قدر و منزلت ہی کہاں ہوتی ہے۔ اور ایسے انسان کو خود اہم و حفاظت کے سلسلے بہت دیر اور سخت گزارنا پڑتا ہے۔ اب اس کا کہنا تو مستحسن ہے کہ وہ

وہ تو اس دن کو کوئی بھی جرم رواں نہ سمجھ رہی تھی۔ اگر اسفند کو خون دیا تھا، اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اسفند اپنے والدین کی اکلوتی تریزہ اولاد ہے۔ اوصف سبب منصور اور سہیل منصور کے یہاں بھی حرف بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بھی وہ مانتے بہت تیار نہیں ہوا تھا اور تو میر کیا تھا کہ وہ فی کے پاس ہو سکتا تھا اور وہ فی کو معلوم ہو جانا گا یا غضب ہو گیا تھا۔ وہ تو بال کی کھال کھینچنے کی عادی تھی اور انسان کو گھر سے جا کر ہی اس کا یہیچھا جھوڑی تھی جبکہ وہ اپنے ہوٹل کی رومٹن خراب ہونے سے بھی ادگری تھی۔ کہ اس طرح اس کی بدنامی ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اب آسانی سے

ہی گیت پر ادھر ادھر کی باتیں غلط آتے تھے۔ اور بائبل کے عقوبت کا چھوٹا سا دروازہ دروازہ پر اترتا تھا۔ بلکہ

گوئیابی موقع تھا یا ہر نکل جانے کا۔
گملاں روز جاتے، یہ اسے کچھ ایسے کام سوچنے لگے تھے کہ تمام وقت نرہوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ بھر کہیں نفی نام

”دو تین گھنٹے کیوں بھو بھو جانا کیا آپ کا آج ہی واپسی کا ارادہ ہے؟“ اسفند نے ان کی بات پر تعجب سا ہو کر پوچھا۔
 ”نہیں۔ ارادہ تو نہیں ہے لیکن ہم زبردستی کہاں بننے کے قائل نہیں۔ یہاں کے کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔“ ثاقب بن

بولے۔
 ”واہ یہ تو سراسر عزیمت ہوئی بھو بھو جانا کہ ہمارا گھر موجود ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں قیام کریں۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ
 خود آپ کو یہاں رہنا پسند نہ ہو۔“ اکرام بڑی اچانکیت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔
 ”اچھا جیسے۔ اب آپ اپنا تئیت کو بیچ میں نے آئے ہیں تو پھر ہم سب جیسے گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ثاقب حسن نے اس
 کی اپنا تئیت سے متاثر ہو کر شکستہ لہجے میں کہا۔ اسفند کا دل چاہا کہ یہ لکھنوی تکلف آپ ان لوگوں سے کہاں بستے بیٹھ گئے
 یونگ بہت سادہ لوح اور مخلص ہیں۔ مگر اس نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔
 ”اچھا آئے۔ آپ اندر تو چلے بھو بھو جانا۔ آپ کے قیام کا مسئلہ بعد میں حل ہو جائے گا۔“ ثاقب حسن شاید خود بھی یہی
 چاہ رہے تھے۔ چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے۔
 ”آپ نے یہاں بیچنے میں بڑی دیر لگا دی۔ بھو بھو جانا اور ادھر میں آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔“ اسفند نے کمرے
 میں آکر انہیں بٹھاتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے ہر نے تو بالکل دیر نہیں لگا لی کہ شیش تھما رنڈ ملا اور آج ہم آگئے۔“ ثاقب حسن بولے۔
 ”لیکن میں نے تو آپ کو بدھ کی رات ہی وہ خطرہ زنا کروا تھا جو میرے انداز سے کچھ ملتا تھا۔“ ثاقب حسن نے اس کی بات کو
 جاننا چاہیے تھا۔ اور آپ کہہ رہے ہیں وہ کل جمعہ کی رات کو آپ کو ملا تھا؟“ اسفند دنوں اور گھنٹوں کا حساب لگاتا ہوا بولا۔
 ”ارے جیسے تم نے خط ہی بھیجا تھا کوئی ٹیلیگرام تو نہیں۔ اور شہر محمد کہہ رہا تھا کہ اسے کل جمعہ کی صبح کو تھما رنڈ ملا تھا مگر یہاں
 محمد کو تو عام تعطیل ہوتی ہے۔ پھر اسے جہاز کو ہی ملا ہوگا اور اسے ہم تک پہنچانے کی فرصت سے جمعہ کو ہی ملے۔“ ثاقب حسن نے خود
 ہی حساب لگاتے ہوئے اپنی غلطی کی تصحیح کی پھر بولے۔

”خیر جیلو۔ اب تو ہم آج آ گئے۔ مگر جس کارن آئے اس کا تو تم نے اب تک کوئی ذکر ہی نہیں کیا جب کہ ہم تو میٹین سے پہلے
 کر چلے تھے کہ جس ٹیکسی میں جا رہے ہیں اسی میں تمہیں بٹھا کر سیدھے بٹیا کے پاس پہنچیں گے اور پھر اسی ٹیکسی میں بٹیا کو ملے
 اسٹیشن کا رخ کریں گے۔ اسی لیے تو ہم نے تمہارے میزبان سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا بہت مختصر قیام ہوگا۔“ اور بھو بھو جانا اس
 مادگی پر دل ہی دل میں وہ خوب ہنسنا۔

”لیکن بھو بھو جانا۔ آپ نے حالات کا ہمارا بدلے بغیر پہلے سے ہی یہ پروگرام کیسے مرتب کر لیا۔ میرا مطلب ہے پہلے
 چل کر یہ تو معلوم کریں کہ آیا آپ کی بٹیا آپ کو پہنچاتی ہی ہیں۔ انہیں ساتھ لے جانے کا سوال تو بعد میں ہی آتا ہے۔“ اسفند نے کہا۔
 ”ہائیں کیا مطلب۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ وہ زس سلوط ہی ہے۔ پھر تو تم نے خواہ مخواہ ہی ہمارا وقت کھوٹا لیا۔ اور پھر
 وہ تمہاری بھو بھو جیم۔“ ثاقب حسن بہت جگہ کہہ رہے تھے تو اس نے ان کی بات قطع کر کے کہا۔

”نہیں بھو بھو جانا۔ میرا مطلب ہرگز نہیں۔“ یہ ایسا احمق یا عقل سے پیدل ہوں کہ سلوط کے بارے میں پوری معلومات
 حاصل کیے بغیر صرف دھوکے اور شے کی بنا پر کسی دوسری زندگی پر سلوط کا گمان کرتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ اس قدر بظن
 اور نظر آتی ہیں کہ کہیں میری طرح آپ کو بھی پہچاننے سے انکار نہ کریں۔“ اسفند نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”خیر خیر اب تو ہم آج آ گئے ہیں۔ اور صورت حال خواہ کسی ہی کیوں نہ ہو ہم ان سے ملے بغیر جائیں گے ہی نہیں۔ لہذا اب
 اب تم وقت ضائع کرنے کے بجائے ابھی اور اسی وقت ہمیں ان کے پاس لے جیلو۔“ ثاقب حسن اپنی جیتا بی دکھانے کو پہلے
 ”جی۔ جی ہاں ضرور میں خود بھی ایک لمبے صانع نہیں کرنا چاہتا۔ بس ابھی لازم ہے ٹیکسی منگواتا ہوں۔“ اسفند اٹھنا
 ہوا بولا اور پھر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد واپس آیا تو ثاقب حسن سے بولا۔

”جیلو بھو بھو جانا۔“
 ”ہائیں۔ کیا یہاں گھر سے ہی آواز دینے پر ٹیکسی آجاتی ہے؟“ ثاقب حسن نے اٹھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔
 ”نہیں۔ وہ اصل میں میں نے لازم کو ٹیکسی منگوانے کے لیے بلوایا تو اکرام نے کہا کہ آپ میری کار لے جائیں۔“

بھو بھو جانا کو خط بھیجے دو روز ہو گئے تھے۔ اور تیسرے روز بھی ان کے آنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے
 ادھر جو تک بھو بھو جانا کے کمر کا پتا معلوم نہیں تھا اس لیے اسفند نے اجمال کے ملازم شہر محمد عرف شیرا کی معرفت انہیں وہ خط
 بھیجا تھا۔ وہ بھی اجمال کے پتے پر۔ اول تو اسے یہ یقین نہ تھا کہ اس کا خط وقت پر پہنچ ہی گیا ہوگا۔ کیونکہ محلہ ڈاک کی
 ناقص کارکردگی سے وہ بخوبی واقف تھا کہ بعض خطوط دوسرے روز ہی پہنچ جاتے ہیں اور بعض محکمہ ڈاک کے بھی کھاتے
 میں دنوں پرستے رہتے ہیں اور مینے عشرے سے بھی زیادہ مدت میں پہنچتے ہیں۔ دوسرے بالخصوص اگر وقت سے پہنچ بھی گیا
 ہوگا تو شیرا نے اپنے تمام کام نمٹانے کے بعد شام کو ہی وہ خط بھو بھو جانا کے پہنچایا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے روز پہنچا یا ہو۔
 یا پھر شیرا کو وہ خط سب سے ملا ہی نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تو سارا کام ہی چوڑے ہو کر رہ جائے گا۔ یہی سب سوچ کر اس نے شیرا کو
 کوٹھن کرنے کی ٹھانی تھی کہ اسے اجمال کا ذون بر معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اجمال یا تو کہیں باہر گیا ہوگا یا پھر گھر ہی میں
 ہوگا تو سو رہا ہوگا۔ کیونکہ وہ دن کے بارہ بجے آگئے کا عادی تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور شام کے بھائی اکرام کے ساتھ اس کی کار میں ٹیلی فون آفس جا رہا تھا کہ تبھی بھو بھو
 جانا کی ٹیکسی گیٹ کے آگے آکر رکی تو وہ کار سے اتر کر اس کی طرف بٹھا۔ اسی اشار میں ثاقب حسن بھی ٹیکسی سے اتر چکے تھے۔ اس
 نے انہیں سلام کر کے جیسے ہی دس روپے کا نوٹ نکال کر ٹیکسی والے کو پکڑا یا اور بھو بھو جانا کو لے کر اندر آ گیا۔ اکرام بھی کار سے
 اتر کر باہر گھبرا ہوا گیا تھا۔ اس نے اس کے پاس آتے ہی بھو بھو جانا اس سے تعارف کرایا اور پھر معذرتی لہجے میں بولا۔
 ”مانڈے کرنا یا۔ جن کی خاطر فون کرنے جا رہا تھا وہ خود ہی آ پہنچے ہیں۔“

”ارے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بھلا مانڈے کرنے کی اس میں کیا بات ہے۔ بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گھر میں
 ایک مہمان کا اور اضافہ ہو گیا۔“ اکرام نہایت خوشدلی سے بولا۔

”ارے نہیں صاحبزادے۔ ہم مہمان کی حیثیت سے آپ کو رحمت دینے یہاں نہیں آئے بلکہ ہمارا یہاں قیام بہت
 مختصر ہوگا۔ شاید دو تین گھنٹے۔“ ثاقب حسن نے مسکرا کر کہا۔

اسفند نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ کم از کم پرائیویٹ سواری میں یہ تو آسانی رہتی ہے کہ انسان اسے اپنی مرضی سے جہاں اور جتنی دیر چاہے لے جاسکتا ہے۔ ثاقب حسن نے اس کے ساتھ کار کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ اس نئے بیڑے کے خیال سے ان کا دل بھی کھلا جا رہا تھا۔

بلکہ وہ جو اتنی زیادہ باتیں کر رہے تھے اور اس قدر شگفتہ مود میں نظر آ رہے تھے تو بیڑی سے ملنے کی خوشی میں ہی غافل آ رہے تھے۔

پھر دونوں کار میں بیٹھ کر ہوشل روانہ ہوئے۔ تب بھی ہوشل پہنچنے تک ثاقب حسن مسلسل بولتے ہی رہے جب کہ فطرتاً کم گو اور روکھے چہرے سے انسان تصور کیے جاتے تھے۔ اسفند بھی ان کے اس وقت کے جذبات کو سمجھ رہا تھا اس لیے اسے ان کے اتنے زیادہ چپکے تعجب نہیں ہوا۔

پھر کوئی آدھ گھنٹے کا فاصلہ طے کر کے اسفند نے ہوشل سے کیٹ کے قریب ہی کار روکی اور اسے لاک کر کے گیٹ میں داخل ہونے لگا تو وہاں موجود دربان نے اس کا راستہ روکا کیوں کہ ہوشل میں ہر کس و ناس کے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دو روز قبل بھی جب اسفند ہوشل آیا تھا تو کوئی دو سو دربان موجود تھا جس نے بہت رد و قدح کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دی تھی۔ اور اس روز بھی اسفند کو کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ہر حال اس نے یہ کہا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ہوشل کی انچارج سسٹیم سے ملے گا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جب سے اپنا کارڈ بھی اسے نکال کر دکھا یا جب کہ وہ ان پڑھ ہی تھا تب کہیں جا کر دربان نے ان دونوں کو اندر جانے کی اجازت دی۔

وہ بچھو چکا کے ساتھ سیدھا سسٹر پیرا کے آفس میں پہنچا۔ سسٹر پیرا کی آفس ٹیبل کے گرد اس سے دو اشخاص بیٹھے تھے جن سے وہ باتیں کر رہی تھی۔ اسے آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو بات ہی کرنا بھول گئی اور اندر ہی اندر ایک پھر بری سی بھی آئی۔ کیونکہ وہ اسفند کے آنے کی نوعیت سے واقف تھی۔ مگر کتنی ہی مضمحل و قوت ارادی کی مالک اور بڑی دیباغہ قسم کی عورت۔ اس نے دوسرے بولنے خود پر قابو پایا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئی۔ اسفند سیدھا اس کی طرف ہی بڑھتا چلا آیا۔

”گڈ مرننگ مسز پیرا“ اسفند نے متبسم سے انداز میں کہا۔

”گڈ مرننگ سر“ پیرا نے باتیں کرتے کرتے چونک کر یوں اس کے سلام کا جواب دیا جیسے وہ اس کے آفس میں آجائے سے لاعلم ہو پھر اس انداز میں اس کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہی ہو اب آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ اسفند بھی اس کی ہی چند راہٹ کو سمجھ گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

”میرے خیال میں اپنا تعارف پیش کرنے کی مجھے ضرورت تو نہیں کیونکہ تین روز قبل بھی میں کیپٹن آفتاب کے ساتھ یہاں آچکا ہوں“

”جی ہاں، مجھے ابھی طرح یاد ہے“ پیرا نے نرمٹھے پن سے کہا۔

”پھر تو آپ کو میرے یہاں آنے کی غرض وغایت کا بھی اچھی طرح علم ہوگا“ اسفند نے جتنا کہنے کے سے انداز میں بدلتا مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔ بخوبی۔ وہ قدرے رعوت سے بولی۔

”تو پھر آپ سے التماس ہے کہ آپ اسفند نے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا تو پھر اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”لیکن سراسر معاملے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ اچھا ایک منٹ“ اتنا کہہ کر گویا اس نے ایک منٹ کی مہلت مانگی۔ اور پھر ان دونوں آدمیوں سے جو ابھی تک میز کے گرد ہی بیٹھے تھے منہ طلب ہو کر کہا۔

”اچھا۔ آپ ایسا کریں کہ کل آفس آؤر میں کسی وقت میرے پاس آجائیں۔ اس وقت تو میں بہت بڑی ہوں۔ پہل میں وہ بظاہر جتنی نرمٹھا سی نظر آ رہی تھی اندر ہی اندر اتنی ہی خوف زدہ تھی۔ اس کی بہت نہیں پڑی تھی اسفند کو بتانے کی کہ سلوٹ ہوشل چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ بلکہ ایسا سخت اور دکھا چھپکا رویہ اختیار کر کے وہ چارہ دہی بھی کسی طرح اسفند کو مرے ٹال دے۔ اور یہ ایک منٹ کی مہلت اس نے صرف ان دونوں آدمیوں کو مہلتانے کی غرض سے نہیں مانگی تھی بلکہ اصل

حقیقت سے روگردانی کرنے کی غرض سے بھی مانگی تھی۔ مگر یہ ایک منٹ کا وقفہ بھی اسفند کو بہت شاق گزارا تھا۔ ان دنوں وہیں کے جاتے ہی وہ تودری چڑھا کر بولا۔

”میں آپ سے کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے نہیں آیا۔ بلکہ مس شان سے ملنے آیا ہوں۔ براہ کرم آپ انہیں یہاں بلاویں“ اور اس کی اس بات پر پیرا انہیں جھانکتی ہوئی بولی۔

”لیکن سر وہ تو اس وقت ہوشل میں موجود نہیں ہے بلکہ“

”دیکھیں زیادہ اسماٹ بننے کی کوشش نہ کریں مسز پیرا۔ مجھے ابھی طرح معلوم ہے کہ وہ شام کو ڈیوٹی پر جاتی ہیں اور دن کے وقت ہوشل میں ہی ہوتی ہیں“ اسفند اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولا۔

”لیکن ڈیوٹی پر پہنچ ہی ہوئی رہتی ہیں سر۔ آج کل تو اس کی ڈیوٹی دن ہی کو ملتی ہے لیکن اگر یہ بھی گنتی تو“

”افوہ۔ میں یہ گنتی اور نہ گنتی کچھ نہیں جانتا میں تو مس شان سے ملنے آیا ہوں۔ اور یہ ان کے والد ہیں۔ اب آپ سیدھی طرح انہیں بلو دیجیے۔ اس کے حلیے میں گرنے پر اسفند کو حق ہی تکاناؤ گیا۔ اس نے بڑے سخت اور کثرت لہجے میں کہا۔

اور اس کے منہ سے والد کا لفظ سن کر پیرا کی مٹی ہی گم ہو گئی۔ وہ ایک دم ہی نرم پڑ کر بولی۔

”پلیز سر۔ آپ پہلے پوری بات تو سن لیں“

”سنائیے، کیا سنا نا چاہتی ہیں آپ؟ ثاقب حسن نے پہلی بار لب کشائی کی۔ مگر پیرا اسفند کی کوٹھا طب کر کے بولی۔

”مس شان تو آپ کے آنے کے دوسرے روز ہی یہ ہوشل چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جہاں تک مجھے یقین ہے آپ کی

دعوت ہے ہی“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ میڈم۔ کیا ہم آپ کو بہت ہی بے وقوف نظر آ رہے ہیں لیجیے بھلا یہ یا شوشہ چھوڑا آپ نے“ ثاقب حسن بگڑ کر بولے۔

”نہیں۔ شوشہ نہیں ہے سر۔ بلکہ حقیقت ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ یہاں ہوشل میں بلکہ ہسپتال میں کسی سے بھی پوچھ کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں“ پیرا ثاقب حسن کے گڑے ہوئے تئور دیکھ کر ہی طرح کھڑکی گئی۔

”خیر آپ کے اس مفروضے پر ہوشل اور ہوشل کے لوگ تو ایسا نا لا سکتے ہیں لیکن میں آپ کی بات کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں ہوں“ اسفند بھی بڑے گڑے تئور سے بولا اور پھر ثاقب حسن سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔

”یہ کارستانی ان خصوص کی ہی ہے۔ اصل میں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں سلوٹ کو واپس لے جانے کی غرض سے ضرور آؤں گا اور اسی لیے اس روز انہوں نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا آپ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی غرض سے آئے ہیں۔ تو میں اسی وقت کہنا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ میں نے ان کو بڑی فحشی سے تاکید کر دی تھی کہ میرے آنے کی غرض وغایت کو راز ہی میں رکھیں۔ لیکن انہوں نے نہ معلوم کس رنگ اور معنوں میں سلوٹ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا، ورنہ بھلا یوں بھی کوئی چپکے سے ہوشل چھوڑ کر جاسکتا ہے“

”ارے میاں ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ سلوٹ خود اپنی مرضی سے ہوشل چھوڑ کر گئی ہے یا انہوں نے اسے کہیں بچھا دیا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا ہے چنانچہ اب اس معاملے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کیجئے بغیر کوئی کام ہی نہیں بنے گا۔ یوں بھی تین روز ہو گئے ہیں اس کی گمشدگی کو۔ ہمیں اب یہاں وقت براہ کرنے کے بجائے فوری طور پر پولیس اسٹیشن چلنا چاہیے“ ثاقب حسن نے دھمکی نہیں دی تھی بلکہ وہ تھا نے جانے کے لیے بہت سنجیدہ تھے۔ یوں بھی میٹھی کے اچانک مل کر گھو جاتے پر ان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔

”جی ہاں۔ علیٰ ہذا التماس ہو چکا جان۔ وقت کھوٹا مارنے سے فائدہ۔ ہم اس علاقے کے پولیس اسٹیشن ہی چلتے ہیں“

اسفند کو بھی اس مسئلے کو حل کرنے کی یہی ترکیب نظر آئی۔

”چلو“ ثاقب حسن نے کہا۔ دونوں جانے لگے تو مسز پیرا نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے ملتی لہجے میں انہیں بلکا را

”ستینے پلیز میری صرف ایک بات اور سن لیجیے“ اسفند نے تو اس کی بات سن لی ان سنی کر دی لیکن ثاقب حسن نے

ہلٹ کر دیکھا۔

”اچھا سنا ئے مزید کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟ ان کی بات پر پیرا نے جھجک کر میز کی دراز سے ایک چھوٹی سی جگہ

”خیر خیر۔ وہ تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب آپ بتادیں، ثاقب حسن نے انتہا کو پہنچے ہوئے تجسّس کے سبب اس کی بات کاٹ کر کہا۔“

”اصل میں اسے میری ایک بہت ہی پرانی دوست جو کبھی میری کو لیگ بھی رہ چکی تھی کراچی سے اپنے ساتھ یہاں لائی تھی اور اپنی بجائی کی حیثیت سے اس نے مونا کا گھر سے تعارف کرایا تھا۔ اور اس کے بارے میں جو اسٹوری سنائی تھی وہ کچھ یوں تھی کہ مونا کا سوتیلہ باپ اس کی شادی ایک عیاش اور رئیس بندھے سے کر رہا تھا جس کے ہوتا تو بی بی مونا کی عمر کے تھے مونا کی ماں سے یہ سب کو ادا نہ ہوا تو اس نے چپکے سے مونا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ مگر غزال کے پاس رہنے میں مونا کو خطرہ لاحق تھا اس لیے وہ اسے مگر وہاں لے آئی تھی تاکہ میری نگہانی میں ہو سکی کہ اور ساتھ ساتھ سروس بھی کرتی رہے۔ جس بی بی تھی اس کی اسٹوری“

”وہ تو خیر حالات کے تحت بنائی پڑی ہوئی مگر وہ آپ کی دوست آخر رہی کہاں ہیں؟“ اسفند نے قدر سے بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کراچی میں ہی عرصے سے اس نے سکونت اختیار کر رکھی ہے، پریرا نے بتایا۔“

”تو کچھ ان کا اتنا پتا بھی تو ہو گا کہ آپ کے پاس؟“ ثاقب حسن نے پوچھا۔

”جی، کچھ کا ایڈریس تو مجھے معلوم نہیں البتہ جس کلینک میں وہ کام کرتی ہے اس کا مفروضہ معلوم ہے بلکہ فون نمبر بھی“

”پھر تو نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لائے جلدی سے کلینک کا ایڈریس پھر فون نمبر عنایت کر دیجیے،“ ثاقب حسن نے تباہی سے بولے

تولڈر نے دروازہ کھول کر اپنا پرس نکالا اور پھر پرس کھول کر ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور فلورڈا کے کلینک کا پتا بعد فون نمبر۔ ٹیبل ڈائری کا صفحہ بھاڑ کر اس پر درج کیا اور ثاقب حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”اس کے ساتھ آئی وٹن سے لڈلک۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ مونا فلورڈا کے پاس ہی گئی ہوگی“

”فلورڈا۔ کیا آپ کی دوست کا نام فلورڈا ہے؟“ اسفند نے متعجبے انداز میں پوچھا۔

”جی ہاں۔ اور وہ اسی کلینک میں ٹیوائف لگی ہوئی ہے مگر بہت ہی ٹنگ خاتون ہے، سب سے پہلے وقت نمازی اور پھر ہنگام اور اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہے۔“ پریرا نے متمم سے انداز میں فلورڈا کے بارے میں تفصیل بتائی۔ دونوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ واپسی میں ثاقب حسن چپ چپ سے غور کر رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی طرح انہیں بھی سلوٹ کی طرف سے یقین نہیں ہے کہ وہ کراچی میں انہیں مل جائے گی اور وہ جو بہت گہری اور مضبوط طبیعت رکھتے ہیں آج کی ناکامی پر رندہ سے کتنے ٹوٹ پھوٹ رہے ہوں گے۔ ان کا دھیان پلٹنے کی غرض سے اسفند نے گفتگو کی ابتداء کی۔

”میرے خیال میں تو میں آج ہی کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ کیوں پھوٹا جان“

”ہاں بالکل، ہم خود بھی وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہیں،“ ثاقب حسن نے جواباً کہا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ثاقب حسن نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”کیا یہ نام تھا ہوٹل کی انچارج کا اس کے؟“

”سمسٹر پیرا“ اسفند نے ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے نام بتایا۔

”ہاں سمسٹر پیرا کے بیان کے مطابق تو اب تک سلوٹ کراچی پہنچ گئی ہوگی، کیونکہ ڈین سے سفر کیا ہوگا اس نے“

”کراچی تو وہ پرسوں شام کو پہنچ گئی ہوں گی پھر بھاجان۔ کیونکہ انہوں نے بدھ کو ہوٹل چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے سیدھا شیش کارڈ ہی کیا ہوگا کہ یہاں تو ان کا کوئی اور واقف بھی نہیں ہے۔ لیکن بشرطیکہ وہ کراچی ہی گئی ہوں“ اسفند نے اپنے دلی کی بات کو فطرت میں ڈھالا۔

”لیکن بقول تمہارے اس کا یہاں نہیں تو کہیں بھی کوئی واقف کار نہیں ہے۔ ورنہ وہ اُدھر کا رخ ہی کیوں کرتی۔ اب خدا جانے کن حالات میں فلورڈا سے عمرانی ہو۔ خیر میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ اس معاملے میں کوئی اور رملک لینا گوارا نہیں کر سکتی۔“ ثاقب حسن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ورنہ انہیں ڈھونڈنے میں بڑی مشکلات درپیش آجائیں گی۔“ اسفند ایک گہرا مائس سے کر بولا۔

”کتاب نکالی اور پھر اس پر ہاتھ رکھ کر کھڑے کھڑے ہی بولی۔“

”دیکھیں اگر آپ مسلمان ہیں تو میرا بھی جو دین و ایمان ہے اور میں اس مقدس بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ مونا اپنے بڑے پر صرف اپنا رینڈیشن لیٹر ہی چھوڑ کر گئی ہے ورنہ میں نے اسے کہیں جھپا یا ہے۔ نہ چھپنے کی تعلیق کی ہے اور نہ مجھے معلوم ہے کہ وہ یہاں سے کب گئی اور کہاں گئی ہے۔“ پریرا نے صرف حلف ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس کی آواز میں بھی صداقت اور کچھ ایسی بے بسی سی جھلک رہی تھی جیسے ایک سچی بات کو چھوڑنا ثابت کر دینے پر سچے انسان پر طاری ہوتی ہے۔ دونوں کو پریرا کی باتوں پر یقین کر لینا ہی پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اسفند نے اس کی میز کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے یہیں آپ کی باتوں کا یقین آگیا، لیکن اس کے باوجود بھی میں آپ کو موہ و الزام ظہر اؤں گا کیونکہ اگر آپ میرے آنے کی غرض و غایت سے انہیں آگاہ نہ کرتیں تو مایوس کن صورت حال کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے زس شان کی گمشدگی کی ذمہ دار آپ ہیں صرف آپ“

”اوہ۔ نو۔“ دیکھیں آپ مجھے الزام نہیں دیں۔ بلکہ اس میں میرا کوئی قصور ہی نہیں“

پریرا نے اسفند سے کہہ کر پھر ثاقب حسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں آپ ہی انصاف سے کام لے کر سوچیں بزرگوار کہ میں اس ہوٹل کی انچارج ہوں۔ یہ آپ کے صحیح صاحب ایک روز اچانک ہی میرے پاس ایک ایسی اسٹوری لے کر آئے جسے سن کر میں بڑے غصے میں پڑ گئی، کیونکہ مونا کے متعلق جو کچھ مجھے بتایا گیا تھا وہ کچھ اور ہی تھا اور پھر۔ ایک تو میرے ہوٹل کے اصول اور قوانین بہت سخت ہیں دوسرے میں یہاں کی انچارج تھی اور یہ میری ذمہ داری بنتی تھی کہ میں مونا سے اصل حقیقت کے بارے میں استفسار کروں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ آج کل کے زمانے کی رفتار دیکھتے ہوئے مجھے ڈاکٹر صاحب کی باتوں کا یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں میں ان کو کچھ صاحب کی باتوں کی مونا سے تصدیق کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی“

”وہ تو ٹھیک ہے میڈم۔ لیکن مجھے اس بات پر غجب ہے کہ جب آپ کے ہوٹل کے قوانین اتنے ہی سخت ہیں تو آپ کی ناز و علم میں لائے بغیر ہمارا مطلب ہے آپ کی اجازت کے بغیر کسی لڑکی کا ہوٹل سے نکل جانا کیا معنی رکھتا ہے؟“ ثاقب حسن بولے۔

”اے۔ اے۔ پھر میں پھوٹا ہوا ہوں۔ یہ قوانین اور اصول سب دکھاوے اور پٹی کی باتیں ہیں ورنہ ایسے ادارے محض پسہ کمانے کی غرض سے خوگر کی بھرتی بھرتے کے عادی ہوتے ہیں۔ لوگ جن بھرتے ہیں اسی طرح نکل جاتے ہیں،“ اسفند جلدیے کئے سے انداز میں بولا۔

”مگر یہ تو ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو شیا تو تلاش کرنے کا ہے۔ ان کی نشاندہی کرنے کا ہے۔ کہ وقت میری تیزی سے بیتتا جا رہا ہے۔ اگر مزید دیر ہوگی تو پھر تو ہم ہمیشہ کے لیے ان سے محروم ہو جائیں گے۔“ پھر ثاقب حسن نے بڑے جذباتی سے انداز میں ہلکی ہلکی سی رقت کے ساتھ کہے۔ اور شاید انہی جملوں سے متاثر ہو کر اسفند کو مونا کچھ خیال آیا۔

”دوویسے باقی داوسے سمسٹر پیرا۔ زس شان جس طرح چپکے سے یہاں سے گئی ہیں ظاہر ہے بلا آپ کی اجازت اور لاعلمی میں تو یہاں نہیں آئی ہوں گی۔“ میرا مطلب ہے کوئی تو ان کو یہاں لایا ہوگا یا پھر وہ خود ہی آئی ہوں گی“

”او۔ ایس۔ ایس۔ ناؤ یو ہو میوک ٹوڈا ہوانٹ۔ ہم سے غلطی ہوئی ورنہ میں یہ سوال بہت پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا، ثاقب حسن خوش ہو کر بولے۔

”او۔ ایس۔ ایس۔ میرا بھی یہی اوپینین (خیال) ہے۔“ پریرا جو اسفند کے جلدیے کئے سے انداز میں سوال کرنے پر کسی سوچ میں پڑ گئی تھی اتنی دیر میں پہلی بار حقوڑا سا مسکرا کر بولی۔

”یعنی یہ کہ آپ کو بہت پہلے بتا دینا چاہیے تھا،“ اسفند اس پر مسلسل طنز کر رہا تھا۔

”جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوال سے قدرے مختلف۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجھ سے آتے ہی یہ بات پوچھ لیتے تو بات اتنی زبردستی نہ پیرا رہتی۔“

”لیکن یہ فرض تو آپ کا تھا کہ آپ خود ہی میں بتا دیتیں،“ اسفند پھر بھی اس پر طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

”دیکھیں میں بھی آپ کی طرح انسان ہی ہوں۔ اور مونا کے معاملے میں میں آپ سے زیادہ پریشان بھی کیونکہ اس سے ایک دم غائب ہو جانے کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہی آئی تھی۔ اور پھر آپ نے اتنے ہی مجھ سے کراس ایڈمان کرنا شروع کیا تو میں بالکل ہی بولکھا گئی۔ ورنہ۔“

”خیر، ہر اجنبی طرف سے تو بڑی امیدیں لے کر جا رہے ہیں باقی معاملہ خدا کو سونپنا وہی ہماری مدد کرے گا۔“
 ”جی ہاں امید پر ہی دنیا قائم ہے لیکن پھر بھیا جان اگر آپ یہاں سے براہ راست کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر کیا پھینچو بیگم عرصے تک لاہور میں تنہا نہیں رہ سکیں گی کہ کوئی ان کے ساتھ نہ آئے۔“ اسفند نے ایک بہت ہی اہم بات کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ تو انہوں نے ہنس کر کہا۔
 ”تاؤ اور سنئے دماغ کی یہی خوبی ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی اور کام کی باتیں سوچتا ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ذہانت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کبھری ہے۔ اس پر تم بہت حساس بھی ہو تمہارے معیار کی تسلی پر سو فیصد پورے اترتے ہو۔“

”لیکن بات پھینچو بیگم کی جو وہی میری ذہانت کی نہیں، ان کی بات میں جو معنویت تھی۔ اُسے سمجھتے ہوئے اسفند نے بھی ہنس کر کہا۔
 ”ویسے تم نے ایک اہم بات کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ تمہارا شکریہ لیکن ہم بھی اپنی شریک حیات کی طرف سے اتنے لا پرواہ نہیں نہاں سے براہ راست کراچی جانے کا ارادہ ہی رکھتے ہیں۔ بلکہ ابھی وہہر کی فلائیٹ سے سیدھے لاہور جا رہے گے۔ اور پھر شام کی فلائیٹ سے آپ کی پھینچو بیگم کے ہمراہ کراچی۔“ شاقب حسن نے اپنا پروگرام بتایا۔
 ”اچھا تو کیا آپ اپنے گھر کو متقل کر کے جائیں گے پھر پھانسان۔“ میرا مطلب ہے کہ آپ کے جانے کے بعد وہ محفوظ بھی رہ سکے گا۔“ اسفند نے پوچھا۔

”جہاں تک محفوظ رہنے کا سوال ہے تو اس میں چند معمولی برتنوں، منگوں اور چارپائیوں کے کچھ ہوگا ہی نہیں۔ اور متقل اس لیے کر کے جائیں گے کہ وہاں ذاتی گھر ہے۔ اگر کبھی کوئی اچھا کاکب مل گیا تو اسے فروخت بھی کر دیں گے کیونکہ اب ہم لاہور کی رہائش ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ اور کراچی میں ہی سکونت اختیار کریں گے۔“
 ”اوہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے پھر بھیا جان۔ پھینچو بیگم ایک عرصے سے ہم سب سے دور ہی ہیں۔ اس طرح کم از کم سب اپوں سے قریب تو ہو جائیں گی۔“ اسفند نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
 ”اجی ہمان کی شہر پر بھی مگر کے تاج ہیں وہ ہم سے ہی قریب نہیں ہوئیں تو آپ سب سے کیا ہوں گی۔“ شاقب نے ہلکا سا تہنید لگا کر کہا تو اسفند بھی ہنسنے لگا۔ یہی باتیں کرتے ہوئے وہ احتشام کے بیچے پر بیٹھ گئے۔
 ”اب تم سب سے ہلکا کام یہ کرو کہ جہاڑی سٹیس کا انتظام کرو۔“ شاقب حسن نے کارے اترتے ہوئے کہا۔
 ”وہ کوئی مسئلہ نہیں پھر بھیا جان۔ لیکن پہلے طعام بعدہ الکلام۔“ بات کے اختتام پر اسفند ہنسنے لگا۔
 ”یعنی ہاتھ منہ کی لڑائی۔ چلو خیر اس کی اجازت ہے۔“ شاقب حسن نے بھی ہنسنے لگے۔ میں جواب دیا۔ پھر اسفند انہیں اپنے رہائشی گھر میں لے آیا۔

”دھب دھب دھب۔“ رات کے منٹے کو چھری۔ دستک کی آواز آئی تو پلنگ پر لیٹی کسی رسالے کا مطالعہ کرتی۔
 سلوٹ ہڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے پہلے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر جاننا پر غشا کی نماز ادا کرتی فلورا کی طرف۔
 اس وقت بھلا کون یہاں آسکتا ہے؟
 ممکن ہے کوئی پڑوسی یا محلے والا ہو۔

یا پھر کسی کیس کے سلسلے میں کوئی آیا ہو۔
 مگر نہیں۔ آج تک تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کوئی اتنے بے وقت اگر دروازہ کھٹکھٹائے۔ فلورا کو نماز میں مشغول دیکھ کر وہ سراسیمگی کے عالم میں سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔
 جو پہلے کی نسبت قدرے زور سے دئی گئی تھی۔
 گو کامیاد میں نہیں بلکہ واقعی کوئی ہے۔ مگر کون۔؟ اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا۔ اس اشار میں فلورا نے جلد جلد انتہات پر تھک کر سلام پیرا۔ اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کوئی دعا دم کی اور پھر ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے کے بعد۔
 جاننا جیتے ہوئے اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”کوئی دروازہ بج رہا ہے مگر اس وقت کون آسکتا ہے بھلا۔“ اور اس کی بات کا جواب سلوٹ نے دیا۔

”یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔ کہیں برابر والی کلثوم غار نہ ہوں۔“

”نہیں۔ کلثوم کے دروازہ کھٹکھٹانے کا انداز یہ نہیں ہوتا۔ وہ تو دروازے کو توڑ دینے کے سے انداز میں بجاتی ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ زور زور سے ہوتی بھی جاتی ہے۔“

”پھر کون ہو سکتا ہے آخر۔؟“ سلوٹ نے سہم سہم سے انداز میں کہا۔

”اب یہ تو پوچھنے پر ہی معلوم ہوگا۔“ فلورا بولی۔

”میرے خیال میں تو جواب ہی نہیں دیکھیے۔ معلوم کون ہو اور کس مقصد سے آیا ہو۔“ سلوٹ نے مشورہ دیا۔

”لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ میں سرے سے جواب ہی نہ دوں۔ تم اطمینان رکھو۔ میں بلا جانے پر مجھے ہرگز دروازہ

نہیں کھولوں گی۔ پہلے پوچھ لیتی ہوں کہ کون کیسے اس کے بعد ہی۔“ تبھی تیسری بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ بھی زور

زور سے۔ فلورا جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی اور پھر سے منہ لگا کر پوچھا۔

”کون صاحب میں بھئی۔“ اس کے لیے سے کھٹکھٹ صاف نمایاں تھی۔ جواب میں باہر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”میں فاخرہ ہوں سلوٹ کی بھائی سسٹر فلورا۔ آپ برائے میرا یہ دروازہ تو کھولیں۔“ فاخرہ کی آواز اتنی

صاف اور ادنیٰ تھی کہ اپنے ستر کے قریب کھڑی سلوٹ نے بھی سن لی تھی۔ فلورا نے مڑ کر سلوٹ کی طرف دیکھا اور اٹھکھکے

اشارے سے پوچھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا وہ دروازہ کھولے یا نہ والی کو باہر سے ہی واپس کر دے۔ مگر سلوٹ گم سم سم کھڑی

رہی۔

”سنیں سسٹر فلورا اگر سلوٹ یہاں موجود ہیں تو آپ اُن سے پوچھ لیں۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔“ اندر سے جواب

دیا کہ فاخرہ نے دروازے کو کھٹکھٹا کر پھر کہا۔ تو فلورا نے ”اچھا ٹھہریں“ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔

”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ فاخرہ نے باہر ہی کھڑے کھڑے پوچھا۔

”جی ہاں۔ بعد شرق۔“ فلورا نے بڑے تپاگ سے کہا۔ تو فاخرہ اندر آگئیں۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔

نظر میں مجھکائے اسی گم سم سم کیفیت میں۔

اس پر نظر پڑتے ہی دونوں ہاتھ بھیل کر فاخرہ اس کی طرف لپکیں۔

”ارے سلوٹ میری جی میری جان۔ تم نے تو ہمیں اپنی صورت کو ہی ترسا دیا۔“ فاخرہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے اپنے

سینے سے لگایا۔ لیکن وہ پونہی الٹی الٹی سی ہلا کوئی تاثر دے کھڑی رہی۔

”شکر خدا کا کہ تم لگئیں ورنہ تمہاری گشت گئی نے تو ہماری مینڈیں حرام کر دی تھیں تمہاری پریشانی میں تو ہماری بھوک و

پیاس تک منہ کر رہ گئی تھی۔“ بڑی جذباتی سی کیفیت میں یہ جملے کہتے کہتے فاخرہ کا گلہ زندہ کیا۔ تو سلوٹ متاثر نہ ہونے

کے بجائے اُن سے الگ ہو کر بڑی ناگوار سی بولی۔

”میری طرف سے تو شروع ہی سے آپ پریشانی اٹھاتی آرہی ہیں۔ اب میں آپ کی زندگی سے نکل آئی ہوں تو آپ نے

میری وجہ سے خود کو ہلکا کر دیں کیلئے۔“ اور اس جواب پر فاخرہ اپنا سامنے کر رہ گئیں۔ اور قدرے توقف کے بعد بڑی

بلے بلے سے بولیں۔

”اب میں تمہارے اس سوال کا کیا جواب دوں۔ جبکہ اتنا منہ میں نہیں رکھتی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ ہم جو کچھ کرنا چاہ

رہے تھے۔ تمہارے ساتھ کی گئی زیادتوں کے ازالے کے طور پر ہی کرنا چاہ رہے تھے۔ اور تم بھی اس بات سے لاعلم نہیں تھیں

اب یہ ہماری بدقسمتی کہ ہمیں اتنی دیر ہو گئی۔ اور اوجہ نہیں سارا جھگڑنا بھگتتا پڑا۔ اب میں یہاں کھڑے کھڑے اپنی ساری

مُرگشت تمہیں کیسے سناؤں۔ جب اطمینان سے بیٹھو گی تبھی سناؤں گی۔“ فاخرہ بولیں۔ وہ جو سیدھے منہ بات کرنے کی روداد

تھیں۔ اس وقت کس عاجزی سے بات کر رہی تھیں۔ اسے تعجب مزدور ہوا کہ وہ ان کی لاگ لپیٹ کی باتوں سے ذرا بھی

متاثر نہیں ہوتی بلکہ بہت ہی دشتی سے بولی۔

”لیکن مجھے کچھ سننے کا شوق ہے میں اس کی ضرورت ہی سمجھتی ہوں کہ کوئی میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ میں اس کا

کو کو دوش دیتی ہوں نہ ذمہ دار ٹھہراتی ہوں۔ بلکہ نوشہہ تقدیر سمجھ کر صبر کر لیا ہے میں نے۔“

”اب ہم اس قدر خفا ہو کہ بات تک سننے کی روداد نہیں تو میں موائے اس کے تم سے اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ کہ تم نہیں معاف کرو کہ خدا بھی اپنے بندوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو بھائی سے اس قدر مل جل کر گفتگو کر سلوط خط و حریت سے بے ہوش ہو جاتی۔ مگر اس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فخر کے منہ سے نکلی کوئی بھی بات اسے متاثر نہیں کر سکے گی۔“

”دیکھیں بھائی جان۔ آپ یہ گیسے پٹے عام سے مکالے نہ بولیں۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ جیسی بلند بالا سہمی کا اپنے مقام سے نیچے آن کر بات کرنا بھگتہ شرمندہ اور ذلیل کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ بلکہ یہاں سے علی جا میں۔ میں نے اپنی زندگی کا جو نیا راستہ چنا ہے۔ اس پر اطمینان سے مجھے چلنے دیں۔ میرا سکون اور آرام غارت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ ان کی باتوں سے متاثر ہونے کے بجائے الٹا ان پر برس ہی پڑی۔ غلو اور اتنی دیر سے تھوڑے فاصلے پر خاموش کھڑی اُن دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ سلوط کی باتوں پر اس نے اُسے ٹوکنے کے سے انداز میں کہا۔“

”باتیں باتیں مونا بھئی۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارے دل میں اپنے بڑوں کا ذرا سا بھی احترام نہیں۔“ اور پھر فخر سے بولی۔

”آپ تشریف تو رکھیں بیگم صاحبہ۔ جب سے آئی میں کھڑی ہی ہیں۔ اصل میں آپ مونا سے باتوں میں ایسی باتیں کہیں۔“

”مگر میں بھی آپ سے دعا سلام کر سکی نہ آپ سے تعارف ہی حاصل کر سکی۔ لیکن غائبانہ طور پر ضرور آپ کو جانتی ہوں۔“ فخر نے اس کا باقی ماندہ فقرہ یوں پورا کیا تو وہ ہنس کر بولی۔

”جی یہ میری غرض نصیبی ہی ہے کہ آپ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف ہیں۔ اچھا آپ تشریف تو رکھیں۔“

”نہیں اس وقت میں بیٹھ نہیں سکتی کیونکہ میرے قصور بار بار کا میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ فخر نے نہ بیٹھے کا عذر پیش کیا۔

”ابو، تو آپ انہیں اپنے ساتھ اندر کیوں نہ لیتی آئیں۔ خیر اب بلا لے لیں۔ یوں بار بار کہیں اُن کا بیٹھنا کچھ مناسب نہیں۔“ فلور نے کہا۔ تو سلوط بڑے برہم سے انداز میں بولی۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں کسی کو اندر بلانے کی سنی میں یہ مل لیں میرے لیے یہی بہت ہے۔“

”مونا۔“ فلور نے اُسے بڑے نشیبی انداز میں مخاطب کیا۔

”اگر دشمن بھی ملے تو اس کے ساتھ بھی مروت اور اخلاق کے ساتھ پیش آنے کا حکم صادر کیا گیا ہے جبکہ یہ تو تمہارے لیے بھائی کا معاملہ ہے جو تمہارے لیے بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے تمہاری ان ادیتوں کا احساس ہے جو ان لوگوں کے ہاتھوں تم نے جھیلی ہیں۔ مگر بیٹی سگے رشتے آپس میں اس طرح گھٹے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ناخن کوشت سے۔ اور اگر ناخن گل یا ٹوٹے بھی جاتا ہے تو دوبارہ آگ آتا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی کوشش بھی کرے تو سگے رشتوں کو توڑ نہیں سکتا کیونکہ ان کا تعلق خون سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خون ہی ہوتا ہے جو رشتوں کی شناخت کرتا ہے۔“

”جو کچھ بھی ہوئی آئی۔ لیکن میرا اعتماد ہر رشتے سے اٹھ چکا ہے۔ میں سارے رشتے توڑ چکی ہوں۔ آئی۔ آپ ان سے کہیں یہاں سے چلی جائیں اور آئندہ بھی ادھر کا رخ نہ کریں ورنہ میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔ سلوط کے لیے میں بیزاری اور ناکواری میں نہیں بلکہ تنفر بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے فلور ادم سی کھڑی رہ گئی۔

”واہ کیسے چلی جاؤ گی بیٹا۔ جب تک ہم زندہ ہیں اور ہمارے دم میں دم ہے ہم ہمیں اسی رشتے کو جوڑنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔“ ثاقب حسن نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اصل میں وہ فخر کے حکیم کے استکار میں بیٹھے تو کارہی میں تھے۔ لیکن جب فخر کو واپسی میں دیر ہو گئی تو ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ بیٹی سے ملنے کے لیے پہلے ہی بیابان ہو رہے تھے۔ اسی لیے اتر کر دروازے کے قریب تر کھڑے ہوئے تھے۔ چھوٹا سا تو کمرہ ہی تھا۔ سب کی آوازیں بہت واضح طور پر باہر آرہی تھیں۔

انہوں نے سلوط کی بات بھی سن لی تھی۔ اور بلا اجازت اندر آئے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مگر آتے ہی انہوں نے فلور سے معذرت کی۔

”معاف کیجیے گا ہمیشہ ہمیں اپنی بیٹی کی محبت نے آپ کی اجازت کے بغیر اندر آنے پر مجبور کر دیا۔“

”کوئی بات نہیں برادر محترم۔ میں نے ابھی کچھ دیر قبل ہی آپ کو اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔“ فلور نے تھوڑا سا سسکا کر کہا۔

سلوط سامنے ہی کھڑی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر۔ اور ان کے اچانک اندر آ جانے پر حسبِ عادت سہمی اٹھی تھی۔ کہ وہ شروع سے ان سے بہت ڈرتی تھی۔ اور بچپن ہی سے ان سے بچتے نہ کھانے کے بعد ان کا خوف کچھ ایسا دل میں بیٹھا تھا کہ ان کی یگانگت اور التفات بھی اس خوف کے اندر ڈال مل ہو کر رہ جاتا تھا اور اس سے اپنی آنکھوں میں غصے اور کھینچاؤ کی چنگاریاں بھرے جس انداز میں وہ فخر سے باتیں کر رہی تھی بھائی کو دیکھ کر وہ نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ ثاقب حسن قدم بڑھا کر اس کے قریب جا کھڑے ہوئے اور قدرے فہمانی انداز میں بولے۔

”ہم تمہاری نظریں ہر اصرار قصور دار سہی۔ لاکھ معذرت سہی لیکن بیٹا ہم نے تمہیں آداب و اخلاق سے کبھی عاری نہیں رکھا۔ جو تم میں آداب و سلامت کرنا پھول گئیں۔“ اور وہ جس کا دل ان کے اتنے قریب آ جانے پر غوف سے بری طرح وھڑک اٹھا تھا۔ اس پر اچانک غصے اور بچپنا دے کی آگ غالب آ گئی۔ اور وہ دل کڑا کر کے بڑی بے مروتی سے بولی۔

”جب میں ہر تعلق قطع کر چکی ہوں۔ خود پر ہی تیری برابرت۔ اپنا ماضی حتیٰ کہ خود اپنا آپ مٹا چکی ہوں تو پھر ان تکلفات اور دکھاوے کی باتوں سے کیا حاصل؟“

”جیسے مونا یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔ کم از کم میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس قدر بے مروت اور بدلہ طلب گستاخ ہو گی۔“ فلور اس کے گستاخانہ انداز کو برداشت نہ کر سکی تو اس نے فوراً ہی اسے طاعت کی۔

”نہیں ہمیشہ آپ ہماری بیٹی کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اور جو سلوک کر رہی ہیں۔ ہم اس سے بھی۔ کہیں زیادہ سخت سست اور بدسلوکی کے مستحق ہیں۔ اصل غلطی ہماری ہی ہے جو ہم اتنے بے مروت آئے اور ان کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی ایک خلیجان میں مبتلا کر دیا۔“ ثاقب حسن خصوصاً بیوی کے سامنے بیٹی کے ہاتھوں خوار ہونے پر اپنی شرمندگی کو مٹانے کی غرض سے بولے۔

”نہیں بھائی صاحب۔ خلیجان میں مبتلا ہونا کیسا مجھے تو آپ دونوں کی آمد سے دلی مسرت ہوئی ہے۔ لیکن آپ تشریف تو رکھیں۔ آپ بھی بچھ جائیں نا بیگم صاحبہ۔ اب تو آپ کے شوہر بھی تشریف لے آئے ہیں۔“ فلور ابہت ہی حلیق لے لے بولی۔

”نہیں شکریہ ہمیشہ۔ ہم اب چلیں گے۔ یوں بھی ہم نے بے وقت آ کر آپ کے آرام میں خلل ڈالا۔“ فخر نے بچائے ثاقب حسن جلدی سے بولے۔ اور پھر انہوں نے سیاٹ چہرے لیے کھڑی سلوط کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اچھا بیٹا۔ ہم لاکھ برس سہی۔ اور لاکھ تم ہم سے سارے رشتے توڑ لو۔ لیکن ہمیشہ کے بقول۔ خون کا رشتہ تو بد نہ نک قائم رہے گا۔ اور اسی خون کے رشتے کے برتے پر ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم خواہ ہمارے ساتھ نہ چلو۔ لیکن ہماری خطائیں ضرور معاف کر دو۔ اچھا خدا حافظ۔“ آنا کہہ کر انہوں نے فخر کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے قدم اٹھائیں ثاقب حسن۔ تیزی سے دلیلیز یاد کر کے گھر سے باہر آئے۔“ فلور انہیں دروازے تک چھوڑ آئی تھی۔ لیکن۔ دونوں میں سے کسی نے بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

سلوط کی بدسلوکی اور گستاخانہ رویے پر فلور اکورہ دھ رگھڑا رہا تھا۔ وہ دروازے کا کھٹکا لگا کر اپنے بستر پر پڑی تو بات کرنی تو کیا اس کا دل سلوط کی طرف لٹا تھا کہ دیکھنے کو بھی نہ چاہا۔ یوں بھی عشاء کی نماز پڑھ چکی تھی اور بڑا کی سکھائی دھوا پھٹنے کا ہی ذہن ہوتا تھا جس بات کرنے کی فرصت ہوتی تھی۔ ورنہ۔ اس کے گھر سے ٹھیک کافی دور تھا۔

اور چونکہ وہ بس کے ذریعے ٹھیک جاتی تھی اسی لیے ساڑھے سات بجے جمع ہی گھر سے نکل جاتی تھی اور پھر سات بجے شام کو ہی ڈیوٹی جگنا کے واپس آتی تھی۔ اور اگر کوئی سیریس کس آ جاتا تھا تو واپسی میں اسے دس بھی بج جاتے تھے۔

اس سے رات کے نونچکے تھے۔ اور سلوط کی طرف سے دل میں کینہی محسوس کرتے ہوئے اس نے فوری طور پر سو جانا

کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کمرے کی لائٹ بجھا لی اور چپ چاپ اپنے بلیک بے بھر وہ سلوٹو کے آگے کی وجہ سے تاخیر کر لائی تھی لیٹ گئی۔ جبکہ سلوٹو ابھی تک کھڑی ہی تھی اور بہت بے دردی سے اپنا ناخن جباری ہی تھا۔ اصل میں نووہ سمجھ رہی تھی کہ اب فلورا اس کے بری طرح لے لے گی۔

اسے سمجھائے گی اور قابل کرنے کی کوشش کرے گی۔
مگر اس کی باتوں کے رد عمل میں اس نے خاموشی اختیار کر لی۔
بلکہ خفگی کا اظہار کیا اور جی بھی بجا دی۔
سلوٹو کا دل تو پہلے ہی بھر چلا آ رہا تھا۔

فلورا کی ناراضگی نے اسے مزید ہوا دی تو بھر بھر اسکی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیل ساروں ہو گیا اور وہ اندھیرے میں اپنے بلیک بے پر چڑھ کر آنسو بہانے لگی۔ اس کی شوش شوش۔ اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اتنی واضح تھی کہ فلورا نے بھی سنی۔ لیکن ایک تو وہ اس سے کہہ رہی تھی دوسرے سارا دن ڈیوٹی انجام دینے کی وجہ سے بہت تھک گئی تھی اور اسے سخت نیند آ رہی تھی۔ اسی لیے وہ اسے یونہی روتا بلکتا چھوڑ کر کچھ دیر بعد کمرہ چلی گئی۔

اگلے روز حسب معمول صبح تھکے ہی بیدار ہوئی تو دیکھا سلوٹو جا، نماز پچھائے فجر کی نماز ادا کر رہی ہے۔ معلوم وہ رات کو سوئی تھی یا جاگتی رہی اور روتی ہی رہی تھی۔ فلورا کے دل میں یہ خیال ضرور آیا۔ مگر اس نے سلوٹو کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھی۔ اور وضو کرنے سے قبل اس نے پانی کی کیتھی جو چائے بنانے کی غرض سے چولہے پر رکھی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اسی میں چائے دم کی۔ یاد پیا نیس لینے لیے چائے بنا کر وہیں کھڑے کھڑے کنٹر سے آٹا نکال کر جلد جلد گوندھنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک دو گوندھنے چائے کے بھی پتی رہی۔ پھر آٹا گوندھنے کے بعد اس نے باقی ماندہ چائے پی کر پیالی دھوئی اور پیالی کھنگال کر اس نے رات کا لاپا ہوا قیمہ دھویا اور مسالے اور کھمبہ پتیلی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ اور دوسرے چولہے کو سلگا کر نوے کو اس چولہے پر لٹکایا اور کوئلے میں سے پڑے توڑ توڑ کشتی کی برات پر لٹکے لگی۔

سلوٹو بھی اس دوران میں تھوٹے اور تنگ سے باورچی خانے کے کھلے در پر آکھڑی ہوئی تھی مگر اس نے اب تک۔
فلورا کو سلام کیا تھا نہ ایک لفظ کہا تھا۔ جبکہ سرگودھا سے واپس آتے ہی یہ سارے کام اس نے بہت زبردستی کر کے اپنے ذمے لے رکھے تھے مگر اس روز فلورا وہ کام خود انجام دے رہی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس سے سخت خفا ہے اتنی کہ بولنے کی، کی روادار نہیں مگر اس کی خفگی کی وجہ سلوٹو کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ یہ میرا اور بھائی جان کا ذاتی معاملہ ہے۔ انہوں نے مجھ پر زیادتیاں ہی نہیں کی تھیں بلکہ ظلم توڑا تھا۔ مجھے برباد اور بے ٹھکانہ کرنے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ اور آج ان ساری باتوں سے لاعلم نہیں ہیں، انہیں بھی معلوم ہے کہ میں نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں کتنی اذیتیں جھیلی ہیں۔ اور کیسے کیسے زخم کھائے ہیں۔ کہ میری شخصیت ہی بڑھ بڑھ کر ہو کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی ذات تک پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ اور میں نے اپنی ان اذیتوں اپنے ان دکھوں کو خود ہی تو سہا ہے۔ کسی نے میرے دکھ نہیں بانٹے۔ کسی نے اذیتیں جھیلنے میں میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں خود ہی بالکل تنہا اور بے یار و مددگار طوفانی ہواؤں کی زد میں آئے تھے کی طرح ادھر ادھر لٹی پھری ہوں اور اب میں نے اپنا ایک ٹھکانہ بنایا ہے۔ اپنے لیے ایک نئے راستے کا تعین کیلئے۔ تو پھر بھائی اور بھائی جان اس نئے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے لگے۔ شاید اس خوش فہمی میں آئے تھے کہ میں اب بھی وہی۔ سبھی سبھی دلی دہائی اور بے زبان سی سلوٹو ہوں۔ جسے انہوں نے اپنے مفاد کی سمجھ بڑھا دیا تھا۔ اور وہ کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ حتیٰ کہ اشاروں اور کنایوں میں بھی کوئی ناپسندیدگی کو زبان نہیں دے سکتی تھی۔ اور حد تو یہ تھی کہ جب لٹ پٹ کر واپس آتی تھی۔ تب بھی ان کے اشاروں پر ہلکتی رہی تھی۔ انہی کی مرضی کو مقدم سمجھتی تھی۔

انہوں نے بہت ہلکا پھلکا اور سبز باغ دکھا کر کہا کہ میرے برادر نسبتی کے یہاں کراچی چلی جاؤ وہ لوگ بہت ہی شریف ہیں اور بڑا اعلیٰ ظرف رکھتے ہیں۔ تم کو سر آکھوں پر بٹھائیں گے۔ اور پھر صرف ڈیڑھ دو گاہ کا معاملہ ہی تو ہے۔ ہم واپس

آتے ہی تمہیں اپنے پاس بلا لیں گے۔ ارے ہم تمہاری خاطر ہی تو اینٹیا جا رہے ہیں۔ تاکہ اس خبیث کی قید سے تمہیں رہائی دلاؤں ہمیشہ کے لیے۔ اور تب میں نے بھی بھائی جان کی کچھ دھمکوں کے آگے گھٹے ٹیک دیے تھے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی

کراچی آگئی تھی۔ مگر کراچی آکر تو ایسی خوار کا منہ دکھا کر اٹھائیں کہ کبھی نہ دکھائے۔ اور ان ساری باتوں کے ذمہ دار صرف اور صرف بھائی جان ہیں۔ جو مجھے کراچی بھیج کر بھول ہی گئے تھے کہ ان کی کوئی بہن بھی بیتی ہے اس اتنی بڑی پرہنگام دنیا میں۔ مگر بھائی جان نے مجھے بہن ہی کتب سمجھا۔ میں تو ان کی نظر میں دنیا کی سب سے بیکار اور فالتو شے رہی ہوں۔ بھلا ایک ہی بھائی کی ایک بہن ہوتی ہے تو وہ اس کے کتنے ناز اور نخرے اٹھاتا ہے۔ کس قدر لاڈ کرتا ہے۔ اور کتنا ٹوٹ کر جاتا ہے مگر وہ اب تو لاڈ باریاں ناز نخرے اٹھاتا اور ٹوٹ کر چاہتا تو بڑی بات ایک نگاہ التفات کو بھی یہ چھوٹی بہن ترستی تھی۔ تب سب سب بھائی ایسا بے حس تھا تو پھر بھائی کو کیا دوش دینا۔

تمہی تو گزشتہ شب مجھے ان کی خیریں کلامی اور اتنی زیادہ پرہنگامت ذرا بھی متاثر کر سکی نہ متعجب۔ کیونکہ ان کی ساری باتوں کا کھوکھلا میں نے غصوں کر لیا تھا۔ ان کی گفتگو سے تصنع اور بناوٹ کی بو آ رہی تھی۔ ہونہر۔ اب انہیں کیا معلوم کہ زندگی کی کھٹنائیوں اور تلخ تجربات نے سلوٹو کو کچھ سہل و آلا ہے۔ انہیں کیا خبر کہ سلوٹو اب پہلے جیسی دلی دہائی بے زبان بلکہ بے فزری سلوٹو نہیں رہی ہے مگر ہاں۔ میری کمری گفتار سے۔ انہوں نے کچھ تو اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔

جائے کتنی درنگ وہ باورچی خانے کے کھلے در پر کھڑی ہو جیتی رہی تھی۔ وقت کے گزرنے کا احساس تو اس وقت ہوا جب تو نے کو چولہے پر سے آٹا کر کیل بڑھانے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ تو اس نے بڑی طرح چونک کر فلورا کی طرف دیکھا۔ جو تو اٹھانے کے بعد دست پینے سے چولہے پر بڑھ رہی تھی کہ پتیلی کا دھکنا کھول رہی تھی۔ تو اس کی عادت نہیں تھی کسی بات پر استفسار کرنے یا بولنے کی۔

بڑی سے بڑی بات اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ اس کے ساتھ ہوتی مگر وہ چپ ہی رہتی تھی حتیٰ کہ بڑی سے بڑی پیداواری اس پر توڑی جاتی تب بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔ نہ وہ پچھوری لڑکیوں کی طرح پٹر پٹر بولنے، تنہی مذاق کرنے اور بر بات کی ٹوہ میں لگی رہنے کی عادی تھی۔

اس کے مزاج میں بر دباری تھی اور فطرتاً ہی باپ کی طرح کم گو تھی۔ بات بھی کرتی تو ضرورتاً۔ تنہی بھی تو دیتا۔ یعنی اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ ایک اسٹائل تھا۔ جس سے اس کے اندر ایک دھماکا پیدا کر دیا تھا کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ پوچھتی بھی نہیں۔ مگر یہ فلورا کا معاملہ تھا جس کے اس پر بہت سارے احسانات تھے۔ جس نے اسے بڑا ہی نہیں دی تھی بلکہ سہارا بھی دیا تھا۔ محفوظ دیا تھا اور سب سے بڑھ کر اپنی بے لوث۔ جاہتوں سے نوازا تھا۔ اور فی زمانہ بے لوث چاہتیں مفتوحہ و سہمی مگر عنقا ضرور ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور پھر بے لوث چاہتوں کا متلاشی تو برہنہ یاد رکھا جاتا تھا۔ ہوا ضرور بھی عبور کر جاتا ہے۔ کہ یہ چاہتیں اگر ملتی ہیں تو ابل پانی کے بعد اٹھتی ہیں۔

جیسے کہ سلوٹو کو فلورا سے ملی تھیں۔ پھر بھلا وہ کیسے اس کی ناراضگی پر داشت کر سکتی تھی۔ دل کو سنبھال کر وہ ٹوڑا سا آنکھیں دھمی اور پھر قدرے تسکین سے لہجے میں اسے سلام کیا۔
"اسلام علیکم رحمہ"

"وعلیکم السلام۔" جواب بہت دھمی آواز میں ملا۔
"ارے یہ آپ کیا کرنے کھڑی ہو گئیں؟" اس نے فلورا کے قریب ہو کر پوچھا۔
"ہیں، یہ میرے کرنے کے کام ہیں۔ اس لیے کر رہی ہوں۔" فلورا دھمکے روئے انداز میں بولی۔
"لیکن یہ کام تو آپ نے مجھے سوچ دیا ہے؟" اور بھلے تو بعد میں ذاتی ہوں میں۔ آپ نے آج پہلے کپول پرکھ لیے۔ خیراب بیٹے میں قیہوں دوں۔" سلوٹو اس کے ہاتھ سے ٹکیر لینے کی کوشش میں بولی۔
"نہیں بھئی، میری عادتیں نہ بگاڑو۔ تمہارا تو کچھ ٹھیک نہیں کہ کب جلی جاؤ۔ بعد میں تن آسانی کی عادت

مجھے بہت تکلیف دے گی۔ فلورائے بدستور درختے ہوئے انداز میں کہا۔

”اوہ! تو انہی میری اس بات پر مجھ سے خفا ہو گئی ہیں۔“ سلوٹ نے دل میں سوچا اور پھر جھینپے جھینپے انداز میں بولی۔

”وہ تو میں نے بھائی بران سے اس لیے کہہ دیا تھا۔ تاکہ وہ آئندہ یہاں نہ آئیں۔“

”لیکن اگر وہ یہاں آئیں تو پھر تو تم یقیناً یہاں سے چلی ہی جاؤ گی نا۔“ فلورا اب جو لکھی کی طرف مڑ کر کے پتیلی میں کھٹ کر چلا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی گھوم کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ سوال اس نے گھوم کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے سوال کا فی الفور کوئی جواب نہ بن سکا وہ توقف کے بعد کچھ سوچ کر بولی۔

”نہیں۔ میں یہاں کہاں جاؤں گی بلکہ جاسکتی ہوں؟“

”نہیں بھئی تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔ بس جب تک یہاں ہو۔ آرام اور بے فکری سے رہو۔ ان کاموں کا کیا ہے۔ یہ تو زندگی کے روز مرہ میں سے ہیں۔ اور میں تو شروع ہی سے انہیں انجام دینے کی عادی ہوں۔ انہیں تم کرو یا میں انجام دوں میرے لیے ایک ہی بات ہے۔“ فلورا پھر جو لکھی کی طرف گھوم کر پتیلی میں کچھ چلائے لگی۔

”کمال ہے آنٹی! آپ انہی کی بات پر اس قدر ناراض ہو گئیں۔ بھلا میں آپ کو چھوڑ کر کہیں جاسکے گا تقویٰ کر سکتی ہوں۔“ سلوٹ اس کی خفگی سے عاجز ہو کر بولی۔

”کیوں میرے اندر کون سے شرفاب کے پڑ گئے ہیں۔ میرا تو تم سے کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ واقفیت۔ جب تم اپنے گئے اور خونی رشتوں کو توڑ سکتی ہو تو میری بھلا کیا بساط اور اوقات۔“ فلورائے اس کی طرف مڑتے ہوئے یونہی بدل ڈال کر کہا۔

”نہیں آنٹی! میرا آپ سے خلوص کا رشتہ ہے۔ بے لوث چاہت کا رشتہ ہے اور سب سے بڑھ کر اسلامی رشتہ ہے جو گئے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے کیونکہ یہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جوڑا ہوا ہوتا ہے۔“ سلوٹ قدرے جو شکلے انداز میں بولی۔

”ہاں اس میں شک نہیں کہ اسلام کا رشتہ بہت مضبوط اور قوی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق حق باری تعالیٰ کی ذات اور حبیب پاک سے بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حق و باطل کے درمیان مکر کر لائی ہوئی تھی تو بیٹا باپ کے اور باپ بیٹے کے سامنے شہید زن ہوتا تھا۔“

”ہاں تو پھر اسلام کا رشتہ سب سے بڑھ کر جوانا۔“ سلوٹ نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”ہاں، بے شک ہوتا ہے لیکن۔ اس رشتے میں درختوں کی تقسیم نہیں رکھی گئی۔ یعنی ایک مسلمان کی جائیداد اور مال و زر کا حق اس کی زندگی یا وفات کے بعد دوسرے مسلمان کو ملیں دیا گیا بلکہ یہ رعایت باحق ہے اور خونی رشتوں کو ہی دو بیت کیا گیا ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم بیٹ میں ہی بیٹے کے رشتوں کا تعین کر دیتے ہیں اور پھر نسل باپ ہی سے جلتی ہے۔ خون باپ کا ہی مانا جاتا ہے بلکہ انسان کی شناخت ہی باپ کے خون سے ہوتی ہے۔ لہذا تم ان رشتوں کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں۔“ فلورائے اسے قائل کرنے کی غرض سے بڑے محسوس دلائل دے کر بولی۔

”لیکن میں نے ان رشتوں کی حقیقت سے کب انکار کیا ہے آنٹی! میں نے تو یہ کہا تھا کہ میں ہر رشتہ توڑ چکی ہوں کیونکہ رشتہ توڑنے کا تو مجھے کم از کم مجھے اختیار تھا۔“ وہ فلوراک کی باتوں سے زچ ہو کر بولی۔

”اچھا اگر نہیں اتنا ہی اعلیٰ رہے تو پھر اپنے جسم سے یہ گوشت بھی توچ کر پھینک دو اور یہ خون جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے اسے بھی نکال پھینکو کہ تمہارے دادا سے تمہارے باپ کی رگوں میں منتقل ہوا ہے۔ اور باپ سے تمہاری رگوں میں ہے۔“ فلورائے سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی طیش میں آ کر بولی۔ وہ بھی چھٹاسی ہو گئی تھی۔ فلورائے اسلئے دھناختیں پیش کر کے روکھی سی ہو کر بولی۔

”میں نے آپ سے اپنی کوئی بات چھپائی ہے نہ جھوٹ ہی بولا ہے بلکہ جتنا بھی بتایا ہے۔ میرے ساتھ جتنا کچھ ہوا ہے اس کے عشرہ عشرہ بھی نہیں ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ میں بھلا کس دل سے ان لوگوں کے ساتھ دوبارہ رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔“

”خیر۔ تم چاہو یا نہ چاہو۔ یہ رابطہ تو قائم ہی رہے گا کیوں کہ خون کے رابطے مرنے کے بعد بھی نہیں لڑتے اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے بھائی چھوڑنے کے کم از کم زیادتیوں ہی نہیں بلکہ بڑے مظالم ڈھائے ہیں لیکن تمہاری برپادی کے دفتر دار وہ نہیں تمہاری قسمت ہے۔ کیونکہ دوزخ کے رستے عرض برطے کیے جاتے ہیں۔ اور فرش پران کا بھوک ہوتا ہے۔ وہ بھی موت کی طرح ایک معینہ وقت پر۔ تمہاری۔ تمہارے بھائی یا کسی کی بھی طاقت نہیں جو قدرت کے فیصلوں میں دخل دے۔ سو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارا مقدر تھا اور باقی جو حالات اور واقعات پیش آئے یا پیدا کیے گئے۔ ان کے دفتر دار اور قصور وار تمہارے بھائی ہی ہیں۔ لیکن انہیں نے تم سے معافی تو مانگ لی ہے۔“ فلورائے اس کی کسی بھی تاویل یا عذر کو تسلیم نہیں کیا اور اس کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ اب سلوٹ اس سلسلے میں مزید کیا کہتی کہ وہ تو اس کی کوئی بات کوئی دلیل ملنے پر تیار ہی نظر نہ آتی تھی۔

”تمہارے بھائی بران تم سے اتنے بڑے ہیں کہ اگر تمہاری بھائی مجھ سے کہیں کہ باہر کامیں ان کے سوا ہر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو میں یہی سمجھتی کہ تمہارے باپ ہیں مگر بڑا بھائی بھی باپ کے سامنے ہوتا ہے۔ اس پر بھی ان پر شاباش ہے کہ تمہارے لئے ہانت امیر سلوک اور باتوں کے باوجود ان کی توری پر بل تک نہیں آیا۔ اور وہ تم سے معافی مانگ کر گئے اور معافی تو تمہاری بھائی نے بھی مانگی تھی اور جس طرح وہ تمہاری خوشامد کر رہی تھیں۔ میں نے آج تک کسی بڑی بھائی کو زندگی میں سنا ہے کہ تمہارے بھائی نے اسے خاموش دیکھ کر فلورائے بھر کہا۔“

سلوٹ نے بھائی اور بھوچ کے ساتھ بدتمیزی تو کی تھی۔ اور اس کے خیالات بھی ان کی طرف سے بڑے باغیانہ تھے۔ مگر دل ہی دل میں اپنے اس ناروا سلوک پر وہ چوری چوری ہوتی تھی۔ اس کا ضمیر برابر اسے ملامت کر رہا تھا۔ اب جو فلورائے ایک طرح اس کے لیے تواسے رونما کیا۔ مگر فلورائے اس کی آسنوؤں کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔

”ارے بھئی! بھائی بہن اور رشتے دار بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ ارے ہم سے بوجھو۔ ہم تو ان رشتوں کو توڑ گئے ہیں۔ ہمارا سینہ پیر کر دیکھو کہ وہاں کتنے گہرے زخم لگے ہیں۔ ہماری تو ساری فیملی فسادات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ دونوں بھائی! بہن اور ماں باپ کوئی بھی تو نہیں بچا تھا۔ ایک طرف میں دکھایا ہی سب کے غم کو بوجھ اٹھانے کے لیے رہ گئی تھی۔ ارے ماں جانے کی بات ہی کچھ اور ہی ہوتی ہے بھئی! تم خواہ کہیں بھی رہو کسی ہی حفاظت میں رہو مگر ہمیشہ خود کو غیر محفوظ ہی محسوس کرو گی۔ کیونکہ انہوں کے ہوتے دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے والے اپنے شناخت کھو دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کھو کھلی ہو کر رہ جاتی ہے۔“ فلورائے ایک اور پوکھا لگایا۔ تو وہ روتے روتے بولی۔

”تو پھر آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں۔ میرا دل ان لوگوں سے کھٹا ہو گیا ہے۔ میری طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی۔ کہ پھر ان لوگوں کے پاس واپس لوٹ جاؤں۔ اور۔ اور اب تو اس کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ رات کے سلوک کے بعد تو میں خود بھی ان دونوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔“ اپنی بات بڑی بے بسی سے کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ فلورائے اس پر ترس آ گیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھر کر کہا۔

”واہ کیوں قابل نہیں رہیں۔ تمہارے بھائی بڑے شریف اور ٹھنڈے مزاج کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی صلیبی کا اس سے اندازہ لگا لو کہ تمہارے آستے ہانت امیر رویے اور گفتگو کے باوجود وہی کہ جسے سن کر میں خود پر قابو نہ کر سکی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی زیادتیوں کا اعتراف کیا بلکہ تم سے معافی بھی مانگ لی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں فوراً معاف کر دیں گے۔“ فلورائے اس نے اپنے آسنوؤں کو پکڑ کر کہا۔

”لیکن میں تو ہرگز ان سے معافی نہیں مانگوں گی کیونکہ انہوں نے مجھے اب تک ہمیشہ سب کے سامنے ہی خود کو جھکا دیا ہے۔ میں ہی سب کی کراوی کیسی بنایت صبر و سکون سے برداشت کرتی آئی ہوں لیکن اب میرے

اندر برداشت کا مادہ ختم ہو چکا ہے۔ ہاں البتہ۔" سلوٹ کچھ کہتے کہتے رکی تو فلور اسے فوراً ہی پوچھا۔

"ہاں، ہاں کہو۔"

"البتہ اگر بھائی جان نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا تو شاید جلی ہی جاؤں۔" آخری فقرہ سلوٹ نے جڑی دلی زبان سے کہا۔

"یہ شاید کیوں کہا تم نے۔ بس جلی ہی جانا کوئی کدھی میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ لیکن اب تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب تمہارے بھائی اوجھ کا رخ کریں گے۔"

فلور کی باتوں سے سلوٹ بھی کبھی کہ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہ رہی، وہ چپ سی ہو کر بڑی سوچنے لگی کہ بھائی تو اب شاید ہی اوجھ کا رخ کریں، پھر وہ یہاں سے بھلا کہاں جائے گی۔

"غلط باتوں کو دل میں بگڑ نہ دو نا، مجھے تمہاری بہتری اپنے گھر سے زیادہ عزیز ہے۔ ورنہ تمہارے اچھانے کی وجہ سے دوسرا ہٹ تو نصیب ہوئی، میں نے تمہیں اپنا بہن بنایا ہے۔ حتیٰ کہ تمہارا نام بھی تبدیل کر دیا ہے۔ پھر بھی میں دل سے یہی چاہتی ہوں کہ تم اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ اوہو۔ آج تو بڑی دیر ہو گئی، اچھا جلدو جلدی سے لفٹ میں میرا کھانا رکھ دو۔ اور ہاں تم بھی ناستہ کرو۔ میں تو اب دوپہر کو کھانا کھاؤں گی۔ لوہی سے تو انجی تک پڑے ہی نہیں پڑے۔" فلور کو باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی وقت گزر جانے کا خیال آیا تو وہ اسے ہدایتیں دیتی اسی دم کپڑے بدلنے اندر چلی گئی۔ اور سلوٹ لفٹ کھنکال کر جلدی سے اسی قیمہ بھر سنے لگی۔

پورا راستہ یعنی مارٹن روڈ سے کینٹ بمک کا فاصلہ جس خاموشی سے طے ہوا تھا، فاخرہ کو دشت سی ہونے لگی۔ حتیٰ حالانکہ وہ خود بھی بہت خاموش طبع تھی۔ اور ان کے شوہر بھی جو ضرورتاً ہی بات کرنے کے عادی تھے مگر پچھلے دو روز سے بہت چپک رہے تھے۔

اصل میں جیسا کہ کامران، اشتہام کے گھر تک پہنچنے کے درمیانی وقفے میں طے پایا تھا کہ اسفند اور ثاقب جن دو بزرگ کی فلائٹ سے لاہور روانہ ہو جائیں گے اور پھر اس کے بعد اپنا ضروری سامان بیک کر کے بمبوغاخرہ، بیگم شام کی تلاقی سے لاہور روانہ ہو جائیں گے اس کوشش کے باوجود یہ طے شدہ پروگرام فیل ہو گیا تھا کیونکہ۔ اول تو دو بزرگ کی فلائٹ کے بجائے لاہور کے لیے شام کی فلائٹ مل سکی تھی۔ دوسرے لاہور پہنچنے کے بعد گھر کا سامان بیٹنے اور پینک کرنے میں اگلا آدھا دن ہی صرف ہو گیا تھا۔ کیونکہ فاخرہ نے گھر میں صرف چار بائیاں ہی چھوڑی تھیں۔ باقی کا کچھ بڑا اداہ غیر استعمالی بے کار سامان محلے کے غریبوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس پر ثاقب جن کو بینک سے کچھ رقم بھی نکلوانی تھی اور کچھ لوگوں کے جو اجابات تھے وہ بھی ادا کرنے تھے۔ یوں تو فاخرہ بیگم کے تقریباً تمام زیورات ہی حالات کی نذر ہو گئے تھے۔ لیکن جو کچھ باقی رہ گئے تھے۔ وہ انہوں نے ان زیورات کے ساتھ جو سلوٹ کو دینی تھے واپس کیے تھے بینک کے ڈاکر میں رکھوا دیے تھے۔ انہیں بھی لاگت سے نکلوانا ضروری تھا۔ اس لیے دونوں میاں بڑی اسفند کے ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے اور دونوں کو بینک میں چھوڑ کر اسفند ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کر انے چلا گیا تھا۔

یوں تو یہ تینوں اگلے دن سیریکہ کو ہی کراچی پہنچ گئے تھے مگر کامران کی مسئلہ جو کچھ نہیں پایا تھا۔ حالانکہ اسفند نے تو کتنا اصرار بھی کیا تھا۔ کہ کچھ پہنچا پھونچی اس کے گھر میں بٹھیں۔ لیکن ثاقب جن کسی طرح آمادہ ہی نہ ہوئے تھے خود فاخرہ بھی بھائی بھاجو بلکہ سہیل منصور سے بھی کچھ اس درجے کی کدھی ہو گئی تھی جس میں ان کی زبان ہو گئی تھیں۔ ان بزرگوں کو جب تک مکان کا مسئلہ نہ ہو جاتا۔ ہوٹل میں ہی قیام کرنا پڑتا اور ثاقب جن کسی بہت ہی فائو اسٹار جسم کے بہت ہی عمدہ اور مینکے ہوٹل میں قیام کرنے کے حق میں نہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے ایک بھڑی اشارے کے نسبتاً گھٹے مگر اچھے ہوٹل میں قیام کرنے کو ترجیح دی۔ جبکہ اسفند تو بی جہاد رہا تھا کہ جس عمدہ اور فائو اسٹار ہوٹل میں وہ دس بارہ روز قیام کر کے گیا تھا۔ وہیں بھوجا پھوڑا اور بھوجی کے لیے بھی ایک سوٹ بک کر اوسے اور ان کے ہوٹل کے اخراجات وہ خود اٹھانے لگے لیکن ثاقب جن سے کسی طرح یہ گوارا ہی نہیں کیا۔

بزرگیت، ایک مقامی میگزین کے ذریعہ ہوٹل کا چناؤ کرنے کے بعد کہہ بک کر انے اور کمرے بدقصد جانے

میں شام ہو گئی اور ادھر تا قتب جن نے جب سے کراچی ایرپورٹ پر قدم رکھا تھا مسلسل سلوٹ کے نام کی مالا جب سے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایرپورٹ سے سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں مگر اصل مسئلہ کلینک تلاش کر کے فلور ایک سال کی حاصل کرنے کا تھا۔ اور ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی ثاقب جن سے سلوٹ کے پاس جانے کی جو رٹ لگائی تھی تو اسفند نے بھی انہیں سمیت سمجھا یا تھا کہ اس کام کو اب وہ آئندہ روز پر چھوڑ دیں۔ اس وقت تو شام ہو گئی ہے۔ کلینک کو کھلا ہوا ہو گا مگر اس وقت وہاں جانا کسی طور پر مناسب نہیں لیکن ثاقب جن کا کہنا تھا کہ وہ آج کا کام کل پر چھوڑنے کے عادی نہیں۔ دین (Then) اور پھر (There) کے قابل ہیں اصل میں انہیں رنج و خزاں تھا کہ کہیں پیرا۔ فلور کو فون کر کے ڈرا ورا دوسرے اور وہ سلوٹ کو کہیں اور بھجوا دے۔

بہر حال، ثاقب جن کی ضد کے پیش نظر اسفند انہیں کام میں جو اس نے اپنے ایک واقف کار، کارڈیل کے پاس رکھا دی تھی۔ کوئی سات بجنے کے قریب فاخرہ بیگم سمیت کلینک کا رخ کیا جیسے دھونڈنے میں کم و بیش آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا اور جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ملڈائف، فلور کچھ دیر قبل ہی اپنی ڈوٹی انجام دے کر اپنے گھر جا چکی ہے۔ تب اسی کلینک کی کئی نرسوں سے اس کے گھر کا پتہ دریافت کیا مگر سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جس اتفاق سے وہ ڈاکٹر آ گیا جو یہ کلینک چلا رہا تھا۔ اس نے فلور کا پتہ بتایا۔

اسی صبح دو وین رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ ثاقب جن نے اسی وقت جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسفند جو ان کے ساتھ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے فاخرہ کو آہستہ سے بتایا کہ وہ اس وقت ان دونوں کے ساتھ فلور کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھتا لیکن اگر چھوچھا۔ جانے کا تہیہ ہی کر چکے ہیں تو پھر وہ کہیں راستے میں ہی اتار جائے۔ مگر مسئلہ تو کارڈیل کو گھر لے کھانے اور اسی وقت کو کوئی ایسا ریڈی میڈ ڈرائیور ہی نہیں ملے گا تو فاخرہ بولیں۔

"اے۔۔۔ تو کیا تمہارے خیال میں تمہارے چھوچھا جان کو کار چلائی نہیں آتی۔ اسے وہ تو ایکسپرٹ ہیں ایکسپرٹ۔ اب کچھ نہیں ہیں مگر جب کچھ تھے تو ان کے پاس پانچ پانچ گاڑیاں تھیں پانچ پانچ۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ میں اپنے ہوٹل پر اتار چاؤں گا اور چھوچھا جان خود کارڈیل کو کر دیں گے۔" اسفند بولا اور پھر راستے میں ہی اتار گیا لیکن اتارنے سے پہلے اس نے انہیں مارٹن روڈ کا راستہ اور عمل وقوع ضرور بتا دیا تھا۔ یوں تو شہر کراچی میں کسی کا گھر دھونڈنے کا مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے صدیوں سے مدینوں کو فی خزانہ دھونڈنا کہ اس میں بھی مسئلہ ہی کے ہاتھ میں خزانے کا نقشہ ہوتا ہے اور یہاں بھی دھونڈنے والے کے ہاتھ میں گھر کا پتہ ہوتا ہے اور وہاں کا پتہ یا اس ہوتا ہے تو انسان اس علاقے کی حدود میں بھی پہنچ جاتا ہے حتیٰ کہ محلے میں بھی۔ گھر کے بہت قریب یا آس پاس۔ اس کے باوجود بھی اہل علاقہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔

اور اگر شائبہ اعمال راستے میں کسی راہ گیر یا ڈاکٹر اسے پتا ہو چھوچھا جانے تو وہ کہتا ہے کہ یہ جو سلسلہ میں روڈ جاری ہے اس کے سرے پر چلے جائیں اور وہاں سے بائیں یا دائیں فلاں سڑک پر درجائیں۔ بس تو خود آگے جا کر آپ کو اپنی مطلوب جگہ مل جائے گی۔ اور اب جو اس میں روڈ پر چلے تو وہ شیطان کی آنت کی طرح کھینچ کر اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی اور جب ناک کی سیدھ میں چلتے چلتے اس سڑک کے سرے پر پہنچتے ہیں تو وہاں یا بائیں پھر دہری لمبی سڑکوں کا جال۔ قسمت سے ہی کسی کو صحیح تپے پر پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔

مگر اسفند جبل کے سرے پر شہید ملت کا جو آخری راؤنڈ باؤٹ تھا دیکھ انہیں چھوڑ کر کار سے اتار تھا اور ابھی طرح کچھا دیا تھا کہ کھلی کی چار دیواری سے آخری سرے کے مقابل میں جو کوارٹر بنے ہوئے ہیں وہ مارٹن روڈ کے ہی ہیں۔ اور آپ وہاں سے کوارٹروں کے قریب تیار کرتے ہوئے جلدی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ ثاقب جن اس بات پر سخت جبرز تھے کہ اسفند کو ان کے ساتھ چلنے میں کیا عار ہے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ ان کی طلب صادق تھی۔ اور دل کو لگی ہوئی تھی۔ اس لیے فلور کا پتا تلاش کرنے میں انہیں دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ جب کہ کوارٹروں کے درمیان ہی تنگ سی گلیوں کا وہاں بھی ایک جال سا بچھا تھا۔ اور انہیں کافی اندر جا ملنا تھا مگر غیر متوجہ تھے ہوئے، بلکہ نہروں کی ترتیب کے مطابق چل رہے تھے اس لیے کچھ ہی دیر بعد انہیں فلور کے گھر کا نمبر مل گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے فاخرہ کو بھیج دیا تھا

تاکہ اگر کسی غلط کو آرڈر پر لگے ہوں تو ایسے ناوقت ایک قانون کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر کوئی اعتراض نہ کرے۔
بہر حال یہ ان کی اپنی کوئی مصالحت تھی مگر بیٹھے تو صبح جگہ پر تھے۔ ناخروہ کے دستک دینے پر دروازہ کھول دیا گیا تھا اور وہ اندر چلی گئی تھی۔ اسی سے انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ٹھیک پتے پر پہنچے ہیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ وہ ناخروہ کے سامنے ہی ہوا تھا۔ ان کے دل، جذبات اور احساسات پر جھجی گزری تھی۔ اس سے بھی ناخروہ لاعلم نہیں تھیں۔ بلکہ اسے فلورا کے گھر کا رخ کرنے کے دوران راستے میں کیسے کیسے منصوبے بنائے گئے تھے۔

”بس اب ہم تین چار روز کے اندر اندر ہی یہاں کے کسی معزز علاقے میں ایک مکان خرید لیں گے۔ کیونکہ جو ان میٹھی کا زیادہ عرصہ ہوئی میں رہنا ٹھیک نہیں۔ اب یہ تو اسفند میاں ہی جانتے ہوں گے کہ ہمارے قیام کے لیے یہاں کا کون سا علاقہ موزوں رہے گا۔“

”یہاں کراچی میں کوئی بھی علاقہ کسی خاص طبقے کے لیے مختص نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے جن علاقوں میں شرفاء اور معزز رہتے ہیں یا جو علاقے معزز کہلائے جاتے ہیں۔ ان میں بھی اچھے اور برے ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں اصل میں ان علاقوں کی بیشتر آبادی نو دولتوں پر مشتمل ہے جن میں اچھے ظرف کے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ہلکے ظرف کے بھی۔“ اسفند نے کہا۔

”خیر۔ ایسی صورت حال تو فخریہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہے۔ لیکن ہم کسی ایسے علاقے میں مکان خریدنا چاہتے ہیں جو کسی معزز علاقے اور شہر کے وسط میں ہو مگر بہت گنجان نہ ہو اور اب مکان کی خریداری کا معاملہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں؟“ ثاقب حسن نے کہا تو اسفند جلدی سے بولا۔

”لیکن چھو بھانجان! میں تو اس فیملی میں بالکل گوارا ہوں۔ مجھے مکانات وغیرہ کی خرید و فروخت کا بالکل تجربہ نہیں البتہ کراچی میں سکونوں اسٹیٹ ایجنسیاں ہیں۔ گو میں کسی سے واقف تو نہیں مگر کسی اسسٹنٹ بروکر سے آپ کو ملوا دوں گا۔“ اسے بھی نہیں کسی بروکر کے ذریعے مکان خریدنا نہیں بالکل گوارا نہیں۔ ایک تو بروکر قسم کے لوگ پیشہ بننے فارغے کو نظر رکھتے ہیں۔ دوسرے کمیشن بھی بہت زیادہ لیتے ہیں۔ اب نامعلوم یہاں مکانات وغیرہ کی کمیشن کی شرح کیا ہو۔ ظاہر ہے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے خود اپنی ذات میں چھوٹا پاکستان۔“

”افو! ادبی مثل ہے کہ جیسا دس ویسا بھیجیں۔ اب یہاں آئے ہیں تو یہیں کے اصولوں اور قاعدوں پر چلنا پڑے گا۔ پہلے یہ دیکھیں کہ خدا کرے کیا ملے گی جائیں۔“ ناخروہ نے ان کی بے موقع گفتگو سے انکار کر کہا۔

”اے ملے گی کیوں نہیں۔ بھلا تم تلوتے صادق جذبے، ارمان اور آرزوئیں لے کر ان سے ملنے جا رہے ہیں۔ ان کے دہلے کا کیا سوال۔“ ثاقب جن جذباتی ہو کر بولے تھے مگر اب واپسی میں سلووا اگر چہ مل بھی گئی۔ تو اس نے ان کے ملے صادق چالوں اور مالوں اور آرزوئیں پر اپنے ہنر اور گستاخانہ رویے سے باقی پھیر دیا تھا۔ ساری خوشی، سارے صادق جذبے سارے ارمان اور آرزوئیں سب کچھ پامال ہو گئے تھے۔ ناخروہ کو شدت سے احساس ہوا کہ اس کے شوہر کے دل۔ جذبات اور احساسات کا کیا عالم رہا ہوگا۔

نن من ٹن۔ فون کی گھنٹی ایک تسلسل سے بج رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور زینت اور شعیب منصور کچھ دیر قبل ہی ٹھک ہار کر اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ اصل میں شعیب منصور نے چند کاروباری اہم ہستیوں کو ڈنر دیا تھا۔ سارا دن زینت گھر کی شینگ اور کھانا پکواتے میں لگی رہی تھیں اس لیے ٹھک کر چور ہو رہی تھیں۔ ان کے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ وہ ابھی سوئی نہیں تھیں۔ مگر اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ شعیب منصور خود اٹھ کر فون ریسپونڈ کریں۔ اور فون بھی جی وجہ سے سر ہانے سے اٹھا کر کر کے کے دوسرے کونے میں رکھ دیا جاتا تھا کہ رات بے رات ایک دم ہی وہ اٹھنے کو تیار نہیں تھے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر رات میں کاتے والی کالیں رات بھر ہی ہوتی تھیں۔ لہذا زینت شوہر کے اٹھنے کے انتظار میں ہی پڑی رہیں مگر جب کال بچھیں سے کٹ کر پھر فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی تو طوعاً اور کرہاً زینت ہی کو اٹھ کر فون ریسپونڈ کرنا پڑا۔

”ہیلو جی کون بول رہا ہے؟“ انہوں نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا آپ شعیب منصور صاحب کے گھر سے بول رہی ہیں؟“ ادھر سے ناخروہ نے پوچھا۔

”جی ہاں میں نیلم شعیب بول رہی ہوں۔ مگر آپ کی تعریف؟“ انہوں نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

”اوہ آپ میں کرماب جی جان! ذرا تجھے آکا کو تو بلا دیں؟“ ناخروہ نے کہا تو کچھ دیر کو تو جیسے زینت کو سانپ ہو گئے گئے۔ پھر وہ ریسور ہاتھ میں اٹھنے لگی۔ اس کا تانکینیتی قدم بڑھا کر بید کے قریب آگئیں اور ماٹوٹہ پس پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے شعیب منصور کا بیڑا کر آہستہ سے بولیں۔

”سنیں شعیب شاید ناخروہ بی کا فون ہے؟“ اور شعیب منصور جو جاگ رہے تھے لیٹے لیٹے ہی بولے۔

”شاید سے آپ کا کیا مطلب ہے کیا آپ نے ان سے پوچھا نہیں یا آپ انہیں پہچانی نہیں؟“

”افو۔ اگر پہچانی نہیں تو کیا دل سے گھڑ کر کہہ رہی ہوں۔ وہی ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔“ زینت

تے قدرے جھلکا رہا۔

”اوہ۔ خدا خیر کرے رات کے پونے بارہ بجے فاخرہ بی نے مجھے کیوں فون کیا ہے۔ اچھا مالے ریسور مجھے دیجیے“
شعب منصور گھبرا کر بیٹھنے ہوئے بولے۔ زینت نے کونے میں رکھا فون ان کے سر ہانے لاکر رکھا اور پھر ریسور
ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

”ہیلو۔ شعب اسپیکنگ“ شعب منصور نے ریسور کان سے لگا کر کہا۔

”اوہو۔ آداب عرض تھیلے اکا۔ شکر ہے آپ نے بات تو کی۔ ورنہ بھائی جان تو میری آواز سن کر ایسی خاموش
ہو جی تھیں کہ میں سمجھی میری یہ کال ہی ضائع جانے لگی“ فاخرہ نے چہیتے سے لہجے میں کہا۔

”منہیں نہیں اصل میں تمہاری بھابی جان اتنے ناوقت اور غیر متوقع تمہاری آواز سن کر بحر حیرت میں غوطے کھانے
لگی تھیں۔ خیر تم بتاؤ کہاں سے بول رہی ہو۔ باہر کہیں سے یا لاہور سے“ شعب منصور نے پوچھا۔

”نہیں میں باہر کہیں سے بول رہی ہوں نہ لاہور سے بلکہ آپ کے شہر کراچی سے ہی بول رہی ہوں“ فاخرہ نے
بتایا تو شعب منصور ان کی کراچی میں موجودگی کا سن کر اچھل سے پڑے۔

”اچھا! انہوں نے اچھا کو بہت جھاکر کہا۔

”مگر کراچی پہنچ گئی ہو تو بتاؤ کہ اس وقت کہاں ہو۔ اسٹیشن پر یا ایر پورٹ پر تاکہ میں تمہیں اپنی کار بھیج دوں“
”نہیں بڑی نوازش تھیلے اکا۔ سارے بیٹھے کی زحمت نہ کریں کیونکہ ہم دونوں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے
ہیں یہ فاخرہ نے مزید ایک چٹکا دینے والا انکشاف کیا تو شعب منصور کچھ پریشان سے ہو گئے۔

”کمال ہے ہوٹل میں کیوں ٹھہریں کیا میرے گھر کا بتاؤ ذہنیں رہا تھا یا پھر میرے یہاں ٹھہرنا گوارا انہیں کیا تھا۔
اس قدر غیریت برتنے کی کیا ضرورت تھی جتنو۔ خیر یہ بتاؤ کہ کس ہوٹل میں قیام ہے تمہارا“ شعب منصور نے گکڑا
کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہوٹل کا نام تو مجھے معلوم نہیں تھیلے اکا البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ ہوٹل کینٹ اسٹیشن کے علاقے میں ہی
واقع ہے“ فاخرہ کی بات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہوٹل کا نام نہیں بتانا چاہا رہیں“

”عجب ہے تمہیں ہوٹل کا نام تک معلوم نہیں۔ یہ کیوں کہ تم بتانا نہیں چاہا رہیں“ شعب منصور بڑا مان جانے کے
سے انداز میں بولے۔

”لیکن تھیلے اکا ہوٹل کا نام معلوم کر کے آپ کیا کریں گے۔ جبکہ تو شعب منصور ان کی بات کا ٹکڑا کر لولے۔

”واہ یہ یہی تم نے خوب کہا کہ کیا کریں گے معلوم کر کے۔ ارے سمجھی میں تمہارا پتا معلوم کر کے کم از کم تمہیں لینے تو
آجاؤں گا۔ کیونکہ میں تو یہ گوارا ہی نہیں کر سکتا کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں قیام کرو“

”لیکن ہمارے نزدیک یہاں یا آپ کے یہاں رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تھیلے اکا۔ آپ تو یہ بتائے کہ سب
غیریت سے تو ہیں نا اور وہ ہماری بٹیا کی ہیں“ فاخرہ نے اپنے بچے کی بات گول کر کے سب کی غیریت پوچھنے کے
ساتھ ساتھ سلوط کا حال احوال پوچھا تو شعب منصور سمجھے کہ وہ ناز پرور کی غیریت پوچھ رہی ہیں۔ خوش ہو کر بولے۔

”بس خدا کے فضل سے بڑے مڑے میں ہیں۔ پتہ بھی بڑا صحت مند اور پیارا پیارا سا ہے ان کا۔ اور کہیں بہت
یاد کرتی ہیں۔ عرصہ بھی تو ہو گیا تم سے ملے“

”ہاں خدا سب کو خوش ہی رکھے۔ لیکن میں سلوط کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ تین ماہ کا کہہ کر گئے تھے کوڑیڑا
سال کا عرصہ لگ گیا دلہن میں۔ بیچاری بچی تو ہمیں روپیٹ کر بیٹھ گئی۔ ہوگی“ شعب منصور تو فاخرہ کی آواز
سن کر ہی سمجھ گئے تھے کہ اب وہ سلوط کو ضرور پوچھیں گی۔ اور وہی ہوا بھی۔ انہوں نے سٹپنا کر زینت کی طرف دیکھا
جو نہایت بیزاری کے عالم میں ان کے قریب ہی بیٹھی آنکھوں کو پٹیٹا کر اور جمانیاں لے کر اپنی نیند اور دھن کا اظہار
کر رہی تھیں۔ شعب منصور نے ماؤٹھ پس کر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے ان سے کہا۔

”سلوط کو پوچھ رہی ہیں۔ اب میں ان سے کیا کہوں“ اور زینت جن کے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ وہ
شوہر کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔ کہ کہیں بھی کیا۔ فاخرہ کی آواز سن کر تو خود ان کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

”ہیلو۔ ہیلو۔ تھیلے اکا“ اپنے سوال کے جواب میں۔ بھائی کو خاموش دیکھ کر فاخرہ نے ہیلو بھوکا تو شعب
منصور جلدی سے بولے۔

”ہاں ہاں ہیلو۔ سلوط بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں“

”اچھا تو ذرا اس کو بلانے تو کم از کم میں اپنی بہاں موجودگی کی خوشخبری تو اسے سنا دوں۔ فاخرہ نے بڑا اشتیاق
دکھاتے ہوئے کہا۔ اور ان کی اس بات پر شعب منصور بالکل ہی ہلکھلا گئے۔ متوک نکل کر بولے۔

”سلوط کو اس وقت بلواؤں۔ وقت بھی معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ۔ اور اس وقت
وہ اپنے کمرے میں پڑی گہری نیند سو رہی ہیں۔ بھلا ان کی نیند میں خلل ڈالنا بھی کوئی معقولیت ہوگی“

”نہیں تھیلے اکا اب اس کی نیند میں خلل پڑے یا وہ بے آرام ہو۔ آپ اسے بلوایں لیجیے۔ مجھے اس سے ایک بہت
ہی اہم بات بھی پوچھنی ہے“ فاخرہ نے ہٹیلے سے لہجے میں کہا تو شعب منصور پھر ماؤٹھ پس پر ہاتھ رکھ کر بیوی سے بولے

”لیجیے اب تو آپ ہی گئی ہماری شامت۔ فاخرہ بی سلوط سے فون پر بات کرنا چاہا رہی ہیں“

”تو پھر میں کیا کروں میری تو خود بھی کچھ کچھ میں نہیں آرا“ زینت بیزاری سے بولیں۔

”ارے سمجھی تو ایسی جلدی کیا ہے۔ کوئی اہم بات بھی کرنی ہے تو کل۔۔۔ یہاں آکر کہ لینا۔ اس وقت آدمی رات
کو یہ بچوں کی سی مندر کے کیوں خواہ مخواہ اس غریب کو پریشان کرنا چاہا رہی ہو“ شعب منصور نے زینت کی پوری

بات بھی نہیں سنی اور خود ہی بات بنادی۔

”تھیلے اکا۔ کم از کم میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی جیسے کہ آپ نظر آ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی غلط بیانی پر انسوس
ہی نہیں ہو رہا بلکہ رونامی آ رہا ہے“ فاخرہ نے ایک دم ہی پینتہ بدل کر کہا۔ تو جواب میں کچھ دیر کے لیے شعب منصور

بغل میں جھانکنے لگے۔ اصل میں تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ فاخرہ سلوط کی گمشدگی کو جتنا ہی ہیں یا پھر اس کو نہ بولنے
پر طنز کر رہی ہیں۔ وہ بکلا کر بولے۔

”تم۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو“

”میں کیا کہنا چاہوں گی تھیلے اکا۔ آپ نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں رکھا۔ بڑے مان سے آپ پر پھر وسا کر کے بلکہ
امانتا اس بچی کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اور خط میں بھی پوری تفصیل سے آپ کو اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ بیٹک
لکھ دیا تھا کہ انڈیا سے واپسی پر آپ کا سارا حساب بٹکا دوں گی۔ اس کے باوجود بھی آپ نے اسے بوجھ سمجھا۔ اور اسے گھر

سے نکال باہر کیا۔ کیا سمجھا تھا آخر آپ لوگوں نے اسے لاوارث یا زخرد“

”ارے ارے ذرا مجھے بھی تو کچھ کہنے کا موقع دو۔ میں تو خود تم سے اس قدر شرمندہ ہوں کہ تمہیں اپنی شکل دکھانے کی
بھی ہمت نہیں رکھتا“ شعب منصور نے بہن کی بات کا ٹکڑا کر گویا اپنی صفائی میں کہنا چاہا۔ مگر فاخرہ تیز لہجے میں بولیں۔

”جھوڑیں تھیلے اکا شرمندگی و شرمندگی کو۔ سلوط کی گمشدگی اتنی معمولی بات نہیں کہ صرف شرمندگی کا اظہار کرتے
سے دھل جائے بلکہ تو اس کی عزت اور جان کا معاملہ ہے۔ آپ نے اسے گھر سے نکالتے وقت یہ نہیں سوچا کہ آخر

وہ جائے گی تو کہاں چلے گی۔ اور کچھ نہیں تو اپنے بیٹھو کی ہی حفاظت کر لیا ہوتا۔ وہ تو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہے۔
میری تو جان متقین کر رہی ہے انہوں نے مگر کچھ غلط تو نہیں کر رکھی۔ بھلا غضب خدا کا ان کی جوان بچی کو آپ نے نہیں

غائب کر دیا تو پھر وہ اپنا سارا عقد پھر پر ہی کر لیں گے آپ پر تو نہیں۔ آپ تو بڑی آسانی سے شرمندگی کا اظہار کر کے
بری الذمہ ہو گئے۔ بہن کی کھری کھری سنائے پر شعب منصور جھل سے ہو کر بولے۔

”ہاں ہاں تم ہر بات کہنے میں حق بجانب ہو جتنو مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے سلوط کو کبھی اپنی بیٹیوں سے کم نہیں
سمجھا۔ اور مجھے تو اصلاً یہ خبر نہ تھی کہ وہ کب گھر سے گئی تھی۔ وہ تو دوسرے دن صبح تمہاری بھابی جان کی زبانی ہی علم

ہوا تھا کہ وہ گذشتہ رات سے غائب ہے“

”کیوں کیا آپ راتوں کو گھر سے غائب رہتے ہیں جو آپ کو صبح کو معلوم ہوا تھا وہ بھی بھابی جان کی زبانی۔ تھیلے اکا
تعب ہے اس عمر میں آپ اس قدر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں“

”نہیں سمجھی غلط بیانی کیسی۔ جبکہ“

”غلط بیانی ایسی کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں نے آپ سے سلوط کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کرنے کے بجائے اوپر دھڑکے پڑتے رہے یا دوسرے معنوں میں مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے رہے کیا یہ غلط بیانی نہیں ہوئی؟“ ناخزہ نے حد درجہ صاف گوئی سے کام لے کر گویا بھائی کو قائل ہی نہیں شرمندہ کرنے کی غرض سے کہا۔

”ارے نہیں جتنو غلط بیانی کیسی۔ اصل میں میرا ہواؤ ہی نہیں پڑ رہا تھا تب میں اصل بات بتانے کا بھلا چھوٹے ہی تم سے کیسے یہ کہہ دیتا کہ“

”جی ہاں جی ہاں واقعی بہت مشکل کام ہوتا ہے سچ بولنا۔ ہواؤ کیسے پڑا سکتا تھا۔ جبکہ آپ نے خود ہی اس غریب کو دھکے دے کر گھر سے نکالا ہے۔ ورنہ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ آپ کے سامنے کسی کی عیال نہیں ہو سکتی تھی مگر میں نے اس کی طرف دیکھنے کی گھر سے نکالنا تو بڑی بات“

”افو۔ اب میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں جتنو۔ بس حلف اٹھانے کی کسر رہ گئی ہے تو میں حلف بھی کیا ہوں کہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کب اور کس وقت یہاں سے گئی تھی تب میں تو معلوم ہی ہے کہ میں صبح کالیا شام کو گھر آتا ہوں۔ یہ تنہا ہی بھائی جان ہی گھر میں رہتی ہیں۔ مگر انہیں بھی اگلے روز صبح کو ہی“

”ہاں تو آپ کو گھر بھلا مور سے کوئی دیکھی ہے نہ کسی بات کی پرواہ۔ اور آپ کی اسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھائی جان نے میری ساری کسر اس غریب سے نکالی ہو گی۔ یہ سارا کیا دھرا اصل میں اتنی کاہل ہے“

”نہیں نہیں یہ عُفن تنہا راجھال ہے۔ ورنہ انہیں تم سے ایسی کیا عصمت تھی جو وہ تنہا ہی ساری کسر اس غریب سے نکالیں؟“ شعیب منصور نے بیوی کی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہا۔

”اے بس تجھے اکا۔ اب میرا منہ نہ کھلوائے۔ بھائی جان نے تو ہمیشہ اور ہر معاملے میں میری کاٹ ہی کی ہے۔ آپ کے سامنے وہ ضرور سبکی ملی جی رہتی ہیں مگر دوسرے کے سامنے جو میرے لیے زہر الگ تھی ہیں وہ سب جوتنک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور تو اور میری برائی کرنے میں میرے میاں کو بھی نہیں بخشا انہوں نے۔ جب بھی انہیں میرے

میاں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے ہمیشہ انہیں ہی مشورہ دیا کہ عقد ثانی کر لیں۔ تاکہ آپ کا بھی کوئی وارث پیدا ہو جائے جو آپ کی نسل بھی چلا سکے اور آپ کی جائیداد کو بھی بچا سکے۔ جبکہ جائیداد کے نام کی ایک اینٹ بھی نہیں ہے حسن کے پاس۔ مگر وہی جس میں چنگاری ڈالنا لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ان کے آگے بھی میٹیاں ہیں اگر دوسرے پر ظلم کریں گی ان کے آگے بھی آئے گا۔“ زینت کے ذکر پر ناخزہ بھوک ہی اٹھیں۔

”خیر تم میری بیٹیوں کا ذکر تو درمیان میں نہ لاؤ۔ کیونکہ ان بے چاری بچیوں کو تو کوئی واسطہ ہی نہیں کسی بات سے البتہ جہاں تک میری بیوی کا سوال ہے تو تم بڑے شوق سے انہیں جتنا چاہو برا کہہ سکتی ہو۔“ شعیب منصور نے ناخزہ کی بات کو کوٹھنے پر محمول کرتے ہوئے اندر ہی اندر ہم کر کہا۔ تو زینت جن کے کان ان کی گفتگو پر گئے ہوئے تھے تڑخ کر بولیں۔

”ارے واہ وہی مثل ہے کہ غریب کی جو رو سب کی بھائی۔ یعنی میں اتنی گنی گزری ہوں کہ چھوٹی نندہ جو جی چاہے مجھے کہہ لے“ مگر ناخزہ نے شعیب منصور کو ان کی بات کا جواب دینے کا بھی موقع نہیں دیا۔

”لیکن میں ان کو کیوں برا کہوں۔ سلوط کے معاملے میں تو میں آپ کو قصور وار سمجھتی ہوں۔ کیونکہ آپ کی غفلت اور لاپرواہی کے نتیجے میں یہی یہ کچھ ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ اسے اپنی بیوی اور بچوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس کی طرف سے بالکل ہی بری الذمہ ہو گئے ہوں گے۔ اور بھائی جان کی بن آئی ہو گی۔ میں سب جانتی ہوں۔ انہیں تو اگر میرے گھر کا پالتو کتا بھی مل جائے تو وہ اسے زہر کھلا کر مار ڈالیں۔ خیر تجھے اکا۔“

”خیر میں نے غرض نہیں۔ میں تو صرف آپ کو جانتی ہوں۔ اب آپ ہی کو اسے سلاش کر کے دینا ہوگا۔ ورنہ یہ سچہ لیجیے کہ میں اپنے نام کی ایک ہوں۔ اگر سلوط نہ ملے تو میں اپنی اور سب کی جان ایک کر کے رکھ دوں گی۔“

ارے آپ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ مجھ کو کھانے والا سے خرو کی سب کتنی اذیتیں برداشت کر کے تینتیس برس کا بن کاٹا ہے۔ کیونکہ اپنا دامن بچا بچا کر اپنی ازدواجی زندگی کے پتے ہونے والے گزرتی

رہی ہوں۔ اس پر بھی کچھ معلوم ہے آپ کو کہ میرے میاں عقد ثانی کر کے ہی رہے۔ ارے میرے بھیا کبھی آپ نے پلٹ کر میری خبر لی کبھی یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میری بہن کیسا عذاب بھگت رہی ہے اپنی ایک خرومی اور خافی کا۔ نہیں نہیں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ پرانے گھر جا کر لڑکی بھی پرائی ہو جاتی ہے ناسا سے سارے رشتے ناتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آپ کی کوئی آٹھ دس بہنیں تھیں۔ صرف ایک بہن ہی تو تھی۔ مگر۔ مگر۔ مگر

سے آگے اشک ان کی آواز پر غالب آگئے۔ اور وہ رونے لگیں۔ بہن کی باتیں سن کر شعیب منصور ان کی بے بسی پر تنہا سے اٹھے۔

”نہیں نہیں تم روؤ نہیں جتنو۔ دیکھو مجھے صرف ہونٹ کا نام بتا دو تاکہ مجھے کم از کم تنہا رہے میاں سے تو صفائی کرنے کا موقع ملے۔ مگر ناخزہ نے جواب دینے کے بجائے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور شعیب منصور ہلو ہلو ہی کہتے رہ گئے۔

”لو مجھ احمق لڑکی سے پتا بتانے کے بجائے فون ہی ڈسکلیٹ کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے بڑے وقت کے عالم میں ریسور کو کرڈل میں پختے ہونے کہا۔ زینت تو ان کی بات پر پہلے ہی جلی بیٹھی تھیں۔ طنز یہ سے انداز میں ہنس کر بولیں۔

”واہ لڑکی بھی خوب کہا آپ نے۔ اب ڈھلتی ہوئی عروں کی عورتیں بھی آپ کی نظریں لڑکیاں ہونے لگیں۔“ لیکن یہاں معاملہ عورتوں کا نہیں صرف ناخزہ کا ہے۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے بوڑھی بھی ہو جائے گی تو میری نظریں چھوٹی ہی رہے گی۔ لیکن تم اتنی جیس کون بوڑھی ہو تم تو پیر بھی عمریں اس سے دس گیارہ برس بڑی ہو“

شعیب منصور نے ان کے طنز کا جواب طنز ہی سے دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں تو آپ کی نظریں میرا سر سے بری ہوں۔ بوڑھی ہوں۔ جاہل ہوں۔ بد صورت ہوں۔ ساری خامیاں مجھ ہی میں ہیں۔ لو بھلا اب میری عمر کو بھی جتنا جاگئے گا۔ اے اگر مجھ میں اتنے عیب تھے تو پھر آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی؟“ شوہر کے عمر جتنے پر زینت تھلائی اٹھیں۔

”بس غلطی سے کر لی تھی۔ مگر تم تو میرے لیے سانپ کی بھچو نہ رہی ثابت ہو میں جو نکلتے نہیں نہ اگلتے“ شعیب منصور نے جن کا دل ناخزہ کی باتوں سے دکھ سا رہا تھا نہایت ناگواری سے کہا۔ اور ان کے چھوچھو کی مثال دینے پر تو زینت سلگ ہی اٹھیں۔

”افو بھچو نہ رہ۔ یعنی اب میں آپ کی نظریں چھوچھو نہ رہوں گی۔ عُفن میں وہ صرف یہی کہہ سکیں۔“ ہاں میں نے تو صرف چھوچھو نہ رہی کہا ہے جبکہ تم تو اس سے بھی زیادہ سننے کی مستحق ہو۔ وہ بزرگوں کی اصطلاح میں ادھر ادھر لگائی بھائی کرنے۔ دلوں میں نفاق ڈالنے اور جھگڑے کرانے والیوں کے لیے جو ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پرنے اسی ٹاپ کی عورتوں کو بھی مات کر دیا ہے“

”ہیں یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں کتنی بھی ہوں کتنی۔“ زینت نے اتنی بڑی بات کہہ جانے پر انکھیں پھاڑ کر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ جبکہ ان کے لمبے میں غصہ اور کسبائٹ بھی شامل تھی۔

”اب تم خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہو تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ شعیب منصور نے گویا یہ کہہ کر ان کے دل پر ایک اور چرکا لگا دیا۔

”اچھا اچھا۔ میں کتنی ہوں چھوچھو نہ رہوں۔ گویا سارے عیب مجھ میں ہی ہیں۔ واہ واہ یہ صلہ دیا ہے آپ نے وفا داری اور جانفشانی کا یہ غم عُفن کی زیادتی سے زینت کی انکھیں جھلک اٹھیں۔

”ہاں بس۔“ مجھے زیادہ عُفن نہ دلاؤ۔ اور نہ روکر مجھے ڈرانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ عورت کا آخری حربہ ہوتا ہے کہ جب اس کی اصلیت کھل کر سامنے آتی ہے تو اپنے دفاع کے طور پر اسی طرح ٹھوسے بہانے لگتی ہے جیسے کہ اس وقت تم بہا رہی ہو۔ مگر میرا دماغ اس وقت بالکل شکستہ نہیں ہے تنہا رہے لیجئے بہن

ہوگا کہ خاموشی سے پڑ کر سو جاؤ۔“ میاں نے ان کی گریہ نازی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی بلکہ ایک طرح انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ زینت اپنے انسو پونچھ کر کچھ زیادہ ہی طیش میں آکر بولیں۔

”نہیں میں آپ کی دہلی ہوں نہ حکم کی بندی۔ جو آپ کے اشاروں پر ناچوں گی۔ میں تو خاموش رہوں گی نہ سوئوں گی۔ بلکہ آپ کے عاید کردہ رکیک الزامات کا آپ سے جواب طلب کر کے ہی دم لوں گی“ تب شاید زندگی میں پہلی بار شعیب منصور بھی شیش میں آگئے۔ ابھی تک تو وہ ان کے قریب ہی بیٹھے تھے مگر اب غصے میں کھڑے ہو کر بولے۔

”دیکھو زینت، میں نے کہا تھا کہ اس وقت میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ کسی کا باپ بھی مجھ سے اس وقت کوئی جمل طلب کرے گا تو میں اس سے بھی سہی ہوں گا جو تم سے کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اور اب تک تو میں تمہاری عزت کرتا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر تو انہوں نے زینت کے تن بدن میں آگ ہی لگا دی تھی۔ لیکن ایک تودہ کبھی اس قدر طیش میں نہیں آئے تھے۔ نہ ایسی اہانت آمیز زبان ہی بولی تھی۔ دوسرے کسی کا باپ پس پردہ انہوں نے انہی کے باپ کو کہا تھا۔ دوسرے عزت کو برقرار رکھنے کی تنبیہ بھی کی تھی۔ اس لیے سخت غصے کے باوجود زینت کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ کیوں روکے موڈ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ شوہر کے موڈ کا۔

جو احساس برز می میں ڈوب کر بعض اوقات عورت پر تشدد کرنے سے بھی نہیں بچتا۔ اور پھر اس کے پاس چار حروف پر مشتمل الفاظ کا وہ سب سے خطرناک اور تباہ کن ہتھیار بھی ہوتا ہے جو بل کے بل میں ایک لسنے اہم مضبوط اور پائیدار رشتے کو یوں کاٹ کر رکھ دیتا ہے جیسے گندے لے کی ایک ضرب کسی پٹری کی شان کو اس کے جوائنٹ سے کاٹ دیتی ہے۔ اور ایک عزت دار اور وفادار عورت خواہ شوہر پر کتنی ہی حاوی کیوں نہ ہو اب اس بات سے تو ڈرتی ہے لیکن زینت اب اتنی بھی بے قصور نہیں بلکہ خود ان کا اپنا ضمیر بھی مجرم تھا۔ اصل میں تو سلوط کو گھر سے نکلنے میں ان کا ہی ہاتھ تھا۔

اس پر انہوں نے سلوط کے ساتھ کچھ ایسا سوکھ روار کہا تھا جیسا کہ عمو گھر کی پردہ لڑکیوں سے رکھا جاتا ہے۔ جبکہ فافہ اور ان کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک چپقلش سی قائم تھی۔

لیکن سلوط کو نا پسند کرنے کا سبب فافہ سے کہیں گ نہیں بلکہ سلوط کا فن بے مثال تھا۔ وہ سلیقہ، وہ لکھ لکھا، وہ سادگی اور انکسار تھا جو ان کی بیٹیوں میں مفقود تھا اور پھر یہ قسمتی سے بالکل بے مایہ اور بے آرا تھی جبکہ زینت حیثیت کی بگاری تھیں۔ ان کے حلقہ احباب میں صرف ادب صرف ممتول طیف شامل تھا اور وہ خود بھی ممتول اور تو گھر تھیں۔ بس سلوط اسی معاملے میں ان سے مات کھا گئی تھی۔ اور اس کی اسی کمزوری کی وجہ سے وہ اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ لیکن جہاں تک اسفندی شادی کا سوال تھا۔ تو وہی کیا، کوئی اور مان بھی ہوتی تو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی جس کے بارے میں اس نے بہت ساری غلط باتیں سنی ہوتیں اور جو کسی دوسرے مرد کی ملکیت ہوتی۔ بہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن ان سے یہ غلطی ہو گئی کہ انہوں نے اپنے حسد اور حیل میں بہت ہی غلط انداز میں بلکہ دوسرے معنوں میں اسفندی کو اس کے خلاف بھڑکایا اور غلاپاٹھا۔ ورنہ یہی باتیں وہ رسائی سے لے کر بھانجا کر کہتیں تو ایسی نوبت کبھی نہ آتی جواب آگئی تھی۔

بہر حال شوہر کی دھمکی پر وہ خاموش تو ہو گئی تھیں۔ مگر منہ ہی منہ میں برابر بڑبڑاتے جا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ بیٹے کے بعد بھی بڑبڑاتی رہیں۔

”یہ بڑبڑانا بیچیت کی نہیں لونڈی کی عادت ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنا منہ نہ نہیں کر سکتیں تو پھر نوک دوم میں جا کر سو جانا ہوں۔ واہ، یہ تو ہی شہل ہوئی کہ چوری اور سینہ ندری۔ کوئی ایک بات بھی تو ایسی نہیں پھڑکی جس میں نفاق کی قینچی نہیں چلائی ہو آپ نے۔ حتیٰ کہ میری بھی کے خلاف میرے بہنوئی کو بھی وغرلے سے۔ نہیں چلیں آپ۔ اور پھر اس سے چاری بچتی ہے جیسا سوکھ روار کہا، اس سے بھی میں بے قرب نہیں ہوں۔ اسے آپ سے ہی سنی کو بھڑکا کر گھر سے نکلوا دیے۔ غراب فافہ کی تو آہی گئی ہیں۔ ان کے اور آپ کی جوان جوان اولادوں کے سامنے آپ کی شخصیت پر چڑے دینا دکا کے خوبصورت پرت آئیں گے تو سب خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ آپ کس قدر شاطر و ظریف کی مالک ہیں۔ بھوی کو منگ کر کے شعیب منصور خود بھی بڑبڑانے کے سے انداز میں کہتے سہے مگر زینت نے ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

خاموش پڑی مڑی تھری سے آفسو بہاتی رہیں۔

جانے کتنی دیر اور کب تک۔ شعیب منصور تو کچھ دیر کے بعد معلوم کیا کیا سوچنے کے بعد پڑ کر سو گئے تھے۔

پھوپھا اور پھوپھی کو اپنی کار سوچنے کے بعد ارستے میں ہی ایک جگہ کار سے اتر کر اسفندی کا دل تو بہی چاہ رہا تھا کہ۔

سیدھا اسی ہوٹل میں پہنچ جلتے جہاں پھوپھا اور پھوپھی کو گھبراہٹ سے اور وہاں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کر کے سلوط

کو پھوپھا کی بیٹی کے روپ میں دیکھنے کا اسفندی کو بہت شوق ہو رہا تھا۔

یوں بھی دل تھا کہ اسے دیکھنے کو بجلا جا رہا تھا۔ ٹرپا جا رہا تھا۔

مگر پھر اس نے سوچا کہ پھوپھا کے انتظار میں پہلے سے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جانا کچھ مناسب نہیں۔ بجلا پھوپھا اور

پھوپھی کیا سوچیں گے کہ میں سلوط کو دیکھنے کے لیے اتنا دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اور پھر خود سلوط بھی مجھے دیکھ کر معلوم کیسا

رویہ اختیار کرے۔ کہیں پھوپھا جان کے سامنے ہی ایسی کوئی بات نہ کہہ دے جس سے مجھے مذمت کا سامنا کرنا پڑے۔

یہ جس سے میری اہانت ہو۔

بس یہی سب کچھ کہنے وہ جذبات شوق کو بڑی سختی سے دل کے اندر ہی گھونٹ کر۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں واپس آگیا۔

جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

تھے ہی کوئلہ کافی کا آؤر دیا۔ اور پھر ٹی وی پر چلنے والی ایک لیٹ ٹائٹ انگلش مووی دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ

فلم دیکھتا رہا پھر اٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ اور لیٹر پر لیٹ گیا۔ اس روز تقریباً تمام دن وہ گھومتا پھرتا رہا تھا۔ اس لیے بہت

تھک گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی بڑی دیر تک اسے نیند نہیں آتی تھی۔

وہ سارا دن سلوط کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔

کہ پھوپھا اور پھوپھی کی غیر متوقع آمد سے اسے تعجب تو بہت ہوا ہوگا۔ اور وہ کس طرح بک کر ان کے گلے لگی

ہوگی۔

ردنی بھی ہوگی اور خوش بھی ہوئی ہوگی۔

اور جب اسے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ وہ پھوپھا کی بہن نہیں بیٹی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا ہوگا۔

پھر سلوط کے حسین ترچے سے چھوٹے دھنک رنگ لے آئیں انہوں میں جھللاتے نظر آنے لگے۔

وہ بڑی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسی کے تصور میں کھویا رہا۔ اس کے خیالوں پر غراؤں پر سلوط ہی بھائی

رہی۔ حتیٰ کہ اس کی بند آنکھوں کے اندر بھی اسی کی شبیہ تیرتی رہی۔ دیر سے سویا تھا پھر بھی بہت سویرے اس کی

آنکھ کھل گئی۔ جانے کیسی بے کلمی تھی، وہ تو شاید سویا ہی بے کلم بے کلم تھا۔ نہ نہیں کیسے نوکے تک کا وقت گاتا تھا۔

حالانکہ تیار تو آتھ جیسے سے ہی ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر یہی سوچ کر کہ ابھی تو پھوپھا پھوپھا۔ آتھے بھی نہیں ہوں گے۔ وہ

نوکے تک انتظار کی صلیب پر چڑھا رہا تھا۔ یوں بھی چونکہ اس کی کار پھوپھا کے پاس تھی۔ اس لیے باہر نکل کر اسے

سواری بھی پکڑنی تھی۔ اور اس کے خیال میں سواری پکڑنے میں بھی کچھ وقت گاتا تھا۔ اس لیے نوکے ہوٹل سے نکلے کا وقت

اس نے مناسب سمجھا تھا۔

پھر وہ ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل پہنچا تو فافہ نے بڑے عجیب سے تاثرات کے ساتھ دروازہ کھولا اور اس کے سلام کے

جواب میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ سے بولیں۔

”آہستہ بولو اسفندی۔ تمہارے پھوپھا جان سو رہے ہیں۔ اور اس سے پہلے کہ وہ آہستہ سے ہی ان سے کچھ پوچھتا،

انہوں نے دروازے کے آگے ہی کھڑے کھڑے ٹکر کھڑے ہوئے شوہر پر ایک نظر ڈالی اور پھر حیرے سے بولیں۔

”آؤ ایسا کرتے ہیں کہ ہوٹل کی لابی یا لاونج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ یوں بھی میں نے اب تک یہ ہوٹل دیکھا بھی نہیں۔

اور اسفندی کا دل چاہتا ہے کہ آپ کو اس ہوٹل میں آئے بھی پورا ایک دن بھی نہیں ہوا۔ اور پھر یہ ہوٹل اتنا بڑا دیکھنے اور

دکھنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کوئی لابی تک نہیں ہے مگر وہ خاموش ہی رہا اور اسی خاموشی سے ان کے ساتھ

باہر نکل آیا۔ ان کے عجیب و غریب رویے اور باتوں سے اپنے نہیں اس نے یہی اندازہ لگا لیا کہ شاید سلوط نے انہیں دھوکا دیا ہوگا کہ مجھے کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔ یوں بھی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال ہوٹل میں ایک چھوٹا سا

”بڑی مشکل میں چھتا دیا ہے تم لوگوں نے سلوط کو لینے گھر سے نکال کر۔ یہ تو کہو کہ بہت غنیمت ہو اور جوہ یہیں مل جائیگی لیکن اس کے ملنے کا فائدہ یہی کیا ہو۔ بلکہ اعلیٰ میری شامت آگئی۔ اب تمہارے بچہ جیسا تم لوگوں کی شعلیں تک دیکھنے کے روادار نہیں رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم کسی سے ملو گی نہ میں ملوں گا۔ بلکہ اسفند کو بھی سختی سے منع کر دو کہ وہ یہاں نہ آئے۔ ورنہ میں ایسا کروں گا کہ تمہیں بھی اس کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔“ بچہ بھی کی ان سے رابطہ اور بے یقینی باتوں سے بھی اس نے یہی افکار کیا کہ ضرور سلوط نے یہی سب کے خلاف شکایت کی ہوگی۔ جو بچہ پھیلانے پر فیصلہ صادر کیا ہے۔ بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس نے پوچھا۔

ہنس چھوٹے سے بادلوں کی آواز پر چڑھا۔

”میں سمجھا نہیں چھوچھو کہ آخر آپ کہنا کیا جا رہی ہیں اور پھر جان آخر کس بات پر اتنے خفا ہیں جو سب کا بارگاہ کرنا چاہتے ہیں جبکہ اب تو انہیں سلوٹ کی طرف سے بھی کوئی پریشانی نہیں رہی“ تب فارخہ نے اسے سلوٹ کے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دینے بلکہ اس کے رویے اور فنگلو کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتادیا۔ حتیٰ کہ اپنے شوہر کے خیالات اور فیصلے کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا اور چھوچھو کی زبانی یہ ساری تفصیل سن کر اسفند کو یوں لگا جیسے وہ جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہو۔ اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ تھوڑی دیر گم صم سا بیٹھ رہا پھر چھوچھو کے پاس سے اٹھتا ہوا

بوللا۔

”اچھا، اب آپ اپنے روم میں چلیے پھیر بیٹھیں، یوں بھی یہ عام گزرگاہ ہے اور یہاں بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ اور فارغ بھی جیسے وہاں سے اٹھنا ہی چاہ رہی تھیں اس کے کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ انہیں ان کے کمرے کے دروازے پر پھونک کر یوں ان سے رخصت ہوا جیسے اپنا سب کچھ ہار کر جا رہا ہو۔

وہ فخر کو خدا حافظ کہہ کر سڑیاں اتارنے لگا۔ تو غصے کے نہیں بلکہ مسرت کو فت کے عالم میں مبتلا تھا۔ کیونکہ یہ بھیجی کی فطرت کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

یہ تو اسے معلوم تھا کہ جو پانچ فطریاتی خشک مزاج کے گواہ کر دے قسم کے انسان ہیں اور ان کے بارے میں یہ بات محض سنی ہی نہیں تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کر چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ بچے اس بھرے بھرے سے مزاج میں ایک خوش گوار قسم کی تبدیلی میں صرف سلوٹ کی وجہ سے آتی تھی کہ انتہائی مایوس کن حالات میں سلوٹ سے کھل جانے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ ورنہ کہاں وہ اور کہاں اس قدر شکستہ انداز گفتگو اور پکپکا اور اب سلوٹ نے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا تو اس کے پاس کے گھر والوں کی وجہ سے تو نہیں کیا تھا۔ ظاہر تھا کہ کچھ ای اور بھائی کی زیادتیوں اور کوتاہیوں سے مدد دہر دل برداشتہ اور بدظن ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن وہ سرا قاصد ہمارے سرخوب رہے جس کی کوئی قلعی تک قطع کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ انہیں شاید معلوم تھیں کہ اگرچہ ان کو اپنے سنگھبی بیگنہ سے ملنے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کو قلعی قطع کرنے کی دھمکی دیتا ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ جلد کر لےنا نہیں چاہئے تو نہ ہی تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش۔ کوئی باسی کی کسی کو بدواہی نہیں ہوتی۔ خصوصاً کراچی میں تو یہ بے ثباتی عام ہے کہ ٹپے ہوئے عمریہ گورجائے تو اپنی اپنی مصروفیات میں ایک دوسرے کو بلٹ کر لوچھا ہی نہیں جاتا کیونکہ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ اور میں نے تو ان ان پر احسان کیلئے۔

سلوٹ کو ڈھونڈ کر دیا ہے۔

ان سے ملو ایسے ۔

اس کے باوجود بھی پھوپھا جان نے میرا ذرا نہ ڈرنا، وہ بچے انکو سوار کی کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اپنے ان خیالات میں ایسا سمجھتا کہ بھول گیا تھا کہ کیوں کھڑا ہے جب کہ خانی ماریاں اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں اور ابھی وہ اسی قدر سوچ سکا تھا کہ کبھی ایک کار اس کے اتنے قریب آ کر کرے کہ اگر وہ اچھل کر بچے نہ پھٹ جاتا تو یقیناً اس کا پر کار کے اگلے پہیے سے نیچے آ جاتا۔ ایک دم دل کو دوچھکائی لگتا تھا اور ظاہر تھا اسے کار چلائے والے کی اس بے ہودگی پر سخت غصہ بھی آتا تھا۔ اس بد تمیزی پر بال بلبل ہو کر اس نے جو نیچے چلائے والے کی طرف دیکھا۔ تو یوں لگا جیسے سائنس دان کی یہی اس ایک کہ وہ گلوبو کو کنڈرا ٹوئنگ میٹ پر لپکا ہے، شفق سی مسکا رہا ہے اس کی طرف و جھو رہے تھے۔ اس کی وی مثل ہو گئی کہ نہ جاتے

رفیق نہ پائے مائدہ۔ کہ نہ ان سے چھپ سکتا تھا نہ وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ زمین نے بھی جیسے قدم پکڑ لیے تھے اور وہیں پر جبر کر رہ گیا تھا۔ یوں جیسے رینگے مائتول پکڑا گیا ہو۔

مذکورہ تھی کہ باب کو سلام تک کرنا بھول گیا تھا۔ شعیب مضمون خود ہی دروازہ کھول کر باہر اترے اور اس کے نزدیک آکر بولے۔

”جیلو ہوا تو بس، جلوا چھاپا ہی ہوا کہ تم گلے ورنے مجھے نہ جانے اور کتنے ہولوں کی خاک چھانی ہر بڑی کیسے نہ فاخر
نے غصے میں کچھ تیرا ہی نہیں تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے تم اپنی سے شے لے کر ہو۔“ باپ کی باتوں سے اسے یہ تو
اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ بچے نے اسے ایک فن کے ذریعے ہی کیسائی حاصل کر لی ہے۔ وہ نیچے گئے سے اندازیں بولا۔
”جی ہاں مگر آپا ہوں نہیں آیا تھا ڈیڑی۔“

”خیر، ایک ہی بات ہے مگر وہ دونوں میں کس روم میں :- چلو آؤ مجھے کم از کم ان کے کمرے تک تو پہنچاؤ۔
شعب منصور میں سے ملنے کی تمہاری سی بے تانی دکھائے ہوئے لولے۔

”نہیں ڈیڑی، آپ اب اس سے نرمی ملیں تو میرے کہہ دینے پر یہاں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ میرے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ دوسرے معنوں میں وہ ہراری صورتیں دیکھنے سے بھی روا دار نہیں ہیں تو ان حالات میں آپ کا ان کے پاس جانا _____ آپ کے دھار کے منافی ہی ہو گا۔ اسفند نے انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

خیر اگر وہ روادار نہیں تو میں اپنی بہن سے ملنے آیا ہوں۔ میرے سلسلے ان کی مجال نہیں ہو سکتی کہ مجھے اپنی بہن سے ملنے سے روکیں۔ ارے بھئی! اگر ایک نالائق ہو تو ضرور یہ نہیں کہ دوسرا بھی ہو جائے۔ چلو۔ تم نے کسی طرح ان کے پاس تو لے چلو۔" ضعیف مندوہ نے اپنے کاتوں کو کوئی اہمیت بھی نہیں دی۔

”نہیں دیکھی! اصل میں آپ کو معلوم نہیں کہ حالات کتنی سنگینی اختیار کر چکے ہیں۔ سلو واطی بھی ہیں تو انہوں نے کھو بھا جان کے ساتھ اسے رکارڈ کر دے۔ بلکہ وہ تو کسی رشتے کی اہمیت کو گردان ہی نہیں رہیں۔“

ہائیں۔ وہاں ٹو لو مین، چند آدمی، بیٹھ کر وہاں لب سڑک اور وہ بھی ایک پبلک پلیس پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔“ شعیب منصور نے سوطو کا ذکر سن کر جلدی سے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ شعیب منصور بھی جلدی سے گھر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھ گئے۔

”ہاں، اب تبادلو کا کہہ رہے تھے تم“ انہوں نے ایک نظر اس برڈوال کر لیا تھا۔ تب اس نے ابھی وہ — ساری باتیں تبادلو جو سولو کے متعلق ناخارہ سے سُن کر اُٹھتا اور یہ بھی کہ اسی غصے میں بیٹھو، دھاڑے سے بھی ہر تعلق قطع کر کے ہیں۔

لیکن یہ تم نے نہیں بتایا کہ سلوٹو انہیں ملی کیسے جاو رہا ہے یہاں کیسے کٹے اور ہاں تمہاری ان سے کیونکر ملاقات ہو گی! جب کہ کمرے سے کہہ کر گئے کہ تم زندان جا رہے ہو۔ جبر خدا مال جان کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے

ان کے خطے معلوم ہو گیا تھا کہ غم بہاں سے لندن نہیں ملتا ان کے لئے n باب نے ایک ساتھ کئی سوالات کو دے
اردو و جوان برہنہ نظر نہیں کرنا چاہا رہا تھا کہ وہ نظر ہو تو دھوا دم گھوٹنے پھر سے ہی نکلا تھا گیس کا اصل مقصد

سلووا کو ہی تلاش کرنا تھا اور یہ مقصد اس برس وقت واضح ہوا تھا جب شیر محمد کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے پید ہوا لاہوری سی موجود ہیں۔ اس نے باپ کو بھی بتا دیا کہ لاہور کے مولیٰ جس دوست کے مکان میں منتقل ہوا تھا۔

وہ اتفاق سے وہی مکان تھا جس کے پورٹن میں کبھی بیٹو بکھرا رہا کرتے تھے مگر پھر انڈیا سے واپسی پر انہوں نے شیو پورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اس گھر میں وہ بیڑ ٹھکانے پر یہ بیچھوڑے ملنے لگا تھا، اور وہ اس نے ہی نہیں سولہ کے

اجانک لپٹا ہو جانے کے بارے میں بتایا تھا اور ان کے اس سوال کے جواب میں سلوٹو جو پوچھا کہ کیسے مل گئی تھی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ سلوٹو نے خود خط کے ذریعے انہیں اپنا بتا دیا تھا۔ ایسا لگن اور کھون کا ذکر نوڈ گولی کر گئے تھے۔

”وہ! یہ تو ابھی اچھا ہوا کہ سلووا نہیں مل گئی۔ پھر وہ کس بات کا تہیابہیں دکھا رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ وہ ناخرہ

نی سے کسی بات کا بدلہ لے رہے ہوں گے۔ خیر میرے ساتھ تو چلو۔
 "لیکن میں جا کر کیا کروں گا ڈیڑی۔ البتہ آپ کو ان کا رد میں آئے دیتا ہوں۔" اسفند گویا ان کے ساتھ جھانسنے سے انکار کرتا ہوا بولا۔

"خیر چلو ہی سہی۔ لیکن مجھے ان کے روم میں چور بزم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں بہت کرنی آوارہ گردی کچھ معلوم بھی ہے۔
 کہ تمہارے چپکے سے چلے جانے پر تمہاری مٹی سے اپنا کیا ہڈہ بنالیا ہے۔ اگر اپنے باپ کا نہیں تو کم از کم اس دھمی ماں کا تو خیال کرو۔" شعیب منصور نے اترنے سے پہلے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تغیب ہے میرے چلے آئے تو مٹی کی حالت غیر بوری ہے اور انہوں نے جو ایک جوان لڑکی کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اس پر انہیں تھوڑا سا بھی ملال نہیں ہوا۔" اسفند نے ایک زہر خند سے کہا۔

"نہیں ہوا کیوں نہیں بلکہ بہت ہوا ہے لیکن وہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتی اور کسی بیٹے میں مانتا ہوں کہ انہوں نے ذرا غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔ انہیں تمہاری ضد سے باز رکھنے کے لیے۔ لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی غلطی پر نہیں تھیں۔ کیونکہ وہی کساد نیکی کوئی ماں بھی یہ پسند نہیں کرتی کہ اس کا اکلوتا بیٹا ایک ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے۔ جو کسی دھبہ پر کھل میں ہو۔ مذہباً بھی ایسی شادی جائز ہی نہیں۔" شعیب منصور ماں کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی غرض سے بولے لیکن پھر غلط بھی نہیں بولے۔ اور وہ بھی یہ سوچ کر کہ ساری غلطی اور زبانی اسی کی تھی، اس معاملے میں کچھ متنبی بولے۔

"میرے خیال میں یہ بات تو تم کو بھی معلوم ہوگی۔" شعیب منصور نے لمبے خاموش دیکھ کر کہا۔
 "جی ہاں۔ معلوم تو ہے لیکن سلوٹ کے واسطے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ مگر تیرا آپ تو انہیں غلط بھی مل گئی ہے۔ چھو بھاجان اور پھوپھو یکدم ہی فیصلہ کرانے تو انہیں لگے تھے۔ لیکن وہ شخص کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چھو بھاجان کو داپسی میں آئی ویر بونٹی تھی لیکن چھو بھاجان نے دیر سویر کی پروا نہیں کی۔ اور نہ صرف طلاق دلوانی بلکہ انکوں کے زیورات جو دونوں طرف سے سلوٹ کو شادی کے موقع پر پرے تھے اور پانچ لاکھ نقد مہر کے وصول کر کے ہی سہے، پھر بھی چھو بھاجان کا ہاون لاکھ روپیہ نہ شخص مہم کر گیا۔ بڑن بارنہ رشپ تھی نا اس کے ساتھ۔" مہر کی رقم اور زیورات کی بات اسفند نے محض باپ کی نظروں میں سلوٹ کی اہمیت پر اصرار سے بتائی تھی اور پانچ لاکھ نقد اور نصف کروڑ کے بارے میں سن کر شعیب منصور بھی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہے۔

"اوہ دیری امیزنگ (بہت تعجب خیز)؟ انہوں نے حدود مجھے متاثر ہو کر کہا
 "جی ہاں اور اس سے زیادہ امیزنگ ہے کہ سلوٹ چھو بھاجان کی بہن نہیں بلکہ بیٹی ہیں۔" اس نے تھوڑا سا مسکرا کر بتایا تو شعیب منصور سوج بوج اچھل پڑے۔

"ہاں آریو کڈنگ (تم مذاق تو نہیں کر رہے)؟ انہوں نے بڑے سخت اچھنے کی لپیٹ میں آکر پوچھا۔ تب مختصر افغان میں ہی اسفند نے انہیں ناشتہ کی زبانی سنا ہوا سارا واقعہ سنایا تو شعیب منصور کو فاخرہ کی اس بات پر یقین کہ لینا ہی پڑا جو انہوں نے ثابت جس کے عقد ثانی کرنے کے بارے میں بتائی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹوہ بھی سمجھ رہے تھے کہ ابی ایک بہت بڑی عروسی کی وجہ سے فاخرہ میاں کی طرف سے شک و شبہات کا شکار ہو گئی ہیں۔

دونوں باپ بیٹے اب تک کاربار رنگ میں کھڑی کاری میں بیٹھے تھے اور انہیں کار میں بیٹھے کم دیش آدھا کھنڈ ہو گیا تھا۔ اور شعیب منصور بیٹے کی زبانی سننے سے انکشافات سن کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

"لو ڈیڑی بعض اوقات انسان کی قسمت کچھ اتنے حیرت انگیز طور پر پڑتا کھاتی ہے کہ عقل و نگ ہو کر رہ جاتی ہے؟ غائب اسفند نے یہ بات باپ کے آریو کڈنگ کہنے کے جواب میں کہی تھی۔ مگر شعیب منصور نے شاید سنی نہیں۔ اپنی سوچ سے نکل کر بولے۔

"لیکن یہ سلوٹ آخر کس کے یہاں ٹھہری ہوئی ہے کیا تم بھی وہاں گئے ہو؟
 "نہیں میں تو باقی کیا لیکن ان کا پتہ ضرور جانتا ہوں۔ اصل میں وہ کوئی مذہب ہے جو نرسی کے ایک کلینک میں کام کرتی ہے۔ اسی کے یہاں رہ رہی ہیں وہ آج کل۔" اسفند نے کہا۔ تو شعیب منصور نے اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے کار کو

ریورس دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تمہیں سلوٹ کا پتا معلوم ہے تو ان حالات میں ہمارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ فاخرہ کے پاس جھانسنے کے بجائے سلوٹ کے پاس چلیں۔"

"اولو ڈیڑی ہمارا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔" اسفند یوں ایک کر بول کر بیک لگانا چاہتا ہوا۔
 "میکوں۔ کیوں مناسب نہیں؟" شعیب منصور نے کار کا رخ میں رد کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ جب وہ چھو بھاجان اور پھوپھو یکدم کو کچھ خاطر میں نہیں لائیں تو۔ ڈیڑی آپ کا وہاں جانا کسی طور پر بھی مناسب نہیں کم از کم میں تو بالکل گوارا نہیں کروں گا کہ آپ وہاں جائیں۔" اسفند باپ کو سلوٹ کے پاس جھانسنے سے باز رکھنے کی کوشش میں بگڑے ہوئے سے انداز میں بولا۔

"نہیں سنی بیٹا! اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خود جا کر سلوٹ سے ملوں۔ آخر میری وجہ سے ہی تو اس بے چاری کو اتنی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قصور دار ثابت یا تم نہیں بلکہ میں ہوں میں کیوں کہ میری غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے ہی یہ سارا ختمہ اور ضا دھڑا ہوا ہے۔" شعیب منصور گویا باپ کی ضد پر اڑے رہے۔ کار کو میں روڈ پر ڈال کر انہوں نے شہر کا رخ کیا۔

"اوہو ڈیڑی آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" اسفند نے جو بڑا ہو کر کہنا چاہا۔
 "میں سب سمجھتا ہوں بیٹے! اور میری اپنی بھی کچھ عزت و وقار ہے۔ لیکن معاملہ اصل میں میری بہن کی زندگی کا ہے۔ یہیں ابھی ازدواجی زندگی کا پتہ نہیں ہے۔ نہ قلم کی شقیوں سے واقف ہی ہو کر سنا سمجھ لو کہ جب ثابت سننے کی جتنی کٹھن ہے تم سب سے متعلق قطع کر لیا ہے تو تمہاری پھوپھو سے متعلق قطع کر لینا کچھ مشکل تو نہ ہوگا۔ یوں بھی فاخرہ کی کی دکھتی ہوئی رنگ ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب وہ اولاد حاصل کرنے کی خاطر عقد ثانی کرنے سے بھی نہیں بچو گے تو سلوٹ تو ان کی اکلوتی اولاد ہے اور اس کے ساتھ جو ظلم و نا انصافی ہوئی ہے۔ اس کی ساری کسر وہ فاخرہ ہی سے ہی نکال سکتے ہیں۔ متنبی ایسا ہی اپنے وقار کا خیال ہے تو تم نہیں جانتا کہ مجھے ضرور جانے دو اور اس کا پتا بتا دو۔"

باپ نے تمام اندیشوں اور نزاکتوں کو سامنے رکھ کر بیٹے کو سمجھایا۔ وہ چپ سا ہو کر بولا۔
 "جیجی کے ڈیڑی، میں آپ کو ان کا پتا بتا دیتا ہوں مگر آپ مجھے راستے میں کہیں ڈراپ کر دیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے مگر یہ تمہاری کار کہاں ہے جو تم کو لے کر سواری میں پھرتے پھرتے ہو۔" شعیب منصور نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ چھو بھاجان کے پاس ہے۔ سلوٹ کے یہاں جھانسنے کی غرض سے رات کو انہیں وہی تھی۔ مگر اس وقت ان سے جہانی لینا بھول گیا۔ یہی ان حالات میں جہانی واپس لینے کا تقاضا کرنا بھی مناسب نہیں لگتا بیٹے نے بتایا تو شعیب منصور نہایت ہونے بولے۔

"ہاں، یہ تو تم نے اچھا ہی کیا معلوم۔ جب وہ وادین جاتا ہے تو کچھ توں کیوں اختیار کر لیتا ہے اور معمولی سی بات بھی ڈنک مارتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کم از کم میں ایسے بدینیت مردوں میں سے نہیں ہوں۔" اور جو اب میں وہ خانوئی ہی رہا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے نیچر پیرس کی طرف آگئے تھے۔ اسفند نے باپ کو بہت سمجھا سمجھا کر سلوٹ کو پتہ لگایا اور دربار اصرار آدھر دیکھ کر بولا۔

"ڈیڑی! آپ مجھے یہیں ڈراپ کر دیں کیونکہ مجھے آگے نہیں پیچھے کی طرف جانا ہوگا۔"

"اچھا ڈراپ تو کیجیے دیتا ہوں لیکن یہاں نہیں بلکہ تمہارے موجودہ ٹھکانے پر ہی ڈراپ کروں گا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں آنا ہے۔ تاکہ واپسی میں میں نہیں وہاں سے پک کروں۔" شعیب منصور نے کار کی رخسار لمبی کر کے کہا۔ تب بہت عجیب ہو کر اسفند کو اسی ہول کا نام لینا ہی پڑا جس میں رہ رہا تھا۔

اور پھر آگے تاج محل ہوئے کے سامنے والے راؤنڈ اباؤڈ سے شعیب منصور نے پھر کار کو واپس موڑ لیا۔
 "حالات اور اتفاقات بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اب تم خفا ہو کر گھر سے اس لیے نکلے تھے کہ میں نے سلوٹ کو گھر واپس لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور اب تم خود ہی مجھ سے پہلے اس کے پاس پہنچ گئے۔ ویسے تمہارا جذبہ واقعی بہت

صادق تھا۔ شعیب منصور بات کے اختتام پر ہنسنے لگے۔

”اب آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش تو نہ کریں ڈیڑی۔ ورنہ میں آپ کی اس بات پر ناراض ہو کر نہیں سلوٹ کو ڈھونڈ کر عرض سے ہی نکل تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض باتیں اسنے غیر محسوس طریقے سے انسان کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں کہ جن کا احساس انسان کو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جیسے کہ مجھے ہوا۔ اسفند سے جن الفاظ میں سلوٹ کو تلاش کرنے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

شعیب منصور نے اچھا گہر کر بڑی بے ساختگی سے ایک ہتھکڑی لگایا۔ پھر اسفند کے بتائے ہوئے پول کے پار لنگ لاق میں کاربوک کر جہاں وہ مقیم تھا۔ کچھ دیر تک اسے کچھ سمجھاتے رہے اور پھر اس سے جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر سلوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

”آپ یہ تو دن چڑھ آئے۔ کچھ بڑی بڑی کھڑکی اور کچھ گڑی کا احساس۔ جس نے سلوٹ کو کبھی غیند سے جگا دیا تھا۔ انکھیں کھول کر دیکھا تو کچھ دروازے سے نظر آئے۔ صحن کے مقابل کی دیوار پر دھوپ چمک رہی تھی۔

کیا میں آج اتنی دیر تک سوئی رہی ہوں؟

اس خیال کے آتے ہی اس نے سر ہلاتے دیوار میں نصب بریکٹ پر رکھی ٹائم ہیں پر نظر ڈالی تو دس بج چکے تھے۔ وہ گہرا کراٹھ بٹھی اور بیٹھے کی پوزیشن میں آئے اسے اس نظر سامنے کوئے پر بڑی تو دیکھا فرش پر جانی بچاے سر پر پہنی باندھے فلورا اپنا کپس کھینے اس میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔ اسے غلاف تو فتح کھیں دیکھ کر درجی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ فلورا بڑی با اصول تھی اور کلینک وقت پر جاتی تھی اور پونے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل جاتی تھی۔ کمراب دس بج چکے تھے۔ اس نے کلمہ پڑھتے ہی سب سے پہلے اسے ہی مخاطب کر کے پوچھا۔

”آج آپ ڈیوٹی پر نہیں نکلیں انٹی؟“

”نہیں۔“ فلورائے عجیب سے پیچھے میں کہا۔

”کیوں آئی؟“ اس نے دیوٹی سی آواز میں پوچھا۔

”جس طرح تمام رات تم جاگتی رہی ہو۔ اسی طرح رات کا بیشتر حصہ میں نے بھی جاگ کر گزارا ہے۔ ابھی معمول کے مطابق اپنے وقت پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ بدن بھی ٹوٹ سا رہا تھا۔ اس لیے میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ڈیوٹی پر جاسے کی۔“ کو فلورائے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اپنے ڈیوٹی پر نہ جانے کا ذمہ دار وہ اسے بطور رہی ہے۔ مگر سلوٹ یہی کبھی اور نہ دانت بھرے بیچھے میں ہوئی۔

”اصل میں میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف آگئی پڑ رہی ہے۔ خیر ایسے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تو میں آپ کے سر میں تیل کی ماسح کر دوں۔ کیونکہ ماسح کرنے سے درد بہت کم ہو جائے گا۔“

”ارے نہیں بھگدوانی ہوئی ہو۔ تو بھلا منہ ہاتھ دھو یا نہ ناشتا کیا اور چلی ہو ماسح کرنے۔ یوں ہی میں سر دوانے اور ماسح کرانے کی عادی نہیں ہوں۔ میں معمولی سادر دے گئی تو کھا ہی ہے ابھی جاتا رہے گا۔“ فلورا اپنے کپس کا دھککا بند کرتی ہوئی ہوئی۔

”اچھا اگر آپ عادی نہیں ہیں تو خیر۔ مگر آپ نے مجھے جگا کیوں نہ دیا۔ میں کم از کم آپ کو چائے اور ناشتا ہی بنا کر لے دیتی۔“ سلوٹ دستور نام سے لہجے میں ہوئی۔

”کیوں کیا میرے ہاتھ پاؤں نہیں تھکتے جو میں ناشتا لانے کے لیے تھیں جگا دیتی۔ ساری رات تو تم جاگتی رہی تھیں اس پرائی گہری غیند سو رہی تھیں کہ تھکے آرام میں خلل ڈالنا مجھے گوارا نہیں ہوا۔ فلورائے جس ساوکی سے اپنے خلوص کا اظہار کیا۔ سلوٹ کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز سا ہو گیا۔ وہ اٹھتی ہوئی ہوئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ سردرد کا تو محض بہانہ ہے۔ ورنہ آپ میرے کونے کی وجہ سے آج ڈیوٹی پر نہیں نکلیں۔“ چلو یہی کچھ نہ۔ یوں بھی اب روز روز تو تم کو اپنے ساتھ کلینک نہیں لے جاسکتی۔ تم گھر میں تنہا رہتی ہو تو میرا سارا دھیان تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ کیونکہ جو ان لوہی کی ذمہ داری لینا آسان نہیں ہوتا۔ اور آج تو تم بے سہہ پڑی سو رہی تھیں پھر تمہیں بتائے بغیر کوئی سوتا چھوڑ کر کیسے چلی جاتی۔“ فلورائے بھی اصل بات بتادی۔

”وہ تو ٹھیک لیکن آخر تک آپ میرا بوجھ اٹھائیں گی۔ آپ مجھے کسی دارالامان میں داخل کیوں نہیں کرادیتیں۔ وہاں تو لوہیوں کو پورا پورا تحفظ ملتا ہے۔ اگر وہ پچھلے کسواں ہے تو میرے پاس ٹھوڑی نقد رقم اور چند زیورات موجود ہیں۔ جنہیں بچ کر میرے اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں۔“ سلوٹ یوں بولی جیسے اس زندگی سے عاجز آگئی ہو جو وہ گزار رہی تھی۔

”نہیں بھئی، خواہ تمہارے پاس لاکھوں کی رقم اور زیورات کیوں نہ ہوں۔ میں تمہارے وارثوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی جس سے بعد میں میری گردن ناپی جائے۔“ فلورا کپس کے ٹھکے پر ہاتھ ٹیک کر اٹھی ہوئی کھڑکی بیزار سی ہوئی۔

”لیکن میں نے تو پہلے ہی کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ میں کسی کو بھی اپنا وارث نہیں سمجھتی۔ میں بالغ اور خود مختار ہوں اپنی مرضی سے جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ پھر آپ سے جملہ ان جواب طلب کر سکتا ہے۔“ سلوٹ قدرے چڑ کر ہوئی۔

”تم خود کو خواہ۔“ کچھ بھی کہہ اور کچھ نہ کہہ لیکن وارث وارث ہو تمہارے اور تمہارا وارث تو اپنے بھٹے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کہاں ہے جاری ایک معمولی نرس۔ دیکھو نیچی، بچی بات تو یہ ہے کہ میں اب زیادہ عرصے تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتی اور تمہارے بارے میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ان لوہیوں میں سے نہیں ہو۔ جو آزاد اور خود مختار ہوتے ہی بڑ بڑ سے نکال بیعت ہیں اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہیں۔ میں اب بھی تم سے کہتی ہوں کہ تم اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤ۔ کیونکہ اسی میں تمہاری عزت اور برتری ہے۔ آخر میں جھڑی جان کب تک تمہاری حفاظت کر سکتا ہے۔ جب کہ میں تو خود اپنی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“ فلورا کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ مزید اسے پناہ اور تحفظ دینے کی راہ دہا نہیں ہے۔ یوں ہی پیشہ کی طرح آج اس کے اٹھنے ہی اسے ناشتا کرنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ اس پر اسے صاف اور واضح الفاظ میں اپنے گھر سے چلے جانے کو بھی کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود سلوٹ نے چمک کر کہا۔

”نہیں نہیں انٹی! میں یوں گر کر تو کبھی بھائی جان کے پاس نہیں جاؤں گی۔ آپ کو معلوم نہیں انٹی! کچھ نہیں سے لے کر اب تک میں سب کے سامنے ٹھکرتی رہی ہوں۔ سب کے ٹھکے تھکتے اور زیادتیاں سہتی رہی ہوں۔ مگر اب مجھ میں اتنی تاب ہے نہ سکت۔ میں تو اب کچھ نہیں کہہ سکتی۔ انہیں دیکھا نا جانتی ہوں اور پھر میں نے ان کی عذبت چھری درخواست کو کتنی حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ اب میں ان کے پاس کیا شکل لے کر جاؤں گی۔“

”توبہ ہے۔ وہ تمہارے گئے بھائی میں کوئی غیر تو نہیں۔ جو تم ان کے بارے میں اتنی غلط باتیں سوچ رہی ہو۔ اسے وہ تو تمہیں دیکھ کر الفا خوش ہو جائیں گے۔“ فلورائے کہا۔

”نہیں، اب ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ وہ میرے لیے غیروں سے ہی بدتر ہیں۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں خودی اپنے لیے کوئی دوسرا بندہ و سب کر لوں گی۔ یوں ہی آخر مجھے کچھ نہ بچھڑ کرنا ہی ہوگا۔ کوئی ساری عمر آپ کے اوپر بوجھ کر نہ کر رہی رہ سکتی۔“ سلوٹ اس کی باتوں پر بڑبڑ کر رہی ہوئی۔

”نہیں بندہ و سب کیسا، میں تو نہیں گھر سے نکلنے کی اجازت بھی نہیں دوں گی۔ آخر میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔“ فلورا ایک دم ہی بڑ کر ہوئی۔ پھر قدرے توقف کے بعد اس نے قدرے نرم پڑ کر کہا۔

”دیکھو بیٹی، اگر تم خود چل کر جانا اپنے دکان کے خلاف سمجھتی ہو تو میں چلی جاؤں گی۔ تمہارے بھائی جان کے پاس، کچھ ایسا ظاہر کر کے کہ میری آمد سے تم لاعلم ہو۔ پھر میں اپنی طرف سے انہیں سمجھاؤں گی کہ وہ کسی طرح خود کر نہیں لے جائیں۔ ورنہ تمہاری بھابی کو بھیج دیں۔ پھر تو نہیں ان کے سامنے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔؟“ فلورا نے آخری فقرے کو سوال کی شکل دے دی تو سلوٹ کچھ دیر سوچنے کے بعد آہستہ سے ہوئی۔

”ٹھیک ہے، آپ یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لیں۔“ کہنے کا مقصد جو بھی تھا فلورائے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اس جواب کو بہت کافی سمجھا۔

”اچھا، اب منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ تباہ دھو کر کوئی اچھا سا لباس پہن لیتیں لیکن بیان تو روز ہی پانی کی قلت رہتی ہے۔ خیر بلا تباہی ہی بدل لو، اصل میں آج چونکہ میں چھٹی پر ہوں اس لیے میں سے سوچا کہ آج ہی تمہارے بھائی جان کے پاس ہو آؤں۔ ہاں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یوں بھی آج کا کام کل پر ڈالنے کی

عادت نہیں ہے مجھے۔ فلورا نے کہا۔

"لیکن کیا آپ کو بھائی جان کا پتا معلوم ہے؟" سلوٹ نے پوچھا۔

"ظاہر ہے وہ تمہاری بھائی کے بھائی کے یہاں ٹھہرے ہوں گے۔ اور وہ پتا تو خود تم نے مجھے بتا رکھا ہے۔" فلورا نے جواب میں کہا تو سلوٹ چپ چاپ منہ دھونے چل دی۔

فلورا کے کہنے کے باوجود اگر سلوٹ کے کپڑے میلے اور مسے کیے نہ ہوتے تو وہ کبھی لباس تبدیل نہیں کرتی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ فلورا نے اس لیے اسے لباس تبدیل کرنے کی تاکید کی ہے کہ اس کے خیال میں اگر کوئی اسے لینے آیا تو اسے عین وقت کے وقت کپڑے تبدیل نہ پڑیں۔ جبکہ دل ہی دل میں وہ فلورا کی اس خوش فہمی پر ہنس رہی تھی کہ وہ بیک بھائی بھائی کو اپنے گھر لانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس تبدیل کر کے وہ باورچی خانے میں آئی تو دوپہر کا کھانا تیار ملا۔ گو فلورا کا معمول تھا کہ وہ ناشتے کے ساتھ ہی دوپہر کا کھانا تیار کر لیتی تھی۔ کیونکہ وہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کلینک کے کمرے پر لے جاتی تھی۔ مگر اس روز سلوٹ نے یہی سمجھا کہ اس نے یہ کھانا پکا کر گویا پیسے سے ہی اس کے بھائی کے پاس جانے کی تیاری کر رکھی ہے۔

بہر حال لینے لیے جانے دم کی گنجینے سے دوپہر کے کال کران سے ناشتہ کیا اور پانی کی بوتلی دھو کر باہر آ گئی۔ تبھی دروازے پر ہلکی ہلکی سی کٹ کٹ کی آواز آئی تو فلورا نے جواسی چٹائی پر بیٹھی اپنی چوٹی کو نہ ہنسی تھی۔ اس نے سلوٹ سے کہا۔

"اب سے ڈرا دیکھنا تو مونا۔ کہیں وہ وارڈ بولے عظمت میری خیریت معلوم کرنے نہ آیا ہو۔ بے چارہ بچہ میرا رٹا خیال رکھتا ہے۔" تو سلوٹ نے دروازے تک جانے میں تھوڑا سا تاہل کیا کیونکہ فلورا نے اس کو سختی سے ممانعت کر رکھی تھی کہ وہ کسی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولے۔ اسی وجہ سے وہ دروازہ کھولتے ہوئے ہچکچاہٹ رہی تھی تبھی فلورا کو احساس ہوا تو اٹھتی ہوئی بولی۔

"نہیں، تم ٹھہرو میں دیکھتی ہوں کہ کون آیا ہے؟" اور پھر اس نے کون ہے کہتے ہوئے دروازہ کھولا۔ تو دروازے پر ایک سوئڈن بوٹ اور۔۔۔ بہت ہی برف دار شخص کو کھڑا دیکھ کر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ کہ یوں بھی دروازہ کھولتے ہی کسی قیمتی خوشبو کا ایک بھسکا اس کی ناک میں گھس آیا تھا۔

"کیا سسٹر فلورا یہیں رہتی ہیں؟" آنے والے نے پوچھا۔

"جی۔ جی ہاں۔"

"اوہ، تو میں ٹھیک جگہ ہی پہنچا ہوں۔" آنے والے نے کہا۔

"لیکن آپ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں؟" فلورا نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں شعیب منصور ہوں، سلوٹ کا ماموں اور ان سے ملنے آیا ہوں۔" شعیب منصور نے کہا سلوٹ ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ شعیب منصور کی آواز سن کر اس کی رنگت پھلکی سی چڑکھی تھی۔ فلورا نے تصدیق کرنے کی فرض سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اسے اضطرابی سی کیفیت میں انگلیاں مروڑتے دیکھ کر اس نے نہایت غلیظ لہجے میں شعیب منصور سے کہا۔

"اوہ، آپ سلوٹ کے ماموں ہیں۔ اندر تشریف لے آئیے۔ اصل میں آج کل کچھ واقعات ایسے ہو رہے ہیں کہ رٹا پوچھے اور معلوم کیے کسی کو اندر نہیں بلا یا جاسکتا۔"

"جی ہاں، درست کیا آپ نے احتیاط تو بہر حال اچھی چیز ہے۔" شعیب منصور نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ان کو اندر آتا دیکھ کر سلوٹ اتنی گھبراہٹ کی کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس سے باہر نکل جائے یا وہیں کھڑی رہے۔ ادھر شعیب منصور سید سے اس کی طرف ہی بڑھ آئے۔

"آہا سلوٹ، کہو کیسی ہو بیٹیا۔ ہم تو تمہاری صورت کو ہی ترس گئے تھے۔ چہنچہنی سنا کہ تم مل گئی ہو پس اپنی پہلی فرست میں ہی تم سے ملنے چلے آئے۔" انہوں نے اس کے نزدیک آ کر اس کے تھوڑے تھوڑے جھکے ہوئے سر پر شفقت

سے ہاتھ پھیرا۔ پس اتنا کہنا تھا کہ نہ سلام نہ دعا۔ وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ اس کے اس طرح رونے پر شعیب منصور کا بھی دل بھر آیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے جھجک گئے۔ لیکن بڑی سختی سے خود پر قابو پا کر اپنی آواز کو شکستہ بنا کر آہستہ سے اس کے سر کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر۔۔۔ اگر سے پر اتنا رونا دھونا۔ اگر یہ خوشی کے آنسو بھی ہیں ماما سوئٹ گرل۔ تو مجھے لینے اشکوں کی اس غلیظانی میں نہیں نہ ہونا۔ دیکھو بھئی، ہم تو انشورڈ بھی نہیں ہیں۔ اور پھر کتنی جانوں کے نکیل بھی ہیں؟ اور ان کی اس بات پر آبدیدہ سی فلورا ہنسنے لگی۔ لیکن سلوٹ کی گریہ وزاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ شعیب منصور کچھ پریشان ہو گئے۔

"دیکھو بھئی، رونا تو ہمیں چاہیے تھا کہ ہماری وجہ سے تمہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسے قصور وار تو تمہارے ہم ہیں بیٹی، پھر تم اتنا رو دھو کہ ہماری شرمندگی میں اضافہ کیوں کر رہی ہو؟" شعیب منصور نے گلو گلو آواز میں کہا تو سلوٹ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ نہیں منجھے، کاکا، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ یوں بھی آپ سے تو مجھے کوئی شکایت نہیں؟" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

"اتنا مت رو مونا بیٹی۔ دیکھو تمہارے ماموں تمہارے رونے کی وجہ سے کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ انہیں بٹھاؤ، ان کی خاطر کرو؟" فلورا اس کے قریب آ کر آہستہ سے بولی۔ اور پھر اس نے شعیب منصور سے کہا۔

"جب سے آئے ہیں کھڑے ہی ہیں۔ آپ تشریف تو رکھیں ماما گومیرے پاس آپ کے شایان شان بیٹھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے پھر بھی۔"

"اب سے نہیں سسٹر، آپ کہاں مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے لگیں۔ میں تو خود ایک ذرہ خفیر ہوں۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔ ورنہ بیٹھ جاتا۔" شعیب منصور حد درجے انکساری سے کام لے کر بولے۔ اور پھر انہوں نے سلوٹ سے کہا۔

"اب اپنے آنسو پونچھ لو بیٹی اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کیوں سسٹر، اگر میں انہیں لینے ساتھ لے جاؤں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔؟" انہوں نے اس سے بات کرتے کرتے فلورا کو مخاطب کر کے پوچھا تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے بولی۔

"نہیں نہیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے سراسر آپ ان کے ماموں ہیں اور میں ایک ادنیٰ سی خدمت گزار، آپ انہیں شوق سے لے جائیں لیکن سلوٹ کو تو کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھا کہ وہ چھ بٹ کر ان کے یہاں جائے وہ تو ان کے گھر میں قدم رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر بولی۔

"نہیں منجھے کاکا۔ آئی ایم سوری، میں آپ کے یہاں نہیں جاؤں گی۔ جس گھر سے اتنی بے عزت کر کے نکالی گئی ہوں، اس گھر میں قدم رکھنا میری تو بہن اور گراؤٹ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔" شعیب منصور کو فلورا کے سامنے اس کا یہ کہنا ناگوار تو گزرا لیکن مصلحت کا نقصان کچھ یہی تھا کہ حکم اور نرمی سے کام لیا جائے۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"لیکن میرا ارادہ نہیں اس گھر میں لے جانے کا تو نہیں ہے بیٹا۔ میں تو۔۔۔! اور فلورا نے جواس کے انکار پر جربز سی ہو رہی تھی، ان کی بات کا ٹ کر کہا۔

"تمہیں بھائی صاحب، اگر آپ اپنے گھر میں انہیں لے جانا چاہ رہے ہیں تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ انہوں کے درمیان تو کبھی کبھی اس سے بھی کہیں بڑی باتیں ہو جاتی ہیں۔ اصل میں یہ مونا ابھی بہت ناگہم ہے کارور حساس ہے۔ اس نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ اس لیے اس نے اپنے بھائی کو بھی دھتکار دیا ہے، یہ ان کے ساتھ بھی نہیں گئی مگر میں اسے آپ کے ساتھ بھیج کر رہوں گی۔"

"نہیں۔ آپ کے میرے اوپر بہت زیادہ احسانا ضرور ہیں لیکن آپ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں انہی فلورا۔ آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" سلوٹ نے ساری مروت اور رواداری کو بالائے طاق رکھ کر سخت برہمی سے کہا۔

"اچھا اچھا بھئی، پرسسٹر فلورا تو کیا میں بھی نہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن بیٹی میں یہ کہہ رہا ہوں۔ کہ میں بھی تمہیں اپنے گھر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ لے جائے بغیر نہ رہوں گا۔ آخر میری بھی تو کوئی حیثیت ہے، کوئی پرسٹیج ہے اور میں بڑے مان اور دعوے سے تمہیں لینے آیا ہوں؟" اپنی بات کہتے کہتے

شعبہ منصور جذبہ میں آگئے۔

"دیکھو مونا، تمہارے بقول میں تم پر کوئی حق کھتی ہوں نہ اختیار لیکن اپنی حد تک تمہاری ذمہ داری سے دستبردار ہونے کا حق تو مجھے ہے نا، اور یہ بات میں پہلے بھی تم کو بتا چکی ہوں۔ لہذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم آج ہی اپنے ماموں کے ساتھ چلی جاؤ۔" فلورا یہ کہہ کر گویا اپنے گھر سے نکلے کا حکم دے دیا۔

"ہاں بیٹی ضرور چلو۔ ہم تو تمہارے لیے غیر ہی ہیں لیکن تمہارے اپنے والد اور والدہ تو موجود ہیں نا۔ اپنا گھر چھوڑ کر ان بے چاری پر اپنی ذمہ داری کا بار ڈالنا کوئی معقول بات تو نہیں۔ چلو اب جلدی سے تیار رہو جاؤ۔"

شعبہ منصور نے باتوں ہی باتوں میں اس پر بڑی گہری چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ کم از کم اسے تو یہی لگا۔ مگر گویا مجبوری ہی مجبوری تھی کہ اب ان کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ اس پر غصے میں فلورا کو ایک نیچا سا جواب دے کر اس نے اس کے سارے کیے کرانے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بلکہ اس کے بے لوث جذبے کو تبریح کر دیا تھا۔

اس نے فلورا سے آنکھ نہیں ملائی اور چپ چاپ جا کر ہنگ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس گھسیٹا۔ اپنے میبلے کپڑے اخبار میں لپیٹ کر اس میں رکھے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل آئی۔ جبکہ شعبہ منصور نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا بھی چاہا مگر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ باہر آکر شعبہ منصور نے گھر کے فاصلے پر کھڑی کار کی ڈکی کھولی اور اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر ڈکی میں رکھ دیا۔ اور جب شعبہ منصور نے فلورا کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ کر سلوٹ کے لیے کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھولا تو اس نے بیٹھے بیٹھے پٹ کر دروازے کی دلیز پر کھڑی فلورا کی طرف دیکھا۔ اور بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی۔

"انتہی مجھے معاف کر دیجیے، میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ پلیر آئی، آپ میری باتوں کا کچھ خیال نہ کیے گا۔ کیونکہ آپ کے میرے اوپر اتنے احسانات ہیں کہ جن کا اتنا رونا تو بڑی بات، مجھے وہ الفاظ بھی نہیں مل رہے جن سے آپ کے ان احسانوں کا شکر یہ ادا کر سکوں۔" وہ روتی ہوئی نو فلورا جو خود بھی اس سے جدا ہونے کے خیال سے رونے لگی تھی۔ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

"ارے نہیں بیٹی، میں نے تو تمہیں اپنی بیٹی سمجھ کر اپنے پاس رکھا تھا۔ تمہیں تحفظ دیا تھا اور تم مجھ پر میرے احسانات جتا کر غیریت کی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو تمہاری کسی بات کا بھی برا نہیں مانا کہ میں تمہاری ذہنی کیفیت سے واقف ہوں۔ اچھا خبر، جاؤ جہاں بھی رہو خوش و خرم اور سلامت رہو۔" پھر فلورا نے اس کی پیشانی چوم لی۔ اور خود دلیز سے اتر کر اسے کار میں بٹھا دیا۔ اور ایک بار پھر شعبہ منصور نے اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھائی اور سلوٹ کو لے کر روانہ ہو گئے۔

اس سے ان کی کیفیت کسی فائن کی سی تھی۔

اپنی اتنی زبردست کامیابی پر اتنے مسرور، اتنے سرشار تھے کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کار میں نہیں ہواؤں کے دوش پر بڑے جا رہے ہوں۔ یوں بھی سلوٹ کا ان کی لاعلمی میں ان کے گھر سے چلے جانا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ بڑی ذمہ داری کا معاملہ تھا۔

بلکہ دوسرے معنوں میں ان کی ناک کا معاملہ تھا۔

اور جس روز سے سلوٹ ان کے یہاں سے گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی چین کا ذکر نہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ بیٹے کے گھر چھوڑ کر جانے کی بھی انہوں نے پروا نہیں کی تھی۔ بلکہ حقیقت جان لینے کے بعد بیٹے سے بھی وہ مالال ہو گئے تھے اور اس کی اور بیوی کی ہی جگت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ذہنت سے بھی ان کا رویہ اچھا نہ رہا تھا۔ اور اب ان کے لیے یہ کتنی خوشی اور سرخروئی کی بات تھی کہ وہی اسے منا کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ گویا پہل انہوں نے کی تھی۔ ان کا رخ شہر کی سمت تھا۔

سلوٹ ان راستوں سے بالکل واقف نہیں تھی۔

پھر انہوں نے خاصا فاصلہ طے کر کے ایک پُر رونق بازار میں مٹھائی کی دکان کے سامنے اپنی کار روکی۔ اور اس سے

ابھی آتا ہوں کہہ کر کار سے اتر کر وہ مٹھائی کی دکان میں چلے گئے۔ انہوں نے کاؤنٹر پر کھڑے ایک شخص سے کچھ کہہ کر وہیں رکھے فون سے کوئی نمبر ڈال کر اور ٹھوڑی دیر تک کسی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر ریسور کرکھ کر باہر آئے تو دکان کا ملازم ایک بہت بڑا مٹھائی کا ڈبہ اٹھائے ان کے پیچھے آتا نظر آیا۔ انہوں نے وہ ڈبہ ملازم سے پھینک دیا اور کار سے کچھ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ابھی تک ایک، بات بھی نہیں کی تھی۔ ماسوائے ابھی آتا ہوں کہنے کے اور وہ اس سے بڑی الجھن میں گرفتار تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ شعبہ منصور اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ نہ اس نے کچھ پوچھا ہی تھا۔ وہ تو سیٹ کی پشت سے کمر لگائے۔ اپنی طرف کی کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مٹھائی کچھ نشست پر رکھ کر روانہ ہوئے تو کار چلاتے چلاتے اس پر ایک اچھٹی سی نظر ڈال کر مسرور کے انداز میں بولے۔

"میں نے سوچا خوشی کا موقع ہے، سب کام نہ مٹھا کر آنا بھی ضروری ہو گا۔" وہ جواب میں بھلا کیا کہتی۔ ان پر ایک نظران پر ڈال کر رہ گئی۔ لیکن وہیں ان کے تے خوش ہوئے پر مٹا کر ہوئے بغیر نہ رہی۔ یوں بھی اسے ان سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ پر خاش۔ کیونکہ بھائی کے عزیزوں میں صرف وہی ایک تو تھے۔ جن سے اسے کچھ دلی انسیت تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ بھی آگئی تھی۔ ورنہ تو اس کا دل سب سے اتنا کٹھا ہوا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ شعبہ منصور چاہتے تھے کہ وہ کچھ بات کرے تاکہ اس کے دل پر چھاپا نگہ نہ ہو سکے۔ وہ اس سے فلورا کے متعلق پوچھتے رہے کہ وہ کون ہے، کیسی ہے اور تم سے اس کی واقفیت کیونکر ہوئی؟۔ اور وہ نے تے انداز میں انہیں فلورا کے متعلق بتاتی رہی۔ پھر کچھ دیر تک خاموشی چھا رہی۔ اور مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد شعبہ منصور اصل مقصد پر آئے ہوئے بولے۔ جس پر گفتگو کرنے کی غرض سے ہی اصل میں وہ کار کو بلا مقصد ہی ادھر ادھر مڑوں پر گھما رہے تھے۔ ورنہ فریبر ہال کا علاقہ اتنی دور تو نہیں تھا۔ آخر انہوں نے اس بات کی ابتدا کی۔

"دیکھو بیٹی، سب سے پہلے تو میں اپنی اور اسفندی طرف سے تم سے معافی کا خواستگار ہوں کیونکہ تم نے میری وجہ سے ہی سب سے زیادہ مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اسفند کا سوال تو بعد میں آتا ہے کیونکہ اسفند کا قصور صرف اتنا تھا کہ اسے تمہارے بارے میں بہت غلط انداز میں بتایا گیا تھا۔ اور اس نے تم سے غلط رویہ اختیار کیا۔ بیٹی، تم ذرا اس معاملے کو اپنے اوپر رکھ کر سوچو، اگر تم کسی کی ذات میں اتنی دلچسپی لیتیں کہ اسے اپنی موت و حیات کا مسئلہ بنالیتیں اور پھر ایک دن تم کو معلوم ہوتا کہ وہ تو پہلے سے شادی شدہ ہے، پرایا ہے۔ تو تمہارے بارے میں میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سننے کے بعد تمہارا کیا رویہ ہوگا؟ یا تمہارے دل پر کیا گزرتی؟ لیکن اسفند چونکہ مرہ ہے، اس کے بارے میں میں دعوے سے۔ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے دل پر یہ انکشاف قیامت بن کر ٹوٹا ہو گا۔ اس لیے وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔" اپنی بات کہہ کر انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سیٹ سے پشت لگائے پھر مٹھڑا سا جھکائے بلا کوئی تاثر دے کر گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ شعبہ منصور سمجھ گئے کہ صفائی کے لیے اس نے اسے الفاظ آئے میں تک کے برابر بھی نہیں۔ جبکہ وہاں تو ایک ذخیرہ الفاظ بھی اس کے دل پر پڑی نفرت اور نگہ کو نہیں چھانٹ سکتا تھا۔ لہذا انہیں بڑے تدر اور حکمت عملی سے کام لینا ہو گا۔ انہوں نے پھر کہا۔

"میں مانتا ہوں اس کی بدسلوکی کی وجہ سے تمہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اور بڑے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک شریف اور پارسا لڑکی کو اپنی عزت اور آبرو و جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے تمہاری عزت اور آبرو بھی خطے میں پرگئی تھی۔ لیکن بیٹی اس نے بھی تم پر ظلم کر کے خود کو مزاحمے لی ہے۔ وہ بھی تمہارے جانے کے اگلے روز بلا سکی جو تلوے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنی اتنی اچھی ملازمت تمہارے ہی علم میں چھوڑ دی تھی اور پورے ڈیڑھ ماہ تک تمہاری تلاش میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ دیکھو غلطی تو بڑے بڑے نبیوں اور اولیاء سے ہو جاتی ہے۔ وہ تو بعض ان کے بیروں کی خاک ہے، ایک معمولی سا شخص۔ تب وہ جوان کے اسفند کی حمایت کرنے کو برداشت نہ کر سکی تھی بڑے تلخ و ترش لہجے میں بولی۔

"ہونہ۔ آپ ان کی تکلیفوں کا، جو کچھ میں نے جھگڑا ہے اس سے مقابلہ کر رہے ہیں منجھلے کا۔ شاید آپ یہ بھول گئے۔ کہ وہ مرد آپ اور میں ایک گھڑوسی عورت، بڑا فرق ہے میری اور ان کی تکلیفوں میں۔ اور پھر میں

نے تو کسی سے کسی بات کا بھی شکوہ نہیں کیا۔ کیونکہ میرے نزدیک شکوے شکایت کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ میرے مقدر میں تھا، وہی ہوا ہے۔

”ہاں۔ مگر ہر بات کا دور و مار مقدر پر ہی نہیں ہوتا۔ کچھ باتیں یا معاملے انسان کے اپنے اختیارات کے دائرے میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر انسان سے یہ نہ کہا جاتا کہ نیکی یا بدکردی جو چاہے اختیار کرے بلکہ یا تو محض بدی ہی رہ جاتی یا صرف نیکی۔ میرا مطلب ہے بہت سی باتیں انسان کے اپنے اختیار میں بھی ہوتی ہیں۔ اور ان سے ہٹ کر جو ہوتی ہیں انہیں اتفاقات یا مقدر پر غموں کیا جاسکتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ممکن اتفاقات کی بنیاد پر ہوا اور ان اتفاقات کے رونما ہونے میں ہماری کوتاہیوں اور زیادتیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔“ شعیب منصور نے اپنا کوئی فلسفہ بھڑا تو اس نے بیزار ہو کر دل میں سوچا۔ ”آف، یہ منجھلے آکا جانے کیوں اتفاقات اتفاقات کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ جبکہ جو کچھ مجھ پر گزر چکی ہے اس کا مداوا ہو سکتا ہے نہ ازالہ ہو گیا ان کی کوئی بات کوئی دلیل اس کو متاثر نہیں کر سکی تھی۔ انہوں نے بھی اس کی خاموشی اور بے نیازانہ سے انداز سے اخذ کر لیا تھا کہ وہ ان کی کسی بات پر بھی کان نہیں دھر رہی چنانچہ انہوں نے پھر موضوع ہی بدل دیا۔

”بہر حال۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ آج کا دن میری نصرت اور کامیابی کا دن ہے۔ آج نہایت غیر متوقع طور پر میرا بیٹا مجھے مل گیا، ادھر تو بھی مل گئیں۔ آج کا دن میرے لیے بہت مبارک ہے۔ کم از کم اب میں ثابت حسن کے سامنے منظر روئی سے توجہ اس کوں گا۔“ شعیب منصور کی اپنی ایک دشمنی ایک وقار تھا۔ وہ نہایت بردبار اور سنبھلہ مزاج بھی تھے۔ کم از کم اپنے جھوٹوں کے لیے تو بہت باعرب تھے۔ اور اس وقت سلوط سے انہوں نے جتنی باتیں بھی کیں، اسفندی کو دیکھا سب پرکھیں۔ اس نے ہول بھری کرباب سے دبے لفظوں میں کہا تھا۔

”ڈیڑی، سلوط مجھ سے خفا ہی نہیں متفر بھی ہو گئی ہیں۔ ڈیڑی پلڑ، میری طرف سے ان کے دل میں بھرنا مگر رنگ لے کی کوشش ضرور کیے گا۔ کیونکہ میری کوشش کے نتیجے میں تو یہی ہوا تھا کہ انہوں نے ہوشیار ہی جھوڑ دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مجھے پہلے سے بھی انکار کر دیا تھا مگر آپ کی بات اور ہو گئی، اور شعیب منصور نے جواب میں کہا تھا۔

”ڈونٹ وری مانی سن، آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔ (تم فکر نہ کرو میرے بیٹے، میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گا)“

وہ روشن خیال اور ابد و اناں تھے۔ اور اولاد کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس پر رعب گانٹھ کر لو سختی کر کے نہیں، دوستانہ طریقے سے پیش آنا چاہیے۔ ورنہ سختی کرنے سے اولاد باغی اور اجنبی ہو جاتی ہے۔ ورنہ باپ کے اور اس کے درمیان عزیزیت کی ایک دیوار سی جائے ہو جاتی ہے۔

مگر انہوں نے کچھ توبہ بیٹے کی خوشی کی خاطر اس سے اپنی باتیں کی تھیں اور کچھ بہن کا گھر سلامت رکھنے کی غرض سے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب سلوط عرصے بعد شاقب حسن سے ملے گی اور اسے اس حقیقت کا علم ہو گا کہ وہ شاقب کی بہن نہیں بیٹی ہے تو شاقب حسن کے لیے اس کے تاثرات اور جذبات دوسرے ہی ہو جائیں گے۔ عین ممکن ہے وہ باپ کے ساتھ مل کر ہم سب کی زیادتیوں کا بدلہ لے گا۔

بہر حال پھر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ یوں بھی ہو مل نزدیک آ گیا تھا۔ انہوں نے کار باہر فرٹ پاتھ کے کنارے پارکنگ پلیس میں کھڑی کی اور اسے لے کر اندر آئے تو اسفندی انہیں سامنے ہی کھڑا نظر آیا جسے دیکھ کر اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔ اور جہاں تک ان کے ساتھ آئی تھی۔ وہیں ٹھٹک گئی۔ مگر شعیب منصور اس کے قیام جو کچھ بولے۔

”شاقب! بیٹے! تم شاک دقت پر یہاں پہنچے۔ ورنہ مجھے تو ان دونوں کے کمرے کا کنٹرول معلوم نہیں تھا۔“ بھلہ بھلے نے مزہ کرتے دیکھا اور سلوط کو کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھ کر انہوں نے اس سے کہا۔

”آؤ بیٹے! آج تم نے چاہا کہ مل کر مجھے ایک سر پر اُلو دیا ہے اور اب میں تم کو ایک زبردست سر پر اُلو دل گا۔“

وہ بچوں کی طرح خوش نظر رہے تھے۔

”درا دیکھیے تو شاقب میاں! اکون آیا ہے؟“ اور شاقب جس جوان کو اور اسفندی کو اندر آدیکھ کر منہ پھلکا کر اور ایسے انہماک کر بیٹھ گئے تھے۔ جیسے انہیں آتے دیکھا ہی نہ ہوا۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور سلوط کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر گھڑی بھر کو ان کو ابھی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مگر جب جلدی سے اٹھے اور اپنے دونوں ہاتھ دکھا دیے۔ سلوط بھی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ چوڑی رنگ دونوں انسو بہاتے رہے اور فخر بھی روئے میں ان کا ساتھ دینی رہیں۔ ماحول کچھ اتنا افسردہ اور افسردہ ہو گیا تھا کہ شعیب منصور پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ اور وہ کچھ کہنے والے ہی تھے کہ کچھ آگے بڑھے سہیل منصور اپنی فیملی کے ساتھ اور ان کے پیچھے خود ان کی دونوں جھولی بیٹیاں اور بیوی اندر داخل ہوئی۔ تو شعیب منصور بیوی کو دیکھ کر کھل ہی اٹھے۔ ماحول سارا بدل ہی گیا تھا۔

ہنسی، تھپتھپ، مبارکباد۔ اور غنائی گویا خوشیوں کے سارے رنگ۔ مگر سلوط اسفندی کی موجودگی کی وجہ سے بہت چپ چاپ سی تھی۔ یوں بھی اسے یہاں آنے سے پہلے بالکل توقع نہیں تھی کہ شاقب حسن اتنی آسانی سے اسے معاف کر دیں گے۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ بھی اکھٹی اولاد کی۔ ایسی اولاد کی جسے تمام عمر انہوں نے غفلت اور بے توجہی کی مادی تھی۔ اور ایک بوڑھے شخص سے اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ رنج و بھیتا دوسے کی آگ میں کس بری طرح جل رہے ہیں۔

اور اب وہ آئی ہے تو اسے ہاتھ سے کیسے کھوسکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس کے اتنے گستاخانہ رویے کے باوجود اسے سینے سے لگا لیا ہے۔

پھر شاقب حسن نے خود ہی سب کے سامنے یہ چونکا دینے والا انکشاف کیا کہ سلوط ان کی بہن نہیں بلکہ بیٹی ہے سلوط تو اس انکشاف پر اتنی مسرور ہوئی کہ باپ سے لپٹ گئی کہ اس کی زبان تو اب کتنے کو ترسی تھی۔ بڑی دیر تک تو اس بات پر بھی مبارک سلامت ہوتی رہی۔ سب کو ان کے ہوش میں بھرے ہوئے براعتراض تھا اس لیے سب کی متفکرانہ سے طے یہ پایا کہ وہ سہیل منصور کے ہاں منگنی ہو جائیں گے۔ لہذا کچھ روز ہی وہ ہوش کی رہائش چوڑی سہیل منصور کے یہاں آگئے۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ شاقب کو سہیل منصور کے یہاں آنے میں بائیس روز ہو گئے تھے۔ ان کے لیے کسی معقول اور دھنگ کے مکان کی تلاش بھی بلا رہا جاری تھی۔ ادھر وہ سلوط کا جہیز بھی۔ انہیں اسفندی سے کیا وعدہ بھی اچھی طرح یاد تھا۔

لیکن وہ اتنے جلد بھی کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے خاموش تھے کہ اب تو یہ عالم تھا کہ سلوط کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے۔ ادھر زینت بھی کئی بار اسفندی سے کہہ چکی تھیں کہ اگر وہ کہے تو وہ سلوط پر اس کا بیہوش دے دیں۔ لیکن وہ یہ کہہ کر انہیں ٹال دیتا تھا کہ ابھی ایسی کیا جلدی ہے۔

اصل میں تو چونکہ سلوط اس سے سخت خفا تھا بلکہ سخت بدظن تھی۔ اس لیے وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے بروہوں کرے پر انکار ہی نہ کر دے۔ اسی وجہ سے وہ سلوط سے مل کر پہلے اسے متانا چاہتا تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ تنہائی میں اس سے بات ہو سکے۔ کوئی ایک طرح اس کی راز داں تھی اور اس کی طرف سے سلوط کا دل صاف کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔ اسی سے اسفندی نے کہہ دیا تھا کہ کبھی ایسا اتفاق ہو کر کوئی گھر میں موجود نہ ہو تو مجھے فون پر اطلاع دے دینا۔ آخر ایک روز جب شاقب حسن ایک مکان دیکھنے کے ہوئے تھے۔ سہیل اپنے افسانہ وار نازش اور فخر شاہ پنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ کوہنٹے موقع دیکھ کر اسے مطلع کر دیا۔

اس لمحے سلوط اپنے کمرے میں بیٹھی لہسنے دے دے کے انچل تپ رہی تھی جب اسفندی نے کمرے میں قدم رکھا۔ فرش پر قائم تھا ہو سنے کی وجہ سے سلوط کو اس کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ سر جھکاتے اپنا کام کر رہی تھی۔

”ہلو کیا ہو رہا ہے؟“ اسفندی نے ایک دم ہی قریب آکر کہا تو وہ ڈر کر اس بری طرح چونکی کہ کوئی کی نوک اس کی انگلی میں جھپک گئی۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ اس نے بڑے سخت لہجے میں تیوری چوہا کر کہا۔

”آپ سے معافی مانگنے اور آپ کو ملانے۔“ اسفندی مسکرا کر بولا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ اور سفید بیسٹ پہنے

ہوئے تھا۔ جو اس پر بہت عجیب رہی تھی مگر سلوٹو کو تو اس سے ایسی نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ ہی کیا وہ خود مختار ہے زہر لگا۔

”کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ٹھیک ہی کیا۔ میں ایسے ہی سلوک کی مستحق تھی۔“

وہ ایک دم ہی بیٹھ کر اتر کر کھڑی ہوئی ہوئی بولی

”اوہ نو۔“ مستحق تو اصل میں میں ہوں۔ آپ جتنا بھلا ہیں مجھے برا بھلا کہہ لیں۔ لیکن خدا را اب تو اپنا عقدہ ٹھوک

دیں۔ میں ایک بار پھر اپنے لیے کیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ واقعی مجھ سے بڑی زیادتی ہو گئی تھی۔ لیکن یقین جانیے

میں نے جو کچھ کیا محض لاعلمی اور غصے میں کیا تھا۔ اسفند کے لیے میں عاجزی ہی آگئی۔

”جب میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر معافی کا سوال نہ کسی۔ وضاحت

اور صفائی کا بھی آپ یہاں سے چلے جائے۔ یہی آپ کا بھلا برحسان ہوگا۔“ اس نے بڑے عنت اور تلخ ہنسنے میں کہا۔

”وضاحت اور صفائی اگر آپ کو نہیں پسند تو مجھے تو پسند ہے۔ اور میں اس وقت آپ کو منسلک آیا ہوں تو

نہا کر ہی جاؤں گا۔ اب غصہ ٹھوک دیجیے کیا آپ کے دل میں میری کوئی عزت نہیں رہی؟“ وہ ہنسیلے سے انداز

میں اپنے نو قوت پر ٹوٹ کر بولا۔

”نہیں بالکل نہیں دراجی نہیں ہے۔ دیکھیں آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں مجھے آپ سے عنت نفرت ہے۔

میں آپ کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔ بات کرنی تو نا۔“ اس نے خوبصورت آنکھوں سے قہر کی جلیاں

گراتے ہوئے کہا۔

اور اس کی یہ باتیں سن کر اسفند کو لگا جیسے اس نے بھرنے بازار میں اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ جس طرح وہ

شروع سے بات کر رہی تھی۔ وہ بھی نہ معلوم کیسے برداشت کر رہا تھا۔ مگر اب معاملہ برداشت کی حد سے گزر چکا تھا۔

اور وہ تو یہاں اپنی مراد پالنے آیا تھا۔ اپنی خوشحال بوٹے آیا تھا۔

یہ احساس اس کے لیے کتنا اطمینان بخش تھا کہ وہ مل گئی ہے اور اس کے قریب ہی گئی ہے اور پھر پھر بچا کی مثال

مثالی پر اس نے سوچا تھا کہ کفر کا معاملہ ہے۔ میں اسے جلد ہی مثالوں کا اور یہ یقین بھی کہ پھر پھر اپنا وعدہ ضرور نبھائیں

گئے۔ اور وہ تو اس خوش فہمی میں اس وقت یہاں آیا تھا کہ سلوٹو پر اپنی تمام تر محبت بچھا کر رکھے کسی نہ کسی طرح اسے

متا ہی سے لگا۔ لیکن اس نے نفرت کا اظہار کر کے اور سب سے برا بھلا اس کی تحقیر کر کے بری طرح اسے دھتکار دیا تھا۔

پس وہ غصے کی ایک طوفانی سی لہر تھی جیسے سے اوپر اٹھی تھی۔ ایک کھونٹے جی جس نے تن بدن میں اگ لگادی۔

مٹی جس کے ریلے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ تیزی سے پلٹا اور اندھی کے کسی تیز چھوٹے کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور سیدھا سہیل منصور کے کمرے

میں پہنچا۔ ان کے سپیڈ کی دراز کھولی اور پھر اسے ہسپتال لیا۔ یو سہیل منصور اپنی حفاظت کی غرض

سے رات کو اپنے ساتھ لڑکھوڑا کر لے گئے تھے۔ کوثر جو اسے فون کرنے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ وہ

ابھی تک آیا بھی نہیں کہ اندر سے سلوٹو کے تعلق کے آواز سن کر وہیں دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر

بعد وہ اندھی اور طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور سیدھا اس کے باپ کے کمرے کی طرف بڑھتا ہوا گیا تو کسی

اچانک سے خیال سے کوثر کا ماتھا ٹھٹکا۔ وہ بھاگ کر سہیل منصور کے کمرے میں پہنچی تو اسے بھرا ہوا ہسپتال ہاتھ میں

لیے دکھایا جسے وہ نیٹھی پر کار رہا تھا۔ اور اس کو صرف پہنچی ہی تھی۔

اور سلوٹو کے دل کو اس پہنچے سے کچھ ایسا دھچکا لگا تھا کہ وہ دہل اٹھی تھی۔ وہ جس آگ بگولہ سی کیفیت میں اس کے

کمرے سے نکلا تھا۔ اس پر اندر ہی اندر وہ ہول کر رہ گئی تھی۔ اس پر جب کوثر کے چہرے کی آواز آئی۔

”نہیں نہیں بھائی جان خدا کے لیے نہیں۔“ تو وہ دوپٹے ایک طرف چپ کر رہی طرح دھک دھک کرتے

دل کے ساتھ ننگے پاؤں باہر بھاگی۔ کوثر کی آواز اب بھی اسے آرہی تھی۔ اس نے بھاگ کر اسے کمرے جھانک

ڈالے۔ آخر سہیل منصور کے کمرے میں اسے کوثر اور اسفند نظر آئی گئے۔ اسفند ہسپتال کی نال کنپٹی پر لٹکے کھڑا تھا۔

اور کوثر ایک ایک کمرے کے ہاتھ سے چھینا بچا رہی تھی۔ یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ کیونکہ کوثر بچہ راگر ہلکا سا

بھی داؤد بھی پڑ جاتا تو اسی وقت گولی چل جاتی۔ لہذا وہ بھی بھاگ کر اسفند سے ہسپتال چھیننے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

کہ اس سے ہزار نفرت سہی لیکن اس کے دل کو اب بھی پیارا تھا۔

اس کی جان اسے اب بھی بہت عزیز تھی۔

مگر سلوٹو کو دیکھ کر تو گویا وہ اپنے سے باہر ہی ہو گیا۔

کوثر کو پیچھے دھکیل کر اس نے اس کا ہاتھ بھی بڑی سختی سے جھٹک دیا اور نال کو کنپٹی سے لگا کر ٹرک دانا ہی چاہتا

تھا کہ وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

”نہیں نہیں اسفند! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ پلیدہ اسفند! پہلے میری بات تو سنئے۔“

”نہیں نہیں۔ اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم تو مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ جاؤ ہو۔ میری نظروں

سے دور ہو جاؤ۔ گیٹ لاسٹ۔“ کوثر اس نے سلوٹو کو بھی پیچھے دھکیل دیا۔

”لیٹ می ڈائی“ دیکھ مرنے دو! میں اپنی تو بے بسی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے میری توہین کی ہے۔ میرے سچے

جذبے کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ مغرور لڑکی تم نے میرے احساسات کو بے درجہ کر دیا ہے۔ اب مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ مر

ہی جانا چاہیے۔“ اس نے پھر ہسپتال کو کنپٹی سے لٹکاتے ہوئے کہا تو وہ پانگھوں کی طرح چنچی۔

”نہیں نہیں، میں نے آپ کی توہین نہیں کی۔ میں آپ سے نفرت نہیں کرتی۔ کبھی کیسے سکتی ہوں بھلا۔ میں تو آپ

سے صرف خفا تھی۔ ایمان سے میں نے یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ سچ یا دیکھی نہیں کہ کیا کہا تھا۔ اور آپ نے تو مجھے گھر

سے نکال دیا تھا۔ برے برے الزامات لگاتے تھے پھر۔ آپ یہ کیوں بھول گئے۔ اس کی وجہ سے ہی سخت بدظن ہو گئی تھی

آپ سے۔ مگر اب تو نہیں ہوں۔ نہیں ہوں اسفند!“ بات کے اختتام پر وہ بے بسی سے دو ٹوٹی ہاتھوں سے چہرہ

دھماپ کر روئے تھی۔ تو اسفند نے مسکرا کر کوثر کی طرف دیکھا۔ اور کوثر نے منہ پھر کبھی ہنسی چھپائی۔

”خیر، تم کہہ رہی ہو تو ملنے لیتا ہوں۔ مگر اب تو تم مجھ سے کبھی نہیں روٹھو گی؟“ اس نے ہسپتال کو اس کی جگہ رکھتے

ہوئے پوچھا۔

”جی۔“ کبھی نہیں اب تک جو زندگی گزار رہی ہے۔ اس میں زیادہ تروقی ہی رہی ہوں۔ اب میں اپنے آئندہ

خشک کر لوں گی۔ اور آئندہ کبھی نہیں روٹھوں گی۔ کبھی نہیں۔“ اس نے گریہ سے بوجھل د بھاری اور موٹی آواز میں

کہا۔ ”اچھا۔“ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اسفند نے اس کا آئینہ اس کے سر پر ڈال دیا۔

اور کوثر ان کے من کی خوشی میں گلدان سے پھولوں کی پتیال توڑ توڑ کر ان پر برسائے لگی۔

